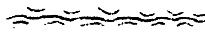
PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

جلد ۵	فہرست مضامین رسالہ "شمع" بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۷ء	نمبر ۱

تصاویر: ۱ جناب شیخ علی حزین، ۲ مقبرہ شیخ علی حزین، ۳ حصہ مکان شیخ علی حزین ۔ ۴ نواب برہان الملک بہادر

اطلاع

عدم گنجایش کے باعث جناب مولوی محمد معین الدین انصاری صاحب بی، اے، دکنیٹب، بیرسٹرایٹ لار، کا معرکتہ الارا مضمون "محکومیت نسواں" اور جناب حسن عابد جعفری صاحب (آکسن)، بیرسٹرایٹ لار کا شاندار تاریخی مضمون "قرون اولیٰ مین ہندوستان کے ذرایع آمدورفت" شایع نہوسکے، آیندہ نمبر مین ان دونون مضامین کا انتظار فرمائیے۔ ان کے علاوہ کئی نہایت نفیس اور نادر مضامین ہین جو صرف پڑھنے سے تعلق رکھتے ہین، افسانے بھی بہت پاکیزہ اور پُرلطف ہین۔



جن حضرات کا سالانہ چندہ ختم ہوگیا ہی، اور ابتک بذریعہ منی آرڈر نہین پہونچا ہی وہ براہ کرم بہت جلد منی آرڈر کے ذریعہ سے مرحمت فرمادین، ورنہ مجبورًا رسالہ وی، پی روانہ ہوگا، جسمین ہم کو بھی زحمت ہوگی اور آپکو بھی نقصان ہوگا۔

ترسیل زر، اور خط وکتابت مین نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیجئے۔

جواب کیلئے ایک آنے کا ٹکٹ ضروری ہے۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت بیکار رہے۔

رسالہ شمع کے سابقہ نمبرون کی ضرورت ہی۔ جو صاحب فروخت کرنا چاہین، مطلع فرمائین۔

خاکسار:- منیجر رسالہ شمع، حسن منزل شاہگنج آگرہ

شمع

(از جناب سید محمد ہادی صاحب ہادیؔ مچھلی شہری بی، اے، ایل، ایل، بی)

اے ضیا بخشِ نظر اے "شمع" اے دُرِ یتیم
اے نشانِ زندگی اے مایۂ ذوقِ سلیم

اے طرب افزائے خاطر تازگی بخشِ خیال
اے گُلِ نورستہ در صحنِ گلستانِ نعیم

فیضہا بردارد از نفحاتِ تو گل در چمن
رہن میدارد خودش را پیش تو کیفِ نسیم

ذوق را آمد زحسنت رونقِ بازارے دگر
قیمتت را کس نمی داند بجز قلبِ فہیم

در رہِ علم و عمل گم گشتگانِ ذوق را
رہنمائی کردہ اندازی براہِ مستقیم

ہر کسے برحسب ذوقش بہرہ بردارد ز تو
فیض جاں بخشت برائے زندگی بخشِ عمیم

عقل و دانش را بود گہوارہ درآغوشِ تو
بہر علم و فن خطِ صفحاتِ تو گشتہ حریم

تازہ گلہا می فشانی روئے دامانِ خیال
با گُلستانت نباشد در جہاں چیزے ندیم

دیدہ با ذوق را از خط و خالت بہرہ ہا
بے سوادانِ جہاں از چوب تا دیبت بیم

صاحبانِ علم را باید نثارت جاں کنند
قیمتت ہرگز نمی باشد کسے سنجد بسیم

سال نو

از

(مدیران شمع)

گذشتہ بارہ مہینوں پر اگر نظر دوڑائی جائے تو مسرتوں اور شادمانیوں کے مقابلہ میں غم اور رنج کا حصّہ نمایاں نظر آئے گا چند الفاظ کے ذریعہ سے یہ تشریح ہی ہماری معاشرتی اور اقتصادی حالت کی!

سنہ ۱۹۲۶ء ہم سے رخصت ہوگیا، اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا اُس کے آنیکی جو خوشیاں تھیں، اُن سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ اگرچہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، اور مشکلوں سے گیا، مگر شکر ہے کہ وہ چلا گیا! اُس کی بھیانک صورت کبھی سامنے نہ آئے گی اور آیندہ، اُس کے ساتھ کبھی ہماری قسمت کا واسطہ نہ ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم اسکی صورت سے کیوں بیزار تھے؟ اُسکی رخصت پر ہمارا قلب کیوں مسرور ہے؟ اور سال نو کی آمد سے ہمارے دل کی کلی کیوں کھلی جاتی ہے؟

سنہ ۱۹۲۵ء جب ہم سے رخصت ہوا تھا، ہمارے خیالات کچھ ایسے ہی تھے، اُسکی آمد سے ہمارا قلب مسرور ہوا تھا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، اُسکی صورت سے بیزاری بڑھتی گئی اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو ہم نے سکون اور اطمینان کا گہرا سانس لیکر کہا تھا "گذری ہوئی بدنصیبیاں گذرے ہوئے سال کے ساتھ تھیں، وہ دفع ہوا، یہ بھی دُور ہو جائیں گی، اور پردۂ غیب سے ایسا انتظام ہوگا کہ سال نو مسرت کا مژدہ، سناتا، اور کامیابی کے پھول لٹاتا ہوا آئیگا۔ تقدیر کی گردش کا پہیہ رُک کر اب سیدھا چلے گا اور ہمارے دلوں اور خواہشوں کو کامرانی

کا سہرا دیکھنا نصیب ہوگا،

دسمبر ۱۹۲۵ء کی اکتیس تاریخ کا بیتابی سے انتظار تھا، اور رات کی خموشی میں ہم کو انتظار تھا کہ کسی طرح گھڑی کی سوئی بارہ پر آجائے۔

اس دن ہم نے اپنی زندگی کا جائیزہ لیا تھا، اور برسوں کے غم ناک مرقع کے ایک ایک ورق کو دیکھا تھا جسمیں راحتوں، اور خود فراموشیوں کے مرقعے کم تھے، مگر تکلیف اور غم کی بھیانک تصویریں بہت تھیں، حسرت سے دل بیٹھا جاتا تھا، اور نئی زندگی، نئے ماحول، اور نئی دنیا کی تمنائیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ دل بیقرار تھا آنکھیں حلقوں میں چکر کھا رہی تھیں، کمرے کے ایک ایک گوشہ میں جاتی تھیں، دروازہ پر پہونچتی تھیں اور کھڑکیوں میں ہوکر سال نو کے استقبال کو دُور تک چلی جاتی تھیں! اپنی وہ بیتابی ہم کو اچھی طرح یاد ہے!

بارہ بج گئے! ہم نے نو گھنٹوں کی آوازیں سنیں، اور ۱۹۲۵ء کو ۱۹۲۶ء سے بغلگیر ہوکر رخصت ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بارہ مہینے کے سفر نے ۱۹۲۵ء کو بوڑھا کر دیا تھا، کمر خم تھی، چہرہ پر جھریاں تھیں، ہاتھوں میں رعشہ تھا، آنکھیں حسرتوں کا تنور تھیں، بال سفید تھے، لکڑی کے سہارے مشکل سے کھڑا ہوکر مہمان سے بغلگیر ہوا تھا، رخصت کے بعد اُس کے گھسٹتے ہوئے پیر، اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے سیاہ بدن کو دیکھکر ہمارا جسم کانپ اُٹھا تھا، اور ہم نے صدق دل سے دعا مانگی تھی کہ خدا اب اسکی صورت نہ دکھائے!

۱۹۲۶ء ہماری طرف مسکراتا ہوا بڑھا تھا، اُس کا شباب، اس کے چہرے کی صباحت، اور اُس کے مزاج کی شگفتگی میں ہمارے لئے ایسا خوش کن پیغام تھا کہ طبیعت کا تکدر یکدم رفع ہوگیا، بیٹھا ہوا دل اُچھلنے لگا، دُنیا مختصر اور تقدیر محض بازیچۂ اطفال معلوم ہونے لگی۔

ہم نے اپنے گناہوں کا اور اپنی فروگذاشتوں کا اقرار کیا، اُن کو ایک ایک کرکے قلمبند کیا،

اور صمیم قلب کے ساتھ عہد کیا کہ آیندہ اُن بدعتوں کا ارتکاب نہ ہوگا! اور سنہ ۱۹۲۶ء کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اپنا مفصل پروگرام بنایا۔ اور اس پرعمل کرنیکا مستحکم ارادہ کیا۔

لیکن افسوس ہی کہ جوں جوں سنہ ۱۹۲۶ء آگے بڑھتا گیا، ہمارے وعدے فراموش ہوتے گئے اور مفصل پروگرام مختصر، اور مختصر پروگرام کالعدم ہوگیا! سنہ ۱۹۲۶ء کی وہ نورانی اور رُوح پرور صورت پھر نظر نہ آئی۔ ہم تھے اور ناکامیابی، ناکامیابی تھی اور خجالت! طبیعت روز مکدّر ہوتی تھی، دل روز بیٹھتا تھا، اعضا دن بدن سست ہوتے جاتے تھے، اور عقل سلب ہوتی چلی جاتی تھی!

اسی طرح بارہ مہینے ختم ہوگئے، اور سنہ ۱۹۲۶ء ہم سے جدا ہوگیا ضعیف اور بے ہمّت دل نے اس کی بھی رخصت پر گہرا سانس لیا، اور سنہ ۱۹۲۷ء کا خیر مقدم کیا، مگر اس مرتبہ سالِ نو سے عہد لینا چاہا کہ وہ ہماری دستگیری کرے گا، بھٹکتے ہوئے قدم سنبھالے گا، اور ہم کو راہ مستقیم سے جُدا نہ ہونے دے گا، مگر اسکی صورت مسخ ہوگئی، اور ہمارے سامنے سنہ ۱۹۲۷ء کے جوانِ رعنا کی بجائے سنہ ۱۹۲۵ء کا بوڑھا کھڑا تھا! اُس نے سفید ابروؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کو اُٹھا کر دیکھا، اور کہنے لگا "جوان ارادوں اور بلند ہمتوں کے ساتھ میں جوان ہوں، اور میرے دونوں ہاتھوں میں شادمانی اور شادکامی کے تحفے ہیں لیکن پست ہمّتوں اور بد عہدوں کے لئے میں وہی ہوں جو نظر آرہا ہوں" انکشاف حقیقت سے ہمارا جسم کانپ اُٹھا، اور آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں............

یہ خواب نہ تھا۔ عالم بیداری کی باتیں تھیں، اور سالِ نو کے مختصر جملہ میں ہماری قسمتوں کا پورا فیصلہ لکھا ہوا تھا! زمانہ نے اپنے دونوں رُخ دکھا دئیے تھے! اور ہمارا دل خود بخود مقر تھا کہ تمام عمر کی مصیبتیں ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ تھیں! ہم ہی نے اپنے اعمال درست نہ کئے، ہم ہی نے اپنے قدم کو صراط مستقیم سے علیحدہ کرلیا! اور ہم ہی ناکامیابی اور نامرادی کا شکار ہوگئے!!

آہ ! یہ واقعہ بھی کیسا جاں فرسا، اور المناک ہے ! خود ہماری کمزوریاں اور خود ہماری بدعہدیاں، ہمارے پیروں کی زنجیر ہیں، اور خمیازہ ہیں اس امر کا کہ ہم نے کبھی اپنی غلطیوں کو رفع کرنیکی کوشش نہ کی، اور اپنی سستی اور کاہلی کو، تقدیر کی گردش، اور مشیت الٰہی سے تعبیر کرتے رہے،

سال نو کا پیغام، پیغام عمل ہے، اور دعوت کامرانی ہے! ہمارا فرض ہے کہ خاموشی اور تنہائی میں بیٹھکر اپنی روح کی گہرائیوں کو دیکھیں، اپنی زندگی اور اپنی اعمال پر غائر نظر ڈالیں، اور پورے بارہ مہینوں کیواسطے اپنا دستورالعمل بنائیں، اُس کے ایک ایک نقطہ کو پیش نظر رکھیں، اور ہمت اور استقلال کے ساتھ اُس پر عمل پیرا ہونیکی کوشش کریں۔

یہی راز ہے آج یورپ کی کامیابی کا، اور یہی وسیلہ ہو سکتا ہے ہماری آیندہ فلاح وبہبود کا!

ملک کی ترقی منحصر ہے قوم کی ترقی پر، اور قوم کی ترقی نام ہے افراد کی مجموعی ترقی کا :

ہمارا روئے سخن اپنے ملک، اور اپنی قوم کے افراد کی طرف ہے، اور انھیں سے توقع ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو کامیاب بناکر ملک کی ترقی کا باعث ہونگے۔

شمع، مشعل ہدایت نہیں ہے لیکن آپکو دعوت عمل کی ترغیب دیتا ہے، اور ایسا لٹریچر پیش کرنا چاہتا ہے جو دلوں میں اُمنگ اور اُمنگوں میں کامیابی کی جھلک دکھائے، شمع کے صفحے، پورانے طرز کی گلکاریوں سے خالی ہیں، عرصہ ہوا کہ زمانہ نے پورانی روش کو چھوڑ دیا، اور پچیس ۲۵ سال کے عرصہ میں دُنیا بدل گئی!

قبروں میں آرام کرنیوالوں کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ دنیا جو کچھ عرصہ سے ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی پچیس ۲۵ برس کی قلیل مدت میں اپنا چولا بدل دیگی ! اور انسان اپنے گھر میں بیٹھکر ہر جگہ کے آدمیوں سے باتیں کریا کریگا، ریل ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تیز چل سکے گی، اور ہوا میں بیٹھکر ہزاروں میل کے سفر ممکن ہوجائیں گے!

کہا جاتا تھا کہ ریل نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں! لیکن ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہوا بھی ہمارے قابو میں آگئی ہے، اور فطرت جس کا ہم دُور سے مشاہدہ کرنیکے عادی تھے آج ہماری خدمتگذاری کا حق ادا کر رہی ہے، جو مسافتیں مہینوں میں طے ہوتی تھیں، گھنٹوں میں طے ہوتی ہیں، جو خبریں ہفتوں میں معلوم ہوتی تھیں ہم اپنے کانوں سے سُنتے ہیں! اور متحرک تصاویر کے ذریعہ سے گھر بیٹھے دنیا کے نظارے، اور مشہور عالم واقعات دیکھ لیتے ہیں! بجلی جو اپنی کڑک اور چمک سے دلوں کو سہماتی تھی آج ہمارے قابو میں ہے، اور صرف ایک بٹن کو دبا کر ہم اُس سے روشنی حاصل کرتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں، کھانے پکاتے ہیں، اور وہ تمام خدمتیں لیتے ہیں جو ہم کو اپنے ہاتھوں سے کرنی پڑتی تھیں، یا جن کے لئے ملازموں کی ضرورت ہوا کرتی تھی!

فطرت کے وہ راز جنکو سمجھنے سے انسان کی عقل عاجز سمجھی جاتی تھی، آج ہمارے مطالعہ اور مشاہدے میں ہیں! ہوا کیسے بنتی ہے، مینہ کیوں برستا ہے، بجلی کہاں سے آتی ہے، پہاڑ کہاں سے آئے، ان میں آگ کیسی پیدا ہوئی۔ دریا کیا ہیں، اور ان کا رُخ کیوں بدلتا ہے، سمندر کی تہ میں کیا ہے، زمین کیسے بنی، اور اسکی انتہا کہاں ہے، زلزلہ کیا چیز ہے، نباتات کیا ہیں، جمادات کہاں سے آئے، انسان کی ابتدا کیونکر ہوئی وغیرہ وغیرہ ہزاروں ایسے سوال ہیں جنکو ہمارے بزرگ حل نہ کر سکے، لیکن بیشتر سوالات کے جوابات آج مدرسوں کے بچّوں کی زبان پر ہیں!

بیماریاں اب بھی ہوتی ہیں، مگر اب علاج کی تدابیر بہتر ہیں، روٹیاں ہم پہلے بھی کماتے تھے، مگر اب رزق پیدا کرنے کے وسائل بہت ہیں، پہلے بھی ہمارے دل خوش ہوا کرتے تھے لیکن اب تفریح اور دلچسپیوں کی انتہا نہیں ہے! دنیا جسکی وسعت کا اندازہ کبھی نہ کر سکے، ہم نے ناپ کر رکھدی ہے، سمندروں کے عمق جن کے خیال سے کانوں پر ہاتھ رکھے جاتے تھے ہم کو معلوم ہیں، اور وہ سفر جن کو "وصیّت نامے" لکھکر اور روانگی

کے وقت "کہا سُنا معاف" کرا کے اختیار کیا جاتا تھا، اب آسان اور ارزاں ہیں، علم جو صرف چند لوگوں کا ورثہ تھا، آج عام ہی، اور سائنس جسکی طرف سی بدعقیدتی کی حد تھی، آج ہماری زندگیوں کی ساون ہی، اور تمام عالم میں آج اسی کے دم سے رونق ہی!

دنیا، ترقی، ایجاد، اور کامیابی کا مرکز اور مظہر ہی، اس پر شباب کی کیفیت طاری ہی، چشم انسانی نے ایسا دلچسپ انقلاب اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا!

ملک کی کامیابی، نام ہی افراد کی مجموعی کامیابی کا، اور افراد کی کامیابیان ہمیشہ منحصر رہی ہیں، ذاتی حوصلہ مندی، اور استقلال پر، طبایع میں سلامتی، کیرکٹر مین استواری، دلون مین ولولہ، اور مزاج میں استقلال نتیجہ ہیں تربیت کا! جسمیں تربیت ذہنی کو سب سے زیادہ دخل ہی، اور ان سب کا دارومدار ہی لٹریچر پر! یعنی وہ لٹریچر جس کا صحیح مفہوم ابھی تک ہمارے ہم وطن نہیں سمجھ سکے لیکن جس نے یورپ اور امریکہ میں کایا پلٹ کردی! جس لٹریچر کے مطالعہ سے غور وفکر کی تحریک پیدا نہ ہو وہ لٹریچر نہیں ہی، اور بغیر اس لٹریچر کے ہمارے افراد کی ترقیون کا خیال محض عبث ہی!

شمع، ایسے ہی ارادون سے میدان میں آیا تھا، اُس کے ہاتھوں مین اگرچہ دنیا کی فتح وشکست نہ تھی، لیکن ایسے لٹریچر کی طرف ترغیب وتحریص ضرور تھی جو غور وفکر کی طرف متوجہ کرتا ہی، اور تاریخی ضیافتوں سے تھکے ماندے دماغ کو آرام پہونچاتا ہی۔

شمع کے صفحات میں آپکو دنیا کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل، اور عمیق سے عمیق خیالات، اپنی زبان اور صاف وسادہ مگر پرجوش لٹریچر میں نظر آئیں گے، اور نہ صرف سائنس، بلکہ مذہب، فلسفہ، اقتصادیات، معاشیات تاریخ وغیرہ وغیرہ پر مضامین پیش نظر ہون گے جو دلوں میں جذبہ، طبیعتوں میں ولولہ، اور قویٰ میں تحریک عمل

پیدا کر سکیں گے۔

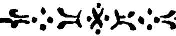
شمع کی چار جلدیں شاہد ہیں کہ یہ مشکل خدمت ہم نے کس طرح انجام دی ہی، اور عام طبایع کے مرغوب خاطر لٹریچر کے ساتھ ساتھ ہم نے جدید لٹریچر کو کس طرح پیش کیا ہی؟

حقیقت یہ ہی کہ اس ارادہ، اور اس راہ میں ہم کو سخت مشکلات کا سامنا ہوا، اور چونکہ یہ ایک تجربہ تھا، جو احتیاط کے ساتھ جاری تھا، ہم شمع کو اس کے اصلی رنگ میں مصلحتاً یکایک پیش نہ کر سکے لیکن گذشتہ تجربات کی بنا پر یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہی کہ شمع کے متعدد مضامین زندگیوں میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوئے اور شمع کی اصلی جھلک اگرچہ اس کے صفحات پر کم نظر آئی مگر جیسے جیسے لوگ مانوس ہوتے گئے اُسکی خوبیاں بھی اپنا اثر دکھاتی گئیں، ہمارے پاس جو تحریریں اطراف و جوانب سے آئی ہیں، اس بیان کی شاہد ہیں۔

سال حال کا پہلا پرچہ اپنے اصلی رنگ کے اعتبار سے، سابق پرچوں سے زیادہ شوخ ہی، اور یقین ہی کہ اگر رسالہ کی قدردانی جاری رہی اور اس کے خریداروں کی تعداد میں حسب دلخواہ اضافہ ہوتا گیا تو بہت جلد ایسے مضامین بھی شایع ہوں گے جن کی اشاعت کی اہتمام اور تصاویر کی فراہمی اور تیاری میں زر کثیر کی ضرورت ہوتی ہی،

شمع مستقل دلچسپیوں کا ذریعہ ہی، اسکی ترویج اور ترقی کا بار آپکے اوپر ہی، اور اس کو زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید بنانا ہمارا کام ہی! جہانتک محنت اور توجہ کا تعلق ہی وہ ہمارے فرایض ہیں، لیکن رسالہ کو اس قابل بنا دینا کہ وہ اپنے اخراجات کو خود برداشت کر سکے، آپکا فرض ہی، اور چونکہ مقاصد، اور پالیسی کے اعتبار سے ملک اور آپکی زبان میں یہ ایک ہی رسالہ ہی، اور کسی ذاتی منفعت کی غرض سے بھی جاری

نہیں ہی، اس لئے حیف ہی کہ دو سال میں بھی اپنی اخراجات کا خود کفیل نہ بن سکا! اور ہنوز ایک مستقل جُرمانہ ہی جسکو ہم خندہ پیشانی کے ساتھ ہر ماہ ادا کرتے ہیں!



مطبُوعات جدید

پر نہایت توجہ اور احتیاط کے ساتھ شمع میں ریویو لکھے جاتے ہیں شمع اردو زبان کا رسالہ ہے جس کا فرض ہے کہ اردو مطبوعات کو پبلک کے سامنے لائے۔ اور مصنفین اور اہالیان مطابع اور تاجران کتب کی ہمت افزائی کرے۔ شمع کی روز افزوں اشاعت اور ہر دلعزیزی اس امر کی ضامن ہیں کہ آپ کی کتاب پر جو ریویو اس میں شائع ہوگا وہ توجہ کے ساتھ ہزاروں جگہ پڑھا جائیگا اور یقین ہے کہ آپ ہماری اس ادبی توجہ سے اس طرح فائدہ حاصل کریں گے کہ :-

آپ کی کتاب سینکڑوں کی تعداد میں فروخت ہوگی

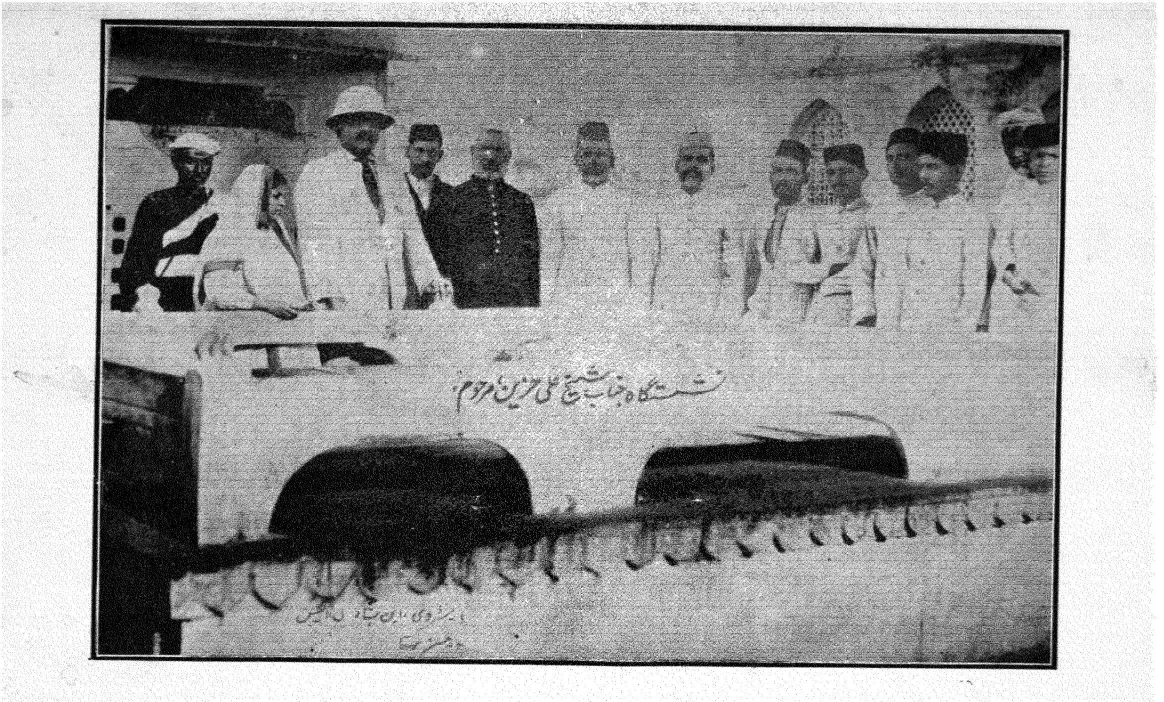
منیجر شمع۔ حسن منزل۔
شاہ گنج۔ اگرہ

جناب شیخ علی حزین مرحوم و مغفور

تمہید

(از مسٹر وی، این، مہتہ، آئی، سی، ایس، کلکٹر بنارس)

عرصہ ۲۳ سال کا ہوا جب میں برائٹن سے لندن جاتے وقت مقام ہارشم سے گذرا۔ تو معلوم ہوا کہ فیلڈ پلیس جہاں شیلے پیدا ہوا تھا اُس مقام سے بہت قریب تھا طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا، اور میں اُس مکان کی زیارت کے لئے اُتر پڑا، گھوڑا گاڑی وہاں موجود تھی میں گاڑی میں سوار ہوا اور کوچبان سے کہا کہ اُس مقام پر لیچلے جہاں شیلے پیدا ہوا تھا، کوچبان نے شیلے کا نام تین بار لیا، اور پھر جوابدیا کہ اُسکو بھی معلوم نہیں کہ دشیلے) کوئی شخص اس نام کا کبھی پیدا بھی ہوا تھا۔ بہرکیف میں فیلڈ پلیس کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کوئی شخص اِس نواح کا مل گیا تو اُس سے پتہ معلوم کرونگا، ایک عالی شان مکان کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ کچھ لوگ وہاں ٹینس کھیل رہے ہیں۔ میں نے گاڑی سے اُتر کر کھیلنے والوں سے بہت منت کے ساتھ دریافت کیا "آپکو وہ مکان معلوم ہے جس میں شیلے پیدا ہوئے تھے"! اُن اصحاب نے اخلاق سے جوابدیا" وہ مکان یہی ہے"۔ میں نے اسکو مذاق سمجھا کیونکہ مکان بالکل جدید طریقہ کا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اُنھوں نے ملازم کو بلاکر مکان دکھانیکی ہدایت کردی، میں اندر مکان کے داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک پورانا اُٹھارہویں صدی کا کمرہ بیش قیمت جواہرات کے ڈبہ کی طرح اپنی قدیم حالت اور وضع کے ساتھ محفوظ ہے۔



نشست گاه جناب شيخ علي حزين مرحوم

اسی طرح جب میں اس ضلع میں آیا اور دریافت کیا کہ حزؔین کا مسکن کہاں تھا تو باشندگان شہر بنارس کچھ جواب نہ دسکے مجھکو بنارس کے گزیٹیر میں بھی کوئی پتہ اس کے متعلق نہ ملا۔ بہت دقت کے بعد معلوم ہوا کہ حزؔین کا مدفن مقام فاطمان میں ہی اور اُن کا مسکن بھی اُسی کے قریب ایک باغ میں ہی، میں نے اُس مقام کو جاکر دیکھا اور خوش نصیبی سے حزؔین کی ایک قدیم تصویر بھی بابو سیتا رام شاہ سے مجھکو دستیاب ہوئی، ان تصاویر کو شمع میں شایع ہونے کے لئے بہ خوشی ارسال کرتا ہوں، منسلکہ مضمون ایک رئیس نے حزؔین مرحوم کے متعلق لکھوا دیا ہی۔

وی۔ ین۔ مہتا۔ آئی۔ سی۔ ایس۔

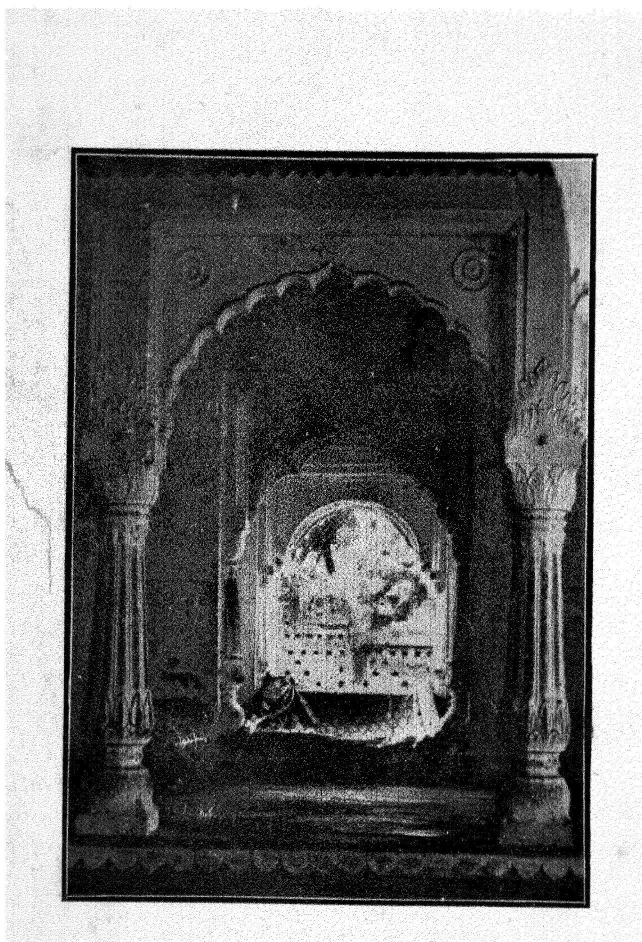
کلکٹر بنارس۔

شیخ علی حزین مرحوم

از

جناب پروفیسر ظفر حسین صاحب، ضابط

حزین تخلص نام شیخ محمد علی باپ کا نام شیخ ابو طالب، ان کے مورث اعلیٰ شیخ زاہد جیلانی تھے، اور جیلان میں بہت ذی عزت اور ذی علم اور نام آور شخص تھے، حزین ماہ ربیع الاول ۱۱۰۳ھ مطابق ۷ر جنوری ۱۶۹۲ء کو اصفہان میں پیدا ہوئے، چار برس کے سن میں مولانا شاہ محمد شیرازی سے پڑھنا شروع کیا۔ چونکہ ذہن تیز تھا اور پڑھنے کا شوق تھا چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہوکر بڑے فاضل مذہبی شاعر فارسی ہوگئے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کو گئے ۱۷۳۳ء میں نادر کے خوف سے ہندوستان چلے آئے، اُس وقت ہندوستان میں روشن اختر محمد شاہ رنگیلے کی سلطنت تھی (ملاحظہ ہو شجرہ ۲) حزین کے نادر سے خائف ہونے کا یہ سبب تھا کہ حزین اصفہان میں شاہ عباس ثانی کے صاحبزادہ شہزادہ طہماسپ ثانی کو تعلیم دیتے تھے۔ اُس وقت نادر ایک معمولی سپاہی یا خدمتگار کی حیثیت کا آدمی تھا۔ ایک روز دوران تعلیم میں حزین کو پیاس معلوم ہوئی اور پانی طلب کیا نادر تھالی جوڑ میں پانی لایا حزین نے پانی پینا شروع کیا لیکن نادر نے حسب قاعدہ جام کے نیچے پانی پیتے وقت تھالی نہیں لگائی۔ اور کچھ پانی حزین کے قبا پر گر گیا۔ انھوں نے نادر کو قہر آلود نظر سے دیکھا اور ممکن ہے کہ کچھ سخت و سست بھی کہدیا ہو۔ اُس وقت تو نادر تھالی جوڑ لیکر چلا گیا لیکن اُسکو حزین کا یہ فعل بہت ناگوار ہوا اور پھر کبھی حزین کے سامنے نہیں آیا بلکہ تھوڑے دنوں کے بعد ایران سے اپنے وطن افغانستان



مقبرہ شیخ علی حزین مرحوم، واقع فاطمان، بنارس

کو چلا گیا۔ نادر ایران کی حالت اور اہل ایران کی عادات سے بخوبی واقف تھا اُس نے اہل افغانستان کو اشتعال دیکر ایران کے برخلاف بغاوت کی اور خود بادشاہ بنگیا حزین کو اُس کے خوف سے ایران چھوڑنا پڑا۔ نادر کی خیالات حزین کی طرف سے خراب تھی، کیونکہ نادرشاہ جب دہلی آیا تو اُس نے ایک شخص سے کہا کہ حزین کو بلا لاؤ۔ اُس نے جواب دیا کہ حزین آپکے خوف سے یا اپنی عالی حوصلگی کی وجہ سے نہ آئیں گے"۔ جب حزین کو اِس واقعہ کی خبر ہوئی تو لکھنؤ چلے آئے۔ چونکہ وہ لکھنؤ میں بھی نادرشاہ سے مطمئن نہ تھے۔ لہذا بنارس چلے آئے، بنارس میں یہ زمانہ مہاراجہ بلونت سنگھ کی سلطنت کا تھا جو موجودہ مہاراجہ پربھونارائن سنگھ دام اقبالہ کی پانچ پُشت پہلے مورث اعلیٰ تھے (ملاحظہ ہو شجرہ ۱) جب مہاراجہ بلونت سنگھ کو بنارس میں حزین کے درود کی خبر معلوم ہوئی تو اپنی ایک معتمد ارکان سلطنت سے فرمایا کہ تم حزین سے دریافت کرو کہ وہ یہاں بحیثیت مسافر ہیں یا قیام کا قصد ہے، اُس نے عرض کی کہ میری یہ مجال نہیں کہ میں حزین سے دریافت کرسکوں۔ مہاراجہ نے فرمایا کہ میں خود ملوں گا اور حزین کے پاس تشریف لاکر استفسار حال کیا۔ حزین نے عرض کی کہ میں بحیثیت مسافر تو ضرور ہوں لیکن اگر آپ اجازت دیں تو یہیں ایک جھونپڑی بنا کر قیام کروں۔ مہاراجہ صاحب نے اس شرط پر اجازت دی کہ حزین مہاراجہ بلونت سنگھ کے بیٹے کمار چیت سنگھ کو تعلیم دیا کریں۔ حزین نے اس شرط پر قبول کیا کہ کمار چیت سنگھ بغرض تعلیم خود حزین کے پاس آیا کریں گے۔ چنانچہ اکثر کمار چیت سنگھ حزین کے پاس جایا کرتے تھے۔ اور فارسی بہت اچھی حاصل کرلی تھی۔ غالباً حزین نے یہ شعر اُسیوقت شکریہ حصول زمین میں کہکر مہاراجہ بلونت سنگھ کو سُنایا ہو ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا ∴ ہر برہمن لپسرے لچھمن و رام است ایں جا

اس کے بعد حزین نے کچھ روپئے اور اشرفیاں مہاراجہ صاحب کو نذر دیں جنکو مہاراجہ صاحب نے بڑی مشکل اور اصرار سے قبول تو کیا لیکن اسکے صلہ میں بہت سی زمین کچھ دنوں کے بعد دیدی جسمیں اورنگ آباد وغیرہ بھی شامل تھا۔ درگاہ فاطمان وغیرہ تعمیر ہونے کے بعد نواب شجاع الدولہ والی ملک اودہ حزین سے ملنے کو آئے چونکہ اُن کے دماغ میں سلطنت کی نخوت تھی چاہا کہ بخط راست حزین کے پاس چلے جاویں لیکن پہلے ہی دالان میں پہونچے تھے کہ ملازم نے عرض کی کہ "حضور کہاں تشریف لیجاتے ہیں"؟ شجاع الدولہ نے جوابدیا "شیخ سے ملنے کو" ملازم نے عرض کی کہ "ذرا میں اطلاع کر لوں" شجاع الدولہ رُک گئے۔ لیکن اُنکو ملازم کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی ملازم نے اطلاع کی اور حزین نے اجازت دیدی۔ شجاع الدولہ حزین کے سامنے پہونچتے ہی برس پڑے اور یہ مصرعہ پڑھا: ع

در درویش را دربان نہ باید

بھلا حزین اور چُپ رہیں فوراً جواب دیا ع

بہ باید تا سگ دنیا نہ آید

اب شجاع الدولہ نے چاہا کہ جس چاندی کے پلنگ پر حزین لیٹے ہوئے تھے اُسی پر بیٹھیں۔ حزین نے مہمان خیال کر کے اپنے پیر سمیٹ لئے، شجاع الدولہ پائینتی بیٹھ گئے۔ اور حزین سے کہا کہ میں آپ سے ایک خاص امر میں مشورہ لینے آیا ہوں۔ حزین نے کہا فرمائیے۔ شجاع الدولہ نے کہا کہ میر قاسم علیخان بنگالے والے اور شاہ عالم بادشاہ دہلی والے (ملاحظہ ہو شجرہ ۲) مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ آپ ہم لوگوں کے شریک ہو کر انگریزوں سے لڑیئے آپکی کیا رائے ہے؟ حزین نے جوابدیا کہ انگریزوں سے بگاڑنا اچھا نہیں ہے آپ ہرگز ایسا نہ کریں۔ اس گفتگو کے بعد شجاع الدولہ نے پانی طلب کیا حزین

اپنے ملازم سے تیوری پر بل ڈال کر کہا کہ شربت انار لاؤ ملازم شربت انار ترش بنا کر لایا۔ شجاع الدولہ تو ملازم سے پہلی ہی سے ناخوش تھے کیونکہ اُس نے آنے وقت انکو ٹوکا تھا۔ شربت پی کر حزین سے بولے کہ آپنے صرف شربت انار لانیکو کہا تھا یہ لیکن شربت انار ترش لایا شجاع الدولہ نے پھر منہ کی کھائی۔ حزین نے جوابدیا کہ ملازم میری ہدایت کے بموجب شربت انار ترش لایا لیکن آپنے امتیاز نہیں کیا میں نے جسوقت اُسکو شربت انار لانیکو کہا تھا اُسوقت ابرو پر شکن ڈال کر کہا تھا ملازم میرے مطلب کو سمجھ گیا تھا۔ شجاع الدولہ نے کہا کہ شربت انار عموماً انار شیرین کا استعمال کیا جاتا ہی۔ اب آؤ تو جاؤ کہاں حزین گھوم پڑے اور علم طب کے قاعدہ سے جوابدیا کہ اس وقت آپکے مزاج مین حرارت زیادہ ہی لہذا میں نے رفع صفرا کے خیال سے شربت انار ترش آپکو پلایا۔ اِن باتون کے بعد شجاع الدولہ رخصت ہوئے اور حزین کی رائے کے خلاف بمشارکت شاہ عالم و میر قاسم علی خان بمقام بکسر انگریزون سے لڑے اور شکست کھائی کچھ دنون کے بعد شجاع الدولہ گھومتے پھرتے بنارس آئے اور پھر حزین سے ملنا چاہا چونکہ شجاع الدولہ نے حزین کی رائے نہیں مانی تھی یا جو اور مصلحت رہی ہو، حزین نے ملنے سے قطعی انکار کردیا اور نہیں ملے۔ اِس واقعہ کے چند دنون کے بعد ہندوستان کے مشہور شاعر مرزا رفیع سودا حزین سے ملنے آئے حزین نے دریافت کیا۔ لوگون نے بتایا کہ یہ بڑے شاعر ہیں۔ حزین نے سودا سے کہا "چندے بخواں" سودا نے جوابدیا کہ مین اُردو میں کہتا ہون اور میں خود آپسے سننے آیا ہون حزین نے اپنا یہ مطلع سُنایا۔

درشست چو بر داشت کمانے و کمینے
نگذاشتہ یک صید زمانے و زمینے

اس کے بعد حزیں نے سودا سے کہا کہ اب تو میں سُنا چکا اب آپ اپنا کلام سُنائیے چونکہ سودا بھی اِس مضمون کو کہہ چکے تھے لہذا یہ مطلع پڑھا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مُرغ قبلہ نُما آشیانے میں

تڑپے کا لفظ حزیں نہ سمجھے سودا سے دریافت کیا۔ تڑپے چیست یعنی تڑپے کے کیا معنی ہیں؟ سودا نے فارسی میں کہا (طپیدن) اِس کے بعد حزیں نے کہا کہ اور کچھ پڑہو۔ سودا نے وہ رُباعی جو کسی بادشاہ یا نواب کیواسطے کہی تھی پڑہی۔

ایوان عدالت میں تمھارے یا شاہ
کیا دخل ہے ظُلم کو عیاذاً باللہ
شیشے کا جو ہیں طاق سے پیٹہے پاؤں
پتھر سے بھی آتی ہے صدا بسم اللہ

حزیں رپٹے کا لفظ بھی نہ سمجھے اور سودا سے پوچھا رپٹے چیست؟ سودا نے فارسی میں سمجھایا حزیں بہت محظوظ ہوئے اور سودا کو اُن الفاظ کا سارٹی فیکٹ دیا۔ دریوچ گویان ہند خوب میگوئی۔ اِس کے بعد سودا رُخصت ہوکر چلے گئے۔

بنارس میں آٹھ برس قیام کرنے کے بعد حزیں نے خود اپنی سوانحعمری لکھی جو "سوانح حزیں" کے نام سے چھپی ہے لیکن بڑی دقت سے ملتی ہے۔ مدت العُمر بنارس ہی میں گوشہ نشین رہے اور اسی شہر میں رحلت فرمائی۔ بمقام فاطمان میں دفن ہوئے۔ سن وفات ۱۱۸۰ھ جو مطابق ۱۷۶۶ع ہے،

قبر پر ایک عربی عبارت اس مضمون کی ہے۔

عبدہ الراجی لارحمت اللہ الغنی علی ابن الطالب لاہی اصفہانی ترجمہ اُس کا

بندۂ غنی خدا کی رحمت کا امیدوار علی ابوطالب کا بیٹا لاہجان کے خاندان سے اور اصفہان کا رہنے والا

سرہانے یہ شعر کندہ ہے ؎

روشن شد از وصال تو شبہائے تار ما

صبح قیامت است چراغِ مزار ما

ایک پہلو مین یہ شعر نقش ہے ؎

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم

سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

دوسرے پہلو میں یہ شعر نقش ہے ؎

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم

ہمیں دانم کہ گوش از دوست پنہانِ شنید اینجا

لوگوں کا خیال ہے کہ ان اشعار سے حزین کے انتقال کا سن یعنی ۱۱۸۰ھ نکلتے ہیں لیکن

ان اشعار سے یہ سن نہیں نکلتا ہے بلکہ غلام علی آزاد بلگرامی نے جو حزین کے ہمعصر تھے جو تاریخ

کہی ہے اُس سے ۱۱۸۰ھ ضرور نکلتے ہیں مادہ کا مصرعہ یہ ہے۔

از فوت حزیں ۔ حزیں دل ما است
۱۱۸۰ھ

بعض لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ حزین کے تابع ایک جن تھا جسکا نام رمضانی تھا میاں رمضانی

حزین کے لازم ضرور تھی۔ حزین نے اپنی سوانح عمری میں جن کا ذکر نہیں کیا ہی اور نہ کسی کتاب سے جن کا حزین کے تابع ہونا پایا جاتا ہی اگر ایسا ہوتا تو کسی کتاب میں ضرور کچھ تذکرہ ہوتا۔ حزین کی فیضان صحبت سی رمضانی بھی شاعری کرتے تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہی کہ حزین کو مکھیاں ستاتی تھیں۔ حزین نے فرمایا "رمضانی مگسان می آیند"۔ رمضانی نے فوراً ہی جواب دیا "بلے خداوندا ناکسان پیش کسان می آیند"۔ غرضکہ ایسے بہت سے واقعات حزین کے لوگ بیان کرتے ہیں لیکن تحقیق کے درجہ پر نہیں ہیں۔

تمام شد

سنجرہ مہاراجیں کا حوالہ دیا گیا ہی!

۱ مہاراجہ صاحب بلونت سنگھ

۲ راجہ چیت سنگھ جو معزول کر دیئے گئے

گلاب رانی

۳ راجہ مہیپ نارائن سنگھ جو بجائے راجہ چیت سنگھ راجہ بنائے گئے

بابو [illegible] نارائن سنگھ — بابو [illegible] نارائن سنگھ — بابو [illegible] نارائن سنگھ

بابو پرسدھ نارائن سنگھ

بابو [illegible] نارائن سنگھ لاولد

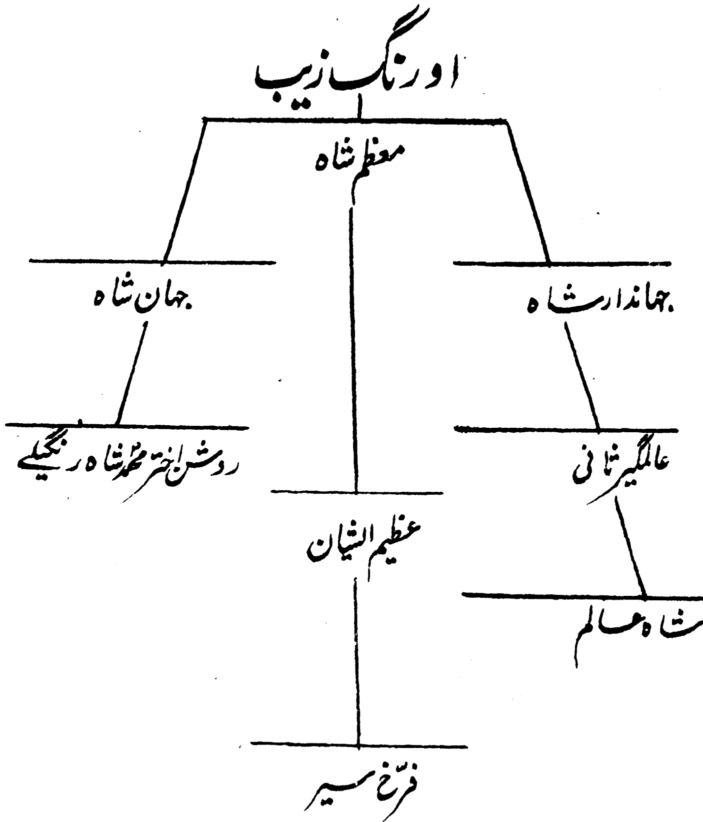
۴ راجہ اودت نارائن سنگھ لاولد

۵ راجہ ایشری نارائن سنگھ تبنی پسر بابو پرسدہ نرائن سنگھ لاولد

۶ راجہ پربھو نارائن سنگھ تبنی پسر بابو نرنارائن سنگھ موجودہ مہاراجہ بنارس

کمار آدت نارائن سنگھ

شجرہ ۲ جس کا حوالہ دیا گیا ہی!



نوٹ:۔ شیخ علی حزین مرحوم سے ہم کو طالب علمانہ عقیدت ہی، اُن کا علمی تبحر، اُن کی ذہانت، اور اعلیٰ شاعری، قابل تحسین وثنا ہیں۔ لیکن کسقدر افسوس اور حیرت کا مقام ہی کہ مرحوم کے قیام بنارس کے متعلق صحیح حالات معلوم نہین ہوسکتے، خود مرحوم کی کلیات میں جو انھون نے اپنا حال قلمبند کردیا ہے۔

اُس کے علاوہ جو باتیں سُننے میں آتی ہیں وہ اسقدر عجیب ہیں کہ اگر اُن پر اعتبار کیا جائے تو مرحوم کی شخصیت مزموم اور قابل نفرت معلوم ہوتی ہے۔ مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت شگفتہ مزاج، منکسر طبع، اور علم دوست بزرگ تھے۔ بعض تذکرہ نویسون نے میر تقی میر اور میر انیس کی نازک مزاجیونکو "ہوّا" بنا کر دکھایا ہے حالانکہ وہ دونون بزرگ اعلیٰ صفات انسانی سے متصف تھے۔ ایشیائی عام راویون کا عجیب خاصہ ہے کہ روایتوں کو اپنا حاشیہ ٹانک کر بیان کرتے ہین اور چند سال کے بعد ایک روایت کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے مُغلوں کے عہد میں، بادشاہان وقت کے متعلق عجیب و غریب روایتیں شہرون اور قصبون مین چکر لگایا کرتی تھیں، اور یہ مرض ہندوستان مین ابتک موجود ہے۔ بالخصوص ریاستون میں تو جتنے مُنہ اُتنی روایتیں سُننے میں آتی ہیں۔

اسی طرح جناب حزین مرحوم بھی راویوں کے ہدف "تعریف" سے نہ بچ سکے، اور عوام نے اُن مُہمل روایتون کو جو صریح بد تہذیبی پر مبنی تھیں، نازک مزاجی سے موسوم کر دیا۔

مرحوم کا زمانہ بنارس مین گذرا ہے، وہاں اب بھی ایسے خاندان ہیں جن کے بزرگون کو شیخ مرحوم سے نیاز حاصل تھا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر بنارس کے صحیح الفہم اور خوش فکر حضرات توجہ فرمائیں تو اُن کو حزین مرحوم کے متعلق بہت سے واقعات معلوم ہو جائیں، اور اُنکی اشاعت ادبی اور تاریخی حیثیت سے نہایت قابل قدر ثابت ہو۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ باقیات صالحات بھی ہم سے رخصت ہو جائیں گے! فقط

"مدیران شمع"

فلسفۂ عظمت

(از جناب محمد حنیف صاحب ندوی)

اگر آپ کسی ایسے آدمی کو دیکھیں جس کے متعلق اختلافات کی خلیج نہایت وسیع ہو، جہاں اُسے فرشتہ، اوتار تسلیم کیا جاتا ہو وہاں اُسے شیطان و مردود کہنے والے لوگ بھی موجود ہوں تو سمجھ لیجئے وہ ایک عظیم الشان آدمی ہے۔

بڑائی، شعر و شاعری کا نام نہیں علم و حکمت سے حاصل ہونیوالی چیز نہیں، جاہ و منزلت کی رہین منت نہیں، عالم بہت ہیں، شعراء کثیر التعداد ہیں، امراء کا تو شمار ہی نہیں لیکن انہیں بڑے آدمی کتنے ہیں؟ بہت کم، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، یہ ایک وہبی چیز ہے، خدا کی دین، اور اُسکی عنایت ہے؛ ابتداء سے ہی اس کا احساس ہونے لگتا ہے، وہ سمجھ جاتا ہے، اُسکی ہر چیز عجیب ہے، عقل ہے تو یگانہ " فراست ہے تو بے نظیر، سمجھ بوجھ ہے تو لاجواب، غرض اسکی ایک ایک حرکت سے ایک ایک ادا سے فہم، و ذکا، کے پھول جھڑتے ہیں۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کسی کا مقلد، کسی کا پیرو نہیں ہوتا، تاڑ جاتا ہے کہ ہمارا مسلک اور ہے ہمارا مشرب اور، اس کے بعد وہ اپنے لئے ایک خاص نظام کار، تیار کر لیتا ہے ایک متعین مطمح نظر اُس کے سامنے ہوتا ہے جو اُسی کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اپنی ہی بات کہتا ہے، اپنا ہی کلام سنتا ہے اور خوش ہوتا ہے اُسی راستے پر چلتا ہے جسکو اُسی کے ہاتھوں نے درست کیا ہے، بڑے بڑے آدمیوں کی باتوں کو بیدریغ مسترد کر دیتا ہے مُسلم عقائد کا بے طرح

تمسخر اڑاتا ہی، اور اس کفر نوازی پر خوش بھی ہوتا ہے، اس کے نزدیک اُس کے سوا کوئی امام، یا مجتہد نہیں ہو سکتا، تمام لوگ جاہل ہیں، مقلد ہیں، یہ اس لئے کہ اُسے اپنی ہی عقل پر اعتماد ہی، اپنے ہی قویٰ پر بھروسہ ہی، اس کا ہر کام حیرت انگیز، اور ہر بات ہوشربا ہی، لوگ اُسے بغور دیکھتے ہیں لیکن اُن کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب اسکی کسی چیز کو پُرانی اور قدیم نہیں پاتے، نہ وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہی، نہ کسی مشرب کا معتقد، اگر شاعر ہی، تو اشعار میں ایک خاص جدت ہی، جو اُسی کا حصہ ہی، اگر انشا پرداز ہے تو اپنے انداز میں نیا، اگر مولوی ہی، فقیر ہی، تو اُسکی ڈیڑھ اینچ کی الگ ہی مسجد ہی، مسائل ہیں تو انوکھے، فقہ ہی تو جدید، اگر وہ بادشاہ ہو جائے تو کایا پلٹ کر دیگا، وہ کارہائے نمایاں دکھائے گا، جنکی نظیر تاریخ سے ملنی دشوار ہو جائے، اور اگر کہیں لیڈر رہا تو وہ سبز باغ دکھائیگا، کہ قوم کو اعتبار ہی کرتے بن آئے۔

یہ ہی وہ بڑائی جس کے لوگ متلاشی ہیں، اور یہ ہی وہ بڑا آدمی جسکی زندگی قابل صد رشک خیال کی جاتی ہی، ایسا شخص لوگوں کے لئے ایک عجیب فتنے کا باب ثابت ہوتا ہی تشتت، و افتراق، کا اگر صحیح نمونہ کوئی ہو سکتا ہی، تو یہی شخص ہی، وہ لوگ جو "کُل جدیدٌ لذیذٌ" کے قائل ہین، اسکی آواز پر پُر جوش لبیک کہتے ہیں، یہی نہیں بلکہ اُسے انسانیت کا بہترین اسوہ سمجھکر، اسکی حرکات و سکنات کا، بغیر سوچے سمجھے تتبع کرتے ہیں۔ اسکی ہر بات کو قرآنی، اور ہر چیز کو آسمانی تصور کرتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے، دشمنوں کے سینوں میں حسد کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھتی ہے بُغض و حسد کے ناپاک جذبات موجزن ہو جاتے ہین۔ انہیں اسکی قابلیت ایک آنکھ نہیں بھاتی، اس لئے مخالفت پر کمر باندھ لیتے ہیں، اختلافات پر تُل جاتے ہیں، ان کے بُغض و حسد کو پارہ اُتنا ہی چڑھ جاتا ہی، جتنا اُس کے مُریدوں کا، عقیدت و نیاز مین، پھر کیا ہی ایک اچھا خاصہ معرکہ بپا ہو جاتا ہی، مخالفین چاہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی نظروں

میں ذلیل ہو جائے موافقین ہمیشہ اس کے کوشاں رہتے ہیں۔ کہ اُسکے وقار کی دھاک بٹھا دیں، مگر وہ نہایت اطمینان سے ان کا تماشا دیکھتا ہے، اور مُسکرا دیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے یہ تمام آوازیں اُس کے گنبد شہرت میں آواز بازگشت کا کام دینگی،

میں نہیں کہتا اسکی ہر بات حق ہے یا اُس سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ بسا اوقات ایک ضعیف العقل انسان کی رائے اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور واقع کے موافق ہوتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عالم کو اپنی طرف متوجہ کر لینا ایک عظیم الشان آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

نصیریون نے "حضرت علیؓ" کو خدا سمجھ لیا لیکن خوارج نے انہیں کے متعلق تکفیر کے فتوے دئے ابوبکرؓ و عمرؓ کو اُمت کے اکثر حصہ نے شیخ الاسلام تسلیم کر لیا لیکن بعضون نے اُن کے اخلاص و ایمان میں بھی شبہ کیا، ابن عربی کو بعضون نے قطب الاقطاب، کا معزز ترین خطاب دیا، لیکن تہمتوں سے بھی نہ بچ سکے، ابن رشد کو فیلسوف الاسلام کہا گیا لیکن سر راہ اُس کے مُنہ پر تھوکا بھی گیا، غزالی کو حجتہ الاسلام کے زبردست نام سے یاد کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ، اسکی کتابون کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا کہ الامان، والحفیظ، ابوالعلا معری جسکی جوتیاں چومنا لوگ فخر سمجھا کرتے تھے، اس طرح ذلیل ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے سقراط کو زہر ہلاہل اس لئے دیا گیا کہ وہ عامتہ الناس کے خلاف تھا متنبی کی تعریف میں کتنے ہی ورق سیاہ کئے گئے، کتنے ہی قلم توڑے گئے لیکن پھر بھی وہ لوگ موجود رہے جو اُسے متکلف شاعر کہنے سے نہیں جھجکتے شکسپیئر کو قوم نے وہ مرتبہ دیا کہ باید و شاید، تمام کمالات انسانی کا اُسے بہترین مظہر سمجھا گیا لیکن زمانہ ایسے لوگون کو فنا نہ کر سکا جو اُسے جھوٹا، اور چور کہتے تھے نپولین اوّل کو لوگوں نے بہادری اور شجاعت کا اعلیٰ ترین مجسمہ قرار دیا لیکن وہ لوگ بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے جو اُسے

سفاک ، بیرحم اور ظالم کہتے ہیں ۔ اسی طرح لوگون نے توتھ ہینیٹنے کو کیا کچھ نہیں کہا آجکل کے بڑے لوگوں کو ہی دیکھئے لوگ اُن کے متعلق کسقدر مختلف الخیال ہین ع

" بہ بین تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا "

یہتمام لوگ واقعتاً ایسی منزلت کے مستحق نہیں ، جو قوم کے دلون میں تھی اور نہ ایسی ذلت ہی کے قابل تھے جو انہیں دنیا کے بدترین انسانوں میں شمار کیا جاوے بلکہ یہ عزت وشرف ، یا ذلت ونا قابلیت صرف حُسن ظن ، عناد و بُغض پر مبنی ہی ، لیکن وہ کیوں پیدا ہوئے ؟ اس لئے کہ وہ دنیا کے عظیم الشان آدمیون سے ہیں !

زندگی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی ایک عجیب سکوت میں عمر بسر کردے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ، جانوروں کی طرح پیدا ہو ، اور مر جائے ، بلکہ زندگی نام ہی نامانوس کانون کو مانوس بنانے کا ، زندگی نام ہی ایک خاص کشش پیدا کرنے کا جس سے لوگ اسکی طرف کھنچے چلے آئیں ، زندگی نام ہے دلوں کو ہلا دینے کا ۔ گُنگ زبانوں کو گویا کردینے کا ، زندگی کہتے ہیں محبت وعداوت کے متضاد جذبات کے پیدا کردینے کو ، پس حقیقت میں زندگی نام ہی بڑے آدمی کی زندگی کا ۔

بزرگی ایک ایسی حقیقت ہی جسکی خدمت دوست و دشمن سب کرتے ہیں اس کے خمیر میں موافق ، ومخالف دو زبردست جُزو ہیں چنانچہ جہان اُس کے دشمن ہیں ، وہاں چند دوست بھی ہیں بہر حال جہاں یہ دونوں اقسام کے آدمی ہوں ، سمجھہ لو وہیں عظمت کی دیوی موجود ہی ۔

عظمت ، ایک عالی شان قصر ہی ، جو بُغض ، ومحبت کے دو مرصع ستونون پر کھڑا ہی ، انہیں کا اس کا سہارا ہی ، جہاں یہ گرے عالی شان محل آن کی آن میں تباہ ہو کر رہ گیا ۔

یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ لوگ تم سے اچھا سلوک کرتے ہیں، کیونکہ لوگ ہمیشہ اُسی سے محبت کرتے ہیں جو عقل و دانش سے ہاتھ دھو بیٹھے، جو اپنے جذبات کو پامال کردے، اور اُس کُتّے کی طرح ذلیل ہو جائے جو اپنے آپکو بچّوں کے حوالہ کردے، اور چاہے کیسا ہی سلوک ہو مگر وہ اپنی دُم ہلاتا ہی رہتا ہی، اور نہ یہی کوئی تعجب انگیز بات ہی کہ لوگ تمھیں بُری نظروں سے دیکھتے ہیں کیونکہ بُرے کو ہی بُرا کہا جاتا ہی، ہاں اگر لوگ تمھارا صحیح اندازہ نہیں کرسکے اور دو گروہ ہو گئے تو یقیناً تعجب خیز بات ہی کیونکہ عظمت و جلال کی یہی سب سے بڑی علامت ہی۔

تو ایک ایسا بولتا چالتا انسان ہو جا جسکی آواز ہوا مشرق و مغرب تک اُڑاتی ہوئی لیجائے ایسی ہوا ہونے کی ضرورت نہیں جو کوئی مُستقل نغمہ نہ رکھتی ہو اور محض نقال ہو، کیونکہ اِس سے وقعت جاتی رہتی ہی۔

ہاں ایک نونہال مگر شاداب شجر کی صورت اختیار کرلے جسکی تعمیر میں ہزارہا ذرّوں کی بربادی مُضمر ہو، ذرہ نہ بن جسکو سنکڑوں ہی قدم روندیں۔

تو اگر لوگوں کی اصلاح، اور رہنمائی نہیں کرسکتا تو اُٹھ! اپنا ہی رہنما ہو جا، اپنے ہی نفس اَمّارہ کی رہنمائی کر، کیونکہ وہ تیرے اختیار و اقتدار میں ہی تقلید و اقتدا کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس سے تو ذلیل ہوگا، اور عظیم الشان لوگ وہی کہلائیں گے جنکی اقتدار کا تجھے فخر حاصل ہی۔

ترجمہ (النظرات مصطفیٰ لطفی منفلوطی)



فرمانِ عمل

از

(جناب خان صاحب مولوی رضا علی صاحب وحشت)

مژدہ اے پائے طلب ہمت کا پیغام آگیا
اُٹھ! کہ فرمانِ عمل، اے دل، ترے نام آگیا

بارہا بے التفاتی دیکھ کر صیاد کی
خود بخود بیتاب ہوکر، میں تہِ دام آگیا

کون کرتا تیری بیدادِ تغافل کا گلہ؟
اور اُلٹا مجھ پہ بیتابی کا الزام آگیا

گرمیِ محفل، کچھ اس سے بڑھ کے ساقی چاہئے
کچھ خبر بھی ہے؟ ترا رندِ سیہ فام آگیا

اے دلِ زخمی، مبارک تجھکو یہ تازہ خلش
آج اُس کے ناوکِ مژگاں کا پیغام آگیا

گرم اب دم بھر میں ہوگی مجلسِ راز و نیاز
شمع کے ہمراہ پروانہ سرِ شام آگیا

گو کہ میں بیٹھا تھا وحشت بزم میں بیگانہ وار
اُس نگاہِ آشنا کا مجھکو پیغام آگیا

نجات

مصنفہ

جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، ممبر لیجسلیٹو کونسل صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ،
ایڈیٹر شمع

اے فرزند عزیز! 'خدا'، 'رُوح' اور 'الہام' کے پچھلے تین باب پڑھنے کے بعد تم نے مجھ سے پوچھنے کے لئے اپنے دل میں سوال قایم کیا ہوگا کہ "نیک آدمی کی زندگی کے کیا اصول ہیں؟" میں تم کو اس سوال کا جواب قرآن کریم کی آیت سے دوں گا "دُور کرو بُرائی کو نیکی کے ذریعہ سے" کیونکہ "نیکی بُرائی کو دُور کرتی ہی"۔ یہ نصیحت تم کو سب آسمانی کتابوں میں ملے گی۔ اور میں جب خُراسان کے جنگلوں میں سفر کر رہا تھا، ایک عیسائی راہب نے بھی کہا تھا "ہماری انجیل مقدس میں حکم ہی کہ بُرائی کو نہ روکو، بلکہ اُس پر نیکی کے ذریعہ سے غلبہ حاصل کرو"، کیونکہ ایک مُتبرّک بُزرگ کا قول ہے "تم بغیر جہاد کے شیطان پر فتح حاصل نہیں کرسکتے ہو"۔

مگر اے فرزند، خوب یاد رکھو 'شیطان' کوئی بیرونی ذات نہیں ہی جس سے مقابلہ کرسکو، بلکہ یہ نام ہی اُس بدعت کا جو ہماری فطرت میں موجود ہی، اور جو صرف تربیت، اور رُوح کی بالیدگی سے دُور ہوسکتی ہی۔

ہندوستان میں ایسے فقرا موجود ہیں جو فطری خواہشات زندگی، اور تحلیل جسم کی تعلیم کرتے ہیں، مگر یہ طریقہ غلط ہی، اور ایسے فقرا کا انجام بُرا ہوتا ہی، یہ بھی یاد رکھنا کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا دہلوی نے جن کی خدمت کی سعادت اس حقیر کو برسوں نصیب ہوئی ہی کبھی کسی ناسک طریق کی تعلیم با تربیت نہیں فرمائی،

اِس زبردست اخلاقی اصول کے تحت میں بہت سے عجیب وغریب واقعات بیان کرسکتا ہوں لیکن چونکہ آپ بیتی کا علم صحیح ہوتا ہی اس لئے میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرنے پر قناعت کروں گا۔

میرے عنفوان شباب کا زمانہ تھا، عمر کی بیسویں منزل گذر چکی تھی، طبیعت میں اُمنگیں تھیں، سینہ میں آرزوئیں تھیں، اور دل اُداس رہتا تھا، ہر قسم کی معصیتوں میں کشش تھی، اور دوزخ میں پہونچانے والی راحتوں کی خواہش رہتی تھی، مگر کوئی چیز مجھکو روکتی بھی تھی، اور میں جسقدر رُکتا تھا، اُسی قدر میری اُداسی بڑہتی تھی، اس کھینچ تان میں میری حالت قابل رحم ہوگئی!

احکام الٰہی کی پابندی نجات کا ذریعہ ہی، اور دُنیا کی خوشیاں شیطان کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتی ہیں، لیکن پابندئی شریعت اور خواہش گناہ کی کش مکش میں نہ راحت ہی نہ اطمینان، اس درمیانی حالت میں میرا دم گھٹتا اور میں خوف زدہ ہوکر کانپنے لگتا۔ جب میرے ہم عمر اور ہم صحبت دوست اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ذکر کرتے، میرے دل میں بھی بے اختیار لہر اُٹھتی، اور میں بھی چاہتا کہ اُن کی طرح عشق کی سختیاں اٹھاویں اور وصال کی لذتیں حاصل کروں، لیکن کوئی قوت..........!

جس واقعہ کو میں بیان کرنے والا ہوں اُس کا تعلق سنہ سے ہی اور میں ایک مہینہ سے دہلی میں مقیم تھا! چونکہ والد مرحوم (خدا اُن کو بخشے) گیلی کی جنگ میں شہید ہوچکے تھے، اُن کے بعد

اجودھیا کے دس گانوں، مرحوم کا قابل رشک خطاب "امیر" اور لشکر کی سرداری کا عہدہ، یہ سب ورثہ میں ملے۔ سلطان علاء الدین نے رنتھنبور کے معرکہ میں شریک ہونے کے لئے شاہی فرمان بھیجکر مجھکو مع میرے سپاہیوں کو دہلی میں طلب کرلیا تھا، فرمان کے پہونچتے ہی والدہ زار و قطار رونے لگیں، مگر میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، اُس وقت تک ایک مختصر سے قصبہ کی بے حس زندگی میں میری دنیا محدود تھی۔ پایۂ تخت کی آزاد اور پُر کیف زندگی میرے لئے ایک ایسا موضوع تھی۔ کہ میں بے اختیار اُسکی طرف کھنچ رہا تھا، وہاں وہ سب باتیں موجود تھیں جو روپیہ سے میسر آسکتی تھیں یا تقاضائے شباب بن سکتی تھیں، فرمان کے آتے ہی مجھے کامیابیوں کے خواب نظر آنے لگے، اور دل میں کہنے لگا اب وہ دن بھی قریب ہے جب میں خان اعظم ہو جاؤں گا۔ میرا بہت بڑا حرم ہوگا۔ بیشمار لونڈیاں، باندیاں ہونگیں، اور وطن کو واپس ہونے سے قبل میں دنیا کی مسرتوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہو جاؤں گا۔

لیکن دہلی پہنچکر معلوم ہوا کہ سلطان اعظم کے عہد میں فوجی سرداروں کو مطلق آرام نہ تھا، اُس زمانہ میں جو سختیاں ہوتی تھیں اُن کا اندازہ بھی نہیں ہوسکتا ہے، ادنی مثال یہ ہے کہ ناقابلیت کی سزا موت تھی! اور معمولی غلطی یا فرد گذاشت پر بڑے بڑے سردار تازیانہ کی سزا پاتے تھے، اور انسان کی زندگی محض بے حقیقت تھی، جہاں قواعد اور قانون کی ایسی قید و بند ہو وہاں بھلا میری بساط کیا تھی معمولی غلطی کی سزا میں شاید میری خاک بھی دنیا میں باقی نہ رہتی۔

پایۂ تخت کی یہ حالت دیکھکر میں سہم گیا، میرا معمول تھا کہ میں اپنے فرائض منصبی میں اس طرح منہمک رہتا جیسے کسی کے سر پر بھوت سوار ہو، اس لئے میری راتیں مختصر ہوتی تھیں، اور نیند کم آتی

تھی، مگر میرے قلب کے تسکین کا باعث ایک ہندو لڑکی تھی جسکی دید میرے لئے مرہم زخم جگر تھی، اُس کا باپ نصرت خان کے دفتر میں گماشتہ تھا، اور قوم کا کایستہ تھا، اور تیسری سے متصل میرے مکان کے پاس رہتا تھا، بدایون دروازہ کے سامنے قواعد ہوتی تھی، اُسمین شامل ہونیکے لئے مجھے علی الصباح اُٹھکر دیوانون کی طرح بھاگنا پڑتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ اُسی وقت وہ لڑکی بھی مندرسے لوٹتی، اور راستہ میں میری اُسکی مڈبھیڑ ہوجاتی، وہ پندرہ سال سے زیادہ عمر کی نہ تھی چال ڈھال مین نزاکت، بُشرے پر شادابی، اور قد مین انتہائی موزونیت تھی! مین نے اُس کی پیشانی پر کبھی شکن نہ دیکھی! گھونگروالے بالوں کی موٹی موٹی لٹیں اُس کے شانون پر صاف اور سفید لباس سے اُلجھکر بکھر جاتیں اور اُس کے گھرے ہوئے ہاتھ اُن کو سلجھا نہ سکتے۔ چونکہ اُس کے والدین بہت ہی کم استطاعت تھے، اس لئے اس کا زیور بھی سادہ اور ہلکا تھا، مگر وہ قانع تھی! خوش تھی! اور زندگی سے بیزار نہ تھی!! اس حالت سے جب وہ گنگناتی ہوئی لوٹتی تو نسیم سحر کے ہلکے جھونکے اُس کے رخساروں سے مس ہوکر گلابی جھلک پیدا کردیتے، وہ لچکدار، گداز، اور عریان بازو مجھے بہت پسند تھے، اُس کے ہاتھ شفاف اور قطعی بے نقص تھے، حالانکہ اُس کا نام دریافت کرنیکی خود اُس سے یا کسی اور سے مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی لیکن میں اُسے لچھی کہتا تھا۔ مجھے آنکھیں ملاکر دیکھتی اور ایک مرتبہ اُس نے راستہ میں ہٹ کر میرے گھوڑے کو نکلنے کا راستہ بھی دیا لیکن اس کے بعد پھر کبھی میری طرف متوجہ نہ ہوئی لیکن رفتہ رفتہ میری قوت احساس پر پوری طرح مسلط ہوگئی۔

مین دہلی سے وسیع اور بے رُوح شہر میں بالکل اکیلا تھا، فرائض کی زیادتی کے سبب سے

میری طبیعت خراب رہتی تھی بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کسی کو اپنا زخمی دل دکھاؤں، چنانچہ ایک دن تو مین نے ارادہ کر لیا تھا کہ کل اسکو روک کر کھڑا ہو جاؤن گا اور کہوں گا کہ "تو میری چھوٹی بہن ہے" لیکن اس ارادہ کو استقلال کی صبح دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ کیونکہ میری معصوم محبّت کو فوراً غلط معنون مین لیا جاتا، نصرت خان تک بات پہنچتی اور وہ سزا ئے تازیانہ جس سے بڑے بڑے سردار لرزتے تھے، مجھے بھی بھگتنی پڑتی۔

کرم سنگھ کایستھ، نیک اور ایماندار پرانا فوجی ملازم تھا جب کبھی مجھے کسی کام سے اُس کے پاس دفتر میں جانے کا اتفاق ہوتا وہ بہت خوش ہوتا۔ اور ہمسایہ کی طرح خاطر مدارات کرتا۔ مین اکثر اس خیال سے شرمندہ ہوتا کہ اگر راز افشا ہو گیا تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گا۔

ایک رات مجھی نیند نہ آتی تھی، اور لحظہ بہ لحظہ بیقراری بڑھ رہی تھی۔ کہ اتنے میں کسی نے دروازہ پر دستک دی، ہرکارہ کارندہ کا خط لایا تھا جسمیں میری والدہ کا دفعتاً انتقال ہو جانے کی اطلاع تھی، بے اختیار منہ سے نکل گیا "سفّاک تقدیر! کہاں لاکر پیر توڑے ہیں!" اور دل پر جو صدمہ گذرا وہ بیان سے باہر ہے۔ مین طوعاً وکرہاً فرائض منصبی میں منہمک رہا لیکن اب سوائے لچھمی کے دُنیا مین میرا کوئی نہ تھا۔

کشتی شکستگان کی طرح جو قریب کے بہتے ہوئے تختون سے بے اختیار لپٹ جاتے ہیں۔ مین نے بھی لچھمی کے خیال کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا، اور ایک لمحہ کے لئے بھی اُسکو جُدا نہ ہونے دیا، اکثر میرے منہ سے نکل جاتا "لچھمی میری بہن"۔ یہ الفاظ اکثر زیر لب ادا ہوتے، اور مجھے شرمندہ ہونا پڑتا اور اس خواب معصومیت سے چونک کر ممکن الوقوع اور دل پسند تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا یعنی

عالم خیال میں اُسکو اپنی بیوی سمجھتا، وہ دراز قد، بلند وبالا، اور نہایت حسین اور دل کش نظر آتی، بازؤن میں اب بھی وہی لوچ اور نرمی تھی، گیسوؤں میں وہی پیچ وخم تھے، اور گالوں پر وہی سُرخی کی ہلکی جھلک تھی، اِسی تصویر کی دنیا میں اُسکی عمر کا بھی فیصلہ ہوجاتا تھا یعنی چشم زدن میں اُس کی معصومیت، شباب کے الڑھ پن میں تبدیل ہوجاتی، اور وہ ایک شگفتہ پھول معلوم ہوتی، جو پہلے کلی کی صورت تھی مگر اب اُس میں شباب کا رنگ خوب گہرا تھا، اور مادریت کی راحت بخش خوشبو چارون طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اسکی گود میں ہنستے بولتے خوبصورت بچے ہوتے، میری آنکھون سے آنسو جاری ہوتے اور فرط تشکر میں کہ اُس نے مجھے بچالیا، میں اپنے آپکو بے اختیار اُس کے پیر پکڑے ہوئے دیکھتا! مگر میں فوراً ہی اپنے دل سے سوال کرتا کہ" اپنا اثر ڈال کر۔ مجھے کس سے بچالیا؟"

تصوّرات میرے کام میں حارج نہوتے، بلکہ مجھے اپنی تن دہی، اور بڑھتی ہوئی قوت پر خود تعجب ہونے لگا، اورون کا تو قطعی خیال تھا کہ مجھ پر جنّات کا اثر ہے، اور یہ خیال کچھ غلط نہ تھا میں کبھی کوئی کام نہ بھولتا، اور کیسا ہی کام کیون نہ ہو لیکن اُس کے کرنے کے لئے میرے پاس ہمیشہ وقت تھا، میرے ساتھی جانتے تھے کہ میں ماتحتون سے اپنے حکم کی تعمیل کرانا جانتا تھا، اور یہان، وہان، اور ہر جگہہ موجود رہتا تھا، دن مین کئی کئی گھوڑے تھک جاتے، اور جس وقت فوج کے قریب ہو کر گذرتا، سپاہیون پر موت کا سنّاٹا آجاتا، جھڑکنا، مارنا اور دُرّون کی سزا دینا، میرے معمولی احکام تھے، سپاہی جانتے تھے کہ مجھے دھوکہ دیدینا آسان کام نہ تھا، لیکن وہی میں تھا کہ زیادہ رات گئے گھر میں داخل ہو کر بے بس بچّہ کی طرح لرزہ بر اندام ہوجاتا! جبر کرکے چند لقمے کھاتا، کوٹھری مین مغموم اور بے چین ٹہلتا، یا کھڑکی سے باہر دُور تک پھیلی ہوئی تاریکی کا نظارہ کیا کرتا!

دُور، داہنے ہاتھ کی طرف روشنی میں جگمگاتا ہوا شاہی محل تھا، اور شہر سے ہر قسم کی مخلوط، ہلکی، اور دھیمی آوازیں

کان میں آتیں، جو سمجھ سے تو باہر ہوتیں لیکن اُن شادمانیوں کے پیغام کی حامل ہوتیں، جو شب کی گہرائی کے ساتھ اپنی دسعتوں کو پھیلا رہی تھیں، تاریکی میں کچھی کا گھر سیاہ نظر آتا، اور میں اُسکی تازگی بخش نیند پر رشک کرتا جس سے وہ صبح کے وقت ترنم ریز مسرت کے ساتھ بیدار ہوا کرتی تھی۔

ہر چند کوشش کرتا، مگر پلک سے پلک نہ ملتی، اور تھکی ہوئی گرم گرم آنکھوں کے سامنے ایک ننھا سا، خاموش صورت آجاتی جسکو چاہ زنخدان کی لطافت نے دل فریب اور مغرور بنا دیا تھا، یا میرے پیش نظر وہ نصف عریاں سینہ ہوتا جو شفاف اور باریک کھال کے اندر ہلکے ہلکے سانس لے رہا تھا

دل کا عجیب عالم ہو جاتا! کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ اس سینہ میں خنجر بھونک دوں یا اُسکو چھاتی سے لگا لوں!

اختلاجی کیفیت پیدا ہو کر میرے ہوش و حواس بجا نہ رہتے، لحاف کے اندر پسینہ چھوٹ نکلتا، اور چھوٹے اور بے بس بچوں کی طرح "کچھی! کچھی!" پکارنے لگتا، اور پھر باور بھی کر لیتا کہ وہ خود دبے پاؤں کمرے میں آگئی ہے، میرا سر اُس کے زانو پر ہے، اور اپنی معصوم اور مسرور نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی ہے، ایک مرتبہ تو میں نے اپنے کانوں سے اُسکو یہ کہتے سُنا "گھبراؤ نہیں! میں تم کو نجات دلواؤنگی"......... غرضکہ اسی طرح رات کے بعد رات آتی تھی، اور گذر جاتی تھی، میرے لبوں پر قرآن شریف کی آیتیں جاری ہو جاتیں، اور میں چند لمحوں کے لئے سونے کے بجائے غافل ہو جاتا!

۲

فوجی معائنہ کا دن آگیا تمام رات نیند نہ آئی تھی مگر میں صبح کو تازہ دم اُٹھا، قلب مطمئن، اور طبیعت تسکین تھی میں نے اپنی فوج کو محنت کے ساتھ تیار کیا تھا اور جب معائنہ کا وقت آیا تو اُس نے

عیسر جہمس

میری توقعات کو غلط ثابت نہ کیا، سلطان کی جھکی ہوئی ابروؤں سے دبی ہوئی واقفکار آنکھوں نے میری فوج کو جب وہ پاس سے گذری، بہ غور دیکھا، اور دیر تک اُسکی طرف متوجہ رہی، آنکھوں کی چمک سی معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوج کی معمولی معمولی باتوں کو بھی ذہن میں رکھتے جا رہے تھے، با چھوں پہ خفیف مُسکراہٹ نمایان ہوئی، گھنی داڑھی کو بھی یوں ہی سی جنبش ہوئی، اور اُنھوں نے نصرت خان کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"او وہ میں ایک قابل سردار تو ہی" اور پھر بلند آواز سے میرا نام پوچھا کہ اہل دربار بھی سُن سکیں میں سنے فوراً بڑھ کر تخت سُلطانی کو بوسہ دیا اور عرض کیا "جہان پناہ۔ غلام کو ظہیر الدین کہتے ہیں" سلطان نے آہستہ میرا نام دُہرایا، اور پوچھا "اس کے باپ کا کیا نام ہی؟"

نصرت خان نے جواب دیا "امیر حسام الدین" جہاں پناہ کو یاد ہوگا، دیوگیری کے معرکہ کو اُسی نے سنبھالا تھا، اور ظفر خان کے ساتھ کیلی میں شہید ہوا تھا"

سلطان نے ایک لمحہ کے لئے سر جھکالیا، سیدھے ہاتھ کی ہتیلی پیشانی پر پھیری، اور فرمانے لگے۔

"ہان! مجھے اُسکی ہر بات یاد ہی" یہ کہکر وہ آداب درباری کے خلاف، یکایک تخت سے اُتر آئے، چہرہ پر مسرت کا اظہار تھا، مجھکو اپنی طرف کھینچ کر ارشاد ہوا "تمھارا باپ میرا ساتھی تھا، میرا اُستاد تھا! مدتیں گذرین جب میری گردش کا زمانہ تھا، امیر حسام الدین کی امداد اور اُسکی نصیحت نے میری جان بچائی، اور آج تم اُس کے بیٹے بہترین فوج لیکر شاہی افواج کی امداد کے لئے حاضر آئے ہو" میری پیشانی پر بوسہ دیا، مجھے سینہ سے لگایا، اور اُس پُرجوش، اور متوسط طبقہ کے لئے مخصوص، طریق اظہار محبت سے جس کے آگے وہ رسوم و قواعدِ دربار، اور آداب تخت جس پر وہ حال میں بیٹھا تھا، اکثر فراموش کر دیتی تھی فرمایا "میرے بچے! میرے بیٹے! تم نے اپنے فرائض کو حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ ادا کیا ہے،

تعجب ہوتا ہے کہ آج کا میدان، لشکر کے بوڑھے اور تجربہ کار سرداروں کی موجودگی میں ایک سبزہ آغاز کے ہاتھ آیا" اور پھر بہت بلند اور باٹ دار آواز میں جسکی گونج سے شامیانہ بھی ہل گیا۔ اور جو ہزار ستون محل کی اخیر فصیلوں تک جاکر ٹکرائی کُل دربار کو معزز اور مفتخر کرنے کے لئے فرمایا" اعلیٰ انتظام اور سپاہیوں کو باقاعدہ تربیت دینے کے صلہ میں امیر ظہیر الدین کو "ملک" کے مرتبہ پر فائیض کرتا ہوں، اور نئے مرتبہ کے مطابق اعزاز اور منصب سے بھی سرفراز کرتا ہوں۔"

دربار میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، نصرت خان کے سخت چہرہ پر پہلے نرمی اور پھر مسکراہٹ کے آثار نظر آنے لگے لیکن اُسکی صورت سے نہ اظہار تشکر، اور نہ رفیقانہ مسرت ظاہر ہوتی تھی، صرف اطلاع یابی کا البتہ پتہ چلتا تھا، سلطان ابھی تک مجھ سے ہی مخاطب رہے، اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھکر میرے چہرہ کو بغور دیکھا، اور فرمانے لگے "صاحبزادے! جسم کو نہ بگاڑنا، اور بُرے خیالات سے دُور رہنا۔ دُنیا میں آدمی جو چاہے سو کرے لیکن بُرے خیالات کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دے مجھکو یہ نصیحت تمھارے باپ کی تھی، میرا فرض ہے کہ تم تک پہونچا دوں، کیونکہ تم اُس کے بیٹے ہو، اور اُس نصیحت کے مستحق ہو"

بعد کو دربار کی رسمی کارروائیاں ہوتی رہیں جن سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی، سلطان نے مجھے اس عظیم الشان موقع کا ہیرو بنا دیا تھا اور اپنے ساتھیوں کے چہروں پر رشک اور غصہ کے آثار دیکھکر میرا دل خوش ہو رہا تھا۔

دربار برخاست ہوا، میں بھی گھر جانے کو اُٹھنے لگا تو کسی نے کمر میں باہیں ڈالدیں، مُڑکر دیکھا تو وہ معز الدین تھا، اس کا وطن دوآب تھا، اور نو عمر، گٹھے ہوئے بدن مگر خبیث صورت کا امیر تھا، کہنے لگا "معائنہ ختم ہوا،

محاربہ میں ابھی ایک مہینہ باقی ہے، یہی زمانہ عیش اور تفریح کا ہے، سہ پہر کو میرے یہاں مخصوص احباب کا جلسہ ہے، ایرانی سوداگر بہترین اقسام کی شرابیں لایا ہے، دہلی کی تمام طوائفیں آئینگی، زیب النسا بھی آئیگی۔ اُس کا مجرا بہت قیمتی ہوتا ہے۔ مگر میں نے اُس کو بھی بلایا ہے"

شہنشاہ کی نصیحتیں ابھی میرے کانوں میں گونج رہی تھیں جی نہ چاہتا تھا کہ جلسہ کی شرکت قبول کروں مگر اُس نے کچھ ایسے فریبانہ انداز میں مجبور کیا اور کہا "زیب النساء کے ارشاد کے بموجب میں آپکو مدعو کرتا ہوں، وہ کسی خاص معاملہ میں آپ سے معافی مانگنے کی آرزومند ہیں، کہیں ایسا غضب نہ ہو کہ آپ اُنکی درخواست کو مُسترد کردیں"۔ بمجبوراً مجھے اقرار کرنا پڑا، اور یہ کہکر" بہت اچھا، حاضر ہونگا" میں نے اپنا پیچھا چھڑایا،

معزالدین کا جلسہ دوپہر کو شروع ہوا، نئے امیروں کی طرح اس موقع پر دولت اور امارت کا دل کھول کر اظہار کیا گیا تھا، مہمانوں کے سامنے شراب کے سُرخ جام، اور چاندی کے ورق لگے پانوں کے خاصدان چُنے ہوئے تھے، کمرہ عطر اور خوشبو سے مہک رہا تھا میرے پہونچتے ہی مہمانوں میں کھلبلی سی مچ گئی کیونکہ اُس مجمع میں میں ہی ملک تھا،

حاضرین نے طوعاً وکرہاً راستہ دیا میں اُنکی صفونکو چیرتا ہوا نکل گیا اور صدر نشست پر گاؤ تکیہ کے سہارے جا بیٹھا، تفریح اور دلچسپیوں کا سامان وافر تھا، اور دیر تک قایم رہنے کے سب انداز تھے،

پہلے بیس بائیس نوجوان عورتوں نے جو حُسن کے اعتبار سے "ایک سے بہتر دوسری" کے مصداق تھیں، ملکر ہندی گیت گائے، پھر ایک بوڑھی عورت نے جس کے چہرے پر جُھریاں تھیں، راگ اور راگنیوں کے ہنر دکھائے، وہ مشہور گانیوالی تھی اور اپنے فن میں کامل تھی لیکن شباب اور حیات کی یادگار اب صرف اُسکی آواز تھی، جو حقیقت میں قابلِ تعریف تھی، مگر عورتوں سے زیادہ مجھے موسیقی سے لگاؤ تھا۔

یکے بعد دیگرے کئی طائفے آئے، کچھ تو کئی کئی ملکر ایک ساتھ ناچے، اور کچھ علحدہ علحدہ، سامعین نے معز الدین کے حسن انتخاب کی دل کھول کر داد دی، اور اس میں شک نہیں کہ اُس نے موقع کو "جنت نگاہ، اور فردوس گوش" بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا "خط ثانی" کا اس سے بہتر اور کامیاب طریقہ بظاہر بہت دشوار تھا مگر میرے خیالات موعودہ آخری قسط کی طرف لگے ہوئے تھے، ہر گانیوالی کے کمال کا اندازہ میں اُس خراج تحسین سے کرتا تھا جو سامعین سے اُسکو ملتی تھی، اور وقت مناسب پر میں اُسکو ایک طلائی تنکہ بطور انعام کے دیتا تھا، یہ سلسلہ دیر تک قایم رہا، اور میں اُکتا اُکتا گیا کہ "آخر اُس کے آنے کا بھی کوئی وقت معین ہے؟ اور وہ بھی کبھی سامنے آئیگی؟"

خدا خدا کر کے یہ سلسلہ ختم ہوا، اور زرد ریشم کی چادر اوڑھے ہوئے زیب النساء نظر آئی، کمرے کے دروازہ پر ہی اُس نے مجھکو قاعدہ کے مطابق جھک کر سلام کیا، اور میں نے گردن کے اشارے سے بیٹھنے کی اجازت دی، اُسکی تمام حرکتیں رُکی، اور جچی تُلی تھیں میرے سامنے بیٹھکر اُس نے گانا شروع کیا۔ اُسکی نگاہیں نیچی تھیں، آواز میں قوت نہ تھی، اور رخسار کے چاہ ذقن منہ بند کلیوں کی طرح سمٹے ہوئے تھے، وہ کچھ شرمائی ہوئی، اور بدن چُرائے بیٹھی رہی، اور ایک عرصہ کے بعد یہ رسمی گانا ختم ہوا، میں نے طلائی تنکہ کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا، خالی تھی، تھوڑی سی خفت محسوس ہوئی، مگر طبیعت کی تیزی کام آگئی اور مجھے ایسے فعل کا مرتکب ہونا پڑا جسکا بعد کو سخت افسوس ہوا، میری دستارچہ دھانہ کی تہ میں ایک بڑا ہیرا بندھا ہوا تھا، جو والد مرحوم دیوگیری سے لائے تھے اور والدہ مرحومہ نے یہ کہکر مجھے دیا تھا کہ "بُرے وقت میں کام آئے گا۔" اُس کو دستارچہ سے نکالتے وقت میرا ہاتھ کانپنے لگا،......... مگر آن واحد میں وہ درخشندہ ستارہ زیب النساء کی ہتیلی پر چمک رہا تھا،

اِس واقعہ کے بعد زیب النساء بے تکلف ہوگئی، اس میں ایک نئی رُوح حلول کر گئی، چاہِ ذقن کے پھیلے ہوئے پھول سمٹ کر کلیاں بن گئے، رُخساروں پر سُرخی دوڑنے لگی، اور چہرے کا اُکھڑا اُکھڑا پن یک لخت مٹ گیا، چہرہ کی گلابی رنگت کو ناواقف تو دوشیزگی کے حجاب پر محمول کرتے!

اب وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، چادر علٰحدہ کر دی، اور گانا شروع ہوا، ریشمی کُرتی کے اندر اُس کا شفاف سینہ چمک رہا تھا، نغمہ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کو بھی حرکت ہوتی تھی، دونوں ہاتھ، گداز، ہوسناک، اور طبیعت کو بے قابو کر دینے والے تھے، سامعین نے ایک زبان ہو کر کہا کہ "زیب النساء کا اس سے بہتر گانا کبھی سُننے میں نہ آیا تھا" معزّ الدین نے ہیرے پر آنکھیں جما کر کہا "ایسا تحفہ تو علّت سے خالی نہیں"۔

زیب النساء ایسے انداز سے مُسکرائی جسکے صاف معنی تھے کہ "بیشک! مگر کسی کا اجارا؟" اب زیب النساء نے مُڑ کر سامعین کی طرف توجہ کی اور پورے حلقہ کو محظوظ کر کے، اُسی قاعدہ کے ساتھ مجھکو مُجرا کیا، اور رُخصت ہوگئی۔

جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا، مہمان معزّ الدین کا شکریہ ادا کر کے رُخصت ہونے لگے، مگر میرا دل اُٹھنے کو نہ چاہا! "کیا یہی خاتمہ ہے؟ ہیرا دیکر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا؟" میں اسی خیال میں تھا کہ خود معزّ الدین نے آگے بڑھکر میری دلجمعی کر دی "زیب النساء منتظر ہے، تم ابھی نہیں جانے پاؤ گے"۔

تخلیہ کے بعد زیب النساء کمرہ میں داخل ہوئی، ابھی تک پشواز پہنے ہوئے تھی، ایک ہاتھ میں ہیرا، اور دوسرے میں شراب کا جام تھا! بڑے مخملی تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی، اور بے تکلّف ہو کر کہنے لگی "ظہیر! ادھر آؤ، اور وعدہ کرو کہ آج پہلا جام میرے ہاتھوں سے پیو گے؟" معزّ الدین نے بات کاٹ کر کہا "ظہیر کو، شراب پینا، گالیاں دینا، یا اور اسی قسم کی شرفاء کی باتیں نہیں آتی ہیں، یہ باتیں ایک نئے خطاب یافتہ مَلِک کی شان کے

خلاف ہیں۔ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ آپ نے ایک تصویر سے ہم کلامی کا شرف حاصل کیا تھا۔ وہ رشتہ میں نہ آپکی بہن ہوتی تھی اور نہ ماں! لیکن یہ ابتدا وہی ایسے بھدّے پن سے کی، کہ اس نے آپکو گھر سے نکلوا دیا۔"

مجھے یکایک غصّہ آگیا، اور میں نے کہا "مجھے بھی آپ نے بُزدل سمجھ رکھا ہے! اگر شک ہے تو میں ابھی اور یہیں اپنی دلیری کے نشان تمھارے بدن پر بنا سکتا ہوں"۔

معزالدین "اِس کا علم تو خدا کو ہے کہ تم بہادر ہو یا بُزدل، مگر ہو سخت احمق"۔

زیب النساء نے مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا، اور میرے ہونٹوں سے جام لگانا چاہا، مگر میں نے منظور نہ کیا، زہرہ نے معزالدین کو یہ کہکر ہٹا دیا "تمھاری وجہ سے شرماتے ہیں، تخلیہ کی ضرورت ہے، جاؤ، اور اپنی جورو سے جس کے تم غلام ہو، میرا سلام کہنا، اور پان بنوا کر لیتے آنا"۔

معزالدین کے جانے کے بعد کہنے لگی "بس آنکھیں بند کر کے ایک گھونٹ ہی پی لو"۔ مجھے یہ تحکمانہ لہجہ کچھ ناگوار سا گذرا، مگر تعمیل حکم کرنی پڑی، اور جب آنکھیں کھولیں تو وہ میرے سامنے ایسے انداز سے لیٹی ہوئی تھی گویا اپنے آپکو قطعاً میری مرضی کے حوالہ کر چکی ہے۔ پیشواز اُس کے زانو سے اوپر تک سرکی ہوئی تھی، سینہ بالکل کُھلا ہوا تھا، اور نیم باز ادر التفات آمیز نظروں سے میری طرف بے محابہ دیکھ رہی تھی، دھیمی آواز میں کہنے لگی "جلدی کرو، اتنا وقت نہیں ہے، .... وہ آجائے گا"۔

میرے اعضا یکایک سُن پڑ گئے۔ اور میں کئی لمحہ تک بُت بنا ہوا اُسکی طرف دیکھتا رہا، دفعتاً جی میں آیا، وہیں خنجر بھونک کر اس کا خاتمہ کردوں، مگر اس نے میری شرر فشاں نگاہوں کے جواب میں ایسی نظر سے دیکھا جس میں بے اختیار بغلگیر ہو کر آسودہ ہونیکی آرزو بھری ہوئی تھی، اُسے جمائیاں آرہی تھیں سینہ

کو اُبھار کر، اور مجھ پر انتہائی حریصانہ نظر ڈال کر متبسم لبوں سے مُصر ہونے لگی،

میری انسانی فطرت کے لئے یہ معاملات ناقابلِ برداشت تھے، بے خود ہو کر درندے کی طرح جھپٹا، اور اُسکو گود مین اٹھا کر، پوری طاقت سے سینہ سے چمٹا لیا، وہ تاب نہ لاکر چیخ اٹھی، اور خوشامدین کرنے لگی" ارے یہان نہیں! یہان نہیں، دیکھو وہ آجائے گا" مگر مجھے صبر کہان تھا؟ اُسی وقت مین نے اُس سے پوچھا" تو پھر کب؟" "آج شب کو، کھانے کے بعد اپنے گھر مین بالکل تنہا ہونگی" اس جواب پر بھی مجھے صبر نہ آیا اور مین نے گرفت چھوڑنے سے قبل کہا" بہتر، لیکن میں پھر چومونگا" اُس نے اپنے رخسار، جن میں چاہ زنخداں کی کلیاں بکھر رہی تھیں محض بے حس، اور بے کیف ہو کر میری طرف بڑھا دئے۔

تھوڑی دیر میں معز الدین کے پیر کی آہٹ معلوم ہوئی، ہم سنبھل کر بیٹھ گئے، اور پھر جو سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ وہ کچھ دلچسپ نہ تھا، ایک نے ایک کو اس قدر شراب پلا دی تھی، کہ عقل کی باتین کرنے سے ہم تینون قطعی عاری تھے۔



۳

شام ختم ہوتے ہی میری طبیعت میں اضطراب اور بے چینی بڑھنی شروع ہوئی، بار بار خیال آتا تھا" جاؤن یا نہ جاؤن"، (تمام عمر میں پہلی مرتبہ شراب کے جام میرے ہونٹون سے لگے تھے، اور میں ایک عورت سے بغلگیر ہوا تھا، ان باتون سے مجھے روحانی تکلیف تھی اور زیب النساء کی طرف سے میرے دل میں خوف بھی تھا، میں اس کو نجس اور ناپاک عورت سمجھتا تھا، اور اُس سے بچنا بھی چاہتا تھا) مگر جوش کامیابی کا بھوت میرے سر پر سوار تھا، جو مجبور کر رہا تھا کہ اُسے اپنے ہاتھون سے نکلنے نہ دوں،

زیب النساء جس پیشہ کی عورت تھی دُنیا جانتی تھی معز الدین کیقباد کے عہد میں وہ پہلی پہل آئی، اور آتے ہی بدنصیب شہنشاہ کو قابو میں لے لیا معز الدین کیقباد کی مختصر اور پُر حسرت حکومت کے خاتمہ پر دس برس تک اس نے "ہر شبے در پہلوئے دگرے" پر کھُلے خزانہ عمل کیا، ملک کے ہر مشہور رند بد سے اس کا راز و نیاز کا واسطہ تھا، یہانتک کہ سلطان علاء الدین سا سُلجھا ہوا بادشاہ بھی کچھ دنوں تک اس کے دام تذویر میں گرفتار رہا لیکن اُس نے بہت جلد ثابت کردیا کہ وہ عاشق سے زیادہ کامیاب جلّاد تھا، علاء الدین نے اس کو اپنے محل میں داخل کرکے اپنا پابند کرلیا تھا، اور اُس کے جملہ تعلقات کو منقطع کردیا تھا لیکن اہل محل کے استعجاب اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ ایک ہاتھ میں چابک اور دوسرے ہاتھ سے اُس کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا، زینہ سے نیچے تک کوڑے مارتا ہوا اُترا صحن میں کوڑے لگائے، وہ چیختی رہی منتیں کرتی رہی، اور خون بہتا رہا، مگر محل کے پھاٹک پر کوڑوں کی آخیر قسط ادا کی گئی اور سخت گالیاں دیکر اس حکم کے ساتھ نکالدی گئی کہ وہ شہنشاہِ معظم کو آیندہ اپنی صورت نہ دکھائے،

اس واقعہ کے بعد شہنشاہ کی ہر دل عزیزی میں ترقی پیدا ہوگئی، اگرچہ کوڑے لگانے کی اصلی وجہ کبھی معلوم نہ ہوئی، زیب النساء نے شہنشاہ تک پہونچنے کی بہت کوششیں کیں مگر بیکار ثابت ہوئیں۔

شہنشاہ معظم ایسے نہ تھے جو صرف ایک عورت کے ساتھ اپنی عمر گذار دیتے۔

"جاؤں یا نہ جاؤں؟" - یہ الفاظ تھے جو میرے دماغ میں چکّر کھا رہے تھے، مجھے جینی جوگی کے الفاظ یاد آگئے جو دہلی جاتے وقت راستہ میں ملا تھا، "ہر برائی کی جڑ نفرت ہی! مرد جب مرد سے نفرت کرتا ہی تو اس لئے اُسکی جان لیتا ہی کہ اُس پر قبضہ کرسکے لیکن جب عورت سے نفرت کرتا ہی تو یہ آلودگی اور بھی بُری صورت اختیار کرلیتی ہے کیونکہ وہ چاہتا ہی کہ وہ عورت کی زندگی میں اُس کے جسم پر قبضہ حاصل کرلے - یہی ابتدا ہی ہماری دو بدترین

بدعتوں کی، حالانکہ جن سے مجھے حقیقی محبت ہے وہ میری ماں اور بہن ہیں"۔

واقعی مجھے زہرہ (زیب النساء) سے سخت نفرت تھی، اور یہی جوش نفرت مجھکو مات کر رہا تھا، اگر نفرت نہ تھی تو کیا بات تھی کہ مجھے مشکل سے پائے تخت میں تین دن گذرے تھے کہ محض اتفاق سے ایک مشہور رقاصہ سے دوچار ہوا شہنشاہی کوڑوں کی مارسے جس کا نام، زبان زدِ خلائق تھا، اور ہر شخص جانتا تھا کہ ہرکس وناکس کے لئے اُس کا دروازہ کھلا رہتا ہے لیکن میری حماقت کی کوئی انتہا تھی کہ باوجود ان تمام باتوں کے میں اُنھیں خوش نصیب "ہرکس وناکس" کے زمرہ میں شامل ہونے کے درپے تھا، یہ میرا لڑکپن تھا! [redacted]

وقت معیّنہ پر میں اُس کے دروازہ پر موجود تھا، دیر تک انتظار کرنے کے بعد ملازم نے آکر عذر کر دیا کہ وہ گھر میں موجود نہ تھی میں نے مطلق پرواہ نہ کی، اور پھر آواز دی، اس مرتبہ وہ خود نکل آئی، اور غضبناک ہوکر کہنے لگی "میں اسقدر ذلیل نہیں ہوں کہ باہر کا ہر سپاہی میرے گھر کو گھوڑا سمجھکر چڑھتا چلا آئے"۔ جواب میں ایک حرف بھی میری زبان سے نہ نکلا، غصہ کی حالت میں وہ نہایت حسین معلوم ہوتی تھی، چاہ زنخدان، اور نصف عُریاں سینہ کو دیکھکر پھر جوش طبیعت نے بیتاب کر دیا، اور بمشکل تمام ضبط کر سکا، ورنہ اُسی وقت اُس کو گود میں اٹھاکر اپنی خواہش اور اپنے غصہ کو رفع کرتا۔

اس واقعہ کی یاد نے مجھے میرے کمرے میں چین نہ لینے دیا، گھر کی تنہائی سے طبیعت کی وحشت بڑھتی تھی اور میں پھر سوچ رہا تھا "جاؤں یا نہ جاؤں" کمرے سے باہر نکل کر سڑک پر آیا میرے قدم بلا ارادہ اُس کے مکان کی طرف اُٹھنے لگے، اور میں اسی سوچ میں آگے بڑھتا رہا، زیب النساء کا منظورِ نظر عاشق ہونا واقعی بڑی بات تھی!

اتنے میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زیب النساء سامنے سے چلی آرہی ہے! سخت حیرت ہوئی! کیا اُسے معلوم تھا، کہ میں کس افسوسناک غرض کو لیکر مکان سے نکلا تھا؟ جب وہ سامنے آگئی تو ٹھٹکی، شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی

تھی، مگر نہیں! یہ محض میری نظر کا دھوکا تھا، میں اسی رفتار سے چلتا رہا، اور زہرہ کے مکان پر پہونچتے ہی پھاٹک میں داخل ہوگیا، اُس کی خوشی کا اندازہ لگانا بیان سے باہر ہے، مجھے بے اختیار اُسی جینی کے الفاظ یاد آگئے "محبت قدم کی روشنی ہے، شب کو پُرلطف نیند، اور صبح کو تازگی بخشتی ہے، اس کو دوسرے دن کی پرواہ نہیں، ہمیشہ خوش اور مترنم رہتی ہے! برخلاف اس کے، نفرت اُس شے کی تمنا کرتی ہے جو کبھی حاصل نہیں ہوسکتی، وہ ہمیشہ متفکر اور متردد رہتی ہے،

اُسکی آنکھیں خونچکاں، اور بے نور، زبان خشک دانت تیز، اور نوکدار ہوجاتے ہیں، اور ہونٹ، خوف سے اور نفرت کے جوش میں کانپا کرتے ہیں، جسم زار، سہم سہم کر، اور لرز لرز کر دل کی رفتار کو تیز کردیتا ہے، اور اُسی کے ساتھ قبل از وقت فنا ہوجاتا ہے، لیکن عاشق صادق مسکراتا ہوا موت سے بغل گیر ہوتا ہے، کمر جھک جانے پر بھی اس کو شکایت نہیں ہوتی۔ جو لوگ محض جسم (گوشت) کو قایم رکھنے کے لئے زندہ رہتے ہیں اُن کو جسم اور رُوح کی جدائی شاق گذرتی ہے"۔ جوگی کے الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں بیٹھ گئے، مگر میں زیب النساء کے مکان تک پہونچ چکا تھا! دستک دیکر اندر چلا گیا۔ کمرہ کی آراستگی اور سجاوٹ قابل تعریف تھی، ہندوستان کے ہر مفتوح صوبہ نے اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے اسکی زیبائش میں حصہ لیا تھا، نفیس اور خوش ذایقہ کھانا کھانے کے بعد ایرانی شراب کا دور شروع ہوا، زیب النساء خاموش اور اپنے خیالات میں محو تھی، پہلا جام پی کر دو ایک باتیں کیں، طرز گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت مصیبت میں گرفتار ہے، میں نے پوچھا مجھے پہلی مرتبہ مکان میں داخل ہونے سے کیوں روکا گیا تھا؟ جواب دیا" اس وجہ سے کہ اس وقت تک آپکی اصلی خوبی مجھے معلوم نہ تھی، مجھے کیا علم تھا کہ تم وہ ہوجاؤ گے جو اس وقت ہو"۔ جواب سے میرا ملال خاطر رفع نہ ہوا، اور جانبین کی خاموشی سے کچھ بے لطفی پیدا ہوگئی، مگر اُس نے خود ہی مُہر سکوت کو

توڑ کر کہا" خاموشی سے کیا حاصل! جام کی طرف توجہ فرمائیے"۔ مین نے اپنا بازو اُسکی کمر میں ڈال دیا، اور اُس نے چھلکتا ہوا ساغر میرے ہونٹون سے لگا دیا، اخر میں کہنے لگی" اخراجات کی زیادتی نے پریشان بنا رکھا ہی، میری حالت بہت نازک ہو گئی ہی، اور اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تو تم میری امداد کرو"

مین نے پوچھا" کیا امداد کرون؟"

جواب مین اُس نے ایک لمبا چوڑا دفتر، ماماؤن، پنساریون، اور قصابون کی شکایت مین بیان کر ڈالا، اور یہ بھی کہا کہ آئے دن، لباس میں جدید اختراعات ہوتے ہین، مجھے مجبوراً مُصرفانہ طرز زندگی اختیار کرنی پڑتی ہی، پندرہ سو طلائی ٹنکے سالانہ سے میری گذر ہو سکتی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ اس رقم کی کفالت آپ کیا کریں؟ میں وعدہ کرتی ہون کہ کبھی آپکے حکم سے باہر نہ ہونگی، اور کبھی کسی غیر کی صورت نہ دیکھونگی"۔

قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دیسکون، مین نے محسوس کیا کہ وہ میری آنکھون مین میرے جواب کو ڈھونڈھ رہی تھی،

زہرہ کا مطالبہ، میری کُل جاگیر اور املاک کی آمدنی کے برابر تھا، اُسکو دے ڈالتا تو میرے گذارے کو صرف تنخواہ بچتی تھی لیکن اس وقت تو میری ضرورت نکل رہی تھی اور اُسکی صحبت سے دل مسرور تھا اور انکار کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا، میں نے بھی دل میں فیصلہ کر کے، کہ یہ فرمائش میرے امکان سے باہر ہے بخوشی اقرار کر لیا، اور کہدیا" مجھے سب کچھ منظور ہی بشرطیکہ تم میری ہو جاؤ"۔ اُس نے اپنے رُخسار میرے کندھے پر رکھدئے اور کہنے لگی" اگر میں تمھاری حیثیت کے مطابق نہ رہونگی تو لوگ انگشت نما ہونگے جس پیمانہ پر انسان اپنے معشوق کے اخراجات کا بار اٹھاتا ہی، اس پیمانہ پر دنیا میں اُسکی امارت کی شان، قایم ہوتی ہی"۔

غرضکہ اسی طرح ہنسی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں، اور ساغر کے دَور چلتے رہی، یہانتک کہ میں اس قابل بھی

نہ رہا کہ بیٹھ سکوں، یہ کہکر کہ اب تو سونے کا وقت ہے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اور میرے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دیتی ہوئی مجھے آرام گاہ میں لیگئی۔

میرے کانوں میں ظہیر، ظہیر، کی آوازیں آئیں، شک ہوا کہ یہ تو میری والدہ کی آواز تھی، مگر نہیں، یہ اُنکی آواز نہ تھی، میں نے سنبھلنا چاہا، مگر لڑکھڑاتا ہوا، دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ سر اُڑا جا رہا تھا، اور پیر بے قابو ہوئے جاتے تھے، یہ حالت دیکھکر بولی "میں نے بہت پلا دی، اور یہ یاد نہ رہا کہ تم ابھی نو آموز ہو"

لیکن تنہا شراب ہی نے میرے قدم نہیں ڈگمگائے تھے! میں نے اپنے ہاتھ سینہ پر باندھ لئے اور غصّہ میں اُسکی طرف دیکھنے لگا، مجھے غصّہ تھا اور کدورت تھی، کیونکہ اُسکی صورت ہر وقت پیش نظر رہکر میرے قلب کو زخمی کرتی تھی، اور اب پندرہ سو طلائی تنکہ پر میرے ہاتھوں بکنے کے لئے سامنے کھڑی تھی، مجھ سے پہلے وہاں اور کتنے جاچکے تھے! اور کس کس کے ساتھ اُس نے وفاداری، اور تابعداری کا اقرار نہیں کیا تھا؟ -

طبیعت کا تقاضہ تھا کہ خنجر نکال کر اُس کے سینہ میں پیوست کردوں، اُس کا گلابی حُسن، اور گدرایا ہوا سینہ میرے دل کو داغ کر رہے تھے، جبتک اُس کا گداز بدن، موت کے ہاتھوں ٹھنڈا ہوکر، اور اکڑ کر سڑ گل، یا ٹکڑے ٹکڑے ہوکر خاک میں نہ مل جائے۔ میری رہائی ناممکن تھی!

ظہیر، ظہیر، کی دھیمی اور دُور کی آواز پھر میرے کانوں میں آئی، یہ آواز میری والدہ کی نہ تھی! اگر شیریں اور واقفکار تھی! زیب النساء نے کہا "ایسے موقع پر ملازموں کو بُلانا مناسب نہیں ہے، میں خود تم کو گود میں لیکر پلنگ پر لے چلونگی" یہ کہکر اُس نے اُوڑھنی اُتار دی، اور اپنے ہاتھ میری کمر میں ڈالدیئے "گردن میں باہیں ڈالدو، اور مجھے زور سے پکڑ لو، ورنہ ہم تم دونوں گر پڑینگے" اُسکی گرم اور نازک جلد کے مس ہوتے ہی، میرے جذبات برانگیختہ ہوگئے اور جب اُس نے مجھکو زمین سے اونچا اٹھایا، میرا دل اُڑنے لگا، اور تمام جسم میں رعشہ پڑگیا۔

"ظہیر ظہیر" کی آوازیں اب التجا آمیز ہوکر میرے کانوں میں آنے لگیں، میں نے اُنکو شناخت کرلیا اور چشم زدن میں اپنے آپکو علٰحدہ کرکے کمرہ کے وسط میں کھڑا ہوگیا، سامنے پچھمی کھڑی تھی! اُس کے ہونٹوں پر خواہرانہ تبسم تھا، کمرہ کا دروازہ کھُلا ہوا تھا، اور تاریکی میں اُس کا نصف حصۂ جسم صاف نظر آرہا تھا، میں سخت شرمندہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہوں اور بھاگ نہیں سکتا، میں نے کچھ کہنا چاہا، مگر اُسکی آنکھوں کی صباحت، اور حلاوت نے زبان بند کردی، اُس کے چہرہ پر برہمی کا مطلق پتہ نہ تھا، مجھ سے کہہ رہی تھی "میرے ساتھ چلے آؤ" اپنے ہاتھوں کے دل آویز اشاروں سے مجھے باہر بُلایا، اور میں زینہ سے اُترکر سڑک پر آگیا، ایک ناقابل بیان قوت ارادی مجھ پر غالب آگئی اور میں یکایک اپنے جسم میں ایک خاص تحریک اور قوت کو محسوس کرنے لگا،

رات کی تاریکی میں مجھے وہ پیر جو رہبری کررہے تھے، صاف نظر آرہے تھے، اور میں مضبوط قلب کے ساتھ اُس کے پیچھے قدم اُٹھائے چلا جارہا تھا۔ سڑکوں اور گلیوں کا مجھے خفیف سا خیال تھا، یہانتک کہ ہم اُس دروازہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے جسکو میں اچھی طرح شناخت کرسکتا تھا، پچھمی نے دروازہ کھول کر مجھے اندر بُلایا۔ کمرہ بھی مجھکو نیا نیا معلوم نہ ہوا، روشنی مدہم تھی، صرف ایک شمع روشن تھی، میرا حافظہ تیزی کیساتھ سلب ہورہا تھا، اور پچھلے واقعات کی بالکل یاد نہ تھی۔

پچھمی وسط کمرہ میں بیٹھ گئی، گویا صاف پانی کے تالاب میں کنول کا پھول کھِل گیا، اُس نے دھیمی لے میں ہندی گیت شروع کیا جس کے الفاظ میں محبت اور عقیدت تھی اور میری رُوح کو سکون پہونچ رہا تھا، نسکرہی کہ میں نشہ کی حالت میں اُن الفاظ کو سمجھ نہ سکا۔ مگر اُس نغمہ نے میری رُوح کو محصور کرلیا، میں اُس کے سامنے مودب بن کر کھڑا تھا، گویا میں چیلا تھا اور وہ گرو تھی، اور میں اپنے گرو کی اشاروں

پر چل رہا تھا، وہاں ایک صندوق بھی رکھا نظر آیا، معاً خیال گذرا "یہ تو وہی صندوق ہی جسمیں والدہ نے میری عبادت کی کتابیں سفر کے وقت رکھکر میرے ہمراہ بھیجا تھا۔"

چاہتا تھا کہ شرمندگی کا اظہار کروں، معافی مانگوں، اور اپنی گناہوں کا عذر پیش کرکے لچھمی سے دریافت کروں کہ میں کہاں ہوں، مگر الفاظ حلق سے لپٹ کر رہ گئے۔ اور لچھمی کے نغمے اور راگ نے اس طرح گرویدہ بنالیا کہ میں سانپ کی طرح سپیرے کے سامنے مست اور بیخود بنا کھڑا رہا

رفتہ رفتہ ایک خوفناک احساس میرے تمام جسم میں سرایت کرنے لگا۔ کیونکہ وہ پرانا صندوق ہل رہا تھا، اور اس مین سے سفید اور نیلگون دھوان نکلکر شمع کی ہلکی روشنی میں بل کھا رہا تھا۔

"یہ کیا ماجرا ہی؟ شاید نشہ نے بصارت کو کمزور کر دیا ہی"! زیادہ توجہ کرکے دیکھا تو نہ دھوان تھا، اور نہ صندوق کو حرکت تھی، البتہ ایک آدمی سامنے کھڑا تھا، اُس کے وجود مین شک وشبہ کی مطلق گنجایش نہ تھی، سر کے بال کھڑے ہوئے تھے، خون چکان آنکھیں حلقوں میں گھوم رہی تھیں، اور میری طرف تھین! اُنمین خوف تھا، ہونٹ خشک تھے، چہرہ سُرخ تھا، اور گھٹنے کانپ رہے تھے، ظاہر تھا کہ اسکی روح گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ ہی میں آنکھوں پر ہاتھ رکھکر کانپتا ہوا لچھمی کے قدموں پر گر پڑا "کیا ہوا؟" مین نے یہ فقرہ ایسی ہلکی، اور بے جان آواز مین ادا کیا کہ خود مجھے وہ میری آواز نہ معلوم ہوئی، لچھمی نے تشفی آمیز الفاظ مین کہا "تم ہی ہو، پیارے تم ہی ہو" اور کونے مین بچھے ہوئے پلنگ تک پہونچا دیا، جب وہ کمبل اُڑھا رہی تھی مین نے دیکھا کہ اسکی آنکھوں میں فرشتۂ رحمت کی آنکھونکی چمک تھی! نرم اور دلسوز لہجہ میں مجھ سے پوچھنے لگی، "بستر آرام دہ اور گرم ہی؟" "تم بالکل خستہ ہو رہی ہو، مین پلنگ کے پاس بیٹھکر گاتی ہوں، ابھی نیند آجائے گی۔"

پھر اُس نے میری بند آنکھوں کو پیار کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُور سے مترنم صدائیں آرہی ہیں میں لیٹا ہوا سنتا رہا، یہانتک کہ رفتہ رفتہ نیند کی غفلت طاری ہوگئی (باقی دارد)

محمود غزنوی

(جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، ایم، آر، اے، ایس، ممبر لیجسلیٹو کونسل پروفیسر تاریخ و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و اڈیٹر شمع) کا معرکۃ الآرا رسالہ، محمود غزنوی، مہذب دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔ کل مضمون کا ترجمہ جناب دفیر سید جمیل حسین صاحب ایم اے (علیگ) نے نہایت خوش اصلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ اور جستہ جستہ شمع میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ یہ مضمون کئی نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوا ہے، اور احباب کا اصرار ہے کہ اسکو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ اس لئے ہم نے اس کی اشاعت کا انتظام کیا ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس مضمون کا جواب نہیں ہے۔ اور ایک مستقل کتاب ہے۔ تاریخ کے شائقین کو صلائے عام ہے کہ وہ اس نفیس تاریخی تحقیقات سے لطف اندوز ہوں۔ چونکہ کتاب نظر ثانی کے بعد، اور دیباچہ و ضروری حواشی سے مزین ہو کر شائع ہو رہی ہے، اس کا حجم زیادہ ہو جائے گا۔ اس لئے قیمت عہ رکھی گئی ہے۔ لیکن جو حضرات آخر فروری ۱۹۲۶ء تک عہ بذریعہ ٹکٹ یا بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے اون کی خدمت میں کتاب مفت روانہ کی جائیگی۔ اور چونکہ ڈاک زیادہ ہوگی اس لئے سبقت کے ساتھ اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ جو آرڈر پہلے وصول ہوں گے انہیں کی تعمیل ہوگی؛

المشتہر

منیجر رسالہ شمع۔ حسن منزل
شاہ گنج آگرہ

جذبات عالیہ

(از جناب صدق صاحب جائسی)

لطف جب تیرا کبھی یاد اے ستمگر آگیا
اشک آنکھوں میں بھر آئے نالہ لب پر آگیا

اُٹھکے ارماں میں ترے بیٹھا کہ تیور اکر گرا
گر کے حسرت میں ترے اُٹھا کہ چکر آگیا

دشت میں بہلا ہی کچھ بہلیگا کچھ گلشن میں دل
تو نے اے وحشت کہا اور مجھکو باور آگیا

جاتے جاتے جان مضطر ایکدن جاتی رہی
آتے آتے آپ کا وعدہ برابر آگیا

نیچی نظریں تھیں کہ آنکھوں میں نہاں دو تیر تھے
اِک جگر میں چبھ گیا اک دل کے اندر آگیا

کیا تصور میں جگر پر رکھدیا تھا تم نے ہاتھ
درد اِس پہلو سے اُس پہلو میں کیونکر آگیا



خوردبین کے ذریعہ سے سراغ رسانی

(از جناب سید حسن زاہد جعفری صاحب منیجر رسالہ شمع، آگرہ)

"ناممکن ہو کہ مجرم فرار ہو جائے اور اپنی گرفتاری کے واسطے کچھ نشانات نہ چھوڑ جائے۔ میں نے صرف ایک معمولی جلی ہوئی دیا سلائی سے پتہ لگا کر سات سو آدمیوں کے درمیان میں اپنا چور گرفتار کیا تھا" ان الفاظ میں شیخی کم ہو، اصلیت زیادہ ہو، اور ایسے شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جسکے نام سے یورپ کے مجرم تھراتے ہیں۔ اور مشہور سراغ رسانوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔

ایک بجے رات کو صدر دروازہ کھلا، آہٹ سے مکان میں تنہا عورت کی آنکھ کھل گئی. خوف زدہ ہو کر اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھ گئی، چور دوسرے کمرے میں اطمینان سے داخل ہو گیا، اُسکو معلوم تھا کہ سوائے صاحب خانہ کی بیوی کے مکان کے اندر کوئی نہیں تھا، کمرے میں داخل ہو کر چور نے الماری کھولی، اُس میں کئی ہزار روپیہ کے نوٹ تھے، عورت سے کچھ نہ بن پڑی، مگر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

چیخ کی پیہم صداؤں سے چور کے ہواس بجا نہ رہے، اندھیرے میں کھڑکی کو دروازہ سمجھکر لپکا، مگر کرسی کی ٹھوکر لگی، گھبراہٹ میں اُس نے دیا سلائی جلائی اور دروازہ کھول کر فرار ہو گیا۔

صبح کو پولیس آئی، تمام شہر میں چوری کا اعلان ہو گیا مشہور سراغرسان بھی آ گئے، مگر چونکہ کوئی نشان

چور کا موجود نہ تھا تحقیقات ناقص رہی، اور چوری کا واقعہ ایک سربستہ راز ہو گیا۔

برسوں کی جمع کی ہوئی دولت کا منٹوں میں ضائع ہو جانا معمولی بات نہیں ہے، صاحب خانہ نے نام سنکر مسٹر مے کو بلایا، انکی نوعمری پر پولیس اور خفیہ کے پرانے افسرون نے دل کھول کر مذاق اُڑایا مگر وہ نوجوان سیدھا اُس کمرے میں گیا جہان چوری ہوئی تھی، صاحب خانہ نے بیان کیا کہ رات کو گیارہ بجے تک میرے ایک دوست اور میں اس کمرے میں بیٹھکر کاروبار کے متعلق باتیں کرتے رہے، اور سگریٹ پیتے رہے، کمرے میں فرش پر دیا سلائیاں شاہد ہیں کہ بہت سگریٹ جلائے گئے تھے! بیوی نے بیان کیا کہ میں اپنے کمرے میں تھی، میں نے چور کو بالکل نہیں دیکھا، مگر اُس نے میری چیخ پکار سے گھبرا کر کھڑکی کی طرف جانا چاہا، اور چونکہ اندھیرا تھا، ایک دیا سلائی جلاکر دروازہ دیکھا، اور اُسے کھول کر فرار ہو گیا"

مسٹر مے نے کمرے کی تمام دیا سلائیاں جمع کرلیں، انکی تعداد تیرہ تھی! بارہ دیا سلائیاں ایک قسم کی تھیں مگر تیرھویں دیا سلائی مختلف تھی! اور دیا سلائیاں چوکھنٹی تھیں مگر یہ گول وضع کی تھی اور ایک طرف کو خمیدہ بھی تھی! اس دیا سلائی کو غور سے دیکھکر مسٹر مے نے اطمینان کا سانس لیا، اور کہنے لگے اب چور کا پتہ لگ جائیگا، پولیس کا انسپکٹر پاس ہی کھڑا ہوا تھا ہنسکر کہنے لگا "ایسی دیا سلائیاں اسی شہر مین کروڑون موجود ہین آپ کیا پتہ لگائیں گے"؟

مسٹر مے ۔" اس قسم کی تو کروڑون دیا سلائیاں مِل جائینگی، مگر اپنی وضع کی یہ ایک ہی دیا سلائی ہے، اور اسی سے چور کا سُراغ ملے گا، دُنیا میں کروڑوں آدمی آباد ہیں، مگر ہر شخص اپنی وضع کا ایک ہی ہوا کرتا ہے، اسی طرح اگرچہ یہ دیا سلائی بے جان ہے، اور انسان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے مگر اپنی وضع کی ایک ہے!"

مسٹر مے نے اپنے معمل میں لیجا کر اس دیاسلائی کو خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا، دیاسلائی پر ایک خفیف سا نشان نظر آیا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بال کا ٹکڑا ہی معمل میں بالون کے نمونون سے اُس کا مقابلہ کیا، مگر یہ بال بھی اپنی وضع کا ایک ہی بال تھا! غالباً جس جیب میں دیاسلائی کا بکس تھا اُس کا باریک رُوان دیاسلائی سے لپٹکر رہ گیا تھا! لیکن جو بات قابل غور تھی وہ یہ تھی کہ یہ رُوان کسی غیر ملکی کپڑے کا تھا!

مسٹر مے دیر تک خوردبین کو گھما کر دیکھتے رہی! دیاسلائی پر ایک اور خفیف دھبہ نظر آیا جو غالباً چکنائی یا مشین کے تیل کا تھا! اور اس دھبّہ کے اندر ایک ریزہ کوئلہ کی خاک کا تھا! شیشہ کو پھر حرکت دی، اور ایک دھات کا ریزہ چمکتا ہوا دکھائی پڑا، اب جو زیادہ توجہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ دھات کا ریزہ مرکب تھا پیتل اور لوہی سے! ممکن ہی کہ یہ ریزہ وہان سے آیا ہو جہان لوہا اور پیتل ریتا جاتا ہی!

چوری کی واردات کو چار یوم گذر چکے تھے مسٹر مے نے شہر کے ساتون کانون کی انجن روم مین جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پانچ روز قبل ایک کان مین ایک انجن ٹوٹ گیا تھا مسٹر مے نے کہا "جس شخص نے اُس انجن کی مرمت کی ہی، اور ریتی سے ٹھیک کیا ہی، اُس سے ملنا چاہتا ہون" ایک کم رُو، متوسط عمر کا غیر ملکی آدمی اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس کو دیکھتے ہی مسٹر مے نے کہا "مین تم کو گرفتار کرتا ہون"

اِس شخص کے کپڑون کے نیچے ایک جوڑا کپڑون کا اور تھا جس کا رنگ اُس رُوئیں سے ملتا تھا، جو مسٹر مے نے خوردبین کے ذریعہ سے دیاسلائی پر دیکھا تھا، اس جوڑے کے اندر دیاسلائی کا بکس برآمد ہوا جسمین گول وضع کی دیاسلائیاں تھیں، اور ایک طرف کو جھکی ہوئی تھیں! مسٹر مے نے اس

شخص کے کپڑون مین سے کئی دھاگے لئے، اور خود اُس کے ناخنون کا میل نکالا، اور جب خوردبین کے نیچے رکھکر معائنہ کیا تو صاف واضح ہوگیا کہ دھاگون کا رُوان اُس روئین سے ملتا تھا جو دیا سلائی پر موجود تھا، اور ناخنون کے میل مین لوہے اور پیتل کے ذرے موجود تھے! اور اُس آدمی کے کوٹ کی جیب مین چکنائی کے دھبے، اور کویلہ کی خاک بھی موجود تھی!

مُشتبہ شخص نے جُرم سے اقبال کیا، اور چوری کا مال واپس مل گیا۔ مسٹر مے کی زبان سے یہ واقعہ سُنکر اُن کے دوست نے کہا "ممکن ہی کہ اسی قسم کا ثبوت آپکو اُس جگہ کے دوسرے آدمیون مین مل جاتا؟"

مسٹر مے: مسکراکر، "میری شناخت کے متعلق آپکا کیا اندازہ ہی؟"

دوست: "یہ کہ دس معاملون مین ممکن ہی آپ سات مین کامیاب ہون"۔

مسٹر مے: "غلط ہی! مین نے اس شخص کو سات سو آدمیونمین گرفتار کیا تھا، لیکن اگر سات لاکھ آدمی بھی ہوتے تب بھی مین اسی کو گرفتار کرتا، میرے پاس دس ثبوت تھے، اور وہ ایک دوسرے سے ایسے ملتے ہوئے تھے کہ اگر "قانون، اتفاقات" کو تسلیم کیا جائے کہ وہ ٹھیک ہی تو مین دعوٰی سے کہہ سکتا ہون کرورون مین شاید ایک ایسا اتفاق ہوجائے! ورنہ اُس کا بھی احتمال نہیں ہی۔

قانون اتفاقات، " قانون ممکنات" سے کم وقعت نہین ہی، جتنے زیادہ واقعات، (نظریے نہین) ملکر ایک نتیجہ پر پہونچاتے ہیں، اُسی قدر وہ نتیجہ قابل وثوق اور قابل اعتماد ہوتا ہی۔ یہی وجہ ہے کہ اخیر مین مجرم گرفتار ہوجاتا ہی، وہ ہمیشہ امکانی دھوکون کے غیر محدود اتفاقات کے خلاف عمل کرتا ہی، حالانکہ ابتک ایسا کوئی دماغ پیدا نہین ہوا ہی۔ جو غیر محدود کا مقابلہ کرے اور ہر مرتبہ کامیاب ہے

جرائم پیشہ لوگ ہمیشہ اپنا سراغ چھوڑ جاتے ہیں، بظاہر وہ آنکھوں سے نظر نہ آئے، مگر اسکی موجودگی میں کلام نہیں ہوسکتا ہے، اور سائنس کی مدد سے تو یہ معاملات روز بروز صاف ہوتے جاتے ہیں، اگر صحیح طور پر مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کی شہادتیں جو نہایت باریک اور عام طور پر نظروں سے مخفی ہوتی ہیں حقیقت میں حیرت انگیز ہوتی ہیں اور انکی سچائی میں مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

مثلاً آپ کے سر کا بال ہے، یہ بال اور بالوں سے مختلف ہے، گو بظاہر دو بالوں میں آنکھ کو فرق نظر نہ آئے لیکن جس طرح درخت ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور کہیں نہ کہیں اُن میں ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے درختوں میں نہیں ملتی، اسی طرح آپکے بال کی ساخت میں کہیں نہ کہیں کوئی بات ضرور ایسی مل جائیگی کہ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ دنیا میں صرف آپکے سر کا بال ہوسکتا ہے! اس تحقیق کے مقابلہ میں مجرموں کے فوٹو کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے"

مسٹر مے کی عمر چالیس سال کی ہے! بارہ سال کی عمر سے اُن کو فن جرم سے دلچسپی ہے، کئی برس تک اُنھوں نے علم نفسیاتی کا مطالعہ کیا، اور پھر اٹلی کے مشہور ماہر فن جرم، لومبروسو کی تصانیف کی طرف توجہ کی، اُس کا طرز استدلال ان کو بہت پسند آیا، اور کئی برس تک علم نباتات، علم جمادات، علم کیمیا، علم طبعیات، علم تشریح قوائے انسانی وحیوانی، طب، علم شناخت، علم نشان انگوٹھا، علم سمیات، فوٹوگرافی، علم اسلحہ وغیرہ وغیرہ جن کو وہ مفید مطلب سمجھتے تھے، پڑھتے رہے،

کتابوں سے فارغ ہو کر مسٹر مے نے معملات میں تجربات کی ابتدا کی، چنانچہ کئی مہینہ

تک وہ بازار کی مختلف سیاہیون کے اجزار کا مطالعہ کرتے رہے، اس کے بعد بوڑھے آدمیون اور جوانون کے بالون کے مقابلہ مین اُن کا وقت صرف ہوا، اور پھر طرح طرح کے تجربات اور مشاہدات جاری رکھے، چنانچہ اب انکی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ محض دو چار باتیں معلوم کرکے وہ آدمی کی نہایت صحیح تصویر اُتار دیتے ہین، معمولی آدمی تو اُن کو جادوگر سمجھنے لگے!

سترہ سال کی عمر میں اُنھوں نے عملی دنیا مین قدم رکھا، اور پولیس کے تھانون اور کوتوالیون مین آمد ورفت شروع کی، اور افسران پولیس سے تعلقات پیدا کرکے تفتیش جرائم مین شریک ہونے لگے، اور اٹھارویں برس میں انھوں نے اپنا ذاتی دفتر قایم کرلیا، گورنمنٹ کی جانب سے اُن کو مجرمونکو گرفتار کرنیکی اجازت ہے، اور وہ مشہور یونیورسٹیوں میں قانون تعزیرات کی نہایت اہم شاخ "تعزیری مقدمات میں جسمانی شہادت" پر معرکتہ الآرا لیکچر دیچکے ہیں۔

مسٹر سے کے معمل میں ۳۵ آدمی کام کرتے ہین جو سائنس کے مختلف شعبون سے واقفیت رکھتے ہین، اور اب وہ خود قتل کے معاملات کی تحقیقات کرتے ہیں چنانچہ صرف امریکہ نے کئی ہزار قتل کی وارداتون میں اُنکی مدد لی ہے۔

مسٹر سے کا معمل عجیب وغریب مقام ہے گویا چھوٹا سا عجائب خانہ ہے۔ الماریون میں ادویہ کیمیاوی اجزار، اور سیکڑون قسم کی چیزون کے نمونے، جانچ کرنے کے آلے، اور تولنے کے لئے طرح طرح کی ترازو رکھی ہوئی ہیں اور پندرہ بیس اقسام کی خوردبین بھی ہیں۔ سیکڑون خاص واردانون کی یادگاریں دیوار پر لگی ہوئی ہیں۔ تصاویر، اور انگوٹھے کے نشانات، اور تحریر کے نمونے، غرض ایک چیز ہو تو بیان کی جائے۔ وہان موجود ہین۔

اپنے مجموعہ میں سے ایک طبنچہ کو اٹھاکر مسٹر مے نے کہا " اس ہتھیار کا واقعہ بھی دلچسپ ہے، ڈاکوؤں نے راستہ میں کئی موٹر روک لئے تھے، پولیس اطلاع پاکر موقع پر پہونچ گئی اور ڈاکوؤں نے بھاگتے میں فیر کئے، جب دہوان کم ہوا تو پتہ چلا کہ ایک سب انسپکٹر گولی کھاکر مرگیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد ایک موٹر کار جسکو ڈاکو چھڑا لے گئے تھے، سڑک کے کنارے کھڑا ہوا ملا، اُس میں ایک ڈاکو مرا ہوا بیٹھا تھا، اُس کے ہاتھ میں طبنچہ تھا جس کے کئی فیر خالی ہو چکے تھے۔ عام خیال تھا کہ مفرور ڈاکو سب انسپکٹر کا قاتل تھا، لیکن خوردبین کے ذریعہ سے گولیوں کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ مُردہ ڈاکو کے طبنچہ سے سب انسپکٹر کی موت واقع ہوئی تھی، مجھ تک طبنچہ ذرا دیر سے پہونچا، یعنی اس وقت تک تیس چالیس آدمی اُسکو دیکھ چکے تھے، اور ملزم کے انگوٹھے کے نشانات اصلی حالت پر نہ تھے، مفرور کا تعاقب کیا گیا اور وہ گرفتار ہوکر آیا، دوران تفتیش میں پولیس نے یہ طبنچہ اُسکو دکھاکر دریافت کیا " یہ طبنچہ تمہارا ہے ؟" ملزم نے سخت احمقانہ غلطی کی اور صاف انکاری ہوگیا، بلکہ یہانتک بیان کیا کہ اُس نے وہ طبنچہ اپنے ہوش میں کبھی نہیں دیکھا تھا!۔

مجھے فکر تھی کہ ڈاکو سچ بولتا ہے یا جھوٹ، کئی دن تک طبنچہ کا معائنہ کرتا رہا، اسمیں ایک نئی بات تھی یعنی اس کا گھوڑا بہت معمولی اشارے پر کام کرتا تھا، ظاہر ہے کہ عام طور پر گھوڑا سخت ہوا کرتا ہے میں نے طبنچہ کو کھول ڈالا، اندرونی پُرزوں پر مجرم کی اُنگلیوں اور انگوٹھے کے نشان تھے! تین سکینڈ میں مجھکو معلوم ہوگیا کہ وہ جھوٹ بولا تھا!

اس شہادت کو سُنکر مجرم نے جُرم کا اقبال کرلیا اور صاف بتادیا کہ سب انسپکٹر کا قاتل وہی تھا! اور اُسی نے اپنے ساتھی کو بھی مار ڈالا تھا تاکہ وہ ہی مجرم سمجھا جائے کیونکہ مُردہ سے کبھی راز

انشا نہیں ہوتا!

جرایم پیشہ لوگ عموماً وہمی اور شکی ہوا کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ خود نطات ان کی گرفتاری میں کس حد تک اعانت کرتی ہے۔

ایک شخص اپنے کمرے مین فرش پر بیٹھا ہوا تھا شیشہ کی کھڑکی مین گولی کا سوراخ تھا یا ایک سوراخ تھا جسمیں ہوکر گولی آئی تھی۔ اور اسکی موت کا باعث ہوئی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ اور شیشوں پر داغ دھبہ تھے، سامنے سے سڑک نکلی تھی اُس کے کنارے پر بھی جوتوں کے نشان تھے، پاس ہی ایک سایہ دار درخت تھا، وہان بھی پیروں کے نشانات تھے، مین نے بڑی محنت سے ان نشانات کے سانچے بنائے۔ اور جب اُن کی جانچ کی تو معلوم ہوا کہ موقع واردات پر جو انسپکٹر صاحب سب سے پہلے پہونچے تھے انہیں کے نشانات تھے!

گولی لگ کر شیشہ کا نہ ٹوٹنا میرے لئے خاص دلچسپی کا موجب تھا اگر بڑی طاقت کی بندوق شیشے کے پاس سے چلائی جائے تو غاس گیس، کی وجہ سے شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے، مین کھڑکی سے دور جاکر درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا مختلف خیالات میرے دماغ مین کام کر رہے تھے، کہ ہوا کا جھونکا آیا، دفعتاً میری نگاہ اُٹھ گئی اور خدا ہی جانتا ہوگا کہ کیون؟ مگر میں پتوں کو دیکھنے لگا۔ ایک پتہ میں بھی سوراخ تھا! دل نے گواہی دی کہ مجرم کا پتہ لگ گیا، مگر مین نظریہ کا قایل نہین ہون جبتک عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر آئے مین اپنے خیال کو زبان پر بھی نہین آنے دیتا، فوراً کمرے مین واپس آیا، اور کھڑکی کے سوراخ مین جھانک کر پتہ کے سوراخ کی جو نشست باندھی تو سڑک کے دوسرے جانب کی کھڑکی سے بالکل مقابل تھی!

معلوم ہوا کہ اُس کمرے میں جو آدمی شب باش ہوا تھا صبح سے غائب ہی، اس کے نشانات کافی فراہم ہو گئے اور جب گرفتار ہو کر آیا تو ایسا گھبرایا ہوا تھا کہ جرم کا فوراً اقبال کر لیا، اس کو اپنی گرفتاری کا گمان تک نہ تھا!"

مسٹر ... کا زیادہ وقت معمل میں گزرتا ہی، تبدیل لباس، یا صورت بدل کر وہ خفیہ پولیس کا کام کبھی نہیں کرتے۔" چند سال کا واقعہ ہے کہ ایک کنوارے بوڑھے مالدار آدمی نے اپنے دو بھتیجوں کو گود لیا، چچا کی جائیداد کے وہی وارث تھے، ایک کی عمر ۱۹ سال کی اور دوسرے کی ۱۷ سال کی تھی، چچا نے مکان کے چھوٹے سیف میں تین لاکھ روپیہ کی ضمانت نامے رکھدئے تھے، ایکدن جبکہ چچا باہر گیا ہوا تھا سیف میں سے وہ ضمانتیں غائب ہو گئیں، سیف مختصر تھا اور اُس کے اوپر دیوار میں ایک آئینہ لگا رہتا تھا۔ اُس آئینہ پر انگلیوں کے دو نشان تھے جو اسقدر صاف اور خوبصورت تھے کہ مجھے اُنکی موجودگی پر ہنسی آگئی، سیف پر کسی قسم کے نشانات نہ ملے، جب میں نے بیان کیا کہ یہ نشانات اُس کے بڑے بھتیجے کی اُنگلیوں کے نشانوں سے مشابہ ہیں، تو بوڑھا چچا رونے لگا، وہ بار بار کہتا تھا " اُسکو کیا ضرورت پڑی تھی! سب کچھ تو اُسی کا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ طلب کرتا تو میں خوشی سے دیتا، اس نے مجھے ہمیشہ خوش رکھا ہی، مجھے حیرت ہی کہ وہ اور ایسے جرم کا ارتکاب کرے!"

میں نے چچا سے تو صاف الفاظ میں سچ بات کہدی کہ" مجھے نہیں معلوم سیف کس نے کھولا ہی، اور کس نے آپکا خزانہ نکالا ہی" لیکن اُس لڑکے سے میں نے جب باتیں کیں تو اُس نے آئینہ کے قریب کبھی بھی جانے سے صاف انکار کر دیا! میرا دوسرا سوال تھا کہ " آپ رات کو

تھے کہاں ؟" اس سوال پر لڑکے کا مُنہ سُرخ ہوگیا اور اُس نے کہا، کہ وہ رات کو مکان سے غائب تھا! اور واقعہ کی شب کو وہ اس شہر میں بھی موجود تھا، مین نے ثبوت مانگا، اور اُس نے ایسا معقول ثبوت اپنی بریّت کا دیا کہ مجھے ماننا پڑا، میرا اصول ہو کہ مین بغیر جانچ کئے ہوئے کسی بات کو نہین مانتا، چنانچہ مین نے گھر کی ہر چیز پر نگاہ رکھی، چچا اور بھتیجون کی عادات کا مطالعہ شروع کیا، اُن کے ملنے والونکی فہرست بنائی اور وقوعہ کی شب کی معمولی معمولی باتون کو بھی بہت توجہ کے ساتھ اپنے ذہن مین محفوظ رکھتا گیا، اور اگرچہ مین نے کسی سے اظہار نہین کیا لیکن میرے آدمی بھتیجون کے پیچھے لگے رہے۔

ایک دن وہ عورت جو مین نے ایک بھتیجے کے لئے تعینات کر دی تھی بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اُس نے ایک کارڈ دیا جس پر پتہ لکھا ہوا تھا، کہنے لگی" جاؤ۔ وہان جاکر تمھیں بہت سی باتیں معلوم ہونگی" مین اُسی پتہ پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ خالی کمرے ہین جنکو چھوٹے بھتیجہ نے کرایہ پر لے رکھا ہے، اور رات کو وہان ایک بدمعاش اور آوارہ جماعت کے ساتھ عیش و عشرت کی محفلیں گرم ہوتی ہیں مین نے اُس لڑکے کے سامان کی تلاشی لی، پورا سامان انگوٹھے کے نشانات بنانے کا میرے ہاتھ لگا اور اس طرح پر آئینہ کے نشانون کی کیفیت معلوم ہوگئی۔

مسٹر سمے نے اپنے دوست سے دریافت کیا" کبھی ایسا اتفاق ہوا ہو کہ کچھ الزام لگایا گیا ہو، اور آپ کے چہرہ پر گھبراہٹ مسکراہٹ، اور مجرم ہونے کے اثرات پیدا ہوگئے ہون؟ میرا خیال ہے کہ الزام کو سُنکر ہر شخص کی یہی حالت ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ایک مشہور، اور نہایت باعزت آدمی اسی قسم کی بلا مین گرفتار ہوکر مشتبہ ہوگیا تھا، ایک شب کو مسٹر اسمتھ مکان کو لوٹے، اُنھون نے صدر

دروازہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بندوق کے فیر کی آواز آئی بعض ہمسایون کا بیان تھا کہ مسٹر اسمتھ کو اتنا موقع تھا کہ وہ مکان میں داخل ہو جاتے! بہرکیف مسٹر اسمتھ کا بیان وہی تھا جو مین کہہ چکا ہون. مکان مین داخل ہو کر مسٹر اسمتھ فوراً باہر نکل آئے اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کسی نے انکی بیوی کو ہلاک کر ڈالا تھا چند منٹ میں پولیس موقع پر آگئی. شوہر ایسا گھبرایا ہوا تھا کہ بات تک نہین کر سکتا تھا، اُدھر پڑوسیون مین سے دو ایک نے نیا شگوفہ کھلا دیا کہ "صبح کو میان بیوی مین لڑائی ہوئی تھی، جھگڑے کی آوازین ہم نے بھی سُنی تھین" - بیوی کی لاش کوچ پر پڑی ہوئی تھی اور پیشانی کے بیچ مین گولی کا نشان تھا،

مین نے پہونچتے ہی پولیس سے بندوق طلب کی، پولیس نے جواب دیا کہ بندوق کہین نہین ملتی ہے، مسٹر اسمتھ کی تلاشی لی گئی، کھڑکیان بند ملین اور مکان کی پُشت کے دروازے بند ملے، سخت حیرت تھی کہ آخر بندوق کا حشر کیا ہوا؟ مین نے سوائے افسران پولیس کے سب کو کمرے مین سے نکالدیا اور بندوق کی تلاش شروع کی. کوچ کو سرکاتے ہی کوئی چیز اُس کے پیچھے فرش پر گری دیکھا تو وہ ریوالور تھا! پولیس کا انسپکٹر کہنے لگا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت نے گولی مار کر طمنچہ کو چھپا دیا تھا" یہ اُسکا طنزیہ فقرہ تھا، مگر شوہر اُسی وقت گرفتار کر لیا گیا اور عام طور پر وہی قاتل خیال کیا گیا، مین نے ریوالور کو اٹھا کر دیکھا تو اُس پر عورت کی انگلیون کے بیشمار نشانات موجود تھے. مگر شوہر کی اُنگلیون کے صرف دو تھے اور وہ بھی ریوالور کی نال پر، مین نے اسمتھ سے پوچھا "کیا کوچ کے پیچھے ریوالور کو رکھتے وقت آپنے ریوالور کی نال پکڑی تھی؟" پہلے تو وہ میری طرف دیکھتا رہا، اور پھر اُس نے آنکھین بند کر کے اقرار کیا۔

"واقعہ یہ تھا کہ دُنیا کا منہ بند کرنے کے لئے اُس نے ریوالور چھپا دیا تھا - تاکہ کوئی متوفیہ کو بدنام

نہ کرے کہ اُس نے خودکشی کرلی تھی !!! دراصل اسکو اپنی بیوی سے بہت محبّت تھی! بہرکیف مین نے پولیس کا اطمینان کردیا کہ شوہر ہرگز قاتل نہ تھا بلکہ عورت نے خودکشی کی تھی! حالانکہ اپنی حماقت اور گھبراہٹ سے مسٹر اسمتھ نے پھانسی پانے کا پورا انتظام کرلیا تھا!

صرف انگوٹھے اور انگلیون کے نشانات ہی ہمارے کام نہین آتے سیکڑون اور باتین بھی ہین مثلاً کپڑون پر خاک، دھبّے، داغ وغیرہ وغیرہ، جوتہ دیکھکر ہم بتا سکتے ہین کہ آپ آج دن بھر کہان کہان گئے تھے؟ بال دیکھکر ہم بتا سکتے ہین کہ یہ کس کے سر کا بال ہے۔ اور آیا وہ مرد تھا عورت تھی یا بچہ تھا!

مسٹر ... کی خوردبین بھی عجیب چیز ہے! ظاہری صورت توپ کی ہے اور اُس کا شیشہ اسقدر طاقتور ہے کہ کارتوس کا چھرّہ اُس مین گولا نظر آتا ہے، بال، لکڑی کا کُندہ اور معمولی دھاگہ موٹا رسّا معلوم ہوتا ہے، اُن کا بیان ہے کہ " یہ غلط خیال ہے کہ مقتول کی پُتلیون مین قاتل یا قتل گاہ کا نقشہ جم جاتا ہے مین نے سیکڑون تجربے کئے مگر یہ بات غلط ثابت ہوئی! اسی طرح اکثر لوگ سوال کرتے ہین کہ جرائم پیشہ لوگونکی کیا شناخت ہوتی ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ قدرت نے کسی شناخت کے ساتھ کسی مجرم کو پیدا نہیں کیا، جرایم کا تعلق انسان کے قلب سے ہے نہ کہ صورت سے! مجرم کی آنکھیں اُس کا راز عیان کرتی ہین، اُنمین ہمیشہ خوف اور ہراس ہوتا ہے جو اندرون قلب کی حالت کا پتہ دیتا ہے، چنانچہ مجرم تمام عمر بے چین رہتا ہے، اور ہر وقت بدنامی، گرفتاری، اور سزا کا خوف دامنگیر رہتا ہے"

فقط



غزل

(از جناب میرزا ثاقب صاحب لکھنوی)



یوں اکیلا دشتِ غربت میں دلِ ناکام تھا
پیچھے پیچھے موت تھی آگے خدا کا نام تھا

بنتے ہی گھر ابتدا میں رو کشِ انجام تھا
تنکے چن کر جب نظر کی آشیاں اک دام تھا

وہ خود آرائی میں حیرت میں دلِ ناکام تھا
میرے اُس کے بیچ میں اک موت کا پیغام تھا

معرفت غم کی نہیں اور پوچھتے ہیں حالِ ہجر
بس یہی کہہ دوں کہ ہاں آرام ہی آرام تھا

آگ پہلو میں لگا رکھی ہمیشہ کے لئے
کیوں دلِ پُر درد رکھتا ہوں یہی الزام تھا

ایک شب بھی دل نہ ٹھنڈا کر سکے اہلِ جہاں
صبح تک مہمانِ دُنیا میں چراغِ شام تھا

حالِ مُنعم خود غرض کیا جانیں میخانے میں کل
رِند تھے بے فکر گردش میں دماغِ جام تھا

بس یہی فقرہ کہ شامِ ہجر نے مارا مجھے
کوئی کہہ آتا تو کتنا مختصر پیغام تھا

جز دلِ راحت فروش اک چیز نے جُنبش نہ کی
جب ازل میں خوانِ غم پر اک صلائے عام تھا

سخت جاں کہتے ہیں مجھکو اور اُس میں دم نہیں
وہ مرے سر آرہا خنجر پہ جو الزام تھا

بے محل دل کے بُجھانے سے اُنھیں کیا مل گیا
جس کو شمع صبح سمجھے وہ چراغِ شام تھا

ناہور پھر کون ہوگا کارگاہِ دہر میں
جب یہاں دل سا علم بردارِ غم گمنام تھا

سو جگہ سے چھن رہا تھا جب تو ڈرتا کس لئے
کھا گیا دھوکا کہ میرے دل کی صورت دام تھا

سر چڑھایا میں نے چُن چُنکر خس و خاشاک کو
باغ کے تنکے تھے وہ جن کا نشیمن نام تھا

فرش میں اک بھیڑ سی دیکھی تھی لیکن کیا خبر
گرد میری حسرتیں تھیں یا ہجومِ عام تھا

میرے نالے تھے شبِ فرقت میں کتنے برمحل
اُن کے کانوں نہیں مگر اک شورِ بے ہنگام تھا

کیا زمانے کا گلہ ثاقب کسی کا کیا قصور
یہ دلِ غم دوست خود ہی دشمنِ آرام تھا

خواب زندگی

(ترجمہ)

(از جناب عزیز احمد خان صاحب (علیگ) حیدرآبادی)

زندگی ایک ناپائدار خواب ہی جو قریب کے سیال گھر سے گذرتا ہی۔ ہماری امیدیں بچوں کی خیالی مسرتیں ہیں اور ہمارے آلام سایہ کے عکس......

ہم شہرت، منزلت، دولت، طاقت اور راحت کی عارضی خوشیوں کو ہوس اور حرص سے اس طرح گرفت میں لانا چاہتے ہیں جس طرح کہ بچے اپنے کھلونوں سے جھگڑتے ہیں......

یہ زندگی ایک ساکن دریا میں موجوں کا اُتار چڑھاؤ ہی اور یہ دُنیوی عظمت ایک نمود ہی جو سادگی کو دام میں پھانسنا چاہتی ہی.........

ربانی مسرت کے لئے مالک اور غلام، دوست اور دشمن آپس میں ایک دوسرے سے متعلق کر دیئے گئے ہیں جو دُنیا کے اسٹیج پر زندگی کے حزن انگیز ڈراما میں ہمیشہ بدلنے والے سین کے ساتھ ایکٹروں کا پاٹ کرتے ہیں.........

جس طرح خواب کے تھیٹر میں سایے اپنی خدمت انجام دیکر رات کی ظُلمت میں جذب ہو جاتے ہیں اسی طرح انسان زندگی کے لامتناہی پردہ پر نمودار ہوتا ہے اور اُسے سادہ اور بے داغ چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہی.........

وہ منزلیں طے کرتا ہے لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ سفر کے کس حصہ میں قیام پذیر ہی

اور نہ وہ اسکی ابتداء اور انتہا سے واقف ہی وہ اپنے ہمسفروں کا خیر مقدم کرتا ہی جو تاریکی میں اپنے احباب کو دعوت دیکر معدوم ہو جاتے ہیں..........

نہ بجھنے والی ہوسوں کا بندہ بنا کر انسان ان کے ظالمانہ تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جفاکشی کر رہا ہی- وہ خود غلام ہی لیکن حکومت کا خواہشمند اور زندگی اس کے ہاتھوں میں تو وہ خاک بنکر رہ جاتی ہی.........

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

مجھے نہ تو کسی قوم کے رکن ہونے کا افتخار حاصل ہی اور نہ میں فرقہ و ذات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہون- کوئی تنگ وطن میرے دل کی وسعت کو محدود نہیں کر سکتا، میرے آگے پیدائش اور مرتبہ کا غرور ہیچ ہی............

نہ میرا کوئی وطن ہی نہ کوئی دوست ہی اور نہ کوئی نام، میری روح کا تعلق نہ کسی بندہ سے ہے اور نہ خدا سے بلکہ میری خودی پر ایک غیر مشکل اور غیر متبدل ہستی چھائی ہوئی ہی اور مین تمام ارضی قیود سے آزاد ہون..............

میری روح نہ تو ولادت سے اور نہ وفات سے متاثر ہو سکتی ہے اور نہ محبت اور نفرت کے جذبات مجھے امن و جنگ میں مبتلا کر سکتے ہیں- مین اپنی ذات میں خودی کی تلاش کر کے اسے پا چکا ہون اور اس طرح خواب زندگی سے بیدار ہو گیا ہون-

(عنایت خان)

فرانسیسی صحافت

(از جناب مولوی محمد حسین صاحب حسان، ندوی)

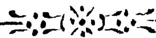
فرانسیسی اخبارات وجرائد کثرت اشاعت، فراوانی تصاویر، تعداد صفحات اور مواد کے اعتبار سے انگریزی اخبارات سے ہمیشہ سے پیچھے ہیں۔

انگریزی اخبارات عام طور پر ۱۸ یا ۲۰ صفحات پر شائع ہوتے ہیں، ہر صفحہ میں باریک حروف سے لکھے ہوئے سات آٹھ کالم ہوتے ہیں، انمیں سے اکثر میں (کم از کم) روزانہ ایک صفحہ باتصویر ہوتا ہی، تمام اقطاعِ عالم کی خبریں ہوتی ہیں جو خاص نامہ نگارون یا عام تلغرافی کمپنیون[۱] کے توسط سے روز کے روز پہونچتی رہتی ہیں، اس کے خلاف فرانسیسی اخبارات کا حجم انگریزی اخبارات سی بہت کم ہوتا ہی۔ اکثر اخبارات ۴-۶- اور زائد سے زائد ۸ صفحون پر شائع ہوتے ہیں شاذونادر ہی کوئی اخبار دس صفحہ پر نکل جاتا ہی، بسا اوقات ایسا ہوتا ہی کہ اشتہارات واعلانات کے صفحات علٰحدہ سے شامل کر دئے جاتے ہین۔ لیکن انگریزی اخبارات کے مقابلہ میں ان نقائص کے باوجود فرانسیسی اخبار طباعت کی دیدہ زیبی و دل فریبی مضامین کی ترتیب اور عنوانات کے تنوع کے اعتبار سے اپنی اندر ایک امتیازی خصوصیت رکھتی ہیں، اس لحاظ سے اخبار کا پہلا صفحہ خصوصیت سے قابل ذکر ہی، پھر مختصر افسانے اور مسلسل قصے جو روزانہ اخبار کے دوسرے یا تیسرے صفحہ پر ہوتے ہیں،

[۱] نیوز ایجنسیون۔

خاص دلچسپی کا موجب ہیں۔

اکثر اخبارات میں بیشتر علمی، ادبی، فنی (آرٹ) مباحث، جدید مطبوعات پر تنقید تبصرے، تھیٹر، سینما، اور دیگر تفریحی مشاغل کے حالات چھپتے ہیں۔



پیرس کے اخبارات کی مواد کے لحاظ سے چھ قسمیں کی جا سکتی ہیں:-

(۱) اخبار (نیوز پیپر) یعنی وہ اخبارات جو صرف دنیا کے واقعات و حادثات بغیر کسی رائے زنی اور تعلیق کے شائع کرتے ہیں۔ اس قسم کے اخبارات میں اہم اخبار البتی پاریزتان ۱۸ لاکھ چھپتا ہے اور پیرس کا جمہوری اخبار سمجھا جاتا ہے۔ پھر "جورنال" متوسط طبقہ کا اخبار ہے، ایک ملیون کے قریب شائع ہوتا ہے۔ پھر "ماتان" ہے اس کے پڑھنے والے اہل سیاست اور سرکاری عہدیدار ہیں، تعداد اشاعت ، لاکھ ہے۔" البتی جورنال" مزارعین کا اخبار ہے چار لاکھ چھپتا ہے۔" الایکو دہ باری" کنسرویٹو پارٹی کا ترجمان ہے۔ دو لاکھ اشاعت ہے۔ لیکن اخبارات کی یہ تعداد اشاعت معین نہیں بلکہ ہر روز واقعات و حالات کے موجب کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔

(۲) جرائد آراء۔

اس قسم کے اخبارات اُن لوگوں کی دلچسپی کا موجب ہیں جو بحث و تمحیص، اور سیاسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اُنمیں سب سے اہم اخبار" الدوقر" ہے جو ڈیموکریٹک پارٹی کا ترجمان ہے۔ دو لاکھ پچاس ہزار چھپتا ہے۔" الکوتیدیان" اشتراکین کا اخبار ہے۔" الاکسیون" فرانسیس شہنشاہ پرستوں کا اخبار ہے پچاس ہزار اشاعت ہے اس کے علاوہ اس قسم کے اخبارات میں مندرجہ ذیل اخبارات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے

"الدکلیر" اور" الدفیز" دونون فوج کے ترجمان ہین۔

" الدیر نوفل" اشتراکیئن کا اخبار ہی

(۳) جرائد فاخرہ ، یہ اونچے طبقہ کے اخبار ہیں جس کا مقصد لطف صحبت ہی ان مین "زین رو" کو زیادہ اہمیت حاصل ہی، کنسر ویٹیو پارٹی کا ترجمان ہی پچاس ہزار اشاعت ہی، اسی طرح " التغلوی" ہی بمرا کسلیسر جو مستقل طور پر مصور شائع ہوتا ہی ۸۰ ہزار اشاعت ہی۔

(۴) مخصوص جرائد۔

یہ اخبارات فوج ، مالیات ، اقتصادیات ، تھیٹر اور ورزشی کھیلوں وغیرہ کے لئے مخصوص ہیں۔ انہیں اہم اخبار" کومدیا" تھیٹر کے لئے" الدوتو" اور" الدیگو دہ سبور" ورزشی کھیلوں کے لئے ہیں،" فران العسکریہ" فوج کا ترجمان ہے تقریباً دس مشہور اخبارات اُن لوگون کے لئے ہین جو بنک یا کسی تجارت سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۵) تیسرے پہر اور شام کے اخبارات۔

انہین سے بھی ہر ایک جداگانہ مقاصد کے ساتھ ساتھ شائع ہوتا ہی اور اکثر خارجی خبرون کی بجائے مقامی خبرون پر زیادہ توجہ کرتے ہیں بعض میں خبریں ذرا تاخیر سے شائع ہوتی ہیں لیکن اسکی وجہ یہ ہی کہ اس بارہ مین خوب تحقیق و تدقیق سے کام لیا جاتا ہی اور جبتک صحت پر یقین و اطمینان نہو شائع کرنے سے احتراز کیا جاتا ہی۔

اس قسم کے جرائد " الدلفور ماسیون" " باری میڈیون" اہمیت رکھتے ہین اور ڈیموکریٹک پارٹی کے اخبار مین " طان" جمہوری اخبار ہی ۸۰ ہزار اشاعت ہی" جرنل دہ دیبانہ" یہ بھی آزاد ویبلک طبقہ

کا اخبار ہے یہ دونوں اخبارات علمی و ادبی مباحث اور خارجی خبریں شائع کرنے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ "الانترنسیجان" جمہوری اور وطنی اخبار ہے ڈھائی لاکھ اشاعت ہے۔ "لاکردی" کیتھولک فرقہ کا اخبار ہے ۸۰ ہزار چھپتا ہے۔

اجنبی زبان کے اخبارات

انمیں سے اکثر انگریزی زبان میں ہیں، اس قسم کے اخبارات میں ڈیلی میل کو زیادہ شہرت ہے یہ گویا ڈیلی میل لندن کی شاخ ہے۔ پھر نیویارک ہیرلڈ رشید کا مو ٹریبیون، پارس ٹائمس، یہ مستقل اخبار ہیں اور اہل امریکہ (مقیم فرانس)، کے ترجمان ہیں۔

امیریکا اتلانتیہ۔ یہ ہفتہ وار اخبار ہے جو اسپینی، پرتگالی اور فرنچ میں شائع ہوتا ہے۔

صوبوں کے اخبارات

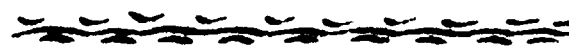
فرانس کا شاید ہی کوئی صوبہ ہوگا جہان سے کوئی روزانہ اخبار نہ نکلتا ہو اکثر روزانہ اخبارات چھ اور آٹھ صفحات پر نکلتے ہیں، انمیں سے اکثر (خصوصاً) لیون، مارسیلیا، تولون اور نیس کے اخبارات کے پیرس اور یورپ کے دیگر مقامات میں خصوصی مکاتب اور نامہ نگار رہتے ہیں۔

پیرس اور صوبوں کے اخبارات کے ہفتہ وار ضمیمہ بھی نکلتے ہیں۔ جو مختلف موضوع زراعت نسائیات اور نکاہات وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔

آج سے بیس برس پہلے فرانسیسی اخبارات کے دفاتر معمولی مکانوں یا تنگ گلیوں کی عمارتوں

میں پھیلے ہوئے تھے شارع مونمارتر معمولی قسم کے روزانہ نیز اکثر ہفتہ وار اخبارات کے دفاتر کا مرکز ہے، صبح کے وقت یا تیسرے پہر جس وقت آپ ان اخبارات کے دفاتر پر گذریں گے اخبار بیچنے والون کا ایک ہجوم ملے گا، یہ جلد سے جلد ان اخبارات کو پبلک کے ہاتھون مین پہونچانے کی سخت کوشش کرتے ہین، سہپر کے وقت اڈیٹرون اور چیف اڈیٹرون کا ایک گروہ ہوٹلون میں میز کے گرد کھانا کھانے مختلف قسم کی دلچسپ گفتگوؤن اور نکتہ سنجیون مین مشغول ملیگا،

پیرس مین اخبارات کے مشہور دفاتر مین ماتین اور طان کا دفتر الجران بونلفا مین البتی بادیزیان کا دفتر شارع لدغائین میں، الجورنال، کا دفتر شارع رلشیولیومیں ہے (غالباً ہر ایک) دفتر کی اوپر کی منزل پر تھیٹر اور لیکچر کے لئے ایک وسیع ہال بھی ہے۔



فرانس میں مجلات ورسائل اُنیسوی صدی کی ابتدا سے نکلنا شروع ہوئے اور اُس وقت سے روز بروز انمین ترقی ہوئی حتیٰ کہ اس وقت یہان سے دو ہزار سات سو رسائل نکل رہے ہین انمین سے اکثر علمی، ادبی، اجتماعی مباحث کے ذریعہ عوام کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہین، انمین بعض ہفتہ وار، بعض پندرہ روزہ اور بعض ماہوار شائع ہوتے ہین۔

جس وقت ان رسائل کے معاصرین نے محسوس کیا کہ جمہور عوام آسان اور سہل مباحث پسند کرتے ہین تو اُنھون نے گرانمایہ مصنّفین اور علمی سوسائٹی کے ممبرون کے علی الرغم عوام کی مرضی کے مطابق چلنا شروع کر دیا۔ قریب قریب تمام پبلشرس نے اپنے رسائل کو چمکانے اور اشاعت کو وسیع کرنے کے لئے بہترین تصاویر کا انتظام کیا حتیٰ کہ بیسیون رسائل نے صرف تصاویر ہی

شائع کرنا اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔

(۱) مجلہ الاستراسیون جو پہلے ایک خاص طبقہ کے لئے محدود تھا، بعید وسیع الاشاعت ہوگیا ہے، شاید ہی کوئی مجلس کوئی قہوہ خانہ ہوگا جسکی میز اس سے خالی ہوگی اسکی وجہ یہی ہے کہ اس نے ماہر انشا پردازون کے مضامین کے ساتھ بہترین تصاویر کا بھی زبردست انتظام کر رکھا ہے۔

فرانس کا سب سے قدیم علمی و ادبی رسالہ جو اپنے مقاصد پر استقلال کے ساتھ قایم ہے، مجلۂ العالمین ہے، یہ سخت اور کھرے کاغذ پر ماہ مین دوبار شائع ہوتا ہے تصویر نہین ہوتی، اس کے ہر نمبر مین سیاسی حالات کی مختصر لیکن غائر تاریخ ہوتی ہے نیز فرانس کی علمی، ادبی، فنی، ڈرامی تحریک و ترقی کا تذکرہ ہوتا ہے یہ رسالہ شروع ہی سے استقلال کے ساتھ سُرخ لباس ڈائٹل مین نکلتا ہے۔

(۲) مجلۂ پاریس، جو اسیقدر اہم ہے اس کا لباس بھی ہمیشہ زرد رہتا ہے اور کبھی نہیں بدلتا، اس کے مباحث مین مجلۂ عالمین کی بہ نسبت عمق اور گہرائی ذرا کم ہوتی ہے، ہر نمبر مین یادداشتین غور و خوض کے لایق مضامین مراسلات اور مشہور انشا پردازون کے اخلاقی مقالات و تراجم ہوتے ہین۔

(۳) مجلہ فرنسا اس کا ٹائٹل ایک نوجوان دوشیزہ کی تصویر سے جو دانہ بکھیر رہی ہے مزین ہوتا ہے اس سے اس کے اصلی مقصد یعنی نشر علوم و فنون کی جانب اشارہ ہے اس میں اوپر کے رسائل کے مقابلہ مین یہ خصوصیت ہے کہ اس مین افسانے کثرت سے ہوتے ہین نیز فرانس کی داخلی تاریخ بھی ہوتی ہے۔

موسیو فرنان لاڈو درکن مجمع العلمی فرانس) کا قول ہے کہ جو شخص صرف ان ہی تین رسالون کو دیکھتا

رہیگا، وہ مختلف علمی مباحث سے لاعلم اور ملکی وغیر ملکی علمی و ادبی ترقیون سے ناواقف نہین رہیگا۔ ان رسائل کے بعد مرکورہ "فرنس" کا رتبہ ہی جو پندرہ روزہ رسائل مین قدیم ترین رسالہ ہی اور ادبی حالات اور علمی وصحافی حالات کے اداریتی جزون کے لئے مشہور ہی۔

مجلۂ زرتار پہلے مجلہ علمیہ کے نام سے شائع ہوتا تھا، اسمین علمی و ادبی مباحث ہوتے ہین حالات حاضرہ سے دلچسپی رکھنے اور مختصر مضامین پسند کرنے والون کے لئے یہ رسالہ بہت بکار آمد ہی۔

"المجلۃ العالمیہ" پہلے مجلۃ المجلات کے نام سے پھر صرف المجلہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے اہم ترین مباحث اجنبی لیکن ماہر مضامین نگارون کے قلم سے ہوتے ہین اس کے علاوہ غیر ممالک کے رسائل کے مفید اقتباسات بھی دئے جاتے ہین اور مخصوص...... فرانسیسیون اور اجنبی اشخاص کے کہ جن کے نام اخبارون نیز اہل قلم کی زبان وقلم پر آگئے ہین دلچسپ ومضحکہ انگیز کارٹون بھی شائع ہوتے ہین۔ اس کا سب سے بڑا اشعار یہ ہی کہ "خیر الکلام ماقل ودل"

"مجلۃ العمومیتہ" ہر نمبر میں چار مضامین ہوتے ہین جنمین فرانسیسی حالات کی اصلاح کے لئے مشہور ترین اہل قلم لکھتے ہیں۔ "لاایز تال" یہ ہفتہ وار رسالہ ہی بیسٹیں صفحون مین تصاویر اور مختصر مضامین سبھی کچھ ہوتے ہین اس کے مباحث دلچسپ اور آسان ہوتے ہین اور ایک ایسے شخص کے لئے جو کتابون، تھیٹر اور ورزشی کھیلون وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیے کافی معلوم ہوتا ہے

"المجلۃ السیاسیتہ والبرلمانیہ" ماہوار ہی اور فرانس اور غیر ممالک کے سیاسی وقانونی مباحث پر مشتمل ہی۔

"المباحث" کیتھولک فرقہ کا رسالہ ہی فرانس کے پادری نکالتے ہین۔

"مجلتہ فرنسا امیرکا" یہ فرانس وامریکی انجمن کا ترجمان ہی، امریکہ کی اقتصادی تجارتی اور مالی مسائل کی نشر واشاعت اُس کا مقصد ہی اس کے علاوہ فرانس، پیرس اور آرٹ وغیرہ کی تحریک وترقی کا بھی تذکرہ ہوتا ہی۔

یہ رسائل اُن عام رسائل کا ایک نمونہ ہین جنکی ہر اُس شخص کو جو علم وفن پر پورے طور پر وقوف حاصل کرنا چاہتا ہی سخت ضرورت ہی، ان مخصوص مجلات کے علاوہ شاید ہی علم وفن یا دوسرے مقاصد کی کوئی انجمن ہوگی جسکا کوئی آرگن نہ ہو اور اس انجمن اور اس علم وفن کے شایق اُس کی طرف توجہ نہ کرتے ہون۔



نواب برہان الملک سید محمد امین سعادت خان بہادر برہان جنگ

فرمانروائے اولین اودھ

(از جناب حسن عابد جعفری صاحب (دکسن) بیرسٹرایٹ لا اڈیٹر شمع)

چونکہ ولادت نیشاپور میں ہوئی تھی، صحیح تاریخ اور سنہ پیدائش نہیں معلوم، البتہ اسقدر تحقیق ہے کہ وہ ۱۱۲۰ھ میں اپنے والد بزرگوار میرزا نصیر اور اپنے بھائی محمد باقر سے ملنے کے لئے عظیم آباد (پٹنہ) میں وارد ہوئے وہاں معلوم ہوا کہ والد بڑے بھائی کے سلوک سے تنگ آکر شاہجہان آباد چلے گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے، میر محمد امین نے رائے رتن چند، دیوان وزیر اعظم قطب الملک عبد اللہ خان سے ربط پیدا کیا، اور ۱۱۳۱ھ میں پرگنات ہنڈون اور بیانہ کی (جنکی آمدنی آٹھ لاکھ سالانہ تھی) سند حاصل کرکے وہاں کے انتظام میں مشغول ہوگئے۔ اور بعد کو نواب محمد تقی خان صوبہ دار اکبر آباد کی بیٹی سے عقد ہوگیا۔ اسی زمانہ میں فرخ سیر کا قتل، رفیع الدرجات کی تخت نشینی اور پانچ ماہ چند یوم کے بعد گوشہ نشینی اور قید کی نوبت آئی اور محمد شاہ تخت نشین ہوئے، یہ سب باتیں سید حسین علیخان اور عبد اللہ خان قطب الملک کے اشارے سے ہوئی تھیں، اور انہیں واقعات سے متاثر ہوکر میر حیدر خان رفیق و معتمد محمد امین خان کو کنی نے



نواب برہان الملک سید محمد امین سعادت خان بہادر

فتح پور سیکری میں جبکہ حسین علیخان بادشاہ سے ملکر پالکی میں اپنے محل کو واپس جا رہے تھے، ایک درخواست پیش کردی۔ سید حسین علیخان درخواست میں مصروف ہوئے حیدر خان کو موقع مل گیا اور خنجر نکال کر شہید کردیا۔ اُسی وقت حیدر خان کے تکے بوٹی کردئے گئے، مگر عجیب وغریب سیاسی انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی۔ قطب الملک عبداللہ خان دکن میں صوبہ دار تھے، بھائی کی شہادت کا حال سُنکر فوراً زبردست لشکر لیکر دہلی آگئے۔ اور اپنے متوسلون اور رفیقون کو طلب کیا تاکہ پورے تزک واحتشام کے ساتھ سید حسین علیخان کے خون کا بدلہ لیں، میر محمد امین اگرچہ رائے رتن چند کے آوردے تھے، مگر مصلحت وقت کو دیکھکر چودہ ہزار سوار جمع کرکے امین خان کوکنی سے جا ملے، اور اس طرح محمد شاہ کی فوج میں داخل ہوگئے۔ بادشاہ نے خطاب سعادت خان سے سرفراز کیا، عبداللہ خان کی گرفتاری کے بعد بادشاہ نے سعادت خان کو عہدہ داروغگی خواصان حضور پر سربلند کیا، اور اکبرآباد کا ناظم مقرر کردیا، عنایات خسروانی روز بروز بڑھتی گئیں، یہانتک کہ ۱۱۳۲ھ کے آغاز مین اُن کو صوبہ اختر نگر اودہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اُس زمانہ مین صوبہ مذکور گردھر بہادر ناگر کے سپرد تھا، اور بد انتظامی اور آئے دن کے فتنہ وفساد کی وجہ سے میدان کارزار بنا ہوا تھا، بادشاہ نے سعادت خان کو دہلی طلب کیا، اور خلعت صوبہ اختر نگر سے ان کو، اور خلعت صوبہ اکبرآباد سے راجہ جے سنگھ کچھواہا کو معزز فرمایا۔ تاریخ تقرر حسب ذیل ہے:-

نواب محمد امین یافت   تشریف اودہ بقدر افزون
گفتش ملک از سر بشارت   تشریف اودہ بود ہمایون ۱۱۳۲

بعض مورخین کا بیان ہے کہ سعادت خان کی ترقی سے اہل دربار جلتے تھے، انھون نے

موقع غنیمت سمجھکر اودہ کا صوبہ دار مقرر کرادیا، کیونکہ وہان قتل ہوجانے کا احتمال تھا، سعادت خان اس چال کو سمجھ گئے۔ مگر تھے آدمی دلیر اور بہادر، کمرہمت باندھکر مستعد ہوگئے، اورسب سے پہلے دہلی کے آوارہ گرد مغلونکو جمع کیا، جو مارے پھرتے تھے، اور سخت بدمعاش تھے، سعادت خان کے جھنڈے کے نیچے سب آگئے، اور لمبی لمبی کالی ٹوپیان پہنکر آغا بن گئے۔ دہلی کا خزانہ خالی تھا، اس لئے خان لشکر لیکر بے سازوسامان چل پڑا، اس کے ذہن کی جودت اور انتظام کی لیاقت دیکھو کہ پہلے توسیدہا اکبرآباد پہونچا، یہان صوبہ دار سے زرنقد حاصل کیا اور مفلوک الحال فوج مین تقسیم کیا، دوسرا پڑاؤ بریلی کا تھا۔ وہان بھی روپیہ ملا۔ اور جب فرخ آباد پہونچا توگھوڑے اور ٹٹو خرید کر فوج مین تقسیم کئے اور اس طرح پر اچھی خاصی فوج تیار کرلی،

بعض مورخین کو اختلاف ہے وہ کہتے ہین کہ گردھر بہادر ناگر اودہ کا صوبہ دار نہ تھا، بلکہ صوبہ داری شیوخ، اور شیخ زادون کے ہاتھون مین تھی جن کا سرغنہ شیخ عبدالرحیم تھا، خان نے پہلے کاکوری کے شیوخ کو اپنی طرف کرلیا، اور پھر گئو گھاٹ سے دریا کو عبور کرکے لکھنؤ مین داخل ہوئے یہان بھی مورخین مین اختلاف ہے، بعض کہتے ہین کہ خان موصوف نے پہلے موہن سنگھ تعلقہ دار تلوی کو شکست دیکر قتل کیا اور اس صلہ میں بادشاہ سے خطاب بہادر جنگ کا ملا، اور سال اول مین اودہ کی مال گزاری بجار ستر لاکھ کے ایک کروڑ سات لاکھ ہوگئی۔ اس حسن خدمت پر برہان الملک کے خطاب سے فائز ہوئے۔

بالاجی پیشوا نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ یک بارگی حملہ کیا، مگر برہان الملک نے ۱۷۳۷ء میں اس حملہ کو بشرایط سخت رد کردیا ۱۷۳۸ء مین نادرشاہ نے حملہ کیا مگر اس زمانہ مین

برہان الملک کے پیر مین دُنبل نکل آیا۔ اور وہ شاہ جہان آباد مین فوت ہوگئے۔ ہندوستان مین ان کا قیام ۳۱ سال رہا، اور نظم و نسق مین ۲۳ سال مصروفیت رہی، نعش کربلائے معلی بھیجی گئی تھی، اُن کی دختر نواب بیگم تھی جسکی شادی نواب نے اپنے بھانجہ مرزا مقیم سے کردی تھی، یہی بعد کو صفدر جنگ کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

نواب برہان الملک، نہایت شجاع، بلند حوصلہ، سپاہی اور نہایت دُور اندیش مدبّر تھا، اودھ کو اُس نے ایسی گرفت مین لیا کہ تا دم مرگ صوبہ داری سے جدا نہ ہوا، اُس کا خزانہ معمور تھا، افواج باترتیب تھین، صوبہ مین امن و آرام تھا، اور خود ذاتی حیثیت سے ایسا اثر پیدا کرلیا تھا کہ اُسی کی زمانہ سے اودھ کی خودمختاری کی داغ بیل پڑگئی، اور اسکی وفات کے بعد اُس کا داماد صفدر جنگ صوبہ دار ہوا، غرضکہ عملی حیثیت سے نواب برہان الملک اودھ کا پہلا بادشاہ تھا، اگرچہ بظاہر صوبہ دار اور دہلی کے بادشاہون کا نمک خوار تھا! فقط



نوٹ:۔ یہ سلسلہ مضامین محض تصاویر کی وجہ سے شروع کیا گیا ہے، تصاویر قلمی ہین اور نہایت نفیس ہین، اور اپنی وضع کا یہ ایک ہی مجموعہ ہے، جو باقساط ہر ماہ ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ نواب برہان الملک کے حالات لکھنے مین قلمی تواریخ سے مدد لی گئی ہے، قلمی تصاویر اور قلمی تواریخ راقم الحروف کے پاس موجود ہین۔

تبصرے

شعر الہند

حصّہ اول

مصنّفہ

جناب مولوی عبد السلام صاحب ندوی

تقطیع بڑی، ضخامت ۵۴۴ صفحے، کاغذ چکنا، لکھائی چھپائی معارف پریس اعظم گڑھ کی ہے اور قابل تعریف ہی، کتاب دیباچہ اور چار ابواب مین تقسیم ہی۔ پہلے باب مین "اردو شاعری کا آغاز سے لیکر تبعین شعرائے قدیم تک" دوسرے باب مین "متوسطین کا پہلا دور سے لیکر متوسطین کا دوسرا دور اور تلامذۂ مومن و غالب تک" تیسرے باب مین "متاخرین کا پہلا دور سے لیکر متاخرین کا دوسرا دور تک" اور چوتھے باب مین "دور جدید سے بحث ہی، یعنی قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے۔ اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے"۔

اِس کے علاوہ لایق مصنّف نے یہ بھی ظاہر کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ "انواع شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجودہ زبانون مین اردو کا کیا درجہ ہی؟" ۷۴ اردو تذکرون کی فہرست دیکر

اُنھون نے بالکل بجا طور پر اظہار افسوس کیا ہی کہ امین" اُردو شاعری کے ہر دور کی خصوصیات عہد بہ عہد کی ترقیون کے حالات اور اُن کے علل واسباب کی تلاش ایک بے سُود کوشش ہے" اور بقول "ڈی ٹاسی" اگر کوئی کام کی چیز ہے تو وہ شعرا کے کلام کا انتخاب ہی"

پہلے باب مین مصنف بھی تسلیم کرتے ہین کہ اُردو کا مکمل خاکہ اگرچہ عالمگیر کے زمانہ مین تیار ہوا لیکن تیمور کے زمانہ تک دکن کے اُس حصّہ مین جہان مسلمان بادشاہ تھے، ہندو اور مسلمانون کے میل جول سے اُردو مستقل زبان بن چکی تھی، جہانگیر کے عہد مین آدھی تیتر آدھی بٹیر شاعری تھی یعنی اُردو اور فارسی مخلوط تھی، چنانچہ "مُلّا نوری" کا شعر ہے :-

ہرکس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہی نہ ڈرے ہے

ظاہر ہی کہ جب جہانگیر کے دور حکومت مین اُردو اس قدر صاف تھی تو اُس سے قبل یعنی اکبری عہد مین بھی وہ قطعی مفقود نہ تھی، اور مصرعہ ثانی کی زبان بتاتی ہی کہ اس پر کچھ عرصہ سے مشق ہو چکی تھی ورنہ یہ جِلا نہ آتی،

صاحب تصنیف چند اہم تاریخی شہادتون کو پیش کرکے فرماتے ہین کہ "سب سے پہلے قطب شاہیون کے دور حکومت مین اُردو شاعری کا پتہ چلتا ہی" اور اسکی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ۹۱۸ھ کے بعد جب شیعون کو دکن میں فروغ ہوا تو مجالس عزا کا عام رواج ہوگیا جن مین پُرانی ملکی زبان کے اشعار اور فارسی شعرا کے کلام کے ساتھ محتشم کاشی کے بند اور مراثی کثرت کے ساتھ پڑھے جانے لگے" محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے :-

سدا تو مدح علیؑ اور نبی کی کہتا ہے
معانی شعر ترا تو لکھے ہین دست بدست

یہ تاریخی مسالہ صرف ۲۳ صفحے پر آیا ہی، اور اگرچہ اس مین بھی تحقیق کا رنگ ہی مگر کوئی نئی دریافت یا تحقیقات نظر نہین آتی ہے، یہی ایک ایسا موضوع بن سکتا ہی کہ جس پر مستقل کتابین لکھی جائین۔

"قدما کا پہلا دور اور دکن مین اردو شاعری کا آغاز" مین لائق مولف فرماتے ہین کہ "اردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا اور ولی کے زمانہ تک مذہبی خیالات شاعری کا جزو غالب رہے....... تاہم ولی اور سراج کے زمانہ تک اس پر بھاشا اور سنسکرت کا اثر قایم رہا لیکن سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے عہد سے عاشقانہ شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ ارتقار کی حیثیت سے اردو شاعری مین یہ زمانہ نہایت قابل قدر ہی اور اس امر کا محتاج ہی کہ اس پر وضاحت کے ساتھ بحث کی جائے اور تحقیق و تدقیق کا حق ادا کیا جائے، لیکن یہان پھر ہم کو اپنے بزرگون سے شکایت ہوتی ہی۔ جو ارتقار شاعری، اور ارتقار زبان و ادب کی قدر و قیمت کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے، چنانچہ میر حسن شعرار دکن کے عیب و حسن کے متعلق فرماتے ہین کہ "اکثر اشعار ایں ہا در بحر کبت بہ نظر آمدہ چون الفاظش ربط بہ یکدیگر نہ داشتند بقلم نیاورد" اور" اس دور کی شاعری کو ناقابل اعتبار سمجھکر بالکل نظر انداز کر دیا ہی"۔ صدیون کی ظلمت کو دور کرنا موجودہ زمانہ کے مورخون کے حصہ مین آیا ہی، اور مولانا نے اس کوچہ مین بہت احتیاط کیساتھ قدم رکھا ہی چنانچہ تقریباً ہر بات کو قدیم تذکرہ نویسون سے اخذ کرکے لکھا ہی اور حتی الوسع اپنی رائے

کو محفوظ رکھا ہی۔ تاریخی نقطۂ نظر سے مولانا نے یہ ثواب کا کام کیا ہی، ورنہ ہمارے مؤرخون کا تو یہ حال ہی کہ بلا حوالہ اور بلا اقرار استفادہ محض اپنی ذاتی رائے کو پیش پیش رکھکر تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کی داد دیا کرتے ہین۔ افسوس ہی کہ یہ حصہ بھی مختصر ہی اور ہم کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مؤلف نے زیادہ کاوش اور تحقیق سے کام نہین لیا ہے، دکن مین اس موضوع پر کافی مواد فراہم ہوچکا ہی۔ اور ممکن ہے کہ اگر جناب مولف توجہ فرماتے تو تاریخی حیثیت سے ماسبق باب اور موجودہ باب پر اور زیادہ لکھ سکتے تھے، غالباً یہ خدمت مولانا نے عمداً اہل دکن کے لئے چھوڑ دی ہے۔ کیونکہ اس کتاب مین زیادہ شرح وبسط کی گنجایش نہیں تھی،

" قدما کا دوسرا دور اور اُردو شاعری کی تجدید و اصلاح " میں جو باتین قابل توجہ ہین وہ حسب ذیل ہین:۔

(۱) ایہام گوئی کا رواج تھا اُس کی اصلاح ہوئی۔

(۲) بھاشا ہنسکرت اور دکنی الفاظ کو خارج کر کے زبان کو دہلی کے محاورے کے مطابق بنایا۔

(۳) متاخرین شعرا فارسی کے طرز پر اُردو شاعری کو ڈہالا گیا۔

(۴) فارسی ترکیبون، اور فارسی محاورون کے ترجمے احتیاط سے کر کے اُردو مین داخل کئے گئے۔

اس باب مین مؤلف نے اپنی وسعت نظر کا کافی ثبوت دیا ہی، اور حقیقت مین یہ مختصر باب قابل قدر ہی۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اسی دور سے عربیت اور فارسیت نے اُردو پر جہان احسانات کئے وہان یہ شدید ظلم بھی کیا کہ اُسکو بھاکا سے دُور کر دیا اور ایسے الفاظ تک کہ جو ہماری زبانون

پر چڑھے ہوئے تھے اور ہماری معاشرتی زندگی کے لئے ضروری تھے نکال پھینکے جن کا نعم البدل اب تک نہین ملا - اور اب وقت ہی کہ اُن نقصانات کی تلافی کی جائے اور اُردو مین بھاشا الفاظ پھر حسب ضرورت داخل کئے جائیں۔

میر و مرزا کے عنوان سے مؤلف نے ایک دلچسپ بحث چھیڑی ہی، اور سودا کی خوبیان دکھانے کی کوشش کی ہی۔ میر و سودا - آتش و ناسخ، انیس و دبیر وغیرہ وغیرہ کے موازنے تو پرانے قصے ہو چکے ہین اور جیسے جیسے مذاق مین تبدیلیان ہوتی جائینگی ویسے ہی ویسے شعرا کی قدردانیان اور ناقدردانیان ہوتی رہنگی۔

میر و مرزا کی طبیعتوں کی اُفتاد جدا ہی، ایک فطری شاعر ہی تو دوسرا مشاق اور ذہین صاحب فن ہی۔ جہان مولانا انتخاب کلام کے ذریعہ سے دونون شعرا کا موازنہ اور مقابلہ کرتے ہین وہان وہ بغیر کچھ کہے ہوئے سب کچھ کہہ جاتے ہین، اور ماننا پڑتا ہی کہ مولانا کا مذاق سلیم اور تلاش وسیع ہے۔

قدما کا تیسرا دور، لکھنؤ مین شاعری کا آغاز: - ایک سبق آموز باب ہی جو محنت سے لکھا گیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری کے متعلق مصنف کا یہ نوٹ یاد رکھنے کے قابل ہی "غرض اس دور مین شاعری ایک لازمۂ امارت بن گئی تھی اور تقریباً ہر امیر کے دربار مین جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ آئیگا شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قایم ہو گیا تھا جو شعرا کی معاش اور قدردانی کا اصلی ذریعہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور مین شعرا کے کلام کی تمام تر کامیابی اُمرا و سلاطین کی پسندیدگی پر موقوف رہ گئی اور بڑے بڑے اساتذہ اُن کا مُنہ تکنے لگے" حالانکہ بقول مصحفی "والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رود"۔

مولانا کا یہ قول بھی بالکل سچ ہو کہ "سب سے بڑھکر یہ کہ میر و مرزا کے زمانہ تک اگرچہ شاعری مین مختلف اصلاحین ہوچکی تھین تاہم ابتک اُس کا کوئی ضابطہ و اصول مقرر نہیں ہوا تھا لیکن مصحفی نے اُسکو ایک خاص اصول و آئین کا پابند کردیا...... اور قدما کے کلام مین جو شتر گربگی یعنی ناہمواری پائی جاتی تھی اُسکو بالکل مٹا دیا"

اسی ضمن مین "مصحفی اور انشا" کے عنوان سے مولانا نے نفیس بحث کی ہو۔ مگر دشواری یہ آپڑی ہے کہ یہاں بھی مولانا اپنا دل مضبوط کرکے صاف الفاظ مین مصحفی کا ساتھ دینا نہیں چاہتے ہین، دبی زبان مین وہ مصحفی کو انشا سے بہتر شاعر سمجھتے ہین، زبان کے معاملہ مین تو اُنکی رائے بالکل صحیح ہے کہ مصحفی کی زبان انشا سے زیادہ صاف ہو۔

مندرجہ بالا ابواب کے بعد مولانا نے ایک جدت پیدا کی ہو اور تلامذہ شعرائے قدیم کی سُرخی قایم کرکے مشہور شاگردون کی خصوصیات شاعری پر عالمانہ بحث کی ہو۔

اسی طرح "متبعین شعرائے قدیم" کے باب مین شروع سے ابتک کے متبعین کا ذکر کیا ہو۔ اور تلاش اور تجسس کا بہترین نمونہ پیش کیا ہو۔ متبعین میر مین غالب کو بھی داخل کرلیا ہو اور حق یہ ہو کہ جس حیثیت سے اُن کو اس زمرہ مین شامل کیا گیا ہو وہ ادبی لحاظ سے بالکل ٹھیک ہو، کیونکہ بار بار غالب نے میر کا تتبع کیا ہو، اور خود ان کا کلام اس دعویٰ کی بہترین تائید ہو لیکن انصاف یہ ہو کہ غالب کا ایک علحدہ دور قایم کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کا اسکول جداگانہ حیثیت رکھتا ہو، اور اس لحاظ سے بھی کہ انھون نے زبان کو بہت وسیع کردیا ہو وہ ضرور ایک خاص دور کے مُوجد تھے۔

ذوق سے مولانا بہت خفا ہین، اور اُس غریب کو یا اُس کے شاگردون کو جن مین محمد حسین آزاد

شامل ہین کوئی مستقل جگہہ نہین دی گئی ہی۔

دوسرا باب متوسطین کا پہلا دور، شیخ ناسخ، یہ باب قابل توجہ ہی۔ اور مولانا کا ارشاد بالکل بجا ہے کہ "میر و مرزا نے زبان کی اصلاح کا کوئی ضابطہ اور دستورالعمل نہین بنایا تھا، بلکہ جس لفظ اور جس ترکیب کو مناسب سمجھتے تھے چھوڑ دیتے تھے، اور جس لفظ اور ترکیب کی ضرورت ہوتی تھی اُس کو استعمال کر لیتے تھے .... لیکن ناسخ نے شعر و سخن کے متعلق نہایت متشددانہ اصول اختیار کئے۔ یعنی یہ کہ

(۱) عروض و قافیہ کے اصول سے وزن و شعر درست ہو۔

(۲) معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول کا لحاظ رہی تنافر، غرابت اور تعقید نہ ہو۔

(۳) لغات صحت کے ساتھ استعمال کئے جائین۔

(۴) غیر زبان کے حروف نہ دبنے پائیں، ہندی کے حروف دب سکتے ہیں، مگر کم،

(۵) قافیہ کے اصول سب برتے جائیں۔

(۶) بندش چست، الفاظ زاید، حشو اور بلا ضرورت نہ آنے پائیں۔

(۷) جتنے کم الفاظ مین مطلب ادا ہو سکے اتنی ہی فصاحت و بلاغت کے اصول کی پابندی ہوگی۔

(۸) ذم اور ابتذال کا پہلو شعر مین نکلنے نہ پائے۔"

ناسخ کے متروک الفاظ کی ایک طویل فہرست مولانا نے داخل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے زبان کی درستی مین غیر معمولی حصہ لیا تھا اور اُن کو مُصلح زبان اُردو لکھنا غلط نہ ہوگا لیکن اس جکڑبند نے لکھنؤ کی فضا مین جو زہریلا اثر پیدا کیا وہ تشریح کا محتاج نہین ہے۔

یہان پر یہ نکتہ قابل غور ہی کہ اُردو مین عربی و فارسی کے بیجا استعمال کے ذمہ دار صرف شعراء

لکھنؤ ہی نہیں ہیں بلکہ شرفار اور علما، لکھنؤ بھی ہیں جن کی زبان پر ابتک عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ چڑہے ہوئے ہیں، اور جن کی بدولت زبان اُردو عوام کی بول چال سے بہت علیحدہ ہو گئی ہے۔

اُردو شاعری کے دو مختلف اسکول۔ دلّی اور لکھنؤ۔ پامال عنوان ہے لیکن مولانا نے یہاں بھی اپنی تلاش، اور محنت کی داد دی ہی، اور دہلی کی 'آہ' اور لکھنؤ کی 'واہ' سے بہت آگے نکل کر نہایت سنجیدگی سے دونوں اسکولوں کے فرق کو دکھانے کی کوشش کی ہے چنانچہ اساتذہ کے کلام سے ابتدا کرکے اُن کے شاگردوں تک شاعری میں جو اسکولی تفریق ہی۔ ظاہر کردی ہی ممکن ہے کہ اس باب سے اہل لکھنؤ خفا ہوں، مگر حق یہ ہی کہ اگر مرثیہ گو شعرا، اور چند دیگر غزل گو حضرات لکھنؤ کو علیحدہ کر دیا جائے تو لکھنؤ کی شاعری شاعری نہیں ہی۔ البتہ شعرا لکھنؤ نے زبان کو صاف کرنے میں جو حصہ لیا ہی اُس کا جواب نہیں۔ ہمارا اعتراض تھا کہ مرثیہ گو شعرا کو کس اصول کے تحت میں مولانا نے قطعی فراموش کر دیا ہی۔ مگر حصہ ثانی میں مولانا نے اس کی تلافی کردی ہی۔

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش پر جو بحث کی گئی ہے اُس کا مقصود صرف اس قدر ہی کہ خود لکھنؤ میں شاعری کے دو اسکول قایم ہو گئے۔ یہ بحث ایسی نہ تھی کہ اس کے واسطے جدید عنوان قایم کیا جاتا۔ ماسبق عنوان میں اس کی بھی کھپت ہوسکتی تھی۔ غالب کا کوئی اسکول قایم نہیں کیا گیا ہی حالانکہ غالب کی شاعری اور اُن کی فارسی ترکیبیں اور اداے بیان ایسی باتیں تھیں کہ اساتذہ تک اُن سے مُستفید ہوئے تھے۔

آتش و ناسخ کے متعلق جو باتیں مولانا نے لکھی ہیں اُنمیں فرسودگی نہیں ہے بلکہ شباب کی کیفیت ہے

اساتذۂ دہلی سے گذر کر متوسطین کا دوسرا دور۔ تلامذۂ آتش و ناسخ کے عنوان سے مولانا نے

سلسلۂ ماسبق کو جاری رکھا ہی اور اگرچہ عنوانات جدا گانہ ہین لیکن یہ باب ماسبق باب کا ایک ضروری جُزو ہی جو زبان اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے ناگزیر ہے، کیونکہ اس دور کے شعراء نے اُس کمی کو پُورا کیا جو زبان اور شاعری مین خواجہ آتش اور شیخ ناسخ چھوڑ گئے تھے۔ یہان ہم بڑی حد تک یعنی جہانتک کہ زبان کا تعلق ہی مولانا سے متفق ہین مگر جہانتک شاعری کا تعلق ہے اختلاف ہی کیونکہ اس دور کی شاعری مصنوعی شاعری ہے اور شاعری کے حقیقی معیار سے خارج ہے البتہ زبان کی صفائی محاورون کی کاٹ چھانٹ، اور حُسن بیان کی نُدرتین جو اس دور مین نظر آتی ہین وہ نہایت بلند مرتبہ ہین۔

تلامذۂ مومن و غالب نہایت مختصر اور تشنہ باب ہی کاش کہ مولانا اس بددلی کے ساتھ اس موضوع پر قلم نہ اُٹھاتے۔

متاخرین کا پہلا دور، ریاست رامپور عجیب چیز ہی، اور چونکہ زمانہ قریب سے تعلق رکھتا ہی اور کافی مسالہ موجود تھا اس لئے مولانا نے جی لگا کر لکھا ہے، اور داغ، امیر اور منیر وغیرہ کے بارے مین مولانا کی گلفشانیان لایق داد ہین، مولانا مین بڑی خوبی یہ ہی کہ کوئی بات بغیر سوچے سمجھے نہین کہتے ہین۔ اگر کسی بات کا دعویٰ کرتے ہین تو اُس کے ساتھ ساتھ دلیل بھی پیش کرتے ہین۔ جہانتک ممکن ہوتا ہی قدیم نقادون کی رائے پیش کر کے اس کے تحت مین چلنا چاہتے ہین، مگر آزاد خیالی جو نقادی کی رُوح ہی وہ مولانا سے جدا نہین ہوتی ہے۔ اور یہی وہ صفت ہی کہ جسکی وجہ سے یہ تصنیف ایک گلستان ہے جو تر و تازہ اور پُر بہار پھولون سے لدا ہوا ہی۔

رامپور کسی زمانہ مین شعراء اردو کا مرکز تھا۔ غالب اور مومن سے لیکر داغ، امیر، جلال، اسیر وغیرہ

وغیرہ سب ہی تو وہان جمع تھے مصنّف نے ان کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہو اور اُن تمام جھگڑون سے بحث کر چلے ہین جنھون نے پچاس ساٹھ برس تک جنگ زرگری جاری رکھی لیکن علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے فائدہ خاک نہ ہوا۔ اس عہد کے مشہور شعرار کے شاگردون کی شاعری پر بھی مولانا نے مجملاً نظر ڈالی ہے۔ افسوس ہو کہ ریاض اور جلیل کے متعلق مولانا کے قلم سے کہیں کہیں ایسے الفاظ نکل گئے ہین جن کو پڑھکر اُن کے ہوا خواہ مولانا کا شکریہ ادا نہ کرین گے۔

میر و میرزا، مومن و غالب، ناسخ و آتش، امیر و داغ کی شاعری پر بحث کرنے کے بعد دَور موجودہ کے اکثر شعرار کے کلام پر بحث کرتے ہوئے نقاد کو خود ذلت محسوس ہوتی ہے اور کوئی تعجب نہین ہے کہ وہ اپنے قلم کو اوج سے پستی مین دیکھکر ایسے الفاظ لکھ بیٹھے جو زمانہ موجودہ کے شعرار کی دلشکنی کا باعث ہون۔

امیر کے شاگردون کے بارے مین مولانا کا خیال صحیح ہے کہ " ان سب کو شعرار لکھنؤ پر متعدد وجوہ سے فضیلت حاصل ہو، یعنی اُن کے کلام مین سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہو، تھوڑا بہت سوز و گداز بھی پایا جاتا ہو، کلام مین ہمواری اور یک رنگی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ معشوق کے خارجی اوصاف مثلاً کنگھی، چوٹی۔ شانہ، و آئینہ کے بجائے زیادہ تر اُن کا کلام معاملات اور واردات پر مشتمل ہو"۔

چوتھا باب دورِ جدید کی ابتدا مین مصنّف نے صاف الفاظ مین موجودہ مذاق شاعری کی تشریح کرکے چند کلیے قایم کر دئے ہین، اور انہین کی پابندی مین آجکل کے شعرار اپنی مشق بہم پہونچا رہے ہین مثلاً اخلاقی اور تمدنی مضامین کی آمیزش، اور مناظر قدرت کا سمان دکھانا مسلسل طور پر کسی خاص کیفیت

یا جذبہ کا، غزل میں اظہار کرنا، ردیف کو بالائے طاق رکھنا، بلکہ بعض مواقع پر قافیہ کو بھی خیر باد کہدینا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بقول مولف "اس طرز نے اگرچہ اردو غزل گوئی میں اخلاق، تصوف بلکہ علم کلام تک کے بہت پاکیزہ خیالات داخل کر دیئے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے خیالات سے غزل کی لطافت میں بہت کچھ فرق آگیا، اس لیئے جن شعراء نے ان اصلاحات کے ساتھ غزل کی اصلی شان قایم رکھنا چاہی انھوں نے لکھنؤ کے قدیم رنگ کو چھوڑ کر قدما کی سادہ روش، اور دلی کی متانت آمیز رنگ کو اختیار کیا۔"

اس زمرہ میں حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی وغیرہم ہیں لیکن تعجب ہے اور سخت تعجب ہے کہ مصنف نے جناب محشر لکھنوی، جناب صفی لکھنوی، اور جناب ثاقب لکھنوی کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے۔

علامہ اقبال۔ عالی، چکبست، محمد حسین آزاد مرحوم، اکبر الہ آبادی، سرور جہان آبادی وغیرہ کے کلام کے نمونے بھی پیش کیئے گئے ہیں مگر پھر بھی بعض اچھے اچھے شاعر رہ گئے، جن کی عدم شمولیت کی کوئی وجہ مولانا نے ظاہر نہیں کی ہے، مولانا نے دو بڑی بڑی فہرستیں بھی دی ہیں جنمیں بعض شعراء کے کلام کا حوالہ دیا ہے۔ مگر مثال میں ایک شعر بھی پیش نہیں کیا ہے۔ غالباً مولانا کتاب کی ضخامت سے ڈر گئے، اور محض نظموں کے عنوانات اور شعراء کے نام لکھنے پر قناعت کی، اگر یہی وجہ اختصار کی تھی تو خیر، ورنہ مولانا فہرست کو تو مختصر کر دیتے اور چوٹی کا کلام ضرور کچھ نہ کچھ کتاب میں داخل کرتے۔

غرضکہ پوری کتاب ۴۴۵ صفحوں پر ختم ہوتی ہے، اور خاتمہ کے بعد پڑھنے والے کے دل میں خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصنف کو ۴۴۵ صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت بھی تھی یا نہیں؟ ہمارے

پہلے سوال کا جواب بالکل صاف ہے کہ جو دعویٰ مُصنّف نے پیش کئے تھے اُن کو بہت کچھ پُورا کر دکھایا ہے، مولانا کے بعض خیالات سے اختلاف کا ہونا، یا اُن کے قایم کردہ دور ہائے شاعری کو تسلیم نہ کرنا فی نفسہ کتاب کی قدر و قیمت کو کم نہین کرتا ہے۔ کیونکہ اس مین تاریخی تغیرات، اور تنقید کا مسالہ بہت کافی موجود ہے یہ تصنیف صحت مذاق کو اُکساتی ہے۔ دلچسپ تاریخی تغیرات کی تحقیق کی طرف متوجہ کرتی ہے، اور پڑھنے والے کے دل مین تنقید کا ولولہ پیدا کرتی ہے، ہماری رائے مین یہی مقصد تصنیف ہے۔ اور اس کسوٹی پر پورا اُتر کر مولانا یقینی طور پر کامیاب ہین اور مبارکباد کے مُستحق ہین۔

ہم کو" مسرت آمیز ندامت" ہے کہ جو کام انگریزی لکھے پڑھے لوگون کو کرنا چاہئے تھا وہ ایک عربی دان مولوی صاحب نے لاکھون روپیہ سالانہ خرچ کرنے والی یونیورسٹیون سے الگ، اعظم گڑھ سے دُور اُفتادہ، اور دار المُصنّفین سے بے سرمایہ مقام پر رہ کر ہوشمندی اور خوبی سے انجام دیا ہے!

قبل اس کے، کہ ہم ریویو کو ختم کرین دو باتین ضرور عرض کرنا چاہتے ہین:-

(۱) بعض مقامات پر اس کتاب کے متعلق ہم کو خلاف واقعہ تنقیدین نظر آئین۔ اور محض اُن کی بنا پر ہمارا بھی خیال تھا کہ مولانا کی تصنیف کچھ یون ہی سی ہوگی مگر مطالعہ کتاب کی بعد ہم کو گونہ رنج ہوا کہ بعض اخبارات اور رسائل کے اڈیٹر تنقید کرتے وقت انتہائی تعصب سے کام لیتے ہین، اور دار المُصنّفین کی کوششون کو بدنام کرنا چاہتے ہین۔ اس قسم کی باتین انصاف سے بعید ہین۔

(۲) اب چونکہ ایم۔ اے تک اُردو مین تعلیم ہوگئی ہے، ہمارا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے شعر الہند سے بہتر کتاب دستیاب نہین ہوسکتی، کالجون اور یونیورسٹی کے طلبار اور اُستادون کو اسکی طرف پوری توجہ کرنا چاہئے۔ کتاب کی قیمت چار روپیہ ہے، اور مولوی مسعود علی صاحب منیجر دار المصنّفین اعظم گڑھ سے مل

صُبحِ وطن

مجموعۂ کلام پنڈت برج نراین صاحب چکبست لکھنوی مرحوم

گذشتہ مارچ مین محترمی لسان الملک حضرت محشر لکھنوی نے اثنار گفتگو مین فرمایا تھا کہ اگر کبھی چکبست مرحوم کے متعلق کچھ لکھنے کا اتفاق ہو تو یاد رکھنا کہ " مرحوم برسون فکر سخن نہ کرتے تھے، یہانتک کہ ایک مصرعہ بھی نہ کہتے تھے، لیکن جب کچھ کہنے کا اتفاق ہوتا تھا تو بلا تکلف خوب کہہ لیتے تھے" اُس وقت خیال بھی نہ تھا کہ مرحوم کے متعلق مجھے لکھنے کا اتفاق ہوگا۔ مگر حسن اتفاق سے انڈین پریس الہ آباد نے مرحوم کا کلام جمع کر کے 'صبح وطن' کے نام سے نہایت نفاست کے ساتھ حال مین شایع کیا ہے، اور یہ قابل قدر کتاب بغرض ریویو ہماری پیش نظر ہے،

پہلی چیز جو اپنی طرف ہم کو متوجہ کرتی ہے وہ کتاب کا دیباچہ ہے چکبست مرحوم کے مجموعہ کلام کے لئے سر تیج بہادر سپرو کے دیباچہ سے بہتر دیباچہ ہونا بہت دشوار تھا۔ اور حق یہ ہے کہ جس پایہ کی شاعری مرحوم چکبست کی تھی اُسی پایہ کا دیباچہ اُن کے مجموعہ کو نصیب ہوا، مجموعہ کلام، اور دیباچہ کی یکجا اشاعت نے اُردو ادب مین نظم و نثر کا ایسا دلکش اور دلچسپ اضافہ کیا ہے کہ مدت تک دونون کا وجود صفحۂ ہستی سے محو نہ ہو سکیگا، اختصار دیباچہ کی جان ہے، اور صرف چند صفحات کے اندر سر تیج بہادر نے نہایت خوبی کے ساتھ اُردو شاعری، اسکی مختلف اصناف، اور دور جدید پر عالمانہ اور مورخانہ شان سے بحث کی ہے، گویا دریا کو کوزے مین بند کر دیا ہے، خود شاعر کے متعلق لایق دیباچہ نگار کے جملے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہین۔

"پنڈت برج نراین چکبست کا ادبی مذاق خاص الخاص لکھنوی ہی - اور وہ لکھنؤ کے ادبی رنگ مین از سرتاپا ڈوبے ہوئے ہین، فارسی اور اردو زبانون مین انکی معلومات جامع اور وسیع ہین، اور اردو کے اساتذہ کے کلام پر ان کو پورا عبور حاصل ہی، ان کے طرز بیان پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کی مہر لگی ہوئی ہے لیکن باانہمہ ان کو دور جدید کے شاعر ہونے کا خاص طور پر امتیاز حاصل ہی .... اس وقت ایسے اصحاب کی تعداد بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہی جنکو گل وبلبل کے فرسودہ قصون، اور چاہ زنخدان - موے میان - یا دہن تنگ کی تعریفون مین لطف حاصل ہوتا ہو - اور نہ ہی کو اردو شاعری کے خیالی معشوق کی کج ادائی بے وفائی، یا بے پایان ظلم وستم کے لاطایل قصّے پسند آتے ہین - ایسے معشوق کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس مین وہ سب اوصاف موجود ہین جنمین سے ایک کو بھی ہم روزمرّہ زندگی مین کسی طرح روا نہین رکھ سکتے .... زمانہ حال کی اردو شاعری کی داغ بیل بالکل نئی اور زیادہ پاک ولطیف سرزمین پر ڈالی گئی ہے - اقبال وچکبست کی شاعری کی تحریک کا باعث کبھی تو حب وطن کا جوش ہوتا ہی اور کبھی کوئی گذشتہ یا حال کا تاریخی واقعہ ان کے خیالات کو پرواز مین لاتا ہی کبھی قدرت کے نظارون یا مذہبی رازون کے انکشاف سے وہ اپنی نظمون کو آراستہ کرتے ہین مدد لیتے ہین - اور کبھی انسانی جذبات اور احساس کی سچی تصویرین کھینچکر عبرت کا سبق دیتے ہین - قومیت کا خیال ان کی شاعری کی ساخت کا جزو اعظم ہے - ان کی شاعری ایسی شاعری ہے جس کا اثر نوجوانون کے دل ودماغ پر اس کلام سے کہیں زیادہ ہوتا ہی جو گذشتہ معیار سخن کے قاعدون سے جکڑا ہوا ہی - یہ کہنا کہ اس نئے ڈھنگ کی شاعری مین اصلیت کا جز وزیادہ ہی - یہ معنی نہین رکھتا کہ اس مین شاعرانہ تخیل یا ایجاد کی کمی ہے - بلکہ حاصل کلام صرف یہی ہی کہ یہ جزو پرانے اور نئے دور کی شاعری کا فرق امتیازی ہی - برج نراین چکبست

دور جدید کے صرف ترجمان ہی نہین ہین بلکہ اس دور کے نمایندون مین ان کا پایہ بہت بلند ہی۔ اس دور کے ترقی کی ممکنات کی کوئی حد نہین قرار دی جاسکتی۔ ایک خصوصیت اس دور کی جس کو پُرانے دور کی مذمت نہ سمجھنا چاہیے راستبازی کا شعبہ ہی جسکی مثالین اقبال اور چکبست کے کلام مین کثرت سی ملین گی۔"

دیباچہ کے ۲۹ صفحے ہین، اور اس مین جناب سر تیج بہادر نے شاعر مرحوم کے کلام کا اقتباس بھی دیا ہی جس سے مرحوم کے خاص رنگ کا اندازہ ہوتا ہی۔ مثلاً

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا   دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

اگر درد محبت سی نہ انسان آشنا ہوتا   نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

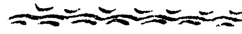
کمالِ بزدلی ہی پست ہونا اپنی آنکھو نمیں   اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

نئی تہذیب کے صدقے نہ شرمانے دیا دل کو   رہی منطق کے پردہ مین کرشمے بے حیائی کے

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آبھی گئے   بندۂ تقدیر قسمت کا گلا کرتے رہے

دیکھا سرور بادۂ ہستی کا خاتمہ   اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

مزا شباب میں ہے سر سے خون بہانے کا | لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے



اعمال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی | تقدیر کیا ہے گردشِ لیل ونہار کیا ؟

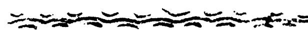
مرحوم چکبست کا رنگ کلام دور موجود کے تمام شاعروں سے جُدا ہی، مرحوم ایک سچے فطرت کا شاعر تھا۔ اُس کے دل میں شریفانہ جذبات کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہی، اور اُس کے نالے کبھی قیدوبند کے خوف یا ملامت کے تازیانے سے سہم کر رنگ شاعری نہ بنے، وہ فلسفی بھی ہو اور حق بین بھی، اُس کا دماغ سچائی سے منور ہو۔ دل کی چوٹ زبان پر آتی ہے۔ اور یہی راز ہو اُس کے کلام میں درد کا، تاثیر کا تو یہ عالم ہو کہ:۔

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی | اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہو دل میں ٹھنی
مادرِ ہند کی تصویر ہو سینہ پہ بنی | بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زبان پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوق وفا کا یہی جوہر ہوگا | فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائیگا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا | قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے



(جنوبی افریقہ مین شورش ۱۹۱۴ء) فریاد قوم

وطن سے دور تباہی مین ہی وطن کا جہاز ہوا ہی ظلم کے پردے مین حشر کا آغاز

سُنیں تو قوم کے ہمدرد مُلک کے دمساز ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دُکھ بھری آواز

وطن سے دُور ہین ہم پر نگاہ کر لینا

"ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا"

نصیب چین نہین بھوک پیاس کے مارے ہین کس عذاب مین ہندوستان کے پیارے

تمھین تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے وہان بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے

جو چُپ رہین تو ہوا قوم کی بگڑتی ہی

جو سر اُٹھائین تو کوڑون کی مار پڑتی ہی

وطن سے دُور بھی ہین اور خانہ ویران بھی اسیر یاس بھی ہین اور اسیر زنداں بھی

تباہ حال ہین ہندو بھی اور مُسلماں بھی ہوئے ہین نذر مُصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اُجڑے گھرون کے صحرا مین

اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا مین

جو دب کے بیٹھ رہے سر اُٹھاؤ گے پھر کیا عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا

جفا و جور کی ذلت مٹاؤ گے پھر کیا تم اپنے بچّون کو قصّے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہ ہی اُن سے اُن کی ماؤن کا

لہو رگون میں تمھارے ہی بے حیاؤں کا

سیر دہرہ دُون

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہی　　بشر کی رُوح کو راحت کی نیند آتی ہی
بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہی　　نہ شور و شر ہی نہ دُنیا کی آہ و زاری ہی

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دل گیر
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں　　یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سُنے گا اسے دل گداز ہی جس کا　　ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہی اُس کا

بلا کی مجھ میں سمایا سرور بے ہو کر
ہوس تھی روح کو مل جائے اسمیں مے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کے باریابی تھی　　نگاہِ شوق میں اک شان بے حجابی تھی
نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے　　رواں تھا چشمۂ آب خنک نظر کے تلے

شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شراب اُنس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار　　شجر تھا، کوہ تھا، چشمہ تھا یا یہ مُشت غُبار
درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا　　طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر باراں کیا

یہ موج ہستی بیدار کے عناصر ہیں

سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہین

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہین　　کچھ آبشار میں اور ہم مین امتیاز نہین
ہی جسم خاک یہان اسکا جسم پانی ہی　　جو رُوح ہم مین ہی اُس مین وہی روانی ہی

گائے

صاحبِ دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں　　چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہین
درمندون کی مسیحا شعرا کہتے ہیں　　ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہین

کون ہے جس نے ترے دُودھ سے مُنہ پھیرا ہی
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہی

پنڈت لشن نراین در مرحوم

نذرانۂ رُوح

تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیمان رہا　　طائرِ فکر ترے اوج سے حیران رہا
قدر کرنا تری سکھین یہی ارمان رہا　　یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا مین مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

مجھ سے یارانِ عدم سنتے اگر فرمایا حسرت آباد جہان سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا

لے کے دُنیا سے یہی مُہر وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

مرحوم کی شاعری قلوب انسانی کو منور بناتی ہے۔ رُوح کو گُدگداتی ہے، اور اخلاق کا سبق دیتی ہے، صبح وطن بڑی تقطیع کی ،، صفحون کی کتاب ہی اور غالباً مرحوم کی شاعری کا مکمل مجموعہ ہی، ہم بلا تصنع کہتے ہین کہ اس کے مطالعہ سے ہماری رُوح بیچین ہوگئی۔ اس رنگ کی شاعری غالباً عرصہ تک نظر نہ آئیگی افسوس ہی کہ شاعرین شباب ہین ہم سے رخصت ہوگیا۔ اگر زمانہ مہلت دیتا اور ملک اسکو کسب معاش کے جھگڑون سے آزاد رکھتا یعنی اگر اُس کا وقت بجائے وکالت کے شاعری مین صرف ہوتا تو خدا معلوم اُس کے ہاتھون سے ملک اور زبان کی کیسی کچھ خدمت ظہور مین آتی ملک کی بدنصیبی ہے کہ آج شعرا مین اُسکا کوئی جانشین نہین ہی۔ ہمارے پاس اشاعت کے لئے ہر ماہ بیسیون نظمین اور غزلین ملک کے ہر گوشہ سے آتی ہین۔ لیکن افسوس ہے کہ جذبات کو محرک ہمت کو مستقل، اور خیالات کو بلند کرنیکی طرف نئے دور کے شعرا کو مطلق فکر نہین ہی۔ اس مجموعہ کو نہ خریدنا یا اس کا مطالعہ نہ کرنا دل اور دماغ کو نعمت سے محروم رکھنا ہی، کتاب مین مرحوم کی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت غالباً ۱۲؍ ہے۔

ملنے کا پتہ

منیجر انڈین پریس الہ آباد

بیدار

قوم قصّاب کا حقیقی ترجمان

مدیر:۔ مولانا کوکب مقام اشاعت:۔ جوالا پور۔ سہارنپور

ستمبر ۱۹۲۶ء سے جاری ہوا ہی، دوسرا نمبر" بغرض ریویو وتبادلہ" ہمارے پیش نظر ہے، پہلے نمبر کے متعلق اعتذار یہ ہی، کہ بعض مقام پر الفاظ و حروف کی زیادتی اور کمی سے عبارت کے تسلسل مین نشیب و فراز واقع ہو گیا .... بہت ممکن ہو کہ قارئین کرام نے بھی اس انقلاب کو محسوس کیا ہو" بسم اللہ اگر غلط ہو گئی تو مضائقہ نہیں، کیونکہ دوسرے نمبر کی ظاہری شکل و صورت اچھی ہی۔ اور لایق مدیر بھی قوی دل و دماغ کے بزرگ معلوم ہوتے ہین۔ رسالہ محض قوم قصّاب کی بہبودی کے لئے نکالا گیا ہی، اور مولانا کوکب مدیر نے اپنی قوم کا ناصح خیر اندیش ہونے کا حق ادا کر دیا ہے، قوم کو رسالہ کی خریداری پر طرح طرح سے آمادہ کیا ہی، اور اسی ضمن مین نصیحتین بھی فرمائی ہین، ملاحظہ ہو،

" اگر خدانخواستہ آپکی غفلتون اور عدم توجہی سے "بیدار" موت کے گھاٹ اُتر گیا تو دنیا کے اوپر آپکا وہ بھرم بھی کھُل جائیگا جو آجتک تھوڑا بہت بندھا ہوا ہی، اور آیندہ آپ دُنیا کی نظرون مین یقیناً ایک مُردہ قوم شمار ہونے لگین گے دُنیا کے کسی معاملہ مین ایک کوڑی کو بھی تو کوئی نہ پوچھے گا"

اِسی سلسلہ مین خریدارون کی عدم توجہی کی شکایت ہے،

" افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ بعض ہمارے بھائی ایسے بھی ہین جنھون نے نہین معلوم ایسے (بیدار کو کیا سمجھکر وصول کرنے سے انکار کردیا ہی، حالانکہ خطوط کے ذریعہ اُن کو پہلے سے اطلاع دیجاچکی تھی اگر انھین یہی سلوک کرنا تھا تو دو پیسے کے کارڈ کے ذریعہ اطلاع کردینا اُن کا فرض تھا تاکہ دفتر کرایہ کے خرچ کا ناحق زیر بار تو نہ ہوتا، خیر یہ اپنے اپنے اخلاق ہین .... ذرا انصاف پسند دل سے غور کیجئے، اچھا اگر فرض کیا کہ پانچ روپیہ رائگان ہی گئے، یا ہم نے اپنے ہی لئے آپکو تکلیف دی تو کیا بیجا اور فضول خرچیون اور ایرے غیرے نتھو خیرے پر خرچ ہونے سے اپنے ایک بھائی کو دینا بہتر اور مناسب نہین، مین آپکو توجہ دلاتا ہون اور آپکو اپنا اور قوم کا بھائی سمجھکر زور سے کہتا ہون کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرین، دُوبارہ غور کرین سہ بارہ غور کرین مجھے امید ہی کہ آپ اپنی اس غلطی کی تلافی بہت جلد کرین گے"۔

'بیدار' کے ایک قدردان شیخ نور الٰہی صاحب نے پہلا نمبر ملاحظہ فرماکر جناب مدیر سے شکایت کی کہ " بڑے افسوس کی بات ہی کہ آپ نے میرا نام مضمون نگارون کی فہرست مین تحریر نہین فرمایا"

قابل مدیر نے جواب شاعرانہ دیا ہی اور ادیبانہ حیثیت سے اس شکایت کی تلافی کی ہے۔

" اگر جناب اپنی گلستان طبیعت کے نورانی گلدستے مضمون نگاری کے گملون مین لگاکر 'بزم بیدار' کی رونق افزائی کرتے تو پھر ملاحظہ فرماتے کہ مضمون نگاری کے یاران بزم مین آپ جلوہ افروز ہین یا نہین ؟ فرمایئے ؟ بڑا تو درکنار، یہان تو چھوٹا افسوس بھی نہین ہے"۔

لائق مدیر کو 'قوم' کے غم مین، شملہ جانیکا اتفاق ہوا، مگر 'قوم' کے اُس حصہ نے جو وہان آباد ہے رسالہ سے قطعی بے اعتنائی برتی جو ایک نازیبا سی بات تھی، لائق مدیر نے اس واقعہ کو بڑی

جسارت، اور چرب زبانی سے لکھا ہی۔ کچھ اقتباس درج کیا جاتا ہی:۔

"آہ عرب کی وہ ٹمپریری رونے والیاں کہاں گئیں جو مُردون کو کرایہ پر رویا کرتی تھین، کاش وہ آج مل سکتین.......... مجھے برادران شملہ کی اعجوبہ کیفیت سُنکر افسوسناک تعجّب ہوا۔ اور کچھ دیر تک تو میرا دماغ خواب و بیداری کا ایسا درمیانی عالم بن گیا جیسے جنّت اور دوزخ کے درمیان مین مقام "اعراف" ہوتا ہی.............. جب جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، کی تسبیح سے جلدی جلدی دانون کو کھٹا کھٹ کرنا شروع کیا تو بارے سنبھلا.............. بیدار اگرچہ دو دن کا بچّہ ہے جسکی یہ حالت ہوتی ہے کہ جس نے ذراسی مٹھائی کا لالچ دیا اُسی کی طرف جھک پڑا لیکن اللہ اسے "جم جم" رکھے، ہے ہونہار اور خوددار آخر تاڑ گیا کہ یہان خنکی کا ٹمپریچر ڈگریون کی قیدوبند سے آزاد ہی، ایسی ٹھنڈک مین دال گلنی مشکل ہی، اگر اسی طرح کچھ دن اور برابر جتے رہے، اور یہ سُوکھی دعوتین جیمتے رہے تو خشکہ قبض کئے بغیر نہ رہے گا چنانچہ غریب بیدار، اپنا سا منہ لیکر پچھلے پاؤن لوٹ آیا" اور یہ کارگذاریان، اور شملہ مین مخالفت ایک ذات سے متعلق ہین یعنی "شملہ مین ایک پیر مرد ہین جو اپنی برفانی ریش و فش کے ساتھ جب خدا کے دربار مین گڑگڑا کر دعا رمانگتے ہین تو معلوم ہوتا ہی کہ معلم الملکوت کے اُستاد نہین، تو فرشتون کے اُستاد بھائی ضرور ہین"۔ ان کے "دل مین یہ وحشت بیٹھی ہوئی ہے کہ با دا قوم نے علم حاصل کرلیا تو یہ "اڈنگ بڑنگ" کی ساری چودھرایت "توتی تڑ نگ" ہوجائیگی، اور پھر یہ "تو تڑ لیے" کی چھوڑی ہوئی "ڈور" تو میرا عالم مین تیرا جور" کا انقلاب کئے بغیر نہ رہیگی.......... وہ بیدار کے خلاف پروپگنڈا کرنے پر مجبور ہوگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشاعت رُک گئی، اور غریب بیدار شملہ کی آنِ لاشون پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہوا ناکام واپس ہوگیا"۔

مولانا کی بیدار کی اشاعت کو بڑھانے، اسکی زندگی کو قوم کے لئے ناگزیر ثابت کرنے، اور اُن ابتدا ئیون کو طشت از بام کرنے مین، جن کا ایک جدید مدیر کو وی، پی، کی واپسی پر جبر یہ تجربہ حاصل کرنا پڑتا ہے نہایت صفائی سے کام لیا ہے۔ اور اُردو رسائل واخبارات کے مدیران کے واسطے ایک دلچسپ سوال پیدا کر دیا ہے کہ آیا وہ بھی کُھلے بندون، نا دہند اور خریداری سے گریزان حضرات کی خبر لینے کا تہیہ کرین یا اُسی قدیم، خوشامدانہ روش کو قایم رکھین جس سے آجکل کی "تجارت پسند" پبلک عاجز ہو چلی ہے،

بہرکیف جن مقاصد کو لیکر بیدار پیدا ہوا ہے وہ قابل تعریف ہین اور ایک دن کامیاب ہون گے کیونکہ بقول بابو عصمت اللہ صاحب، جن کا خط بیدار کے صفحہ ۶، پر شایع ہوا ہے " یہ قوم کسی زمانہ مین یگانۂ روزگار ہوگی، کیونکہ اب بھی .... اس قوم کی بزرگی ثابت ہوتی ہے ...... اس قوم کی زبان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ قوم عرب سے آکر ہندوستان ظلمت نشان مین آباد ہوئی "

رسالہ مین ادب کی بھی چاشنی ہے، مواعظ حسنہ، اور قرآن وحدیث کے حوالون سے قوم کو راہ پر لانیکی خاصی کوشش نظر آتی ہے۔ اور منجانب مدیر اعلان ہے کہ اگر قوم اپنے باہمی جھگڑون کو مٹا دیگی تو جس جگہہ کے بھائی اپنی نااتفاقی اور فرقہ بندی کو دُور کرکے اور قوم مین اتفاق اور اتحاد پیدا کرکے دفتر بیدار کو اطلاع دین گے اُن کا ذکر رسالہ بیدار مین خصوصیت کے ساتھ موٹے حرفو مین کیا جائیگا۔

لکھائی چھپائی دیدہ زیب، کاغذ چکنا، تقطیع بڑی، حجم ۸۰ صفحات، قیمت سالانہ صرف ۸ششماہی ہے۔

(ج)

علی گڑھ میگزین

نیا نمبر ہمارے پیش نظر ہے، لکھائی، چھپائی، کاغذ اور سرورق کی دلکشی کے اعتبار سے دیدہ زیب ہے، اور جناب مولوی عبدالباسط صاحب ایم، اے (علیگ) کی ادارت مین ہر تیسرے مہینہ پوری آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا ہے، فلسفہ تمدن اور اسلام، لائق مدیر کے زور قلم کا نتیجہ ہے، مبسوط اور دلچسپ مضمون ہے ہم خوش ہین کہ یہ مضمون کتابی شکل مین بہت جلد نظر آئے گا۔

"پان اسلامزم، یا اتحاد اسلامیت" جناب مولوی ابرار حسن صاحب فاروقی نے محنت اور توجہ سے لکھا ہے، اور انکی وسعت نظر کا پتہ دیتا ہے۔

بُعد رابع، یعنی چوتھی سمت، جناب مولوی محمد فاروق صاحب بی، ایس، سی علیگ، نے لکھکر نمونہ پیش کیا ہے کہ اہم اور دقیق مضامین کو اپنی زبان مین کس سلیقہ اور لطافت سے لکھا جاسکتا ہے، مضمون محققانہ ہے، اور خوب لکھا ہے،

صبح صادق، نظم بلا قافیہ ہے، اور پنجاب کے شاعر، خواجہ دل محمد صاحب کے زور طبع کا نتیجہ ہے، مگر شکر ہے کہ ان قیود کی پابند ہے جن کا لحاظ رکھنا، آجکل کے پنجابی نوعمر شعراء مین، ناجائز ہے، نظم بہت پاکیزہ ہے۔

جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری کی شاعری شایع ہوئی ہے، اور اُن کا ایک فارسی خط بھی ہے

ملنے کا پتہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جلد ۵ — فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ فروری ۱۹۲۷ع — نمبر ۲

تصاویر

(۱) جناب وزیر اعظم امین الملک میرزا محمد اسمٰعیل صاحب بی اے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔

(۲) جناب وزیر الممالک آصف جاہ نواب ابو المنصور خاں بہادر صفدر جنگ۔

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کے لئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا

اگر آپ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کیجائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون ۱۹۲۷ء تک جو بہترین افسانہ وصول ہوگا اس کے معاوضہ میں چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر آپ نے کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جب تک وہ شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپکو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اسکی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائیں گی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپ کی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اس پر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ

جو مضمون، افسانہ، ناول، نظم یا غزل ناپسند ہوگی وہ ارکا ٹکٹ آنے پر واپس کر دی جائے گی۔ البتہ نقشہ وغیرہ ہم اپنے خرچ سے باحتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپ کا کلام شائع ہوگا، بلا لحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جاویگا

مطبوعات جدیدہ

جو ۱۹۲۷ء میں لغرض ریویو وصول ہونگی، ان پر دو انعامات ہیں۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام ان کو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجیں گے، اور

(۲) دوسرا انعام حسب تجویز کمیٹی ان کو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائیں گے۔

خادم - منیجر شمع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمع

بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۷ء

محکومیت نسواں

(مصنفہ جان اسٹورٹ مل)

(بہ سلسلہ ماسبق)

(۳)

از

(جناب مولوی محمد معین الدین صاحب انصاری - بی - اے (کنٹیب) بیرسٹرایٹ لا)

عورتوں کو سیاسی زندگی اور جائز پیشوں سے بھی محض اسلئے الگ رکھتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی گھریلو زندگی اور خانگی دنیا کی چاردیواری سے باہر نہ آجائیں۔ جو کام ناکارہ سے ناکارہ مرد کے لئے

جائز ہے وہ لائق سے لائق عورت کے لئے حرام ہے پرانے خیال کے لوگ اسی صورت حال کو فی الجملہ سوسائٹی کے مفاد کے لئے ضروری بتاتے ہیں اور اب تک یہ کہنے والے موجود ہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں۔ اونکا ذہن فطرتاً کند اور ناکارہ ہوتا ہے۔ اور خود عورتوں کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ مرد کی مطیع ہو کر رہیں۔

میں کہتا ہوں کہ رواجی پابندیوں کے باوجود بعض اوقات عورتوں کے مخالفین کو بھی ماننا پڑا ہے کہ عورتیں بہت سے مردوں سے سبقت لے گئیں۔ اور بعض امور میں یقیناً مردوں سے افضل ثابت ہوئیں۔ اگر کسی شخص یا گروہ کو کسی خاص شخص یا چند اشخاص سے کچھ شکایت ہو تو خیر۔ لیکن جب ساری جنس اناث کے خلاف اس قسم کے مستبدانہ خیالات سراہے جاتے ہیں تو بجز جاہلانہ تعصب کے اس کو کیا سمجھا جائے؟ یہ کون سا انصاف ہے کہ محض جنسی اور روایتی تعصبات کی بنا پر ہم نے دنیا کی نصف آبادی کو تقریباً معطل کر دیا ہے؟ یہ کیونکر جائز ہے کہ عورت اگر اپنے پیروں کھڑی ہونا چاہے۔ اپنی عزت اپنی دولت اپنی سعی سے پیدا کرنا چاہے تو نہ حاصل کر سکے۔ اور جو پیشے مرد کے لئے جائز ہیں عورت کے لئے ناجائز سمجھے جائیں۔

میرے اعتراضات معاشری مشاغل تک محدود نہیں۔ عورتوں کے حق رائے دہندگی کو لیجئے۔ مانا کہ عورتیں خود حکومت کی اہلیت نہیں رکھتی ہیں لیکن یہ کمزوری بہت سے مردوں کو بھی لاحق ہے۔ بہرکیف اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو خود حکومت کا اہل نہیں وہ اپنے حکمرانوں کو منتخب کرنے اور اُن کو اپنے اثر میں رکھنے کا بھی اہل نہیں۔

فرض کیجئے مرد اور عورت کا سیاسی مفاد ایک ہے تو ہمیشہ وہ مرد ہی کیوں ہو جو رائے دیا کرے؟ اور اگر عورتوں کا مفاد جداگانہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے حقوق کو تمامتر مردوں کے رحم و انصاف پر چھوڑ دیں۔

عورتوں کی اہلیت اور استعداد کا سوال یقیناً اہم ہے۔ اس پر بھی غور کر لیجئے۔ اگر عورتیں دنیا کے کسی کام میں نااہل ثابت ہوتی ہیں تو یہ اُن کی پیدائشی نااہلیت کی دلیل نہیں۔

کیونکہ عورتوں کو دنیا کے مشاغل میں عام طور پر مردوں کے مقابلہ میں آنے کی نہ تو کوئی ترغیب اب تک دی گئی نہ اُن کی تربیت آزادی سے ہوئی اس پر بھی اب تک جو ان بیچاریوں نے بعض موقعوں پر کر دکھایا وہ بہت ہے بلکہ اونکی اہلیت کی دلیل ہے۔ ملکہ الیزبیتھ اور جون آف آرک جنس اناث ہی سے تھیں! سیاست مدن ہی وہ رزمگاہ تھی جس میں عورتوں کو اپنی قابلیت کا ثبوت دینے کا اکثر موقع ملا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عورتوں نے محض اپنی ذاتی استعداد سے دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کی صف میں جگہ حاصل کی اور اون کا نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ ان خوش قسمت عورتوں کو اگر دنیا کے قابل ترین اور تجربہ کار مردوں کی امداد نہ حاصل ہوتی تو وہ اس شہرت کی مستحق نہ ہوسکتیں لیکن عورتوں کے اس حسن انتخاب کی داد کس کو دیجئے گا؟

عورتوں میں انتظام و انصرام کی استعداد گویا پیدائشی ہے۔ اس کی تصدیق یورپ ہی کی تاریخ سے نہیں بلکہ ایشیا کے معاملات پر نظر کرنے سے بھی ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے معاملات کے دفتری مطالعہ[۵] سے یہ نتیجہ اخذ کر کے میں خود دنگ رہ گیا کہ جن ریاستوں کا انتظام سختی اور ہوشیاری سے ہو رہا ہے، جن کی مالی حالت درست ہے اور بغیر ظلم و تعدی کے انصرام حکومت امن و امان کے ساتھ جاری ہے، رعایا خوشحال اور زراعت ترقی پر ہے اُن ریاستوں میں ۵۰ فیصدی ایسی ہیں جن کی عنان حکومت عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ رواج ہنود کے لحاظ سے عورتیں خود حکمراں نہیں بن سکتیں لیکن نابالغ رئیس کی ولیہ کی حیثیت سے مدتوں اون کو یہ مواقع حاصل رہتے ہیں کہ خوش انتظامی اور دوراندیشی کے ساتھ امور سلطنت کو انجام دیں۔

---

۵ ل انڈیا آفس (نظارت ہند) لندن میں عرصہ تک ملازم رہا۔ عجیب نہیں کہ اُس نے ہماری دیسی ریاستوں کے اُس زمانہ کے حالات پر نظر دوڑائی ہو جس کا اس کو موقع حاصل تھا۔ ۱۲

ہندوستان میں تو عام طور پر روسا اپنی بدکاریوں اور شہوت پرستی کی بدولت عمر طبعی کو پہونچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں اور اکثر اسی وجہ سے اُن کے اطفال نوعمری میں ریاست کے مالک ہو جاتے ہیں جن کے بجائے ابتداً اون کے خاندان کی عورتوں کو یہ مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ شہزادیاں جن کی پرچھائیں بھی کسی نے کبھی نہیں دیکھی، جنھوں نے کبھی کسی غیر مرد سے بات تک نہیں کی، بلکہ بعض صورتوں میں اگر اقارب سے بھی وہ ہمکلام ہوئیں تو اس طور سے کہ درمیان میں پردہ کی دیوار حائل رہی، جو نہ تو خود لکھی پڑھی ہیں نہ اون کی زبان میں ایسی کتابیں ہیں جنھیں پڑھ کر وہ امور مملکت کی بابت کچھ علم حاصل کر سکیں، جب وہ انتظامی امور میں اس قابلیت کا ثبوت دیتی ہیں تو بجز اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ عورتوں میں انتظامی قابلیت خداداد ہے۔

یورپ میں عورتوں نے بہ لحاظ حکمراں ہونے کے اس سے بڑھ کر اپنی انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ذرا اُس تناسب پر غور کیجئے جو یورپ کی تاریخ میں مردوں اور عورتوں کی تعداد کا حکمرانوں کی فہرست میں پایا جاتا ہے۔ پھر دیکھئے کہ کتنی عورتیں کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور کتنے مرد ناکام۔ عورتوں نے نہ صرف بادشاہت کی ہے بلکہ حکومت کی ہے اور براہ راست اہم انتظامی امور کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم نے عنان حکومت درحقیقت اپنی ماں کے ہاتھ میں دیدی تھی اور یہ فعل اُس نے اپنے مرحوم باپ لوئی دہم کے ایما کے مطابق کیا تھا جس کی دوراندیشی کو دُنیا مانتی ہے۔ فرانس کی تاریخ میں دوسری مثال سینٹ لوئی کی ہے جس کے تدبر اور حاکمانہ قابلیت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس نے بھی اپنی حکومت کا انتظام عرصہ تک اپنی بہن کے ہاتھ میں رکھا۔ غرضکہ وہ ماں اور یہ بہن دونوں اپنے اپنے زمانہ میں عدیم النظیر حکمراں ثابت ہوئیں۔

شہنشاہ چارلس پنجم جس کے دربار میں حکماء اور قابل مشیران کار کی کمی نہ تھی اور جس کو ہمیشہ لایق سے لایق عمال کی خدمات حاصل رہیں اوس نے یکے بعد دیگرے اپنے خاندان

کی دو عورتوں کو ہالینڈ کی صوبہ داری پر مقرر کیا اور دونوں نے غیر معمولی قابلیت سے اپنے فرائض انجام دئیے۔

اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عورتیں جب موقع پانے پر ایسے سخت امتحانوں میں پوری اُتری ہیں تو وہ عام کاروبار میں ہمیشہ ناکارہ ہی رہیں گی۔ عورتوں میں جو خامیاں ہیں وہ اُنکی موجودہ مجبوریوں کی وجہ سے ہیں۔ عورتوں میں جو سلیقہ اور جوگُن ہے اُس سے مرد یقیناً محروم ہیں۔ اون میں خاص بات یہ ہے کہ وہ عملی چیزوں کی طرف جلد مائل ہوتی ہیں۔ ہر حاضر شئے کی طرف اُن کا ذہن فوراً منتقل ہوتا ہے اور وہ اُس پر عبور حاصل کرلیتی ہیں۔ برخلاف اس کے مرد کی نظر اسقدر تیز نہیں دوڑتی۔ اگر مرد کی طرح عورت بھی کسی امر واقعی سے واقف کردی جاتی ہے تو وہ اُس امر کے گہرے احوال پر جلد تر حاوی ہوجاتی ہے۔ یہ گویا عورت کا حصہ ہے۔ عمل میں بے شک عورتوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں جس کا سبب اُن کے تجربہ اور عام معلومات کی کمی ہے۔ نہ یہ کہ وہ اپنے علم سے فائدہ اُٹھانے یا علم کو عمل کا جامہ پہنانے سے فطرتاً قاصر ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ بھی کہدینا ضروری ہے کہ مرد فضول بھی نظریئے قائم کیا کرتے ہیں اور بلاوجہ دور کی سوچنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی دور اندیشی کے آگے اکثر حالات حاضرہ اور اپنے ہمجنسوں کے موجودہ محسوسات اور جذبات کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ انتظامی اور سیاسی معاملات میں عورتوں کی حاضر دماغی اور موجود پرستی کو بھی شریک کار بنایا جائے تاکہ نظام دنیا میں مزید موزونیت اور توازن قائم ہو، ورنہ مرد اسی طرح "اگر" "مگر" میں پڑے رہیں گے۔ اور استبداد کے بازو کبھی شل نہ ہوں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ عورتیں نسبتاً محرور المزاج ہوتی ہیں اور اُن کے اعصاب ذرا ذرا سی بات میں ہیجان پذیر ہونے لگتے ہیں اس لئے دُنیائے عمل میں اُن کا وجود مضر ہے یا یہ کہ اُن کی طبیعت اور ارادہ اسقدر تغیر پذیر ہوتا ہے کہ کسی بات میں استقلال نہیں ہوتا۔ تو میرا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ ایک بڑی حد تک یہ ہے کہ سوسائٹی نے عورتوں کو ابتک اہم اور وسیع الاثر

افکار اور معاملات میں پڑنے سے باز رکھا۔ اگر اُن کے لئے بھی زندگی کا کوئی اہم اور مفید مطمح نظر جائز رکھا جائے اُن کی تربیت اسی آزادی اور اسی انداز سے ہونے لگے جو مرد کے لئے مخصوص ہے تو اس قسم کی خامیاں بہت بڑی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ صورت تو یہ ہے کہ اُن بیچاریوں کو نہ تو کوئی قوت یا اقتدار حاصل ہے نہ کوئی اہم ذمہ داری۔ اُن کے مقاصد زندگی کم و بیش غیر معین ہیں۔ نیز میں کہونگا کہ اعصاب کا جلد ہیجان پذیر ہونا فی نفسہ کوئی ایسی خلقی کمزوری نہیں جو عورتوں کو دنیائے عمل میں معطل رکھے۔ بہت سے مرد جو فطرتاً یا امراض کی وجہ سے نہایت ہیجان پذیر اعصاب رکھتے ہیں اُن میں مستقل مزاج اشخاص کی کمی نہیں ہے بلکہ اکثر عاملانہ کاروبار کی خاصی اہلیت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کے مزاج میں افراط و تفریط ہوتی ہے اُن کا مقابلہ صبر و تحمل میں بھی بعض اوقات کوئی نہیں کر سکتا۔ جو قومیں زیادہ محرور المزاج اور افراط پسند ہوتی ہیں وہ محض اس بنا پر ترقی کی رزمگاہ میں لازماً شکست نہیں کھاتیں۔ فرانسیسیوں سے بڑھ کر تند خوئی کس قوم میں ہوگی؟ لیکن فرانسیسی سائنس تجارت حرفت قانون یا جنگ وغیرہ میں کس قوم سے کم ہیں؟

جلد از جلد خالی الذہن ہو کر ایک امر سے دوسرے امر کی طرف توجہ منتقل کر سکنا عملی معاملات میں ایک خوبی ہے جو مردوں میں کم پائی جاتی ہے۔ مرد بے شک توجہ کو ایک طرف زیادہ عرصہ تک بآسانی قائم رکھ سکتا ہے لیکن عملی دنیا میں یہ اتنی بڑی خوبی نہ شمار ہوگی۔ یہ دونوں خصوصیتیں کچھ تو فطری ہوتی ہیں اور کچھ تربیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ کم از کم یہ ماننا ہوگا کہ عورتوں کو توجہ ایک طرف قائم رکھنے کی تعلیم ہی بہت کم ہونے پاتی ہے۔ اگر عملی دنیا میں یہی خوبی کام آتی ہے تو عورتوں کی تربیت درست کرنے کے اسباب اور مواقع پیدا کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ یہ خوبی حاصل کر سکیں اور میرے خیال میں ان دونوں خصوصیتوں سے عملی دنیا کو فائدہ اوٹھانا چاہئے۔

بعض لوگ عورتوں کی خلقت کو حقیر گرداننے کے لئے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ عورت کا دماغ یعنی بھیجہ مرد کے بھیجہ سے چھوٹا اور وزن میں کم ہوتا ہے۔ اول تو یہی امر علما ر

میں متنازعہ فیہ ہے کہ آیا دماغ کے بڑے چھوٹے ہونے کا اثر ذہنی استعداد پر کچھ ہے بھی یا نہیں۔ بہرکیف غالب گمان یہ ہے کہ بڑا بھیجہ اعلیٰ ذہنیت کی دلیل ہو سکتا ہے مگر یہ کہ بھیجہ کی بڑائی چھوٹائی ہی وہ چیز نہیں جس پر کوئی فیصلہ کیا جا سکے بلکہ دماغ کی قسم اور اس کے اثرات پر بھی نظر کرنا چاہئے۔ یوں دیکھیے تو ہاتھی کا بھیجہ سب سے بڑا اور وزنی ہوتا ہے مگر انسان کی سی عقل اس میں نہیں پائی جاتی۔ اگر اثرات کو لیجئے تو عورت کا مزاج نہایت نزاکت پسند ہے اور یہ نزاکت پسندی اور باریک بینی اوس کے ہر کام میں ظاہر ہوتی ہے جس سے مرد عاری ہیں۔ ایک خاص بات عورت میں یہ ضرور ہے کہ وہ کام سے جلد تھک جاتی ہے۔ اس کے اعضا اور دماغ دونوں جلد تکان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن مرد کی بہ نسبت اس کی تھکن جلد دور ہو جاتی ہے اور آناً فاناً چاق وچوبند ہو کر اسی جوش وخروش کے ساتھ وہ اپنے کام میں منہمک ہو سکتی ہے۔

ہماری یہ ایک عجیب عادت ہے کہ ہم جس چیز میں عورتوں کے خواص کو اپنے خواص سے مختلف پاتے ہیں ان خواص کو زنانہ کمزوریوں سے تعبیر کرنے لگتے ہیں اور عورت کی فطرت کی خامی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ عورتوں کی موجودہ کمزوریاں تمام تر فطری نہیں بلکہ بہت کچھ گردوپیش کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اگر مختلف ممالک میں جا کر مختلف اقوام کی عورتوں کے حالات دیکھے جائیں تو میرے قول کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

ابھی تک صحیح طور پر نہیں دریافت ہو سکا کہ مرد اور عورت کے ذہن میں درحقیقت کتنا فرق اصلی ہے اور کتنا ظاہری اور کسبی۔ لیکن خارجی اثرات اور حالات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ صورت واقعہ کیا ہے۔ مثلاً یہ دیکھا جائے کہ تقریباً سو برس سے عورتوں کو تعلیمی آسانیاں بہم پہنچائی جا رہی ہیں اور اس اثنا میں اونہوں نے کیا کیا۔ ادبیات میں اپنی تعداد اور اپنی بساط کے لحاظ سے عورتیں اب تک جو کچھ کر گذری ہیں وہ امید سے زیادہ ہے ابھی تک عورتوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ مساوات کے درجہ تک نہیں پہنچا۔ نہ ابھی کافی عرصہ گذرا ہے کہ آخری فیصلہ عورت اور مرد کی خلقی مساوات کا براہ راست تجربہ

سکے واسطے سے کیا جا سکے۔ عورتیں ابھی اُس زینہ پر ہیں جس سے مرد بہت عرصہ قبل گذر چکے ہیں اور اگر وہ واقعی اپنی جگہ پر اور اپنی ذات سے کوئی جدت دکھاتی ہیں یا کوئی بڑا کام کرتی ہیں تو فی الجملہ وہ ماضی کے کسی مرد کی طرف منسوب ہو چکا ہوتا ہے۔ فنون لطیفہ ادبیات وغیرہ سب میں عورتوں کی ہمت افزائی کرنے والے بہت کم ہیں۔ دُنیا میں ترقی کی راہیں لوگ شہرت پسندی کے لئے اختیار کرتے ہیں جو بجائے خود بُری بات نہیں کیونکہ اسی لالچ نے دُنیا کے بہت سے مفید اور دلچسپ کام انجام دلائے۔ مگر سوسائٹی نے تو عورت کے دل سے آرزوئے شہرت ہی کو گویا نابود کر رکھا ہے۔ اوس کے دل میں بڑا حوصلہ کبھی نہیں پیدا ہونے دیا جاتا۔ پھر کونسی چیز ہے جو اُس کے دل کو بڑھائے۔ میں کہتا ہوں ہزار علتوں کی ایک علت یہ ہے جو عورت کو تمام تر ترقیوں سے روکے ہوئے ہے اور جو اُسے مساوات کی راہ میں قدم بڑھانے سے بھی روکتی ہے۔

اخلاقی حیثیت سے دیکھئے تو یہ امر مُسلم ہے کہ عورت مرد سے زیادہ نیک اور خوش اطوار ہے۔ مگر یہ عجب قانون ہے کہ نیک کو بد کی فرمانبرداری پر مجبور کرتا ہے اور پھر بھی وُہی قانون سراہا جاتا ہے! شاید واقعہ یہی ہے کہ اقتدار اور دُنیاوی قوت انسان کی اخلاقی قوت کو گھٹا دیتی ہے۔ عورتیں اپنی غلامی کی وجہ سے اوس قدر مذلت کو نہیں پہونچیں جتنا کہ مرد کی قوت پسندی نے مرد کو اخلاقاً تباہ کیا۔

جب یہ بحث آپڑتی ہے تو بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ عورت کے اخلاق خواہ کتنے ہی اچھے ہوں مگر اُن کے مزاج میں جنبہ داری اور طرفداری کا مادہ ایسا ہے جو اُن کی اخلاقی قوت پر بھی غالب آجاتا ہے۔ اوّل تو میں اس کو اس صورت سے تسلیم ہی نہیں کرتا کیونکہ مرد اپنی بابت بہت کچھ بیجا حُسن ظن رکھتے ہیں۔ اور اگر تسلیم کروں تو میرا قول یہ ہے کہ عورتوں کے مغلوب الجذبات اور جانب داری کا عادی ہونے سے اخلاقی دُنیا کو جو ضرر پہنچتا ہے وہ مرد کی بوالہوسی اور خواہش پرستی کے ضرر سے زائد نہیں ہے۔ اس ضرر کے

مقابلہ میں عورت کی دلی خواہشیں اور ذاتی تعصبات یا جنبہ داریاں اگر ہیں تو بمنزلہ صفر کے ہیں۔ اُس کی کوئی خواہش "خواہش" نہیں بلکہ محض ایک "آرزو" ہو سکتی ہے۔ مرد جو کچھ کرتا ہے خواہ عورتوں کے لئے مضر ہو یا مفید کہتا یہی ہے کہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں اور سوسائٹی کا بھلا کرتا ہوں۔ عورت جو کچھ کرتی ہے وہ فی الواقع دوسروں ہی کے لئے ہوتا ہے۔ بالآخر یہ بحث یہ کہکر ختم ہو سکتی ہے کہ عورت اگر اپنی جانب داری کی وجہ سے یعنی دوسروں کے لئے گمراہ ہوتی ہے تو مرد محض اپنے لئے گمراہ ہوتا ہے۔

اب پوچھئے کہ عورت کو مساوی حقوق دینے سے کیا کیا فائدے ہو سکتے ہیں؟

مرد کا عورت پر قانوناً اور رتبتاً حاوی ہونا ہزار عیوب اور ہزار مظالم کی جڑ ہے۔ عورت کی مصیبت کو نظر انداز کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔ جب کسی قوی کو کمزور پر قانوناً حاوی کر دیجئے گا اوس کا نتیجہ بہرکیف ظلم ہوگا۔ اگر عورتیں سرکاری اور کاروباری کاموں میں رکھی جانے لگیں تو مردوں کی خود پسندی دور ہونے لگے۔ آزادانہ مقابلہ باہمی کی وجہ سے مرد کمزور تر اور کاہل ہوئے جا رہے ہیں۔ عورتوں کو آزاد کرنے سے مرد زیادہ مشقت کے اہل بنجائیں گے۔ اُن کی اخلاقی جرات بڑھے گی اور وہ ایثار کے عادی بننے لگیں گے۔ انسان جس منزل پر بغیر پوری جنگ کئے ہوئے پہنچ جاتا ہے یعنی جو منزلت اوس کو محض کسی "پیدائشی" حق کی بدولت حاصل ہوتی ہے وہ اس کا دماغ خراب کر دیتی۔ اوس کی اخلاقی حالت تباہ ہو جاتی ہے۔ جب کسی فرقہ کو بلا کسی کسبی خصوصیت کے خاص خاص حقوق دیدیے جائیں گے یا جب کبھی کسی انسان کے دل میں اوس کی پیدائشی افضلیت کا عقیدہ راسخ کر دیا جائے گا تو اُس کا نتیجہ قوت کا بیجا استعمال یعنی ظلم ہوگا۔ اس صورت سے دُنیا میں گویا مشق جور و ستم کی ایک تعلیم گاہ قائم ہے جہاں ہر آن معاشری جرائم ایجاد ہوا کرتے ہیں۔

عورتوں کی مساوات سے دُنیا کی ذہنی قوت دُونی ہو جائے گی۔ دُنیا کی کل اگر مرد عورت دونوں مل کر اپنی پوری قوت سے چلائیں تو ایک بہتر دُنیا پیدا ہو جائے۔ عورت کی ذات

سے دُنیا میں بہت سی خوبیاں قائم ہیں جو بڑھائی جا سکتی ہیں اور جن کا اثر عام کیا جا سکتا ہے خود صفت "مردانگی" عورتوں کے اثرات سے پیدا ہے جو ایک طرف بہادروں کو داد شجاعت دیتی ہیں اور دوسری طرف کمزوروں کی حمایت کرتی ہیں اور قوی تر جنس کو بے کسوں کی امداد اور معصوموں کے ساتھ رواداری پر مجبور کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ "مردانگی" کے معنی ہی یہ ہوگئے کہ انسان نہ صرف شرافت کے ساتھ شدت برتے اور جارحانہ شجاعت کا ثبوت دے بلکہ ناچیز ہستیوں سے رحم کے ساتھ پیش آئے اور کمزوروں کے ساتھ رواداری دکھائے۔

"مردانگی" کا یہی نصب العین اب بھی باقی رکھنا چاہئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس معنی میں "مردانگی" اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ عورتوں کی زندگی اور موت مردوں کے ہاتھ تھی۔ اگر مرد اس صفت سے متصف نہ ہوتے تو عورتیں اور بھی تباہ ہوتیں۔ لیکن اس زمانہ میں اگرچہ مردانگی اور شجاعت مفقود نہیں لیکن دُنیا کا وہ دَور گیا جب آئے دن تیر و تفنگ سے سابقہ رہتا تھا۔ ہر مرد سپاہی تھا۔ اب سپھگری کی جگہ کاریگری نے لے لی۔ اب زمانہ وہ ہے کہ مردوں سے رحم اور حلم کی استدعا کے بجائے انصاف اور دور اندیشی کا برتاؤ مطلوب ہے۔ پُرانے زمانہ میں نیکی کا صلہ تعریف اور شہرت تھی جس کے لوگ زیادہ دلدادہ ہوتے تھے۔ اب بُرائی سے روکنے کا طریقہ زیادہ تر نقصان کا خوف دلانا ہے۔ پہلے سوسائٹی کو مردوں کی "مردانگی" پر زیادہ بھروسہ تھا۔ اب کمزوروں کا تحفظ کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

زمانہ حال میں عورتوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ دُنیا کو جنگ سے پرہیز کرنے اور نوع انسان کی خدمت کرنے پر آمادہ کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اصول مذہب کی تبلیغ اور خیراتی کاموں میں اُن کا قدم مردوں سے آگے ہے اگرچہ ان امور میں بھی ان کی تعلیم ناقص تجربہ محدود اور آزادی مسلوب ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا غلط ہوگا کہ عورتوں نے اپنے اثر سے جو کام لیا اس کا نتیجہ نوع انسان کے لئے ہمیشہ خراب ہی ہوتا رہا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ عورتوں کو صحیح تعلیم اور معقول تربیت سے راہ راست پر لگایا جائے تاکہ وہ واقعات زندگی کو صحیح طور

پر اندازہ میں لاسکیں تاکہ اچھے اور بڑے بڑے کاموں میں اُن کا اثر اپنا پورا فائدہ دکھائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ عورت اپنے گھر میں بیٹھ کر خاندان کے مردوں پر جو اثر ڈال سکتی ہو وہ کسی دوسری طرح نہیں پڑ سکتا اور اس صورت سے مرد اخلاقی گمراہی سے بہت کچھ بچ جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ اور خاص کر اُن مردوں کے حق میں اور بھی صحیح ثابت ہوتا ہے جن کی نفس پرستی اُن کے ہر خیال پر غالب رہتی ہے۔ تاہم میں یہ چاہتا ہوں کہ عورتیں آزاد ہو جائیں تو اُن کے یہ سلیمانہ اثرات اور بھی قوی اور عام ہو جائیں۔

جو گروہ سوسائٹی کے اعلیٰ تر مدارج میں زندگی بسر کر رہے اُن میں واقعی دیکھا گیا ہے کہ عورتیں اپنے مردوں کو رسم ورواج کی سطح سے گرنے نہیں دیتیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہو کہ وہ اس سطح سے اوپر بھی نہیں جانے پاتے۔ وہ بیوی جس کی دماغی سطح پست ہو اپنے شوہر کے منصوبوں اور حوصلوں کے حق میں زہر ہے۔ اور اس کے خاندان کے لئے افلاس اور مصیبت کی نشانی۔ ایسی عورت یا تو اپنے اور اپنے ناسمجھ بچوں کے لئے ظلم کی راہ کھولتی ہے یا شوہر پر اپنے خیالات اور جاہلانہ منصوبوں سے ستم ڈھاتی ہے۔ جب فریقین کا مذاق مختلف ہے تو تنازعہ بعید نہیں۔ اتحاد کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ایک فریق اپنی ہستی کو دوسرے کے لئے بالکل مٹا دے۔ یا دونوں فریق ہم پلہ ہوں۔ اول الذکر اتحاد غلام اور آقا کے درمیان ہوا کرتا ہے جس میں محبت کے جذبات کا پایا جانا بھی بعید نہیں دوسرے قسم کا اتحاد جو مساوات کے ساتھ ہو دوستی کہلاتا ہے جو طبائع کی ہمواری و ہم مذاقی سے پیدا ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ مساوی قوت کے اشخاص میں اگر مذاق ایک نہ ہوا تو نباہ مشکل ہے۔ مگر عورت کے موجودہ حالات اور رواجی تربیت کے زمانہ میں شادی شدہ زندگی کا نباہ اُس سے بھی زائد دشوار ہے۔ یکساں مذاق و تربیت کے لوگوں میں آپس کا نباہ زیادہ آسان ہوا کرتا ہے۔ مذاق زندگی کے بارہ میں زن و شو کا اگر کوئی جزئی اختلاف ہو تو دونوں کی روشن خیالی اوسکو دبا سکتی ہے بر خلاف اس کے موجودہ حالت میں عورت کو مرد سے اور مرد

کو عورت سے ذرا ذرا سی بات میں ایثار کی توقع رہا کرتی ہے جو اکثر اوقات دونوں کو مایوسیوں میں گرفتار رکھتی ہے۔ زندگی کا وہ نصب العین جو یکساں مذاق اور ہم پلہ تعلیم کا پیدا کیا ہوا ہو ایک ایسی دوستی کی بنیاد قائم کرسکتا ہے جس کی لذت سے ہم عموماً آشنا نہیں ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی لائق غور ہے کہ موجودہ حالات میں شادی شدہ زندگی کا نباہ محض اس بنا پر ہوا کرتا ہے کہ عورت اگر ایک قسم کی خوبیوں سے اپنے شریک زندگی کو اپنی جانب مائل رکھتی ہے تو مرد دوسرے قسم کے اوصاف ظاہر کرکے اپنی زوجہ کو راضی رکھتا ہے۔ لیکن ان حالات میں یہ مضرت کیا کم ہے کہ مرد جس کی دماغی سطح معمولاً ارفع ہوتی ہے اپنی جاہل زوجہ کی صحبت سے اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ اس کو اپنا طرز تخیل بدلنا پڑتا ہے اور وہ ادنی جذبات کا عادی بنتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بری صحبت اچھوں کو برا کردیتی ہے۔ انفرادی زندگی میں خواہ یہ بات زیادہ اہم نہ نظر آئے لیکن تہذیب اور معاشرتی ترقیوں پر اس کا کتنا بڑا اثر مرتب ہوتا ہے یہ امر نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو آزاد کردینے سے رفتار ترقی بہت تیز ہو جائے گی۔

ترقی یافتہ سوسائٹی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انفرادی آزادی دنیاوی معاملات میں ہر ہر قدم پر نہایت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ صورت حال معاشری ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کرچکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے برخلاف اس کے ادنی سوسائٹی کی علامت یہ ہے کہ اس میں افراد کو حریت عمل بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ موجودہ دور ترقی میں عورت پر جو سختیاں عائد ہیں یہ اسی زمانہ جاہلیت کے آثار سے ہیں۔

ہم میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ اپنی آزادی کو تو از حد عزیز رکھتے ہیں لیکن دوسروں کی آزادی کی اہمیت ہمارے ذہن میں نہیں آتی۔ افراد کیا معنی اقوام پر بھی یہی کلیہ صادق آتا ہے۔ جو لوگ اقوام کی آزادی کا مسئلہ پیش نظر رکھنے کے عادی ہیں وہ عورتوں کی آزادی کے مسئلہ پر غور کیوں نہیں کرتے؟ آزادی کے بڑھنے سے جو مادی اور ذہنی ترقیاں نمودار ہوتی

ہیں وہ عورتوں کی آزادی سے بھی حاصل ہوں گی۔ غلاموں کا آزاد کرنا ہر زمانہ میں ایک نیکی خیال کیا گیا۔ مظلوم اقوام کو پنجۂ ظلم سے چھڑانا روشن خیالوں کا کام ہے۔ مجبور عورتوں نے کیا قصور کیا ہے جو آزادی سے محروم رکھی جائیں؟ دم بھر کے لئے اپنے اُن ایام کی خوشی کو یاد کیجئے جب آپ اپنے بزرگوں کی حکومت سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے۔ اگر یہ مسرت بجا تھی تو یقیناً دوسری ذاتیں بھی اس کی مستحق ہیں۔ دُنیائے اخلاق میں یہی کیا کم مسرت کی بات ہو گی کہ دُنیا کی نصف آبادی آزاد ہو جائے۔

ان سختیوں کی بدولت بہت سی عورتوں نے ایک معنی میں بے حیائی اختیار کر کے بجائے اپنی ہمجنسوں کی آزادی کے لئے کوشش کرنے کے محض ذاتی اور خود غرضانہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں جاری کی۔ مرجع خلق بننے کے لئے کبھی تو ذاتی شان و شوکت کی متوالی بنیں کبھی بازار حسن میں خود نمائی کے جلوہ دکھائے۔ جب جائز طریق سے وہ کامیابی کی راہ نہ دیکھ سکیں تو خود آرائی نے اُن کی ہوس اقتدار کو پورا کیا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جن حالات میں کسی گروہ کو عام آزادی کی طرف سے مایوسی ہوتی ہے تو انفرادی اقتدار کے تمام راستے کھلے ہوئے ہوتے ہیں جن میں جائز ناجائز طریق کا رسب تقریباً یکساں اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ اور اس اقتدار کے لئے حاکم و محکوم دونوں ساعی رہتے ہیں جو اگرچہ مختلف صورتوں سے مگر دونوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ترقی اور آزادی کی راہ میں فی الجملہ اس قسم کے خود غرضانہ اقتدار پسندی سے بڑھ کر مضر کوئی چیز نہیں ہوتی۔

غرض کہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جو جس کام کا اہل ہو وہی اس کا اہل سمجھا جائے اور اہلیت حاصل کرنے کی آزادی دونوں جنسوں کے افراد کو حاصل رہے۔ انصاف کو رواج پر قربان نہ کیا جائے۔ اور اس دور ترقی میں زمانہ جاہلیت کے آثار جو خاص کر عورتوں کے حقوق کے بارہ میں پائے جاتے ہیں ان کو روشن خیالی کے ساتھ دور کر دیا جائے۔

نغمۂ توحید

(از حضرت مولانا صفی صاحب لکھنوی)

جستجو میں تری اے قیدِ تعین سے بری
مہر تاباں ہے گرفتارِ پریشاں نظری

اُس فضا میں کہ جو ہی سرحدِ امکان و وجوب
ہمسے پوچھے کوئی ادراک کی آشفتہ سری

کسکی یہ بزمِ دل افروز ہی یارب کہ جہاں
ماہ و انجم متحیر ہیں بہ ایں دیدہ وری

دونوں یہ حلقۂ بیرونِ درِ خلوت ہیں
دورِ شمسی ہو زمانہ میں کہ دورِ قمری

خاک سے پاک کیا نسلِ بنی آدم کو
ابنِ مریم کو دیا معجزۂ بے پدری

ایک جلوہ سے ہوئے موسیٰ عمراں بیہوش
جب سرِ طور کسی شوخ نے کی عشوہ گری

موجزن ہو کے کسی زہرِ محبت کا اثر
سنگریزوں کو بناتا ہے عقیقِ شجری

محملِ روحِ رواں ہے دلِ نازک بخدا
کس نے حکمت سے اُتاری ہے یہ شیشہ میں پری

پردۂ خاک سے گل چاک گریبان نکلا
حسن کو کس نے سکھائی روشِ جامہ دری

خوابِ راحت میں جو ہے سبزۂ گلشن اُسکا
صبح چلتی ہے دبے پاؤں نسیمِ سحری

مست و آئینہ بکف دیکھ کے اُس محفل میں
ماہِ کامل پہ ہوا قہقہہ زن کبکِ دری

کر دیا کسکی کشش نے شبِ اسرا یہ ثابت
قابِ قوسین ہے سرحدِ عروجِ بشری

معتدل ہے وہ کسی گلشنِ وحدت کی بہار
جسمیں گرمی ہے نہ سردی ہے نہ خشکی نہ تری

ہے قضایائے دو عالم کا نتیجہ توحید
دیدۂ دل میں مگر چاہیے بالغ نظری

چھوڑ دو حال پر اپنے اُسے اے متقیو!
رند ہے رند صفی مست مے بیخبری

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کے براہ خشکی بار برداری اور آمد و رفت کے ذرائع

از

(جناب سیّد حسن عابد جعفری صاحب، (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ اڈیٹر شمع)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

تجارت اور حرفت کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے زندگی اور جائداد کا تحفظ، شرط اوّل ہے، کسان، زراعت، سے اور پیشہ ور محنت سے گھبرائیں گے جب تک کہ ان کو یقین نہ ہوگا کہ اُن کی کوششوں کے ثمر غارت گر ہاتھوں سے محفوظ نہ رہیں گے اور تجارت کو اس وقت تک فروغ نہ ہوگا جب تک کہ راستے خوف و خطر سے خالی نہ ہوں گے۔ کسی ملک میں تجارت اور حرفت میں ترقی کے یہ معنی ہیں کہ وہاں ملکی اندرونی انتظامات اچھے ہیں اور رعایا اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں نہ تو زمانہ موجودہ کے پولیس کے انتظامات تھے، اور نہ رعایا کو وہ اطمینان تھا جو آج حاصل ہے، اور نہ اس کی توقع کیجا سکتی ہے، کیونکہ زمانہ جوں جوں ترقی کرتا ہے، تحفظ کے ذرائع بھی قوی تر بنتے جاتے ہیں۔ حکومت کی خواہشات یعنی قوانین کی پابندی کرانے کا کام اُس زمانہ میں بہت دشوار تھا، کیونکہ ملک کی وسعت اور ملک کے بڑے حصہ میں آمد و رفت کی دشواریاں، ایسی کٹھن مشکلات تھیں کہ ان پر حاوی ہوجانا آسان کام نہ تھا۔ اسی لئے، قرونِ وسطیٰ کے متعلق رائے زنی کرنے سے قبل ہم کو یہ دشواریاں پیش نظر رکھنی چاہئیں، اور ہندوستان کی اُس حالت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے جب کہ آئیں تار برقی، ٹیلیفون، اور ریل و موٹروں کے جدید اختراعات رائج نہ تھیں،

ہندوستان کی فارغ البالی، متعدد تجارتی مرکزوں کی خوش حالی، اور کئی بندرگاہوں کی موجودگی جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے پیشتر ہندوستان میں تھیں، ہم کو باور کراتی ہیں کہ عام طور پر ہندوستان کی حالت قابل اطمینان تھی۔ اور کافی طور پر مال اور جان کی حفاظت ہوتی تھی۔ اندرون ملک تحفظ کی خدمت چوکیدار اور گاؤں کے سرغنہ، مقدم اور زمیندار کرتے تھے، سکاٹ نے میں لکھا ہے "گاؤں کا سرغنہ، لوگوں کو ظالموں، چوروں اور حکام کے مظالم سے ماں باپ کی طرح بچاتا ہے۔" جنوب میں وجیانگر کی ہندو سلطنت نے (۱۳۳۶ء لغایتہ ۱۵۶۵ء) انتظام حکومت کا اچھا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اور جان و مال کی حفاظت بھی کافی طور پر ہوتی تھی۔ یہی اسباب تھے جن سے وہ قرون وسطیٰ کے ایک نہایت مالدار ریاست بن گئی۔ شاہ رخ کا ایلچی متعینہ وجیانگر، عبدالرزاق نے لکھا ہے "حفاظت، اور انصاف اس ریاست میں ایسی جڑ پکڑ چکے ہیں کہ نہایت مالدار تاجر، بندرگاہوں سے کثیر سامان لاتے ہیں اور بغیر لکھے پڑھے، یا حساب کے اس کو بازار میں بکنے کے لئے بھیج دیتے ہیں اور مطلق تامل یا اندیشہ نہیں کرتے ہیں۔" وارتھیما، بولون کا سیاح بھی اس حاکم کی انصاف پسندی اور ملک میں قیام امن کا ثنا خواں ہے، اس کا بیان ہے "اس ملک میں تم کہیں پھرو، محفوظ رہو گے۔"

نونیز، پرتگالی سیاح (۱۵۳۵ء) مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کرتا ہے، اور لکھتا ہے "اگر کوئی شخص آ کر شکایت کرے کہ وہ فلاں صوبہ میں، فلاں سڑک پر لٹ گیا تھا، تو بادشاہ اس صوبہ کے افسر اعلیٰ کو فوراً طلب کرتا ہے، خواہ افسر اعلیٰ اس زمانہ میں بادشاہ کے پاس ہی کیوں نہ موجود ہو، لیکن اس کو حکم ہوتا ہے کہ اگر وہ چور اور مال کو گرفتار کر کے نہ لائے گا، تو وہ خود حوالات میں رکھا جائیگا اور اس کی جائداد چھین لی جائے گی۔ اسی طرح گاؤں کے مکھیا کو ایک ایک چوری کا جوابدہ ہونا پڑتا ہے، انہیں وجوہ سے ملک میں امن ہے اور اگر چوری کی وارداتیں ہوتی بھی ہیں تو برائے نام، اگر تمہاری چوری ہو جائے، اور تم ان لوگوں کو تھوڑی سی بخشش دیدو، اور چرائی ہوئی چیز کا کچھ حوالہ بتا دو، تو یہ لوگ جادوگروں کے ذریعہ سے

فوراً معلوم کر لیتے ہیں کہ چوری کا مال ملک کے اندر ہے، یا باہر چلا گیا۔ اس ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں، غرض جہاں ایسی سختیاں ہوں گی وہاں لازمی طور پر چور بھی کم ہوں گے۔"

وہاں کی انتظامی حالت زوال سلطنت ۱۵۶۵ء تک بدستور اچھی رہی۔

گجرات کے حکمران بھی اپنی حدود کے اندر اچھے انتظامات رکھتے تھے، بار بوسا، کا بیان ہے "اس جگہ آدمی قاعدے سے رکھے جاتے ہیں، ملک میں امن ہے اور انصاف"

گولکنڈہ کی صاف سڑکوں، اور سفر کے آرام کے متعلق بادری بہت تعریف کرتا ہے "اگر کوئی شخص لٹ جائے، (اس ملک میں ایسا واقعہ اکثر درپیش آتا ہے) تو حکومت اس کے نقصان کی تلافی کر دیتی ہے۔"

مغلوں کے عہد سے پہلے شمالی ہندوستان میں اندرونی انتظامات کے احوال ہم کو بہت کم معلوم ہیں۔ گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے راجپوتوں کے تمدن کے تذکرے میں سٹرکینیڈی کا بیان ہے کہ "جنگ کی، اور عام لڑائیاں یہاں رائج تھیں، لیکن باہمی جنگ و قتال، اور اجنبیوں سے سخت مغائرت ہوتے ہوئے بھی اندرون ملک بہت کافی تجارت ہوتی تھی۔

تجارت کو فروغ تھا، اور پنڈتوں اور شاعروں کی درباروں میں کمی نہ تھی، گنگا کا پانی، اور کشمیر کے پھول سومنا تھ پر روز چڑھائے جاتے تھے۔"

پٹھان عہد میں (۱۲۶۶-۸۷ء) غیاث الدین بلبن نے بہت سے جنگل کٹوا دیے تھے، اور لوٹ مار کا بہت معقول طریقہ پر استیصال کر دیا تھا۔

۱۳۴۱ء میں البتہ ابن بطوطہ ہندوستان میں سفر کرنا خالی از خطر نہیں بتاتا۔

شیر شاہ (۱۵۴۰ء لغایتہ ۱۵۴۵ء) جس کے کارہائے خیر اب تک یادگار ہیں، غالباً مسلمانوں میں پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد میں اندرون ملک کافی حفاظت جان و مال کی ہوا کرتی تھی۔ "اس نے اپنے صوبہ داروں اور عاملوں کے نام احکام جاری کر دیئے تھے کہ

وہ رعایا کو تاجروں اور مسافروں کے ساتھ نیکی سے پیش آنیکا طریقہ سکھائیں، اُن کو تکلیف نہ دیں، اور اگر کوئی سوداگر مرجائے تو اس کے مال پر اس طرح قبضہ نہ کریں جس طرح کہ لاوارثوں کے مال پر کیا جاتا ہے۔"

اس نے دیہاتوں کو ذمہ دار بنا کر، اور دیہاتوں کے مکھیا اور مقدم کو چوریوں اور ڈاکوؤں کا جوابدہ قرار دیکر ملک کو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے پناہ دلوا دی تھی، مقدم کا فرض تھا کہ یا تو چور کو لائے یا نقصان کی تلافی کرے۔ یہ طریق حکومت کامیاب ہوا۔ اور ملک میں امن اور اطمینان پھیل گیا۔ اور سفر ایسا آسان ہوگیا کہ "لاغر کو رستم کا خوف نہ رہا، شیر شاہ کے" پولیس کے انتظام کی نظام الدین نے بھی تعریف کی ہے۔" شاہراہیں اسقدر محفوظ تھیں کہ آدمی اشرفیوں کا توڑا لیکر اگر جنگل میں سو جاتا تو کوئی گزند نہ پہنچتا اور چوکیدار کی ضرورت نہ ہوتی۔"

اکبر کے عہد میں بھی سڑکیں کافی طور پر محفوظ تھیں، "اس نے اندرون ملک محاصل کو معاف کرکے تجارت کو ترقی دی تھی، اور سوداگروں کا بہت خیال رکھتا تھا۔" دیگر مغل بادشاہوں نے بھی سوداگروں کی حفاظت اور سرپرستی کی، اور یہ شہزادگان مغلیہ کی غیر معمولی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ کامل دوسو سال تک سلطنت مغلیہ دُنیا کی بہترین، اور سب سے زیادہ دولتمند سلطنت بنی رہی۔" اکبر کے پچیسویں سنہ جلوس (۱۵۸۰ء) میں ہندوستان کی مردم شماری لی گئی، جس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ اندرون ملک انتظام کو اور بہتر بنایا جاسکے۔ ابوالفضل نے جو ضروری سفارشیں کی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی "افسران ریاست کو حکم دیا جائے کہ وہ اجنبی آدمیوں کو ٹھہرنے نہ دیں تاوقتیکہ وہ لوگ کسی خاص پیشہ کے پابند نہوں، چالاک آدمیوں کی آمد اور روانگی کا بھی خیال رکھا جائے اور تحقیقات کی جائے کہ اُن کے مقاصد نیک ہیں یا بد، تاکہ تھوڑے عرصہ میں ایسے لوگوں کا صحیح حال معلوم ہوجائے جو بظاہر بیں تو شریف ہیں اور دراصل بدنیت ہیں، اس ذریعہ سے ہندوستان کے ہر حصہ میں اطمینان اور آسودگی پھیلانا مقصود تھا۔"

قصبات میں امن قائم رکھنا کوتوال اور پولیس کا کام تھا، اور دیہاتوں میں آخر تک یہی دستور رہا کہ ڈکیتیوں، لوٹ مار، اور چوریوں کے جواب دہ کوتوال، فوجدار، اور چوکیدار رہے کوتوال کے فرائض کے متعلق اکبر کی حکومت نے مفصل قواعد بنائے تھے، ابوالفضل نے ان کی مجملاً تفصیل اس طرح کی ہے :۔

"کوتوال کو مضبوط، تجربہ کار، چست،، باہمت، صابر، سخت، اور رحمدل ہونا چاہیئے اُسکی نگہداشت سے اور شب کو پہرہ دینے سے رعایا آرام کی نیند سوئے گی، اور بدنیت لوگوں کو بدمعاشیوں کا موقع نہ ملے گا۔ اُس کو چاہیئے کہ مکانات اور اُن سڑکوں کا جن پر آمد و رفت زیادہ رہتی ہے، رجسٹر بنائے۔ اور رعایا سے عہد لے کہ وقت ضرورت کے کام آئے، اور غم اور خوشی میں شریک ہو، اُس کو چاہیئے کہ مختلف آبادیوں کا اپنے طور پر ایک حلقہ قائم کرے، اور اپنے ایک ہوشیار معتمد کو وہاں مقرر کردے تاکہ وہ اس پر نگاہ رکھے، اور روزانہ شام کو اپنی مہر لگا کر کوتوال کے پاس رپورٹ بھیجے جس میں نوواردوں اور جانیوالوں کا اور تمام واقعات کا ذکر ہو، اور خفیہ کو مقرر کردے جو غریب ہو اور لوگ اُس سے ناواقف ہوں، اور اپنی تحریری رپورٹ کو پیش نظر رکھکر پوری طرح تحقیقات کرتا رہے، اُسکو چاہیئے کہ ایک سرائے علیحدہ بنائے جس میں اجنبی نوارد ٹھہرائے جائیں اور مختلف اقسام کے خفیہ لوگوں کے ذریعہ سے اُن کے حالات معلوم کرے۔ اس کو چاہیئے کہ لوگوں کی آمد و خرچ پر نگاہ رکھے، اور اپنے طرز عمل سے لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت اور اپنا وقار قائم کرے، اور محکمہ کو قابل احترام بنائے .... اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ رات کو شاہراہیں کھلی رہیں، اور اُن مقامات پر رکاوٹیں قائم کردی جائیں جہاں دوسروں سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور جب رات زیادہ ہوجائے تو کسی کو گاؤں کے اندر نہ آنے دے، اور نہ کسی کو باہر جانے کی اجازت دے، بیکاروں کو کام سے لگائے۔ پرانی شکایتوں کو رفع کرے، اور ہر شخص کو دوسرونکے مکان میں زبردستی داخل ہونے سے روکے اور چوروں

کا پتہ لگائے ۔ ورنہ وہ نقصان کا خود ذمہ دار رہے گا" ابو الفضل نے یہ بھی لکھا ہے ۔ کہ اگر کسی مقام پر کوتوال نہ ہو تو یہ خدمت محصّل ٹیکس کے سپرد رہے گی۔

سترھویں صدی کے آخر نصف زمانہ میں تھی وے نو، اور منوچی نے بھی ذکر کیا ہے کہ اگر فوجدار اور کوتوال چوری کا سُراغ لگا کر مال برآمد نہ کر سکتے تھے تو اُن کو نقصان کی خود تلافی کرنی ہوتی تھی ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان قواعد کی کس قدر پابندی ہوتی تھی، اور اپنی بچت کے لئے کتنے افسران محکمہ رعایا پر الزام عائد کر دیا کرتے تھے، بہرکیف اس طریق انتظام سے رعایا میں ہوشیاری کا مادہ پیدا ہوتا تھا اور جرائم کی تعداد میں بھی کمی ہوگئی تھی ۔ تھی وے نو کا بیان ہے کہ کوتوال ہمیشہ اپنی چالاکیوں سے روپیہ کی ادائیگی نہ کرتے تھے، اور وہ ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ مسٹر بے برکی چوری کا معاوضہ ایک فوجدار کو مبلغ پندرہ ہزار روپیہ ادا کرنا پڑا ۔

حکومت کی سخت کوششوں کے باوجود راہزنی اور قزاقی کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی تھیں، بالخصوص اُن مقامات پر جو ذرا دُور واقع ہوئے تھے، دور دراز کی مسافتیں خطرے سے خالی نہ تھیں اور بغیر کاروان کے اس قسم کے سفر ذرا مشکل سے سلامتی کے ساتھ طے ہوتے تھے، پہاڑی اور جنگلی مقامات، بالخصوص مالوا اور سنٹرل انڈیا میں راہیں بہت مخدوش تھیں، حالانکہ مغربی بندرگاہ کو جانے کا راستہ یہیں سے تھا، ان جنگلوں میں بھیل، گونڈ اور موگھی اقوام کے چور پناہ گزین رہتے تھے، اور بسا اوقات قافلہ تک کے سامان کی چوریاں کر لیتے تھے ۔ البتہ مقابلۃً ذرا مشکل سے آتے تھے ۱۶۰۸ء لغایۃ ۱۶۱۱ء میں ہاکنس کے یہ الفاظ "عہد جہانگیری میں چوروں اور قزاقوں کی ایسی زیادتی ہے کہ کوئی شخص اپنے مکان سے نہیں نکل سکتا ہے تاوقتیکہ اُس کے ہمراہ پوری فوج نہ ہو" یقینی طور پر خلاف واقعہ ہیں کیونکہ اسی زمانہ میں مسٹر ٹامس رو (۱۶۱۵ء لغایۃ ۱۶۱۹ء) اور ٹیری (۱۶۱۵ء) راجپوتانہ سے دور افتادہ اور خطرناک مقام سے ہو کر سفر نہ کر سکتے ۔ اگر راہیں صاف اور خطرہ سے خالی نہ

ہوتیں، انگریزی سفیر نے تو ایسے وقت میں سورت سے اجمیر کا سفر برہان پور، اور چتوڑ ہو کر کیا تھا، جب کہ سیاسی فتنہ و فساد کی گرم بازاری تھی۔ یہی حال ٹیری کا تھا جس نے "نہایت آرام کے ساتھ" سورت سے مانڈو تک کا سفر کیا تھا اور صرف بڑودہ کے قریب آدھی رات کو اُس کے مختصر قافلہ پر ایک معمولی سا حملہ ہوا تھا، انہیں راستوں سے بنجارے اپنی گونیں بھر کر آتے جاتے تھے، اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ راستوں کے خطروں کے باعث اُنھوں نے اپنے آبائی پیشوں کو ترک کیا ہو،

قزاقوں اور رہزنی کی روک تھام کا ایک ذریعہ عہد مغل میں یہ بھی تھا کہ قزاقوں کو ایک دم تہ تیغ کر کے اُن کی کھوپڑیوں سے مینار قائم کر دیئے جاتے تھے تاکہ دوسرے بد اعمالوں کو عبرت حاصل ہو، ٹیری کا بیان ہے کہ رام سور، اجمیر سے بیس میل، کے فاصلہ پر، "بادشاہ نے سو قزاقوں کو قتل کیا تھا، اور اُن کی برہنہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں"۔ پندرہ برس کے بعد سنہ ۱۶۳۱ء میں پیٹر منڈی نے "آگرہ میں کئی مناراں (چھوٹے مینار) دیکھیں جو نو گرفتار چوروں کی کھوپڑیوں سے بنائی گئی تھیں۔ بعض چور اور ڈاکو تو زندہ جلا دیئے گئے تھے، اُن کی لاشیں ایڑیوں میں پھندا لگا کر آم کے باغوں میں ٹانگ دی گئی تھیں۔ اور خود شہر میں متعدد مقامات پر ٹکٹیوں پر لاشیں لگی ہوئی تھیں"۔ ایک سال کے بعد منڈی نے باکیوار اور چپر گھاٹ کے درمیان میں گنگا کی وادی میں اسی قسم کی دو سو میناریں دیکھیں، حالانکہ دونوں مقامات کا فصل صرف ۵۰، ۶۰ میل تھا، یہ راستہ ایسا خطرناک تھا کہ بادشاہ نے عبد اللہ خاں کی کمان میں دو ہزار سوار، اور بیس ہزار پیادے بھیجے، جنھوں نے قزاقوں اور ڈاکوؤں کے گاؤں برباد کر دیئے، اور اُن کا کل مال و اسباب لوٹ لیا، قزاقوں کی ہمتیں ایسی بڑھی ہوئی تھیں کہ اُنھوں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی، اس کے استیصال کے لئے بادشاہ کو بہت بڑی فوج بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔

ٹے ورنیر نے کالا باغ، واقع راجپوتانہ میں بھی ایک ایسا ہی مینار دیکھا تھا، اورنگ زیب

نے وہاں کے راجہ اور باشندوں کو اس جرم میں یہ سزا دی تھی کہ وہ مسافروں کو لوٹتے تھے، اور سوداگروں سے زبردستی کثیر محاصل وصول کرتے تھے۔

مالوہ اور گجرات میں ایک خاص فرقہ تھا جو چارن کے نام سے مشہور تھا اُن کا پیشہ یہ تھا کہ اُنکی جماعتیں یا ٹولیاں مسافروں کے ہمراہ سفر کرتی تھیں، اور راہ کے ڈاکوؤں اور قزاقوں کو مسافروں سے کچھ روپیہ دلوا کر، حملہ سے محفوظ رکھتی تھیں، بنیئے عام طور پر چارنوں کو لیکر سفر کرتے تھے، ہیبر ۱۸۲۵ء میں لکھتا ہے کہ سوداگر اور مسافر عام طور پر مالوہ اور گجرات میں ایک چارن کو ہمراہ لے لیتے ہیں، چارن کا وجود ایسا متبرک خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی ڈاکو اس مسافر سے ہاتھ نہیں لگاتا،

سترہویں صدی کے اخیر میں سلطنت مغلیہ کے جوڑ بند ڈھیلے ہو چلے تھے، اور رفتہ رفتہ باہمی جنگ و قتال نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی تھیں جو خود سر ہو گئی تھیں، شمالی ہندوستان کی فتنہ سامانیوں اور ہنگامہ آرائیوں نے ملک میں سیاسی بدنظمی اور بد انتظامی کا بازار گرم دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوانین اور قاعدے جن کی برکت سے عہد مغلیہ کو دو سو سال تک سکون اور امن پسندی کی شہرت حاصل تھی، رفتہ رفتہ مٹ گئے، پنڈاری ٹھگوں، جاٹوں اور مرہٹوں نے زور پکڑا، اور اپنی اپنی سلطنتوں کے خواب دیکھنے لگے اُنکے زمانہ میں غارتگری، قزاقی، اور بدعہدی نے از سر نو سر اٹھایا اور ہر جگہ مظلوموں کے آہ و بکا کے نعرے بلند ہو گئے، خود اورنگزیب کے عہد میں چورامن جاٹ آگرہ کے قرب و جوار اور فتح پور سیکری میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا، اور مرہٹے سرونج اور اُجین تک غارتگری کرتے آجاتے تھے، اٹھارھویں صدی کے وسط میں تو مرہٹے بنگال تک پہنچ گئے تھے۔ فصلی حملوں کے علاوہ سخت محاصل وصول کرتے اور مسافروں اور سوداگروں سے ٹیکس لینے میں بھی بہت تشدد کرتے تھے۔ اور اُن کے مظالم کی انتہا نہ تھی۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے، غالباً امپیریل گزیٹیر سے مندرجہ ذیل اقتباس غیر موزوں نہ ہوگا عہد اورنگزیب کے اختتام پر آمد و رفت، اور مال و اسباب کے

لانے لیجانے کے متعلق درج ہے کہ "سڑکوں پر چلنے کا جو حق عوام کو حاصل ہے اس کی حفاظت کیجاتی تھی۔ اور جان اور مال کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں کو ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ جن سڑکوں پر کارواں اور مسافروں کی آمد و رفت رہتی تھی اس کی پوری نگہداشت کی جائے۔ سڑکوں پر جا بجا چوکیاں تھیں، اور چوکیوں کے درمیان پتھر کے نشان اور ستون اور درختوں کی قطاریں نظر آتی تھیں، جن زمینداروں کی زمین پر ہو کر سڑکیں نکلیں تھیں ان کی جانب سے چوکیدار تھے اور مسافروں سے بہت ہی معمولی محصول لیا جاتا تھا، عمل گذار یعنی مجسٹریٹ اپنے حلقوں میں چوریوں کے ذمہ دار تھے، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رعایا کی کافی حفاظت ہوتی تھی۔

خاتمہ

جملہ واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان قرون وسطیٰ میں بار برداری اور آمد و رفت کے معقول ذرائع کے اعتبار سے خوش قسمت تھا، اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق کافی طور پر رعایا کی حفاظت ہوتی تھی۔ ہندوستان کی تجارت بڑھتی ہی رہی، اور اندرون ملک اس کو ہمیشہ فروغ ہوتا رہا سڑکیں اور شاہراہیں محفوظ تھیں، اور اگر کبھی وارداتیں ہو جاتی تھیں تو ان کا عام طبائع پر زیادہ اثر نہ ہوتا تھا۔ بداعمالیوں، قزاقیوں اور چوریوں کے استیصال کی طرف حکومتیں ہمیشہ توجہ کرتی تھیں، اور قانون کی پابندی، اور مفید قوانین کے نفاذ کو اپنا فرض سمجھتی تھیں، اور ہندوستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک لطف اور آرام کا گہوارہ تھا، قرون وسطیٰ کے حکمرانوں پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ وہ اپنی حدود حکمرانی سے باہر خلق اللہ کی بہبودی اور ان کی راحت کے لئے کوشاں نہ ہوتے تھے، ملک کی خوشحالی، فارغ البالی، شہروں اور بندرگاہوں کی رونق اور تجارت کی کامیابی، انہیں حکمرانوں کی مرہون منت تھی جن کو آج یورپین مورخ اپنی کوتاہ نظری سے مطعون کرتے ہیں، اور خود اپنی قوم کے سیاحوں اور مورخوں کی شہادتوں پر التفات نہیں کرتے، یہ علمی اور تاریخی ظلم ہے جس کو ہم

اور ہمارے طلبا رانگریزی مورخین کی تواریخ ہندوستان، اور درسی تواریخ میں جبراً اور قہراً برداشت کررہے ہیں، اور اُن رہبران ملک وملت کو بُرا کہنے پر مجبور ہوتے ہیں جو حقیقتاً ہمارے لئے مایۂ ناز، اور ہماری تاریخ میں طرۂ امتیاز تھے۔

(مختار) (باقی)

(**نوٹ**) قرون وسطیٰ کے مضمون کا بڑا حصہ اس قسط کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ نوعیت اور تحقیق کے اعتبار سے جس پایہ کا یہ مضمون ہے اس کے بارے میں ہم کو زیادہ عرض کرنیکی ضرورت نہیں۔ قابل مصنف نے زیادہ تر یوروپین، سیاحوں اور مورخوں کے حوالہ سے ہندوستان میں قرون وسطیٰ کی حالت کا جو دلفریب اور اطمینان بخش نقشہ کھینچا ہے اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کی گردن شرم سے نیچی نہ ہوگی، ہمارے لئے یہ تاریخی شہادتیں موجب فخر ہیں کہ جہاں تک ملک رانی، قوانین سازی، اور فارغ البالی کا تعلق تھا، ہم خدا کی خدائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے! آئندہ قسط میں اس عہد کی ڈاک کے انتظامات پر ایک مضمون شائع ہوگا اور اس طرح پر مصنف کا پورا مضمون اردو کے قالب میں ڈھل کر قارئین شمع تک پہنچ جائے گا،

ہمارا ارادہ ہے کہ مضمون کی کُل اقساط کو جمع کرکے یکجا شائع کردیں، قیمت صرف عہ، ہے۔ درخواستیں ابھی سے آنی شروع ہوجانی چاہئیں تاکہ ۵۰۰ خریداروں کی درخواستیں آجانے پر اس کی طباعت شروع کرادی جائے۔ ۱۰۰ جلدوں کے خریداروں کو بیس فی صدی اور ۵۰ جلد کے خریداروں کو دس فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

منیجر شمع

غزل

(از حضرت مصور جذبات میرزا ثاقب صاحب لکھنوی)

یوں جھیلتا ہوں ہجر کی شبہائے تار کو
ہر صبح یاد کرتا ہوں شامِ مزار کو

نازاں ہی تیرگی پہ ہے شامِ مزار کو
لاؤں کہاں سے ہجر کی شبہائے تار کو

گرنے لگی ہے قیمتِ دل آنسوؤں کیساتھ
کس نے اُلٹ دیا ورقِ اعتبار کو

جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں
گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو

آوازہ چمن کی امید اور میرے بعد
چپ کر دیا فلک نے زبانِ بہار کو

در سیکڑوں قفس میں ہیں پھر بھی اسیر ہوں
کیسا مکان ملا ہے غریب الدیار کو

میں سخت جاں نہیں ہوں مگر ہاں نگاہِ یاس
روکے ہے دستِ بازوئے خنجر گذار کو

اس حادثے سی قبل کہ میں کچھ نہ کہہ سکوں
سُن لو بیانِ حالِ دلِ بے قرار کو

خود آسماں کو نقش وفا سے ہے دشمنی
تم کیوں مٹا رہے ہو نشانِ مزار کو

ثاقب یہ شعر جن میں جھلک خونِ دل کی ہے
دکھلا رہے ہیں کیفیتِ قلبِ زار کو

نجات

(بہ سلسلہ جنوری ۱۹۲۷ء)

از

(جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب، آکسن، بیرسٹرایٹ لا ممبر لیجسلیٹو کونسل - ایڈیٹر شمع)

(۴)

صبح کو جب ہوش آیا تو دن اچھی طرح نکل چکا تھا، اور دھوپ کی تیز شعاعیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں - درد کی شدت سے سر میں ٹیسیں ہو رہی تھیں اور بہ مشکل آنکھ کھلتی تھی۔ ڈوبتے آدمی کو زمین پر پیر ٹیکنے سے جو خوشی ہوتی ہے وہی خوشی مجھ کو فرش پر کھڑے ہو کر اس احساس سے ہوئی کہ میرے پیروں تلے زمین موجود تھی اور میں اپنے ہی کمرہ میں تھا! والدہ کا چوبی صندوق رکھا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر آئینہ تھا - میں آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر روزانہ صبح کو ورزش کیا کرتا تھا۔ کیا رات کو مجھے میرا ہی عکس نظر آیا تھا؟ .... اور پھر؟ میں نے آواز دے کر ملازم سے پوچھا "رات کو میرے ساتھ کون تھا؟" اس نے جواب دیا "حضور نے تو مجھے رات کو چھٹی دے دی تھی اور فرمایا تھا کہ صبح آنا، مجھے کیا معلوم آپ کے ساتھ کون آیا تھا، باہر امیر معزالدین بیٹھے ہیں، انھوں نے آپ کے جگانے کو منع کر دیا تھا" یہ کہہ کر وہ تو رخصت ہوا مگر مجھے اپنے سوال پر خود ہی ندامت ہوئی، اتنے میں معزالدین کمرہ میں آگیا اس کا چہرہ کامیابی کی مسکراہٹ سے چمک رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا "زیب النسا کا پیغام ہے کہ آج آپ میرے یہاں مدعو ہیں، وہ بھی آئے گی - آپ کی رات کی باتیں اس کی زبانی معلوم ہو کر

مجھے بہت ہنسی آئی‘‘

میں نے فوراً جواب دیا ’’سہ پہر کو ایک اور جگہ جانا ہے‘‘ اس کو چپ کرنے کے لئے مجھے کہنا پڑا ’’سخت مجبوری ہے‘‘، اور ہتیلی سے پیشانی کو سہلانے لگا، درد کی شدت سے بُرا حال تھا، مگر اُس پر مطلق اثر نہ ہوا، میرے انکار پر اُس کا اصرار بڑھتا گیا۔ مجبوراً مجھے کہنا پڑا ’’زیب النسا سے ملنا ناممکن ہے، آپ اس قصے میں نہ پڑیں .... وجہ دریافت کرنے پر اگر ایسا ہی اصرار ہے تو خیر سُنئے، مجھے زیب النسا سے بہتر عورت مل گئی ہے .... فرمایئے، کیا یہ وجہ انکار کے لئے کافی نہیں ہے؟‘‘

اس گفتگو کے بعد معزالدین کو رخصت ہونا پڑا، اُس کی گھبرائی ہوئی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ مجھے پھانسنے اور تباہ کرنے کی جو اُمیدیں اس نے باندھی تھیں، اُن کا خاتمہ ہو چکا تھا

میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا، مگر اختلاج قلب سے تمام جسم لرز رہا تھا۔ دل کی دھڑکن کانوں کو محسوس ہوتی تھی، اور ایک دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ ’’میں چلا‘‘ گھبرا کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، اور کپڑے پہننے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر میں سڑک پر تھا۔ مگر کیوں!

لچھمی کو آتا ہوا دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، لیکن خیال آیا کہ میرے معمہ کو وہی حل کر سکے گی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک قدم بڑھایا تو گر کر مر جاؤں گا، وہ بازار سے واپس آ رہی تھی، ایک ہاتھ میں ترکاریوں کی ڈلیا تھی، اور دوسرے ہاتھ سے ساری کو درست کرتی جاتی تھی۔ سڑک خالی تھی، کوئی دس قدم کا فاصلہ رہا ہوگا کہ میں گفتگو کرنے کو رُکا، وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ میں نے کہا ’’بڑا احسان کیا، رات کو مجھے بچا لیا‘‘ اُس نے رفتار دھیمی کر لی اور مجھے اُس کے لباس کی خوشبو سونگھنے اور اُس کی زلفوں کو شانے پر بکھرے ہوئے دیکھنے کا اچھی طرح موقع ملا ......

اب صرف ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا، اُس نے منع کرنے کے انداز سے ہونٹوں پر انگشت

شہادت رکھ لی، یعنی میں خاموش رہوں اور خفا نہ ہوں، اور مجھے کنکھیوں سے دیکھتی اور مسکراتی ہوئی برابر سے نکل گئی۔

"کیا وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی؟...... کیا اس عمر اور اس وضع کی تربیت یافتہ لڑکیاں اپنے باپ کے شناساؤں کو جواب دینے کی بجائے اسی طرح مسکرایا کرتی ہیں؟" وہ نرم اور ہلکے پاؤں سے فوراً گھر پہونچ گئی، اور مڑکر دیکھنے لگی۔ اب بھی ہنس رہی تھی...... واقعی اُس کی طبیعت میں محبت تھی، اور بچپن کا بھولا پن موجود تھا، مجھے ہاتھ کا اشارہ کیا جسکا مطلب تھا "پھر ملیں گے" اور مکان کے اندر چلی گئی۔

میں جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو میری دنیا دوسری ہو چکی تھی، کرم سنگھ کی بیٹی میرے لئے ایک نازک پھول تھی جو نسیم سحر کے ہلکے جھونکوں سے کھلتا ہے، رات کی کچھ اصلی کچھ بھی نہ تھی! وہ میری طبیعت کی خرابی، اور نشہ کی ہیجانی کیفیت کا تخیل محض تھی!...... معلوم ہوتا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤنگا، اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور پیشانی کی بھڑکتی ہوئی رگوں کو انگلیوں سے دبانے لگا۔ دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی، جس قدر قابو میں لانے کی کوشش کرتا تھا، اُسی قدر طبیعت خراب ہوتی تھی، سامنے خنجر رکھا تھا۔ میں نے اُس کو غلاف سے نکال لیا اور چاہا کہ زندگی کا خاتمہ کردوں، خنجر کی بے قرار نوک جگنو کی طرح چمک رہی تھی، پھر خیال آیا کہ میرے بعد میری کل جائداد سرکار میں ضبط ہو جائے گی کیونکہ میں بے وارث ہوں، میرا عہدہ امیر معزالدین یا کسی اور ایسے ہی بداعمال کو ملیگا، اور زیب النساء فخر یہ کہتی پھرے گی کہ میں نے اُسی کی وجہ سے خودکشی کی تھی لہٰذا میں نے خنجر کو غلاف میں رکھدیا کیونکہ ان حالات میں خودکشی کرنا سخت حماقت تھی اور چونکہ سخت انتشار تھا اس لئے کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ رفتہ رفتہ طبیعت کو سکون ہونے لگا اور اس فیصلہ پر پہنچ کر کہ "سب جھگڑوں کا فیصلہ کردینا مناسب ہے" بے بیان اطمینان ہو گیا۔ میں اس نتیجہ پر کس طرح پہونچا؟ اس سوال کا جواب میرے امکان سے باہر ہے، کیونکہ دُنیا وی علایق سے قطع تعلق کی خواہش از خود پیدا ہوئی تھی، اور میں نے اُس کا احساس اس وقت

کیا جبکہ میں مستقل رائے قائم کرچکا تھا! ناتجربہ کاری کے باعث مجھے زندہ دلی کی تلاش رہتی تھی۔ اور چونکہ اب اس کی حقیقت معلوم ہوگئی، اور میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے ذریعہ سے زندگی اور مسرت کا ملنا محال، اس لئے میں یکایک متنفر ہوگیا۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

مجھے تو اب قلب کی راحت، اور دماغ کے سکون کی ضرورت تھی، اور اپنا وہ عہد معصوم پیش نظر تھا جبکہ میں خوف اور جوش کا متحمل نہ تھا، اور والدہ کی تربیت اور محبت کی نگاہیں میری محافظ تھیں! والدہ اب زندہ نہ تھیں، اور غالباً ان کی زیارت کبھی نصیب نہ ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی آنسوؤں کا تار بندھ گیا، اب تک میں اُن کے غم میں جی کھول کر نہ رویا تھا۔ رونے سے طبیعت ذرا ہلکی ہوئی، مگر "اب میری حفاظت کون کرے گا؟" ایک بزرگ بزرگ کی نورانی اور مُسکراتی ہوئی صورت میری اشک آلود آنکھوں کے سامنے آگئی اور میں بے اختیار ہو کر کہنے لگا "انہیں کی خدمت کرونگا، اور انہیں کے قدموں پر سر رکھدونگا"!

چوبی صندوق سے والد مرحوم کا مُطلّا قرآن شریف نکالا، کئی ہفتوں سے تلاوت نہ کی تھی۔ پہلی آیت نظر آئی "اللہ کے کرم سے مایوس نہ ہو، وہ سب گناہوں کو معاف کردیتا ہے، وہ رحمٰن ہے اور رحیم ہے" کتاب اللہ کو میں نے سینہ سے لگالیا۔ اور پھر کھولا تو یہ آیت ملی "اور جب ان لوگوں سے (سچے ایمان والوں سے) کوئی شرمناک اور نقصان رساں فعل سرزد ہوجاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اور کون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو گناہوں کو معاف کرے، بشرطیکہ وہ لوگ جان بوجھ کر بار بار گناہوں کا ارتکاب نہ کریں" دل کو مضبوط، اور ہمت کو بلند پاکر میں نے تیسری مرتبہ کلام الٰہی سے امداد طلب کی، یہ آیت ذرا بڑی تھی اور قاتلوں، زانیوں، اور بے ایمانوں سے تعلق رکھتی تھی، "جن کو روز قیامت دوگنی سزا دیجائے گی، لیکن جو توبہ کرتا ہے، اور خدا کا یقین رکھتا ہے اور اپنے

اوقات کو نیک کاموں میں گذارتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی زندگی کی برائیوں کو نیکی سے بدل دیگا کیونکہ اللہ رحمٰن اور رحیم ہے " اور بے شک جو توبہ کرتا ہے اور اعمال نیک رکھتا ہے وہ حق کی جانب ہو جاتا ہے "

اب سیدھا راستہ میرے پیش نظر تھا۔ اور جو کچھ جھجک باقی تھی نکل چکی تھی! " جو توبہ کرتا ہے اور خدا کا یقین رکھتا ہے اور اپنے اوقات کو نیک کاموں میں گذارتا ہے " یہ الفاظ میرے دل میں اتر گئے، قرآن کریم کو میں نے تکیہ کے پاس رکھدیا، اور جس طرح بچہ ماں کو یاد کرکے روتا ہے میرا دل چھوٹ گیا اور بے قرار ہو کر رونے لگا۔ اختلاج بھی کم ہو گیا اور مجھ پر سکون بخش اور آرام کی نیند غالب ہو گئی!

(۵)

اسی روز سہ پہر کو میں حضرت شیخ نظام الدین اولیار کی خانقاہ پر حاضر ہوا، اور بستر علالت سے اٹھے ہوئے مریض کی طرح گر پڑا، کیونکہ میرے سر میں ابھی تک درد باقی تھا۔ کرن سنگھ پھاٹک پر تھا، حسب معمول خندہ پیشانی سے ملا۔ اس کو فقرار اہل اللہ اور صوفیوں پر بہت اعتقاد تھا، بعض لوگ اس کو مسلمان سمجھتے تھے، مگر وہ مسلمان نہ تھا۔ وہ اہل سیاست اور فقرار کی شہرت کے لحاظ سے انکی تعظیم و تکریم کرتا تھا اس کے قلب کی وسعت میں دو قطعی مختلف عقاید کی بہ یک وقت گنجایش تھی، نو وارد مذہب کی کامیابی کو وہ اس کی سچائی پر محمول کرتا تھا اور جس حد تک مذہب کامیاب ہوتا تھا اسی حد تک اس کو سچا مذہب سمجھتا تھا۔ غرض کرن سنگھ کے دل میں اسلام اور ہندو دھرم اسی طرح جاگزین تھے جس طرح ہندوستان میں ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔

وہ اُن لوگوں میں تھا جو اپنی حالت پر فطرتاً قانع اور صابر رہتے ہیں۔ اور کبھی شکایت نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے حضرت شیخ اس کو پیار فرماتے تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا، " بہت اچھا کیا کہ یہاں چلے آئے، آجکل ہر شخص تمہارا ذکر کرتا ہے شیخ کو بھی اطلاع کر دونگا

وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے" میں نے کہا "اطلاع کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔ جب اور لوگ زیارت کریں گے میں بھی زیارت کر لونگا" اور ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہو گئے جہاں انسانی وضع کے عجیب و غریب نمونے موجود تھے، چونکہ میرے سر میں بہت درد تھا میں دیوار کے سہارے سے بیٹھ گیا۔ کرن سنگہ میری تکلیف کو محسوس کرکے کہنے لگا "میری بیٹی کہتی تھی کہ تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے" اور میری پیشانی کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اُس نے مجھے سینہ سے لگا لیا، اور پوچھنے لگا "کیا ماں کی یاد آگئی؟"

ملازم نے آکر اطلاع دی کہ حضرت شیخ تشریف لارہے ہیں۔ ہم سب سروقد کھڑے ہوگئے اور اس خیال سے کہ ہر شخص کو حضرت کی زیارت کا پورا موقع ملے، نصف دائرہ بنا کر فرش پر بیٹھ گئے،

یہ سوچ کر کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرنا پڑے گا، مجھے پھر اختلاج ہونے لگا۔ کیونکہ گناہوں کا اقبال آسان ہے مگر حماقتوں کا اظہار امکان سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ مگر مجھے سابقہ زندگی کو اختیار کرنا منظور نہ تھا، اور یہ بھی معلوم تھا کہ محض سابقہ گناہوں کی بنا پر حضرت مرید بنانے سے انکار نہیں کرتے اسلئے میں نے دل کو مضبوط کرکے عہد کرلیا کہ چاہے کچھ ہو مگر میں شیخ سے ایک ایک بات عرض کردوں گا اور کچھ نہ چھپاؤں گا، البتہ یہ خیال نہ رہا کہ میرا ہمسایہ بھی وہاں موجود تھا!

حضرت شیخ نظام الدین کی عمر ستر سال سے کم نہ تھی۔ بال سفید ہوگئے تھے مگر ہونٹوں پر ہروقت ہنسی اور شادمانی رہتی تھی۔ آنکھوں میں حیرت انگیز قوت تھی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ کر راحت اور اطمینان سے معمور کردیتی تھی۔ حضرت نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر مجھے منتخب فرما لیا۔

اللہ رے نگاہ کہ مجمع کے بیچ میں
جس دل سے لاگ تھی اُسے پہچان لے گئی

اور بلند آواز سے فرمایا "یہاں ایک بیش قیمت نگینہ موجود ہے! اے میرے دل شکستہ! میرے

پاس آ" میں فوراً آگے بڑھ گیا، اور کرن سنگھ نے یہ کہہ کر تعارف کرادیا "امیر حسام الدین کے بیٹے ظہیر الدین یہی ہیں انہیں کو کل شہنشاہ معظم نے ملک بنایا ہے" "میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا، مگر تعارف کی ضرورت نہیں ہے" یہ فرماکر حضرت نے میری ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ میں لیکر بلند کیا، اور بائیں ہاتھ سے ایک ہلکا طمانچہ میرے دلہنے رخسار پر لگاکر تبسم فرمایا۔

حاضرین بھی مسکرانے لگے، اور اُن کو خیال ہوا کہ حضرت میری ترقی سے خوش ہو رہے ہیں مگر میرا ہی دل جانتا تھا کہ ان الفاظ کی تہہ میں کیا کیا باتیں تھیں، حضرت نے میری ٹھوڑی کو اونچا کیا تاکہ میں اُن کی آنکھوں کی مقناطیسی قوت سے متاثر ہو جاؤں، میں متاثر ہو گیا، اور ان آنکھوں میں میرے لئے پیغام تھا جس کا صاف مطلب تھا "میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے، مجھ سے ہر بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے" اور قبل اس کے کہ میں معلوم کرسکوں میرے گناہوں کا اقبال ہو چکا تھا۔

شیخ نے فرمایا "اے میرے پیارے سبزۂ آغاز ملک، تمہارا باپ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کو لے چلو" میں پھر ڈر گیا کہ اب تنہائی میں شیخ اچھی طرح ایک ایک بات پوچھیں گے، اور جرح کریں گے، مگر میں نے دل کو پھر مضبوط پکڑا، حضرت نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا، اور قطعی فیصلہ کن انداز میں فرمایا "جو چیز خدا رکریم نے اپنی بے نہایت اور غیر محدود عقل میں مسطور کردی ہے اس کو پوشیدہ رکھو، اور کسی کو نہ دیکھنے دو، بہت اچھا کیا کہ میرے پاس چلے آئے۔ ہمت سے کام لو، اور سلطان کو جاکر استعفا دیدو۔ جوش اور شوق کی ابتدائی طغیانی میں ایسے اہم کام آسان ہوا کرتے ہیں"

"اور میری جائداد"؟

"اپنے وارث کو دے ڈالو"؟

"میرا کوئی وارث نہیں ہے"

"جس سے تمہارا پیار ہے اُس کو دیدو"

"مگر .... میری زبان نے ساتھ نہ دیا۔ اور میں جو چاہتا تھا نہ کہہ سکا"

حضرت نے معصومانہ انداز سے فرمایا "اُنہیں کو دیدو" اور مجھ کو پیار کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ، میرے والد نے بھی مجھ کو اس طرح کبھی نہ دیکھا تھا ،

"اس کا باپ بغیر حضور کے حکم فرمانے کے قبول نہ کرے گا"

"وہ کون ہے ؟"

"کرن سنگھ !" مگر میں شرم سے پانی پانی ہوگیا -

شیخ خوش ہوگئے اور تالیاں بجا کر فرمانے لگے "کرن سنگھ ٹھیک ہے ، اُس کو بیٹی کے جہیز کی فکر بھی تھی - اچھا ، میں خط دیتا ہوں تم دستاویزات کے ساتھ اس کے حوالہ کر دینا"

قصر ہزار ستون میں ابھی روشنی شروع ہوئی تھی - میں نے میر خاں ساماں کے ذریعہ سے بارگاہ سلطانی میں اطلاع کرانی چاہی ، وہ مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگا "آپ تھے کہاں ؟ سلطان آپ کو یاد فرما رہے ہیں ، آج کچھ شکایتیں اُن کے کان تک پہنچی ہیں - اور آپ کی تلاش میں آدمی بھیجے گئے ہیں خدا کرے یہ ملاقات خیر و خوبی کے ساتھ انجام پائے"

میں قصر سلطانی میں بے دھڑک چلا گیا - سلطان علاءالدین اپنے رنج کے تخت پر فروکش تھے ، اور معتمد کاغذات کا بستہ لئے سامنے کھڑا تھا ، سلطان نے میرا مجرا قبول کیا ، اور ایک سربمہر لفافہ کو چاک کر کے پڑھنے میں مشغول ہوگئے - اُن کے لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ تھی - اور کاغذ کو بے پرواہی کے انداز سے عمداً اسقدر نیچا کر لیا تھا کہ میں اس کو خواہ مخواہ پڑھ سکوں - اخیر جملہ تھا کہ "نہایت پریشانی کے عالم میں حضور کی خادمہ نے یہ عریضہ لکھا ہے اور وہ اخیر مرتبہ عرض کرتی ہے کہ حضور اس کی خطا کو معاف فرمائیں - حضور کی لونڈی "زیب النساء""

خط پڑھ کر سلطان نے دریافت کیا "وہ ہے کہاں ؟"

معتمد نے عرض کیا "حضور وہ باہر موجود ہے ، اور امیر معزالدین اُسکے ہمراہ ہیں"

"کہدو کہ وہ کم بخت یہاں سے دفع ہو جائے، اور اب اس کی عرضی آئی تو میں اس کو چوراہے پر چابک لگواؤنگا، اور ایسا ذلیل کرونگا کہ یاد کرے گی۔ .... مگر نہیں.... ذرا ٹھہرو"

سلطان کی خبیث طینت نے زیب النسا کے دوبارہ ارتکاب جرم کا انتظار نہ کیا، وہ ایسی سزا تجویز کر رہے تھے جو چابکوں سے بھی زیادہ سخت ہو۔ فرمانے لگے "چابک کھا کر تو وہ اور مشہور ہو جائیگی، اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، وہ تو خود شہرت کی طلبگار ہے، ایسا ہو کہ وہ ایسے مکان کے کونے میں بیٹھ کر گناہوں سے توبہ کرے جہاں نہ آرام مل سکے اور نہ عشاق پہنچ سکیں۔ اور نہ رہائی کی کوئی صورت نکل سکے، اچھا! اس کی تمام دولت ضبط کرکے داخل خزانہ کی جائے، اس کی سواری پر پہرا لگا دیا جائے تاکہ وہ گھر پہنچ کر کسی چیز کو نہ چھپا سکے، کونے کونے کی تلاشی لی جائے، اور ایک ایک چیز خزانہ میں داخل ہو جائے یاد رکھو، اگر ایک تنکا بھی رہگیا تو تم لوگوں کی کھالیں کھچوا دونگا، اس نے میرے امیروں کو لوٹا ہے، اگر جائداد کے حوالہ کرنے میں عذر کرے اور ہبہ نامہ پر دستخط کرنے سے تعرض کرے تو فوراً شکنجہ میں دیدو، پوری سمجھ آجائے گی۔ سمجھے؟ اور دیکھو، کل مال اور دولت قبضہ میں لینے کے بعد قاضی مغیث کو حکم دو کہ وہ اس کا نکاح بدعمال معزالدین سے پڑھا دے! عرض ممالک کے نام حکم بھیجدو کہ معزالدین کی آیندہ ترقی بند کیجاتی ہے، نصف شب تک میرے تمام احکام کی پابندی ہو جائے۔ اور اسوقت تک زیب النسا بدستور حراست میں رہے اور اب تم جاؤ"

معتمد کے رخصت ہو جانے پر سلطان میری طرف متوجہ ہوئے "اب آپ کی باری ہے، مجھے تین مخبروں کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ رات کو نشہ میں چور تھے، اور اسی حالت میں طوائف کے گھر گئے تھے۔ کیا یہ اطلاعات غلط ہیں؟"

"جان پناہ، میں سچائی سے انحراف نہ کرونگا" یہ کہہ کر میں نے تخت سلطانی کو بوسہ دیا،

اور اُن کے ہاتھ میں اپنا استعفا دیکر عرض کیا "کیا سلطان المعظم اُس کو معاف نہ فرمائیں گے جو تائب ہو چکا ہے؟ اور جس کو معاف کرنے کا خدا بھی وعدہ کرتا ہے؟"

"ضرور معاف کرونگا" یہ فرما کر سلطان نے میرے معروضہ کو بغور ملاحظہ فرمایا، اور کہنے لگے "میں ہرگز نہ مانوں گا! کیا شہر میں حرام زادوں کی کمی ہے جو شیخ میرے بہترین چھوٹے سردار کو پھینتے ہیں! نہیں۔ استعفا واپس"

میں نے عرض کیا "میرا باپ حضور کا نمک خوار تھا، اور میں کبھی حق نمک فراموش نہ کرونگا۔ لیکن حضور مجھے معاف ہی فرما دیں، جب میرا دل کہیں اور ہے تو فوج میں رہکر کیا کرونگا؟"

سلطان میری صورت دیکھنے لگے۔ اور بالآخر فرمایا "خیر۔ اگر ایسا ہے تو یوں ہی سہی لیکن تم لونڈے سخت احمق ہوتے ہو اگر ایک طرح کی نہیں تو دوسری طرح کی سہی، مگر کروگے حماقت ضرور۔ کل رنڈی سے بغل گرم کی، اور آج ایک ولی اللہ کے آستانہ کے جاروب کش بن گئے! کوئی نئی چیز ہو، تم لوگ پروانہ وار گرتے ہو، شیخ کو الزام دینا فضول ہے۔ تصوف کو ولی کی رنڈیاں کامیاب بنا رہی ہیں، نوجوانوں کی عقلیں چھین لیتی ہیں اور پکی عمر والوں کی دولت ہتیا لیتی ہیں۔ اور ان احمقوں کے پاس سوائے اللہ کی ذات، اور اُمید نجات، کے کچھ نہیں چھوڑتی ہیں۔ ایک برس کے اندر ان رنگین تیتریوں کے نکاح کرا کے رہونگا"

میں نے کہا "سرکار کی تجویز بالکل مناسب ہے۔

سلطان۔ "میری سلطنت میں تین قسم کی عورتیں ہیں (۱) پیشہ ور رنڈیاں (۲) پیشہ ور خانگیاں اور (۳) شادی شدہ عورتیں جو کبھی کبھی گمراہ ہو جاتی ہیں۔ میں ان سب کو اُن کے قصور کے مطابق سزائیں دونگا۔ لیکن اخیر دو قسم کی عورتیں بہت بُری ہیں"

میں نے زمین کو بوسہ دیا اور رخصت چاہی "ملک ظہیر الدین تم اپنے آبائی پیشہ کو ترک تو کر رہے ہو، لیکن اس کے وقار کو قائم رکھنا، جو تمہارے دل میں آگ لگ رہی ہے میں اُس کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، شہرت اور نام آوری کا جن تم پر سوار ہے اور تم ایسی عزت پیدا کرنا چاہتے ہو جو سلطنت

کی دی ہوئی عزت سے زیادہ پائدار ہو، میں تم کو روکتا نہیں ہوں، اگر تم اس کو حاصل کرسکتے ہو تو کرو۔ میرا کچھ نقصان نہیں ہے اگر اپنے باپ کے دوست کی ایک نصیحت یاد رکھنا! سیاسی امور میں جھوٹ بول کر بھی انسان کامیاب ہوسکتا ہے، کیونکہ دُنیا بے وقوف ہے، لیکن مذہب کی آڑ میں فریب کا جال پھیلانا بہت دشوار ہے۔ اس لئے نہایت دور اندیشی اور پیش فہمی کی ضرورت ہے۔ اگر اس کھیل میں ہارے تو یاد رکھنا روح، جسم، اور سب کچھ ہمیشہ کے لئے فنا ہوجائیں گے" یہ کہہ کر سلطان نے تبسم فرمایا اور مجھ کو رخصت ہونے کی اجازت دیدی۔

باہر آکر طرفہ تماشہ دیکھا آیا۔ ایک بند پالکی کو چاروں طرف سے سپاہی تلواریں علم کئے گھیرے ہوئے تھے، اور معزالدین پاس کھڑا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگا "مصیبت کے وقت تو بے رُخی مناسب نہیں، کچھ تو بتاؤ یہ کیا اصرار ہے" زیب النساء کو میں قطعی فراموش کرچکا تھا اس لئے بلاتکلف پالکی کے پاس چلا گیا۔ معزالدین نے زیب النساء سے کہا "ملک ظہیرالدین ہیں۔ ان سے پورا حال معلوم ہوگا"

زیب النساء نے یہ کہہ کر "ان سے کیا پردہ" پردہ اٹھادیا اور میں اور معزالدین پالکی کے اندر بیٹھ گئے اس وقت اس کی صورت بہت ہی بھدی اور سست، نظر آئی جس پر قبل از وقت بڑھاپے کے آثار تھے، اُس نے بڑھاپے کو دبانے کی کوششیں کرکے اور مُنہ کو بنا بنا کر باتیں کرنے کا طریقہ اختیار کرکے اپنی صورت کو اور بھی مسخ کرلیا تھا۔ بدن سے عطر اور پسینہ کی مخلوط بو دماغ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کا لباس تینتیس برس کی عمر کی عورت کے لئے قطعی غیر موزوں تھا، مصنوعی ہنسی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی "درات کی شراب نے تکلیف تو نہیں دی؟" گذری ہوئی باتوں کو ختم کرنے کے خیال سے میں نے کہا "میں تو دوسری شراب پی چکا ہوں، اور اب اسی کا نشہ ہے، حضرت شیخ نظام الدین نے مجھ کو مرید کرلیا ہے۔ اور میں ابھی استعفا دیکر آرہا ہوں" اس کا طرز گفتار یکدم بدل گیا اور بڑے تعجب سے پوچھنے لگی۔

"کیا؟ استعفا ردیدیا" میں اس کے تنفر کو محسوس کررہا تھا مگر اس نے طبیعت کو قابو میں لا کر مجھ سے پوچھا "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ہم لوگوں کو کیوں روکا گیا ہے؟" میں نے کہا "اس لئے کہ تم بھی میری طرح دردکشیں بنائی جاؤ! یہاں تم اس لئے روکی گئی ہو کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے مکان کی اچھی طرح تلاشی لی جاسکے، اور ایک ایک چیز بحق سلطان ضبط کیجائے" یہ باتیں سن کر وہ زرد پڑ گئی اور معزالدین سے کہنے لگی "ہا! کمبخت، ہیرے پر پانچ سو تنکا دستوری کے لے چکا ہے گھر کے سامان کے ساتھ وہ ہیرا بھی چلا جائے گا! اچھا حرامزادے! سلطان کی محبت کا لالچ دیکر تو نے ہی یہ دن دکھایا ہے" یہ باتیں کہتی جاتی تھی اور زاروقطار روتی جاتی تھی۔ فرط الم سے یہ حالت تھی کہ ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا! ہچکیاں لے کر بار بار تاسف کے ساتھ کہتی تھی "ہائے یہ عمر کیسے کٹے گی؟"

میں نے جواب دیا "اس کا بھی انتظام ہوگیا ہے، اب تم پاک اور صاف زندگی بسر کروگی اور امیر معزالدین کی منکوحہ بیوی بن کر رہوگی! سلطان نے میرے سامنے حکم دیا ہے کہ آدھی رات سے پہلے قاضی مغیث تم دونوں کا نکاح پڑھادے! معزالدین کی ترقی روک دی گئی ہے، لیکن مرد جس قدر روپیہ اپنی بیوی کے اوپر صرف کرتا ہے اُسی کے مطابق دینا میں اُس کا اعتبار ہوتا ہے" زخم خوردہ ناگن کی طرح بل کھا کر زیب النسا، معزالدین سے الگ ہوگئی۔ اور کہنے لگی، ناشکرا، بدمعاش! میری آمدنی کے دس روپیہ سیکڑہ پر تو شریف بنا پھرتا تھا! ذرا نکاح تو ہونے دے! مزا چکھادونگی! تیرے کوڑھی بدن سے ہاتھ نہ لگاؤں گی، اور تیری اور تیرے گھر والوں کی زندگیاں حرام کردوں گی! دیکھ تو سہی، سور کے بچے! ...."

چونکہ "ادب لطیف" کی بہت زیادہ مثالیں سُن لی تھیں اور زیادہ سُننے کی تاب نہ تھی اس لئے میں اُٹھ کھڑا ہوا، اور معزالدین کو اُس کی زوجۂ ثانی، کی صلواتیں سُننے کے لئے چھوڑ کر چلا آیا۔ پہرے والے بھی ہنس رہے تھے، اور کہتے تھے "کیا مزے کا بیاہ ہے! اور کیسے مزے کے بنے اور سہاگ ہیں!"

(۶)

میں سیدھا مکان پہنچا، اور دستاویزات اور زمینداری کے متعلق کاغذات کو لے کر کرن سنگھ کے پاس چلا گیا۔ دروازہ بند تھا۔ کنڈی کھٹکائی۔ لچھمی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی، اُس نے دروازہ کھولا مجھ کو دیکھ کر گھبرا گئی، اور اُس کے ہاتھ میں چراغ ہلنے لگا، آہستہ آہستہ کہنے لگی "چلے جاؤ، چلے جاؤ"، اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے بولنے کو منع کیا۔ میں نے آہستہ سے جواب دیا "نہیں جاؤں گا"، اور ذرا اونچی آواز میں کہا "تمہارے باپ کہاں ہیں؟ تمہارے لئے جہیز لایا ہوں"۔

"جہیز لائے ہو؟" اُس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ مگر شرما گئی۔ اور خاموشی سے چراغ دکھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور میں پیچھے پیچھے اُس کے باپ کی کوٹھری کی طرف چلا گیا،

کرم سنگھ نے حسب معمول اخلاق اور تپاک سے میرا استقبال کیا، اور ہم دونوں سفید فرش پر بیٹھ گئے،

"تم نے اچھا کیا شیخ کے مرید ہوگئے، اُن کی دعائیں تم کو کامیاب کریں گی"

میں نے کہا "نجات کا طالب ہو، اسی لئے فوجی خدمات سے آج مستعفی ہوگیا ہوں"

کرن سنگھ اور اُس کی بیٹی دونوں چونک پڑے مگر میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا "تمہاری بیٹی کو اپنی کل جائداد جہیز میں دیتا ہوں، اور یہ خط حضرت شیخ کا ہے" دستاویزات کو میں نے لڑکی کی گود میں رکھدیا اور کہا "یہ تمہارا جہیز ہے" کرن سنگھ نے خط کو آنکھوں سے لگا، مضمون بالکل مختصر تھا "میں لچھمی کو جہیز بھجواتا ہوں۔ قبول کرلینا۔ نظام"، میں نے کاغذات کو فرش پر پھیلا کر بیچ میں چراغ رکھدیا۔ اور کرن سنگھ سے کہا کہ وہ حساب کتاب اور معاملات کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ کارندہ دھوکہ نہ دے سکے۔ ہر بات کو سمجھانے میں بہت دیر ہوگئی، آراضی کے مواقع، کاشت کی اقسام، مہاجن کے پاس جو روپیہ جمع تھا اُس کی تفصیل، کاشتکاروں پر چڑھے ہوئے روپیہ کا حساب، معاہدوں قرضے ورزمینداری کے پورے حالات، غرض

بہت باتیں تھیں جن کو بتانے میں کافی وقت صرف ہوگیا۔ لچھمی اپنی معصومانہ مسرت کو نہ چھپا سکی، اِدھر اُدھر اٹھلاتی پھری، کاغذات کو دیکھنے میں اکثر اس کا سانس میرے چہرے سے اور اس کی زلفیں میرے بالوں سے مس ہوتی تھیں، لیکن میری طبیعت جس طرح قوس قزح کی رنگینی یا گلاب کی خوشبو سے بے قابو نہ ہوتی تھی اسی طرح ان باتوں کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ کل حساب کتاب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وضع محاصل ولگان وغیرہ کے بعد میری آمدنی پندرہ سو سالانہ سے کہیں زیادہ تھی،

لچھمی نے بھولے منہ سے، مگر تجاہل عارفانہ کے ساتھ کہا "جائداد کا قرضہ بھی ہم کو ادا کرنا ہوگا؟" کرن سنگھ نے جواب دیا "بے شک! یہ کیونکر ممکن ہے زمینداری تم لو، اور قرضہ یہ ادا کریں؟" اور خفت کو دور کرنے کے لئے معذرت کے انداز میں کہنے لگا "میرے سامنے بدتہذیب ہو جاتی ہے، اس کی ماں کے مرجانے کے بعد کوئی سکھانے والا نہ تھا"

میں اُٹھنے لگا تو اس نے بیٹی سے کہا "ان کا شکریہ تو ادا کرو" لچھمی نے مجھے نیچی نظر سے شرما کر دیکھا اور کہنے لگی "میں بڑی خوشی سے تمہارا قرض ادا کرونگی" کرن سنگھ کے سر سے بڑا بوجھ ٹل گیا تھا، لمبا سانس لیکر کہنے لگا "شنخ کی برکت سے ہر قسم کی نعمت حاصل ہوتی ہے" لچھمی چراغ لیکر آگے آگے تھی اور میں پیچھے تھا۔ دروازہ پر اس نے آہستہ سے کہا "ٹھہرو" میں نے مڑکر دیکھا۔ چراغ کی روشنی اس کے آدھے چہرہ پر پڑ رہی تھی نظریں نیچی تھیں اور اس پر ایک تصویر کا عالم تھا۔ دل نے کہا "بس آسمان کی حوریں بھی ایسی ہونگی" میں نے پوچھا "ٹرک کی گفتگو سمجھ گئی تھیں؟" کہنے لگی "کچھ تھوڑی سی! البتہ کل شام کو تمہارے نوکرنے ہماری انا سے کہا تھا کہ تم نے اپنی ماں کا ہیرا ایک عورت کو دے دیا اور تم رات کو گھر نہیں آؤگے۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ اور اسی رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہی عورت تم کو گود میں اٹھا رہی ہے۔ میں تم کو بلانے لگی، اور کئی دفعہ آواز دی، تم چلے آئے اور میرے ساتھ اپنے گھر پہنچ گئے۔ مگر آئینہ سی بہت ڈرنے لگے اس لئے میں نے تم کو پلنگ پر لٹا دیا۔ میرا خواب تمہاری سمجھ میں آیا؟" میں نے کہا "کچھ تھوڑا سا! خدا کریم تم کو ہمیشہ پاک اور صاف رکھے اور ایسے ہی خواب دیکھنے

نصیب ہوا کریں"

اُس نے معصوم اور پیارے ہاتھ کے اشاروں سے مجھے رخصت کیا اور کواڑ بند کر لئے، اس کے بعد پھر ہم نے کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھا......

کرن سنگھ کے مکان سے واپس ہو کر خانقاہ میں داخل ہوتے وقت خیال آیا "یہ کام بھی آسان نکلا، میں نے ہنستے کھیلتے دُنیا کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور ذرا بھی زحمت نہ ہوئی" ایک نوکر نے کھانا لاکر سامنے رکھدیا اور کہا کہ فارغ ہو کر شیخ سے مل لیجئے گا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے، سر کے بال بالکل سفید تھے، ایک ہاتھ سر کے نیچے تھا اور پاس ہی فرش پر امیر خسرو، مشہور و معروف شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے حضرت نے فرمایا "یہ نیا زائر ہے! کل سلطان نے اس کو ملک بنایا تھا اور آج سب پر لات مار آیا" امیر خسرو نے مسکرا کر فرمایا "زہ نصیب! مجھے تو رشک آتا ہے"

حضرت نے ارشاد فرمایا "اپنے طریق پر تھا، قلب بھی جوش سے معمور ہے، روایت ہے کہ ایک دن جناب رسُول مقبول صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، ارشاد ہوا مجھے تین چیزیں پسند ہیں:-

(۱) خوشبو (۲) عورت اور (۳) نماز کے وقت آنکھوں کی ٹھنڈک، اُسی وقت حضرت جبرئیل وحی لائے کہ اللہ کو تین چیزیں پیاری ہیں۔

(۱) تائب نوجوان (۲) اُس کی آنسو بھری آنکھیں اور (۳) اور اُسکا کانپتا ہوا دل۔ کچھ لوگ دنیا میں رہکر خدا کی راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ دُنیا کو ترک کر کے اس نعمت کو حاصل کرتے ہیں۔

میں نے ظہیر کو ایک نظر میں پہچان لیا کہ اس کے قلب کو ترک دنیا سے راحت حاصل

ہو گی۔ کہو ظہیر۔ آج کیسی گذری؟ سب کام ختم ہو گئے؟"
میں نے عرض کیا "خدا کا شکر ہے، بہت اچھی طرح گذری۔ شیخ کی برکت سے مجھ نئی زندگی مل گئی، اور نئی امید حاصل ہوئی۔"
شیخ نے فرمایا "خسرو! ان کے لئے کیا خطاب تجویز کرتے ہو؟ اب یہ ملک نہیں ہیں" شاعر عارف نے مجھے بغور دیکھا اور فرمایا "یہ عاشق صادق ہیں۔ ان کی صورت گواہ ہے۔" حضرت نے اس خطاب کو پسند فرمایا۔ اور ارشاد ہوا "بالکل سچ ہے! عاشق صادق سب کچھ دے ڈالتا ہے اور معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ عشق ہی اس کا معاوضہ ہے اور وہی انعام ہے، اچھا عاشق صادق، اب تم آرام کرو۔ کل سے، انشا اللہ تمہاری تربیت شروع ہو گی۔"
مریدوں کو جو کمبل خانقاہ میں ملا کرتے تھے۔ میں ان میں لپٹ کر سو گیا۔ مگر زمین کی سختی کو محسوس کر کے میں نے کہا "یہ انقلاب کیونکر ہوا؟ ایک دن اور ایک رات میں میری دنیا بدل گئی! اور مجھے راحت ابدی کی دولت ہاتھ آگئی! اب نہ میرے پاس کچھ ہے، اور نہ کسی چیز کی حاجت ہے، دنیا میں لوگ کس چیز کی تمنا کرتے ہیں؟ خوشی کی؟ خوشی کیا ہے؟ صرف ... کی حالت ہے جو کسی کو دولت کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور کسی کو فقر کے ذریعہ سے! میں رات کو ملک تھا۔ ہزاروں ٹنکے سالانہ آمدنی کی جائداد میری تھی، اور آج فقیر ہوں اور قانع! مجھے پہلے خوشی کی جو آرزو تھی وہ غلط نہ تھی، لیکن طریق حصول غلط تھا!"

یہ تو میرا قصہ تھا! اب آج کے سبق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ عقلمند آدمی کبھی اپنے جذبات سے کشتی نہیں لڑتا، وہ برے خیالات کو نیک خیالات سے بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض لوگ مشین کی طرح اوقات معینہ پر دعاؤں کو پڑھنا اپنی حفاظت کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی خوش فہم ہیں جو بجلی کی کڑک سے کمبلوں میں

لپٹ جاتے ہیں کہ مبادا اُن پر بجلی گر پڑے! لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ عبادت کے پابند آدمی خودغرضانہ اور ناپاک زندگیاں کیونکر بسر کرتے ہیں؟ حالانکہ وجہ ظاہر ہے، عبادت ان لوگوں کی عادت ہو جاتی ہے، اور قلب سے تعلق نہیں رکھتی۔ اُوراد اور وظائف محض نیند کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور انکا دل ناپاکیوں کی مدافعت کے قابل نہیں رہتا۔ بعض کا خیال ہے کہ گوشت تمام بُرائیوں کی جڑ ہے، اور وہ جسم کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں لیکن گوشت بجائے خود نہ تو نیکی ہے اور نہ بدی ہے بلکہ اسُ کی تمام خواہشات جائز اور حقیقی اطمینان قلب کے ذریعہ سے پوری ہو سکتی ہیں۔ بُرائیوں کی جڑ فی الاصل "ناپاک خیال" ہے جو ترک دنیا کی وجہ سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے، حضرت نظام الدین کا قول ہے۔

"عبادت اور مسرت کی راہ ایک ہے"

نوٹ

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو وصول ہوئی ہیں جن کے لئے ہم شکرگزار ہیں اور بہت جلد ان پر ریویو شائع کریں گے افسوس ہے کہ مسٹر جعفری مدیر شمع کی علالت کے باعث بعض کتب پر ابتک ریویو نہ ہو سکا تاہم معافی خواہ ہیں۔ (منیجر شمع)

			قیمت
(۱)	مثنوی سحر	زمانہ بک ایجنسی کان پور	۸ر
(۲)	غذائے روح	مترجمہ جناب عاشق لکھنوی۔ سری مصر آشرم چھاونی نیچہ	" عہ ر
(۳)	مذاکرات (سال اوّل)	معتمد صاحب مجلس مذاکرہ۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن۔	" عہ ر
(۴)	آئینہ حقیقت نما۔	مصنفہ جناب مولانا اکبر شاہ صاحب نجیب آبادی۔ نجیب آباد	" ۸عہ ر
(۵)	فرہنگ اصطلاحات علمیہ	مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔	" ۶ر
(۶)	جلال الدین خوارزم شاہ	ازجناب سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	" ۱۲ر
(۷)	سرگذشت وزیر خاں لنکراں	ازمولانا محمد عبد القوی صاحب فانی ایم اے لکھنو یونورسٹی	" ۴ر
(۸)	مصباح القوافی	سید محمد نقوی السرسوی صاحب مولوی سید زین العابد صاحب نقوی محاسب	۴ر
(۹)	پیمان وفا	ازایم اسلم صاحب۔ نسیم بک ڈپو۔ باردوخانہ بازار لاہور	" ۵ر
(۱۰)	امانت	" " " " " " " " "	" ۳ر
(۱۱)	نور ہدایت	" " " " " " " " " "	" ۴ر
(۱۲)	خط تقدیر	" " " " " " " " " "	" ۶ر
(۱۳)	ارمغان عرب	" " " " " " " " " "	" ۴ر
(۱۴)	ساربان	" " " " " " " " " "	" ۴ر

بہ تقریب

جشن عقد مہین پور ریاست محمود آباد صاحبزادہ بلند اقبال محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر طال اللہ عمرہٗ و اقبالہٗ

سہرا

از

(مصور جذبات حضرت میرزا آثاقب لکھنوی)

کیا ہمایوں ہے ولیعہد کے سر پر سہرا
اوجِ گردوں پہ سعادت کا ہے اختر سہرا

رات دن ہو گئی، ایسا ہے منور سہرا
نیرِ رُخ پہ شعاعوں سے ہے بہتر سہرا

شکر کا قصد ہے تسبیح کی یہ ساعت ہے
لے چکا سبحۂ صد دانۂ گوہر سہرا

سایہ افگن ہے خدا رکھے ہمائے اقبال
کہ ہے پرواز میں کھولے ہوئے شہپر سہرا

کھینچتا ہے سحرِ وصل کی روشن تصویر
سرِ پُر نورِ ولیعہد پہ آ کر سہرا

چرخ سے عقدِ ثریا کی صدا آتی ہے
اسی دن کیلئے گوندھا گئے اختر سہرا

ایک موتی میں جو ہے دوسرے موتی کا عکس
نظر آ جاتا ہے سہرے کے برابر سہرا

حسن کا نشو و نما فرق تک آتے ہی بڑھا — بڑھ چلا صورتِ گیسوئے معنبر سہرا
میں یہ کہتا ہوں کہ اس سہرے کا زیور سر ہے — لوگ کہتے ہیں کہ ہے فرق کا زیور سہرا
ناتواں تارِ نمیق تاب ہے ماشاء اللہ — کہ اُٹھائے ہوئے ہے حُسن کا لنگر سہرا
کل تو پھولوں سے گرانبار تھی ہر شاخِ چمن — آج دیکھا کہ گلونکا ہے ترے سر سہرا
جن کو سب کہتے ہیں موتی وہ نشانِ لب ہیں — بخت نے باندھ کے چوما ہے مکرر سہرا
موجیں اُٹھتی ہیں ضیا کی تری عکسِ رُخ سے — کروٹیں نور میں لیتا ہے برابر سہرا
قابلِ دید ہے شادی میں خودداریِ حُسن — پاؤں رکھتا نہیں محفل کی زمیں پر سہرا
غم سے کہتا ہوں کہ ہٹ عیش سے کہتا ہوں کہ آ — کہ بناتا ہے دلِ دوست میں اک گھر سہرا
ساز و برگِ فقرا کچھ نہیں اک دل کے سوا — لیچلا ہوں اُسی کشتی میں لگا کر سہرا

ایک ہی طرح کے گلچیں ہیں یہاں وہ بھی ہیں
کیوں نہ ہو غالب و ثاقب کا برابر سہرا

شمع مزار

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ شمع بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء)

تیسرا آنسو

(کمپنی بہادر کے سایۂ عاطفت میں بادشاہی)

نمبر ۲

از

(جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔ علیگ۔ جج)

مرزا شاہ رخ مرحوم سے دائمی مفارقت کے بعد بادشاہ کی تسلی و تشفی کا وسیلہ صرف نواب زینت محل تھیں یا اُن کے لاڈلے فرزند مرزا جوان بخت۔ بیگم کو آرزو پیدا ہوئی کہ انکا نورِ نظر ولی عہد سلطنت قرار دیا جائے۔ بادشاہ بھی ہم خیال ہوگئے۔ قریب تھا کہ خلف اکبر کو اس منصب سے معزول کرانے کی علی الاعلان کوشش کی جائے کہ ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو مرزا دارا بخت دنیا سے رخصت ہوگئے اور خانہ جنگی کے لئے میدان صاف ہوگیا۔ بادشاہ نے مرزا جوان بخت کو ولی عہد بنانا چاہا اور کمپنی بہادر کے ملازمین کو اپنی طے شدہ پالسی ظاہر کرنے اور لال قلعہ کو خاندان تیموریہ سے خالی کرانے کا وعدہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو بادشاہ کی زندہ اولاد میں سب سے بڑے تھے اور انگلستان کے قانون وراثت کے مطابق منصب ولی عہدی انہیں کا حق تھا۔ مرزا جواں بخت کی مرشد

زادوں سے چھوٹے تھے اور بادشاہ اُن کی نامزدگی پر مُصر تھے۔ انجام یہ ہوا کہ مرزا فخرو نے ولی عہدی کی طمع میں کمپنی کے پیش کردہ شرائط قبول کرلئے۔ انگریزوں نے ان کو ولی عہد مقرر کردیا اور زینت محل مُنھ دیکھتی رہگئیں۔

اُس وقت لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے۔ جن کا عہد حکومت ہندوستان کی تاریخ میں دیسی ریاستوں کے الحاق کی وجہ سے یادگار ہے۔ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے سالگرہ مبارک اور نوروز وغیرہ جشنوں کے موقع پر پیش کی جاتی تھی پہلے[۱] ہی موقوف ہوچکی تھی۔ فرمانروائے دہلی کا نام سکہ پر نقش ہوتا تھا وہ بند ہوا۔ گورنر جنرل کی مہر سے "فدوی خاص بادشاہ" کے الفاظ خارج کئے گئے اور ہندوستانی رئیسوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ بھی اپنی اپنی مہروں سے بادشاہ کی نسبت اس قسم کے بے معنی الفاظ خارج کردیں۔ قلعہ کے آیندہ انتظام کے لئے ایک کمیٹی نامزد ہوئی جسمیں ولی عہد جدید بھی شامل تھے اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد مرزا فخرو برائے نام بادشاہ ہوں لیکن قلعہ خالی کردیں اور قطب صاحب میں جاکر رہیں۔ زینت محل کو زک دینے کے لئے ولی عہد نے یہ شرطیں منظور کرلیں اور ۱۸۵۲ء میں ایک معاہدہ دستخط و مہر سے مکمل ہوگیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرزا فخرو کو باضابطہ ولی عہد بنادیا لیکن زینت محل اپنی ترکیبوں سے غافل نہ تھیں جائز و ناجائز ظاہر و پوشیدہ۔ ہر قسم کی کوششیں اپنے فرزند کو تاجدار بنانے کی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی رزیڈنٹ کی خوشامد کرتیں کبھی انگریزوں کو دھمکیاں دیتیں۔ علوی، سفلی ہر قسم کے اعمال۔ ٹونے ٹوٹکے برابر ہوتے رہتے تھے۔

---

[۱] نذر ۴۳-۱۸۴۲ء میں لارڈ ایلنبرا نے بند کی تھی۔ ان واقعات کی تفصیل کے لئے چھٹے آنسو (اخلاق معاشرت اور جزوی واقعات) کی ورق گردانی کیجئے۔ ۱۲

دحتیٰ کہ ۳ ر نومبر سنہ ۱۸۵۲ء کو سر ٹامس مٹکاف رزیڈنٹ دفعتاً مرگئے اور علامات مرگ نباتاتی زہر سے مسموم ہونے کی دیکھی گئیں تو عوام نے شبہ کیا کہ یہ بھی زینت محل کی کارسازی تھی!!) پارٹی بازی کا بازار گرم تھا۔ مرزا فخرو اور مرزا جواں بخت کی جدا جدا ٹولیاں تھیں شہزادوں کے حرکات بادشاہ کے لئے سوہان روح تھے۔ اور ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے "مری اولاد ناحق آرزو سلطنت کی رکھتی ہے یہ کارخانہ آگے کو چلنے والا نہیں ہے۔ مجھ ہی پر خاتمہ ہے از تیمور تا ظفر"۔ راوی[۵۱] کا بیان ہے کہ یہ قول حضرت کا تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں ایک نیا گل کھلا یعنی دو تیموری شہزادے مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نورالدین (عرف مرزا مراد) پسران مرزا کام بخش ابن شہزادہ سلیمان شکوہ مرحوم جو دادا کے وقت سے لکھنؤ میں آباد[۵۲] تھے۔ سرکار اودھ سے ایک ہزار روپیہ ماہوار

۵۱ ظہیر دہلوی۔ داستان غدر۔ صفحہ ۱۹۔

۵۲ ابتدائی اجزا میں کئی شہزادگان تیموریہ کے لکھنؤ جانے کا ذکر آیا ہے لیکن مفصل روداد بیان نہیں کی گئی کیونکہ شمع گریاں ان کے عبرتناک حالات پر ایک جدا گانہ آنسو بہانا چاہتی تھی۔ آدھی رات گذر گئی اور شمع کا تقریباً نصف حصہ جلگیا۔ ایسا ہو کہ شمع کی عمر طبعی گذر جائے اور اس کہانی کی نوبت نہ آئے لہذا یہ داستان بطور فٹ نوٹ کے اس مقام پر درج کی جاتی ہے۔

(۱) "شاہ عالم"

نواب وزیر اودھ کو اپنے دارالحکومتہ میں سب سے پہلے جس خداوند نعمت کی میزبانی کا شرف نصیب وہ شہزادۂ عالی گوہر کی ذات والاصفات تھی، سنہ ۱۷۵۸ء میں دہلی کے وزیر غازی الدین نے مرہٹوں کو سازش کرکے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ عالمگیر ثانی کو زچ کرنے کے لئے قلعہ شاہجہانی کا محاصرہ کیا بادشاہ کو قلعہ کی حفاظت سے مایوسی ہوئی تو اس نے حکمت عملی سے اپنے بیٹے علی گوہر کو بھگا دیا اور حصار کے دروازے کھول دیئے۔ غازی الدین کی وزارت تسلیم کی۔ اور اپنی برائے نام بادشاہی برقرار رکھی۔ شہزادہ گرتا پڑتا اودھ کے فرماں روا شجاع الدولہ کے پاس پہونچا۔ (بقیہ صفحہ آئندہ)

وظیفہ پاتے تھے اور مذہب سلطنت کے حلقہ بگوش تھے۔ وطن آبائی کی زیارت کے لئے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) نمک حلال خادم نے سر آنکھوں پر جگہ دی سات لاکھ روپیہ نقد اور چند بیش بہا اجناس حضور اقدس میں پیش کرکے ہم چشموں میں سربلندی حاصل کی۔ شہزادے نے تسخیر بنگالہ کے لئے مشرق کی طرف کوچ کی عزیمت کی۔ شجاع الدولہ نے بھی بوقت ضرورت امداد کا وعدہ کیا۔ شہزادہ مشرق کی طرف راہی ہوا عظیم آباد کے قریب مظلوم عالمگیر ثانی کے قتل ہونیکی خبر ملی۔ اور وہیں شاہ عالمگیر ثانی کے منحوس لقب سے تخت سلطنت پر جلوس فرمایا جیساکہ پہلے آنوں میں بیان ہوچکا ہے۔ بکسر کی مشہور لڑائی میں شاہ عالم کو اُنہیں سے شکست ہوئی جو پانی پت کے جنگ میں مرہٹوں کی تباہی کا باعث ہوئے تھے۔ بادشاہ نے انگریزوں کی پناہ قبول کی اور شجاع الدولہ بہزار خرابی اپنے ملک تک واپس پہونچا۔ ان واقعات کی تفصیل سے ہمکو کچھ واسطہ نہیں البتہ یہ قصہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس زمانہ میں شاہ عالم الہ آباد میں تشریف رکھتے تھے شجاع الدولہ اکثر اُن کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تھا بلکہ ایک بار خود بدولت نے بھی فیض آباد کو اپنے قدم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا اور شاہی محل ”لال باغ“ میں قیام کیا تھا۔ بادشاہ کی عزت ہنوز اسقدر باقی تھی کہ شجاع الدولہ نے بڑے دھوم دھام سے مہمانی کی اور بوقت رخصت گیارہ لاکھ روپیہ کا نقد و جنس بطور پیش کش کے حاضر کیا۔

قیصر التواریخ کا مؤلف لکھتا ہے کہ ”ایک دن بادشاہ جب رونق افروز لال باغ تھے بہ سبیل تفرج تخت پر سوار گلگشت کو نکلے شجاع الدولہ حسب دستور پیادہ جلوسواری میں تھے۔ بعد ہوا خوری جب تخت سے اُترنے لگے اتفاقاً بادشاہ کا چرن بردار پیچھے رہگیا تھا۔ شجاع الدولہ نے اپنی کفش نذر کی بادشاہ نے پہن لی اور شجاع الدولہ خود برہنہ پا ساتھ چلے۔ جب چرن بردار حاضر ہوا تو بادشاہ نے شجاع الدولہ کو اشارہ کیا نواب وزیر نے نذر دی۔ آداب بجالایا اور کفش شاہی بہ تفاخر بجائے کلغی کے اپنے سر پر باندہی!! اللہ!! اللہ!! دہلی کی عظمت و دبدبہ کا ایک دن وہ بھی تھا!!!

ان نینن کا یہی بسیکہ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھہ

(بقیہ صفحہ آئندہ)

سنہ ۱۸۵۱ء میں دہلی تشریف لائے ہر طرح صاحب لیاقت تھے۔ شعر و سخن سے ذوق۔ خواجہ

(۲) شاہزادہ "جواں بخت"

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) مرزا جہاندار شاہ عرف شاہزادہ جواں بخت اپنے پدر بزرگوار کی طرح نمک حراموں کی بیوفائیوں سے تنگ آ کر ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آئے۔ اس زمانہ میں وارن ہسٹنگز گورنر جنرل بھی لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے مہمان تھے۔ جب شاہزادہ شہر کے ناکہ پر پہنچا نواب وزیر اور گورنر جنرل دونوں استقبال کے لیے گئے۔ نذریں پیش کیں۔ صاحب عالم ہاتھی پر سوار ہوئے نواب وزیر نے خواصی میں بیٹھکر مورچھل ہلانے کی آبائی خدمت ادا کی۔ گورنر جنرل گھوڑے پر سوار کرچ کھینچے جلو میں تھے جنرل مارٹن کی مشہور کوٹھی میں قیام ہوا۔ نواب وزیر نے تین لاکھ نقد و جنس پیش کش نذر کیا۔ ہر صبح کو نواب وزیر اور گورنر جنرل دربار شاہی سمجھکر حاضر خدمت ہوتے اور لوازم مہمانداری بجا لاتے تھے۔ لیکن شاہزادہ بہادر شب و روز عیش و عشرت میں مصروف رہتے تھے۔ تیموریہ شہزادوں کے لئے سوائے عیاشی کے اور کام ہی کیا باقی رہگیا تھا!!

افتاد کی بات "بگھیا" نام ایک خوبصورت کسبی پر آنکھ پڑی اور دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ نواب وزیر کو خبر ملی تو بہت ناگوار گزرا۔ کیونکہ اس کسبی کی طرف وزارت مآب کی بھی نظر عنایت تھی۔ بگھیا کے آمد و رفت کی بندش کی گئی۔ سمند عشق پر تازیانہ لگا۔ شاہزادہ صاحب رات کے وقت ڈولی میں چھپ چھپ کر اس طوائف کے گھر جانے لگے۔ آتش رقابت تیز ہوئی اور نواب وزیر نے منظور نظر کی حفاظت کے لئے پہرے متعین کر دیئے۔ ناسمجھ دل پر شہزادہ کا قابو نہ تھا۔ جب کھڑکیاں چھوپی گئیں روزن در بند ہوئے۔ تو صاحب عالم نے گورنر جنرل کو بیچ میں ڈالا اور نواب وزیر سے "بگھیا" کی درخواست کی غرض بگھیا محل شاہی میں داخل ہوئی اور اسی خوش قسمت عروس سے شاہزادہ عالی قدر پیدا ہوئے جنہوں نے ماں کے اثر سے شیعہ مذہب اختیار کیا۔ شاہزادہ کو معشوق تو ہاتھ آیا لیکن نواب وزیر سے صفائی نہ رہی۔ خیر اندیشوں نے مناسب سمجھا کہ شہزادہ صاحب لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے بنارس میں قیام کریں۔ چنانچہ شاہزادہ نے کاشی جی میں باس کیا۔ جیسا کہ پہلے آنو (بقیہ صفحہ آئندہ)

آتش سے تلمذ تھا۔ بادشاہ نے اپنا عزیز سمجھ کر خلوت و جلوت کا رفیق بنایا۔ دل کے راز ظاہر

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) میں درج ہے۔ اُنکی اولاد اسوقت تک بنارس میں مقیم ہے۔

(۳) "جہانگیر"

دوسرے آنسو میں شاہزادہ جہانگیر کی شعلہ مزاجی و رخود سری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس جگہ یہ قصہ درج نہیں کیا گیا کہ شہزادہ صاحب الہ آباد جانے سے قبل لکھنؤ بھی تشریف لائے تھے۔ اس داستان کو اب سنئے۔ لکھنؤ میں سلطنت مغلیہ کے ولی عہد کے آمد کی خبر گرم ہوئی۔ نواب وزیر معہ رزیڈنٹ کے استقبال کو نکلے۔ شہر خوب سجایا گیا۔ کوچہ و بازار تماشائیوں سے بھر گئے۔ نواب وزیر نے ایک سو ایک اشرفی نذر گزرانی۔ سلامی کی توپیں چلیں۔ شہر میں انیاز زر کرتے ہوئے داخل کوٹھی فرح بخش ہوئے۔ شاہزادہ کا لباس انگریزی تھا۔ سر پر کالی ٹوپی ترکمانی ولایتی تلوار زیب کمر۔ بڑا اینچوانی حقہ ہاتھی کے ماتھے پر تھا۔ بعد چائے پانی کے کشتیاں نذر کی پیش ہوئیں چار گھوڑے کی گاڑی پر سوار ہو کر لپند باغ میں داخل ہوئے۔

دوسرے دن نواب وزیر معہ رزیڈنٹ اور مرشد زادوں کے حاضر ہوئے۔ چائے پانی کے بعد سب کی نذریں علی قدر مراتب گذریں۔ نواب وزیر کو ہفت پارچہ خلعت عطا ہوا۔ ہر پارچہ پر نذر دیکر آداب بجا لاتے تھے۔ رزیڈنٹ کے لئے صرف دو شالہ اور رومال کا حکم ہوا تھا۔ مگر نواب وزیر کی فرمائش سے پانچ پارچہ کا خلعت عطا ہوا۔ رزیڈنٹ نے ناواقفیت سے چاہا کہ ہر پارچۂ خلعت پر آداب گاہ سے مجرا بجا لائے مگر خواص شاہی نے کہا کہ یہ منصب صرف وزیر اعظم کا ہے رزیڈنٹ بہت منفعل ہوئے اور افسوس کیا کہ اس جلسہ میں ناحق تشریف لائے غرض نواب وزیر نے کوئی دقیقہ مراسم مہمانداری کا فروگذاشت نہیں ہونے دیا اور تمنائے دلی تھی کہ صاحب عالم کی خدمت اسطرح کی جائے کہ بادشاہ دہلی کی خوشنودی مزاج کا باعث ہو اور کدورت ہائے ماضیہ رفع ہو جائیں لیکن شہزادہ کے عادات و اطوار ایسے بگڑے ہوئے تھے کہ زیادہ عرصہ تک صفائی قائم رہنا محال تھا۔ اشرف علی خاں نام ایک شخص ستار خوب (بقیہ صفحہ آئندہ)

کئے اور کمپنی کی طرف سے جو شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں اُنکا تذکرہ کیا۔ باہمی مشورہ سے یہ رائے

بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) بجا تا تھا اُسے اپنا وزیر اعظم کیا اور وہ فرماں روائے اودھ سے ہمسری کا دعویدار ہوا۔

روزانہ صبح کو شہزادہ بلند اقبال گھوڑے پر چڑھتے اور شہر کے گلی کوچوں میں بے تحاشا گھوڑا دوڑاتے تھے۔ ایکدن خاص نخاس میں گھوڑا پھیرنے لگے۔ کئی بچے کچل گئے لیکن آپ کے دل مبارک پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ارباب نشاط کے طائفے روز و شب موجود رہتے۔ اور شہزادہ کا بیشتر وقت عیش و عشرت میں گزرتا تھا۔ تقدیر کا کھیل! ایک کسبی "دامٹری" نام سے جو ناچ میں بے نظیر تھی۔ آنکھ لڑی۔ دل ملا اور وہ مہ لقا حرم سلطانی میں داخل ہوئی۔ نواب وزیر کو رنج ہوا۔ رزیڈنٹ کے پاس پیام بھیجا کہ اطوار شاہزادہ کے خراب ہیں ایسا نہو کسی حرکت سے سخت خجالت پیدا ہو۔ رزیڈنٹ پہلے سے خار کھائے تھا۔ اس نے قطعی حکم دیا کہ شہزادہ فوراً لکھنؤ سے رخصت ہو جائے۔ چنانچہ اُسی دن پردۂ شب میں سوار ہو کر الہ آباد چلے گئے اور خسرو باغ میں مقیم ہوئے۔ بعد چند روز کے اکبر شاہ کے اصرار سے دوبارہ دلی گئے جیسا کہ دوسرے آنسو میں بیان ہوا ہے۔

(۴) "سُلیمان شکوہ"

مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم کا اسم گرامی اس بد اقبالی کی شب تار میں جگنو کی طرح چمکتا ہے جب تک انشا و مصحفی سوز و جرأت کا نام زندہ ہے اس علم دوست شہزادہ کی ہنر پروری بھی یادگار رہے گی۔

غلام قادر کی نمک حرامی سے بادشاہ بصارت سے معذور ہوئے اور انتظام سلطنت مرہٹوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو یہ عالی ہمت شہزادہ نہایت بے سروسامانی کے ساتھ وطن مالوف سے جدا ہوا اور ۱۲۰۵ھ میں رامپور ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ نواب وزیر اور مرزا جواں بخت سے بے لطفی ہو چکی تھی اور وہ بنارس روانہ کئے جا چکے تھے۔ اس لئے حفظ ما تقدم (بقیہ صفحہ آئندہ)

قرار پائی کہ مقدمہ ولی عہدی کی پیروی کے لئے مرزا حیدر شکوہ بادشاہ کی طرف سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کی طور پر تین مہینے تک نواب اودھ اپنے ولی نعمت کے استقبال کو نہ گئے مرزا بھی خوددار تھے۔ پانچ ہزار سوار و پیدل و شاگرد پیشہ کی جمعیت سے لکھنؤ سے تین کوس پر ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ مگر شہر کے اندر قدم نہ رکھا۔ آخر کار گورنر جنرل کی تحریک سے نواب وزیر استقبال کو نکلے اور شہزادے کو ہاتھی پر سوار کرکے خود خواصی میں چنور لیکر بیٹھے اور نہایت تجمل کے ساتھ شہر میں لائے چھ ہزار روپیہ ماہوار جیب خرچ کے لئے بطور پیش کش کے مقرر ہوا اور نواب وزیر فدویانہ سلوک کرتے رہے۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ ایک ایک اشرفی اور گلوری کی بخشش پر آداب گاہ جاکر بار بار مجرا بجالاتے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر نے لارڈ ہاسٹنگز کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کے اشارے سے خطاب بادشاہی قبول کیا تو اُنکی خواہش ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ مساویانہ حیثیت سے ملاقات کریں۔ رزیڈنٹ لکھنؤ نے شاہزادہ سے کہلا بھیجا کہ اب تک نواب وزیر تھے وہ بآداب وزارت حاضر ہوکر نذر دیا کرتے تھے اور خلعت پہنتے تھے اب بہ حکم انگریزی گورنمنٹ وہ بادشاہ ہوئے ہیں لہذا اون سے حضور مساویانہ حیثیت سے ملیں۔ شاہزادے نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے میں ملاقات کرونگا تو اسی طرح کرونگا۔ پھر رزیڈنٹ نے کہلا بھیجا کہ کل بادشاہ اودھ فدوی ملنے کو آئینگے ملاقات کے وقت اسکا لحاظ رکھا جائے دوسرے روز صبح کو بادشاہ اور رزیڈنٹ مع اُمرا و ارکان دولت شاہزادہ کے جلوخانہ میں تشریف لائے نواب ناظر نے چلمن اُٹھائی اور حسب دستور آواز دی "اہل دربار خبردار ہوجاؤ حضور برآمد ہوتے ہیں"۔ شاہ اودھ نے موافق اپنے عادات قدیم کے ذرا خم ہوکر سلام کیا اُدھر چوبدار نے آواز دی "صاحب عالم و عالم پناہ سلامت"۔ شاہزادہ نے سلام کا جواب بطریقہ اسلام دیا۔ دہنے ہاتھ میں شاہ اودھ کا ہاتھ بائیں میں رزیڈنٹ کا ہاتھ لیکر دیوان خاص میں ایک دنگل پر اپنے پاس شاہ اودھ کو بٹھا لیا۔ ایک لمحہ کے بعد فرمایا کہ سرکار کمپنی کو خوشی ہو گئی میری بیوی "ممتاز محل" قریب مرگ ہے میں اُسکو سکرات میں چھوڑ آیا ہوں اسوقت فرصت نہیں ہے پھر ملاقات ہوگی یہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے (بقیہ صفحہ آیندہ)

وکیل مقرر کئے جاویں اور آگرہ و کلکتہ وغیرہ صدر مقامات پر حاضر ہو کر حقوق شاہی کی برقرار

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کشتیاں آئیں شاہ اودھ نے ایک شالی رومال اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا مگر دل میں بہت کبیدہ ہوئے اس دن سے پھر نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات نہ ہوئی بادشاہ کو یہ دھن تھی کہ میں بادشاہ ہوا ہوں تو میرے بیٹے کی شادی تیموریہ خاندان میں ہونی چاہیے۔ جوڑ توڑ لگا کر شاہزادے کے مصاحبوں کو ہموار کر کے نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان شکوہ کی بیٹی سے کرلی۔ چھ ہزار پہلے سے تھے ایکہزار روپیہ ماہوار شادی کے وقت اور پانچہزار ساواریانہ ملاقات کے وقت جملہ بارہ ہزار ماہانہ پیشکش مقرر ہو گیا۔ جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور انہوں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو ایک لڑکی پر ڈورے ڈالے جس کو شہزادی بیگم نے پرورش کیا تھا اور اس کا نام "قمر چہرہ" تھا۔ پہلے تو گفت و شنید رہی اسکے بعد کٹنی کو بھیج محل سے اڑوا لیا۔ شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا رزیڈنٹ تک بات پہنچی اس نے بادشاہ کو سمجھا بجھا کر "قمر چہرہ" کو واپس کرا دیا۔ مگر شاہزادے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کرنل کارن ریس کا سگنج کو بلوا بھیجا۔ اسکی پوتی شاہزادے کے بیٹے سے منسوب تھی اسی کے ساتھ کاسگنج چلے گئے۔ پانچہزار روپیہ جو غازی الدین حیدر نے بوقت ملاقات ساواریانہ مقرر کئے تھے وہ بند ہو کر سات ہزار میں سے ایک ہزار خزانہ شاہی سے اور چھ ہزار بتوسط رزیڈنٹ شاہزادہ کو ملتے رہے۔ وہاں یہ گل کھلا کہ کرنل صاحب کے بیٹے قمر چہرہ کو لے اڑے اور الور جا کر عیش کرنے لگے اس شاہزادہ وہاں سے بھی دل برداشتہ ہو گئے اور اکبر آباد جا کر بود و باش اختیار کی آخر کار ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۴ھ میں مر کر سکندرہ مقبرہ اکبر شاہ تیموری میں مدفون ہوئے۔ (ماخوذ از قیصر التواریخ و گل رعنا)

مرزا سلیمان شکوہ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے مظفر بخت اکمل رتبہ اولوالعزمی سے تسخیر ممالک کیلئے راجپوتانہ کی طرف گئے۔ قاضی محمد صادق خان اختر اور بہت سے شرفائے لکھنؤ ساتھ تھے۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی صورت کامیابی کی نظر نہ آئی کئی برس کی سرگردانی کے بعد واپس آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے سو روپیہ ماہوار (بقیہ صفحہ آئندہ)

رہنے جانے کا مطالبہ کریں اور مرزا جوان بخت کی ولیعہدی طے کرادیں لیکن یہ صلاح بارآور

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) اُن کے جیب خرچ کے لئے مقرر کردیئے دوسرے بیٹے شہزادہ کے مرزا کام بخش تھے۔ مدت العمر اپنے والد ماجد کے کاروبار کے مہتمم رہے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ خاک پاک لکھنؤ کے اثر سے مذہب اثنا عشریہ اختیار کرلیا تھا۔ مرنے کے بعد آغا باقر کے مشہور امام باڑے میں دفن ہوئے اور سب سے بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ اُنکے دو بیٹے مشرف بزیارت کربلائے معلی ہوئے اور طہران پہنچکر شاہ کجکلاہ کے عرصہ تک مہمان رہے۔ ان کے بڑے بیٹے مرزا حیدر شکوہ مع دیگر اعزا کے اپنے والد کی وفات کے بعد اکبرآباد سے لکھنؤ آئے۔ رزیڈنٹ کی سفارش سے ہزار روپیہ ماہوار سرکار اودھ سے مقرر ہوئے۔ اس میں سے چھ سو مرزا حیدر شکوہ لیتے تھے اور چار سو دوسرے متعلقین کو تقسیم کردیتے تھے۔ عزت وحرمت خوب تھی لیکن ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ آمدنی کم خرچ زیادہ۔ عسرت سے بسر ہوتی تھی اپنے آبائی وطن کی زیارت کا شوق ہوا اور دہلی کا سفر کیا وہاں جو کچھ گزرا متن کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ ہنگامہ غدر میں مرزا حیدر شکوہ نے نہایت عاقبت اندیشی سے کام لیا۔ اور بیلی گارد میں جہاں انگریزی فوج محصور تھی داخل ہوکر سرکار کمپنی بہادر کی حفاظت میں آگئے۔ قیام امن کے بعد ان کے مشاہدہ میں پانچسو کا اضافہ ہوا۔ اور اسطرح ڈیڑھ ہزار ماہوار اس خاندان کی تنخواہ خزانہ انگریزی سے مقرر ہوئی مرزا حیدر شکوہ دل شکستہ ہوکر عازم عتبات عالیات ہوئے اور ماہ صفر ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں بمقام مشہد مقدس جوار رحمت میں پہنچے۔

ان کے بڑے صاحبزادے جو "مرزا ولی عہد" مشہور تھے بزرگوں کی پونجی بیچنے کے بعد لکھنؤ میں عسرت اور تنگدستی سے زندگی کے دن گذارتے رہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!!

مرزا سلیمان شکوہ کے چھوٹے بھائی مرزا سکندر شکوہ اور اُن کے بیٹے عباس شکوہ بھی لکھنؤ تشریف لائے اور یہیں کی خاک پاک کا پیوند ہوئے۔ لیکن اُن کی دردناک احوال کی تفصیل سے شمع گریاں کو کچھ علاقہ نہیں۔

نہیں ہوئی۔ سرکار انگریزی کے ایجنٹ متعینۂ دہلی نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ وکالت کے عہدہ پر شہزادوں کے مقرر کرنے کی کوئی نظیر نہیں ہے اور جدید قاعدہ جاری نہیں کیا جاسکتا!

مگر شاہزادے بڑے ہنرمند تھے یہ نسخہ مفید نہ ہوا تو دوسری دوا تجویز کی بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ مذہب اثنا عشریہ قبول کریں تاکہ فرمانروائے اودھ سے رابطۂ یکجہتی قائم ہو اور دونوں متحد ہو کر مرزا جواں بخت کی ولیعہدی سرسبز کرا دیں بلکہ ایک سفیر شاہ ایران کے پاس بھی بھیجا جائے اور نادر کے تخت گاہ سے تاجدار دہلی کی حفاظت کے لئے امداد طلب کیجائے اس تجویز پر عمل کی نوبت نہ آئی تھی کہ بادشاہ بیمار ہوگئے مرض کو اشتداد ہوا ایک دن جانکنی سی حالت طاری ہوگئی برطانوی[۵] حکام نے یہ سمجھ کر کہ کہیں بادشاہ کے انتقال پر تخت حاصل کرنے کی غرض سے شہزادوں میں باہمی جنگ نہ چھڑ جائے قلعہ کے باہر ایک پلٹن متعین کردی۔ حاضرین دربار نے اس واقعہ کا ذکر بادشاہ سے کیا انہوں نے معاً کمشنر دہلی کو پیغام بھیجا۔

"جناب عالی! کیا آپ کا خیال ہے کہ میری لاش انگریزوں سے جنگ و جدال کریگی؟ کیا آپ مجھے اطمینان کے ساتھ مرنے بھی نہ دیں گے؟" کمشنر نے خط پڑھتے ہی پلٹن کو واپس بلا لیا اور بوڑھا بادشاہ تن تنہا چھوڑ دیا گیا "ابھی زندگی باقی تھی۔ مصائب کا پیالہ لبریز نہیں ہوا تھا۔ فرد قرارداد جرم میں کئی دفعات کا اضافہ ہونے کو تھا۔ مرزا حیدر شکوہ نے منت مانی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے تو لکھنؤ میں حضرت عباس کی درگاہ پر علم چڑھاؤنگا اور تیمارداروں کو مشورہ دیا کہ آخری وقت ہے بادشاہ کو خاک شفا دیجائے۔ اللہ کی شان۔ خاک کی چٹکی اکسیر بن گئی مرض کا زور گھٹا اور چند روز میں صحت کلی حاصل ہوگئی جشن صحت دہوم دہام سے منایا گیا۔ استاد ذوق نے بڑے زور شور کا قصیدہ لکھا۔ اور

---

۵ سوانحعمری شمس العلما ذکاء اللہ نوشتہ پادری سی۔ ایف۔ اینڈریوز صاحب ۱۲۰

خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرہ انعام پایا - اس قصیدہ کا قطعہ ذیل بہت مشہور ہے -

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط — کہ شمس بازغہ کی جا پڑے ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ — نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

ظفر کے دیوان چہارم میں ایک قطعہ بند غزل ہے جو اسی جشن صحت کی یادگار ہے -

محفل شادی ظفر آج بھی ہو کل بھی ہو — گھر ترا شادی کا گھر آج بھی ہو کل بھی ہو
رات کو تھی جگمگا دن کو صحنک بھی تھا — دھوم یہ شام و سحر آج بھی ہو کل بھی ہو
باعث صحت ترے روز ہی دن عید کا — کیونکر نہ خوشی ہر شب ہر آج بھی ہو کل بھی ہو
آج شب قدر ہو کل کا ہو دن روز عید — یمن شفا کا اثر آج بھی ہو کل بھی ہو

جشن صحت سے فراغت کے بعد شہزادگان مہمان لکھنؤ واپس گئے اور اپنے ساتھ چند کاغذات لے گئے جن پر بادشاہ کی مہر ثبت تھی -

اُس وقت لکھنؤ آج کا سا اجڑا دیار نہ تھا - رنگیلے پیا جانِ عالم[1] کی راجدھانی تھی - گلیوں میں حُسن بستا تھا ہر ایک محلہ شہر عشق اور ہر ایک کوچہ حسن آباد تھا - مرزا حیدر شکوہ نے نذر ادا کرنے کے لئے حضرت عباس کی درگاہ پر علم چڑھانے کا ارادہ کیا بادشاہ دہلی سے امداد لیکر سامان جلوس و احتشام فراہم کیا - سارا شہر امنڈ آیا - یہاں مجمع سنایان بھی تلاش یار میں آئے - شاہی خاندان کے تمام ارکان شہر کے رؤسا اور اُمرا شریک تھے - کہا جاتا ہے

[1] لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کیطرف اشارہ ہے - سلطان عالم شاعر بھی تھے اختر تخلص تھا - غدر کے زمانہ میں ان کو کچھ دنوں کے لئے قید فرنگ کا تجربہ ہوا تھا - اُس وقت ایک مختصر رسالہ مصائب اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بیان میں لکھا تھا - دیباچہ میں فرماتے ہیں ؎

ہوں شاہ اودھ نام واجد علی — مگر ملک تعبیر ہے خواب کی ۱۲

کہ سلطان عالم نے علَم مبارک کی مشایعت کی اور حضرت مجتہد العصر نے اپنے مقدس ہاتھوں سے علَم چڑھایا۔

اس رسم کو خاص اہمیت حاصل ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ مرزا حیدر شکوہ نے حضرت قبلہ و کعبہ کے حضور میں ایک عریضہ پیش کیا تھا جو پنسل[۵] سے لکھا ہوا تھا اور جس پر بادشاہ دہلی کی مُہر ثبت تھی۔ عریضہ کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ دہلی نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ خبر لکھنؤ کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی اور دار السلطنت کے باشندوں کو نہایت مسرت ہوئی دہلی میں بھی خبر پہنچی۔ لکھنؤ والوں کو جسقدر خوشی ہوئی تھی اس سے زیادہ دلی والوں کو رنج ہوا۔ تمام شہر میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ بادشاہوں کا مذہب شاہ عالم اول کے وقت سے مشتبہ ہو رہا تھا۔ لیکن علی الاعلان اظہار شیعیت کا یہ پہلا موقع تھا۔ بہادر شاہ نبض شناس تھے۔ سارا الزام مرزا حیدر شکوہ کے سر تھوپا اور تبدیل مذہب سے انکار کیا حکیم احسان اللہ خاں مقرب خاص تھے انہوں نے اس خبر کی تردید کے لئے رسالے شائع کرائے۔ شہر کے گلی کوچوں میں اشتہارات چسپاں کئے گئے کہ یہ افواہ بے بنیاد ہے۔ مرزا غالب نے حکیم صاحب کی فرمایش سے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس میں مرزا حیدر شکوہ۔ مجتہد العصر بلکہ مذہب شیعیت پر بھی اعتراضات تھے۔ ع

(مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے!!)

بہادر شاہ نے حاشیہ نشینوں سے بیان کیا کہ مرزا حیدر نے متعدد کاغذات اپنے ہاتھ سے لکھ کر مُہر شاہی خود ثبت کر لی ہے۔ البتہ ایک فرمان حضرت مجتہد کے نام بادشاہ نے لکھایا ہے مگر اس میں تبدیل مذہب کا تذکرہ نہیں ہے۔ صرف یہ بیان ہے کہ جو حضرات اہل بیت سے محبت نہ رکھے وہ مسلمان نہیں ہے۔ دوستوں نے باشندگان

---

[۵] دستور تھا کہ شاہی فرامین پر سیسہ کی قلم یعنے پنسل سے بنایا جاتا تھا۔ ۱۲

دہلی کے اطمینان قلوب کے لئے کمپنی بہادر کے ایجنٹ کی معرفت اُس فرمان کی نقل لکھنؤ سے منگوائی مگر اتفاق سے (!!) اُس میں وہی مضمون پایا گیا جس کی شہرت تھی یعنی بادشاہ نے مذہب اثنا عشریہ قبول کر لیا ہے۔

مرزا ابوظفر نے واقعی مذہب تبدیل کیا تھا یا اظہار تشیع سلاطین ایران و اودہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایک پولیٹکل چال تھی! آج جبکہ نہ بہادر شاہ اس عالم میں ہیں اور نہ مرزا حیدر شکوہ اس معمے کا تسکین بخش حل بہت دشوار ہے۔ دل کا راز سوائے علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بادشاہ کو محبت اہل بیت میں غلو اس سے زیادہ تھا جتنا کہ اُن کے ہمعصر ہموطن ظاہر کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

میرا حامی ہے پیشوا ہے علی   میرے ہر درد کی دوا ہے علی

جو اُس امام کا ہے دوست ہے خدا کا دوست
قبول ہوتی ہے اُس کی علی الدوام نماز
جو ہو حسین کا دشمن اُسے کہاں ایمان
اگرچہ پڑھتا بھی ہو وہ برائے نام نماز

نماز پڑھ کے سدا سجدہ و قیام کے ساتھ   وظیفہ چاہئے ذکرِ غمِ امام کے ساتھ

ہیں درِ دولت سے ہوتے بہرہ ور شاہ و گدا   پھر بھلا اس در کے ہوتے کس سے کیجے التجا
آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں پر ظفر ہے آپ کا   آئیے اب تو مدد کے واسطے بہرِ خدا
یا حسینؑ ابن علیؑ بندہ بہت ناچار ہے

محرم میں بادشاہ فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے۔ چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لئے سدے ہاتھوں میں لیکر اور چاندی کی زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے تھے۔ ساتویں کو مہدی بڑی دھوم دھام سے اٹھتی تھی اور بادشاہ بہ نفس نفیس اس کی مشایعت کرتے تھے۔ آٹھویں کو حضرت سقائے حرمؑ کی یادگار میں لال کھاروے کی لنگی باندھکر بہشتی بنتے اور شربت کی بھری ہوئی مشک کاندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلاتے تھے۔ دسویں تاریخ کو موتی مسجد میں عاشورہ[1] کی نماز پڑھ کر ظہر کے وقت حاضری کے دسترخوان پر نیاز دیتے تھے۔ دستر خوان پر شیر مالیں چنی ہوتی تھیں اور شیر مالوں پر کباب۔ پنیر۔ پودینہ۔ ادرک۔ مولیاں۔ کتر کے رکھی جاتی تھیں۔

یہ رسوم اہل سنت میں نہ اس وقت رائج تھے نہ اب ہیں۔ خصوصاً نماز عاشورہ اور حاضری کا سینوں کے مذہب میں قطعاً وجود نہ تھا۔

واضح رہے کہ یہ قواعد و آداب قلعہ معلیٰ میں اس وقت ملحوظ رکھے جاتے تھے جبکہ حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلی کے اہل سنت سے تمام رسوم قبیحہ اور بدعات چھوڑا چکے تھے سوائے طبقہ جہلا اور گروہ متصدفہ کے کوئی سنی ان افعال کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ بادشاہ پر بھی وہابی علما کا کافی اثر تھا۔

عظیم آباد کے مشہور "متبع سنت" واعظ مولوی ولایت علی جو حضرت سید اور مولانا شہید کے اصحاب ورفقا میں سے تھے لیکن نعمت شہادت سے محروم رہگئے تھے اسی زمانہ کے قریب دہلی تشریف لائے نواب زینت محل کے استاد مولوی امام علی اس کے مرید ہوئے۔ بادشاہ نے مولوی صاحب کو قلعہ میں طلب فرمایا۔ دیوان خاص میں اجلاس ہوا۔ تخت شاہی کے نیچے فرش مکلف بچھایا گیا۔ بادشاہ نے لب فرش تک استقبال کیا۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد مسند

[1] یہ ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے۔ ملاحظہ ہو بزم آخر۔ مرتبہ منشی فیاض الدین مرحوم۔

پر ایک طرف حضرت کو بٹھایا اور دوسری جانب خود بیٹھے۔ عطر و پان کی تواضع ہوئی۔ امرار دربار اپنے اپنے مقامات پر استادہ تھے فرنگی قلعہ دار بھی شریک مجلس تھے۔ اور (صاحب تواریخ عجیبہ معروف بہ سوانح احمدی کی روایت کے مطابق) بادشاہ کے سر پر مورچھل ہلاتے تھے۔ مولوی صاحب نے دنیا کی بے ثباتی پر وعظ شروع کیا۔ وزیر اعظم نے جھک کر عرض کی کہ دوزخ اور عذاب کا بیان بادشاہ کے سامنے نہ کیجئے لیکن مولانا نے نہ مانا اور ایسی پُر اثر تقریر کی کہ بادشاہ۔ بیگمات اور شہزادے زار زار رونے لگے۔ بعد ختم مجلس مولانا کو محلات شاہی کی سیر کرائی گئی اور پچاس خوان الوان نعمت کے بھرے ہوئے نذر کئے گئے۔ یہ بھی گزارش کی گئی کہ مولانا ماہ رمضان قلعہ میں بسر کریں تاکہ بادشاہ اور شہزادوں کو مواعیظ میں شرکت کا موقع ملے لیکن مولوی صاحب نے وہاں قیام خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ حکام انگریز مختلف اشخاص سے دریافت کرتے تھے کہ یہ مولوی[1] کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟

بادشاہ کا مذہب واقعی گومگو کا معمہ تھا۔ ایکدن مراسم عزاداری میں غلو تھا۔ دوسرے روز سرگروہ "متبعین سنت" کی خاطرداری میں انہماک۔ تیسرے روز عرس اور مجالس حال وقال میں شرکت۔ چوتھے دن راکھی سلونو کے میلہ کی تیاری!!

کسکی ملت میں گنوں آپکو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھکو

حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت حسن عسکری اسی عرصہ میں دونق

---

[1] مولوی صاحب نے محرم ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔ انکی بابت ایک لطیفہ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں وہ دلّی تشریف لائے ہیں دارلسلطنت میں اُلّو کے حلت و حرمت کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک فریق اُلّو کو حلال کہتا تھا اور دوسرا حرام۔ بعض حضرات نے آپ سے استفتا کیا تو بولے کہ "ہم بھائیو میں اُلّوؤں کے جھگڑے میں نہیں پڑتا"۔ ۱۲-

فرمائے دہلی ہوئے اور دربار شاہی میں وہ رسوخ واقتدار حاصل کیا جو بعد کو ان فرشتہ صورت بزرگ کی شہادت کا سبب بنا۔ یہ عبرت ناک روداد چوتھے آنسو میں مفصل بیان ہوگی اس مقام پر صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ ظفر کے دیوان چہارم میں مندرجہ ذیل اشعار کی مخاطب غالباً آپ ہی کی ذات والاصفات ہے:۔

ہو گیا آپ کا اس طرح سے آنا جو ادھر
کشش شوق ظفر ہے تمہیں حضرت لائی

ہے یقین آپ کے آنے سے وہ ٹل جائیگی
گردش چرخ ستمگر ہے جو آفت لائی

خازن مخزن اسرار تمہیں ہو کہ قضا
آپ کے پاس کلید در دولت لائی

اس خزانہ سے مجھے بھی تو عنایت کچھ ہو
میری قسمت تمہیں اے گنج سعادت لائی

بلکہ گنجینۂ عرفاں ہے تمہارا سینہ
نہ تہیدست گیا یاں جسے قسمت لائی

یہی قصہ عاشقانہ انداز میں:۔

مدت کے بعد آج ادھر کیونکر آئے ہو
از خود جو آئے ہو مرے گھر کیونکر آئے ہو

آنکھیں ملا کے ہم سے کرو بات صاف صاف
کیا آپکو ہی مد نظر کیونکر آئے ہو

آنا تمہاری ذات سے تو یاں بعید تھا
اپنے زہے نصیب! مگر کیونکر آئے ہو

کہنے لگے کہ تم بھی عجب شخص ہو کوئی
ہمسے جو پوچھتے ہو ظفر "کیونکر آئے ہو"

لائی ہے کھینچکر کشش دل ہی آپ کی
کہتے ہو بار بار وہ ادھر کیونکر آئے ہو"

اس پوچھنے پر ہم نہ آئیں گے پھر کبھی
منہ سے نہ کہنا بار دگر کیونکر آئے ہو

قدرت نے اسرار غیب پر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ اس سوال کا جواب نہایت آسان تھا کہ "خاک گور" کھینچکر لائی ہے۔

اسپ تازی برنشست وشاد تاخت
خون بہائے خویش راخلعت شناخت

اے شدہ اندر سفر با صد رضا
خود بہ پائے خویش تا سوء القضا

اس دردناک کہانی کو تھوڑی دیر کے لئے بند کرکے خاندان مغلیہ کی آخری

بازیب و تجمل شادی کا تماشہ دیکھئے۔

معلوم ہے کہ مرزا جواں بخت نواب زینت محل کے لاڈلے فرزند اور مرزا شاہ رخ کی وفات کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ عزیز نور بصر تھے۔ انکی شادی کتخدائی میں وہ سامان کیا گیا کہ مرزا جہانگیر اور سلیم شہزادوں کی شادیوں کی داستان تقویم پارینہ ہو گئی۔ تکلفات رسوم ساچق و مہندی و برات و آرائش شہر و روشنی بیان کرنا بیکار ہے۔ البتہ ایک چشم دید گواہ[1] کا بیان بزم نشاط اور تقسیم طعام کے اہتمام کی بابت اوسی کی زبان سے نقل کیا جاتا ہے:۔

"قرینہ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا جدا۔ ملازمین معززین کی انجمن جدا۔ فرقہ سپاہ کی بزم جدا۔ شاگرد پیشہ کے لئے جدا۔ اسی طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہل شہر کے لئے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص و سرود سے محظوظ ہوں رقاصان پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز و انداز تھے و مہ جبینان ناہید نواز زمزمہ پرداز دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔

کل ملازمین شاہی اور رؤسائے شہر کے واسطے توڑہ جات کا حکم تھا۔ جسکا جی چاہے زر نقد پچاس روپیہ توڑے کی قیمت لے خواہ توڑہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو توڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ مثلاً میرے والد کا توڑہ جدا۔ میرے نام جدا۔ میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا۔ وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا کیونکہ ایک تنخواہ اُنکے نام بھی تھی میں نے مہتمان توڑہ بندی سے کہلا بھیجا کہ آٹھ روز کے بعد ایک توڑہ بھجوا دیا کرو۔

اس دریا دلی سے تقسیم توڑہ جات کی ہوئی تھی کہ جس روز توڑہ آتا تھا تمام عزیز و

[1] حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی "داستان غدر" صفحہ ۱۷ و ۱۸۔

اقارب دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک تورہ میں طعام اسقدر ہوتا تھا کہ ایک مغل شکم سیر ہو کر کھالے۔ میرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ رنگ برنگ کے میٹھے چاول سُرخ۔ سبز۔ زرد۔ اودے۔ پانچ سیر کی باقرخانی۔ ایک شیریں۔ ایک نمکین اور کئی قسم کی نان غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے وخلعت وانعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم کئے گئے۔

غالب مرحوم کی رسائی دربار شاہی میں ہو چکی تھی۔ نواب زینت محل کی ایما سے انہوں نے یہ سہرا کہہ کر زرنگار کاغذ پر لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں نذر گزرانا۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا　　باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے　　ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی　　ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی　　تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولہ کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا　　ہے رگِ ابر گہربار برابر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں　　دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ اُستاد ذوق سے فرمائش کر کے ایک سہرا لکھوایا :-

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا　　آج ہے یُمن وسعادت کا ترے سر سہرا
سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی　　کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک　　کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابش حسن سے مانند شعاع خورشید — رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا
تا نبے اور بنی میں رہے اخلاص بہم — گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
درِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جن کو دعوٰی ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔

بہادر شاہ پر فقر درویشی کا رنگ ایام ولی عہدی سے چڑھا ہوا تھا لیکن اب حوادث گوناگوں نے یہ نشہ بہت تیز کر دیا۔ تخت سلطنت پر بیٹھ کر اسرار و نکات تصوف بیان فرماتے اور طالبین کو ہدایت و تلقین کرتے تھے۔ سلسلۂ پیری و مریدی فروغ پر تھا۔ جو خوش نصیب شرف بیعت سے فیضیاب ہوتے ان کو شجرہ عنایت فرماتے۔ مسئلہ وحدت الوجود کی تعلیم دیتے اور ایک سُرخ رنگ کا رومال بطور تبرک عطا فرماتے تھے۔ بیشتر مریدین کو پانچ روپیہ ماہوار بطور مدد معاش کے خزانہ عامرہ سے ملتا تھا۔ اور اس طمع سے مریدین کی تعداد میں روز افزوں ترقی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچی کہ سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی بادشاہ کے مرید ہونے لگے۔ ایک جمعدار حمید خاں نام بھی اس نعمت سے مشرف ہوا تھا۔ رزیڈنٹ کو اندیشہ ہوا کہ فوج کے سپاہی اگر بادشاہ کے حلقہ بگوش ہوئے

لہ مرزا غالب مرحوم نے "مہر نیم روز" کے دیباچہ میں اسی پر چوٹ کی ہے:-

شبلی از منبر دہد آواز عشق — شاہ ما بر تخت گوید راز عشق
شاہ ما دارد بہم در رہبری — خرقۂ پیری و تاج خسروی
شاہی و درویشی ایں جا باہم است — بادشاہ عہد قطب عالم است

تو بوقت ضرورت حق نمک فراموش کریں گے۔ لہٰذا اہلکاران فوج کو بہادر شاہ سے بیعت کرنے کی حکماً ممانعت کی گئی لیکن دہلی کے دوسرے باشندے اس خوان کرم سے بے تکلف بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

اگرچہ بادشاہ سلامت کو تصوف میں اسقدر غلو تھا کہ گلستاں کی شرح ایک صوفی کے نقطۂ نگاہ سے خود لکھی اور اشغال واذکار میں ایک کتاب "سراج المعرفت" نام مفتی میرلال سے لکھوائی (جن پر آیندہ ابواب میں ریویو کیا جائیگا) لیکن یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہجوم مصائب یا کثرت ریاضت نے حضور انور کا دل سرد کر دیا تھا۔ اور آتش شوق بالکل بجھ گئی تھی، نہیں ہرگز نہیں۔ عمر شریف ستر برس سے متجاوز تھی اس وقت کا واقعہ ہے کہ "حضور انور نے راکھی ساونو کے میلہ کی تقریب میں راجہ بھولاناتھ کو پچاس روپیہ اور تخت خاص کے کہاروں کو ایک ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔ اس عیش وعشرت کے وقت میں حضور انور نے ایک مطربہ زہرہ پیکر ماہ طلعت کو شرف مناکحت سے اعتبار وامتیاز کا رتبہ مرحمت فرمایا۔ اختر محل خطاب دیا۔ دوسو روپیہ ماہوار مقرر فرمایا۔ ایک خواجہ سرا اور خدمت گار ڈیوڑھی پر مقرر کئے۔ اور اعلیٰ اعلیٰ اقسام کے بہت سے زیور عطا فرمائے۔[۵]

خود ارشاد فرماتے ہیں:۔

اے ظفر جو شباب کے دن تھے — بس وہی خورد وخواب کے دن تھے
دور عشرت تھا اور عہد نشاط — جام صہبائے ناب کے دن تھے
مہندی مل کر نہاتے تھے ہر روز — نہ مقرر خضاب کے دن تھے
کرتے آرام سرد خانہ میں — تابش آفتاب کے دن تھے
جاگتے رات کو بھی جاڑے کی — ہم نشہ میں شراب کے دن تھے

[۵] احسن الاخبار بمبئی - ۲۴ ستمبر ۱۸۴۷ء - ۱۲۰

جتنی پیتے تھے روزے۔ اس سے پیتے دونی سحاب کے دن تھے
تھا "کلو واشربو" پر اپنا عمل کہ شراب وکباب کے دن تھے
تھا نہ کچھ دلمیں خوف روز حساب گنہ بے حساب کے دن تھے
نہ یہ راتیں تھیں آہ و زاری کی اور نہ یہ رنج وتاب کے دن تھے
رہے پیری میں اس لئے جیتے دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

لذت گناہ ہنوز دل میں باقی ہے!! ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد۔ یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!!!

بادشاہ مرزا غالب کے قول کے مطابق ممکن ہے کہ تسلی وقت اور قطب عالم ہوں لیکن کمپنی بہادر کی نظر میں ان کے "تاج خسروی" کی یہ وقعت باقی رہگئی تھی کہ ۱۸۵۴ء میں دارالسلطنت کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گاؤکشی کے قدیم مابہ النزاع مسئلہ پر کچھ جھگڑا ہوا۔ بادشاہ نے معاملہ کو سلجھانے کے لئے مشورہ نیک دینا چاہا۔ اور اپنی رائے لفٹننٹ گورنر صوبہ مغربی وشمالی کو لکھکر بھیجی تو صاحب بہادر نے جواب دیا کہ "مقامی عہدداروں سے جو قیام امن کے ذمہ دار ہیں رجوع کرنا چاہئیے" القاب وآداب میں بھی فرق آگیا۔ پہلے جو خطوط لفٹننٹ صاحب کی طرف سے بادشاہ کو لکھے جاتے تھے وہ May it please your Majesty سے شروع ہوتے اور your Majesty's faithful servant پر ختم ہوتے تھے۔ مگر ۲۲ اگست ۱۸۵۴ء کو مسٹر کالون لفٹننٹ گورنر آگرہ نے مسئلہ گاؤکشی کے متعلق بادشاہ کے خط کا جواب دیا تو My most esteemed & royal friend سے شروع کیا اور your Majesty's sincere friend پر ختم کیا۔ یعنے شہنشاہ دہلی کا مرتبہ لفٹننٹ گورنر کے برابر بلکہ اس سے بھی کم رہگیا۔

(ظفر)؎ اب جو لکھتا ہے وہ یہ کاہے کو لکھتا تھا کبھی
دیکھہ لو اُس بتِ بے پیر کا پہلا کاغذ

صفر ۱۲۷۱ھ میں حضرت شیخ ابراہیم ذوق نے باغ جناں کی راہ لی۔ بادشاہ کو بہت افسوس ہوا اور بار بار مرحوم کے حقوق یاد کرکے اظہار تلق فرماتے رہے۔ جشن ملتوی فرمایا اور ان کے صاحبزادہ شیخ محمد اسماعیل کو خلعت تعزیت سے سرافرازی بخشی۔ نواب مرزا خاں داغ شاگرد ذوق کی مرزا فخرو ولی عہد کے وسیلہ سے قلعہ میں آمدورفت تھی۔ لیکن ولی عہد معتوب تھے اور اُن کے متوسل کا چراغ نواب زینت محل کے سامنے جلنا ممکن نہ تھا۔ بادشاہ داغ کی طباعی اور شستہ بیانی کے معترف تھے مشہور ہے کہ قلعہ کے ایک مشاعرہ میں داغ نے بے اصلاحی غزل پڑہی جسکا شعر تھا؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی۔
کسی کا اس طرح یارب نہ دُنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ کے حسب حال تھی۔ دل پر چوٹ لگی۔ نوعمر شاعر کو اپنے پاس بُلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا مگر منصب اُستادی خالی ہوا تو ولی عہد کے آوردہ کا تقرر محال تھا۔ حافظ غلام رسول ویران[۱] شاگرد ذوق کو یہ منصب عنایت کیا گیا اور خدمت اصلاح مرزا اسد اللہ خاں غالب سے متعلق ہوگئی۔ خواجہ حالی[۲] فرماتے ہیں کہ "مرزا غالب اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرتے تھے" اور ایک ناظر سے روایت کرتے ہیں کہ مرزا کو بادشاہ کی آٹھہ نو غزلیں بنانے میں اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی جتنی کہ "ایک مشاق استاد کو چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کرنے میں لگتی ہے"

[۱] ۱۳۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ مزار پر یہ شعر کندہ ہے:-
فاتحہ مرقدِ ویران پہ بھی پڑھتے جانا ۔۔۔ اُن سے کہدو جو ہیں اس رہ سے گذرنیوالے۔
[۲] یادگار غالب صفحہ ۲۶۔ ۱۲

ظفر کا وہ کلام جو غالب کی "با دل ناخواستہ" اصلاح سے مزین ہوا تھا غدر میں تلف ہو گیا یا حکیم احسان اللہ خاں مرحوم نے جن کے پاس ترتیب دیوان کیلئے جمع ہوتا تھا غائب کر دیا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ کو غالب کی اصلاح سے فائدہ پہونچا یا نہیں اور درحقیقت بادشاہ صرف وہ ایک ایک دو دو مصرعے کہتے تھے "اور غالب اُن مصرعوں پر غزلیں لکھدیتے تھے۔ یا یہ روایت بھی شجر ادشاہ پرستی کا ثمر ہے۔ بادشاہ کہنہ مشق شاعر تھے ممکن ہے کہ آخری زمانہ کا کلام اسقام سے بالکل خالی ہو۔ اور اسوجہ سے مرزا غالب کو کاوش اور جانکاہی کی ضرورت نہ پڑتی ہو اور ناظر حسین مرزا کی روایت کا آخری حصہ بالکل صحیح ہو یعنی "صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کر دیتے ہوں"

غرض ذوق کے بعد مرزا غالب کی قلعہ میں خوب قدر افزائی ہوئی۔ اس عہد کے چند لطیفے چھٹے آنسو میں درج ہیں، لیکن مرزا اپنی فطرتی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور حضرت امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

بادشاہ کے چھوٹے صاحبزادے مرزا خضر سلطان غالب کے شاگرد ہوئے اور انہیں کیطرف الہامی شاعر نے اپنی مشہور غزل کے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

چند سال کے بعد ۲۶ برس کی عمر میں درگاہ نظام الدین اور شہر دہلی کے درمیان یہ نونہال خون سے سینچا گیا۔ لہو کے فواروں سے جسم لال ہوا اور سر شہر کے خونی دروازہ پر آویزاں کیا گیا !!

فاعتبروا یا اولی الابصار

۱۰ ار جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو ولی عہد بعارضۂ ہیضہ دُنیا سے رخصت ہوئے اور شبہ کیا گیا کہ ان کو زہر دیا گیا ہے۔ ولی عہدی کا قصہ پھر اُبھرا۔ نواب زینت محل نے جان توڑ کر کوشش کی بادشاہ نے جواں بخت کی ولی عہدی کا باضابطہ مطالبہ کیا اور ایک محضر پیش کیا جسپر اُنکے آٹھ بیٹوں کے دستخط تھے۔ اور لکھا تھا کہ ہم سب خوش ہیں کہ زینت محل کا بیٹا ولی عہد مقرر ہو۔ لیکن دوسرے ہی دن بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قویش نے رزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ محضر پر دستخط اضافہ تنخواہ کا لالچ دیکر حاصل کئے گئے ہیں اور اس منصب کا مستحق سوائے مرزا قویش کے کوئی نہیں ہے۔ کمپنی کے مزید کامیابی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مرزا قویش سے یہ شرط منظور کرالی کہ بہادر شاہ کے بعد لقب شاہی موقوف کیا جائے صرف خطاب "شہزادہ" باقی رہے اور زر پیش کش جو اس وقت تک سوا لاکھ کے قریب تھا صرف پندرہ ہزار ماہوار رہجائے۔ انکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ شہزادہ نے یہ شرط تسلیم کرلی، اور سرکار کمپنی بہادر نے مرزا قویش کی ولی عہدی کا اعلان کردیا۔

جب یہ افسوسناک خبر ضعیف العمر باپ کے کان تک پہونچی تو اُسکی رنج وغم کی کوئی حد نہ تھی ایک نہایت دردناک نظم اس سانحہ جانگداز سے متاثر ہو کر لکھی جو چند گھنٹوں کے اندر شہر کے کوچہ بازار میں پھیل گئی۔ لڑکے اُن اشعار کو مرثیہ کی طرح گاتے پھرتے تھے اور بوڑھے اُسے سُن سُنکر رو دیتے تھے۔ مکمل نظم اب دستیاب نہیں لیکن اُس کا ایک شعر دلی والوں کی زبان پر ہے۔

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

(باقی آئندہ)

غزل

(حضرت لسان الملک محشر صاحب لکھنوی)

نکتے نکتے میں بھرا خونِ رگ دل میں نے
لکھا اس طرح جوابِ خطِ قاتل میں نے

رازِ سرگشتگیٔ شوق نہ پوچھے کوئی
کسطرح ڈھونڈ لیا جادۂ منزل میں نے

ہجر میں لذّتِ غم سے نہ کبھی منھ موڑا
کردیا سہل سہی بھی بات کو مشکل میں نے

لے چل اے جستجوئے ملک عدم
یہ تو کہنے کو نہ ہو ہار دیا دل میں نے

شکوۂ ناز نہیں قصّۂ غم تو سن لو
ڈرتے ڈرتے یہ کہا اُنسے بہ مشکل میں نے

کر گیا حشر بپا رات کو افسانۂ ہجر
تیری تو نیم اُلٹ دی صفِ محفل میں نے

روح سی بھی ہی سوا آبلۂ عشق کی قدر
دل پہ یہ نقش اُبھارا ہی بہ مشکل میں نے

عشرتِ وصل و غم ہجر پہ صدقے محشر
دیکھا دونوں کا نہ دنیا میں مقابل میں نے

محکمہ معیار

از

(جناب سید حسن زاہد جعفری صاحب، منیجر رسالہ شمع)

واشنگٹن (امریکہ) میں محکمہ معیار ہے، وہاں ایک آلہ ہے جو سیکڑوں میل دور جلتی ہوئی موم بتی کی حرارت کو ناپ لیتا ہے، ایک اور آلہ ہے جو بتا دیتا ہے کہ چھ انچ موٹے فولاد کو موڑنے کے لئے کس قدر قوت کی ضرورت ہے، وہاں پر حسب فرمایش آندھیاں بنائی جاتی ہیں سکینڈ کے دس لاکھویں حصہ کی پیمایش ہوتی ہے، اور معمولی نقطہ کو وزنی چیزوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ محکمہ کچھ عرصہ سے قایم ہے، اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے دنیا میں عجیب و غریب مقام ہے، اور صحیح معنی میں جدید ترین تحقیقات کا عجائب خانہ کہے جانے کا مستحق ہے، اسی جگہ امریکہ کی ترازو اور باٹ کی جانچ ہوتی ہے یہاں ایسی نازک ترازوئیں موجود ہیں کہ جب تک اُن کو انسان اپنی آنکھوں سے خود دیکھکر اطمینان نہ کرلے۔ سنی ہوئی باتوں کا مشکل سے یقین کر سکے گا۔ فرض کیجئے آپ تین چار انچ لانبے اور نصف انچ چوڑے کاغذ کو وزن کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت آسان ہے آپ اس کاغذ پر اپنا نام لکھئے ترازو بتادے گی کہ سیاہی سے لکھے ہوئے نام کا کیا وزن ہے اب آپ پنسل سے اپنا نام لکھے ترازو بتادے گی کہ سیاہی سے اور پنسل سے لکھے ہوئے ناموں کے اوزان میں کیا فرق ہے شاید آپ اپنے نام کے ایک حرف پر نقطہ لگانا بھول گئے تھے۔ اب لگا دیجئے اور دستخط کو پھر

وزن کیجئے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس ایک نقطہ کا کیا وزن ہے!

عجائب خانہ کے دوسرے کمرے میں تشریف لائیے یہاں اُس شخص سے ملاقات ہوگی جس نے ایک انچہ جگہ میں پچیس ہزار سیدھی اور متوازی لکیریں کھینچنے کی ترکیب نکالی ہے کمال یہ ہے کہ ہر لکیر کا فاصلہ برابر ہے! تعجب ہوتا ہے کہ آخر اس دماغ سوزی سے فائدہ؟ معلوم ہوا کہ یہ لکیریں ستارہ سے لیکر ذرّہ تک کی شعاع کا تجزیہ کرسکتی ہیں اور بتا سکتی ہیں کہ اُن کی ساخت کیا ہے شعاعوں کی لہروں کی پیائش کرسکتی ہیں اور یہاں تک پتہ دے سکتی ہیں کہ ذرّہ میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں!

اسی ماہر نے حال میں نہایت باریک حرف کی پیائش کا طریقہ ایجاد کیا ہے حروف شیشہ کے اوپر تھے اور اسقدر باریک تھے کہ انجیل کی پوری آیت لکھی ہوئی تھی مگر آنکھو نظر نہ آتی تھی۔

ہم ابھی ان صنعتوں کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ یکایک بادل کی گرج اور نہایت سخت شور وشغب نے ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیا، معلوم ہوا کہ سرنگون میں سے ہوا چھوڑی جارہی ہے اور ہوائی جہازوں کی جانچ ہو رہی ہے، یہیں آندھیاں بنائی جاتی ہیں جن کی رفتار بیس میل فی گھنٹہ سے لیکر ایک سو اسی میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے، یہاں پر ہوائی جہاز، طیارے، غبارے، گولے، موٹریں، غرض کہ ہر چیز کا جس میں رفتار ہوتی ہو معائنہ کیا جاتا ہے اور کامل امتحان کے بعد اُن کے متعلق صحیح رائے دیجاتی ہے۔ ہوا کے مقابلہ میں اُن کی مزاحمت کی پیمائش اُس قوت کو وزن کرنے سے معلوم ہوتی ہے جو انکو معلوم رفتار کی ہوا میں ساکت رکھتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ایک مشہور کارخانہ کا بنا ہوا نہایت طاقتور موٹر ان ہی سرنگون کے سامنے ساٹھ میل فی گھنٹہ رفتار کی ہوا میں رکھا گیا، اور ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا، یعنی موٹر کے اوپری حصہ کی ساخت ناقص تھی اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار میں ہوا کی مزاحمت

میں تیس گھوڑوں کی طاقت صرف ہوتی تھی - اس انکشاف نے موٹروں کی ساخت میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اب جو موٹریں بنائی جاتی ہیں اُن میں قوت مزاحمت کو حتی الوسع کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں -

اس عجائب خانہ میں بیس عمارتیں ہیں اور تنتالیس ایکڑ زمین ہے - سو سے زائد معمل ہیں، اور ہر معمل میں دس سے زیادہ عجیب وغریب چیزیں ہیں بلکہ ہمارا اندازہ ہے کہ کئی ہزار حیرت انگیز چیزیں وہاں موجود ہیں - چنانچہ ہمارے سامنے ایک نہایت بڑی ڈھنگی لمبی عمارت ہے جو ٹین سے پٹی ہوئی ہے، اس کے اندر ریختہ تالاب ہے جو چار سو فیٹ لانبا اور چھ فیٹ چوڑا ہے تالاب کے اوپر لوہے کی پٹریوں پر جو کہ تالاب کے دونوں جانب ہیں پہیہ دار چوبی چبوترہ ہے جسکی وضع گاڑی کی سی ہے - اور بجلی کی طاقت سے حرکت کرتا ہے اس گاڑی کے پُرزے اس قدر صحیح ہیں اور اُن پر ایسی قدرت رکھی گئی ہے کہ گاڑی کو جس رفتار پر چاہیں چلا سکتے ہیں، یعنی دو انچ فی سیکنڈ سے لیکر بیس فیٹ فی سیکنڈ تک اسکی رفتار ہے گاڑی کے پیچھے اور پانی میں لٹکتا ہوا ایک آہنی آلہ ہے جس کے اجزا گھومتے رہتے ہیں آلہ لٹو کی شکل کا ہے معلوم ہوا کہ اس آلہ سے پانی کی رفتار ناپی جاتی ہے - اور اسی کے ذریعہ سے انجینیر معمولی چشمہ سے لیکر زبردست دریا تک کے پر زور بہاؤ کی پیمائش کرتے ہیں - طغیانی کے وقت یہ آلہ نہایت مفید ثابت ہوتا ہے اسکی خوبی اسکی صحت پر منحصر ہے تالاب کے اور بجلی کی گاڑی بنانے کی غرض یہ ہے کہ آلہ کی قوت پیمائش کی صحیح جانچ ہو سکے، چونکہ بہتے ہوئے پانی میں مستقیم آلہ سے اور ٹھہرے ہوئے پانی میں متحرک آلہ سے ایک سے نتائج پیدا ہوتے ہیں اس لئے گاڑی کے پیچھے لٹکے ہوئے آلہ کی وہی رفتار ہوتی ہے جو گاڑی کی ہوتی ہے، اس طریقہ پر آلہ کی صحت یا خرابی کی جانچ ہو جاتی ہے - اور اصلاح کر دی جاتی ہے -

انجینیر پانی کی مقدار کا اندازہ اور سیلاب میں خطرہ سے محفوظ رہنے کی تدبیریں

آلہ کی مدد سے کرتے ہیں۔

چند دنوں کی بات ہے کہ حکومت نے محکمہ سے دریافت کیا کہ موتی جھرہ کے بخار اور آنتوں کے کیڑوں کے مارنے کی شعاعوں کے متعلق اپنی تحقیقات کے نتیجہ سے مطلع کرے محکمہ نے بالائے بنفشی شعاعوں کی صحیح مقدار کا تعین کر کے حکومت کو اطلاع دیدی۔ اس تحقیقات سے جو نتائج آیندہ پیدا ہوں گے وہ جراثیم کی دنیا میں تہلکہ مچا دیں گے۔

اس حیرت خانہ میں سب سے زیادہ متحیر کرنے والی بات یہ ہے کہ یہاں ماہرین فن گز یا فٹ کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ انچوں کے لاکھویں اور کروڑویں حصہ سے واسطہ رکھتے ہیں ہر شے میں انتہائی صفائی اور صحت کا ہونا اُن کے ایمان کا جزو ہے، اور دنیا اور دنیا سے باہر کوئی ایسی معلوم شے نہیں ہے جس میں ان کو دلچسپی نہ ہو اُن کو ہر چیز سے تعلق ہے۔ اور ہر بات کی چھان بین میں ان کا وقت صرف ہوتا ہے لطف یہ ہے ان کے یہاں اگرچہ قلیل ترین اجزا کی طرف توجہ کیجاتی ہے لیکن اُن کے نتائج مہتم بالشان ہوتے ہیں۔ یہاں ہزاروں ایجادات ہوئی ہیں جن سے آج ہم بیشمار فواید حاصل کر رہے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان لوگوں کے نظر میں انچہ کے دس لاکھواں حصہ بہ نسبت گز کے زیادہ قابل وقعت ہے، کیونکہ معیار کے لئے انتہائی صحت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صحت بغیر ٹھیک پیمائش کے حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

چنانچہ پہلے "ضرورت" کی پیمائش کیجاتی ہے اور پھر حسب ضرورت چیز بنائی جاتی ہے ٹیلیفون۔ موٹر، ریڈیو وغیرہ وغیرہ میں ایسی نازک اور پیچیدہ پیمائشیں ہوتی ہیں کہ دیکھنے اور سُننے والا حیران رہجاتا ہے، فی زمانہ انتہائی مختصر اور قلیل اجزا کی پیمائش پر سائنس کا دارو مدار ہے۔ جس قدر باریک پیمائش ہو گی اسی قدر سائنس میں کامیابی ہو گی۔ دنیا میں سات عجائبات مشہور ہیں لیکن آٹھویں عجیب شے یہ پیمائش ہے جو لاکھویں اور کروڑویں حصہ سے شروع ہوتی ہے! کیلفورنیا میں ایک زبردست دریا پر بند بنایا گیا ہے جس پر کئی کروڑ روپیہ

کی لاگت آئی ہے - یہ بند محض آزمائیشی ہے، اور اس کی عمر صرف ایک تجربہ تک ہے۔
بندوں کی تعمیر کے متعلق دنیا کے بڑے بڑے انجنیروں کی آراء میں اختلاف ہے، ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ڈاٹ وارپل جو بہت ارزاں تعمیر ہوتا ہے، مضبوط ہوتا ہے، دوسری جماعت کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کا پل سخت خطرناک ہوتا ہے!
موجودہ بند صرف اس فیصلہ کے لئے تعمیر ہوا ہے کہ دونوں فرقوں میں سے کس کی رائے صحیح ہے!

امتحان کے وقت ممکن ہے کہ یہ بند یک لخت شکست ہو جائے - اس میں صرف شگاف پڑ کر رہجائے، یا اس کو مطلق کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے، بہرکیف یہ مسئلہ ہے نہایت دلچسپ اور اس امتحان کے بعد قطعی طور پر فیصلہ ہو سکے گا کہ اس قسم کے بند میں کسقدر قوت مزاحمت ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی نتیجہ نکلے گا اس سے انجنیری کے فن میں ایک مستقل اور نہایت قابل اعتبار واقفیت کا اضافہ ہوگا - اس امتحان کے لئے یہاں پر کئی جدید آلات بنائے گئے ہیں ان میں ایک آلہ انٹرفیرومیٹر ہے، جو بند کی دیوار سے لگا دیا جائیگا - اس کے بالائی شیشہ میں دیکھنے سے پانی کے معمولی دباؤ کے اثر بھی معلوم ہو جاتا ہے، کہ یعنی پانی کے دباؤ سے بند کے ایک انچہ کا دس لاکھواں حصہ بھی اگر دبتا ہے تو اس آلہ کے ذریعہ سے انسان دبے ہوئے مقام کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے - آلہ میں ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر نوٹ ہو جاتا ہے کہ بند کس وقت ایک انچہ کا ایک کروڑواں حصہ دبا تھا! غرض فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ عمارت کس وقت کس جگہ سے کسقدر دبی تھی!

یہ آلہ بجائے خود بہت سادہ ہے اور آئینوں اور پلیٹوں سے بنا ہے اس کے تمام اجزا نہایت صفائی سے ایک دوسرے کیساتھ پیوست ہیں ایک ہی مبدا نور سے دو سلسلوں کو پیدا کر کے اُن میں خلل ڈالدینے سے سایہ کی لکیریں بن جاتی ہیں آلہ کے اوپری حصہ کو آنکھوں پر

لگانے سے یہ لکیریں صاف نظر آتی ہیں۔

فرض کیجئے آپ نے آلہ انٹرفیرومیٹر کے فولاد کے چھ انچہ موٹے دُھرے پر لگا دیا ہے اب اس کے اوپری حصہ کو آنکھوں پر لگا کر دیکھئے۔اور دُھرے پر اپنی انگلیوں کا پانچ سیر وزن ڈالیئے۔ آپکو سایہ کی ہم مرکز لکیریں نظر آئیں گی جن میں $\frac{1}{8}$ انچہ کا فصل ہوگا ان لکیروں کا ہر درجہ انچہ کے دس لاکھویں حصہ دباؤ کو ظاہر کرتا ہے ناواقف کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آئیگا مگر یہ مرتعش خطوط صاف بتا دیتے ہیں کہ ایک ہاتھ کے وزن سے پختہ دیوار یا فولادی دُھرا ایک انچہ کا دس لاکھواں حصہ دب جاتا ہے، اسی طرح اگر آپ ساڑھے تین انچہ موٹے لوہے پر اپنا ملاقاتی کارڈ رکھدیں تو اُسکے وزن سے لوہے پر جو دباؤ پیدا ہوگا آپ اُسکو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھہ سکیں گے۔

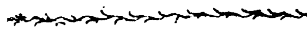
باورچی خانہ میں آپکو چینی کے برتنوں پر لکیریں نظر آتی ہیں اور اکثر برتن چٹخ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برتنوں اور چینی کی وارنش میں جذب حدت کی قوت مختلف ہوتی ہے یعنی گرمی سے برتن زیادہ پھیلتا ہے اور اوپر کی چینی جو اس قدر زیادہ نہیں پھیل سکتی چٹخ جاتی ہے لیکن اب انٹرفیرومیٹر کے ذریعہ سے معلوم ہوگیا ہے کہ حدت سے اثر پذیر ہوکر مختلف چیزیں کس قدر پھیلتی ہیں اور خنکی میں کس قدر سکڑتی ہیں، لہذا اب اوپر کی وارنش اور برتنوں کو ہم قوت بنایا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس جدید دریافت نے چینی سازی کے کارخانوں میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اور آیندہ چینی کے برتن گرمی یا سردی سے نہ چٹخ سکیں گے۔ اسی طریقہ پر اب دُنیا کی ہر چیز کے سکڑنے اور بڑھنے کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اندازہ محض پیمایش کی صحت پر منحصر ہے موٹر کار کے بنانے میں تقریباً تیس ہزار پیمایشوں کی ضرورت ہوتی ہے، پُرزے جسقدر صحیح طور پر لگائے جائیں گے اسی قدر موٹر اچھا ہوگا اور اس کی رفتار سُبک ہوگی۔ توپ کا گولہ بھی صحیح پیمایش کا محتاج ہے، وہ توپ کے مُنہ میں جسقدر ٹھیک بیٹھے گا اُسیقدر

دُور جا سکے گا، اور اُسی قدر نشانہ صحیح لگے گا براؤننگ کے معمولی پستول میں بائیس سو باسٹھ ۲۲۶۲ پیمائشوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور اُس کی لمبی لمبی کو انچ کا ایک لاکھواں حصّہ تک ٹھیک بنانا پڑتا ہے۔

عجائب خانہ میں سب سے زیادہ ذکی الحس ایک آلہ ہے اگر اس قدر گرمی اُس کے قریب پہنچ جائے کہ اس سے آپ کی اُنگلی بقدر ایک ڈگری دس لاکھ برس میں گرم ہو سکے تو وہ اُس کو بھی محسوس کرے گا، وہ اس قدر نازک ہے کہ سیکڑوں میل پر جلتی ہوئی موم بتی کی حدّت کا اندراج کر لیتا ہے، اسی آلہ کے ذریعے سے اب تک سیکڑوں ستاروں اور سیّاروں کی (جن میں مریخ اور چاند شامل ہیں) حدت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہوا کہ مریخ میں دن کے وقت اس قدر گرمی ہوتی ہے کہ ذی روح زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ آلہ بھی جو لاکھوں میل کے فاصلہ کی چیزوں کی حدّت کو ناپ لیتا ہے ساخت کے اعتبار سے بہت معمولی ہے، چاندی اور گندھک سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، اور اسی کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ درخت کے پتوں پر کس قدر دھوپ پڑتی ہے اور وہ کسقدر دھوپ کو جذب کر لیتے ہیں،

حکومت نے استفسار کیا تھا کہ موسم گرما میں خیموں کے اندر سپاہیوں کو سخت تکلیف پہونچتی ہے، کیا ایسی کوئی تدبیر ہے کہ خیموں کے اندر گرمی نہ آنے پائے؟ اس استفسار کا جواب بھی یہیں دیا گیا، اور سیکڑوں تجربات کے بعد اصول قایم ہوا کہ اگر خیموں کے اوپر سفید اور اُن کے اندر استر پر الیومنیم کا رنگ دیا جائے تو فی صدی اسّی حصّہ گرمی خیموں میں داخل نہ ہو سکے گی۔ اسی اصول کی بنا پر ہم کو اپنے گھروں کے آتش دان الیومنیم کے رنگ سے نہیں رنگنے چاہئیں بلکہ اُن کو کئی رنگ ملا کر رنگنا چاہئے تاکہ حدت زیادہ خارج ہو۔ الیومنیم کا رنگ حدت کو روکتا ہے۔
ایک غار پینتیس ۳۵ فیٹ گہرا ہے۔ اس میں اگر بیرونی حدت نہ پہنچائی جائے

تو درجۂ حرارت ایک برس میں ایک ڈگری بھی نہیں بڑہتا ہے، اس غار کے اندر ایک آلہ ہے جو ایسا نازک ہے کہ اگر جسم انسانی اس سے دس قدم کے فاصلہ پر آجائے تو وہ خراب ہوجائیگا۔ خود موجد پندرہ فیٹ کے فاصلہ پر بیٹھ کر دوربین کے ذریعہ سے تجربات کیا کرتا ہے، اگر موٹر کار پندرہ فیٹ قریب آجائے تو آلہ بالکل شکست ہوجائے گا! اسی لئے زمین دوز تہہ خانہ میں اس کے ذریعہ سے تجربات کئے جاتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟ اور اس دردسری کا مقصد کیا ہے؟ آپ سُن کر حیران رہجائیں گے کہ موجد اس کے ذریعہ سے زمین کو وزن کررہا ہے، ایک سال سے تجربہ جاری ہے۔ اور اگر زمین کا صحیح وزن معلوم ہوگیا تو دیگر سیاروں کے اوزان بھی معلوم ہوسکیں گے؟ عام طور پر ماہرین سائنس کا عقیدہ ہے کہ زمین کے بیچوں بیچ لوہا ہے، اب تک تو یہ عقیدہ محض خیالی ہے، لیکن اس جدید آلہ کے ذریعہ سے صحیح طور پر تحقیق ہوسکے گا، اسی آلہ کے ذریعہ سے کشش کی پیمایش ہوسکے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جب عجیب وغریب تجربات سے دُنیا کی حقیقتیں واضح ہوجائیں گی تو انسان کی ترقی کی رفتار اور اُس کی معلومات کی وسعت بھی حیرت انگیز ہوجائے گی۔



شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی کا پایہ اردو ادبیات میں

(جناب محمد عزیز اللہ صاحب بی اے مدراس)

افسوس ہے کہ مضمون ایک عرصہ تک ہمارے پاس رہا اور کثرت مضامین کے باعث اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

مدیران شمع

اُنیسویں صدی کے اواخر کا وہ زمانہ تھا جب کہ دلّی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ مومن۔ ذوق اور غالب یکے بعد دیگرے رخصت ہوچکے تھے اور میدان بالکل خالی ہوگیا تھا ہندوستان کی پُرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری کا دور دورہ ختم ہوچکا تھا اور اُس کی ترقی کا چشمہ خشک ہوگیا تھا۔ وہ چمن بگڑ گیا اور وہ نغمہ پرداز چمن اُڑ گئے۔ نہ وہ آشیان رہا اور نہ وہ عنادل۔ پھر بھی اُس خزاں رسیدہ گلشن پر نوحہ کرنے والی ایک دو غمزدہ بلبلیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر جیسی رنگین تھیں جن کی لَے ہر ایک کو رُلائے دیتی تھی۔ یہ رونا خواہ قوم کی سوشیل حالت کا رونا سمجھیے یا مذہبی عزاداری کا۔ لیکن افسوس کہ یہ رونے رُلانے والے بھی اس محفل سے اُٹھ گئے۔ اب کون تھا جو شاعری کو سنبھالے اور اس گرتی ہوئی دیوار کو تھام لے۔ کس کا منہ تھا کہ اس زبردست ریفارم، یا اصلاح کا بیڑا اُٹھائے اور شاعری کو اُس کے معراج کمال پر پُہنچائے۔ قوم کی اصلاح کی جانب بُہتیرے مصلحین نے توجہ کی اور بعضوں نے اپنی زبان کی بگڑی حالت کو سنوارنا چاہا۔ کسی نے نثر پر توجہ کی

اور کسی نے نظم پر۔ لیکن شاعری کے حق میں جو خضر راہ بنا وہ وہی سحر بیان انسان ہے جس کے نام سے سرنامہ مُزین ہے۔

مولانا حالی جو اپنی اعجاز بیانی اور سخن فہمی کے سبب سعدی ہند کا لقب حاصل کر چکے ہیں ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد خواجہ ایزد بخش کرنال کے باشندے تھے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی سے آپ نے فارسی پڑھی جو اُس زمانہ کے اعلیٰ فارسی دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور حاجی محمد ابراہیم حسین انصاری سے عربی کی تعلیم پائی، ۱۷ سال کی عمر سے آپ اکثر دہلی میں رہے اور یہیں منطق۔ فلسفہ وغیرہ علوم کی تکمیل کی۔ عنفوان شباب ہی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی۔ اُس زمانہ میں آپ نے جو کچھ کہا اُس میں نواب صاحب سے اصلاح لی۔ اسی تعلق سے آپ کو آزردہ۔ نیر۔ رخشاں اور حضرت غالب مرحوم کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ مرزا غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ غالب نے آپ کی طبیعت کا انداز ہ کر کے کہا کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو شاعری کے حق میں ظلم کروگے۔ آپ کی عالی دماغی اور سخن فہمی کا اُس زمانہ میں بھی شہرہ تھا جب کہ قابل سخنور موجود تھے۔ آپ مرزا غالب کی وفات کے موقعہ پر دہلی میں موجود تھے بلکہ تجہیز و تکفین میں بھی شریک تھے۔ اُستاد کی وفات پر مرزا سالک اور میر مہدی حسین مجروح اور آپ نے ایک ساتھ مرثیہ کہا۔ لیکن انصاف کی نظروں سے دیکھا جائے تو جو منزلت اور مقبولیت مولانا حالی کے مرثیہ کو حاصل ہوئی وہ اُن میں کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اس مرثیہ کا ہر مصرع مُوثر، ہر شعر پُردرد اور ہر بند لاجواب ہے جس کا دل ہر نشتر کی نوک کا سا اثر ہوتا ہے۔ آپ کو مرزا غالب سے کمال عقیدت اور محبت تھی جس نے آپ کو مرزا کی سوانح لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس لاجواب تصنیف یعنی یادگار غالب کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائیگا۔

ابتدا میں آپ کی شاعری کا رنگ وہی ایشیائی شاعری کا سا تھا جو شعرائے

دہلی کی صحبت کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ یعنی وہ گل و بلبل کے افسانوں اور ہجر و وصل کے بیانات سے مزین تھی۔ مولانا کے ابتدائی اشعار سے یہ پایا جاتا ہے کہ وہ پہلے پہل شاعری کا ماحصل طبیعت پر زور ڈال کر کہنا سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کلام میں زیادہ تر دقیقہ سنجی اور معنی آفرینی کی جھلک نمایاں ہے۔ مگر درحقیقت مولانا کی طبعی مناسبت سادگی پر مبنی تھی جو بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس جوہر پنہانی کو ابھارنے کے لئے ایک خاص وقت کا انتظار تھا۔

جس موقع کی حالی کو جستجو تھی وہ موقع اس وقت ہاتھ آیا جب کہ دلی میں غدر کا ہنگامہ بلند ہوا اور کئی مسلمان خاندان تباہ و برباد ہوئے۔ اس ناگہانی بلا سے آپ کو اپنے ہمعصر و ہم وطن مولانا آزاد کی طرح شہر چھوڑنا پڑا۔ ان دونو صاحب کمالوں نے کرنل ہالرائڈ کی خدمت میں پہنچکر کتابوں کی عبارت کو زمانہ حال کے مطابق درست کرنے کی خدمت لی۔ اس وقت آپ کو انگریزی لٹریچر پر غور کرنے کا بہت اچھا موقع حاصل ہوا۔ "پنجاب بکڈپو" میں جب تک حالی رہے کرنل صاحب کے خیالات سے اثر پذیر ہوتے رہے۔ پھر کیا تھا۔ اُنہوں نے قدیم راستہ کو یکقلم ترک کر کے طرز جدید اختیار کی اور اُردو کے بے جان قالب میں ایک نئی روح پھونک دی انگریزی لٹریچر کے بیش بہا موتی اُردو زبان میں بھی استعمال ہونے لگے اور اس اُجڑی محفل کو نئی طرح سے زینت دی گئی۔ کرنل صاحب جو یادگار چھوڑ گئے ہیں اور جن کے احسان سے اُردو ادب سبکدوش نہیں ہوسکتا وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے جدید قسم کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ وہ فرسودہ مشاعرے جن میں کسی مصرعہ طرح پر طبع آزمائی کیجاتی تھی اُن کے پیش نظر نہ تھے بلکہ ایک خاص مضمون کا عنوان دیا جاتا کہ ہر ایک شاعر اپنا اپنا کلام پیش کرے۔ مولانا حالی نے بھی اس گلشن میں جدت طرازی کے نغمہ سنائے۔ چنانچہ اُنہوں نے مشاعرے میں چار مثنویاں لکھکر پڑھیں جو اس کی یادگار ہیں۔ وہ مثنویاں یہ ہیں:-

(۱) برکھا رُت (۲) نشاطِ اُمید (۳) حُبِ وطن (۴) مناظرۂ رحم و انصاف۔ یہ چاروں

مثنویاں قبول عام ہوئیں اور بار بار چھپ کر شائع ہوئیں۔

مولانا حالیؔ پر غالبؔ کی صحبت، غدر کے بعد قوم کی تباہ حالت، پنجاب بک ڈپو کا علمی حلقہ اور کرنل ہالرائڈ کے فیضان صحبت کا بہت کچھ اثر ہوا۔ لیکن ان سب سے بڑھکر **سرسید احمد خاں** کی قومی اور ملّی تحریکات اور اُن کی پُر جوش کارروائیاں تھیں جنھوں نے سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ کا کام کیا۔ حالیؔ کی شاعری کا بیج مرزا غالبؔ کی صحبت میں بویا گیا لیکن سرسیّد کی گرمیٔ اثر نے اُس میں پھل پھول پیدا کئے۔ سرسید ایک قابل ادیب ہی نہ تھے بلکہ ادیب گر بھی تھے ان میں بلا کی تیز نظری اور مردم شناسی پائی جاتی تھی۔ جس کام کے لئے جس کسی کو انتخاب کرتے تھے وہ بہترین طور پر اس کے لئے موزوں ثابت ہوتا بلکہ اُس جیسا دوسرا نہ مل سکتا۔

ان انتخابی نامہ نگاروں میں سب سے پہلے حالیؔ ہیں جن کو سرسیّد نے اپنی صحبت سے متاثر کیا تھا۔ اُن کو آمادہ کرنا گویا بارود کے مخزن کو دیا سلائی دکھانا تھا۔ فی الفور نئے رنگ کے خیالات شرارے بن کر نکل پڑے اور کائنات ہند میں ان کے کلام نے ایک آگ سی لگا دی۔ اب مولانا حالیؔ نے :۔

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

اور وہ ایک نئے رنگ میں الاپنے لگے :۔

اب سُنو حالیؔ کے نوحے عمر بھر — ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل"

اس نئی طرز میں مولانا نے ایک مسدس "مدوجزر اسلام"، لکھی جس نے کشمیر سے راس کماری اور سندھ سے کلکتہ تک ہلچل ڈالدی۔ اس مسدس کا مضمون اور وزن قوم کو ایسا مرغوب ہوا کہ اُس وقت سے آج تک قومی شعرا اپنے خیالات کا اظہار اس مسدس یا ترکیب بند یا ترجیع بند میں کیا کرتے ہیں۔ وہ مسدس جو امانت جیسے شعرا کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی اب حالیؔ کے ہاتھوں چمک اُٹھی اور اُسکو چار چاند لگ گئے۔ اس کے شائع ہوتے ہی قوم کے برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ جو سوئے تھے وہ کروٹیں لینے لگے اور جو کروٹیں بدل رہے

تھے آنکھیں مل مل کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر اُس کی شہرت اس قدر ہوئی کہ ہر گلی کوچہ سے اسی کی صدا آنے لگی۔ وہ لوگ جو حالی کے نام سے واقف بھی نہ تھے شیدائی بن گئے۔ اس نظم سے دنیائے شعر و شاعری میں انقلاب عظیم پیدا کیا۔ وہ خود اپنے دیباچہ مسدس میں لکھتے ہیں:۔

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چار طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہرچند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا۔ مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گذرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔"

پہلے وہ قوم کی ابتر حالت ظاہر کرتے ہیں اور یہ تبلاتے ہیں کہ اب تک کسی نے قوم کے بیدار کرنے کے لئے نظم نہیں لکھی۔ اس لئے اس راستہ میں یہ سب سے پہلی کوشش ہے جو مولانا حالی نے کی۔ اس لئے جب تک مسلمان دنیا میں زندہ ہیں مولانا کو ہمیشہ وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھا کریں گے۔

اس مسدس میں انہوں نے پہلے پانچ سات بند تمہید یہ لکھ کر عرب کی حالت تنزل

کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی جس کو زمانۂ جاہلیت کہتے ہیں۔ پھر آفتاب رسالت کا طلوع ہونا اور باطل پرستی و ضلالت کا مٹ جانا اور ان چند وحشی عربوں کا اسلام لانے کے بعد دینی و دنیوی ترقیات میں عالم میں تمام پر سبقت لیجانا وغیرہ اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ اُس کی مثال شاید ہی کسی لٹریچر میں مل سکے۔ اگر یہاں اس بے نظیر مسدس کے چند اشعار پیش نہ کئے جائیں تو مولانا حالی کے حق میں بہت بڑی بے انصافی ہو گی۔

(۱) مسلمانوں کی موجودہ حالت اور طرز تغافل ملاحظہ ہو:۔

"یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے | ہنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفان بپا ہے | گمان ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے

نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

(۲) عرب کی جاہلیت کا فوٹو اس طرح کھینچا ہے:۔

"عرب جسکا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا | جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا | نہ کشورستاں تھا نہ کشورکشا تھا

تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا"

(۳) پھر آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کا سماں باندھا ہے:۔

"یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت | بڑھا جانب بُوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت | چلے آتے تھے جسکی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا"

(۴) پھر رسالت مآب نے جو "تعلیم توحید" عربوں کو دی اُسکو حالی نے اس خوبی سے ادا کیا ہے:۔

"کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق | زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق | اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ"

(۵) جو سبق قرآن مجید نے آپس میں محبت و ہمدردی کا سکھلایا اُسکو مولانا اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا | کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا | خلائق سے ہے جسکو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان
کہ کام آئے دنیا میں انسان کو انسان"

(۶) ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

"خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر | نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر"

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا ہوگا کہ مسدس "مد و جزر اسلام" کا ہر ایک لفظ اہل بصیرت کے لئے پند ونصائح کا لبِ لباب ہے۔ ہم اس کو ابتدائی زمانۂ تعلیم میں پڑھتے ہیں، عالمِ جوانی میں مطالعہ کرتے ہیں، انجمنوں اور سوسائیٹیوں میں سُنتے ہیں، کانفرنسوں میں بڑے بڑے قومی لیڈر اس کو سُنا کر جوش دلاتے ہیں، مولود خوانی میں راگ سے اور بغیر راگ کے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بار بار دُہرائے جانے سے کان بدمزہ نہیں ہوتے اور طبیعت اُکتا نہیں جاتی بلکہ شوق کو اور اشتعال ہوتا ہے اور دل میں بلا کا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ جب اسلام کے ادبار کی کیفیت سُنائی جاتی ہے تو سنگدل سے سنگدل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہتا اور جب اسلام کی ترقی و خوش اقبالی کا ذکر آتا ہے تو سامعین کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اس حیثیت سے یہ کتاب مسلمانوں

کے ترقی پذیر خیالات کا ایک مقدس مجموعہ سمجھی جا سکتی ہے۔
بعض شخصوں نے اس بے مثل مسدس پر اعتراض بھی کیا ہے۔ لیکن ان کے اعتراضات انصاف پر مبنی نہیں بلکہ آتش رشک کی جلن سے کئے گئے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی طرز میں خامہ فرسائی کر کے ناکام رہ گئے ہیں۔ آفتاب کے مقابل میں ذروں کا کیا شمار ہو سکتا ہے۔ قبولیت عام ایک خداداد نعمت ہے۔ جس کسی کو حاصل ہو گئی۔ ہو گئی۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگر حالی صرف اس مسدس ہی پر اپنی تصانیف کا خاتمہ کرتے تو بھی وہ ایک سچے قوم کے خادم اور طبقۂ اول کے شعرا میں گنے جاتے۔
فقط یہی نہیں بلکہ ان کی دوسری نظموں کو بھی بے حد مقبولیت حاصل ہوئی شکوۂ ہند اور بیوہ کی مناجات آج تک پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ حالی کا دیوان ایسے مضامین سے مالا مال ہے۔ دیوان میں بعض نظمیں قوم کی حالت پر لکھی ہیں بعض جگہ اچھوتے اور نئے خیالات کو شعر میں باندھا ہے مثلاً خود ستائی نفس پرستی۔ تعصب۔ خوشامد۔ حرص۔ بے اعتدالی وغیرہ مختلف مضامین پر نظمیں لکھی ہیں جو مولانا کی قابلیت کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ دیوان میں ص۔ ۱ قطعات، غزلیات قصیدے مرثیے ترکیب بند، تاریخیں، رباعیاں وغیرہ شامل ہیں جن کے پڑھنے سے حالی کا قادر الکلام ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بالخصوص اُن کی رباعیات زبان زد خاص و عام ہیں ان جدید طرز کی نظموں کو دیکھکر پرانی لکیر کے فقیر خواجہ حالی پر یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ آپ کو غزل لکھنا ہی نہیں آتا۔ آپ کا مقصد اصلاح قوم تھا اس لئے آپ نے اُن نکتہ چینیوں کی مطلق پروا نہ کی اور قوم کی بہبودی اور فلاح کے راستہ میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا اُن کے دیوان میں دو قسم کی غزلیات ہیں پہلی وہ غزلیں جو نئے خیالات اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد لکھی تھیں۔ دوسری وہ غزلیں جو ابتدا میں لکھی تھیں ان میں سے بعض غزلیں جو سادہ

مضامین سے پرہیز کیا - وہ اس دیوان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

" ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضایقہ ہوتا تھا - خود بھی جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لئے جس پر رہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا - قافلہ کا ساتھ، راہ کی ہمواری اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا - مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے - غزل و تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی " اور جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی - ہرچند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے - مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے "

چنانچہ عشقیہ غزل سے طبیعت سیر ہو چکی تھی - اُنہیں مضامین کے کھیتوں میں جہاں چڑیاں چگ چکی تھیں کیا خاک دھرا تھا سوائے اس کے اور کیا تھا کہ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو آپ بھی منہ میں چباتے رہیں اور خوش ہوں اس لئے مولانا حالی نے عشقیہ مضامین کو چھوڑ کر ایک بالکل جدید طرز اختیار کی چنانچہ کہتے ہیں :-

" مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بےخبر شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ

(باقی)

وزیر الممالک آصف جاہ نواب ابو المنصور خان بہادر صفدر جنگ

از

(حسن عابد جعفری صاحب آکسن - بیرسٹر ایٹ لا - اڈیٹر شمع)

نواب برہان الملک سعادت خاں مرحوم کے انتقال کے بعد اودھ کی صوبہ داری کے متعلق اہم پیچیدگیاں پڑ گئی تھیں - برہان الملک مرحوم نے اپنی صاحبزادی نواب بیگم صاحبہ کا عقد اپنے بھانجے مرزا مقیم سے کر دیا تھا اور مرزا کو اسی غرض سے نیشاپور سے ہندوستان بلایا تھا - نواب برہان الملک اپنے بھتیجوں کے عادات و اطوار سے خوش نہ تھے - اور غالباً اپنا جانشین مرزا مقیم کو بنانا چاہتے تھے مگر قضا نے مہلت نہ دی - اُن کا انتقال ہوتے ہی بھتیجوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور چونکہ ابھی تک نادر شاہ ہندوستان میں موجود تھا اور محمد شاہ بادشاہ دہلی کی حکومت برائے نام تھی اس لئے نثار محمد خاں مخاطب بہ شیر جنگ برادر زادہ برہان الملک نے طہماسپ خاں کے ذریعہ سے نادر شاہ کی امداد طلب کی مرزا مقیم سے اودھ کے اہل دربار خوش تھے - جس وقت یہ حال معلوم ہوا راجہ لچھمن نرائن پسر راجہ مرزا نرائن وکیل برہان الملک مرحوم نے بھی نادر شاہ کی خدمت میں مرزا مقیم مخاطب بہ صفدر جنگ کی جانب سے درخواست دی دی اور شیر جنگ کی ناقابلیت نواب مرحوم کی کشیدگی، اور صفدر جنگ کی اہلیت کے احوال کے علاوہ دو کرور روپیہ نذرانہ کا بھی وعدہ تھا - نادر شاہ نے دو کرور روپیہ لینے کے واسطے دہلی سے دو سو سوار بھیج دیئے اور محمد شاہ سے صفدر جنگ کی سفارش کر کے خلعت صوبہ داری بھجوا دیا - اور اس طرح صفدر جنگ صوبہ دار ہو گئے "

ایک روایت ہے کہ برہان الملک کے انتقال کے بعد اُن کا لڑکا جو چار یا پانچ سال کا تھا جانشین ہوا، اور صفدر جنگ اُس کے ولی مقرر ہوئے۔ مگر وہ بچہ عارضۂ چیچک میں یا زہر دینے کی وجہ سے فوت ہوگیا اور اُس کے بعد جھگڑے جو پیدا ہوئے اُن کو نادر شاہ نے بموجب واقعات مذکورہ بالا صفدر جنگ کے حق میں طے کرا دیا۔

صفدر جنگ نیک طبع اور ہوشیار تھے۔ تمام عمر نواب بیگم کے مطیع رہے۔ آرام طلبی اور عیش پسندی سے اُنکو نفرت تھا اور انتظام سلطنت میں زیادہ انہماک رہتا تھا ۱۱۵۲ھ میں صفدر جنگ کو خلعت صوبہ داری ملا اور ۱۱۵۴ھ میں اُن کو محمد شاہ کے حکم کے بموجب مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کی گوشمالی کی غرض سے روانہ ہونا پڑا کیونکہ مہابت جنگ نے نادر شاہ کے آتے ہی تیور بدل دیئے تھے اور ساڑھے تین کرور روپیہ سالانہ کی بجائے صرف ایک کرور روپیہ خزانہ دہلی میں داخل کیا تھا۔ مہابت جنگ دکھنیوں کے استیصال میں مصروف تہا اور اپنے ملک کی سرحد سے باہر پڑا ہوا تہا صفدر جنگ کی آمد کا حال سنکر گھبرایا ہوا بنگال واپس آیا صفدر جنگ کو اسی زمانہ میں بادشاہ دہلی کا حکم وصول ہوا کہ وہ بغیر جنگ کئے ہوئے اودہ کو واپس ہوجائیں اور ایک حکم مہابت جنگ کے پاس پہنچا کہ چونکہ تم ملک بنگال سے باہر تھے اور دکھنیوں کے حملہ کا احتمال تہا اسلیئے بہ نظر دوراندیشی صفدر جنگ کو لشکر کیساتھ بنگالہ کیطرف مصلحتاً بہیجا گیا تہا اب تم اپنے ملک میں واپس آگئے ہو اسلیئے صفدر جنگ کو واپسی کا حکم دیا جاتا ہے'' بادشاہ کا یہ فعل صفدر جنگ کو بہت ناگوار گذرا مگر مجبوراً واپس ہونا پڑا۔

محمد شاہ بادشاہ کا ایما تہا کہ نواب صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ مرزا جلال الدین حیدر کی شادی نواب موتمن الدولہ اسحٰق خاں بہادر کی دختر نواب بہو بیگم سے ہوجائے بہو بیگم بادشاہ کی گود یونکی کھلائی ہوئی تہیں اس لیئے اس شادی میں اُنکو خاص دلچسپی تہی نواب صفدر جنگ نے اس رشتہ کو منظور کرلیا۔ اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ۱۱۵۷ھ میں شادی ہوئی مورخین کا بیان ہے کہ چھیالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا نواب بہو بیگم صاحبہ کا نام امۃ الزہرا بیگم تہا ان کا وجود تاریخ اودھ میں خاص اہمیت رکھتا ہے جو آئندہ بیان ہوگا۔

سنہ ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ نواب صفدر جنگ شہزادہ احمد شاہ ولیعہد سلطنت دہلی کے ہمراہ اس معرکہ میں بمقام لاہور شریک ہوئے۔ اور انہیں کی ہمت اور لیاقت کا نتیجہ تھا کہ ایک نہایت اہم موقع پر جبکہ شاہزادہ احمد شاہ کی فوج ابدالی افواج کے سامنے آگئی تھی اور یقینی شکست کھائی، خلاف توقع کامیاب ہوگئی اور ابدالی فوج کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا۔ مگر اس معرکہ میں اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خان وزیر اعظم سلطنت دہلی اور نجم الدولہ[۱] محمد اسحاق خاں کام آئے اور خود نواب صفدر جنگ کی بائیں آنکھ تیر کا نشانہ بن گئی۔ جنگ سے فارغ ہو کر واپسی میں پانی پت میں قیام ہوا اور وہیں اطلاع ملی کہ محمد شاہ قضا کر گئے۔ نواب صفدر جنگ نے شہزادہ کو نذر پیش کی اور شہزادہ نے فرط جوش میں کہا "سلطنت بہ ما و وزارت بہ شما مبارک"

اسی زمانہ میں فرخ آباد میں فتنہ پیدا ہوگیا۔ اور سنہ ۱۱۶۱ھ میں علی محمد خاں رئیس افغانان کے انتقال اور ان کے بیٹے سعد اللہ خاں اور رئیس فرخ آباد قائم جنگ کے درمیان کشت و خون اور موخر الذکر کے ہلاک ہونے کی اطلاعیں وصول ہوئیں۔ نواب صفدر جنگ ان تعلقات کی بنا پر جو اُن کو علی محمد خاں سے تھے، فوراً دہلی سے روانہ ہو کر نواح فرخ آباد میں پہونچے اور قائم خاں کے بھائی محمد خاں کے بیٹوں کو گرفتار، اُن کے سات معتمد غلاموں کو قتل اور قائم خاں کی ماں کو فرخ آباد روانہ کر کے اپنی طرف سے قلعہ وار اور کوتوال مقرر کر دیئے اور قائم خاں کے دوسرے بھائیوں کو جن میں احمد خاں بھی تھا گذارا مقرر کر دیا اور اُس حصہ ملک کو جس پر بنگش افغان قابض تھے مہاراجہ نول رائے کی سپرد کر دیا کہ وہ اسکا انتظام کریں۔ اور خود دہلی واپس چلے گئے۔ نواب کی غیر موجودگی میں راجہ نول رائے اودھ کا بھی انتظام کرتے تھے سنہ ۱۱۶۲ھ میں احمد خاں برادر قائم خاں نے بغاوت کر دی اور فرخ آباد پر قبضہ کر لیا۔ راجہ نول رائے نے حملہ کیا مگر مارے گئے۔ راجہ کے انتقال کے چالیسویں دن

[۱] بعض مورخین کو نجم الدولہ کے انتقال سے انکار ہے ۱۲

نواب نے احمد خاں پر حملہ کیا لیکن نواب کو شکست ہوئی اور احمد خاں صوبہ اودھ اور الہ آباد پر بھی متصرف ہو گیا۔ اسی سال احمد خاں کے ملازموں اور لکھنؤ کے شیخ زادوں میں چھڑ گئی اور معزالدین خاں فاروقی ساکن لکھنؤ نے افغانوں کو اودہ سے نکال دیا نواب نے اسمٰعیل خاں کابلی اور راجہ ناگرمل وغیرہ کی رائے سے آپاجی دلہار راؤ ہولکر مرہٹوں سے جو کوٹہ میں خیمہ زن تھی امداد طلب کی۔ مرہٹوں نے ایک کروڑ روپیہ انعام کا ٹھرا کر نواب کی خاطر خواہ مدد کی۔ احمد خاں نے علی محمد خاں کے وارثوں سے صلح کر لی اور افغانوں کی دہ قوتیں مرہٹوں اور نواب کے آدمیوں کے مقابل ہوئیں مگر احمد خاں کو پسپا ہو کر کماؤں میں جا کر چھپنا پڑا، نواب نے محاصرہ کر لیا لیکن مرہٹوں نے صلح کرا دی دو آب میں سولہ محال احمد خاں کو اور افغانوں کا مقبوضہ بدستور علی محمد خاں کے رؤسا کو اور دو آب کا بقیہ کل حصہ نواب کو دلوا دیا اور خود پچاس لاکھ نواب سے اور پچاس لاکھ روپیہ افغانوں سے لیکر رخصت ہو گئے غرض علی محمد خاں افغان اپنی جگہ اور احمد خاں فرخ آباد پہ برقرار رہے۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی نے نواب کو خلعت عطا کیا اور بہت خصوصیت کا برتاؤ رکھا۔ مگر حاسدوں نے شکر رنجی کا موقع پیدا کرانے کی تدابیر شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ ایسا اتفاق ہوا کہ نواب نے بادشاہ کا ایما پا کر صاحب الزمانیہ اُدہم بائی والدہ بادشاہ کے خواجہ سرا کو دعوت کے بہانہ سے اپنے یہاں بلا کر قتل کرا دیا۔ خیال تھا کہ یہ فعل بادشاہ کی خوشنودی کا باعث ہوگا مگر صاحب الزمانیہ کو سخت ملال ہوا۔ اور بادشاہ بھی ان کی غمخواری میں شریک ہو گئے۔ اُدہر نواب سے صاحب الزمانیہ کو کد ہو گئی اور ادہر بادشاہ جو محض ناتجربہ کار اور ملازموں کی صحبتوں کے دلدادہ تھے نواب سے خلاف ہو گئے۔ مجبوراً نواب کو دہلی کی شہر پناہ کے باہر قیام کرنا پڑا بادشاہ نے شہر پناہ کے دروازے بند کرا دیئے تاکہ نواب کے ملازمین شہر میں نہ آسکیں۔ اور بعض امرا نے نواب کا مقابلہ کیا۔ نواب بہت پریشان ہوئے اور ایک معروضہ خدمت بادشاہ میں بھیجکر وجہ ملال خاطر دریافت کی اور نمک حراموں اور خوشامدیوں کی چالوں سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے خلعت بھیجا اور حکم

دیا کہ نواب بالفعل اودھ کو واپس جائیں یہی مناسب ہے۔

بادشاہ کے طرزِ عمل نے نواب کو بہت غمگین کر دیا وہ اودھ کو واپس تو ہوئے مگر بہت غمزدہ تھے کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ تورانیوں کے ہاتھوں عاجز آ گئے اور نواب سے امداد طلب کی۔ مگر نواب عارضۂ دُنبل میں گرفتار تھے معذور رہے اور اس مرض میں سنہ ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲ء پاپڑ گھاٹ نظامت سلطان پور میں رحلت کر گئے۔ نواب بیگم ہمراہ تھیں اُنہوں نے نواب کی موت کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور ہاتھی پر لاش کو لیکر فیض آباد چلی آئیں وہاں پہنچکر انتقال کی خبر چاروں طرف پھیل گئی نعش گلاب باڑی واقع فیض آباد میں سپرد رہی اور پھر کربلائے معلی بھیجدی گئی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نعش پہلے دہلی میں دفن ہوئی اور بعد کو کربلائے معلی بھیجی گئی۔

شذرات

میسور جس کے جلیل القدر وزیر اعظم امین الملک میرزا محمد اسمٰعیل صاحب بی اے - سی، آئی - ای - او، بی - ای - کی تصویر زیب شمع ہے، ہندوستان کی مشہور ریاست ہے، اور تاریخی حیثیت سے مہتم بالشان حیثیت رکھتی ہے، قدیم میسور کے شاہی خاندانوں کے حالات تاریخ ہند میں دلچسپ اور سبق آموز ہیں، اور اُن کے مطالعہ سے معاشرتی اور تمدنی ارتقار کا دلپذیر باب پیش نظر ہو جاتا ہے، لیکن موجودہ دور حکومت بھی ترقی اور امتیازات خصوصی کے اعتبار سے ملک کے لئے مایہ افتخار رہے، اور ریاست میسور کا شمار بہترین ریاستہائے ہندوستان میں ہے۔

بالخصوص تعلیم، صنعت و حرفت اور آئین حکومت کے سلسلہ میں تو ریاست مذکور نے ایسی روشن مثال قائم کر دی ہے کہ اُسکی پیروی ملک کی دوسری ریاستوں پر فرض ہے۔ ملک کے ایک مشہور اور مسلم الثبوت لیڈر نے کہا تھا، ہماری ریاستیں خوش نصیب ہیں کہ ان میں ریاست میسور شامل ہے، اور ریاست میسور خوش قسمت ہے کہ اُس کی باگ میرزا محمد اسمٰعیل صاحب سے کامل شخص کے ہاتھوں میں ہے،، ایسی جگہ جہاں تعلیم عام ہے اور ملازموں کی زبان تک انگریزی ہے اور عام طور پر علمی اور صنعتی ترقیاں ہو رہی ہیں دیوان کے عہدہ پر پہونچ جانا - ممدوح کی حسن لیاقت کی بیّن دلیل ہے، آپ نہایت جفاکش، زود فہم، سنجیدہ اور ہمدرد بزرگ ہیں - آپ کی روشن خیالی - وسعت نظر، اور گہری دلچسپی ایسی اعلیٰ صفات ہیں جن کو اہل ہندوستان نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا وسیع تجربہ، خوش خلقی، اور ملکی معاملات میں استغراق اور انہماک اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ اگرچہ آپ کو قلمدان وزارت حاصل کئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس قلیل عرصہ میں ریاست کے ہر شعبہ میں ایک نئی روح حلول کر گئی ہے، اور ہر

طرف ترقی اور اطمینان کی لہر نظر آتی ہے - آپ کی ذاتی شخصیت کا پرتو ہر محکمہ اور ہر صیغہ پر پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ اقتصادی اور سیاسی مشکلات ہر قدم پر نظر آتی ہیں، ریاست میسور شاہراہ ترقی پر استقلال کے ساتھ گامزن ہے، حضرت کو زبان اردو سے خاص اُنس ہے، اور اُس کی فلاح و ترقی میں آپ کو خاص دلچسپی ہے - یقین ہے کہ قارئین کرام اس امر سے خوش ہوں گے، اور دعا کریں گے کہ حضرت کا عہد حکومت کامیاب ہو، اور آپ کے فیض بخش ہاتھوں سے اردو کو مستفیض ہونا نصیب ہو، آمین،

ہم عنقریب آپ کے عہد حکومت پر مفصل تبصرہ کریں گے تاکہ قارئین کرام اُس کو شوق کے ساتھ پڑھ سکیں،

مولٰنا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی مرحوم اور جناب خان بہادر مولٰنا مولوی سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی مرحوم ادب اردو کے لئے مایۂ ناز ہستیاں تھیں، دونوں بزرگ مدت العمر اردو کی آبیاری میں مصروف رہے اور ادبی فیض کے چشمہ کو تادم مرگ جاری رکھا - مولٰنا شرر مشہور ادیب مورخ، اور ناول نویس تھے - عرصہ تک رسالہ دلگداز اُن کی ادارت میں شائع ہو کر ملک پر احسان کر چکا ہے، اُن کے مضامین دیگر رسالوں یا اخباروں میں کم نظر آتے تھے - مگر اُن کے علمی اشغال میں کبھی فرق نہ آیا تھا - ناول نویسی کو اردو میں بڑی حد تک انہیں نے کامیاب کیا تھا اور حق یہ ہے کہ اُن کے ناولوں کے بعض حصے ناول نویسی کے فن کے اعتبار سے بے مثل ہیں - تاریخی حیثیت سے بھی اُنکا پایہ بلند تھا - مگر ادیب کی حیثیت سے وہ ملک کے محسن تھے - اُنکا انتقال ایک سانحہ ہے اور زبردست نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں - ہم کو اُن کے صاحبزادے محمد صدیق صاحب مہتمم انجمن ترقی اردو سے دلی ہمدردی ہے - یقین ہے کہ موصوف بہت جلد مرحوم کی غیر مطبوعہ تصانیف کو شائع فرما کر اہل ملک کے دلوں میں مرحوم کی یاد تازہ کر دیں گے -

---

مولینا شاد مرحوم کے انتقال کے بعد ہی جناب شاد مرحوم کے صاحبزادے کی نجی تحریر کہ حضرت شاد انتقال کی خبر وصول ہوئی، مرحوم نے ۲۷ جنوری سنہ ۲۷ء کو پٹنہ میں رحلت فرمائی اور صوبہ بہار کی اردو شاعری کو یتیم کر گئے۔ مولینا مرحوم نہایت وضع دار اور صحبت یافتہ رئیس تھے ان کی تمام عمر شعر و شاعری اور ادبی تحقیقات میں صرف ہوئی۔ شاعری میں کوئی صنف ایسی نہ تھی جس میں مرحوم کو ید طولیٰ نہ رہا ہو۔ وہ بے مثل غزل گو تھے۔ نہایت پاکیزہ مرثیے کہتے تھے، اور اصلاح دینے میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ اگرچہ مرحوم کو عمر طبعی ملی۔ لیکن جو ناقابل تلافی نقصان ان کی وفات سے اردو شاعری کو پہونچ گیا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جنہوں نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ مرحوم نے میر انیس، و میر نفیس کی آنکھیں دیکھیں تھیں اور عرصہ تک اُنسے مشورۂ سخن کیا تھا۔ اخیر میں جو تحریرات مرحوم نے ہم کو بھیجیں تھیں اُنسے مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے اسقدر جلد اُٹھ جائیں گے۔ باوجود پیرانہ سالی کے اُن کے اوقات عزیز کا زیادہ حصہ تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا تھا۔ مولنا ایک گرانمایہ مورخ بھی تھے اور صوبہ بہار کی تاریخ تصنیف فرما رہے تھے۔ اُن کے شاگرد رشید جناب قیس نے اُن کے مختصر سوانح عمری "گلشن حیات" حال میں تصنیف فرمائی تھی اور ہم نے اُسپر ریویو کرتے ہوئے رسالہ شمع میں اہل بہار کو توجہ دلائی تھی کہ وہ مرحوم کی جامع اور مکمل سوانح عمری لکھیں کیونکہ مرحوم کی سوانح عمری کم و بیش ساٹھ ستر برس کی بہار کی تاریخ ہو گی۔ لیکن افسوس ہے کہ آج ہم مرحوم کا ماتم کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ زندہ دلان بہار مرحوم کی مبسوط سوانح عمری کو بہت جلد شائع کریں گے۔ اور اس طرح پر اُن کے وسیع اخلاق اور کمالات کو موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دیں گے۔ ہم مرحوم کے صاحبزادے جناب سید حسن خانصاحب اور مرحوم کے خویش جناب مولوی سید جعفر صاحب بی۔ اے ال۔ ال۔ بی وکیل لکھیم پور کھیری کی خدمت میں دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ خدائے کریم مرحوم کو جنت اور اُن کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ ہز اکسیلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر یمین السلطنت جی سی، آئی، ای نے پانچ ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم ہمارے لایق ددست نواب مسعود جنگ بہادر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن حیدرآباد کی معرفت انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کو مرحمت فرمائی ہے۔

انجمن اس عطیہ کی مستحق تھی - اور وہ مفید کام کر رہی ہے - مہاراجہ صاحب بہادر کی علمی فیاضیاں ملک پر روشن ہیں، آپ اردو میں کامل ادیب، باکمال شاعر اور مشہور صاحب تصنیف ہیں، آپ کی محترم ہستی ہندوستان کے لئے مایۂ افتخار ہے - آپ ادب اردو کے زبردست محسن - اور تصوف کے اعلیٰ حامی ہیں - فارسی کلام بہت دلکش ہے اور تاریخی مذاق کی بلندی آپ کی تصانیف سے ظاہر ہے، ہم عنقریب آپ کی تصانیف پر ریویو کرینگے آپ کا تاریخی مضمون ستمبر ۱۹۲۶ء کے رسالہ شمع میں مع عکس مبارک کے شائع ہو کر قارئین کرام سے داد تحقیق لے چکا ہے -

---

سال گذشتہ میں جناب آنریبل رائے جیشور بلی صاحب بی اے وزیر تعلیمات صوبہ ہذا کی سفارش پر گورنمنٹ صوبہ ہذا نے انڈین اکاڈمی کے لئے پچیس ہزار روپیہ سالانہ دینا منظور کیا تھا۔ اب یہ اکاڈمی رجسٹر ہو رہی ہے، ہمارے محترم، اور اردو کے حامی سر تیج بہادر سپرو صاحب ام۔اے ال ال، ڈی کے سی آئی ای - ایڈوکیٹ، الہ اباد اس کے پریسیڈنٹ، اور ہمارے معزز عنایت فرما جناب ڈاکٹر تاراچند صاحب اس کے سیکرٹری ہیں، ڈاکٹر صاحب کو اردو سے خاص شغف ہے، اکاڈمی میں جناب وزیر صاحب تعلیمات، اور ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم صوبہ ہذا کے علاوہ غالباً ۲۵ میمبر ہوں گے - یقین ہے کہ وہی حضرات میمبر ہوں گے جو انڈین اکاڈمی کے فرائض کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور حق شناس کو فرض سمجھتے ہیں -

آنریبل رائے صاحب کی کوشش لایق تشکر ہے، اور ہم کو دلی مسرت ہے کہ یہ مفید

تحریک دو نہایت ہمدرد، آزاد خیال، اور سچے بہی خواہان ملک کے مقتدر ہاتھوں میں ہے۔ یقین ہے کہ تحریک کامیاب ہوگی اور ایسے لوگوں کی اعانت کرے گی جو علمی اور ادبی خدمات کرنا چاہتے ہیں، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے کوئی نمایاں کام نہیں کر سکتے ہیں۔

محمود غزنوی

جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، ایم۔آر۔اے۔ایس ممبر لیجسلیٹو کونسل پروفیسر تاریخ و سیاسات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ (اڈیٹر شمع)

کا معرکتہ الآرا رسالہ "محمود غزنوی" مہذب دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔ اس مضمون کا ترجمہ جناب پروفیسر سید جمیل حسین صاحب ایم۔اے (علیگ) نے نہایت خوش اسلوبی کیساتھ کیا ہے اور ترجمہ شمع میں شائع ہو چکا ہے، چونکہ یہ مضمون کئی نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوا ہے۔ اور احباب کا اصرار ہے کہ اسکو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ اس لئے ہمنے اس کی اشاعت کا انتظام کیا ہے تاریخی حیثیت سے اس مضمون کا جواب نہیں ہے اور ایک مستقل کتاب ہے تاریخ کے شائقین کو صلائے عام ہے کہ وہ اس نفیس تاریخی تحقیقات سے لطف اندوز ہوں۔ چونکہ کتاب نظر ثانی کے اور دیباچہ و ضروری حواشی سے مزین ہو کر شائع ہو رہی ہے اس کا حجم زیادہ ہو جائے گا۔ اس لئے قیمت عہر رکھی گئی ہے لیکن جو حضرات اخیر اپریل ۱۹۲۶ء تک عہ بذریعہ ٹکٹ یا بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے اُن کی خدمت میں کتاب مفت روانہ کی جائے گی۔ اور چونکہ مانگ زیادہ ہوگی اس لئے سختی کے ساتھ اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ جو آرڈر پہلے وصول ہونگے سب سے پہلے انہیں کی تعمیل ہوگی۔

المشتہر

منیجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ

تبصرہ

نیرنگِ جمالؔ

ازمولوی محمد معین الدین انصاری، بی اے کینٹب۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ بیرسٹرایٹ لا

نیرنگِ جمال مولانا احمد علی شوقؔ قدوائی مرحوم کی اُن چند دلآویز نظموں میں ہے جن میں حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں بے ساختہ اور فطری پیرایہ میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ امر کہ شاعر اس سعی میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے قارئین کے فیصلے کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ اس نظم کی بعض خوبیوں پر سطور ذیل میں روشنی ڈالی جائے گی۔

قصہ یہ ہے کہ ایک خوش رو نوجوان لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا کہ اوسکی نگاہ ایک دوشیزہ نازنین پر پڑی جو کسی ٹرین کے زنانہ درجہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کا دوچار ہونا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ مگر موقعہ نہ تھا کہ ایک کو دوسرے سے واقف ہونے کی نوبت آتی۔ ٹرین چلی گئی اور عاشق و معشوقہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔

یہ کوئی نیا افسانہ نہیں۔ وہی عشق کا دکھڑا ہے جسے لاکھوں شعرا اور فسانہ نگار اپنی اپنی زبان میں آپ بیتی یا جگ بیتی کہکر سناچکے ہیں۔ مضمون ایسا ہے کہ ایک شعر بلکہ ایک مصرع میں ادا ہوسکتا ہے۔ مگر شاعر جو سب کا راز داں اور بصیرتِ خداوندی کا حصہ دار خلق ہوا ہے واقعاتِ عالم کے ہر پہلو کو طرح طرح سے دیکھتا ہے اور طرح طرح سے ادا کرتا ہے۔ اسکی کامیابی یہ ہے کہ نقل کو عموماً اصل سے زیادہ رنگین اور مؤثر کرکے دکھائے۔ اور نفس الامر کا ایک ایسا فطری ماحول پیش کرے جو اکثر قرینِ قیاس اور تمام تر مصورانہ نگاہ کا مرتب کیا ہوا ہو۔ اسی قسم کی کہانیاں اور نظمیں وغیرہ ہوتی ہیں جو مختلف قوموں اور زمانوں کے طرزِ تخیل اور

معاشری حالات کا پتہ مورخین عالم کو دیتی ہیں ورنہ زمانہ کے رسم و رواج اور معاشری کیفیات کو قلم بند کرنے کے لئے کسی عہد میں کوئی قوم کوئی مخصوص اہتمام نہیں کرتی کہ آئندہ کے مورخ اوس سے مستفید ہوں۔

حضرت شوق مرحوم اردو کے بہترین ادیبوں میں تھے جنہوں نے اگر ایک طرف روایتی شعر گوئی کو معراج کمال پر پہنچایا تو دوسری طرف پرانی لکیر کو چھوڑ کر سرزمین اردو میں ایک نئی عمارت کی بھی داغ بیل ڈالی اور اس عمارت کی بنیاد میں غالباً ابھی ایک خشت زریں ہے۔ اس کام کو آگے بڑھانا آنے والوں کا کام ہوگا۔

اس نظم میں شاعر نے بجائے کسی خارجی فضا دکھانے کے کسی میدان کارزار کا نقشہ پیش کرنے یا کسی مافوق الفطرت باتوں کو سامنے لانے کے ہماری معاشری دنیا سے ایک دردناک منظر اخذ کیا ہے۔ اس میں باوجود موجودہ رسم و رواج کی جکڑ بندیوں کے ایک موقع دفعتاً ایسا آتا ہے کہ عشق کا دریا اپنے جوش کا اظہار کر دیتا ہے اور پھر آن کی آن میں طرفین فراق دوامی کی تاریک فضاؤں میں غائب ہونے لگتے ہیں۔ ہمارے ملک کی دلیس پردہ دار دنیا میں اگر یہ واردات ممکن ہو تو صرف اسی طرح اور شرم و حیا اور رسم و رواج کے پہلوؤں پر نظر کیجئے تو اسکا انجام بھی قدرتاً وہی ہے جو شاعر نے پیش کیا ہے۔ اس مرقع محسوسات میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری مصنوعی عادات اور معاشری توقعات کی یہ کڑی زنجیریں فطرت انسانی اور ہوس انتہا جنسی پر کس حد تک غالب ہیں اور پھر بھی کم از کم اپنے عالم تنہائی اور دبستان خیال میں پھر بھی کس قدر آزاد اور خود نما ہوتا ہے یہاں واقعات و حالات سے شاعر کو کچھ تعلق نہیں کہ ہماری معاشرت میں کوئی تغیر ہونا چاہیے یا نہیں۔ نہ اس سے واسطہ ہے کہ زمانہ شباب میں انسان کو کن اصولوں کا پابند ہونا چاہیے یہاں غرض صرف اس سے ہے کہ چند مقررہ حالات میں جذبات عشق و محبت کیونکر پیدا ہوتے ہیں اور آن کے جزئی خصوصیات کیا ہیں۔

مصنف کی دوسری نظموں کی طرح یہ نظم بھی نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ جہاں تک صحت زبان اور تحقیق

اوقات محاورات کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ شوق مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے انکا سا وسیع النظر، جہاں دیدہ
اور تجربہ کار محقق پیدا ہونا دشوار ہے جس زبان میں وہ نظم کرتے تھے وہ زبان پچاس برس قبل کے لکھنؤ
کی ہے یعنی جب لکھنؤ مردہ تھا - چنانچہ انکی زبان اسی زمانہ کی خصوصیتوں کو لئے ہوتے ہے - انکے
بعض الفاظ اور ترکیبیں بیشک ایسی ہیں جو ہم کو انوکھی اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس بات کو ہمیں
انکی قدامت پسندی کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیے بلکہ اسے اکثر اُن کی تحقیق پسندی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے
اور انکی ذاتی رائے پر محمول کرنا چاہیے مثلاً حرف "کو" کا استعمال انکی نظم و نثر میں معمول سے زیادہ
پایا جاتا ہے اگر کہنا ہو کہ "میں لکھنؤ جاؤنگا" تو وہ اکثر "میں لکھنؤ کو جاونگا" کہتے تھے - اور اسی کو فصیح خیال
کرتے تھے بلکہ بعض اوقات اس "کو" کے استعمال سے بعض اہم فروق کیطرف اشارہ کر دیتے تھے مثلاً
"سر کو جھکانا" کے معنی صرف سر کو جھکانا جو ایک معمولی بات ہے مگر انکے نزدیک اسکے مقابلہ میں "سر جھکانا"
محض تسلیم خم کرنیکے معنی میں استعمال ہونا چاہیے - اسیطرح مصنف نے لفظ "دیدہ" بھی کثرت سے
استعمال کیا ہے جو ہم کو بعض اوقات بیجا معلوم ہوگا - مگر مصنف نے اسپر بہت زور دیا ہے کہ اردو میں "دیدہ"
سے مراد صرف آنکھ کے ڈھیلے کی سپیدی لیجاتی ہے - معلوم نہیں زبان اس قسم کی تحقیق سے کہاں تک
فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہوگی اور مرحوم کی جفاکشانہ زندگی کے جو ساٹھ سال انہیں مشاغل تحقیقی میں
گذرے اسکی داد اُنکے بعد ملنے کی کچھ توقع ہو سکتی ہے یا نہیں -

یہ نظم اصل میں تین نظموں کا مجموعہ ہے اسکا پہلا جزو رسالہ "ادیب" (فروری ۱۹۱۱ء) اور دوسرا اور تیسرا
جزو "الناظر" (نومبر ۱۹۱۱ء و جنوری ۱۹۱۲ء) میں نکلا تھا لیکن مصنف نے اسکے بعد ان اجزا پر نظر ثانی کی اور
بہت کچھ رد و بدل کیا اور اب یہ گویا بالکل ایک نئی چیز ہے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اسکے ہر جزو کی بحر
الگ ہے - چار رنگ، دکھاتے گئے ہیں جنمیں ہر رنگ کی بحر اسکے مضمون کے لحاظ سے نہایت موزوں
رکھی گئی ہے بلکہ نشست الفاظ بھی اکثر اسی خیال کی پابند ہے - دوسرے دو رنگ "البیلی قربانی" کی ترتیب
ہماری زبان میں ایک نیا نمونہ ہے - بحریں بھی وہ ہیں جنہیں ہمارے شعرا آجکل گویا ترک کئے ہوئے ہیں
حالانکہ ان بحروں کی روانی ایک خاص چیز ہے -

اس نظم میں شاعر کی کہنہ مشقی اور قادرالکلامی کا ثبوت بھی قابل ملاحظہ ہے۔ نازک اور مشکل مطالب کو کس صفائی اور سلاست سے ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ۵ عشق اور حسن کی جب نگاہیں ملگئیں ٭ دو دلوں میں کی چار راہیں ملگئیں عاشق ناکام اپنی نارسائی کی شہادتیں لاتا ہے ۵ یہ وحشت یہ زمیں اور رہگذر کو اصبے ٭ بلیوں آنکھیں کھوئے ہیں نظر گواہ ہے اور بیبس لڑکی اپنی داستان کہتی ہے ۵ یہ ترتیب بدن کی ظاہر کہ نگیں اچھل رہی ہیں ٭ جو جہک رہی ہیں پلکیں تو یہ ہاتھ مل رہی ہیں

کہ نظر کے بس میں آکر وہ نکل گیا نظر سے

یہ آخری مصرعے کتنی جدت اور عمدگی سے نظم ہوئے ہیں۔ کلام پر قدرت ظاہر ہے۔

استعارے اور تشبیہیں بھی بعض جگہ عجیب ندرت سے نظم ہوئی ہیں جس چیز کو جدید طرز کی شاعری کہتے ہیں اُسکا مقصد یہی ہے کہ شاعرانہ تخیل کو روایات کے شکنجے سے چھڑایا جائے۔ اسکی نظیر ذیل کے مصرعے ہیں۔

گیسوؤں کے سلسلے گالوں سے ملے ہوئے	لال لال پھول دو بیلوں میں کھلے ہوئے
کچھ لٹیں کھلی ہوئی تہیں جبین صاف پر	چھوٹی چھوٹی ناگنیں تھیں زمین صاف پر
آنکھ سے نکلتی تھی وہ نگاہ اس طرح	مست کی زباں سے نکلے بات جس طرح

اس آخری شعر میں بلا کی تشبیہ ہے۔ مستی کیحالت میں انسان اٹک اٹک کر بات کرتا ہے۔ اوسکی زبان بولنے میں رکتی اور لڑکھڑاتی ہے۔ یہاں آنکھ کی مستی، نیم بازی، اور غالباً کسی قدر شرمیلے پن کیطرف اشارہ ہے۔ نگاہ کا ہر کر نگاہ سے رک رک کر نکلنا یعنی اوسمیں تسلسل اور استقلال کا نہ پایا جانا (جو بے اختیاری حسن کیطرف اشارہ ہے) ایک نہایت دلکش کیفیت پیش کرتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ یہاں آنکھوں کی مستی کا اثر نگاہ تک میں پایا جاتا ہے جو ایک پُر لطف مبالغہ ہے۔

تیسرے "رنگ" میں جنگل کا منظر بڑی روانی اور خوبی سے نظم کیا ہے۔ اسکا لطف بھی اشعار کو روانی کیساتھ پڑھنے سے ہے اور اس "رنگ" میں جو بحر اختیار کیگئی ہے اوسکے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ الفاظ بھی قریب قریب وہ جمع کئے ہیں کہ اصلی منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ مثلاً:-

بہت گری ہے اوس شب کو ہیں درخت جس سے تر	ٹپک رہی ہیں ٹپ ٹپ اُسکی بوندیں اب زمین پر
اُدھر وہ بیلیں اور ادھر پیڑوں کی قطار ہے	یہ چھپارہے ہیں[۱] پھول لالے کی بہار ہے

یہ متفرق مثالیں بلا تخصیص پیش کی گئیں مگر اس نظم کی جو خصوصیت معاملہ بندی اور ایک ایک ادا کو ظاہر کرنا ہے اور جذبات کی ترجمانی جسطرح کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھکر کی گئی ہے اُسکا اندازہ صرف مسلسل پڑھنے سے ہو سکتا ہے۔ خاص کر "آخری پیام" جو ناکام محبت اور اسیر قفس کیطرف سے ہے اُسکو پڑھنے پڑھتے جب اِن پُر درد الفاظ پر پہنچیے تو اثر آفرینی اور درد کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

۱ھ مصنف کی تحقیق ہے کہ چھپانا (بضم اول وسوم) سُرخ منظر کیلئے آتا ہے۔ سبزہ زار کیلئے لہلہانا بولتے ہیں اور اگر زرد منظر ہو جیسے گیندے کا تختہ تو اُسکی تعریف میں ڈہڈہانا کہیں گے۔

کہ ہے زخم میرے دل میں ترے غم کے نیشتر سے ٭ نوٹ - قیمت ۸ ملنے کا پتہ - خان بہادر شیخ رضی الدین صاحب بیرسٹر گونڈا اودھ

مندرجہ بالا تبصرہ فی الواقعہ مقدمہ ہے



آصف جاہ وزیرالممالک نواب شجاع الدولہ جلال الدین
حیدر خان بہادر — شجاع الملک

Shaugah ud Dowla
Jalal uddin Haider Khan Bahadur
Shaugah ul Mulk

جلد ۵ فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء نمبر ۳

تصویر } آصف جاہ وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خاں بہادر شجاع الملک

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کے لئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا اگر آپ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کی جائیگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون ۲۷ء تک جو بہترین افسانہ وصول ہوگا اس کے معاوضہ میں چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر آپنے کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپکو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اس کی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائیں گی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپ کی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اس پر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ

جو مضمون، افسانہ، ناول، نظم یا غزل ناپسند ہوگی وہ ارکا ٹکٹ آنے پر واپس کردی جائے گی البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے بہ احتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپکا کلام شائع ہوگا، بلالحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جاوے گا۔

مطبوعات جدید

جو ۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، اُن پر دو انعامات ہیں۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجیں گے، اور

(۲) دوسرا انعام حسب تجویز کمیٹی اُن کو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائیں گے۔

خادم **منیجر شمع**

شمع

ماہ مارچ ۱۹۲۷ء

منشی ذکاءاللہ مرحوم دہلوی

(از مسٹر سی - ایف - اینڈریوز)

ذیل کا مضمون مسٹر اینڈریوز نے منشی ذکاءاللہ مرحوم کے انتقال کے بعد ہی لکھا تھا اسوقت ڈاکٹر نذیر احمد زندہ تھے۔ لیکن بعد میں مسٹر موصوف نے اس خیال سے اسے شائع نہ کیا کہ جب "منشی صاحب مرحوم کے حالات زندگی کتابی صورت میں مرتب کرینگے تو اسے بطور ضمیمہ شائع کردیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون ابتک شائع نہ ہوسکا۔ اب مکمل حالات زندگی کتابی صورت میں جمع ہوگئے ہیں اور جہاں ایک طرف وہ مشہور انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں ماہ بماہ شائع ہوچکے ہیں وہاں دوسری طرف ان کا ترجمہ اردو کے مشہور رسالہ "زمانہ" میں بھی ماہ بماہ شائع ہوچکا ہے۔ جو مضمون اب

"شمع" میں شائع ہو رہا ہے وہ بعد میں اردو کتاب کا جز و بنا دیا جائے گا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ کتاب زیادہ سے زیادہ ۱۹۲۷ء کے وسط تک شائع ہو جائے۔

مسٹر اینڈریوز منشی صاحب کے مخلص دوستوں میں سے ہیں اور قائین کرام مضمون سے اس محبت اور عقیدت کا اندازہ لگا سکیں گے جو اول الذکر کو موخر الذکر سے تھی اور ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی

ہندوستان میں انیسویں صدی پر کسی قسم کا تبصرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اس میں ایک نہایت اہم حقیقت کو یعنی اس ذہنی جمود کو شامل نہ کیا جائیگا جس نے کچھ عرصہ تک اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں مسلمانوں کی قومی ترقی کو روکے رکھا۔ ہندوستان کی دیگر اقوام سے مقابلہ میں مسلمان ہی سب سے زیادہ مایوس تھے۔ جس شک و شبہ کی نظر سے انگریز انہیں اسوقت دیکھتے تھے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیڈروں کی اسپرٹ کو کچلا جا رہا ہے۔ اسوقت صرف ردِ عمل کی آوازیں بلند کیجا رہی تھیں۔ اس طرح سے کئی قیمتی سال گذر جانے کے بعد تحریک علیگڈھ کی ابتدا کی گئی لیکن اس نے بھی باوجود اس حقیقت کے کہ وہ بہت شد و مد کے ساتھ شروع کی گئی تھی۔ ابتدا میں مسلمانوں کے صرف محدود طبقہ پر اپنا اثر ڈالا۔ عرصہ دراز تک مغربی تعلیم اکثر مسلمانوں کے لئے نفرت انگیز چیز رہی۔ غالباً یہ کہنا بجا ہوگا کہ ۱۱-۱۹۱۰ء تک ترقی کی جانب لیجانے والی کوئی عام تحریک موجود نہ تھی۔

جو بیداری حال میں پیدا ہوئی ہے اس نے اس خیال کو حیرت انگیز طریقہ سے غلط ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں سیاسی تحریکیں دوسری سمتوں میں ترقی کو روک دینے کا باعث ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری سیاست کی رہین منت رہی ہے۔ لیکن جیسا کہ اکثر اوقات ہوا ہے سیاسی ترقی تیزی کے ساتھ ذہنی جدوجہد میں مبدل ہو گئی ہے۔ سیاسی لہروں کے مدنے اس تعلیمی جمود کو جو اتنے عرصہ سے غیر متحرک رہا ہے بہا کر دور پھینکدیا ہے اور اب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں نمایاں ترقی ظہور میں آچکی ہے۔

انجام کار سارے ہندوستان کو اسلام کی موجودہ ترقی کرنے والی تحریک سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے بشرطیکہ دانشمندانہ اور فیاضانہ طرز عمل اختیار کیا گیا اور جدید تعلیم سے تمام وکمال استفادہ حاصل کیا گیا۔ بمقابلہ دوسرے اسباب کے سب سے زیادہ ایک چیز نے ہندوستان کی دو عظیم الشان قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کو خطرے میں ڈالدیا ہے اور وہ چیز جہالت ہے، اس لئے کہ جہالت (جہاں کہیں بھی وہ پائی گئی ہے) غیر بردباری کی ماں ثابت ہوئی ہے۔ جب تک ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی جمود رہا اس وقت تک اس امر کا احتمال تھا کہ عدم مفاہمت باہمی بدمزگی اور بے اعتمادی کا باعث ہوگی اور یہ کہ ان عناصر کے باہمی اتصال کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام میں استبداد کی اسپرٹ عام ہو جائیگی۔ اب جبکہ مسلمانوں کی قوتیں دانشمندانہ رہبری کی بدولت تعلیمی جدوجہد کی جانب منعطف کر دی گئی ہیں ہر شخص کو جسے ہندوستان سے کچھ بھی محبت ہے، یہ امید پیدا ہوگئی ہے کہ اس خطرہ کا تدارک ہو جائے گا۔ دنیا کے ہر ملک میں رہنمائی کا کام نسبی یا نسلی سیادت سے ہٹ کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آرہا ہے جو ذہانت کی سیادت رکھتے ہیں اور جب لازمی تعلیم عوام تک پہنچ جائے گی اس وقت سیادت کی تبدیلی یقینی ہے۔ ہندوستان میں پُرامن انقلاب کا انحصار کسی اور عنصر کے مقابلہ میں صرف تعلیم کی ترویج پر ہے۔ اور یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قوم جو بہت ہی پسماندہ ہے، تلافی مافات کرے۔

اسلامی تہذیب و ترقی کی نشو و نما جن اصولوں اور اسباب پر مبنی تھی ان پر مناسب غور و خوض کرنے سے بھی مقصد برآری ہو سکتی ہے۔

ان اصولوں میں سے ایک اصول جس پر قرآن مجید میں بھی زور دیا گیا ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں پر فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ علم کی تحصیل کریں خواہ علم چین ہی میں کیوں نہ پایا جائے[۱]۔

---

[۱] فاضل مضمون نگار نے غلطی سے حدیث کو قرآنی آیت سمجھ لیا ہے۔ (مترجم)

اسی اصول کی مطابقت میں تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ بن گیا ہے کہ جب کبھی اسلامی تہذیب کسی دوسرے ذہنی ماحول سے دوچار ہوئی ہے اس کا نتیجہ لازمی طور پر ترقی اور روشنی کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

شاًلاً عربوں کا ایک جانب بازنطینی تہذیب اور دوسری جانب ایرانی تمدن کے ساتھ تعلقات رکھنے کا یہ اثر ہوا کہ عربوں کے تہذیب و تمدن کو قابل یادگار ترقی نصیب ہوئی۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ اور علوم و فنون کے بہت سے خزانے دنیا کے بزرگ ترین خلفا کے ترقی پرور عہد حکومت میں دمشق اور بغداد کے علما و فضلا کے جوش، جد و جہد اور وسیع الخیالی کی ہمہ گیر اسپرٹ کے باعث آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لئے گئے۔ اور جب تک ان کی طاقت قائم و برقرار رہی اس وقت تک بردباری اور آزاد خیالی کی وسیع راہیں ذہنی ترقی کے لئے کھلی رہیں۔

آل عثمان کے زبردست سلاطین کے عہد حکومت سے بھی جو ۱۴۵۳ء میں سقوط قسطنطنیہ کے بعد سے شروع ہوا، دوسری مثال اخذ کیجا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں دول یورپ کے ساتھ ترکوں کا جو تعلق پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں باہمی مفاہمت رونما ہو گئی اور معاشرتی آزادی کی روح وسیع تر ہو گئی۔ بلاشبہ یہ امر اس فوجی فتح سے کم حیرت انگیز نہ تھا جس کے باعث وہ تعلق پیدا ہوا۔ پروفیسر بوری رقمطراز ہے کہ "ساری عیسائی دنیا میں اس زمانہ میں غالباً کوئی حاکم ایسا نہ تھا جو سلطان سلیمان کی طرح انصاف کرنے کی غیر تصنع آمیز خواہش یا سچا ارادہ رکھتا ہو"

مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ہندوؤں کے تہذیب تمدن کے ساتھ آمیزش کی داستان بھی اسی تاریخی سبق کو پیش کرتی ہے۔ اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کی ترقیاں مغلیہ حملہ آوروں کی نوخیز قوت اور زندگی بخش طاقت کے مقابلہ میں قدیم ہندوستانی تہذیب کے ملاپ کی کچھ کم رہین منت نہ تھیں۔ اس زمانہ میں ذہنی ترقی اطراف و اکناف

میں پھیل گئی تھی اور مذہبی بردباری کا ہر جگہ دور دورہ تھا۔

اس اہم نکتہ کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ امر مسلمہ ہے کہ جہاں کہیں اسلام جدید علوم وفنون کی شاہراہ پر گامزن ہوا وہاں اس نے اپنے ماحول سے مناسبت اور مطابقت کرنے کی اُن قوتوں کا اظہار کیا ہے جو آزاد خیالانہ ترقی کی سچی دلیل ہیں۔

حضرت محمدؐ (صلعم) نے جو حکم اپنے متبعین کو دیا تھا یعنی یہ کہ "علم کی تلاش کرو جہاں کہیں وہ بھی پایا جاسکے"، اس کی دانشمندی تجربہ سے ثابت ہوگئی ہے۔ جب کبھی اس حکم کی وسیع مطابقت کی گئی ہے اسلام بے انتہا ترقی کی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی وسیع ترقیاں اس کی شاندار جنگی فتوحات کے بعد عمل میں آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیان اسی کے ابتدائی زمانہ پر بالکل صادق آتا ہو۔ لیکن اس کے سارے زمانوں پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ اور کم سے کم آج تو بالکل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً جو تحریکیں ہم اسلام میں ہر جانب دیکھ رہے ہیں خواہ وہ ٹرکی میں ہوں یا ایران میں، ہندوستان میں ہوں یا شمالی افریقہ میں، وہ کسی عظیم الشان فوجی کارنامہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ تر تعلیمی تحریک کا ماحصل ہیں جسکا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم وفنون کو اپنے میں جذب کیا جائے۔

کئی برس ہوئے مجھے کیمبرج میں جدید ترکی انقلاب کے ایک لیڈر کے ساتھ گہری ملاقات کرنے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ تمام تحریک کی تہ میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ مغربی علوم وفنون کی آزادانہ قبولیت اور انجذاب ہے۔ انکا شمار ان سچے مسلمانوں میں ہے جن سے میری کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ میری ان سے ملاقات ایسے زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ وہ پناہ گزین کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم تھے اور جبکہ ٹرکی میں کسی انقلاب کے امکان یا اس ملک میں اسلام کی کسی اصلاح کے خیال سے بڑھکر اور کوئی بات مایوسانہ نہ ہوسکتی تھی۔ لیکن اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے شخص کی حیثیت سے

وہ اس عظیم الشان اصول پر سختی سے جمے رہے اور اپنی تحریرات کے ذریعہ اُنھوں نے اُن لوگوں میں بھی وہی روح پھونک دی جو اُن کی تعلیمات کے (جن کی تہ میں مذکورہ بالا اصول کام کر رہا تھا) پیرو تھے۔ واقعات نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ان کی تشخیص صحیح تھی اور یہ کہ جس علاج کی اُنھوں نے جا و بیجا تلقین کی تھی وہ ناکافی نہ تھا۔

اسلام کے ترقی کے ساتھ جو گہری دلچسپی مجھے ہوئی اس کا بیشتر حصہ منشی ذکاء اللہ کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے، یہاں تک کہ جن خیالات کا اظہار میں نے اوپر کیا ہے انھیں بھی انہی کے خیالات کی خوشہ چینی سمجھنا چاہئے۔ ان کی پوزیشن کو واضح کرنے کی غرض سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔ وہ دارالسلطنت دہلی میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سالہائے دراز سے اُن کا خاندان آل تیمور کے شاہی گھرانے کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نگران و ذمہ دار تھا۔ انھوں نے تہذیب و شائستگی کی اعلیٰ روایات کو جو عہدِ مغلیہ کے ابتدائی دور سے اُنھوں نے ورثہ میں پائی تھیں، جوں کا توں برقرار رکھا۔ نوعمر ذکاء اللہ کو قدیم دہلی کا وہ زمانہ یاد تھا جبکہ اس پر مغربی تہذیب کا اثر نہ پڑا تھا۔ ان کی زندگی کی مابعد کی روش اور ان کے بڑھاپے کے اعتقادات کا خیال کرتے وقت ضروری ہے کہ اس واقعہ کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

نوعمر لڑکے کی والدہ دہلی کی نہایت مشہور خواتین میں سے تھیں۔ وہ بہت عقلمند اور کیرکٹر کی مضبوط تھیں اور اپنے بچوں کی نہایت شفقت مگر سختی کے ساتھ رہنمائی اور نگرانی کیا کرتی تھیں۔ ذکاء اللہ ان کے بغایت درجہ شکر گزار تھے اور محسوس کرتے تھے کہ وہ فرض شکر گزاری سے کبھی عہدہ برآنہ ہو سکیں گے۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اپنے انتہائی بڑھاپے کے عالم میں جب کبھی وہ اپنی مادرِ مہربان کا ذکر فرماتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ تمام عمر وہ اپنی والدہ سے مشورہ کئے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرتے تھے وہ اُن بڑے ہندوستانیوں میں سے ہیں جن کے کیرکٹر کو ماں کی محبت نے ابتدائی زمانہ

سے سانچہ میں ڈھالدیا تھا۔ ان کے والد علوم قدیمہ کے زبردست فاضل تھے اور اپنی ایرانی ادبی تہذیب وشائستگی کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور تھے۔ قدیم ایران کی ساری تہذیب کو انہوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ اپنے بیٹے کو منتقل کردیا تھا۔

جب نوعمر ذکاءاللہ اپنے عنفوانِ شباب کو پہنچ رہے تھے اس زمانہ میں مغلیہ دربار اور شہر دہلی میں عظیم الشان تبدیلیاں ظہور میں آرہی تھیں۔ تیموری خاندان جو عرصہ دراز سے اپنی سابقہ شان وشوکت اور ٹھاٹھ کا محض ہیولیٰ رہگیا تھا، اب تباہی کے قریب آن لگا تھا۔ دہلی میں برطانوی ریزیڈنسی کے قیام کے ساتھ ساتھ مغلوں کے شہر میں جدید مغربی علوم کی ترویج شروع ہوگئی۔ قدیم دہلی کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور نوعمر منشی ذکاءاللہ جبکہ ان کی عمر صرف بارہ برس کی تھی، اپنے باپ کے ایماسے وہاں بھیجے گئے اور طالب علم کی حیثیت سے وہاں داخل ہوگئے۔ قدیم درباری علوم کی بجائے یکایک مغربی علوم جدیدہ کا جگہ لے لینا یقیناً پریشان کن ہوا ہوگا۔ ذکاءاللہ نے ابتداہی سے اعلیٰ درجہ کی ذہانت کا اظہار کرنا شروع کردیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ریاضی اور سائنس میں اپنے ذہین ہم سبقوں کی پارٹی میں سب سے نمایاں رہتے تھے۔

نوعمر طالب علم نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ علوم میں ترقی کی۔ بعض دفعہ بیکن کیطرح ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وہ تمام علوم پر یکساں حاوی ہیں" انہوں نے عربی وفارسی کے اسباق کو برابر جاری رکھا، انگریزی اور تاریخِ ہند میں اپنے مابعد کے علم کی بنیاد ڈالی اور نیچرل سائنس کی تقریباً ہر شاخ کا مطالعہ کیا اور ریاضی میں خاص مہارت پیدا کی۔ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان میں مغربی علم کے مختلف شعبوں میں رہ نوردی کرنے والے طلبا کے دورِ اول میں تھے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائیگی کہ وہ نصاب کیسا کچھ کارنامہ ہوگا۔

اب ہم ان کی زندگی کے شاندار پہلو سے ہٹ کر ان کی گھریلو زندگی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بجائے خود بے انتہا پاکیزہ ہے۔ انہیں اپنی والدہ سے جو گہری عقیدت تھی،

اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی سے انہوں نے دوسروں پر رحم کھانا اور ان کے جذبات کا احترام کرنا سیکھا تھا اور جوں جوں ان کی عمر زیادہ ہوتی گئی یہ صفات ان کی سیرت کا نمایاں جزو بنتی گئیں۔ مزید براں اُن میں حد درجہ کی ایمانداری اور حیرت انگیز محنت پسندی تھی۔ بہت کم ہندوستانی ایسے ہیں جنہوں نے ان کی سی روزانہ محنت کی زندگی بسر کی ہو۔ اپنی تمام عادات میں وہ بہت سادہ تھے۔ ان کا طریق عمل خاص وضع کا پابند تھا۔ وہ بہت باقاعدہ تھے۔ ان کا جسم اگرچہ بظاہر بہت نازک اور نحیف معلوم ہوتا تھا تاہم وہ درحقیقت بہت جوش اور طاقت سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ ان کی محتاط روش زندگی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سال تک جبکہ ان کی عمر تقریباً ۸۰ برس کی ہو گئی تھی وہ (جیسا کہ انہوں نے مجھ سے بیان فرمایا) ایک مرتبہ بھی بیمار نہ پڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل بن سکے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں اُن کے چہرے پر شرافت برستی تھی۔ اُن کے چہرے کے ہر خط سے مہربانی اور سادگی ہویدا تھی اور اُن کی آنکھوں کی روشنی میں اس وقت ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی جبکہ وہ اپنے اعزا اور احباب کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونا گویا ادب واخلاق وخوش مزاجی کا سبق لینا تھا۔ اپنے مہمانوں کو آرام وآسایش پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان میں قدیم وضع کی شرافت اور تہذیب وشائستگی جلوہ گر تھی جو معلوم ہوتا ہے ان کے خاندان میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہونے کے باعث نسلاً بعد نسل چلی آتی تھی۔

نوعمر ذکاءاللہ نے کالج کی زندگی ختم کرتے ہی تعلیمی کام شروع کر دیا اور پروفیسر اور انسپکٹر کی حیثیت سے ان کی محنت ومشقت نہایت مسلسل رہی جس میں غدر کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے خوفناک رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔ غدر کے باعث ذکاءاللہ کا خاندان سخت ترین مصیبت اور عسرت میں مبتلا ہو گیا۔ خود اُن کی زندگی ایک سے زیادہ مرتبہ خطرہ میں پڑ گئی محض اس سبب سے کہ ان کا عوام جدید انگریزی علوم سے وابستہ تھا۔ وہ شاذ ذ

نادر ہی ان ایام کا ذکر کرتے اور جب وہ کر بیٹھتے تو نہایت ہی خوف و دہشت کے جذبات کے ساتھ ذکر فرماتے اس لئے کہ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اور نیز ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے پرانی حکومت کی تباہی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو، وہ جانتے تھے کہ اگر باغیوں کو کامیابی ہوگئی تو ملک میں کس قدر ابتری و تباہی رونما ہو جائیگی - جدید ہندوستان کی نجات تو کم سے کم ان کے ذریعہ سے ناممکن تھی۔

غدر کے کچھ عرصہ بعد منشی ذکاء اللہ الہ آباد میں سکونت پذیر ہوگئے جہاں وہ جدید گورنمنٹ کالج میں "السنۂ مشرقیہ اور سائنس" کے پروفیسر اوّل مقرر کئے گئے تھے - یہاں پر سب سے اول انہوں نے اپنے آپ کو طلبا میں اپنی شرافت طبع اور حسن اخلاق کے باعث ہر دلعزیز بنایا - ان کے سوانح حیات لکھنے کے دوران میں مجھے ایک نہایت ہی محبت آمیز چٹھی ان کے ایک رفیق کار سنسکرت کے پروفیسر کی طرف سے موصول ہوئی تھی جو محنت و مشقت کی ملازمت کے بعد کنارہ کشی اختیار کرکے اب الہ آباد میں گوشہ نشین ہوگئے ہیں - یہ خط ہمدردی کی ان بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جو منشی ذکاء اللہ اور تعلیم یافتہ ہندو شرفا میں پائی جاتی تھی۔

اس قدیم دوست سے میرے اپنے تعلقات اس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں جبکہ میں ان سے دہلی کے ریڈنگ روم میں ملا کرتا تھا - موسم گرما میں ہر شب کو لائبریری کی چھت پر ایک قسم کی ادبی کلب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور عام دلچسپی کے مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی - شمالی ہندوستان میں اس سے زیادہ شاندار اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آسکتا تھا - ڈاکٹر نذیر احمدؒ اس کلب کے مسلمہ لیڈر تھے اور ان کے گرداگرد ہندو اور مسلمان دونوں مجتمع ہوا کرتے تھے - اثنائے بحث میں کبھی کبھی کوئی ہمدرد انگریز عہدہ دار بھی شرکت کرنے کے ارادہ سے آ شریک ہوتا تھا - منشی ذکاء اللہ ان مباحث میں تمام مسائل کے متعلق حیرت انگیز وسعت معلومات کا اظہار کرتے تھے جو ہمیشہ ان کے آڑے آتی تھی اور میں نے تو شاذ و نادر ہی ایسے شخص

سے ملاقات کی ہے جو ان کی طرح وسیع معلومات رکھتا ہو۔ یہ مجمع اب منتشر ہو چکا ہے۔ منشی ذکاء اللہ انتقال کر گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور رائے پیارے لال دونوں اپنی خرابیِ صحت کے باعث شرکت کرنے سے معذور ہیں۔ نئی پود میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو زمانۂ گذشتہ کے ان "دیووں" کا مقابلہ کر سکے۔

اس صحبت میں شریک ہونے والے شخص کے تخیل پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر پڑتا تھا وہ باہمی بردباری کی انتہائی شرافت تھی جو مذہبی تلخی یا تعصب کے ہر داغ سے مبرا تھی اور یہ وہ ماحول تھا جس میں سیاسی فراست ترقی پا سکتی تھی اور معاشرتی درستی پختہ ہو سکتی تھی۔ ان تمام برسوں میں جن میں منشی ذکاء اللہ سے میرے تعلقات رہے، میں نے جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کر سکتا ہے کسی ہندو یا ہندوؤں کی کسی مذہبی رسم کے بارے میں کبھی ان کی زبان سے ایک دفعہ بھی کوئی تلخ یا غیر شریفانہ لفظ نہیں سنا۔ برخلاف اس کے میں نے انہیں ہمیشہ ان لوگوں کا احترام کرتے ہوئے دیکھا ہے جو اعتقادات کے معاملہ میں اُن سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ جہاں کہیں وہ گئے، اُنھوں نے ہمیشہ صلح جوئی اور رواداری کے حق میں اپنا اثر استعمال کیا۔

ذکاء اللہ اپنے الہ آباد کے زمانۂ قیام میں تحریک علیگڈھ کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہے جو سر سید احمد خاں کی رہنمائی میں شروع کی گئی تھی۔ سر سید ان کے گہرے ذاتی دوست تھے اور ان سے یا ڈاکٹر نذیر احمد سے صلاح لئے بغیر شاذ و نادر ہی کوئی اہم کارروائی انجام دیتے تھے۔ عرصۂ دراز تک تحریک علیگڈھ ڈانواڈول رہی۔ شمال کا رجعت پسند فریق بہت طاقتور تھا اور سر سید احمد کی اپنی زندگی ان کے ترقی یافتہ خیالات کے باعث متعصب بلاؤں کی وجہ سے ہر وقت خطرہ میں رہتی تھی۔ انہیں کھلم کھلا کافر کہا جاتا تھا اور بہت سی مساجد میں وعظوں کے ذریعہ ان پر سختی سے حملے کئے جاتے تھے۔ منشی ذکاء اللہ ظلم و تشدد کے اس دور میں بہادرانہ طریقہ سے ان کی رفاقت کرتے رہے۔ وہ علیگڈھ انسٹیوٹ کے سربرآوردہ ممبروں میں سے تھے اور اسکے

متعلقہ پریس (چھاپہ خانہ) کو انہوں نے اپنی تمام ابتدائی کتابیں بغرضِ اشاعت دیدی تھیں۔ وہ کالج کے ٹرسٹی اور بہت پرجوش کارکن تھے۔

ذکاء اللہ ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد پورے انہماک کے ساتھ ادبی مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے سادہ اور شستہ زبان میں انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ پر بہت سی جلدیں لکھی ہیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کتابیں اور نیز ان کے مضامین اور کتب ریاضی ہمیشہ ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیں گی۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ان کی یہ امید کہاں تک بارآور ہوگی۔

انتقال سے پیشتر ذکاء اللہ مجھ سے افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ ابھی سے میری کتابوں کی فروخت تقریباً رک سی گئی ہے لیکن خواہ یہ صحیح صورتِ حالات ہو یا نہ ہو اور خواہ ان کی ہردلعزیزی دوبارہ زندہ نہ ہو سکے، یہ حقیقت فراموش نہیں کیجا سکتی کہ وہ ان اولین اشخاص میں سے تھے جنہوں نے اردو زبان کے ذریعہ مغرب کے علوم جدیدہ کو روشناس کرانے کی اہم خدمت انجام دی۔ جہاں ایک طرف ہندوستان کے دوسرے صوبے خالصتاً انگریزی تعلیم کی رَو میں بہے چلے جا رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ انگریزی ہی بہترین ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے، وہاں دوسری طرف منشی ذکاء اللہ نے اپنی تحریرات کے ذریعہ ثابت کر دکھایا کہ علوم جدیدہ کے نہایت ادق اور انتہائی مضامین بھی اردو کی کتب نصاب کے ذریعہ پڑھائے جا سکتے ہیں۔ آج ہم رابندرا ناتھ ٹیگور کے کارناموں اور زبردست اثر کی وجہ سے بنگال میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ مادری زبان کی محبت از سر نو زندہ ہو رہی ہے اور سائنٹفک کتابیں بنگالی میں تحریر کی جا رہی ہیں۔ جو بات کہ اب بنگالی لٹریچر میں وقوع میں آ رہی ہے بعینہٖ وہی بات اردو کے لئے ہمیشہ منشی ذکاء اللہ کے پیش نظر رہی اور انہوں نے اس کے حصولِ تکمیل کے لئے انسانی طاقت سے بڑھ کر کوشش کی بہ حیثیت انشاپرداز کے وہ اپنے دو دوستوں ڈاکٹر نذیر احمد اور حالی سے بہت پست ہیں، لیکن

ان کی اردو ان تمام مصنوعی ترکیبوں اور لفاظیوں سے حیرت انگیز طور پر مبرا ہے جن کے بوجھ سے اس دور کی ابتدائی زبان دبی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ درحقیقت موجودہ اردو لٹریچر کے بانیوں میں سے تھے۔

اگرچہ منشی ذکاءاللہ تحریر تعلیم اور گفتگو میں اپنی مادری زبان کے سوائے کسی اور زبان میں اظہار خیال کے عادی نہ تھے تاہم وہ ان تمام انگریزی کتب کے پڑھنے کے بیحد شوقین تھے جو انہیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ وہ ریاضی داں ہونے کی حیثیت سے جدید سائنس کے بغایت درجہ معترف تھے اور اس طرح سے وہ ماضی اور حال، مشرق اور مغرب کا حیرت انگیز اجتماع پیش کرتے تھے۔ وہ عربی تہذیب اور ایرانی تمدن کی گذشتہ شاندار روایات کا بیحد احترام کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ علوم جدیدہ کی انتہائی ضرورت کو تسلیم کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ وہ سختی کے ساتھ اپنی مادری زبان کے ساتھ چپکے رہے اور آخر وقت تک اسے انگریزی کے حق میں ترک کر دینے کی خواہش کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی نوع مزاحمت پسند تھے اور اس امر کے خواہشمند تھے کہ کسی طرح زمانہ کی رفتار کو پیچھے کر دیں۔ برخلاف اس کے انہوں نے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اپنی امکانی طاقت کے ساتھ تحریک علیگڈھ کو ترقی دی جس کے طریقے کم سے کم انگریزی تعلیم کے متعلق ان کے ذاتی خیالات سے بیحد مختلف تھے۔

مگر محض قدیم دنیا کی تہذیب، اخلاق اور وضعداری کا نمایندہ ہونا ہی کوئی ایسی بات نہیں جو منشی ذکاءاللہ کو انیسویں صدی کے قابل احترام ہندوستانیوں کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ٹھہراتی ہو۔ اس اعزاز کے لئے ان کے حقیقی دعوی کا انحصار اس امر پر ہے کہ انہوں نے لبرل تعلیم کی اشاعت میں مخلصانہ اور پرجوش کوشش کی اور اس کے اصولوں کے ساتھ نہ ڈگمگانے والی وفاداری برتی۔ اور یہ سب کچھ ایسے زمانہ میں کیا گیا جبکہ ملک غایت درجہ کی پریشانی اور انقلاب میں سے گذر رہا تھا، جبکہ لوگوں

کے خیالات منتشر اور غیر یقینی ہو چکے تھے۔

اولاً انہوں نے حیرت انگیز دوربینی کے ساتھ یہ دیکھ لیا تھا کہ خود ان کی قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ ملک ہی کو اپنا ملک خیال کرے اور اسے کسی نوع غیر ملک نہ سمجھے۔ وہ مسلمانوں کی جانب سے علیحدگی کی ہر ایسی پالیسی کے سختی کے ساتھ مخالف تھے۔ ان کے اعتقاد میں ایسی علیحدگی ان کے ہم مذہب کی صحیح اسپرٹ کے خلاف تھی۔ وہ اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام کے متعلق دوسرے لوگ خواہ وہ اس کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں، یہ خیال کر بیٹھیں کہ اسلام بردباری نہیں سکھاتا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کے دامن سے ہر ایسا دھبہ دور ہو جائے اور تمام دنیا پر اس کی عجیب و غریب سادگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اسی غرض سے وہ الہ آباد اور دہلی میں آزادی کیسا تھ دوسرے مذاہب کے پیرؤں سے ملا کرتے تھے اور اسی غرض سے وہ ہر بات میں مثلاً لباس طریقہ زندگی، گفتگو اور عادات میں ہندوستانی ہی رہے ان کی رائے تھی کہ وہ مادری زبان جسکا ہندو اور مسلمان یکساں طور پر مطالعہ کریں، جس میں وہ گفتگو کریں اور جس سے انہیں سچی محبت ہو، دونوں قوموں کے درمیان نہایت ہی مقدس رشتہ ہے اور انکی تمام عمر اسی رشتہ کو مضبوط کرنے میں صرف ہو گئی اگرچہ ان جیسی لیاقت کے شخص کے لئے انگریزی میں بولنا اور لکھنا آسان ترین کام تھا۔ میں نے بارہا انہیں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے اور اثنائے گفتگو میں وہ اُس شخص کے سے زور اور یقین کا اظہار کرتے تھے جسے اس بارے میں زندگی بھر کا تجربہ ہو۔ انہیں اپنی قوم سے بیحد محبت تھی اور وہ اُن درسگاہوں اور تحریکوں کی مقدور بھر کوشش کرتے تھے جن کی نسبت انہیں یقین ہوتا کہ وہ تعلیمی لحاظ سے اس کی ترقی کا باعث ہونگی لیکن سب سے بڑھ کر انہیں اُس تعلیم پر اعتماد تھا جو زندگی کے ذریعہ یعنی ہمسایوں کے تعلقات مہربانی آمیز ہمدردی، معاشرتی روابط اور باہمی میل جول کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ مطالعۂ تاریخ نے انپر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح کر دی تھی کہ صرف خیالات کے ایسے امتزاج کے دور میں جب کہ

رائے کی آزادی اور بردباری علانیہ تسلیم کرلی گئی ہو، ترقی، روشنی اور اعلیٰ تمدن جڑ پکڑتے ہیں۔ تاریخی تقابل کی شکل میں اگر منشی ذکاءاللہ کا اپنا تخیل پیش کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اکبر اعظم کا عہد معدلت گستر جبکہ مغلیہ دربار کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے قابل اشخاص کے لئے یکساں طور پر کھلا ہوا تھا ہی وہ زمانہ تھا جسے وہ آئیڈیل کے طور پر اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر وہ انگلستان میں ہوتے تو وہ گلیڈاسٹون اور برائٹ کی پارٹی کے لبرل ہوتے۔ وہ کیتھولک ایمینسی، پیشن ایکٹ یا آئرش چرچ ڈس ایسٹیبلش مینٹ جیسے قوانین کی پورے طور پر تائید کرتے۔

تا نیاً وہ دہلی کی روبتنزل مغلیہ سلطنت کے متعلق اپنے تجربہ سے اور نیز اپنی عظیم الشان تاریخی تحقیقات سے اس بات کے قائل تھے کہ صرف کسی جدید اور مقابلتہً زیادہ نوعمر تہذیب کے اتصال ہی سے زندگی اور طاقت ان کی قوم میں بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان میں آسکتی ہے۔ انہوں نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ مغربی تعلیم ہی اپنی بہترین اور پاکیزہ ترین شکل میں اس اتصال کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور اس لئے وہ اس کے پرجوش حامی اور وکیل ہو گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی تمام زندگی ہی اپنے ہم قوموں کو یہ اصول ثابت کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہو گئی۔

اس مقام پر وہ تاریخی تقابل پیش کرنے کے عادی تھے۔ اپنی سرگرم آرزوں اور مقاصد کی تصدیق کے لئے وہ اسلامی تاریخ کے ان دوروں کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھتے تھے جبکہ مشرق اور مغرب میں باہمی اختلاط بالکل آزادانہ تھا، مثلاً وہ اسپین میں عربوں کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھتے جبکہ قرطبہ مغربی یورپ کے لئے روشنی اور علم کا مرکز بن رہا تھا اور پھر مجھ سے تبسم کے ساتھ فرماتے: "ہم یورپ سے آج اس قرض کی کچھ ادائیگی واپس طلب کرتے ہیں جو اس کام کے سلسلہ میں ہمارا ہاتھ ذمہ نکلتا ہے۔ جسے ہم نے ازمنہ وسطیٰ میں تمہارے لئے انجام دیا تھا۔ اسوقت آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبا سائنس اور ریاضی سیکھنے کے لئے اسپین جایا کرتے تھے۔

اب ہم اُلٹے تمہارے پاس آرہے ہیں"

اس فقرے میں مہربانی آمیز مذاق سے بڑھکر ایک لطیف حقیقت مضمر ہے۔ اس میں اس سچائی کا اعتراف موجود ہے کہ علم کی دولت سب کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہمہ گیر ملکیت ہے جو اگر آج ایک قوم کے پاس ہے تو کل دوسری کے پاس۔

رابندرا ناتھ ٹیگور نے ایک شریفانہ اور فیاضانہ مضمون کے دوران میں ہندوستان کے مستقبل کا مطمح نظر پیش کیا ہے، ایسا مطمح نظر جس میں ہندو مسلمان اور عیسائی سب مل کر موجودہ ہندوستان سے زیادہ عظیم الشان ملک تعمیر کریں۔ وہ آخری صدی کے بڑے بڑے ہیروز مثلاً راجہ رام موہن رائے جیسے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے اپنی زندگیاں بسر کیں۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہیں :-

"عجیب غریب فیاضانہ دل و دماغ کے ساتھ راجہ رام موہن رائے مشرق سے دست بر داری کئے بغیر مغرب کو قبول کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے ہمارے لئے بنی نوع انسان کا دائمی ترکہ یعنی سچائی کا آزاد ورثہ چھوڑا ہے۔ اُنہوں نے ہندوستان کی روح کو سکڑنے نہیں دیا اور نہ اس کے گرداگرد جھاڑیاں پیدا کرکے اس کی نمو کو ٹھٹھرنے دیا۔ بلکہ اُنہوں نے اسے جگہ اور وقت کے اعتبار سے پھیلنے دیا۔ اُنہوں نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کیا، لہٰذا وہ ابھی تک ہندوستان کی ازسرِنو تعمیر میں ایک قوت ثابت ہو رہے ہیں۔ کوئی اندھی عادت، کوئی بے معنی فخر اُنہیں زمانہ کی رَو کے خلاف چلنے کے مقصد سے احمقانہ جنگ کرنے پر مائل نہیں کر سکا۔ اُنہوں نے اس مقصد کا جو ماضی میں ختم نہیں ہوا بلکہ مستقبل کی جانب گامزن ہے ارکاوٹوں اور مشکلات کو ٹھکرا کر ایک ہیرو کی طرح علم بلند کیا ہے۔

یہ الفاظ زندگی کے مقابلۃً کم نمایاں حلقہ میں منشی ذکاءاللہ کے کام پر چسپاں ہو سکتے

ہیں۔ اُنہوں نے بھی مشکلات کی پروانہ کرکے آزاد خیالی کا جھنڈا بلند کیا ہے، اُنہوں نے بھی ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کرنے میں امداد دی ہے اور اُنہوں نے بھی اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا ہے کہ کس طرح سے مشرق کو متروک کئے بغیر مغرب کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔ اے

خواتین ٹرکی کی آزادی اور تعلیم اسلام

جناب مولوی فضل الرحمٰن خاں صاحب بی - اے، ال - ال - بی (علیگ)

زمانہ حاضرہ میں سلطنت ٹرکی میں جو عظیم انقلاب پیدا ہوا ہے اس نے استبدادیت کا خاتمہ کردیا اور اب ٹرکی ایک جمہوری نظام کے ماتحت اس ترقی کے دور میں دیگر متمدن اقوام یورپ کا مقابلہ کررہی ہے فی الواقعی غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹرکی کو تباہی سے بچالیا اور اپنی ذاتی شجاعت اور حسن تدبیر سے اس زمانہ میں اسلام کی وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں کہ اس غازی اسلام کے کارنامے صفحہ تاریخ پر زرین الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس ملکی انقلاب کے ساتھ ساتھ سلطنت ٹرکی میں معاشرتی۔ اقتصادی اور مذہبی انقلاب بھی شروع ہوگیا ہے۔ اور ترک قوم ایک حد تک یورپ کی "مہذب اور شائستہ" قوموں کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ جو خبریں ٹرکی سے ہم کو ہندوستان پہونچتی رہتی ہیں اُن کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی قوم نے جن جن اصلاحات کی تجاویز پیش کی ہیں وہ معاشرتی اور مذہبی قوانین کے متعلق ہیں۔ اس مضمون کا مبحث صرف اسقدر ہے کہ ترکوں نے طبقہ نسا کو کہاں تک آزادی دیدی ہے اور اُسکا کیا انجام ہونے والا ہے؟ انشاءاللہ ہم کسی اور موقع پر ترکوں کے مذہب اور اُن کے مذہبی اصلاحات کے مطالبات پر تبصرہ کریں گے۔ کیونکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ترکوں نے اسلامی قانون ازدواج و قانونِ وراثت وغیرہ میں نہایت اہم تبدیلیاں کرکے نئے نئے قوانین و

ضوابط مرتب کئے ہیں اور اُن کو قابل پابندی تسلیم کر دیا جاتا ہے۔

خواتین ٹرکی کی آزادی کے متعلق کاتب الحروف نے ایک مضمون کسی انگریزی سیاح کا ایک انگریزی اخبار میں پڑھا ہے جس کا اقتباس ہدیہ ناظرین کرنا ضروری ہے۔ اس نامہ نگار کا نام مسٹر نیوسن ہے اور اس نے ایک لنڈن کے اخبار میں اس انقلابی تغیر و تبدل کا فوٹو حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"خواتینِ ٹرکی مدت دراز تک حرم سرا میں پردہ کی حالت میں قید رکھے جانے کے بعد اب دور حاضرہ میں بالکل آزاد ہو گئی ہیں۔ خواتین ٹرکی نے اس دور حاضرہ میں ایک غیر قابل یقین تغیر اپنی معاشرت اور تمدن میں پیدا کر لیا ہے۔ جب میں پچھلے موقع پر ٹرکی میں تھا تو میں نے وہاں کی مستورات کو برقع و نقاب پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک مثل مومیائی شبیہوں کے سیاہ یا ہرے برقعوں اور چادروں میں ڈھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھی بمشکل دکھائی دیتی تھیں اور احتیاط اسقدر کیجاتی ہے کہ بسا اوقات اکثر عورتیں اپنے سروں کو چھتری لگا کر چھپا لیتی تھیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ٹرکی خواتین مثل مہذب اور تعلیم یافتہ ملکوں کی خواتین کے پوشاک پہنتی ہیں اور طرز عمل رکھتی ہیں۔ اب یہ عورتیں اپنے ہونٹوں۔ رخساروں اور پلکوں کو سُرخ رنگتی ہیں۔ اپنے سر کے بالوں کو بناتی اور کاکلیں نکالتی ہیں۔ اپنی گردنوں اور سینوں کو کُھلا چھوڑتی ہیں اور چست چھوٹے چھوٹے فراک پہنتی ہیں جو صرف اُن کے گھٹنوں تک پہونچتی ہیں اور وہ اپنی پنڈلیوں پر ریشمین گلابی رنگ کے موزے پہنتی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہوں۔ فی الواقعی یہ بات قابل تعجب ہے کہ یہ خواتین اپنے آپ کو کس طرح زمانہ کی ضروریات کے مطابق کاربند کریں گی۔ بعض خواتین کو اس آزادی کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑیگا۔ مجھ کو خبر ملی ہے کہ اناطولیہ کے بعض حصوں میں اور دیگر مقامات پر ان آزاد خواتین کی علانیہ توہین کیجاتی ہے اور تمسخر کیا جاتا ہے۔ یہ خواتین پبلک کے روبرو چُرٹ پیتی ہیں اور قہوہ خانوں میں جاتی ہیں اور

رات بھر ناچتی گاتی ہیں اور مردوں سے علانیہ بات چیت کرتی ہیں - یہ تمام آزادی اِن خواتین کو چند سال کے عرصہ میں تُرکی نژاد خاتون خالدہ خانم کی بہادرانہ اور اَن تھک کوششوں کی بدولت نصیب ہوئی ہے - ٹھیک یہی حال ہمارے ملک کی رائے طلب کرنے والی عورتوں کا بھی ہوا تھا اور اُنھوں نے بھی ایک مُدت کی کوشش اور ایثار اور قربانیوں کے بعد کریہہ رسمیات اور بیہودہ پابندیوں کی جکڑ بند کو توڑ کر اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا"

ہم ہندی مُسلمان قید غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہم کو متمدن اقوام کے تمدن و معاشرت پر نکتہ چینی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے - چونکہ ہمارے اور ترکوں کے درمیان رشتہ اخوت اسلامی قانون نے پیدا کر دیا ہے اور رسُول اکرم صلعم کی تعلیم نے ہم کو خواہ ہم عربی یا ترکی یا ایرانی یا ہندی نژاد ہوں ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے - لہٰذا بحیثیت مُسلمان ہونے کے ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم تُرکی کی موجودہ معاشرتی اصلاحات پر نظر تنقید ڈالیں کہ آیا یہ قوم اپنے دعادی میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ اور آیا اس نام نہاد "آزادی" کو حاصل کر لینے میں تُرکی قوم خصوصاً اُن کی خواتین جادۂ اعتدال سے باہر تو نہیں ہو گئی ہیں؟

یورپ اور ایشیا کی اقوام میں گذشتہ کئی صدیوں سے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے عظیم الشان انقلابات ہوئے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ متمدن اقوام "نظام جمہوریت" قایم کر چکی ہیں یا کرنے والی ہیں - ان انقلابات کا نتیجہ اکثر اقوام یورپ کے حق میں سودمند ثابت ہوا ہے - مگر خال خال ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جو اقوام اس نظام جمہوریت کی اہل نہ تھیں اُن کو قبل از وقت "جمہوریت" قایم کر لینے کی آرزو کی وجہ سے شدید نقصانات بھی پہونچ چکے ہیں - چنانچہ اس کی مثالیں روسی، چینی وغیرہ مُلکی انقلابات کی موجودہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ملتی ہیں - میں یہ نہیں کہتا کہ سلطنت ٹرکی جمہوریت کی اہل نہ تھی اور نہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ سلطنت ٹرکی نے قبل از وقت استبدادیت کی زنجیروں کو توڑ دیا اور نظام جمہوریت حاصل کر لیا - بلکہ اس مضمون میں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس آزادی

کی رو میں ترکی نے اپنے دیرینہ معاشرتی و مذہبی قوانین کو خیر باد کہہ کر یورپ کے معاشرت اور مذہب کو آمنّا و صدقنا کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یورپ اس بیسویں صدی کے دور میں مشرق کی "روحانیت" کا قائل ہو رہا ہے اور اُن کے معاشرتی نظام کی وجہ سے جو بد اخلاقی اور بربریت کے خصائل ان متمدن اقوام میں پیدا ہو گئے ہیں اُن پر دُنیا نفرین کر رہی ہے۔ جو اخبارات ہم کو بذریعہ کتب و جرائد ہندوستان کو پہونچتے ہیں اُن سے اظہر من الشمس ہے کہ یورپ نے مذہب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نظام معاشرتی و تمدن میں وہ خرابیاں پیدا کر لی ہیں کہ اب اُن کی اصلاح ناممکن ہے اور ایک زمانہ وہ بھی آئیگا کہ اُن کو اپنے عیش پرستی اور بد اخلاقانہ زندگی کی بدولت زمانہ کے ہاتھوں سے سخت سے سخت سزا ملیگی لہٰذا اس حالت کو دیکھتے ہوئے اقوام ترک کو یورپ کی اندھی تقلید کرنا اور اُن کے ناقص اور بد اخلاقی سکھانے والے قوانین کا اتباع کرنا اُن کے لئے سخت مضر ہے۔ کاش اگر مسلمانان عالم خصوصاً ترک اقوام و ہندی مسلمان "خُذ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدِر" پر عمل کرتے تو کیا اُن کو دینی اور دُنیاوی مسرتیں حاصل نہیں ہوتیں؟ بد اخلاقی اور بد دینی کی زندگی سے گو انسان کے فوری اور جذباتی مقاصد حاصل ہو جاویں مگر قوانین فطرت نے ہم کو سکھلا دیا ہے کہ یہ جذباتی مسرتیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ حقیقی مسرت اسُی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے وہ صفات اور اخلاق پیدا کرے جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

میں اس موقع پر دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کسی خاص عقیدہ یا رسم و رواج کا پابند نہیں ہے۔ جو تعلیم حریت اور مساوات کی اسلام نے پیش کی ہے اسُ کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ پیغمبر خدا صلعم نے سرزمین عرب میں جمہوریت کی بنیاد ڈالی حالانکہ حضورؐ کے زمانہ بعثت کے وقت یورپ اور اقوام یورپ وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام ایک دین فطری ہے یعنی اسلام اس قسم کے اصول اور قوانین پیش کرتا ہے جو خلاف فطرت نہیں ہیں اور

ظاہر ہے کہ اصول نظری غیر متزلزل ہوتے ہیں جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا چنانچہ قرآن شریف میں وارد ہے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیلا۔ اسلام نے حریت اور مساوات کی ایسی زبردست تعلیم دی ہے کہ بنی نوع انسان میں کالے۔ گورے۔ زرد۔ گندمی رنگ والوں کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو شخص دین فطرت یا بدیگر الفاظ اسلام کا قائل ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے اور اس کو حق حاصل ہے کہ وہ بلالحاظ قومیت و جنسیت حریت کا مستحق رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حریت مساوات کیا ہے؟ حریت اور مساوات کے یہ معنی نہیں کہ انسان غیر متزلزل قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرکے بداخلاقی، اور بربریت کا جامہ پہن لے۔ انسان بہ حیثیت حیوان ناطق اور اشرف المخلوقات ہونے کے حیوان مطلق اور اس سے بھی ادنیٰ ذی حیات یا غیر ذی حیات مخلوق سے بوجوہات خاص متصف اور متبائن ہے۔ کسی سنجیدہ مذہب اور خصوصاً اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہوسکتی کہ انسان اشرف المخلوقات ہوکر حیوان مطلق کی سی زندگی بسر کرے۔ میں اس بارے میں صرف اپنے مضمون کے مبحث کی طرف توجہ کرتا ہوں تاکہ اصلی مقصد فوت نہ ہوجاوے۔ ہمارے بحث حریت اور مساوات اور خصوصاً طبقہ نسواں کی آزادی سے ہے۔ اس مبحث پر دو سوالوں کے حل ہوجانے سے اور خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنے سے مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ حریت اور مساوات کسے کہتے ہیں؟ اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے اور زیادہ قابل قدر شے ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر حریت اور مساوات قابل قدر شے ہے تو اس آزادی کی ضبط اور تخصیص کیوں کی جاتی ہے؟ لہٰذا جو مذہب و ملت آزادی کے صحیح معنوں میں کسی طرح سے رکاوٹ پیدا کرے وہ دین نظری نہیں ہوسکتا۔

پہلے سوال کا جواب گو ہمارے بحث کا نقطہ نظر نہیں ہے۔ مگر اس پر ضمنی مختصر بحث

کی ضرورت اس وجہ سے لاحق ہے کہ دوسرے سوال کے حل کرنے میں "حریت و مساوات" کے الفاظ بار بار لانا پڑتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے "حریت و مساوات" کا مفہوم سمجھنا چاہیئے۔ میرے خیال میں "حریت" یا "آزادی" کا مفہوم یہ ہے کہ ایک انسان اپنے قدرتی حقوق کو اپنی قوت ارادی کی تعمیل میں بلا کم و کاست اور بلا دوسرے شخصوں کے دباؤ کے استعمال کر کے اُن سے متمتع ہو جاوے۔ بنی نوع انسان کے "قدرتی حقوق" بہت سے قسم کے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جسمانی۔ دماغی۔ اخلاقی یا روحانی قویٰ کو قوانین قدرت کے ماتحت رکھ کر بام کمال پر پہنچائے کیونکہ اس میں انسان کی فنا اور بقا کا راز مضمر ہے۔ نظام تمدن یا مذاہب عالم میں اگر کوئی قانون یا اصول اس کے خلاف وضع کیا جاوے تو وہ اس قدرتی حقوق کے متضاد و منافی خیال کیا جاوے گا اور "آزادی" کا مفہوم فوت ہو جاوے گا۔ جو شخص یا کوئی نظام سلطنت اس قدرتی حق کو دبائے یا رخنہ انداز یاں کرے تو اس کی نسبت کہا جاوے گا کہ اس نے "آزادی" کو پائمال کر دیا۔ اسی آزادی کے صحیح مفہوم کے اکتساب میں کسی جنس کی قید نہیں ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت دونوں میں سے ہر ایک کو قدرتی حق حاصل ہے کہ وہ اخلاقی۔ روحانی اور جسمانی ترقیاں کریں مگر قانون قدرت کے ماتحت رہکر۔ مرد اور عورت دونوں میں سے اگر کوئی بھی قوانین فطرت سے باہر ہو کر ترقی کرنے کا دعویٰ کرے تو اس ترقی کو صحیح معنوں میں "آزادی" کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ بے شک آزادی ایک بیش قیمت شے ہے کیونکہ وہ قوانین قدرت کا ایک شائبہ ہے اور جو شخص اس صفت یا حق سے محروم ہے یا اُسپر کم و بیش قیود اس آزادی کے حصول میں لازم کی گئی ہیں وہ فی الواقع "قدرتی حقوق" کے حصول میں کوتاہ خیال کیا جاوے گا۔ کسی حکیم کا قول ہے "میں دیگر اشخاص کی آرزوؤں اور تمناؤں کے متعلق رائے قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے دریافت کیا جاوے کہ تم کس چیز کے متمنی ہو تو میں صاف کہونگا کہ مجھے آزاد رہنے دیجاوے ورنہ میری خواہش

موت کی ہوگی" بے شک یہ فقرات نہایت قابل قدر ہیں اور آزادی کے مفہوم کی قیمت کا اندازہ بحالت آزادی نہ ملنے کے موت جیسی محتشم شے سے کیا گیا ہے جس کے بعد انسانی وجود کا ہی خاتمہ ہوجاتا ہے مگر ان الفاظ سے آزادی کے منشا اور مفہوم پر کافی روشنی نہیں پڑتی جس سے معلوم ہوسکے کہ آزادی کیا شے ہے؟ اور اُس کا صحیح استعمال کیا ہے؟ مجھے انگلستان کے مشہور مدبر برک کا قول نہایت پسند ہے۔ اُس نے نہایت مختصر اور صاف الفاظ میں آزادی کی غایت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "فی نفسہ آزادی بھی ایک قسم کا جوہر ہے جسکے حصول اور جائز استعمال کے لئے کچھ نہ کچھ قیود کی ضرورت لابدی ہے" مدبر برک کا یہ قول واقعی نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔ موجودہ زمانہ کی ہل چل اور مطلق العنانی کو دیکھتے ہوئے یہ قول سونے کے حرفوں میں لکھے جانے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہے۔ حریت یا آزادی کے یہ معنی نہیں کہ انسان معاشرتی۔ تمدنی۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ قوانین کو توڑ کر مطلق العنان ہوجاوے اور کسی اصول یا قوانین کی پابندی نہ کرے اور مثل بہایم کے اپنی نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بلا مہار کے اونٹ کی طرح اپنی زندگی بسر کرے لہذا مجھے ناظرین کو اس امر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ جدید اقوام ترکی نے حریت اور آزادی کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا اور یورپ کی کورانہ تقلید کا شکار ہو کر جادہ اعتدال سے تجاوز کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک قوم کا اخلاق اور منزہ صفات جو اُن کو دیگر اقوام یورپ سے متمائز کرتی ہیں مفقود ہو جاویں گی اور مثل پیرس اور لندن والوں کے دنیا انکی بد اخلاقی اور نفس پرستی پر تمسخر اُڑائیگی۔ ممکن ہے کہ ترک قوم کو چند روز میں اپنی اس مطلق العنانی کا سبق مل جاوے اور وہ اس گمراہ راستہ سے ہٹ کر جادہ اعتدال پر بدستور سابق آجاویں۔ اگر ہم ہندی مسلمان ان واقعات کو نظر غور سے دیکھیں اور مسٹر نیوٹن سن کے الفاظ اور مضمون کی غایت کو سمجھیں تو ہم کو نہایت شرم آنا چاہیے کہ وہ کنایتہً ترکی خواتین اور ترکی تمدن کا کن مہذب الفاظ میں خاکہ اُڑا رہا ہے۔ مجھے تو اس سیاح کے الفاظ اور

طرز بیان سے یہی غایت نظر آتی ہے کہ وہ در پردہ اسلامی تمدن وتہذیب کا مضحکہ اڑا کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی تمدن وتہذیب ناکارہ اور خام ہے اور یورپ کی نام نہاد "آزادی" بہترین شے اور زمانہ حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!۔

ناظرین کرام نے سمجھ لیا ہوگا کہ حریت اور آزادی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مجھ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حریت اور مساوات کے مضمون پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس مضمون پر ہزاروں کتابیں اور رسائل مجھ سے زیادہ قابل قدر اشخاص کے موجود ہیں۔ میں یہاں صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اسلام نے ہم کو عام تعلیم دی ہے کہ ہر مسلم اور مسلمہ آزاد ہے اور ایک دوسرے کا بھائی بہن ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ اسلام میں یہ حریت کا مسئلہ کوئی نئی شے نہیں ہے۔ لہذا میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ ابتدا اسلام سے لیکر آج تک جبکہ اسلام ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے اس حریت اور مساوات کا سبق جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب فرد اسلام کے دل میں نہ صرف موجزن ہے بلکہ ہمیشہ سے اس پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہیگا۔ علاوہ ازیں میں نے لفظ آزادی کے مفہوم کو انگریزی مدبر برک نامی کے قول سے ثابت کردیا ہے کہ "آزادی" مطلق العنانی کا نام نہیں ہے بلکہ قدرتی حقوق کو قانون قدرت کے ماتحت رکھکر اُن کو حاصل کرنے اور اُن سے متمتع ہونے کا نام آزادی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت کا دوسرا نام اسلامی اصطلاح میں سُنَّۃُ اللہ ہے۔ اور یہی سنۃ اللہ ہے قوانین قدرت اسلامی مذہب کا سنگ بنیاد ہیں جس کا بار بار تذکرہ قرآن شریف میں آیا ہے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ جبکہ حریت اور مساوات صحیح معنوں میں قابل قدر شے ہیں تو اسلام اور تمدن اسلام اس کی عینی وار تخصیص کیوں کرتا ہے اور عورتوں کو مثل مردوں

کے کیوں آزادی نہیں دیجاتی؟ کیا وجہ ہے کہ اہل اسلام اپنی خاتونوں کو پردہ میں اور حرم میں رکھکر اور اُن پر طرح طرح کی قیود لگا کر اُن کی آزادی اور حریت کو پائمال کرتے ہیں حتیٰ کہ اُن کو ناقص العقل کا خطاب بھی دیئے جانے میں کوئی تامل نہیں کیا جاتا؟

یہ مسئلہ بہت کچھ وضاحت طلب ہے مگر مضمون کے طولانی ہو جانے کی وجہ سے مجھ کو خوف ہے کہ طولانی بحث اور تمہیدوں سے ناظرین اُکتا نہ جاویں۔ لہٰذا اس بارے میں میں نہایت مختصراً عرض کرتا ہوں کہ اس سوال کے مباحثہ میں ناظرین ہندوستان کی خواتین کی حالت اور اُن کے موجودہ تمدن و معاشرت کو پیش نظر نہ کریں۔ مسلمانان ہند اپنا ملک و تمدن کھو بیٹھے ہیں اور اُن کی موجودہ حالت کا مقابلہ اسلام کی اصل تعلیم حریت و نسائیت سے نہیں ہو سکتا۔ مسلمانانِ ہند میں اُن کا اصلی مذہب اور تمدن بہت کم باقی رہگیا ہے جس کے وجوہات چند در چند ہیں مسلمانانِ ہند پستی اور غلامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک غیر آزاد قوم ہیں۔ لہٰذا صحیح تعلیم اسلامی پر نہ یہاں عمل ہوتا ہے اور نہ وہ بوجہ اپنے دماغی انحطاط کے اس قابل ہیں کہ وہ اپنا صحیح مسلک زندہ قوموں کیطرح قائم کر سکیں۔ البتہ دور حاضرہ میں چند شخص ایسے ہوئے ہیں جو اسلامی تواریخ و روایات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے جس کی وجہ سے اب کچھ بیداری پیدا ہو چلی ہے اور ہماری امیدوں میں ایک جھلک سے پائی جاتی ہے کہ اگر تعلیمی جد وجہد جاری رہی تو ممکن ہے کہ وہ زمانہ عود کر آئے کہ ہم لوگ اسلام یا دین فطرت کا صحیح مفہوم سمجھ کر صحیح راستہ پر آجاویں۔ علاوہ ازیں مسلمانان ہند میں زیادہ تر شخص نو مسلم ہیں اور ہندوستان کی آبادی کا ۳/۴ حصہ غیر مسلم ہے لہٰذا ایسی صورت میں مذہب ہنود اور اُن کے رسم و رواجات کا رنگ ہم پر اسقدر گہرا چڑھ گیا ہے کہ اہل ہنود کی بہت سی باتیں ہمارے تمدن اور معاشرت میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور چونکہ اہل ہنود کے قانون یا دہرم شاستر میں "ہندو عورت"، کو مستقل حقوق پیدا نہیں ہوتے اور وہ ایک کمزور اور محکوم ہستی خیال کیجاتی ہے لہٰذا اُن کے رسم و رواج اور قانون کی تقلید بھی مسلمانوں میں اکثر ہونے لگی ہے جس کا

نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں عورت ناقص العقل خیال کی جانے لگی اور بوجہ انکی تعلیم و تربیت نہ ہونے کے فی الواقعی ہماری مستورات کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے ہم کو اسلامی تعلیم پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے میں عرض کرونگا کہ اسلام یا تمدن اسلام نے حریت یا آزادی کے بارے میں جنس وار کوئی تخصیص نہیں کی۔ جن حقوق اور ذمہ داریوں کا کلام پاک اور رسول اکرم ؐ کی تعلیم میں ذکر ہے وہ سب مرد و عورت دونوں پر لازم ہوتی ہیں۔ مرد و عورت کو ہر قسم کے علوم و فنون سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بارے میں کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ ۔ "یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" قرآن شریف کا یہ حکم بلا کسی تخصیص اور پابندی کے ہے جس کے صاف معنی بلا کسی تاویل کے یہ ہیں کہ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ وہ ہر قسم کا علم سیکھیں۔ مزید براں رسول اکرم ؐ نے جن کی حیات ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے اس طرح تعلیم دی ہے کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ یعنی اے مسلمان مرد اور عورتو! تم علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین بھی جانا پڑے۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اکرم نے علم کو ایسا قابل قدر اور بہترین شئے سمجھا کہ تمام مسلمان مرد اور عورتوں کو ہدایت کر دی کہ علم کے حصول میں مسافت بحری و بری کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئے۔ یہ ایک مثال بطور نمونہ ہے۔ جو لوگ قرآن شریف کو بامعنی اور بغور پڑھتے ہیں اُن کو ظاہر ہوگا کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اکثر جگہ بلا کسی تخصیص کے مخاطب کیا ہے اور کل کلام الٰہی مردوں اور عورتوں دونوں پر قابل پابندی ہے میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ میں نے جہاں تک قرآن شریف کا مطالعہ کیا ہے کوئی آیت یا فقرہ ایسا نہیں پاتا جس میں عورتوں کی حریت اور آزادی کے متعلق اُن پر قیود عائد کئے گئے ہوں جن سے انکی ہستی یا حریت پامال ہو جاوے۔ بلکہ حُسن معاشرت یا تمدنی زندگی بسر کرنے کے لئے یہاں تک کہدیا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (سورۃ بقر)

ترجمہ ۔ عورت اور مرد دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں۔ لہٰذا اسلامی تعلیم سے ثابت ہے کہ بانی اسلام نے کوئی جکڑبند عورتوں کی حریت اور آزادی پر نہیں لگائی اور تاریخ اسلام سے یہ ثابت ہے کہ متمدن عرب اور اسلام کی قائم کی ہوئیں جمہوریات اور سلطنتوں میں عورتوں نے ہر شعبہ میں قابلِ فخر حصّے لئے ہیں اور اسلامی تاریخوں کے صفحات بیشتر اُن کے کارناموں سے مملو ہیں۔ اب ہمارے مبحث کا صرف اسقدر حصہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمین اپنی خاتونوں کو پردہ اور حرم میں کیوں رکھتے ہیں؟ کیا یہ اُن کی آزادی پر صریح قیود نہیں ہیں؟ اگر اقوامِ ترک نے اپنی خاتونوں کو اس بارے میں آزاد کر دیا تو کیا بُرا کیا اور ہم ہندی اُن کے فعل پر کیوں معترض ہوتے ہیں؟

قبل اس کے کہ ہم اس اہم مضمون پر کچھ عرض کریں ہمارے لئے بسا ضروری ہے کہ پردہ کے متعلق آیات قرآنی کو نظر تعمق سے دیکھا جاوے کہ آیا اسلام نے اس بارہ میں کوئی پابندی کی ہے یا کسی طرح اس بارے میں عورتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ محض پردہ میں بیٹھی رہیں اور کوئی جسمانی۔ دماغی اور روحانی ترقی نہ کریں؟

اس بارے میں کلام پاک کے مطالعہ سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کی عصمت کے متعلق نہایت تنبیہی الفاظ میں اُن کو پاکدامن رہنے کی فہمائش کی ہے اور فحش اور بے حیائی کو بدترین گناہ خیال کیا ہے۔ چنانچہ زانی اور زانیہ کو سخت سزائیں دینے کا حکم ہے۔ فی الواقعی فحش اور بدکاری کی زندگی مرد اور عورت دونوں کے لئے کسقدر نازیبا ہے۔ کیونکہ بغیر تعلق ازدواج کے ناجائز طریقہ سے عورتوں کے ساتھ معاشرت رکھنا کسقدر کریہہ اور مذہبی اور اخلاقی نقطہ نظر سے معیوب ہے۔ جہاں تک میں نے پڑھا اور غور کیا ہے کلام پاک میں عورتوں کو چہار دیواری کے اندر رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق قرآن پاک میں حسب ذیل آیات موجود ہیں۔

سورہ نور میں ایک مقام پر صرف مردوں کو یہ حکم دیا ہے قُل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذالک ازکی لھم۔ ان اللہ خبیر بما یصنعون (ترجمہ) (اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اس میں اُن کی زیادہ صفائی ہے۔ لوگ جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو سب خبر ہے۔ اس میں دوسری جگہ یہ حکم ہے۔ وَقُل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او آباءھن الخ (ترجمہ) اور (اے پیغمبر) مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر اس میں سے جو چار ناچار کھلا رہتا ہے اس کا ظاہر ہونے دینا مضایقہ کی بات نہیں ہے۔ اور اپنے سینوں پر دوپٹوں کے بُکل مارے رہیں اور اپنے زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں یا اپنے باپ وغیرہ پر الخ۔ سورۂ احزاب میں ایک مقام پر یہ آیت ہے کہ یا ایھا النبی قُل لِازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین ط وکان اللہ غفوراً رحیماً۔ (ترجمہ) (اے پیغمبر) اپنی بیبیوں۔ بیٹیوں۔ اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑیگی کہ نیک بخت ہیں اور کوئی چھیڑے گا نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں مدینہ کی ایسی حالت تھی۔ جیسے ہمارے یہاں دیہات کی۔ گھروں میں بیت الخلا نہیں تھے۔ شریف زادیاں قضاء حاجت کے لئے جھٹ پٹے کا وقت دیکھ کر آبادی سے باہر چلی جاتی تھیں اور بدکار اور فاجر شخص کسی عورت آتے جاتے دیکھ پاتے تو اس کو تنگ کرتے تھے اور اُن کو فہمایش کیجاتی تھی تو وہ جواب دیتے تھے

کہ ہم نے لونڈی سمجھا تھا۔ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کی انسداد کے لئے شروع میں یہ حکم دیا گیا کہ شریف زادیاں گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ پھر اسلام کی ترقی کے ساتھ مدینہ بڑا شہر ہو گیا اور لوگوں نے گھروں میں بیت الخلا بنائے۔ اور مستورات کو قضا حاجت کے لئے بستی کے باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس آیت کے مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ حضور صلعم کے زمانہ میں بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی اور تاریخ اسلام سے بھی ثابت ہے کہ وہ باہر نکل کر ہر طرح کا کام کاج کرتی تھیں اور محض مقتضائے وقت کی وجہ سے اُن کو چادریں اوڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا کلام پاک کے اِن احکامات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورتوں کو چہار دیواری میں رہکر زندگی بسر کرنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورت اور مرد بالکل آزاد ہیں مگر عصمت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا دونوں فریق کے لئے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیم کا لُب لباب صرف اسقدر ہے کہ مرد و عورت دونوں نگاہ بد جس سے بیحیائی پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے پر نہ ڈالیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے اور بلا کسی حجاب و رکاوٹ کے شریک جلسہ ہونے سے ایک دوسرے کے حیوانی جذبات کے مشتعل ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے جس کا نتیجہ بداخلاقی اور بد دینی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کاش ہم مسلمانان جادۂ اعتدال پر قائم رہتے اور اس مادہ پرستی کے دور میں اہل مغرب کی معاشرتی و مذہبی قوانین و ضوابط کو رات تقلید سے پہلوتہی کرتے اور محض اسلامی تعلیم اور اس کی روایات کو پیش نظر رکھکے دینی و دنیاوی حسنات حاصل کرتے۔

غزل

جناب نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری استاد حضرت دکن
خلد اللہ ملکہٗ

گرچہ دلمیں کوئی پیکاں نہیں قاتل باقی
لوٹتا ہوں کہ ابھی ہے خلشِ دل باقی

بجھ گئی آتشِ گل بادِ خزاں کے ہاتھوں
رہگئی گرمیٔ فریادِ عنادل باقی

کام کرنا ہے وہ تجھکو سرِ مقتل جس سے
نام رہجائے لبِ زخم پہ قاتل باقی

جس طرح پارۂ اخگر ہو تہِ خاکستر
دل ہوا خاک مگر ہے تپشِ دل باقی

ہو چکی جامہ دری دستِ جنوں بڑھ آگے
لطف کیا رہ گئے گر طوقِ سلاسل باقی

تم دئے جاؤ مجھے تیغِ ادا کے چرکے
میں کہے جاؤں ابھی ہے ہوسِ دل باقی

تنِ بسمل سے نکلتی جو نہیں جانِ حزیں
بات یہ ہے کہ تری یاد ہے قاتل باقی

رنگ کہتا ہے غریبوں کی دل آزاری کا
اُنکے پہلو میں ابھی تک ہے وہی دل باقی

اس تصور سے کہ ہنگامِ سحر کیا ہوگا
شمع گھلتی رہی جبتک رہی محفل باقی

خون آنکھوں سے ٹپکتا ہے میں خوش ہوتا ہوں
یہ سمجھ کر کہ ابھی ہیں جگر و دل باقی

قدرِ عشاق نہ کیوں شمع رخوں میں ہو جلیل
انہیں پروانوں سے ہے رونقِ محفل باقی

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی ڈاک

(از جناب سید حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر شمع)

(بہ سلسلۂ سابق)

آجکل ڈاک کا جو مفہوم ہے قطعی جدید ہے، ابتدا میں یہ محض سرکاری محکمہ تھا، جو سلطنت کے مختلف مقامات کے درمیان تعلقات کے قیام اور وہاں کی خبریں لینے کی غرض سے جاری ہوا تھا۔

ہندوستان میں ۱۸۳۷ء تک ڈاک، عام طور پر مروج نہ تھی، اور پیام رسانی کا کام سرکاری یا نجی ہرکارے انجام دیتے تھے، امپیریل گزیٹیر میں ذکر ہے کہ "قاصد، پیامبر اور ہرکارے ڈاک کا کام اچھی طرح انجام دیتے تھے، اور یہی طریقہ اس ملک میں عرصہ تک رائج تھا اور کامیاب تھا، یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اس کی ابتدا کب سے ہوئی، لیکن تاریخی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے پٹھان بادشاہ علاء الدین خلجی کے عہد میں ڈاک کا محکمہ موجود تھا، سلطان علاء الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت نشین ہوا تھا، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان نے گھوڑوں اور پیادوں کے ذریعہ سے ڈاک کا انتظام کیا تھا تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں سلطانی افواج پر چڑھائی کریں، تو ان کے حالات اور جنگ کے واقعات کی اطلاعیں سلطان تک پہنچتی رہیں، اسی محکمہ کے ذریعہ سے

اشیار بازاری کا نرخ، اور سلطنت کے حالات کی اطلاعات دربار میں آتی تھیں،
سلطان محمد تغلق کے عہد میں ڈاک کا محکمہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا چنانچہ اس کی شہادت ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملتی ہے، ابن بطوطہ ۱۳۴۱ء میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے "اس ملک یعنی ہندوستان میں قاصدوں کی دو قسمیں ہیں سوار، اور پیادہ سوار قاصد، سلطانی لشکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر چار میل پر تعینات رہتے ہیں، پیادہ قاصد ایک میل کے فاصلہ سے تعینات رہتے ہیں اور تین میل تک جاتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چابک رہتا ہے جس میں گھونگرو لگے ہوتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا ہوتا ہے۔ یہ لوگ چابک کو ہلاتے ہوئے دوڑتے ہیں اور ڈاک کی قریب ترین چوکی تک جاتے ہیں، اور وہاں چابک کو ہلاتے ہیں، گھونگرو کی آواز سنکر دوسرا قاصد دوڑتا ہے اور ڈاک کا تھیلا لیکر اسی طرح چابک کو بجاتا ہوا آگے کی ڈاک کی چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے، اس طرح پر سلطان تک ڈاک پہنچ جاتی ہے اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔
شہاب الدین ابوالعباس احمد نے، جو ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا، اسی قسم کی تفصیل لکھی ہے، ڈاک کے سلسلہ میں مسلمان مورخین نے سکندر لودی (۱۴۸۸ء لغایتہ ۱۵۱۸ء) اور بابر کا بھی نام لیا ہے، سکندر لودی نے تو ہر جگہ ڈاک کی چوکیاں قائم کردی تھیں۔ اس کی فوج جہاں کہیں جاتی تھی، روزانہ دو مرتبہ سلطانی فرامین وصول کرتی تھی، جو فرمان علی الصبح پہنچتا تھا اس میں دن بھر کے کوچ کے بعد قیام کے متعلق ہدایتیں ہوتی تھیں، اور دوسرے پیغام میں جو تیسرے پہر وصول ہوتا تھا احکام ہوتے تھے" یہ طریقہ سختی سے جاری تھا، ڈاک چوکی پر گھوڑے تیار رہتے تھے، اور سلطان کو ملک کے ہر پرگنہ کے حالات، اور اشیار کے نرخ کی اطلاعات روزمرہ پہونچتی تھیں، شہنشاہ بابر نے آگرہ سے کابل تک کی سڑک کی پیمائش کا حکم دیا تھا، چنانچہ بابرنامہ میں ذکر ہے کہ سترہ دسمبر ۱۵۲۸ء کو بادشاہ نے یہ حکم صادر فرمایا، اور اسی دن چقماق بیگ روانہ ہوگیا، کام کا طریقہ یہ تھا" ہر نوکروہ کے فصل

پر ایک مینار بنایا جائے جو چوبیں فیٹ بلند ہو، اور اس کی چوٹی پر چار طرف چار دروازے ہوں، اور ہر اٹھارہ کروہ پر چھ گھوڑے تیار رہا کریں، گھوڑوں کے دانہ اور سائیسوں و افسران ڈاک کی تنخواہ کا معقول بندوبست کیا جائے" لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس اسکیم کا کیا نتیجہ نکلا،

شیر شاہ (سنہ ۱۵۴۰ء لغایۃ سنہ ۱۵۴۵ء) کی حکومت مسلمانوں کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اسی عہد میں سیاسی اور اقتصادی ترقیاں ہوئی تھیں، اور حکومت و انتظام کے جدید قواعد بنائے گئے تھے، شیر شاہ نے سراؤں، سڑکوں، اور پلوں کے علاوہ سوار قاصدوں کا انتظام بھی کیا تھا جو ملک کے ہر گوشہ میں موجود رہتے تھے، اور ملک کے بعید ترین مقامات سے بھی اوس کو روزانہ اطلاعات پہنچتی رہتی تھیں، مختلف سڑکوں پر تقریباً سترہ سو سرائیں موجود تھے ہر سرا میں دو گھوڑے تیار رہتے تھے تاکہ خبریں جلد پہنچائیں، یعنی صرف خبر رسانی کے لئے ملک میں تین ہزار چار سو گھوڑے روزانہ دوڑتے تھے، شہنشاہ اکبر (سنہ ۱۵۵۶ء لغایۃ سنہ ۱۶۰۵ء) غالباً پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد میں ڈاک لیجانے کے لئے اونٹ استعمال ہوئے، آئین اکبری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں ڈاک کے انتظام بہت معقول تھا، "ریباڑی، ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے، یہ لوگ اونٹوں کی عادات سے خوب واقف ہیں، اور دیسی اونٹ یعنی لوک کو تیز قدمی سکھا لیتے ہیں، اگرچہ سلطنت کے حدود سے پایہ تخت تک ہر طرف گھوڑوں کی قطاریں تیار کھڑی رہتی ہیں اور تیز قدم ہرکارے ہر چار کوس پر تعینات رہتے ہیں لیکن محل شاہی میں چند اونٹ بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں" یوروپین سیاحوں میں الگزینڈر ہیملٹن ایسا شخص ہے جس نے سترہویں صدی میں ہندوستان پہنچ کر یہاں کی ڈاک کے حالات کو مشرح طور پر بیان کیا ہے۔

"مغلوں کی سلطنت میں ڈاک بہت تیز جاتی ہے، کیونکہ شاہراہ پر ہر دس میل کے فاصلہ سے کاروان سرائیں بنی ہوئی ہیں، جہاں نہایت تیز قدم آدمی ہر وقت تیار کھڑے

رہتے ہیں مثلاً بکسوں میں خطوط رکھ کر اپنے سر پر لیجاتے ہیں، سرائے میں پہنچ کر دوسرا ہرکارہ اس بکس کو لے لیتا ہے اور دوسری سرائے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، تمام رات اور دن یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، ان لوگوں کی رفتار پانچ چھ میل فی گھنٹہ ہے اور آٹھ دن کے اندر سلطنت کے بعید ترین گوشوں سے پائے تخت تک خطوط پہونچ جاتے ہیں۔

مغلوں کے زمانہ میں اخبار نویسوں کی کئی قسمیں تھیں (۱) وقائع نویس، یا وقائع نگار (۲) سوانح نگار (۳) خفیہ نویس اور (۴) ہرکارے۔ یہ لوگ تمام ملک کی خبریں لاتے تھے، ان کے افسر اعلیٰ کا عہدہ داروغہ ڈاک چوکی کے نام سے موسوم تھا، تمام خطوط اور ڈاک اسی کے پاس آتی تھی اور وہ سربمہر حالت میں اُن کو وزیر کی خدمت میں پیش کرتا تھا تاکہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، ایک فارسی قلمی تاریخ میں مذکور ہے کہ وقائع ہفتہ میں ایک بار، سوانح اور ہرکاروں کے اخبار، مہینہ میں (۹) ایک بار اور نال میں رکھکر تحریرات مہینہ میں دو بار وصول ہوتی تھیں، ضروری امور کی اطلاعات ان کے علاوہ ہوا کرتی تھیں، ملک کے مختلف صوبوں سے پائے تخت کو خبریں پہونچانے کے لئے معقول اور مستقل انتظامات ہوتے ہوں گے، کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی تصنیف مراۃ احمدی مصنفہ محمد علی خاں، دیوان گجرات میں ڈاک کی ترتیب اور باقاعدگی کا مفصل ذکر ہے، اس تصنیف کی رُو سے، صوبہ کا اخبار نویس کے پاس ہر شہر اور ضلع سے اخبار وصول ہوتے تھے شام کو اُس کے پاس تمام اطلاعات جمع ہو جاتی تھیں، اور وہ اونٹ سوار کے ذریعہ سے اُنکو دربار میں بھیجدیتا تھا۔ سوانح نگار کے دفتر میں افواہ قلمبند ہوتی تھیں، اور صوبہ دار کے ساتھ ہرکارے بھی رہتے تھے۔ ڈاک کی چوکیوں کا سلسلہ احمد آباد سے اجمیر کی سرحد تک قائم تھا، جہاں ہر چوکی پر، آدمی اور گھوڑے تیار رہتے تھے اور شاہی ڈاک کو سات دن کے اندر شاہجہاں آباد پہنچا دیتے تھے، اسی طرح ڈاک کا ایک اور سلسلہ تھا جو بہروچ ہو کر دکن تک پھیلا ہوا تھا،

کرنل ویلکس کا بیان ہے کہ راجہ چک دیونے جو ۱۶۷۲ء میں تخت نشین ہوا تھا مسلسل ڈاک رسانی کا انتظام میسور میں کیا تھا، اور وہاں پر ڈاک خانہ صرف خبریں پہنچانے کا کام نہیں کرتا بلکہ خبریں حاصل بھی کرتا تھا، پوسٹ ماسٹر اور اُس کے عملے علاوہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے، حکومت کے معتبر ملازم تھے جو اپنے شہروں کی خفیہ باتوں سے حکومت کو مطلع کرتے رہتے تھے، حیدر علی کے زمانہ میں تو اس طریقہ کو بہت زیادہ کامیابی ہوچکی تھی،

ہندوستان میں قرون وسطی میں ڈاک محض سرکاری اغراض کے لئے تھی۔ نجی کاموں کے لئے نہ تھی، نجی خطوط کو خاص آدمی لاتے اور لیجاتے تھے جو مخصوص تجارتی شہروں میں ملتے تھے، ممکن ہے کہ سرکاری ہرکارے بھی نجی خطوط کو معاوضہ لیکر لاتے لیجاتے ہوں، نجی خطوط لیجانے والوں کے نام مختلف تھے، کہیں اُن کو قاصد کہا جاتا تھا کہیں پتامبر اور کہیں ہرکارہ۔

پیٹر منڈی کے زمانہ میں (۱۶۲۸ء لغایتہ ۱۶۳۴ء) بازاری قاصد پٹنہ سے آگرہ تک گیارہ اور پندرہ دن کے درمیان میں خط پہنچا دیتے تھے، اور تیز رفتار قاصد دہلی سے سورت پندرہ بیس دن میں پہنچتے تھے، گواسے ماسولی پٹم تک پتامبر بیس دن میں جاتے تھے۔ ڈاکٹر فرائر کا بیان ہے کہ دکن میں صرف پتامبر پیدل ڈاک لے جاتے تھے۔

۱۶۱۲ء میں عام ڈاک کا رواج ہوا، نجی خطوط کو کمپنی کے چپراسی (قاصد اور پتامبر) محصول ڈاک لیکر جاتے تھے، انگریزوں کو ابتدا میں بہت دقت ہوئی۔ اور مجبوراً قاصدوں کو نوکر رکھنا پڑا، لیکن ۱۶۸۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس اور بمبئی میں ڈاکخانہ قائم کردیے تاکہ سوداگروں اور خود کمپنی کو سہولت ہو، کمپنی کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا بھی مد نظر تھا۔ کمپنی کی طرف سے بمبئی میں حسب ذیل ہدایات شائع

ہوئی تھیں" ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح تم بھی ڈاک خانہ قائم کرو، جہاں سے خطوط روانہ ہوسکیں اور جہاں پہونچ سکیں، اور ایک خط کے مقابلہ میں دو اور تین خطوط پر دوگنا اور تین گنا محصول لگاؤ، تاکہ چند سال کے عرصہ میں کمپنی کی آمدنی بہت زیادہ ہوجائے اور سوداگروں کو بہت زیادہ آرام اور سہولتیں حاصل ہوجائیں۔ اس کام کے لئے تم کو مناسب مقامات پر چوکیاں قائم کرنا، اور کشتیوں کا بھی انتظام رکھنا چاہئے تاکہ سورت اور بمبئی کے درمیان میں خطوط باسانی اور بہ حفاظت بھیجے جاسکیں۔ اور توقف بھی نہ ہو" مدراس کو بھی اسی قسم کی ہدایتیں بھیجی گئی تھیں، چنانچہ وہاں پر ۱۷۱۲ء میں ڈاک خانہ قائم اور مختلف مقامات کے درمیان میں خط وکتابت کے سلسلے جاری ہوگئے۔ پہلے مدراس سے بنگال میں خط دو تین مہینہ میں آتا تھا، لیکن اب تیس ۳۰ دن میں آنے لگا۔ ابتدا میں جو محصول مقرر ہوا تھا اس کا پتہ نہ چل سکا، لیکن ۱۷۲۰ء میں جو محصول رائج تھا حسب ذیل تھا۔

قلعہ سینٹ جارج سے	وزیگاپٹم کو	چار فانم
" " "	بنگال کو	چھ فانم
" " "	بمبئی اور سورت کو	نو فانم

اس کے بعد کے حالات ہم کو معلوم نہیں، لیکن لارڈ کلایو کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ۱۷۶۶ء میں مستقل طور پر ڈاک کا سلسلہ قائم ہوا، اس کے متعلق جو حکم ہے اس کی سرخی تھی، "ڈاک کے بہتر انتظام کے لئے"، اور حکم تھا کہ آیندہ سے ڈاک گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ کی جائے۔ پوسٹ ماسٹر یا اس کے ماتحت دن رات حاضر رہکر ڈاک کو چھانٹیں اور روانہ کریں، اندرون ملک کے مختلف مقامات کے خطوط کے الگ الگ گڈیاں بنائی جاویں اور تھیلوں میں بھر کر سر بمہر کر دیے جائیں، مہر کمپنی کی ہو، اور سوائے افسران محکمہ کسی کو ان کے کھولنے کی اجازت نہ ہو، نیز یہ بھی حکم تھا کہ یہی قواعد کلکتہ کو ڈاک روانہ کرتے وقت عمل میں لائے جائیں" بعد کو اور بھی قواعد مرتب ہوئے جن کا مقصد ڈاک کو جلد تر اور زیادہ حفاظت

سے پہنچانا تھا، وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں اور زیادہ ترمیم ہوئی۔ اور سنہ ۱۷۷۴ء میں کلکتہ میں ایک پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر ہوا، اور ڈاک کا ادنیٰ ترین محصول دو آنہ فی سو میل قرار دیا گیا۔ اور تانبے کے دو آنے والے ٹکٹ خاص طور پر مسکوک کئے گئے۔ وارن ہیسٹنگز نے سنہ ۱۷۸۴ء میں ڈاک کے قواعد کو ترمیم کیا اور سنہ ۱۸۳۷ء تک مختلف قسم کے ردوبدل ہوتے رہے، لیکن اس سنہ میں ڈاک کا انتظام گورنمنٹ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محصول لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حدود کے اندر ڈاک پہنچانے کی خود ذمہ دار ہو گئی۔

سنہ ۱۷۷۵ء سے کئی سال قبل مدراس اور بنگال کے درمیان ہفتہ میں دو بار ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تھا، لیکن اب تک مدراس اور بمبئی یا بمبئی اور کلکتہ کے درمیان کوئی مستقل سلسلہ نہیں تھا۔ یورپین سوداگروں کی عرضداشت کا لحاظ کر کے گورنمنٹ نے مدراس اور بمبئی کے درمیان سنہ ۱۷۸۸ء میں سلسلۂ ڈاک جاری کر دیا جو پندرہ روزہ تھا، حیدرآباد اور پونا ہو کر ڈاک آتی جاتی تھی اور پورے پچیس ۲۵ دن لگتے تھے، سنہ ۱۷۹۰ء میں ہفتہ وار ڈاک کر دی گئی اور راستہ بھی بدل دیا گیا اب ڈاک بمبئی سے ماسولی پٹم اور وہاں سے کلکتہ اور مدراس کو جانے لگی۔ اس طرح وقت میں بھی کفایت ہو گئی اور کلکتہ سے بمبئی چھبیس ۲۶ یوم میں، اور بمبئی سے مدراس سترہ یوم میں اور مدراس سے کلکتہ کو انیس یوم میں ڈاک آنے جانے لگی۔ ڈاکیہ ہمیشہ پیدل چلتے تھے، اُن کا ایک کوچ سات آٹھ میل کا ہوتا تھا، اور چوبیس گھنٹہ میں عموماً ستر میل کی مسافت طے کرتے تھے۔

ڈاک کے محصول کی شرح فاصلہ اور ڈاک کے وزن کے لحاظ سے مقرر ہوتی تھی، لیکن ان میں جلد جلد ردوبدل ہوتا رہتا تھا، سنہ ۱۷۸۸ء میں مدراس اور بمبئی کے درمیان میں حسب ذیل شرح تھی۔

ایک خط	عہ ؍
دو خط	للعہ ؍

تین خط

پارسل پیکٹ کی شرح للعہ اونس تھی ۱ نومبر ۱۷۸۹ء سے کے بعد ڈھائی تولہ تک کی ڈاک کی شرح یہ تھی۔

بمبئی سے پونا تک ۵۲ کوس ۲؍
" " حیدرآباد تک ۲۲۲ کوس ۸؍
" " ماسولی پٹم تک ۳۳۱ کوس ۱۲؍
ماسولی پٹم سے مدراس تک ۳۲۳ میل ۳ فانم ۴؍
" " گنجم تک ۴۲۸ میل ۴ فانم ۸؍
گنجم سے کلکتہ تک ۳۰۵ میل ۵؍

ڈھائی تولہ سے ساڑھے تین تولہ تک کے خطوط کی شرح دوگنی تھی۔ ساڑھے تین تولہ سے ساڑھے چار تولہ تک شرح تن گنی تھی۔ ساڑھے چار تولہ سے ساڑھے پانچ تولہ تک چوگنی تھی۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس ۱۷۹۵ء میں شرح حسب ذیل تھیں۔

کلکتہ سے	اگر ڈھائی تولہ اور اس سے کم وزن ہو
بارک پور	۱؍
راج محل	۳؍
پٹنہ	۵؍
بنارس	۴؍
ڈھاکہ	۳؍
چاٹگام	۶؍
بمبئی	عہ ۹؍
مدراس	صہ ۱۰۲؍

ڈھائی اور ساڑھے تین تولہ کے درمیان خطوط کا شرح ڈبل تھی، ساڑھے تین اور چار تولہ کے درمیان تین گنی تھی اور علیٰ ہذا۔ ۱۷۹۰ء میں شرح میں پھر تبدیلی واقع ہوئی روپیہ سے کم وزن کا خط ایک خط روپیہ اور ڈیڑھ روپیہ کے درمیان وزن ہو تو دو خط، اور ڈیڑھ اور ڈھائی کے درمیان وزن ہو تو تین خط شمار ہوتے تھے۔ ایک خط پر سو میل کا محصول ڈیڑھ قائم تھا، لیکن ۱۸۵۴ء میں فاصلہ کا سوال نظر انداز کر دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی سے قبل وزنی پارسلوں کے بھیجنے کا بھی قاعدہ مقرر تھا۔ پارسل بھینگیوں میں جاتے تھے اور اس طریقہ کو بہنگی ڈاک کہتے تھے، اور انگلستان میں پارسل کا قاعدہ رائج ہونے سے ایک سو سال قبل ہندوستان میں اس طریقہ کو رواج تھا، ڈاک کی بہ نسبت پارسل کی رفتار کم تھی۔ لیکن اگر گھڑی کو مرمت کے لئے الہ آباد سے کلکتہ بھیجتے تھے تو وہ ایک مہینہ میں بن کر آجاتی تھی۔ فقط

(ترجمہ)

غزل

(مصور جذبات حضرت میرزا ثاقب لکھنوی)

اہلِ غم سے عشرتِ عالم کا ساماں ہو گیا
جب زمیں کے داغ اُبھر آئے گلستاں ہو گیا

اپنی حد سے بڑھ کے جاتا کس طرف کوئی مرا
جان پڑتے ہی یہ مُشتِ خاک بیجاں ہو گیا

اتحادِ باہمی کا ہے نتیجہ زندگی
ذرے کیا شے تھے مگر ملنے سے انساں ہو گیا

مٹ گئے دورِ فلک سے جاں نثاروں کے مزار
آپ کا آباد ویرانہ بیاباں ہو گیا

ایک قطرہ بحرِ عصیاں کا تھا جو یوں سر چڑھا
پلتے پلتے دامنِ عالم میں طوفاں ہو گیا

عشق کے بعد اب حوادث کی ضرورت کیا رہی
آسماں دم لے مرے مرنے کا ساماں ہو گیا

کاروانِ اشک کو میں ڈھونڈنے جاؤں کہاں
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

اک بلائے بد تھی ایسی زندگی جو کٹ گئی
زندہ باش اے مرگ دردِ دل کا درماں ہو گیا

زخمِ دل پہلے ہی دامن دار تھا پر حشر میں
موقعِ فریاد پا کر چاکِ داماں ہو گیا

سیرِ عالم کے لئے کچھ چھوڑ اے دستِ جنوں
اب تو دامن کی جگہ سینہ گریباں ہو گیا

سیکڑوں داغوں کے دھبے ہیں وہ جلوے اب کہاں
دل مٹا اور مٹ کے بھی صحنِ گلستاں ہو گیا

حشر میں پہچان کر قاتل کا منہ تکتا رہا
جب ضرورت ہوش کی دیکھی تو حیراں ہو گیا

خفتگانِ خاک کتنا بے محل سوئے کہ اب
مجمعِ احباب اک خوابِ پریشاں ہو گیا

انقلاب آکر مدد دیتے ہیں استعداد کو
کروٹیں بدلیں لہو نے اور انساں ہو گیا

راستہ وحشت کو آخر مل گیا تنگی میں بھی
یہ گریباں تھا جو دو ہاتھوں میں داماں ہو گیا

بلبلو نکلے دل گلوں کے ساتھ مٹی میں ملے
جو چمن اُجڑا وہی گورِ غریباں ہو گیا

دل تو ہے سینہ میں پر جمعیتِ خاطر کہاں
اس کا شیرازہ تو زلفوں سے پریشاں ہو گیا

وسعتِ صحنِ جہاں کچھ کم نہ تھی اے عشق دوست
کیوں گھٹا اتنا کہ دل والوں کو زنداں ہوگیا

باغباں کی رائے ہیں۔بیں بے حقیقت تھا مگر
بعد میرے آشیاں داغِ گلستاں ہوگیا

رُک چلا ہے بیچ میں خنجر الٰہی خیر ہو
دم نہ نکلے گا اگر قاتل پشیماں ہوگیا

ہم کو صحرا نے غباری پیرہن پہنا دیئے
جن کا کچھ ساماں نہ تھا اُنکا بھی ساماں ہوگیا

جب کوئی آنسو مژہ پر آکے چمکا شامِ غم
میں یہ سمجھا صبح کا تارا نمایاں ہوگیا

شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں
زلف تو سمٹی مگر ہاں دل پریشاں ہوگیا

کم سے کم پر آج راضی ہیں شہیدوں کے مزار
آپ ہنس دینگے تو سمجھیں گے چراغاں ہوگیا

جس میں لاکھوں پھول تھے ثاقب وہ گلشن ہائے ہائے
ایک ہی گردش میں گردوں کی بیاباں ہوگیا

علما کی صحبت

تقریر جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے، ناظم محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد دکن اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر، مورخہ ۶ر نومبر سنہ ۱۹۲۶ء میں فرمائی۔

سیّد جمیل حسن، ایم۔ اے،

جناب صدر انجمن صاحب ومعزز حاضرین اور عزیز طالب علموں! آپ کے لایق صدر نے چند روز ہوئے جب وہ بلادے تشریف لے گئے تھے۔ مجھ سے ازراہ کرم فرمایا تھا کہ یورپ کے علمار کی صحبت سے جو اثر میرے دل پر ہوا۔ اُس کا ذکر اِس جلسے میں آپ کے سامنے کردں، اُن علمار کی سادہ اور بے لوث زندگی، علمی تبحر، مطالعے میں انہماک اور تحقیق کا شوق ایسی خصوصیات ہیں جو ہندوستان کے طالب علم کو خواہ اُس نے مغربی طرز کے مدارس میں تعلیم پائی ہو۔ یا ایشیائی مکتبوں اور آشرموں میں پروان چڑھا ہو، ضرور عجیب نظر آتی ہیں۔ جب کسی قوم میں انحطاط آتا ہے۔ تو اُس کا معیار علم بھی پست ہو جاتا ہے۔ ناداری اور افلاس کی بلا اخلاق کو خراب کر دیتی ہے۔ معلموں کی اور عام پیشہ ور دں کی زندگی میں مطلق فرق نہیں رہتا۔ ذاتی مفاد، تحصیل وتدریس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ اور علمی، تلاش کا حقیقی ذوق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ہمارے بدنصیب ملک کی آجکل یہی حالت ہے۔ مغربی تعلیم حاصل کرنے کی غرض محض کسب معاش ہے۔ اور مشرقی مدارس کی غایت ثواب اُخروی۔ علم کی جستجو محض علم کے شوق کی وجہ سے اس سرزمین میں آجکل عنقا ہے۔ اس تنزل کے اسباب خواہ سیاسی ہوں خواہ معاشی، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ صحیح معنوں میں علمی چرچوں سے ہم ناآشنا ہو گئے ہیں۔ اور تہی دستی اور بدذوقی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کہ اگر ہم کسی میں بھولے بسرے یہ شوق دیکھتے بھی ہیں۔ تو ہم کو تعجب ہوتا ہے اور اُسکی

غایت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

طالب علم کے دل و دماغ پر استاد کی زندگی اور طرز معاش کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور حقیقی طور سے پوچھئے تو وہ تربیت جو طالب علم کو خود بخود اس اثر سے حاصل ہوتی ہے ۔ وہ قومی فلاح اور کامیاب زندگی کے لئے ایسی تعلیم سے جو امتحانات کے پاس کرنے یا دستار فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے کتابوں کے درس کے ذریعہ سے دی جاتی ہے، بدرجہا ضروری اور لازم ہے ۔ ہندوستان والوں کو کیمبرج اور اکسفورڈ یا یورپ کی بعض اور قدیم درسگاہوں میں ایک اور بات جو غیر معمولی نظر آتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ پروفیسر طالبعلموں کو اس طور سے سبق نہیں دیتے جیسا کہ ہماری تعلیم گاہوں میں رواج ہے کہ استاد نے طالبعلموں کو ایسی یادداشتیں لکھادیں جو امتحان میں کارآمد ہوسکتی ہیں اور جن کو حفظ کرکے طالب علم، کامیاب ہوگئے وہاں کے پروفیسروں کا وقت زیادہ تر خود اپنی علمی تحقیقات میں گزرتا ہے، طالب علموں کو بھی مناسب ہدایات دی جاتی ہیں لیکن یہ ہدایات تیار لقمے کی صورت میں نہیں ہوتیں بلکہ اُن کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کن ذرائع سے اور کن کتابوں سے اپنے معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کالجوں میں استاد بجائے بچوں کے دودھ پینے کی عادت کے چھڑانے کے جو ایک خاص وقت تک ضروری ہے اس عادت کو آخری وقت تک جاری رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا طالبعلم ایم۔ اے۔ کے امتحان کے واسطے بھی اُسی طرح اُستاد کی یادداشتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ جیساکہ وہ مدرسے کی ابتدائی جماعات میں تھا۔

میں نے آپ سے ابھی عرض کیا کہ استاد کی زندگی کا طالب علم کے اوپر بڑا اثر ہوتا ہے یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں علمی ترقی کا راز دراصل استادوں کی زندگی اُن کا علمی انہماک اور شغف گرید ایک ربانی ہے جس میں طالب علم خود بخود رنگ جاتا ہے اور حقیقی شوق جو علم کی جستجو کے لئے لازمی ہے اُس میں پیدا ہوجاتا ہے۔ میں اب آپ کو چند اساتذہ سے اپنی ملاقات

کا ذکر سناؤں گا جس سے میرے خیالات اور واضح ہو جائیں گے۔

پروفیسر بیون کا نام آپ نے سنا ہوگا یہ کیمبرج میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ساری عمر عربی لغت کی تحقیق میں صرف ہوئی ہے۔ اور اب اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بدن پتلا دبلا ہے اور مزاج میں زیادہ شگفتگی نہیں۔ اس لئے طالب علم ان کے پاس آنے جانے سے گھبراتے ہیں۔ باہر کم نکلتے ہیں اور زیادہ وقت مطالعے میں اپنی قیامت گاہ میں جو کالج کے اندر ہی گذرتا ہے سو جان مارشل نے جو کیمبرج کے پرانے طالب علم ہیں میرے آنے کے متعلق پروفیسر صاحب موصوف کو لکھدیا تھا چنانچہ جب میں اُن کی اقامت گاہ پر پہنچا اور دستک دی تو بہت دیر تک کچھ جواب نہ آیا معلوم ہوتا ہے مطالعے میں مستغرق تھے جب دروازہ کھلا تو میں نے اپنا کارڈ شناسائی کی غرض سے دیا اُسے ہاتھ میں لے لیا اور بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا لیکن اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا خیال ابھی مطالعے ہی کی طرف تھا یہ کیفیت کوئی پانچ منٹ تک رہی مجھے اُن کے سکوت کو دیکھکر افسوس ہوا کہ میں نے اُن کو ناحق تکلیف دی آخر میں اُٹھنے لگا یکایک کچھ چونک سے پڑے کہنے لگے۔ بیٹھو بیٹھو، کچھ سُناؤ کیا کیا کرتا ہے کہاں کہاں جانا ہے؟ میں نے اجمالی طور سے اپنے سفر کی غایت بیان کی اور اسلامی فن تعمیر کی ضمن میں کہیں مسجد کی ابتدا کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے۔ مسجد کا لفظ عبرانی کتابوں میں بھی آیا ہے، اور سریانی زبان میں لفظ مسجد کے معنی تقریباً وہی موجود ہیں، جو اسلام کی اشاعت کے بعد اس لفظ کے عربی زبان میں پیدا ہو گئے۔ پھر اس رائے کی تائید میں اتنے حوالے دیئے اور اتنی دقیق بحث کی کہ میرے فہم سے باہر تھی۔ میں چپکا بیٹھا سُنتا رہا۔ لیکن اُن کے شوق اور انہماک کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور دل میں یہ خیال آیا کہ اے کاش یہ شوق ہمارے ملک کے ہونہاروں میں بھی پیدا ہو جائے۔

اب میں آپ کو پروفیسر براؤن مرحوم کا حال سُناتا ہوں اُن کی عجب شخصیت تھی، دیکھنے میں تو ذرا سے آدمی تھے اور کوز پشتی کا عیب بھی موجود تھا، لیکن جب بات کرتے

تھے تو چہرے سے کمال ذہانت ٹپکتی تھی - اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے - طبیعت میں انتہا کا انکسار اور حلم تھا - اسی وجہ سے طالب علم اور آنے جانے والے اُن کا بہت وقت ضائع کرتے تھے - ایشیائیوں کے لئے مہمانی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا - میرے آنے کا جب حال معلوم ہوا تو ڈاکٹر بذل الرحمٰن سے جو اس وقت کیمبرج میں تھے کہا کہ اُن کو سیدھا اسٹیشن سے میرے پاس لے آنا - دو دن تک مہمانی رہی، پُر لطف باتیں کرتے تھے - اِن دونوں بیوی کی علالت کی وجہ سے ذرا طبیعت میں انتشار تھا - اور اپنی صحت کی خرابی کو بھی محسوس کر رہے تھے - مسوّدوں کے بستے دکھائے کہا کہ خدا اس ذمہ داری کو پورا کرے - آنکھ میں چونکہ بے حد لحاظ تھا، اس لئے بعض اوقات چھپ چھپکر کام کرتے تھے

ایران اور اہل ایران کے ساتھ حقیقی عشق تھا - اپنے ملک کی نگاہ جب کبھی بدلی ہوئی دیکھتے تھے، فوراً ایران کی بھلائی کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، اُس پُر خلوص محبت اور شیفتگی کی وجہ سے سیاسی عہدہ دار بھی اُن کا ادب کرتے تھے - سر دولزے ہیگ ایک قصہ سناتے تھے - وہ جب مشہد میں قونصل جنرل تھے ایک شاعر کو ایرانی سلطنت نے غداری اور بغاوت کے جرم میں قید کر دیا - شاعر نے پروفیسر براؤن کو عرضی لکھی اور مدد چاہی اُن کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ فوراً سر دولزے کو خط لکھا کہ جس طرح ممکن ہو، شاعر کو چھوڑا دو، یہ سمجھو کہ براؤن کا بیٹا قید ہو گیا ہے اور دستگیری کا وقت ہے - سر دولزے کہتے ہیں کہ شاعر کے جرم میں مطلق شبہ نہ تھا، لیکن براؤن کی محبت کو دیکھ کر مجھے شاعر کو بغیر رہا کرائے بن نہ پڑی -

یہ محبت ہی تھی کہ اس فاضل نے ایران کی ادبیات کو اس خوبی سے سمجھا ہے، لیکن باوجود تبحر کے کبھی کسی قسم کی لن ترانی اُن کی زبان سے نہیں سنی گئی - شبلی کی تالیف "شعر العجم" کے متعلق فرمانے لگے کہ "یہ ایسے وقت لکھی گئی، جب میں اپنی کتاب بہت کچھ لکھ چکا تھا -

اور چونکہ یہ اُردو میں لکھی گئی۔ اس لئے اس کے مطالعے میں مجھے بیحد دقت پیش آئی۔" جب پروفیسر براؤن کے انکسار اور فضیلت کا مقابلہ ہندوستان کے علماء کے مبلغ معلومات اور تعلّی سے کیا جاتا ہے تو ان حضرات کے حال پر تاسف ہوتا ہے، اور اُن کے تنگ مایگی پر غیر قوم والوں کے سامنے شرم آنے لگتی ہے۔

کیمبرج کے ایک پروفیسر کا ذکر میں اور کروں گا۔ اُن کا اسم گرامی "مسر ولیم رجوے" ہے۔ یہ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ میں نے اُن کی بعض تنقیدیں پڑھی ہیں۔ خلاف واقعہ باتوں اور غلط بیانی کے دشمن ہیں۔ اور اس قسم کی کمزوریوں پر مصنفین اور مؤلفین کی دھجیاں اُڑانے میں مطلق نہیں چوکتے۔ علم الآثار کے پروفیسر ہیں اور سر جان مارشل کے استاد ہیں۔ پروفیسر براؤن نے جب یہ سُنا کہ مجھے "سر ولیم رجوے" سے بھی ملنا ہے، تو پہلے تو بہت تعجب کیا لیکن پھر مسکرا کر چپ ہو رہے۔ کیمبرج میں اس زمانے میں موسم گرما کی تعطیل ہو گئی تھی۔ اور "سر ولیم" اپنے ذاتی مکان میں چلے گئے تھے، یہ لب دریا کیمبرج سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں کشتی میں سوار ہو کر اُن سے ملنے گیا۔ یہ بھی عجیب سیر تھی۔ لیکن اس وقت اسُ کا ذکر موجودہ مضمون سے متعلق نہیں۔ "پروفیسر رجوے" کا سن ستر سال سے زیادہ ہوگا۔ نہایت بلند قامت ہیں اور ہاتھ پیر خوب مضبوط ہیں لیکن بینائی نے بالکل جواب دے دیا ہے، میرے آنے کی خبر ملی، تو فوراً نکل آئے اور میری پشت پر ہاتھ رکھ کر مجھے سینے سے لگالیا اور کہنے لگے: "مجھے تمہارے آنے سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم میں تیسری پیڑی نظر آتی ہے۔ "سر جان مارشل" میرے شاگرد ہیں اور تم اُن کے" پھر اُن کی بیوی آ گئیں، اُن سے بھی اسی طرح تعارف کرایا۔ اور ایسی محبت سے باتیں کرتے رہے، جیسے کوئی اپنے بچوں سے کرتا ہے، پھر اپنے گھر کی ایک ایک چیز دکھائی۔ بصارت کی کمی کی وجہ سے چلنا پھرنا دشوار تھا، لیکن میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صحن میں گئے اور ایک دھوپ گھڑی دکھائی، جس کی کچھ تاریخی اہمیت تھی، اس کا سارا حال سُنایا۔

شام کو کھانے کے بعد کہنے لگے کہ مجھ کو ہندوستان کے آثار کے متعلق کچھ معلوم نہیں، سُنتا ہوں وہاں کے فنون لطیفہ میں یونانی اثر غالب ہے۔ تم ہندوستان کے رہنے والے ہو۔ کچھ تم بیان کرو۔ جو کچھ میں کہتا تھا نہایت غور سے سُنتے تھے اور کبھی کبھی سوال بھی کرتے تھے۔ لیکن اس تمام بات چیت میں شفقت کا رنگ غالب تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ دو روز اس صحبت میں عجیب لطف سے گذرے اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اہل علم کے نزدیک شاگرد اور اولاد میں مطلق فرق نہیں، اور یہی گہرا قلبی تعلق ہے، جو علمی ترقی کا راز ہے۔

کیمبرج کے تین پروفیسروں کی شان آپ نے سُن لی، اب تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کو یورپ سے شام میں لیجاتا ہوں۔ بیروت میں عیسائی پاپاؤں کا جو دارالعلوم قائم ہے اِس سے تو آپ شاید واقف ہوں گے۔ یہاں ایک اُستاد "پاپا شیخو" نامی ہیں۔ اسلامی علوم میں فرد ہیں۔ یورپ کے تمام مستشرقین اُن کا بہت احترام کرتے ہیں۔ عرب کی قدیم تاریخ انہیں خوب معلوم ہے۔ اور چند سال ہوئے فرانسیسی زبان میں مکہ معظمہ کے حالات پر ایک ضخیم کتاب بھی تالیف کی ہے "موسیو پروسٹ"، جو خود ایک زبردست "اثری"، ہیں، مجھے "پاپا شیخو" کے پاس لے کر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ خانقاہ میں جہاں پاپا شیخو، اور اور پاپا رہتے ہیں اُسے قلعہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک برآمدے میں پاپا ٹہل رہے تھے "موسیو پروسٹ" کو آتا ہوا دیکھ کر جلد آگے بڑھے اور فرمایا "دوہرا شکرانہ اور دوگنی مسرت کہ خود بھی آئے اور اپنے ساتھ ایک اور عنایت فرما کو بھی لائے" پاپا شیخو، چھریرے بدن کے ہیں۔ قد میانہ ہے۔ ہونٹ پتلے پتلے اور آنکھیں نہایت روشن بات کرنے میں اکثر مسکراتے رہتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ زہد نے ان میں کسی قسم کی خشکی یا انقباض پیدا نہیں کیا۔ ہم کو اپنے حجرے میں لے گئے، اس میں سوائے پلنگ اور ایک میز اور دو تین کرسیوں کے اور کوئی سامان نہ تھا۔ کرسیاں بھی نہایت چھوٹی

اور ہاتھ رکھنے کے لئے ان میں ڈنڈے وغیرہ نہ تھے، زندگی نہایت سادہ بسر کرتے ہیں اور تمام وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گذرتا ہے۔ اُن کا حجرہ خانقاہ کی اُسی منزل میں ہے، جہاں کتب خانہ ہے۔ مجھ سے مکہ معظمہ، طائف، مدینہ منورہ، وغیرہ کے حالات پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہم خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اس لئے اکثر لغزش ہوتی ہے۔ مورخ کے واسطے سیاحت اور قدیم مقامات کا دیکھنا ضروری ہے۔ پاپا سے صحبت تو کوئی دو گھنٹے تک ہی رہی۔ لیکن ان میں میں نے ایک عجب مقناطیسی اثر پایا خبر نہیں وہ اُن کے زہد یا استغنا کی وجہ سے ہے، یا علمی شوق کی وجہ سے، یا طبیعت کی قدرتی شگفتگی اور سحر بیانی کی وجہ سے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ طالب علم، جن کو ایسے اُستاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہوگا۔

عزیز طالب علمو! آپ کے صدر صاحب نے مجھ سے فقط یورپ اور بیرونی ممالک کے اساتذہ کے حالات بیان کرنے کے متعلق فرمایا تھا۔ لیکن میں اس موقع پر ایک اور عالم کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن کے اخلاق میں گو ہمارے ملک میں رہنے کی وجہ سے وہ کشش نہیں رہی، جو میں اور اساتذہ کی نسبت بیان کرچکا ہوں۔ لیکن وقت کی قدر، عمل میں احتیاط، اور تحقیق کا شوق، اس درجہ ہے کہ اُن کی بدولت وہ دنیا کے مشہور و معروف آدمیوں میں سے ہوگئے ہیں۔ ان عالم کا نام "سر آریل ستاین" ہے۔ نسل کے یہودی ہیں، ہنگری کے رہنے والے ہیں، آکسفورڈ میں تعلیم پائی، ہندوستان میں آکر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے، اور پھر صوبۂ سرحدی کے ناظم تعلیمات ہوگئے۔ تحقیق کا شوق آکسفورڈ سے ساتھ لائے، وہاں پالی اور سنسکرت کا درس لیتے تھے اور وسط ایشیا کے ریگستانوں کی چھان بین کے خواب دیکھتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد، گو ملازمت کرتے رہے، لیکن دل بدھ مت کے کھنڈروں کی تلاش کے شوق میں لگا رہا اور تیاری کرتے رہے۔ آخر جب

موقع ملا تو تین دفعہ وسط ایشیا کا سفر کیا۔ پہاڑ اور ریگ چپہ چپہ زمین کی مساحت کی اور علم و فضل، فن و کمال کے وہ خزانے ڈھونڈے کہ دنیا حیران ہو گئی۔ سر آریل سٹائن نہ غیر معمولی طور سے ذہین ہیں، اور نہ بہت بڑے فاضل۔ اُن کی ترقی کا راز وہی صفات ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ وسط ایشیا کی بے آب ریگ سیاحوں کو آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ اُنہوں نے پہلے سے اندازہ کر لیا کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کتنے پانی کی ضرورت ہو گی۔ رستے کی دقتوں کے لحاظ سے روزانہ کسقدر مسافت طے کرنی چاہیئے، آخر ڈیڑھ سو اونٹ برف سے لدے ہوئے ساتھ لے کر کشمیر کے پہاڑوں سے روانہ ہوئے۔ جو رفتار مقرر کر لی تھی۔ اُس میں مطلق فرق نہ آنے دیا۔ بیمار ہوئے، پیر کا انگوٹھا سردی کی شدت کی وجہ سے گل گیا، لیکن پیسہ ارادے کا پکا، آگے بڑھے گیا۔ اور آخر ٹھیک اتنی مدت میں جتنا کہ اندازہ کیا تھا اپنی سیاحت کو کامیابی کے ساتھ ختم کیا۔ خود فرماتے تھے کہ چونکہ وقت کم رہ گیا تھا، اس لئے بھائی رام سنگھ کو جو پیمائش کیواسطے ساتھ گئے تھے ایک جانب بھیجا اور خود دوسری جانب روانہ ہوا۔ تاکہ کام جلد ختم ہو جائے۔ چلتے وقت بھائی رام کو ہدایت کر دی کہ جو نظام العمل مقرر کیا ہے، اگر اُس کی پابندی نہ کی گئی تو ہم دونوں ریگستان میں ہلاک ہو جائیں گے۔ کہتے تھے جس روز ہم دونوں ٹھیک اسی موقع پر اور اسی وقت ملے ہیں جہاں کہ ہم نے اندازہ کیا تھا، تو ہماری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

۱۹۱۹ء میں یہ ممالک محروسہ میں تشریف لائے تھے ایک ہفتہ تک مجھکو اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وقت کی قدر اور احتیاط کا حال آپ سُنینگے تو حیران ہونگے وقت پر سوتے تھے، وقت پر اُٹھتے تھے، اور وقت پر کل کام کرتے تھے۔ اور اتفاق سے اگر نظام العمل میں فرق آجاتا تھا تو وقت کو ضائع نہونے دیتے تھے۔ صبح کو چائے پلانے اور ڈاڑھی نہانے کے لئے گرم پانی دینے کا وقت بندھا ہوا تھا۔ ایک روز گرم پانی لانے میں دیر ہو گئی۔ یہ فوراً قلمدان کھول خط لکھنے میں مشغول ہو گئے جل گاؤں کے اسٹیشن

پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ پنجاب میل دو گھنٹے تاخیر سے آئیگا۔ مجھ سے کہنے لگے: معاف فرمانا میں اپنی یادداشتوں کو صاف کرلوں۔ ورنہ پھر یہ وقت ضائع جائیگا۔ ہر چیز قفل و کنجی میں رکھتے تھے۔ اور جو کام کرتے تھے، اس کو فوراً اس کی حد تک مکمل کردیتے تھے۔ اجنتا میں مولوی سید احمد صاحب بھی ساتھ تھے، ہم دونوں بعض وقت ہنستے تھے، کیونکہ اُنھوں نے ایک ہی غار میں کئی کئی فوٹو لئے لیکن جہاں ایک فوٹو لے لیا، فوراً صندوق میں کیمرے کو بند کرکے قفل لگا دیتے تھے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد دوسرا فوٹو لینا ہوتا تھا تو پھر کیمرے کو نصب کرتے تھے اور پھر قفل لگاتے تھے۔ نوٹ بک کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بار بار تھیلے سے نکالتے تھے اور پھر مقفل ہوجاتی تھی۔ میرے عزیز دوستو! وقت کی قدر اور احتیاط ہی سر آریل اسٹائن کی نمایاں کامیابی کے راز ہیں اور یہ ایسی صفات ہیں کہ ہمارے ملک میں کم نظر آتی ہیں۔

حضرات! علماء کی جو صفات میں نے آپ کے سامنے بیان کیں، یہ طالب علم کی زندگی میں کایا پلٹ کردیتی ہیں، لیکن ایسی نہیں کہ ہمارے امکان سے باہر ہوں۔ فضل و کمال کسی خاص قوم کا ورثہ نہیں، کبھی آپ کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ شمالی یورپ کی اقوام کو جو آج دنیا میں ممتاز ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے میدان میں بلید الذہن، کم فہم اور جاہل سمجھتے تھے۔ اگر آپ کو میرے بیان میں شبہ ہو تو ابن حزم کی کتاب "الفصل فی الملل والاہوا والنحل" کو دیکھئے کہ کیا لکھتے ہیں۔ یا ابن سعید کی تصنیف "طبقات الامم" کو ملاحظہ فرمائیے کہ شمالی یورپ کے باشندوں کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ عروج و زوال ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں، مایوس نہ ہونا چاہئے، عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی غایت یہی ہے کہ ہمارے ملک کے ہونہاروں میں علم کا سچا شوق پیدا ہو۔ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ہم کو ایسا بادشاہ دیا جو علم و فضل کا حقیقی سرپرست اور حامی ہے۔ نصاب کا تقرر اور طریق تعلیم کی اصلاح ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ترقی کے لئے کوئی امر مانع نہیں

اب فرمائیے حضرات!

(ترجمہ روسی زبان سے)

از جناب محمد مجیب صاحب (آکسن)

خوب! اب میں شراب پینا بالکل چھوڑ دونگا.... کچھ.... کچھ بھی ہو! اب سمجھ سے کام لینے کا وقت آگیا ہے۔ محنت کرنا چاہئیے، محنت، تنخواہ وصول کرنا پسند کرتے ہو تو ایمانداری سے کام کرو، دل لگاکر، خدا کا خیال کرکے، چاہے نہ آرام ملے نہ نیند، ہنسی مذاق چھوڑو.... تمہاری مفت میں تنخواہ لینے کی عادت پڑ گئی ہے، اور یہ اچھا نہیں.. اچھا نہیں........

اسی طرح اور چند اخلاقی سبق اپنے آپ کو دیکر ٹکٹ کلکٹر پوڈچیاگن نے محنت اور مشقت کرنے کی ایک عجیب خواہش محسوس کی۔ رات کے دو بجے تھے، لیکن اس پر بھی اس نے اور چند ساتھیوں کو جگایا اور انہیں ساتھ لے کر ٹکٹ چک کرنے کے لئے گاڑی کا گشت لگانا شروع کیا۔

"آپ..... کے ٹکٹ......" وہ چلاتا ہے اور ٹکٹ چک کرنے کے اوزار کو خوشی سے ہلاتا جارہا ہے۔

اونگھتے، گاڑی کے اندھیرے میں لپٹے ہوئے لوگ، کانپتے ہیں سر ہلاتے ہیں اور اپنے ٹکٹ پیش کرتے ہیں۔

"آپ..... کے ٹکٹ...." پوڈچیاگن نے سکنڈ کلاس کے ایک مسافر کی طرف مڑ کر

کہا۔ یہ شخص بہت دبلا ہے، بدن پر سوا ہڈیوں کے کچھ نہیں، کمبل میں لپٹا ہوا ہے اور چاروں طرف تکیہ لگے ہیں۔

"آپ کے.... ٹکٹ....."

"مسافر کچھ جواب نہیں دیتا۔ وہ نیند میں غرق ہے۔ ٹکٹ کلکٹر اس کا کندھا ہلاتا ہے اور بے صبری سے کہتا ہے!"

"آپ.... کے.....ٹکٹ!"

مسافر کانپ جاتا ہے، اور آنکھیں کھول کر پودچیاگن پر ایک خوف زدہ نظر ڈالتا ہے۔

"—کیا؟ کون؟ ہائیں؟"

"—آپ سے آدمیوں کی طرح کہتے ہیں: آپ کے.... ٹکٹ! ذرا تکلیف کیجئے!"

"اے خدا" مسافر روندھا سا چہرہ بنالیتا ہے۔ "اے خدا! مجھے گٹھیا کی بیماری ہے........ تین رات سویا نہیں، جان بوجھ کر (مورفیہ) پھانکا، کہ نیند آجائے.... اور آپ.... ٹکٹ لینے پہونچے! یہ تو ظلم ہے، انسانیت کے خلاف ہے! اگر آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہوتا کہ مجھے نیند کتنی مشکل سے آتی ہے تو آپ اس ذرا سی چیز کے لئے مجھے نہ جگاتے..... بے رحمی، بے تکا پن ہے! اور آپ کو میرے ٹکٹ کی کیا پڑی ہے؟ محض حماقت ہے اور کچھ نہیں!"

پودچیاگن سوچتا ہے کہ اس پر خفا ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور یہ ارادہ کرتا ہے کہ خفا ہونا لازم ہے۔

"—آپ یہاں مت چلائیے! یہ چنڈو خانہ نہیں!—"

مسافر کھانس کر جواب دیتا ہے:—

"آپ سے تو چنڈو خانہ میں بھی زیادہ بھلے لوگ ملتے ہیں........ اب بتاؤ کہ مجھے نیند پھر کیسے آئے گی! عجیب بات ہے، میں یورپ کے تمام ملکوں میں سفر کر چکا ہوں، وہاں

مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہیں مانگا، لیکن یہاں پہونچتے ہی بس یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں، جیسے کوئی بھوت پریت ان پر سوار ہے، اور اس کے سوا ان کو کچھ نہیں کرنے دیتا!

"جی ہاں، اگر یورپ آپ کو پسند ہو تو وہیں چلے جائیے۔"

"حماقت ہے جناب، بس اور کیا کہوں! دھوئیں کے مارے سانس نہیں لیجاتی، ہر طرف سے سرد ہوا آرہی ہے، کیا مسافروں کو یہ تکلیف کافی نہیں؟ اس کے علاوہ کمپنی اپنے تمام قاعدوں پر بھی عمل کرائے گی، خدا اس کو غارت کرے، ان حضرت کو ٹکٹ چاہیئے، دیکھیے تو کس دھوم سے ٹکٹ مانگتے ہیں! اور اگر یہ اتنی سختی نہ کرتے تو تو کون اس ملک میں ایسا ایماندار ہے کہ ٹکٹ لے کر چلتا!"

"سنئے جناب، اگر آپ شور مچانے اور دوسرے مسافروں کو دق کرنے سے باز نہ آئیں گے تو میں آپ کو اگلے اسٹیشن پر اوتار دونگا اور آپ پر عدالت پر دعویٰ کرا دونگا!"

"یہ تو عذاب ہے!" چند لوگوں سے نہ رہا گیا، بول اٹھے "بیمار آدمی سے کھڑا تڑا رہا ہے! بات سمجھو جی اور جھگڑا ختم کرو!"

"مگر دیکھیے تو وہ خود برا بھلا کہہ رہے ہیں" پودچیاگن ذرا ڈر کر کہتا ہے۔ بہت اچھا، میں ٹکٹ نہیں لوں گا...... جیسا آپ چاہیں...... لیکن دیکھیے تو آپ کو خود معلوم ہوگا کہ میں اسی کام کے لئے نوکر ہوں اگر میرا فرض نہ ہوتا تو...... آپ کا جی چاہے تو اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لیجیے...... جس سے جی چاہے پوچھ لیجیے۔

پودچیاگن کندھے ہلا کر بیمار کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور اس کی بے عزتی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ دو تین ڈبوں سے گذر چکتا ہے تو اس کے ٹکٹ کلکٹری سینہ میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور اپنی حرکت پر پشیمانی۔

"واقعی اس مریض کے جگانے کی کوئی ضرورت نہ تھی"، وہ اپنے جی میں سوچتا ہے۔ لیکن اس میں میری کوئی خاص غلطی نہ تھی۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ موٹا ہو رہا ہوں اور بیکاری کے سلسلہ میں سب سے ٹکٹ مانگتا پھر رہا ہوں، لیکن اونھیں یہ نہیں معلوم کہ میرا کام یہی ہے...... اگر اُن کو اس کا یقین نہیں تو میں اسٹیشن ماسٹر کو اون کے سامنے پیش کر سکتا ہوں"

اسٹیشن، گاڑی پانچ منٹ ٹھہرتی ہے۔ تیسری گھنٹی سے پہلے پودچیاگن اسی درجہ میں جس کا ذکر ہو چکا ہے پہنچتا ہے۔ اُس کے پیچھے اسٹیشن ماسٹر لال ٹوپی پہنے ہوئے۔

"یہ دیکھیے، یہ صاحب ہیں"، پودچیاگن کہنا شروع کرتا ہے" جو فرماتے ہیں کہ مجھے اون سے ٹکٹ مانگنے کا کوئی حق نہیں اور...... اور مجھ پر خفا ہوتے ہیں۔ میں آپ سے اسٹیشن ماسٹر صاحب، درخواست کرتا ہوں کہ ان کو سمجھا دیجیے۔ آیا ٹکٹ چک کرنا میرا فرض ہے یا میں یوں ہی لوگوں کو دق کر رہا ہوں۔ جناب، جناب" دبلے پتلے مسافر کی طرف رجوع ہو کر کہتا ہے، "لیجیے، اسٹیشن ماسٹر صاحب سے پوچھ لیجیے اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں"

بیمار مسافر کانپ جاتا ہے، جیسے اوس کے کسی بھڑ نے ڈنکھ مار دیا، آنکھیں کھول دیتا ہے اور روند ھا چہرہ بنا کر گدی پر پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔

"اے خدا! دوسری پڑیا پھانکی تھی اور اونگھا ہی تھا کہ وہ پھر آگیا...... پھر آگیا۔ آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھ پر رحم کیجیے!"

"لیجیے آپ اسٹیشن ماسٹر صاحب خود سے پوچھ سکتے ہیں کہ مجھے ٹکٹ چک کرنے کا حق ہے یا نہیں!"

"بھئی یہ تو مجھ سے نہیں سہا جاتا! آپ آخر ٹکٹ لیکر کیا کریں گے...... کیا کرینگے! میں پانچ ٹکٹ خریدنے کے لئے تیار ہوں، مگر مجھے آرام سے مرنے دیجیے! کیا آپ خود کبھی بیمار نہیں ہوئے! بڑی بے حس قوم ہے!"

"یہ تو صاف ہنسی اُڑا رہا ہے" ایک مسافر جو فوجی وردی پہنے ہے خفگی سے کہتا ہے "اور نہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں اس بات پر اڑا ہوا ہے"

"جانے دو، اسٹیشن ماسٹر تیوریچڑھا کر کہتا ہے اور پوڈچیاگن کی آستین پکڑ اُسے باہر کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

پوڈچیاگن کندھے ہلاتا ہے اور اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے دھیرے دھیرے چلا جاتا ہے۔

"بھلا ان لوگوں کو کوئی خوش تو کرے"، وہ ناراض ہو کر اپنے آپ سے کہتا ہے میں اسی کی خاطر اسٹیشن ماسٹر کو بھی بلا لایا تھا کہ میری بات سمجھ لے اور اُسے تسکین ہو جائے، اور وہ .... اُلٹا مجھے بُرا بھلا کہتا ہے"

دوسرا اسٹیشن۔ گاڑی یہاں پر دس منٹ ٹھہرتی ہے۔ دوسری گھنٹی سے پہلے جب پوڈچیاگن ریفرشمنٹ روم میں کھڑا سوڈا واٹر پی رہا ہے تو اس کے پاس دو صاحب آتے ہیں، ایک انجینئر کی وردی میں، دوسرا فوجی اوورکوٹ میں۔

"سنئے ٹکٹ کلکٹر صاحب!" انجینئر پوڈچیاگن سے کہتا ہے ــــ "بیمار مسافر کے ساتھ جو آپ نے حرکت کی ہے اس سے ان تمام لوگوں کو جو وہاں بیٹھے تھے بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ میں انجینئر پوزنیٹسکی ہوں اور یہ ..... کرنیل صاحب ہیں۔ اگر آپ اُن مسافر سے معافی نہ مانگیں گے تو ہم کمپنی کے ڈائرکٹر سے، جس سے ہم دونوں کی جان پہچان ہے، آپکی شکایت کریں گے"

پوڈچیاگن جلدی سے کہتا ہے:

"مگر میں تو ..... مگر آپ تو ....."

"ہم آپ سے بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ نے معافی نہ مانگی تو ہم مسافر کی طرف سے بدلہ لیں گے"

— بہت اچھا، میں ... ہیں، جیسا آپ چاہیں، معافی مانگ لوں گا ..... لیجئے ......
آدھے گھنٹے کے اندر پودچیاگن، معافی مانگنے کا ایک فقرہ، جس سے مسافر خوش ہو جاتا اور اوس کی اپنی ہتک بھی نہ ہوتی سوچ کر اسی درجہ میں پہنچا۔
"جناب! —" وہ بیمار کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔
"سنئے جناب!"
بیمار کانپ جاتا ہے اور گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔
"کیا ہے؟"
"میں اس کو .... کیا کہوں؟ .... آپ خفا نہ ہوجئے ......
"ارے پانی دو، پانی — بیمار ہانپ کر دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے — تیسری ٹریا پھانکی تھی اور ...... پھر! اے خدا یہ عذاب آخر کب دور ہوگا؟
"میں اوسے ..... آپ معاف کریں گے ......
"سنئے ..... آپ مجھے اگلے اسٹیشن پر اتار دیجئے گا .... مجھ سے اور نہیں برداشت ہو سکتا .... میں مر رہا ہوں ......
"کیا ذلیل، کمینی حرکت ہے" حاضرین میں سے چند نے کہا۔ "چلئے، دور ہو جئے! اگر پھر ایسا مسخرہ پن کیا تو اس کی سزا ملے گی! چلئے!"
پودچیاگن ٹھنڈی سانس بھر کر درجہ سے باہر نکل آتا ہے۔ ریلوے کے ملازموں کا جو درجہ ہے اس میں آ کر بیٹھ جاتا ہے، اور شکایت شروع کرتا ہے۔
"اب فرمائے، حضرات پبلک! آپ کو بھی خوش کرنے کی کوشش کا کیا نتیجہ ہوتا ہے! اور کیا خدمت محنت کی جائے! جی ہی نہ چاہتا ہو تب بھی سوا اس سب جھگڑے کے لات مارنے اور مست ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں ...... کچھ نہ کرو — خفا ہوتے ہیں، کچھ کام شروع کرو، تب بھی خفا ہوتے ہیں .... بس پیو،

اور کیا!"

پوچیاگن ایک سانس میں آدھی بوتل پی جاتا ہے اور محنت، فرائض اور ایمانداری کے پھندے میں نہیں پڑتا۔

(چیخوف)

کتب بغرض ریویو

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو ہمارے پاس آئی ہیں جن کی رسید شکریہ کے ساتھ پیش کیجاتی ہے عنقریب ان سب کتابوں پر ریویو کیا جائے گا:۔

باقیات فانی ۔ دیوان جناب فانی علیگ۔ وکیل اٹاوہ ے ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ ۹ ر

دور ایام ۔ تاریخ ریاست ٹونک کا دوسرا حصہ۔ امیر الانشا دبیر الملک مولوی سید علی اصغر صاحب ناظم نیابا ہیرہ ٹونک ۱۲ ر

درر النیجان ۔ سید محمد حید صاحب اسٹیشن روڈ نامپلی حیدر آباد دکن ۸ ر

التنبیہ بر حقیقۃ الرسوم ۔ مولوی محمد عبدالشکور صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۸ ر

یتیم حصہ اول حصہ دوم (افسانہ) مولوی فیاض علی صاحب بی۔ اے علیگ وکیل فیض آباد ۱۲ ر

مرآۃ الاسرار مسئلہ استرداد برار پر تنقید و تبصرہ سید مبین الرحمٰن صاحب بی۔ اے ال۔ ال بی وکیل اکولہ۔ برار۔ ۱۲ ر

مخزن توفیق ۔ ابتدائی تعلیم کے لئے۔ محمد حبیب اللہ صاحب کنل منڈی حیدر آباد دکن ۳ ر

تنقید بر قواعد اردو ۔ از مولوی محمد عبدالغنی صاحب ایم۔ اے پتہ: پروفیسر عبدالقوی صاحب ایم۔ اے فانی۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱۲ ر

تذکرہ رحمۃ للعالمین (یعنی زنانہ میلاد حصہ اول و دوم) مولانا حبیب حسین ساکن رودولی شریف۔ پتہ: سیٹھ حسین عبدالرزاق تاجران تواہا بازار ڈاکخانہ و مقام قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی ۶ ر

ہملیٹ ۔ شیکسپیر کا ناٹک، مترجمہ مولوی امتیاز علی صاحب بی۔ اے وکیل فیض آباد پتہ: منشی اصغر علی مکان جناب مترجم محلہ مغل پورہ شہر فیض آباد۔ مجلد ۱۲ ر غیر مجلد ۸ ر

منیجر شمع

کفایت شعاری

از

(جناب سید امیر حیدر صاحب تجنت اکبر آبادی)

مداوائے تذلیل و درمان خواری
کفایت شعاری کفایت شعاری

بکار آیدت داشتہ اے برادر
چو دامے نداری تو جامہ نیاری

"جو پیسہ بچایا وہ ہی پیسہ پایا"
یہ اک قول[1] ہے لاکھ تولو نہ بھاری

لئے منہ میں ننھے سے ریزے کو چیونٹی
وہ دیکھو چلی جارہی ہے بچاری

اگر تم پس انداز کچھ کر سکو گے
سدھر جائے گی زندگانی تمہاری

کفایت کو تم بخل ہرگز نہ سمجھو
نہیں آجکل دولت و تاجداری

اگر خرچ آمد سے زائد کرو گے
تو سوکھیگا دریا جو ہو آج جاری

سکھاتا ہے انسان کو صرف بیجا
جوا، رہزنی، جعل، چوری، چکاری

کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوْا پہ
عمل کیجئے۔ ہے یہ فرمان باری

بشر کو مناسب نہیں صرف بیجا
ہو شایانِ شان خاک کو خاکساری

نکالوگے پاؤں جو چادر سے باہر
تو بے چادری تم کو کر دیگی عاری

زمانہ ہے بیزار اگر زر نہیں ہے
ہو بے سود بے زر کا زور اور زاری

اگر تم نے پہنا ہے دھاری کا کرتہ
تو راجہ نہ بنجاؤ تم را جدھاری

یہ دریائے عالم فریب آشنا ہو
جو آدھی کو چھوڑ دو تو جاتی ہو ساری

---

[1] انگریزی مثل ہے ۱۲۰

ہی جز بے ایمانی کی اسرافِ بیجا ، کفایت شعاری ہے ایماندار ی
شمار آمد و خرچ کا گر نہ رکھا عجب کیا جو ہو نوبتِ دم شماری
مناسب ہے پابندِ اوقات رہنا کہ ہے وقت کھونہیں تذلیل و خواری
تباہی نہ لو سر پہ عیاش ہو کر کہ بے سود ہے ایسی یاروں کی یاری
تم اندھے رہو گے دمِ واپسیں تک جو تیر نظر کا لگا زخم کاری
بھروسہ رہے زور بازو پہ اپنے نہ کام آئیں گے یہ سلاری مداری
کفایت ہو عادت مشقت ہو شیوہ اگر دلمیں ہے عزم مقصد براری
کرو کام اپنا یہ دن کام کے ہیں جوانی میں کیوں خواب غفلت ہو طاری
جو پیدل چلو گے تو طاقت بڑھیگی نہو تم نہ پابندِ شوق سواری
ضعیفی میں پھر آپ پچھتایئے گا اگر کھیل میں نوجوانی گزاری
جوانی میں تم خواب غفلت سی چونکو ضعیفی میں بے سود ہو آہ و زاری
جو آپ اپنا یار و مددگار ہو گا کریگا خدا اوس کی بے شبہ یاری
فقط عرض احوال ہے اہل دل سے نہ یہ شاعری ہے نہ مضمون نگاری

اثر تجربت ناداں کی باتوں میں کیا ہو
نہ عالم ، نہ مفتی ، نہ واعظ ، نہ قاری

(مسلسل)

مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر

از

(حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع)

تاریخ پیدائش

ز دولت خانۂ نواب منصور

۱۱۴۴ھ

برآمد آفتاب از مطلع نور

۱۱۴۴ھ

۱۷۵۴ء میں چوبیس سال کی عمر میں بمقام فیض آباد تخت نشین ہوئے۔ وہ زمانہ نواب کے لئے پرآشوب تھا۔ اسمٰعیل بیگ خاں کابلی کا دور دورہ تھا۔ افواج اس کے قابو میں تھیں اور محمد قلی خاں، برہان الملک مرحوم کے بھتیجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ کابلی چاہتا تھا کہ نواب کو برائے نام اختیارات دیئے جائیں اور وہ خود سلطنت پر حاوی رہے۔ اسی زمانہ میں بہت بہائے گوشائیں نے ایک کھتری عورت محل میں پہنچا دی۔ کھتریوں میں واسے ویلا مچ گئی اور افواج کو موقع مل گیا۔ بادشاہ دہلی بھی نواب سے منحرف تھے، اس لئے افواج نے فوراً محمد قلی خاں کو طلب کرلیا۔ اس فتنہ کا دفعیہ نواب کے قابو کا نہ تھا، مگر اُن کی والدہ نواب بیگم نے کمال

دانشمندی سے برافروختہ اور بدظن سرداروں کو راضی کرلیا۔ محمد قلی خاں طلبی کی خبر پاتے ہی چل کھڑا ہوا، آدھے رستہ میں اس کو اطلاع ملی کہ سرداروں کی کشیدگی رفع ہوگئی ہے اور اُس کو الہ آباد واپس جانا چاہئے۔ چونکہ وہ نصف راہ طے کرچکا تھا اور احتمال تھا کہ واپسی کی اطلاع جب نواب کو پہونچے گی تو وہ مشکوک ہونگے اس لئے ارادہ فسخ نہ کیا بلکہ اشتیاق قدمبوسی کا عذر پیش کرکے نواب کی خدمت میں چلا آیا۔ اسمٰعیل بیگ کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ دہلی نواب عماد الملک کے ہاتھوں تنگ آکر لکھنؤ چلے آئے۔ نواب نے ساتھ لاکھ نقد اور ہاتھی اور گھوڑے نذر کئے۔ مگر بداندیشوں کے مشورہ سے متاثر ہوکر بادشاہ نے محمد قلی خاں کو وزارت اودھ کا جائز امیدوار تسلیم کرلیا اور اُس کو اپنے ہمراہ لیکر تسخیر بنگالہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ محمد قلی خاں کو بادشاہ کی کمزوریوں کا اور اُن کی بدرعبی کا جب علم ہوا تو گھبرایا اور اُن سے رخصت ہوکر لکھنؤ چلا آیا۔ اُس کو خوف تھا کہ نواب ناراض ہوکر اُس کی جاگیر کو ضبط اور اُس کے بیوی بچوں کو قید کرلیں گے۔ نواب ان معاملات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ محمد قلی خاں گرفتار کرلیا گیا اور جلال آباد کے قلعہ میں بند کردیا گیا۔ ایک دن نواب، احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں گئے ہوئے تھے، بدخواہوں کو موقع مل گیا، اور محمد قلی خاں کو ہلاک کرکے کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہیں اُس کی قبر بنی جو بعد کو اُس کے ورثا کی زیارت گاہ ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد نواب کی زندگی میں بعض مشہور معرکہ آرائیاں ہوئیں۔

(۱) ۱۱۷۱ھ میں نواب نے نجیب الدولہ نواب خاں کے ساتھ شریک ہوکر مرہٹوں کو شکست دی۔

(۲) احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شریک ہوکر پانی پت کا میدان مرہٹوں کے مقابلہ میں سر کیا۔ اس جنگ میں اسّی ہزار مرہٹے کام آئے۔ اور احمد شاہ ابدالی ہندوستان کا چندروزہ بادشاہ بن گیا۔ ۱۱۷۴ھ میں اُس نے نواب کو خلعت وزارت سے سرفراز کیا۔

(۳) ۱۱۷۸ھ میں نواب نے بُندیلوں کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر بل بھدر تعلقہ دار کی بغاوت کا حال معلوم کرکے بغیر جنگ کئے ہوئے، صوبہ سے واپس چلے آئے۔

(۴) امیر الامرا احمد خاں بہادر غالب جنگ بنگش رئیس فرخ آباد کے خلاف ۱۱۷۷ھ میں فوج کشی کی۔

(۵) ۱۱۷۸ھ کے آخر اور ۱۱۷۹ھ کے آغاز میں انگریزوں سے نواب نے مقابلہ کیا۔ اور میجر ایچ منرو کی زیر کمان ۱۳ رمئی ۱۷۶۴ء کو بکسر میں شکست کھائی۔ نواب لکھنؤ اور فیض آباد ہوتے ہوئے بریلی پہونچے، اور پٹھانوں، افغانوں اور مرہٹوں کو جمع کرکے ایک مرتبہ پھر انگریزوں کے مقابلہ میں آئے۔ لیکن بریگیڈیر جنرل کارنک کے زیر کمان انگریزی افواج کے ہاتھوں پھر شکست فاش کھائی۔ اور فرخ آباد میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ نواب کی زندگی میں یہ وقت سب سے زیادہ سخت گذرا۔ اور اُن کی خودداری کا خون ہوگیا۔ کیونکہ انکو جنرل کارنک کے پاس جانا پڑا اور الہ آباد کے صلح نامہ پر دستخط کرنے پڑے جس کی رُو سے (۱) کڑا اور الہ آباد نواب سے چھن کر شاہ عالم ثانی کے اخراجات کی مد میں دیدیئے گئے (۲) نواب کو اپنی سلطنت میں انگریزی گماشتوں اور سوداگروں کو بغیر روک ٹوک اور بلا مزاحمت تجارت کی اجازت دینی پڑی، اور (۳) پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا، نواب کے پاس بہ مشکل تمام دس لاکھ کی مالیت تھی۔ اعیان حکومت اور احباب سے امداد کا طالب ہونا پڑا، مگر کسی نے دل کھول کر نواب کا ساتھ نہ دیا۔ البتہ اس موقع پر اُن کی ناموس اور رفیق زندگی بہو بیگم نے وہ کام کیا جو بہ لحاظ شرافت اور بہ لحاظ رفاقت مشرق کے لئے مایۂ ناز ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنی کُل جائداد۔ اور اپنا کل نقد و زیور فروخت کرکے نواب کو دے ڈالا۔ صلاح کاروں نے منع بھی کیا مگر انھوں نے جواب دیا "اگر نواب زندہ سلامت رہے تو یہ سب انہیں کا ہے، اور اگر خدانخواستہ وہ نہ رہے تو یہ چیزیں میرے کس کام کی"

کہا جاتا ہے کہ بہو بیگم نے اپنی ناک کی کیل تک بیچ ڈالی تھی۔ غرضکہ اس طرح پر چالیس لاکھ روپیہ کی کمی پوری ہو گئی۔ لارڈ کلایو نے بورڈ کے نام اپنے خط مورخہ ۱۱ رجون ۱۷۶۶ء میں نواب کی صادق الاقراری کی تعریف لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ نواب کی دوستی کا اُس کو کامل یقین ہے اور یہ دوستی انگریزوں کے لئے از بس مفید اور قابل اعتبار ہے۔

انگریزی گماشتوں اور سوداگروں نے نواب کے سلطنت میں طرح طرح کے مظالم کئے جن کی وجہ سے تنگ آکر نواب کو گورنر جنرل سے شکایت کرنی پڑی اور وہ لوگ سلطنت سے خارج کر دیئے گئے۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد کمپنی کو سخت نقصان کا احساس ہوا، اور وارن ہیسٹنگز نے نواب سے مل کر زبانی گفتگو کے ذریعہ سے دوبارہ انگریز گماشتوں اور سوداگروں کے لئے اجازت حاصل کرنی چاہی۔ مگر نواب نے صاف انکار کر دیا اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا دیا کہ اگر وہ لوگ آئے تو ان کے اور کمپنی کے درمیان میں مصالحت قائم نہ رہ سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وارن ہیسٹنگز کو سخت مایوسی ہوئی۔

بنارس میں ۸ رستمبر ۱۷۷۳ء کو نواب نے ایک اور صلح نامہ پر دستخط کر دیے اور ایک بریگیڈ کے اخراجات یعنی مبلغ اکیس ہزار کی ادائگی منظور کر لی۔ اور کڑہ اور الہ آباد کے واپسی کے لئے پچاس لاکھ روپیہ دینا قبول کر لیا۔ بیس لاکھ اسی وقت انگریزوں کو ادا کر دیئے اور پندرہ لاکھ ایک سال اور بقیہ پندرہ لاکھ دو سال کے بعد ادا کرنے کا اقرار کر لیا۔ نواب نے روہیلوں کی امداد مرہٹوں کے خلاف کی تھی اور روہیلوں نے چالیس لاکھ روپیہ نواب کو دینا طے کیا تھا مگر مرہٹوں کی شکست کے بعد وہ انکاری ہو گئے تھے۔ نواب نے کمپنی سے امداد چاہی اور چالیس لاکھ روپیہ کا وعدہ کر کے انگریزوں کی فوج لے کر روہیلوں پر حملہ کر دیا ۱۷ راپریل ۱۷۷۴ء کو نواب رحمت خاں روہیلوں کا سردار توپ کے گولہ سے قتل ہو گیا اور اسی روز نواب کی فوج کے ہاتھ میدان آگیا۔ اور روہیلہ مقبوضات کے بڑے حصّہ پر نواب قابض ہو گئے۔

چند ماہ کے بعد نواب کی طبیعت خراب ہوگئی اور ۲۴ ر ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء کو فیض آباد میں بعمر سینتالیس سال انتقال ہوگیا۔ اُن کی ہڈیاں دہلی بھجوا دی گئیں اور وہیں حضرت شاہ مرداں میں جہاں اُن کے اور عزیز بھی دفن تھے، سپرد خاک کر دی گئیں۔

نواب نہایت وجیہ، قوی اور دلیر آدمی تھے۔ نواب بہو بیگم سے تمام عمر خوش رہے، آیندہ ماہ میں نواب بہو بیگم پر مفصل مضمون شمع میں شائع ہوگا۔ نواب روزانہ علی الصباح اپنی افواج کی قواعد کا معائنہ کرتے تھے، اور صبح اور دوپہر کو سلطنت کے امور کو انجام دیتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کا عہد حکومت کئی وجہ سے قابل لحاظ ہے۔ بالخصوص انگریزی پالیسی کے مدارج اور انکی کیفیتوں کا انکشاف نہایت واضح طور پر ہوتا ہے۔ اِدھر ہی سے سلطنت اودھ کی بربادی کا آغاز ہوتا ہے۔

چونکہ شمع کے صفحات بسیط اور مشرح حالات کے متحمل نہ ہوتے اس لئے واقعات کے اظہار کرنے میں حتی الوسع اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ فقط

تبصرے

فرہنگ اصطلاحات علمیہ

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن کی توجہ اور جناب مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔ اے علیگ سکرٹری انجمن مذکور کی علمی کوششوں اور اُن کی دماغی کاوشوں کی داد نہ دینا حقیقت میں اردو زبان پر ظلم ہے۔ جو گرانمایہ علمی خدمت مولوی صاحب سے ظہور میں آرہی ہے اُس کا جواب نہیں وہ اُردو کے مسیحا ہیں۔ انہیں کی توجہ کی برکت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات علمیہ چھپ کر تیار ہوگئی۔ پوری کتاب پانچ سو صفحات سے زیادہ حجم کی ہے۔ اور کم وبیش بیس بائیس مضامین کی علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ ہے۔ علم ہیت، علم نباتات، اقتصادیات، حکومت ہند، آئینی حکومت، تاریخ انگلستان۔ تاریخ یونان۔ منطق۔ جبر ومقابلہ۔ ہندسی مخروطات، ہندسہ مجسمات، علم مثلث، تفرقی مساواتیں، علم سکون۔ مابعد الطبیعات۔ نفسیات۔ طبیعات۔ سیاسیات آثار قدیمہ، وغیرہ کی اصطلاحات کے ترجمے ہمارے یہاں نہ تھے، اور اگر کہیں پر کچھ ترجمے ہوئے تھے تو وہ شخصی کوششوں کا نتیجہ تھے اور چونکہ ہر شخص نے اپنی طبیعت کے مطابق ترجمے کئے تھے اس لئے ایک ہی لفظ کے مختلف ترجمے ہوگئے تھے جو اصطلاحات کے اعتبار سے سخت مضر تھے اور پڑھنے والوں کو چکر میں ڈال دیتے تھے۔ ضرورت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات کو عام طور پر رواج دیا جائے اور مترجمین کا فرض ہے کہ اصطلاحوں کے ترجموں کو قبول کریں، یا اگر وہ بعض اصطلاحات کے خود ترجمے کریں تو جب تک انجمن ترقی اردو اُن کو قبول نہ کرلے استعمال نہ کریں۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ مکمل نہیں ہیں۔ جن مضامین کی طرف توجہ کی گئی ہے خود انکی بعض اصطلاحات ترجمہ ہونے سے رہگئی ہیں۔ اسی طرح ابھی دیگر متعدد مضامین سے ہاتھ نہیں لگایا ہے لیکن اچھا ہوا کہ جو کچھ مسالہ تیار رہتا شائع کردیا۔ بقیہ ترجموں کی خاطر موجودہ مواد کو درک

رکھنا مناسب نہ تھا، بلکہ ترجمہ کرنے والوں کے حق میں مضر ہوتا۔ دیگر مضامین اور اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ جغرافیہ۔ فلسفہ، سائنس وغیرہ وغیرہ کی اصطلاحات جلد شائع کیجائیں گی۔ اور اس عرصہ میں نقد و تبصرہ و دیگر ذرائع سے جو معلومات بہم پہونچی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھاکر فرہنگ کا ایک ضمیمہ بھی شائع کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بعض اصطلاحات کے ترجمے دقیق اور ثقیل ہیں۔ جہاں کہیں عربی کے ثقیل اور سخت الفاظ آئیں اُن کو ترک کرنا بہتر ہے اور اُن کے بجائے چھوٹے الفاظ، یا اصل اصطلاحات کو حتی الوسع مہند کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مغربی علوم کو اصل زبان میں پڑھنا آسان ہو اور طبیعت پر زیادہ بار نہ پڑے، البتہ عربی اور فارسی یا سنسکرت کی اصطلاحات جو ثقیل نہیں ہیں اُن کے اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ وضع اصطلاحات کا کام کرتے وقت یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اصطلاحات اُن لوگوں کے لئے بنائی جا رہی ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے، سنسکرت یا عربی نہیں ہے۔ یقین ہے کہ اس تنقید کو نیک نیتی پر محمول کیا جائیگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اعتراض کر دینا بہت آسان ہوا کرتا ہے۔ لیکن اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ اور اس کام کے کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے کیا معنی ہیں۔

بہرکیف فرہنگ اصطلاحات کی اشاعت ایک مہتم بالشان کام تھا جو مستعدی اور عرق ریزی کے ساتھہ انجام دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب اور کارکنان انجمن دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انگریزی اصطلاحات بائیں جانب اور اُنکا ترجمہ داہنی جانب چھپا ہے۔ قیمت صرف ۶ ہے، ہم اس کی خریداری کے لئے پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کے لئے تو یہ کتاب ازبس ضروری ہے۔

مذاکرات (سال اوّل)

ہمارے دوست سید ہاشمی صاحب فریدآبادی جوان ہیں، انکا دل جوان ہے اور

اور قلم بھی جوان ہے، جہاں اتنی جوانیاں جمع ہوں، وہاں جو کام ہوگا اس پر شباب کی کیفیت ہوگی اور اس میں قوت و توانائی کی دلکشی ہوگی۔

"مذاکرات" حیدرآباد کی ایک جدید انجمن کی یک سالہ محنت کا نتیجہ ہے، اور زر د جلد کے اندر وہ مضامین ہیں جو انجمن میں پڑھے گئے تھے، کاغذ نفیس لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ جلد بندی بھی قیمتی اور خوش وضع مضامین بہت اچھے، لکھنے والے مستند، غرض مذاکرات کی ظاہری نمایش سے طبیعت شگفتہ، اور اس کی باطنی خوبیوں سے روح مسرور ہوگئی۔ یہ انجمن قائم رہے گی؟ اس کا جواب تو وہی دے سکیں گے جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ مگر رسالہ کی خوبیوں مضمون نگاروں کی لیاقت اور خود جناب ہاشمی کی توجہ کو دیکھتے ہوئے تو امید پڑتی ہے کہ وہ بڑا کام کرے گی اور اس میں ہر سال بہتر سے بہتر مضامین پڑھے جائیں گے،

مذاکرات سات مضامین کا مجموعہ ہے تاج المآثر پر سید ہاشمی صاحب نے اور تحفہ سامی، اور جاویدان خرد پر، نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی نے تبصرے تحریر فرما کر انجمن میں پڑھے تھے۔ اُن کی ایک غزل بھی ہے جو بہت خوب ہے، جاپان پر ہمارے محترم دوست نواب مسعود جنگ بہادر کی انگریزی نثر کا ترجمہ ہے۔ شمع میں ہم کئی بار جاپان کے متعلق آپ کے خیالات قارئین کرام تک پہونچا چکے ہیں۔ یہ مضمون بہت لطیف ہے۔ نظریہ اضافیت پر ڈاکٹر مظفر الدین صاحب کا مضمون ہے جو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اُستاذی جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ کا مضمون جغرافیہ اندلس بہت دلکش، دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ آپ نے جغرافیہ اندلس کے متعلق جو تحقیقات کی ہے وہ قابل تعریف ہے، اور ہم اُن کی بے مثل کتاب جغرافیہ اندلس کی اشاعت کے منتظر ہیں۔ مذاکرات کی جلدیں عام طور پر قیمتاً فروخت نہیں ہوتی ہیں، لیکن قدر دانوں تک پہونچانے کے لئے عام قیمت ہے۔

پتہ :- جناب معتمد صاحب مجلس مذاکرہ۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن

جلال الدین خوارزم شاہ

مترجمہ جناب مولوی سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے

اردو زبان پر سید صاحب موصوف کا احسان ہے کہ انھوں نے اس میں ترکی لٹریچر کے بیش بہا موتی پیش کئے، اور غالباً سید صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل ہند کو ترکی لٹریچر سے روشناس کرایا۔ جودت طبع، اور جدت طراز تحریر کے لئے وہ کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے مضامین اور ترجمے برسوں سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں، اور مدت تک ہماری زبان میں موجود رہیں گے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ آپ نے ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے مرحوم کے ایک عدیم المثال تاریخی، ڈرامے کا اردو میں ترجمہ فرمایا تھا۔ اور ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیج گیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ طویل علالت کے باعث ہم ابتک اس مسرت بخش فرض کو ادا نہ کر سکے۔

ہمنے دوران علالت میں ترجمہ کو کئی بار پڑھا۔ اور اب بھی پیش نظر ہے، ہر مرتبہ اس کے مطالعہ سے طبیعت کو نیا لطف آیا۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں یہ ترجمہ ایک نعمت ہے، طبائع انسانی، اور نفسیاتی کیفیات کی جیتی جاگتی تصویروں کو اردو میں ہو بہو اُتار لینا، ادبی کارنامہ ہے جس کے لئے لائق مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں، چنگیز خان کے خونیں دور میں جلال الدین بادشاہ، حمیت اسلام، اور غیرت وطن سے متاثر ہوکر وہ تمام باتیں کرتا ہے جو سرفروش مسلمان، جانباز سپاہی، اور غیور بادشاہ کے شایان شان ہوتی ہیں، عہد قدیم میں شخصی وقار اور فاتحانہ بے باک حملوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا معمولی کام نہ تھا۔ سپاہ کی فراہمی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں اس کے جوش کو قائم رکھنا، بیوی بچوں اور ذاتی آرام کی مفارقت، طرح طرح کی مصیبتیں اور سب سے زیادہ یہ کہ نفسانی اغراض کے لئے نہیں بلکہ محض مذہب وطن اور ملت کی خاطر، ان سب کو برداشت کرنا، نہایت سبق آموز باتیں ہیں،

واقعات کی تفصیل، اور مختلف جذبات اور مواقع کی ترجمانی اور مصوری کے لطیف نمونے اسی ڈرامہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب نوجوانوں کے مطالعہ میں رہنی چاہئے اور نصاب میں داخل ہونی چاہئے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے حجم ۳۸۰ صفحے قیمت عہ/۱۲
پتہ :- سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

غذائے روح، بالتصویر

شری مدبھگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر کا منظوم ترجمہ پنڈت پربھودیال صاحب مصر عاشق لکھنوی نے کیا ہے حجم ۱۲۰ صفحے۔ قیمت عہ/
قابل مترجم نے ایک بسیط دیباچہ کے ذریعہ سے بتایا ہے کہ بھگوت گیتا کی تعلیم تارک الحزا ہے اسی رعایت سے ترجمہ کا نام غذائے روح، ہے۔ انہوں نے یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ بھگوت گیتا تارک الدنیا ہونا سکھاتی ہے بلکہ اس کا مقصد ہے کہ دنیا میں رہو لیکن اس کی (دنیا کی) محبت میں گرفتار ہو کر اپنی حقیقت اور دنیا میں آنے کی غرض و غایت، کو نہ بھولو۔ اور سچی محبت سے اپنا قلب پروردگار عالم کو نذر کردو۔ لائق مترجم نے کوشش کی ہے کہ سنسکرت کے ایک شعر کا ترجمہ اردو کے ایک شعر میں کیا جائے جابجا حواشی دیکر اور اخیر میں مشکل الفاظ کے معنی لکھہ کر شاعر نے تصنیف کو مفید بنا دیا ہے۔ شروع میں بھگوت گیتا کا خلاصہ سلیس عبارت میں ہے تاکہ ناواقف بھی ترجمہ کو بخوبی سمجھ سکیں۔ البتہ شاعر نے ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کرنے کی قید عائد کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے بعض مقامات تو بالکل تشنہ معلوم ہوتے ہیں اور اُن کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ وہ چاہتے تو ترجمہ کو زیادہ شگفتہ بنا سکتے تھے۔ مگر خود عاید کردہ قیود توڑنی پڑتیں۔ اسی قسم کی اور قابل قدر سنسکرت تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ادبی اور علمی خدمت ہے اخیر میں مترجم کا عکس ہے۔ جابجا بلاک کی تصویریں ہیں جن کا تعلق نفس کتاب سے ہے۔

پتہ :- پنڈت پربھودیال صاحب مصر، عاشق لکھنوی - عرائض نویس - عدالت دیوانی - لکھنؤ،

دشینت و شکنتلا المعروف بہ مثنوی سحر

(از اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی)

چھوٹی تقطیع پر ۸۶ صفحے کی نظم ہے - جناب سحر نے ہندوستان کے سحر نگار شاعر کالی داس کے مشہور قصہ موسومہ شکنتلا کو اردو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے، ابتدا میں منشی دیا نرائن صاحب نگم اڈیٹر زمانہ کانپور کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس کے بعض حصے بہت پاکیزہ ہیں - مثلاً "شکنتلا کا نام زبان پر آیا اور پردہ تصویر پر ایک تصویر کھینچ گئی - کیسی شگفتہ - کیسی درد انگیز، حسن اور شباب کا ایک لبھانے والا خواب، پھول کی طرح نازک اور پتی کی طرح کمزور -

ہرا بھرا جنگل، ندی کا شاداب کنارا، کنول کے پھولوں کا کنج - ہرنوں کی کلیلیں، چڑیوں کی خوشنوائیاں، شہد کی مکھیوں کے نغمے اور ہوائے معطر کے جھونکے، ان دلفریبیوں کے بیچ میں شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ کنول کے بھورے پتے پر، راجہ کو خط لکھتی ہے - کتنا دلفریب تخیل ہے .... شکنتلا ایک عورت ہی سغر کی - درد کی - میٹھے الاپ کی - اس میں سیتا کی روحانیت نہیں - ساوتری کا استقلال نہیں - دمن کا صبر نہیں - وہ ایک کمزور ہستی ہے - تناور درخت نہیں جس پر ہوائیں اثر نہیں کرتیں - وہ ایک شاخ ہے جو ہواؤں سے ہلتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے - یہی اس کا جوہر ہے اسی نے اُسے دلکش بنا دیا ہے"

پہلے بھی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں ہوا تھا، لیکن مترجم کی ہندو معاشرت کی ناواقفیت نے اصلی رنگ کو قائم رکھنے سے معذور کر دیا تھا - لیکن جناب سحر نے قصہ کی وطنیت کو بدرجہ اتم قائم رکھا ہے -

منشی صاحب کا خیال ہے کہ "دبلاغت اور روانی بیان اور حسن ترکیب کے

اعتبار سے مثنوی سحر گلزار نسیم سے لگا کھاتی ہے"۔ ہمارا خیال ہے کہ منشی صاحب کا یہ جملہ حسن مروت اور اخلاق پر مبنی ہے ۔ روانی اور حسن بندش کے لحاظ سے گلزار نسیم بہتر ہے ۔ ملاحظہ ہو ؎

یعنی اک طفل تھا نمودار، جیسے کہ صدف سے دُر شہوار
تھا حُسن میں اک کمال خوبی تھا جسم میں اک مثال خوبی
تسکین جو ہوئی سکنتلا کی ممنون تھی بخشش خدا کی

سختی غم فراق سہتی، مجبور تشددات رہتی
سکھیوں کو بھی رو کے گہہ رُلاتی گہہ یاہ کا ماجرا سُناتی

مثنوی دلکش ہے ۔ اور شاعر کی فکر کا دلپذیر ثبوت ہے ۔ بعض اشعار نہایت آبدار ہیں ۔ اور کئی موقعے ایسے ہیں جہاں تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے ۔ یقین ہے کہ مثنوی مقبول ہوگی ۔ قیمت غالباً ۸ر ہے ۔

ملنے کا پتہ :۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

مُصبّاح القوائی

مصنفہ سید محمد نقوی الٰہ سوی صاحب متخلص بہ سید ۔ حجم ۱۶ صفحہ قیمت ۳ر

پتہ :۔ مولوی سید زین العابد صاحب نقوی محاسب محکمہ عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں تمام القاب حروف و حرکات قافیہ اور ان کے تعریفات مستند اہل فن کی تصانیف سے ماخوذ کر کے نظم کئے ہیں ۔ طرز قدیم ہے مگر لائق مصنف اور شاعر کی محنت قابل داد ہے کہ ۶۸ اشعار میں کل مسائل بیان کر دیئے ۔ معمولی توجہ سے

ان پر عبور ہو سکتا ہے اور محتاط شاعروں کے لئے ضروری ہے۔ اگر حواشی اور ضروری نوٹ دیدیئے جاتے تو رسالہ زیادہ مفید اور دلچسپ بھی ہو جاتا۔

ساربان حجم ۳۵ صفحے قیمت ۴ر۔ نور ہدایت حجم ۳۱ صفحے قیمت ۴۔ ارمغان عرب حجم ۳۰ صفحے قیمت ۴ر۔ پیمان وفا۔ حجم ۴۲ صفحے قیمت ۵ر۔ امانت حجم ۲۲ صفحے قیمت ۳ر۔ خط تقدیر حجم ۵۵ صفحے قیمت ۶ر

یہ چھ رسالے ایم اسلم صاحب کی تصنیف ہیں اور نسیم بک ڈپو بارود خانہ بازار۔ لاہور۔ سے مل سکتے ہیں۔

ساربان = حضرت عمر کے عہد خلافت کا ایک دلچسپ اور مؤثر قصہ ہے۔ اور حقیقت میں مصنف نے خوب لکھا ہے۔

نور ہدایت = میں حضرت سرور کائنات کا ایک صحابی جلیبیب شہید کا پاکیزہ کریکٹر دکھایا ہے۔

ارمغان عرب = میں حضرت عمر کے سوانحی حالات لکھ کر اہل عرب کی دلچسپ حکایت ہے اور اسلام کے بعض ضروری اصول بیان کئے ہیں۔

پیمان وفا = ایک رقت انگیز تاریخی قصہ ہے جس میں عہد و پیمان پر قائم رہنے کی خوبیاں دکھائی ہیں۔

امانت = خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کا واقعہ ہے جس میں ایک لڑکے کے عاقلانہ فیصلہ کا ذکر ہے۔

خط تقدیر = گذشتہ جنگ یورپ کی ایک دلچسپ پُر درد اور سبق آموز داستان ہے جسکا تعلق حب وطن، ایثار، اور انسانی ہمدردی سے ہے۔

افسوس ہے کہ ہم ان رسائل پر جلد تریویو نہ کر سکے۔ ہم نے ان سب کو پڑھا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ طرز بیان صاف اور سلجھا ہوا

ہے،عبارت سلیس اور مؤثر ہے ۔ طریق تصنیف سبق آموز ہے ۔ ناصحانہ اور استادانہ نہیں ہر
جوب اغنیمت ہے ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے یہ سب رسالے کارآمد ہیں ۔ اور اس
لایق ہیں کہ والدین خرید کر اولاد کو ، اور استاد طالب علموں کو انعام کے طور پر تقسیم کریں
توقع ہے کہ آیندہ اڈیشن میں نظرثانی سے عبارت کی بعض خامیاں دُور ہو جائیں گی ۔
مثلاً ساربان میں صفحہ ۸ پر ہے "طیور .... درختوں پر بیٹھے بیٹھے کر مُلَڑ مچا رہے تھے"
صفحہ ۱۹ پر ہے "ایک استعمال شدہ کرتا زیب بدن تھا" "چہرہ انوار ایمانی سے نورانی نظر آتا
تھا" "پھٹی ہوئی جوتیوں کا جوڑا پڑا تھا" وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن یہ غلطیاں اس قسم کی نہیں ہیں
کہ رسالوں کی قدر و قیمت کو گھٹا دیں ۔

بہشتی جھومر یا اسباق النسواں

(مصنفہ محمد مرزا خاں صاحب دہلوی ۔ حیدرآباد دکن)

لایق مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستانی خواتین نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب بجائے
قصے کہانیوں کے پیرایہ میں سبق دینے کے اُن کی اخلاقی کمزوریوں سنجیدگی سے بحث کیجائے ،
اور اُن کے نقائص اُن کو دکھائے جائیں تاکہ وہ اپنے معائب سے واقف ہو کر چپکے ہی چپکے
اپنی اصلاح کرتی رہیں ۔ یہ رسالہ اُس مضمون کی پہلی قسط ہے جس میں لڑکی کے سسرال
جانے کے بعد اُس سے جن جن کمزوریوں کا ظہور ہوتا ہے ان میں سے چند کی تشریح کر دی
گئی ہے ۔ رسالہ میں چار سبق ہیں ، اگر مقبول ہوا تو مصنف صاحب دوسرا حصہ بھی جلد شائع
کریں گے ۔

مصنف نے اپنے خیالات کو صفائی کے ساتھ ظاہر کیا ہے ۔ البتہ عبارت ذرا دقیق
ہے جو معمولی لکھی پڑھی لڑکیوں کو مشکل معلوم ہوگی ۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کا مطالعہ

بہت کچھ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ سسرال جانے سے قبل اور سسرال پہونچ کر ہر تعلیمیافتہ لڑکی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ کچھ انگریزی داں شوہر یا بیبیاں مصنف کے بعض خیالات سے اتفاق نہ کریں تاہم بہت سی باتیں سیکھنے کے قابل ملیں گی۔ جن پر عمل کر کے راحت مل سکے گی۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ہیں حجم ۲ ، صفحے قیمت صرف ۱۰/
چند جلدیں دفتر شمع میں موجود ہیں اور منیجر صاحب سے مل سکتی ہیں۔

صنف نازک

(مصنفہ جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب بسمل)

لایق مؤلف کا بیان ہے "یوں دیکھنے کو آپ اس کو ایک مختصر سا مجموعہ کہدیں گے لیکن اس کے فراہم کرنے میں اور ترتیب دینے میں اپنی عمر کا بہترین حصہ اس کی نذر کرنا پڑا۔ دنیا کی ہر زبان کے شاعرانہ خیالات سے خوشہ چینی کرنی پڑی۔ کہیں سے پتی لی تو کہیں سے پھول، کہیں سے تنکا لیا تو کہیں سے رنگ و بو، تب کہیں یہ گلدستہ سدا بہار تیار ہوا"

مؤلف کے یہ الفاظ تعلی پر نہیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور خدا معلوم اُنھوں نے ان جواہر ریزوں کو جمع کرنے اور بہترین اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کیا کیا زحمتیں اُٹھائی ہونگی۔

صنف نازک بجائے خود ایسا نازک موضوع ہے اور اُسکی دلپذیری ایسی عالمگیر ہے کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونا ظلم ہے، چونکہ جذبات کی تخلیق اور صنف نازک کی مداحی فطری باتیں ہیں۔ اسلئے صنف نازک کی خوبیوں سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے، انکی تعریف کرنا شاعر کا کام ہے، ان سے قلب کو منور کرنا عارف کا کام ہے، اور انکی کمزوریوں کو الم نشرح کرنا مذہبی اور فلسفی دل و دماغ کو مبارک رہے یہ رنگ طبایع انسانی کے بس کا نہیں، عورت پھول سے زیادہ نازک، تصویر سے زیادہ دلکش، موسیقی سے زیادہ مترنم، فلسفہ سے زیادہ سکون بخش،

دولت سے زیادہ راحت رساں، اور عزت سے زیادہ قابل قبول نعمت ہے، آپ اس کی کمزوریوں کو دیکھنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کی قوت انتقام یا زبان کی درشتی کو کیوں آمادۂ عمل کرتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ اس کی کمزوریوں، کو آمادۂ انتقام بنا لینا اور نقصان اٹھانا مرد کے لئے واجبی سزا ہے کیونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، اور یہ صفت اس سے کسی عمر میں جدا نہیں ہوتی۔ اس کا وجود شیریں ہے بھائیوں سے پیار، باپ سے الفت، شوہر سے محبت، اولاد سے شفقت، ہمسایہ سے مروت، اس کے فطری خوبیاں ہیں، وہ بہترین مونس اور غمخوار ہے حقیقی رازدار ہے، اور حاضر و غائب یکساں جاں نثار ہے۔ مرد کے لئے زیبا ہے کہ اس کی صفات سے روحانی مسرت اور سکون حاصل کرے، نہ کہ اس کی دل آزاری اور تخریب کے درپے ہو،

مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے تقریظ، اور مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے نے دیباچہ پرلطف انداز میں لکھے ہیں۔ لائق مؤلف نے جہاں صنف نازک کی خوبیاں بتائی ہیں، وہاں اُن کی کمزوریاں بھی گنوا دی ہیں تاکہ مرد اُن کی صفات پر فریفتہ ہو، اور اُن کی کمزوریوں کی زد سے بچا رہے۔

حجم تقریباً ۸۰ صفحے، لکھائی چھپائی دلکش، اور جلد خوبصورت ہے، صنف نازک کا ایک فوٹو بھی ہے، قیمت ۱؎۔

پتہ:۔ مصنف بیرون۔ دبیر پورہ۔ حیدرآباد۔ دکن

سرورِ عالم

(مصنفہ مولوی عبدالمجید صاحب۔ دارالتصنیف کپورتھلہ)

مولوی عبدالمجید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جناب سرور کائنات کی مقدس سوانحعمری ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ لکھی ہے، تصنیف بذاتہ مختصر ہے لیکن سرور عالم کی حیات کے تمام ضروری پہلو موجود ہیں، اسوۂ حسنہ کو پیش کرکے دوسروں کے

لئے ایک بیش قیمت نمونہ پیش کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ نبی اور بشر ہونے کی حیثیتوں سے سوانح دکھائی جائیں۔ بلادعرب کا نقشہ ہے اور کوہ حرا کی عکسی تصویر بھی دیگئی ہے۔ کوہ حرا کے متعلق مولوی صاحب نے لکھا ہے "جس کے دیکھتے ہی دیار حبیب کی ایک نمایاں خصوصیت سامنے آجاتی ہے اور انسان عالم تصور میں اس سرزمین میں جا پہونچتا ہے جہاں کوہ حرا کی چوٹیاں اور اس کے گوشہ ہائے عزلت، ایسی خاموش و ساکن زبان کے ساتھ جس سے زیادہ کوئی زبان بلند آہنگ نہیں ہو سکتی، دنیا کو بتاتے رہیں گے کہ یہی وہ گھاٹیاں ہیں، یہیں وہ غار ہے، جہاں سے سادہ مگر چونکا دینے والا پیغام آیا۔
"یا محمد انت رسول اللہ" اور جس نے زمانہ کی ظلمت کو عالم افروز نور سے بدل دیا۔ ان مقامات کے تصور سے ہی انسان، روح نواز کیفیتوں اور کیفوں میں ڈوب جاتا ہے اور دل روحانی طمانیت کے بارسے تھرتھرانے لگتا ہے" کتاب میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ عیسوی بھی دیا گیا ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔ قیمت صرف بارہ آنہ۔

موصوف نے چھوٹا رسالہ "انا بشر" بھی تصنیف کیا ہے۔ اور کیا خوب لکھا ہے کہ "رسول عربی کے اسوۂ حسنہ جو دنیا کے لئے بمنزلہ متاع عمومی کے ہیں، بنی نوع انسان کے لئے روحانی اور دنیوی زندگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ جب یہ بات ہے تو یہ نمونہ اس قابل ہے کہ ہر وقت ہمارے سامنے رہے" اس خیال سے لائق مصنف نے رسول کی حیات کے مختلف شعبوں پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے ارادہ کیا ہے۔ اور یہ رسالہ اس زنجیر کی پہلی کڑی ہے جو بچوں کے لئے نہایت مفید ہے یقین ہے کہ صاحبان مقدرت اس کو خرید کر مکتب کے لڑکوں، اور عزیز رشتہ داروں اور دوستوں کے بچوں کو مفت تقسیم کرینگے۔ حجم ۳۲ صفحے قیمت صرف ۱ر جو کچھ بھی نہیں ہے۔ مصنف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتا ہے۔

جلد ۵ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابت ماہ اپریل ۱۹۲۷ء | نمبر ۴

شبیہ - آنریبل مہاراجہ سر محمد علی محمد خان صاحب بہادر والی ریاست محمود آباد

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہین تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کے لیئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا اگر دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر خدمت ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کی جائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون ۲۷ء تک جو افسانہ وصول ہوگا اسکے معاوضہ مین چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک وہ شمع مین چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا۔ اور کتابی صورت میں اسکی تین جلدیں بھی نذر ہونگی

اگر آپ کو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اسکی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائینگی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپکی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شایع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع مین ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اسپر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائیگا

واضح رہے

جو مضمون افسانہ ناول، نظم یا غزل، ناپسند ہوگی وہ ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس کر دیجائیگی۔ البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے باحتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر مین آپکا مضمون یا آپ کا کلام شایع ہوگا، بلا لحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپکی خدمت میں مفت روانہ کیا جائے گا۔

مطبوعات جدید

جو ۲۷ء میں لغرض ریویو وصول ہونگی، اُن پر دو انعامات ہیں۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُنکو دیا جائے گا جو بہترین کتاب بھیجین گے اور

(۲) انعام حسب تجویز کمیٹی اُن کو دیا جائے گا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائینگے۔

خادم منیجر شمع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمع

بابتہ اپریل ۱۹۲۷ء



آنریبل سر مہاراجہ صاحب محمود آباد

از

حسن عابد جعفری صاحب۔ آکسن۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر شمع



ہندو مسلم ہنگامہ آرائیوں نے کچھ عرصہ سے ملک کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ملک کی مقتدر اور ذی اثر ہستیاں جو فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے میں شامل

نہیں ہیں۔ مرعوب ہوکر گوشہ نشیں ہوگئی ہیں۔ یا اس خیال میں ہیں کہ چند دنوں کے بعد دونوں فرقے سپر ڈال کر خود بخود صلح کریں گے۔ ملک کے قوم پرست اور وطن دوست اعضاء رئیسہ کبھی اس طرح مفلوج نہ ہوئے تھے۔ اور نہ غلط فہمی۔ یا شر کی بنا پر ملک کی کوئی جماعت کبھی اس طرح آمادہ تخریب ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ حسرتناک اور عبرت انگیز معاملہ یہ تھا کہ ارباب حل وعقد، کچھ اس طرح سہمے ہوئے تھے کہ اُنکی یکجائی قوتوں کو برسر کار لانا ناممکن نظر آتا تھا۔ ایسے تیرہ وتار اور ابر آلود مطلع میں برسر میدان آجانا غیر معمولی شخصیت اور وجاہت کے لیڈر کا کام تھا۔ اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جسپر ملک کو اعتبار ہو۔ اور وہ خود ذاتی اور پبلک حیثیتوں سے فرقہ وارانہ کشمکش سے بالا اور برتر ہو۔

یہ امر ملک کے لیئے فال نیک ہے کہ سر مہاراجہ صاحب بہادر نے اس موقع پر کمال دور اندیشی اور جوانمردی سے بہ نفس نفیس سبقت فرما کر ملک کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی اور اُنکی تحریک پر ملک کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے حال میں دہلی میں جمع ہوکر ہندو مسلم اتحاد کے ذرائع اور وسائل پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی۔ مسئلہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ایک دو نشستوں میں جملہ معاملات کا فیصل ہوجانا قطعی ناممکن تھا اور نہ کسی ذمہ دار حلقہ میں اس قسم کی اُمیدیں کیجا سکتی تھیں۔ لیکن باہمی گفت وشنید اور طریق عمل نے خوش آیند توقعات پیدا کر دیئے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کے نمایندوں نے خالی الذہن ہوکر ایک مستقل نتیجہ پر پہونچنے کی ضرورت کو اچھی طرح محسوس کرلیا ہے۔ ملک کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے دونوں فرقوں کے نمایندوں کو ایک مرکز پر لے آنا۔ حقیقت میں دماغی قابلیت۔ اور ذاتی وجاہت کا ایک کارنامہ ہے۔ جسکی توقع صرف سر مہاراجہ صاحب بہادر کی ذات والاصفات سے ہوسکتی تھی۔ یہ سوال قبل از وقت ہے کہ اس اتحاد عمل

کا نتیجہ کیا ہوگا۔ نتیجہ کے ذمہ دار تو وہی ہو سکتے ہیں جو معاملات میں پڑ کر آخیر میں مستقل فیصلہ کریں گے۔ لیکن ملک کی ذہنیت کو ایک خوشگوار فضا میں لا کر آمادۂ عمل کر دینا بجائے خود مہتم بالشان کام ہے جسکی چند ہفتوں قبل توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ سر مہاراجہ صاحب بہادر نے ایسے ضروری کام کی ابتدا کی ہے جسکے لیئے موصوف تمام ملک کی جانب سے دلی شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ذاتی صفات۔ خاندانی روایات اور دماغی قابلیتوں کے لحاظ سے اس زبردست کام کے لیئے قطعی طور پر موزوں ہیں اور آزمودہ کار۔ مدبر۔ سچے محب وطن۔ اور پچیس تیس برس سے ملکی اور قومی امور میں سرگرمی کے ساتھ منہمک ہیں۔ وہ ہر صوبہ اور ہر فرقے کے نمایندوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ملک کو اُنکی ذات پر پورا اعتماد ہے اور غالباً میدان سیاست میں اُن کے سوا دوسرا کوئی لیڈر نہیں ہے جس کے ساتھ کام کرنے کے لیئے ملک کی ہر جماعت کے نمایندے آمادہ ہوں۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں ہندو مسلم اجتماع کا باعث سر مہاراجہ صاحب بہادر تھے اور اس موقع پر جو مفید اور قابل عمل نتائج مرتب ہوئے تھے وہ ابھی تک دلوں سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ اگر اس زمانہ میں "مسز اینی بیسنٹ" نظر بند نہ ہو جاتیں اور خود سر مہاراجہ صاحب بہادر اپنی توجہ کو نہ ہٹا لیتے تو بیشک وہی انڈین نیشنل کانگریس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوتے۔ موصوف دنیاوی اعزاز اور افتخار کے خواہش مند نہیں رہے ہے ورنہ کانگریس کی صدارت کے علاوہ اور بہت سی نام و نمود کی باتیں اُنکی ادنےٰ توجہ سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ وہ حق پسند اور جفاکش بزرگ ہیں لیکن اُن کی کثرت اشغال کا ذکر اُنکی تعریف نہیں ہے کیونکہ دماغی اور ذہنی ریاضت اُنکی فطرت میں داخل ہے جسکو وہ کسی معاوضہ کی نیت سے نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ ملک میں ایسی کوئی ہستی یا جماعت ہے جو اُنکی خدمات کا معاوضہ دینے کی مقدرت رکھتی ہو

اسی طرح قومی اور ملکی معاملات میں انہماک اور استغراق اِن کی خاندانی روایات میں داخل ہے اور اُنکی سہر دلعزیزی کا تذکرہ اُنکی مقبول اور محبوب ذات کی ثنا خوانی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ غربا اور مساکین کی امداد اور حاجت روائی۔ اہل کمال اور شرفا کی قدر دانی اور اعانت، موصوف کی مشہور صفات ہیں۔ انکی دولت اور بزرگی خود ساختہ نہیں ہیں وہ رئیس ابن رئیس اور امیر ابن امیر ہیں۔ قومی اور ملکی معاملات میں فیاضیاں اُن کے خاندانی شعار میں داخل ہیں اور اُنکی مستقل اور روشن مثالوں سے کوئی لکھا پڑھا شخص بے خبر نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں کو موصوف سے ذاتی تعارف کی سعادت حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ خاندانی ثروت اور وجاہت سے علیحدہ خود اُنکی ذاتی شخصیت کس قدر دلکش اور قابل محبت ہے۔ وہ مجسم اخلاق ہیں اور اُنکے دربار میں اُمرا، غربا، علما اور اہل سیاست کے ساتھ یکساں محبت اور اخلاق کا سلوک ہوتا ہے۔ وہ نہایت متواضع اور سیر چشم بزرگ ہیں اور غریبوں اور تہیدستوں سے اُسی طرح خندہ پیشانی کا برتاؤ فرماتے ہیں جس طرح اپنے ہم چشموں سے۔ وہ اُنکی دکھ بھری کہانیوں کو اُسی ہمدردی اور شفقت سے سُنتے ہیں جس طرح منعموں کی زبانی خود اُن کے حالات کو، اُنکی آنکھیں ہر وقت مسکراتی ہیں۔ اور لمحوں میں دلوں کو ٹٹول کر اُن کے سربستہ راز دیکھ لیتی ہیں۔ اور انسان رخصت ہوتے وقت محسوس کرتا ہے کہ اُس کا راز ممدوح پر عیاں ہو چکا ہے۔

وہ اگرچہ گریجویٹ نہیں ہیں مگر ہزاروں گریجویٹس سے بہتر انگریزی لکھتے اور بولتے ہیں۔ عربی، اُردو، فارسی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُردو میں تو وہ مجتہد ہیں اور اُنکی گفتگو سُننے سے تعلق رکھتی ہے وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ اور مشکل ترین صنف یعنی مرثیہ گوئی میں باکمال ہیں اور لاجواب مرثیہ پڑھتے ہیں۔

اُن کے حُسن عقیدت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکو مجالس میں یا نجی طور پر زبانِ مبارک سے کلام سُننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اُنکی معلومات وسیع ہیں۔ بالخصوص تاریخ اودھ کے پوست کندہ حالات جو اُن کو معلوم ہیں اگر جمع کیے جائیں تو اودھ کی بینظیر تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

ریاست محمود آباد تاریخی حیثیت سے ایک مشہور اور مقتدر ریاست ہے اور اودھ میں کئی حیثیتوں سے چوٹی کی ریاست مانی جاتی ہے اُسکی آمدنی کا معقول حصہ نیک کاموں میں خرچ ہوتا ہے جسکی تفصیل سے ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے۔ مُلکی اور قومی اُمور میں بھی سرمہاراجہ صاحب بہادر اپنی دولت کو بے دریغ صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ سابق "علی گڈھ کالج، مسلم یونیورسٹی، مسلم لیگ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ میڈیکل کالج۔ ایسی سی ایشن تعلقہ داران، محمود آباد انٹرمیڈیٹ کالج۔ امیرالدولہ ہائی اسکول لکھنؤ، امیرالدولہ پبلک لائبریری، سرمہاراجہ صاحب بہادر کے گرانقدر اور مستقل عطیات کے لیئے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ ممدوح نے قومی اور ملکی تحریکوں میں لاکھوں روپیہ دیکر عملی اعانت فرمائی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں ہندو مسلم معرکۃ الآرا اجتماع کے موقع پر صرف مہمانوں کے موٹروں کے پٹرول کا خرچ سات ہزار روپیہ سے زائد تھا جسکو محمود آباد کے خزانے نے ادا کیا۔ اُن کی تاکید ہے کہ اُن کے کارناموں کو شہرت نہ دیجائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دربار میں قصیدہ خوانی یکقلم موقوف ہے

بعض ناواقف سمجھتے ہیں کہ ہوم ممبری کے زمانہ میں ممدوح کی سیاسی سرگرمیاں بند رہیں۔ حالانکہ واقفکار حضرات جانتے ہیں کہ اگرچہ وہ عہدہ خود ممدوح کے لیئے بارخاطر رہا لیکن اِس صوبہ کے لیئے نیک فال ثابت ہوا۔ اُس زمانہ میں اگر حکومت کی باگ ممدوح کے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو گرم فرقوں کی گرمیاں اور برخود غلط طبقوں کی

شر انگیزیاں صوبہ میں آگ لگائے بغیر نہ رہتیں ۔ اِس نازک اور پُر آشوب زمانہ کو اُنھوں نے اِس طرح گذار دیا کہ کسی فرقہ کی خود داری کو ٹھیس تک نہ لگی ۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ سر ہمارا راجہ صاحب بہادر نے ایک نہایت اہم کام میں ہاتھ ڈالا ہے اور اُنکی ذات سے اُمید ہے کہ بہت جلد ملک ہندو مسلم اتفاق کی طرف پلٹا کھائے گا اور اتحاد اور اشتراک عمل کا دریا جو کچھ عرصہ سے اُلٹا بہہ رہا تھا اپنا رُخ بدل کر اب پھر سیدھا بہے گا ۔

غزل

غیر مطبوعہ

جناب شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مرحوم

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
ٹکڑے ٹکڑے کبھی داماں نہ ہوا تھا سو ہوا

رہتا ہے مصحفِ رُخ آٹھ پہر پیشِ نظر
دل مرا حافظِ قرآں نہ ہوا تھا سو ہوا

اے بُتِ خانہ برانداز ترے جوروں سے
خانۂ دل کبھی ویراں نہ ہوا تھا سو ہوا

آگیا پیچ میں اُس زلف مسلسل کے جو دل
مسکن اپنا کبھی زنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

سوزِ ہجراں سے ہی ہر روز نیا گل کھلتا
سینۂ داغوں سے گلستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

مصحفِ رُخ کا لگی زلف تری لینے سبق
اے صنم تو ہی مسلماں نہ ہوا تھا سو ہوا

دیکھکر تیغ بہ کف یار کو بولا آزاد
دشمنِ جاں کبھی جاناں نہ ہوا تھا سو ہوا

ڈاکٹر سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک مرحوم کے اخلاق

از

جناب نواب سر امین جنگ بہادر، کے، سی، آئی۔ای۔ پرائیویٹ سکریٹری سرکار عالی حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ

چند ماہ قبل نواب مہدی یار جنگ بہادر، فرزند نواب عماد الملک مرحوم کے مکان پر چند احباب کی ایک کمیٹی منعقد ہوئی تھی جس میں یہ طے پایا تھا کہ مولوی سید حسین صاحب بلگرامی المخاطب بہ نواب عماد الملک بہادر، سی، ایس، آئی کی ایک لائف لکھی جائے اور مرحوم کے مخصوص احباب سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ ایک ایک باب اس مجوزہ کتاب کے لئے تحریر فرمائیں اور اس لائف کی ترتیب و تنظیم کا کام مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کو تفویض ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر نواب سر امین جنگ بہادر نے اُن کی اخلاقی زندگی پر جو مضمون لکھا ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

سید محمد حسین بلگرامی

۲۰ فروری ۲۷ء

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ

محبی سید محمد حسن بلگرامی اور مشفقی سید ہاشم ندوی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ نواب عماد الملک مرحوم کی سوانح عمری کے واسطے جو اُنکی یادگار کے طور پر شایع ہونے والی ہے اپنے ذاتی علم کی بنا پر چند باتیں لکھ دوں جو مرحوم کے اخلاق زندگی پر روشنی ڈالتی ہوں میں نے

وعدہ تو کر لیا مگر جب قلم اُٹھایا تو فکر دامنگیر ہوئی کہ خدایا کیا لکھوں۔ اچانک مجھے سیّد مرحوم کی ایک عادت یاد آگئی کہ وہ ایسی اُلجھن اور کشمکش و پیچ کی صورت میں کیا کیا کرتے تھے۔ میں نے قرآن مجید کھولا تو میری نظر اُس آیہ شریفہ پر پڑی (سورۂ زمر آیہ ۱۰) جو عنوان پر میں نے لکھی ہے۔ اس فال نے مجھے مرحوم کی اخلاقی زندگی کا ثمرہ بتادیا۔ اُنھوں نے حتی المقدور نیکی اتنی کی اور صبر سے اس طرح کام لیا کہ انکو خود اسی وسیع دنیا میں اجر بیحساب ملا اور آخرت کے اجر کا تو کیا پوچھنا۔ کسی دکھنی شاعر نے خوب کہا ہے۔

زندہ دلوں کے موت کے پیچھے بہار ہے
جب بجھ گیا چراغ تو کہتے ہیں گل ہوا

اسمیں کوئی شک نہیں کہ مولوی سید حسین بلگرامی زندہ دل تھے اور میرا اعتقاد ہے کہ وہ اب بھی خدا کے جوارِ رحمت میں اپنی زندہ دلی کی بہار لوٹ رہے ہیں۔ ان کی زندہ دلی کا ایک بین ثبوت میرے نزدیک یہ ہے کہ اُنکے حین حیات میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جسکو اُنکی ذات سے واقعی کوئی عناد ہو۔ کوئی فردِ بشر اُنکا ذاتی دشمن نہ تھا اکثر اُنکے دوست اور دشمن مدّاح ہی تھے۔ اُنکے خصائل مطبوعہ اور عادات مکسوبہ میں کوئی ایسا نقص و عیب نہیں تھا جسکی کوئی حکایت یا شکایت واجبی طور سے کر سکے مگر اِس کے معنیٰ یہ نہیں کہ اُن کا کوئی عیب جو یا حاسد ہی نہ تھا۔

سیّد مرحوم اِس ریاست میں بڑے بڑے اور مقتدر عہدوں پر مامور رہے تین مدارالمہاموں سالارجنگ اوّل دوم و سوم کے مقرب و مشیر تھے۔ اِس ریاست ابدمدت کے ایک فرمانروا کے معتمد اور دوسرے کے اتالیق رہے انگلستان میں انڈیا کونسل کے رُکن ایک عرصہ تک رہے اِن کو کوئن ایمپرس وکٹوریا اور اُنکے بعد اُنکے فرزند اور پوتے یعنی بعد کے دو شہنشاہوں سے ذاتی تعارف تھا۔ ہند کے رؤسا اور اکابر کے علاوہ انگلستان کے اُمرا اور عمائدین سے اُنکی دوستانہ راہ و رسم اور سلیقت

رہی۔ پس ہماری موجودہ دنیا میں ایسے آدمی اگر محسود خلق بھی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ خود سید مرحوم کو جہاں تک میں واقف ہوں حسد اور بغض کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ اُنکا اعزاز اور اقتدار ایسا رہا کہ اُن سے حسد کرنے والے بہت تھے اور اُن کے رنج یا نقصان سے خوش ہوتے تھے۔ یہ لوگ در اصل اُن کے ذاتی عدو یا دشمن نہیں تھے۔ بلکہ اُنکو محض حاسد یا پولیٹکل مخالف کہنا چاہیے۔

حیدرآباد میں میری ملازمت کا پہلا نصف حصہ کچھ ایسے احوال میں بسر ہوا جسکے باعث میں سید مرحوم کے پولیٹکل حاسدوں اور مخالفوں کے زمرے میں شمار کیا جاتا رہا حالانکہ مجھے بذات خود کوئی وجہ اُن سے مخالفت یا حسد کی نہ تھی۔ مجھے حضرات غفران مکان کے زمانہ میں سید صاحب سے ملنے جلنے کا اتفاق نہوا۔ بعد میں جب دو ایک ملاقاتیں اُن سے ہوئیں تو اُن کا اخلاقی جادو ایسا کارگر ہوا کہ میں اُنکا دوست تو کیا عقیدتمند چیلہ بنگیا۔ غالباً ہم دونوں کی طبائع میں تھوڑی بہت یکرنگی تھی کہ

سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم (غنی)

میری خوش نصیبی تھی کہ نواب مرحوم میں اور مجھ میں سولہ سال تک کمال محبت و اتحاد کے مراسم رہے اگرچہ وہ سیدھے سادھے سید تھے لیکن اُنکی ہر بات ہر فعل اور ادا سے خاندانی شرافت ٹپکتی تھی۔ اور اِس شرافت میں اُنکی خلقی تمکنت چمکتی تھی۔ اُنکے اخلاق میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ اُن سے ملتے ہی اُنکا مخالف بھی اُن کا دوست بنجاتا تھا میں اُنکو "گروجی" پکارتا تھا وہ مجھے اپنا "چیلہ" مانتے تھے اکثر ملاقاتوں میں بے تکلف گفتگو اور ظرافت ہوا کرتی تھی اُنکی محبت میں عجیب لطف نظر آتا تھا جسکو فقط دل محسوس کرتا تھا اور الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا

میں اُن سے اکثر پوچھا کرتا تھا "گروجی" وہ گر تو بتائیے جس سے آپ دشمن کو دوست بنالیتے ہیں، مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک روز میرے اصرار پر اُنھوں نے خواجہ حافظ رح کا یہ شعر پڑھا جو واقعی دستور العمل تھا۔

وفا کنیم و جفا می کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن

وہ سچے سید تھے تو تھے ہی وفا شعاری اُن کے موروثی خصائل میں سے تھی میں نے کسی کو اُن کی بیوفائی کا تو کجا بے اعتنائی کا بھی شاکی نہ دیکھا۔ ایک دفعہ اُنکو موقع ملا تھا کہ فقط ایک لفظ "ہاں" یا "مناسب" کہدینے سے اُن کے ایک دوست کی جگہ اُن کے ایک فرزند دلبند کو بڑا عہدہ مل سکتا تھا لیکن اُنکی وفاداری اور راستبازی تھی جس نے اُنھیں اپنے دوست پر اپنے فرزند کو ترجیح دینے سے باز رکھا یعنی اُنھوں نے اپنے فرزند کے لیئے اُس عہدہ کو قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ یہ وفاداری کی فقط ایک نظیر ہے اُن صدہا نظایر میں سے جو اُنکی ہشت سالہ عمر کی روداد میں ملیں گی کوئی تعجب نہیں اُنکی وفاداری اور راستبازی نے اُن کو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ اُنکی جفا کشی کی میں کم از کم ایک درجن مثالیں لکھ سکتا ہوں لیکن اُنکی صراحت کیواسطے حیدر آباد کی تاریخ لکھنی ہو گی جسکا فی الوقت کوئی موقع نہیں ہے۔ ہر شخص سے وہ بکشادہ پیشانی ملتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اُنکی مروت اور حلم کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے کبھی کسی مفسدہ پرداز اور بدمعاش تک کو بھی بُرا بھلا نہیں کہا۔ ہر ایک کی باتیں وہ دلدہی اور ہمدردی سے سُنا کرتے تھے اُنکی زبان میں خفیف سی لکنت تھی جسکی وجہ سے اُن کے منھ سے الفاظ رک رک کر جھٹکے کے ساتھ نکلتے تھے۔ جیسے گھڑ کنے یا جھڑ کنے کے وقت آدمی کے منھ سے نکلتے ہیں۔ مگر اُنکی باتوں کا مضمون ہمیشہ ایسی ملائمت سے بھرا ہوتا تھا کہ اُن کی گفتگو کے طرز سے کبھی کوئی کشیدہ خاطر نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔

اللہ نے اُن میں صبر و تحمل کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے اجداد معصوم و مظلوم کے عمل کی پیروی کریں۔ اسی کوشش میں وہ اکثر کامیاب ہوتے تھے۔ پندرہ سولہ سال میں وقت بیوقت اُن سے ملنے کے مجھے بحیثیاب مواقع حاصل تھے حتیٰ کہ میں اُنکی خوابگاہ میں بے تکلف گھس جاتا تھا۔ میں نے کبھی اُنکو غیر معمولی غیظ و غضب یا طیش و پریشانی کی حالت میں نہ دیکھا۔ البتہ میں نے اُنھیں دوبار غم و الم کی حالت میں دیکھا ہے ایکبار اُن کے لائق و فاضل فرزند سید ہاشم کے انتقال کے بعد اور دوسری دفعہ اُنکی قابلِ احترام دختر طیبہ بیگم کی وفات کے بعد۔ دونوں دفعہ جب میں اُن کے ہاں تعزیت کے واسطے گیا تو اُنکی زبان سے بجز ایک سوال کے اور کوئی بات نہ نکلی "مجھ بوڑھے کو چھوڑ کر کیوں موت نے اُنھیں لے ڈالا"؟ دو ایک منٹ کے سکوت کے بعد اُنھوں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی یوں دیا۔ "مشیتِ ایزدی" پھر دو ایک منٹ کی خاموشی کے بعد وہ غم غلط کرنے کی غرض سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کبھی اُنھوں نے مذکورہ جانکاہ حادثوں کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ فضول اظہار رنج اُنکو کبھی پسند نہ تھا۔ اخیر عمر میں شکستہ پیر کے درد نے اُنھیں چلنے پھرنے سے معذور بنا رکھا تھا اسکی نسبت مزاج پرسی کے جواب میں وہ کبھی کبھی ایک دو لفظ کہدیتے تھے مگر اپنے ملاقاتیوں سے کوئی ایسا شکوہ شکایت نہ کرتے تھے جیسا کہ اکثر بڑے بوڑھے بیمار کیا کرتے ہیں اُن کے چہرے سے ہمیشہ یہ بات ٹپکتی تھی کہ اُنکا قلب مطمئن اور رنج و غصہ کی کدورت سے پاک تھا۔ اُنکی زندہ دلی کا مسلک "خوش رہو خوش رکھو" تھا۔ آپ بھی خوش رہتے تھے اور اپنے اقارب و احباب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر وقت ہنسی اور ظرافت کی باتیں اُنھیں پسند آتی تھیں۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی اشعار اور مقولے بہت سے یاد تھے اور اُن کو موقع موقع سے دُہرا کر اپنی خوش طبعی کے سونے میں

اُن سے سُہاگے کا کام لیتے تھے۔ جیساکہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ وہ اپنا مطلب اکثر کنایتہ اساتذہ کے اشعار اور مقولوں میں بیان کر دیتے تھے۔

وہ اپنا مذہب ومشرب کسی سے چھپاتے نہ تھے۔ شیعہ تھے لیکن کبھی سُنیوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے اُنکو عار نہ تھا۔ کہتے تھے کہ اس سے اُنکے مذہب اور اُنکی عبادت میں کوئی تزلزل نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ کی عبادت اگر سچی ہو تو ہر جگہ ہر طرح اور ہر شخص کے ساتھ ہوسکتی ہے ؎

منزل از یار قرین ست چہ دوزخ چہ بہشت
سجدۂ گر بہ نیاز ست چہ مسجد چہ کنشت

کبھی میں نے اُنکو کسی مذہب یا فرقہ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے نہ سُنا۔ کلمہ گو مومن مسلمانوں میں آپس کے نفاق کو وہ نفرت وافسوس کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگرکم بخت نفاق اور فرقے نہوتے تو آج مسلمان روے زمیں کے مالک ہوتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے مذہبی خیالات کیسے وسیع تھے اور کس قدر اُنکا دل صفا منزل تعصب سے پاک تھا۔ عیب جوئی اور درشتی اُنکی سرشت ہی میں نہ تھی۔ ہر شخص کو اپنی طرح اچھا اور نیک نیت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کو دھوکا دینے اور مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش میں بعض چالباز کبھی کبھی کامیاب بھی ہوجاتے تھے۔ اگرچہ اُنکی فطری فراست ایسے لوگوں کی قلعی بہت جلدی کھول دیتی تھی۔

غرض نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ وہ فرشتہ نہ تھے انسان تھے۔ مگر انسانوں میں فرد فرید تھے۔ وہ عابد اور متقی نہ تھے ایک دنیا دار تھے مگر دنیا داروں میں مردِ صالح تھے۔ اُنکی دنیا داری عام دنیا داروں کی عادات اور اقوال سے اُسی قدر دور تھی جس قدر کہ وہ اولیاءاللہ کے

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا پایہ اُردو ادبیات میں

از

جناب محمد عزیز اللہ صاحب بی۔ اے۔ مدراس

(شمع بابتہ فروری ۱۹۲۶ء سے پیوستہ)

یہاں تک تو مولانا حالی کی نظموں پر بحث تھی۔ اب میں اُن کے تصانیف کے باب میں کچھ کہوں گا۔ اُنکی نثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی مناسبت طبعی بلحاظ نثر کے زیادہ تر نظم سے تھی۔ چونکہ بہترین نثار شعرا ہی ہوا کرتے ہیں مولانا حالی بھی مشہور نثاروں کی صف میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اُن کی مشہور تصنیف **مقدمہ دیوان حالی** ہے۔ جو تقریباً دوسو صفحوں سے زائد ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی عملی مثال ہی پیش نہیں کی بلکہ اپنے دیوان کے مقدمہ کو دیگر شعرا کے لیئے مشعل ہدایت قرار دیا۔ یہاں تک کہ وہ مغربی خیالات اور مغربی معیار نظم سے واقف ہونے لگے۔ اُردو زبان میں یہ پہلا قدم ہے جو مشرقی اور مغربی خیالات کے امتزاج کی طرف بڑھایا گیا تھا۔ حالی کی عبارت میں آزاد کی سی شوخی اور محاورہ بندی نہ سہی لیکن وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مطلب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور اُسکو ایسے دلاویز اور مؤثر پیرایہ میں پیش کرتے ہیں جو فوراً اثر کر جاتا ہے۔ اُن کا دل ایک ایسا صاف اور شفاف دریا ہے جو نہایت صفائی سے بہہ رہا ہے۔ جس میں کدورت و غبار بالکل نہیں۔

اس مقدمہ میں حالی نے شاعری کا اصل اصول پیش کیا ہے جس سے

اُردو ادب میں نہ صرف ایک بیش بہا اضافہ ہوا بلکہ وہ شعرا کے لئے رہنمائی کا باعث ہوگیا۔ اُس کے چند اصول یہاں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جس سے مولانا کے اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات شاعرانہ کا بخوبی اظہار ہوسکتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاعری کے لئے سب سے پہلی علامت موزونی طبع، ہے جس کو ایک خداداد نعمت سمجھنا چاہیے۔ جو شخص اِس عطیۂ الٰہی کو کام میں لاوے وہ سوسائٹی کو بیحد فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ پھر کہتے ہیں مسلمانوں میں بہ نسبت دوسری قوموں کے شعرا کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اِس کا سبب یہی ہے کہ ممدوح اپنی مدح و ستائش سے خوش ہو کر صلہ و انعام دے کر اور لکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ سامعین تحسین و آفریں سے شاعر کا دل بڑھاتے ہیں۔ حالی کا قول ہے کہ "قوم کا شاعر وہی ہوسکتا ہے جو شاعری کے فرائض بغیر اُمید و بیم کے نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ نہ اُسکو سلطنت کی دستگیری کی کچھ پرواہ ہے نہ بادشاہ کے مواخذہ کا کچھ خوف"۔ پھر ایک جگہ حالی بُری شاعری کا نقصان سوسائٹی اور ادب پر بتلاتے ہیں۔ دوسری جگہ شاعری کی اصلاح میں مشکلات دکھلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصلح نے "اگر بالفرض قوم کا شارع عام چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کی تو اُسکو دو نہایت سخت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اول تو طریقۂ غیر مسلوک میں قدم رکھنا اور اُس کے تمام مرحلوں سے عبور کر کے منزل مقصود تک پہونچنا ہی نہایت کٹھن اور دشوار کام ہے دوسری مشکل اُس سے بھی زیادہ سخت یہ ہے کہ موجودہ سوسائٹی کا مذاق چونکہ اس نئی روش سے بالکل بیگانہ ہوتا ہے اس لیئے نہ کوئی اُسکی مشکلات کا اندازہ کرسکتا ہے اور نہ کہیں اُس کی محنت کی داد مل سکتی ہے۔ پس کوئی شخص جب تک کہ زمانہ کی قدردانی سے بالکل دست بردار ہو کر اُس دہقان کی مانند

جو اخیر عمر میں کھجور کی پود اپنی زمین میں لگائے محض ایک اُمید موہوم پر آیندہ نسلوں کی ضیافت طبع کا منصوبہ نہ باندھے اُس کو چہ میں ہرگز قدم نہیں رکھ سکتا"۔ پھر خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ شاعری کی اصلاح کے لیئے نئی شاعری کے عمدہ نمونے پبلک کے روبرو پیش کیئے جائیں۔ اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر میں بعض خصوصیتیں پائی جائیں۔ شاعری کی پہلی خصوصیت قوت متخیلہ ہے جسکو انگریزی میں امیجینیشن، کہتے ہیں۔ جس شاعر میں اسکی مقدار اعلےٰ درجہ کی ہوگی اُسی قدر اُسکی شاعری پر ارفع و اعلےٰ ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جسکو شاعر ماں کے پیٹ سے لیکر نکلتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شاعر کائنات کا اور کائنات میں بالخصوص فطرت انسانی کا غور سے مطالعہ کرے۔ اس مطالعہ کے بعد دوسرا اہم اور ضروری مطالعہ تناسب الفاظ کا ہے جسکے انتخاب و ترتیب سے شعر کے معنی و مقصود مخاطب کو بلا تردد سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہوتا ہے جو مخاطب کو مسخر کرلیتا ہے۔ مولانا حالی نے نے شعر کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ملٹن کا مقولہ پیش کیا ہے کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو"۔ ان چند الفاظ میں شعر کی خوبیوں کا بیان مجمل کر دیا ہے۔ اس کے بعد اُسکی تفصیل ہے پھر نیچرل شاعری پر بحث ہے اور محاورہ و روزمرہ میں فرق بتلایا ہے جو دیکھنے سے متعلق ہے۔ اسکے علاوہ مختلف اصناف سخن پر مفصل مثالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ غرضکہ ایسے مفید و کارآمد اصولوں سے مقدمہ بھرا پڑا ہے جس کو شعراء عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

چونکہ مقدمہ شعر و شاعری سے متعلق ہے اسکا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ اب میں مولانا کی دوسری تصانیف پر سرسری نظر ڈالتا ہوں۔ مولانا حالی نے

لاہور کے زمانہ قیام میں تعلیم نسواں کے متعلق ایک کتاب قصہ کے پیرایہ میں لکھی تھی جسکا نام مجالس النساء رکھا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ایک مدت تک اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں جاری رہی۔ اس میں مولانا نے عورتوں کی زباں اور عورتوں کے محاورات برتے ہیں۔ مجالس النساء عورتوں کی ضروری تعلیم و اصلاح کے لیئے مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ اس کے اثر سے اکثر خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ عموماً ہندوستان میں اور بالخصوص دلّی میں شروع ہوگیا ہے۔ آپ کو ہمیشہ عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ پر ہر وقت اور ہر زمانہ میں خاص توجہ رہی اور اس کوشش میں دلچسپی کے ساتھ مصروف رہے ہیں۔ اس کتاب پر کرنل ہالرائڈ سررشتہ تعلیم پنجاب نے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چارسو روپیہ کا انعام دلوایا تھا۔

مجالس النساء کے بعد "حیات سعدی" لکھی گئی جو ۱۸۸۶ء میں چھپ کر شائع ہوئی اس میں شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری اور سیر سیاحت کے واقعات مفصل اور مشرح طور پر درج ہیں۔ اور اُن کے اقوال کا تعلیم یافتہ جماعت پر جو اثر اُنکی زندگی اور وفات کے بعد سے آج تک ہوا اُس پر بحث کی ہے اور اُن کی نظم و نثر کے وہ شعر اور وہ فقرے بھی لکھے ہیں جو اُنھوں نے عربی زبان سے ترجمہ کیئے ہیں اور اُن کے شاعرانہ تبحّر کی خوبی اور نظم و نثر کی عمدگی نہایت خوش اسلوبی اور لیاقت کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ حیات سعدی کی تصنیف سے حالی نے آنے والے مصنفین کے لیئے راہ کھول دی۔ عبارت نہایت صاف اور شُستہ ہے اور اسی میں اپنے فرض کو ادا کیا ہے۔

مولانا حالی کی دوسری قابل دید تصنیف "یادگار غالب" ہے جس کو

اُنھوں نے اپنے اُستاد اور دوست مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم کی محبت میں متوالے بن کر لکھا۔ اس میں مرزا کی لطیفہ گوئی۔ بذلہ سنجی خصلت اور طرز معاشرت کے علاوہ اُنکی اُردو اور فارسی نظم و نثر کی خوبیاں اور نازک خیالیاں علیحدہ علیحدہ تمثیل کے ساتھ بتلائی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے کلام کا موازنہ اساتذۂ ایران سے کیا ہے اور اُن کے حل طلب اور دقیق اشعار کے معنی اور اُسکے ساتھ اُنکی ندرت اور جدت بیان کر کے اُن کی فارسی قابلیت کا وہ بلند و بالا مرتبہ جو عام نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور جس کو اُس زمانہ میں اُنکے ماننے والے بھی کچھ اور سمجھ نہ سکتے تھے نہایت واضح اور معقول اور دلنشیں طور پر سب کے روبرو پیش کیا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ مولانا حالی جیسے قابل اور وسیع شخص ہی کا کام تھا۔ اگر شکسپیر کو گیٹے پر فخر ہو سکتا ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ مرزا غالب کو حالی پر فخر ہوگا کیونکہ گیٹے نے شکسپیر کو دنیا سے روشناس کرایا اور حالی نے غالب کو

مولانا حالی کی آخری اور ضخیم تصنیف "**حیات جاوید**" تقریباً ایک ہزار صفحوں کی سرسید احمد خاں کی نہایت اعلیٰ درجہ کی سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب مولانا نے سرسید کی زندگی سے ہی لکھنی شروع کر دی تھی اور اُن کے انتقال کے بعد شایع کی۔ اس میں سرسید کے تمام حالات مشرح و مفصل تحریر کیئے ہیں۔ حیات جاوید سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کا مقصود سوانح نگاری نہ تھا بلکہ سرسید کے ہمدردوں کی جانب سے ایک "اپالوجی" یا معذرت پیش کرنی تھی۔ ممکن ہے کہ زبان اُردو میں یہ کتاب باسویل کی "لائف آف جانسن" کی مساوی سمجھی جائے۔ اس کے پڑھنے سے اکثر مباحث اور مطالب جو مسلمانوں کی تمدنی۔ مذہبی، اخلاقی، اور تعلیمی معاملات سے متعلق ہیں حل ہو جاتے ہیں

میں نے ابتک مولانا نے حالی کی جملہ تصانیف نظم و نثر پر بحث کی ہے اور چلتے ہو مناسب موقعوں پر کچھ کچھ خوبیاں اور بُرائیاں بھی بتلا دی ہیں۔ مگر اب میں اُن کی

کُل تصانیف نظم و نثر پر ایک عام تنقیدی نظر ڈالوں گا۔ بعض مبصر ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اپنے طبعی مذاق کے موافق یا تو صرف صاحب موصوف کی خوبیاں ظاہر کرتے ہیں یا صرف عیبوں پر انگشت نما ہوتے ہیں۔ اگر منصفی سے دیکھا جائے تو وہی اصلی مبصر ہے جو دونوں کو یکساں ظاہر کرے میں جہاں تک ہو سکے گا اسکو مدِ نظر رکھوں گا۔

مولانا حالیؔ اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد اور ہندوستان کے معجز بیان سعدیؔ ہیں۔ حالیؔ صرف خوبیوں کی وجہ سے سعدی کے مشابہ ہیں ورنہ سعدی کے کلام میں جہاں فطرت انسانی کی واقفیت بہت زیادہ ہے وہاں یہ عیب بھی ہے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی کھٹکتے نظر آتے ہیں اور وہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو عورتوں اور بچوں کو پڑھائی نہیں جاسکتیں لیکن مولانا حالیؔ کے ہاں یہ بات نہیں۔ سعدیؔ انسان کو کامل بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن حالیؔ قوم کو کامل بنانا چاہتے۔ وہ صرف شاعر بے نظیر ہی نہیں تھے بلکہ ایک قوم کے سچے رہبر اور جاں نثار تھے۔ اسی وجہ سے قوم کی ابتر حالت پر اُنکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ دل میں درد اُٹھتا ہے اور سینہ میں جلن محسوس ہونے لگتی ہے۔ حالیؔ کا کلام صاف۔ دلآویز اور قومی اصلاح سے بھرا ہوا نظر آتا ہے اُنھوں نے زیادہ تر مسدس اور مثنوی میں طبع آزمائی کی ہے صرف اسی وجہ سے کہ ردیف و قافیہ کی قید نہ ہو۔ وہ اپنے خیالات کے آزادانہ اظہار میں قافیہ اور ردیف کو سنگِ راہ سمجھتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ کی پابندی کی وہی مثال ہو سکتی ہے کہ لباس کو زیادہ خوشنما بنانے کے لیئے اسکا اصل مقصد یعنی آسایش و سپردہ کھو بیٹھے۔ اسی واسطے اُنھوں نے غزل اور قصیدہ سے درگذر کیا۔ مسدس اور مثنوی میں ردیف اور قافیہ کی آزادی کے علاوہ مضمون مسلسل رہتا ہے

اور زیادہ مؤثر بھی۔ حالی کے اشعار لفظاً اور معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یا فطرت یا عادت کے موافق کہے جاسکتے ہیں۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مراد ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب وبندش تابمقدور زبان کی عام بول چال کے موافق ہو یعنی دقیق الفاظ نہوں۔ معنیً نیچر کے مطابق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ دنیا میں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ اسی اصول کو مدنظر رکھکر اگر ہم حالی کے دیوان اور ان کی دیگر نظموں پر غائر نظر ڈالیں گے۔ تو یہ ثابت ہوجائے گا کہ کس قدر ان کے اشعار نیچر کی مطابقت کرتے ہیں۔ یہاں میں ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید　　خود بخود دل میں ہر اک شخص سمایا جاتا

ان کے اشعار عموماً سادہ واقع ہوئے ہیں اور یہی سادگی ہے جو ان کو قوم کی آنکھوں میں ہر دلعزیز کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ شعر کی طرف خطاب کرکے کہتے ہیں:-

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہو دلگداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

اس مختصر سی بحث کے بعد میں ناظرین پر اس فیصلہ کو چھوڑتا ہوں کہ آیا حالی ہندوستان کے نامور شعراءمیں شامل ہیں یا نہیں۔ جدید۔قدیم مشاہیر شعراءمیں مولانا کو ایک خاص امتیازی درجہ حاصل ہے۔

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے　　کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

مولانا کی نثر کی خصوصیت ہے کہ معنی والفاظ بالکل برابر ہیں۔ کلام میں نہیں ابہام یا اشکال نہیں پایا جاتا۔ لفظ البتہ بعض جگہ مشکل ہیں۔ آپ کی نثر پر یہ تنقید کی جاسکتی ہے کہ گو سلاست سرسید کے کلام میں زیادہ ہے اور بامحاورہ اور دلچسپ عبارت لکھنے میں پروفیسر آزاد یقینی بالا ہیں۔ پھر بھی فلسفی عمق جو حالی میں ہے وہ

آزاد میں نہیں۔ اور لٹریچر کے جن رموز پر حالی پہونچے ہیں سرسید مرحوم نہ پہنچ سکے مولانا کے مقدمہ شعر و شاعری نے اردو شعرا کے لیئے وہ راستہ کھول دیا جو زمانۂ دراز سے مسدود تھا۔ اس میں حالی نے شعرائے عرب و یونان و انگلستان کے خیالات و حالات کے مقابلہ سے اردو لٹریچر کی رونق دوبالا کر دی ہے۔ اس مقدمہ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا کو ہمارے ملک کی روایتوں اور درایتوں سے کس قدر واقفیت تھی۔ اگر اس بے نظیر تصنیف میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے تو صرف بقدر اکہ سنسکرت کے مشاہیر شعرا اور ان کے یادگار کارناموں کا ذکر نہیں کیا جس کا غالباً یہی سبب ہوگا کہ آپ کو سنسکرت کی معلومات سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کمی کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مقدمہ جیسی بے نظیر تصنیف شعرا کی رہنمائی کے لیئے ملنی دشوار ہے۔

خواجہ حالی کی دوسری تصانیف زیادہ تر سوانح واقع ہوئی ہیں۔ ان تصانیف میں مولانا نے جس طرح الفاظ کا صحیح اور برجستہ استعمال کیا ہے اور واقعات اور کیفیات بیان کرنے کا جیسا انھیں ڈھب آیا ہے کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ انھوں نے بیسوں ٹھیٹھ اردو الفاظ اور محاورات کو جو صرف عام بول چال میں تھے ادبی زبان میں رواج دیا ہے جس کی نظیر ہماری انشاپردازی میں نہیں مل سکتی اس سے مطالب کے ادا کرنے میں خاص لطف اور سہولیت پیدا ہوگئی۔ یہ بڑی جرأت کا کام تھا اور مولانا حالی جیسے قابل شخص کے لیئے ہی زیبا تھا۔ ایک فاضل بزرگ کا خیال ہے کہ "ہماری زبان میں نثر تھی ہی نہیں مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے متین اور پاکیزہ نثر لکھی" اس خیال کی صداقت آپ کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ آپ کو سوانح نگاری میں خاص ملکہ حاصل تھا لیکن بعض جگہ آپ سے لغزش بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ مثلاً

حیات سعدی میں اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض جگہ وہ اپنے مذاق کے اثر سے متاثر ہو جاتے ہیں اور مورخ کی غیر جانبدارانہ حیثیت اور سوانح نگار کے فرائض کو اچھی طرح سے باقی نہیں رکھ سکتے۔ یادگار غالب میں حالی مرزا غالب کی شاگردی کا حق ادا کرتے ہوئے اس بات کی کمزوری ظاہر کرتے ہیں کہ بہت سے واقعات پر اپنے آزادانہ رائے بیان نہیں کر سکتے یہی حال حیات جاوید کا ہے جس میں حالی اس الزام سے بچ نہیں سکتے کہ ابتدا سے انتہا تک سر سید کی سوانحعمری میں آپ کو یہی مقصود پیش نظر تھا کہ اپنے ہیرو کو مخالفین کے الزامات سے بری کیا جائے اور دوسروں کے طعنوں کا جواب دیا جائے۔ با اینہمہ ان کمزوریوں کے خواجہ حالی اپنے طرز سوانح نگاری میں یکتا ہیں۔

میرا مطلب ان چند اوراق سے یہ ثابت کرنا ہے کہ شمس العلما خواجہ الطاف حالی نے نہ صرف ایک سوشیل رفارمر کی حیثیت سے قوم کو ٹیڑھے راستے سے ہٹا کر راہ راست پر ڈالا بلکہ اردو ادب میں بھی ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ وہ شاعری جو عدتوں عشقیہ مضامین میں گھری ہوئی تھی اور دقیقہ سنجی و معنی آفرینی کو جوہر اصلی سمجھے ہوئی تھی مولانا حالی کی نظموں کے باعث سادگی اور مغربی طرز خیالات کی دلدادہ ہوگئی۔ وہ شعر جو تصرو رکی مصنوعی رنگ آمیزی کی بدولت مطالب کے ادا کرنے میں ناکافی ثابت ہوئی تھی۔ اب حالی کی سہولت کے سبب اپنے دائرہ کو وسیع کرنے لگی۔ یہ صرف خواجہ حالی کی کوششیں تھیں جنھوں نے زبان اردو کی دوسری زبانوں میں ایک خاص اور ممتاز ادبی درجہ دلوایا۔ اسی واسطے جب تک مسلمان ہندوستان میں باقی رہیں گے اور جب تک اردو ادب کا بول بالا رہے گا اسوقت تک مولانا کی محنتوں اور جانفشانیوں کی داد ملتی رہیگی اس سے بڑھکر شاعر کی اور کیا قبولیت ہوسکتی ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں مسدس

"مدوجزر اسلام" کا پشتو اور سندھی میں وبیوہ کی مناجات" کا علاوہ دس زبانوں کے اعلے سنسکرت میں اور رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ اہل زبان نے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ سے قوم کا مذاق بالکل بدل دیا اور اس کہنہ سخن کی طرز کے بجائے شاعری کو قدرتی مضامین کی طرف مائل کیا۔ مولانا آزاد نے بھی اس رنگ میں چند مثنویاں لکھی ہیں مثلاً شب قدر۔ صبح امید۔ حب وطن وغیرہ جو نظم آزاد میں چھپ چکی ہیں۔ مگر حالی کے طرز کلام کو آزاد کے کلام سے مقابلہ کیا جائے تو حالی کی افضلیت ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ مولانا کو اس روش سے ایک خاص مناسبت تھی۔

جب ہم تذکرہ نویسی یا واقعہ نگاری کے میدان میں پہونچتے ہیں تو مولانا آزاد کو اس قدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ سنبھلنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ تعصب سمجھیے یا ناواقفی "آب حیات" میں میر تقی میر کی صورت ہی بگاڑ دی اس طرح انشاء اللہ خاں انشا کے اواخر عمر کے متعلق اور مرزا دبیر کے خاندان کی نسبت آزاد نے اس قدر غلط سلط معلومات بہم پہونچائے ہیں کہ اہل علم محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ مولانا حالی کی حق شناسی وانصاف پرستی دیکھیے کہ وہ اپنے استاد یعنی مرزا غالب کی طرفداری اس طرح نہیں کرتے جیسے آزاد جو اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق کی حمایت میں تذکرہ نویسی کے اصول سے کوسوں دور جا پڑے۔

اگر ہم مولانا حالی کی نثر کو نذیر احمد کی نثر سے مقابلہ کرینگے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ نذیر احمد کی عبارت حالی کی سی سہل نہیں ہے۔ ان کی نثر میں عربی زبان کے الفاظ اور فقرے احادیث اور آیات قرآنی کا استعمال کثرت سے نظر آتا ہے۔ اسکا یہی سبب ہوگا کہ نذیر احمد کو عربی زبان سے ایک خاص

اُلفت تھی لیکن اس اُلفت نے زبان کی سلاست کھو دی نذیر احمد نے اپنے کلام میں زیادہ تر دہلی کے خاص محاورے اور الفاظ استعمال کئے ہیں جس کو غیر ملکی سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن مولانا حالی کے کلام میں یہ مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ انکی زبان عام فہم ہے جسکو ہر ایک شخص خواہ وہ کسی ملک کا ہو اگر اُردو پڑھ سکتا ہے تو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ یہ خصوصیت مولانا حالی کے کلام کی ہے جو کسی دوسرے مصنف میں نہیں پائی جاتی۔ سر سید کے کلام میں سلاست اور روانی زیادہ ہے لیکن لٹریچر کے جن رموز پر حالی پہونچے ہیں حالی نہ پہونچ سکے۔ حالی نے اُن تمام خوبیوں کو جو دوسرے مصنفیں میں کچھ کچھ پائی جاتی تھیں اپنے کلام میں مجتمع کیا ہے اور اسی واسطے یہ ڈنکے کی چوٹ کہا جا سکتا ہے کہ انکا کلام اُن کے ہمعصروں کے کلام سے زیادہ مقبولِ خاص و عام ہوا۔ اگر مولانا حالی کو کسی مصنف سے مشابہ کر سکتے ہیں تو وہ صرف علامہ شبلی ہیں جن کے طرز بیان پر ہر اہل دہلی نے رشک کیا ہے۔ لیکن یہ بھی مولانا حالی کے خوشہ چینوں میں نظر آتے ہیں کیونکہ انھوں نے حالی ہی سے سوانح نویسی اور ادبی تنقید سیکھی ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ عالیہ نے مولانا حالی کو شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا جو ان کی علمی لیاقت کے اعتبار سے ہر طرح زیبا و مناسب تھا۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں اس قومی اور نیچرل شاعری کا آفتاب ہمیشہ کے لیئے صفحۂ ہستی سے چھپ گیا اور اس تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لئے کوئی جانشین بھی نہ چھوڑا۔ یہ درحقیقت ایک ایسی عظیم مصیبت ہے کہ جسکا کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد بہت سے نوحے اور مرثیے لکھے گئے لیکن ڈاکٹر اقبال کے مرثیے کا ایک شعر یاد رہگیا۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہنورد

صدارتِ عظمیٰ

از

جنابِ صدق صاحب جائسی

جس دن سے خالی تھی صدارتِ عظمیٰ بہ اتفاق
اہلِ دکن کے دل تھے عجب اضطراب میں

کس کس طرح سے وہم جماتا تھا اپنا رنگ
کیا کیا خیال ہوش اڑاتا تھا خواب میں

ہم وزراء مومن و کافر بسانِ شمع
آتش بجاں تھے فکرِ عذاب و ثواب میں

پیچ ایسا آپڑا تھا کہ اربابِ حل و عقد
رہتے تھے جس سے آٹھ پہر پیچ و تاب میں

ق

رکھتی تھی اپنی دولتِ عظمیٰ ابھی ایک رائے
مسند نشینِ باب حکومت کے باب میں

یہ بات تھی کہ طے نہیں پائی تھی کوئی بات
تاخیر ہو رہی تھی سوال و جواب میں

خود بادشاہ کھوج میں مدت سے تھے مگر
جچتا نہ تھا کوئی نگہِ انتخاب میں

کیا ہو رہا ہے اس کی کسی کو خبر نہ تھی
مطلوب خود نما تھا ابھی تک حجاب میں

خالی نہ تھا یہ پردۂ حائل بھی لطف سے
ہوتا ہے حُسن اور بھی دل کش نقاب میں

چھائی ہوئی گھٹا تو غم انگیز تھی مگر
دل بولتا تھا چاند بھی ہے اس سحاب میں

ناگاہ آئی مژدۂ تازہ لیے ہوئے
بادِ سحر بسی ہوئی بوئے گلاب میں

شکرِ خدا کہ گلشنِ عالم کے دن پھرے
آئی بہارِ باغ جہانِ خراب میں

ماہر تھا اپنے علم کا رمّال کا کلام
نکلا نہ فرق رمل کے سچے حساب میں

اس کاردان کے ہاتھ میں آئی زمامِ ملک
جس نے دلوں پہ کی ہے حکومت شباب میں

جس ماہ آسمانِ وزارت کے دور میں — ظلمت کا منھ کسی نے نہ دیکھا تھا خواب میں
چودہ برس کے بعد وہی چودھویں کا چاند — پرتو فگن ہے پھر شرفِ آفتاب میں

سن کر کہ حکمراں ہوئے ہم پر جناب شادؔ — دوڑی خوشی کی لہر دلِ شیخ و شاب میں
کافر بتوں کے سامنے سجدے میں گر پڑے — زاہد نے شکر بھیجا خدا کی جناب میں

ق

ذوقِ نگاہ شاہ کے قربان جائیے — ثانی کہاں ہے اُنکا سیاست کے باب میں
چھانٹا وہ دل کہ جسکی ازل میں نمود تھی — اِتنا تو حسن ہو نظرِ انتخاب میں

ق

خالی ہے زر سے ہاتھ تو آیا ہوں شرمسار — دستِ یمین شاہِ دکن کی جناب میں
ایما ہے دل کا مجھ سے کہ گوہر نثار کر — موتی ہیں کچھ ابھی مری چشمِ پُر آب میں

ق

سَو بار امتحانِ ہنر میں رہا شریک — پیروں سے میری آنکھ نہ جھپکی شباب میں
لیکن جنابِ زر کہ ہیں حاجت روائے خلق — مجھ کو نہیں ہے بار جو اُنکی جناب میں
بے قدر بزمِ اہلِ ہنر میں ہوں اس طرح — کانٹا ہو جیسے پہلوئے برگِ گلاب میں

ہر بات بامزہ ہو تو اے صدقؔ بات ہو — رنگیں دعا بھی چاہیے اُسکی جناب میں
ای رنگ و بوے گلشنِ امکاں کے بادشاہ — جبتک ہے بُو گلاب میں سُرخی شہاب میں
ای نور و نارِ عرصۂ ہستی کے تاجدار — جبتک ضیا ہے ماہ میں نور آفتاب میں

دولت جناب شادؔ کے قدموں سے منھ ملے
نصرت رہے جلو میں سعادت رکاب میں

بہو بیگم

از

(از جناب مولانا محمد علم الدین صاحب سالک بی-اے - پروفیسر السنہ شرقیہ دیو سماج کالج لاہور) و مدیر اعزازی رسالہ قوس قزح لاہور

شاہان اودھ کی تاریخ جن ممتاز ہستیوں پر ناز کر سکتی ہے ان میں سے ایک بہو بیگم بھی ہے۔ تاریخ اودھ میں اسے وہی امتیازی درجہ حاصل ہے جو شاہان تیموریہ کی تاریخ میں نور جہاں یا ممتاز محل کو دیا جاتا ہے۔ بہو بیگم اگر ایک طرف ان تمام محاسن اور خوبیوں کی حامل تھی جو ایک مسلمان عورت کے لیے لازمی ہیں تو دوسری طرف وہ ایک زبردست دماغ کی مالک تھی۔ جو ملکی سیاست پر پورے طور سے حاوی تھا۔ بیگم کی شان و شوکت فیض آباد میں بطور ضرب المثل ہے۔ اسکا وقار اور دبدبہ۔ رعب اور جلال بڑے بڑے سرکشوں کے دل ہلا دیتا تھا۔ قدرت نے اسے حکومت ہی کیلئے پیدا کیا تھا۔ اور تا دم زیست وہ حکومت ہی کرتی رہی۔ حادثات دوران اور گردش زمان نے زمام حکومت اس کے ہاتھ سے کھینچنی چاہی مگر اس سے پیشتر کہ وہ اپنے ارادہ میں فائز المرام ہوئے اُسنے اپنا چہرہ کتم عدم میں چھپا لیا۔

بہو بیگم کا اصلی نام اُمتہ الزہرا تھا۔ وہ نواب مؤتمن الدولہ محمد عاشق خاں* کی دختر تھی۔ نواب موصوف اُمرائے محمد شاہی میں ایک خاص درجہ رکھتا تھا۔

نوٹ* عاشق خاں نام نہ تھا۔ اسحٰق خاں تھا۔ جعفری

ابتدائے حال میں وہ محمد شاہ کا ایک ادنیٰ درباری تھا۔ مگر دیانت۔ جاں نثاری اور کیاست کی بدولت وہ تھوڑے ہی عرصہ میں دیوان خالصہ کے بلند مرتبت عہدہ پر ممتاز ہو گیا۔ دیوان خالصہ کا عہدہ وزارت کے دوسرے درجہ پر ہوتا تھا اثنائے ملازمت میں نواب موصوف کی دوستی ابو المنصور صفدر جنگ نواب وزیر سے ہو گئی۔ جو بڑھتے بڑھتے قرابت داری تک جا پہونچی۔ رشتہ اتحاد کو زیادہ استوار کرنے کے لئے بہو بیگم کی منگنی صفدر جنگ کے بڑے بیٹے شجاع الدولہ کے ساتھ کر دی گئی۔

تاریخ محمد شاہی میں مذکور ہے کہ محمد شاہ لبسا اوقات بہو بیگم کو اپنی گود میں کھلایا کرتا تھا۔ اسکی تعلیم اور تربیت تمامتر محمد شاہ کے زیر سایہ اتمام پذیر ہوئی ابھی بیگم کی شادی نہیں ہونے پائی تھی کہ اسکا باپ فوت ہو گیا۔

بیگم کے بڑے بھائی نجم الدولہ نے اسے اپنی بیٹی کی طرح پالا۔ ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء میں اسکی شادی نہایت تزک و احتشام سے ہوئی۔ بزم شادی کے اہتمام میں شہنشاہ محمد شاہ نے بہ نفس نفیس حصہ لیا۔ اور گراں بہا جہیز دیا۔ چنانچہ تاریخ فرح بخش میں مذکور ہے کہ جہیز میں اسے ایک ہزار چاندی کے پیالے عطا ہوئے جن میں سے ہر ایک کا وزن سو روپیہ تھا۔ علاوہ ازیں اسے ایک ایسی جاگیر عطا ہوئی جسکی سالانہ آمدنی نو لاکھ روپیہ تھی۔ اس شادی پر کم از کم دو کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔

شادی کے بعد بیگم کے لیے ایک وسیع الشان محل فیض آباد میں تعمیر ہوا جہاں بیگم تا دم زیست مقیم رہی۔ شجاع الدولہ بہو بیگم کا نہایت ادب کرتا تھا۔ اگرچہ نواب مذکور کی اور بھی بہت سی بیبیاں اور بچے تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ بہو بیگم کے سامنے ان کا یا نواب کے دوسرے بیٹوں کا (سوائے آصف الدولہ کے

جو بہو بیگم کے بطن سے تھا انام بھی ہے۔

نواب نے سلطنت کی مُہر بہو بیگم کے سپرد کر رکھی تھی اور اس خدمت کے معاوضہ میں اُسے گونڈہ کے ضلع میں ایک بیش بہا جاگیر عطا ہوئی۔

۱۷۵۴ء میں جب نواب شجاع الدولہ سریر آرائے اودھ ہوئے تو بہو بیگم کا اثر اور رسوخ اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اسکے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کو سلطنت میں معقول عہدے اور جاگیریں عطا ہوئیں۔

بہو بیگم نواب شجاع الدولہ کو دل و جان سے چاہتی تھی اور ہر ممکن ذریعہ سے

نوٹ ۲ - بہو بیگم نہایت وفادار اور نیک خصلت ملکہ تھیں۔ اس موقع پر نواب نے اپنے رفقا ر- احباب اور ملازمین تک سے مالی امداد اور اعانت کی خواہش کی۔ مگر کسی نے حوصلہ مندی کا ثبوت نہ دیا۔ بہو بیگم نے اپنا تمام زیور اور ناک لونگ تک فروخت کرکے نواب کو روپیہ دیا تھا تاکہ وہ چالیس لاکھ روپیہ کی رقم کو پورا کرکے انگریزوں کو بطور تاوان ادا کرسکیں۔ سیر متاخرین میں ہے کہ بیگم کے صلاح کاروں نے انکو بہت روکا مگر وہ نہ مانیں اور اپنی تمام چیزیں فروخت کرڈالیں اور جواب میں جو الفاظ اُنھوں نے کہے تھے وہ ابتک یادگار ہیں :- "اگر نواب زندہ سلامت رہے تو مال دولت اُنھیں کے واسطے ہے اور اگر خدانخواستہ وہ زندہ سلامت نہ رہے تو یہ چیزیں میرے کس کام کی؟" بیگم کے اس جواب نے اُس زمانے کے انگریزوں کو متحیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ کپتان جے۔ بیلی صاحب ریزیڈنٹ لکھنؤ نے اس واقعہ کی اطلاع بورڈ میں کی تھی اور بیگم کی محبت اور وفاداری کی بہت تعریف لکھی تھی کہ بیگم نے نواب کو بچا لیا۔ ورنہ چالیس لاکھ کا انتظام کرنا اُن کے قابو سے باہر تھا۔

نواب دونوں وقت بیگم کے پاس خاصہ کھاتے تھے۔ اور پوشیدہ طور پر دوسرے محلوں میں جاتے تھے۔ اِس لیئے وہ محل، چور محل کہے جاتے تھے۔

نواب کہ یہ حالت تھی کہ جو روپیہ، تحائف، جواہرات، زیورات، غرضکہ جو کچھ اُن کے

اس امر کی کوشش کرتی تھی کہ نواب اس سے خوش رہے چنانچہ ۱۷۶۴ء میں جب نواب شجاع الدولہ بکسر کے میدان سے شکست فاش کھا کر فیض آباد پہونچا تو بیگم نے نقصانات جنگ کی تلافی کرنے اور ریاست کے محاصل کو درست بنانے کیلئے اپنے بہت سے قیمتی جواہرات فروخت کرکے نواب کی مدد کی۔ اس کے علاوہ اُسنے اپنے روزینے اور وظیفے میں بھی تخفیف کردی۔ بیگم کا یہ ایثار نواب کے دل کو کچھ ایسا بھایا کہ وہ بیگم کا بندۂ بیدام بنگیا۔ اور جب تک زندہ رہا اُس کا نہایت احترام کرتا رہا۔

تاریخ فرح بخش میں مذکور ہے کہ جب بیگم کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا تو دس ہزار پیادہ و سوار اور ہزاروں ہاتھی و گھوڑے اس کے محل کے سامنے جھوما کرتے تھے

(نوٹ ۲ بقیہ صفحہ گذشتہ) ہاتھ میں آتا تھا بیگم کو دیتے تھے۔ تمام عمر اُنکا یہی طرز عمل رہا۔ بیگم کو بعض مورخ جز رس بتاتے ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ نہایت دیندار بی بی تھیں فضول خرچ نہ تھیں لیکن اپنی حیثیت کے مطابق دل کھول کر خیرات کرتی تھیں اور غربا کے ساتھ بہت سلوک ہوتی تھیں اُنکے زمانہ میں فیض آباد میں بڑی رونق تھی۔ اُنکی مجالس عہد محرم دور دور مشہور تھے علما اور فضلا کی اعانت میں اُنھوں نے ہمیشہ فیاضی برتی۔ نواب آصف الدولہ کی بھی دل کھول کر امداد کی۔ مگر وہ سخت مسرف اور ناعاقبت اندیش ثابت ہوئے۔ بالخصوص اُن کا ابتدائی عہد حکومت تو بوالہوسی اور فضول خرچی کے لیئے اب تک مشہور ہے۔

بہو بیگم میں تمکنت اور خودداری بہت تھی۔ اور ایام بیوگی کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خودداری اور اپنی آزادی کو قائم رکھنے میں اُن کو سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ آگرہ کے کلکٹر مسٹر آر۔ ایچ۔ آر نیول نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بہو بیگم کے عہد میں دو روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ جعفری۔

ایک لاکھ سے زیادہ ملازم اور متوسلین اسکے طفیل سے پرورش پاتے تھے۔ اور وہ سب ایسے خوش اور آسودہ تھے کہ گویا اپنی والدہ کے زیر سایہ پل رہے تھے۔
۱۷۷۵ء میں بہو بیگم کا سہاگ رنڈاپے سے بدل گیا۔ اب اسکا حقیقی بیٹا آصف الدولہ سریر آرائے اودھ ہوا۔ آصف الدولہ کی مسند نشینی سے بہو بیگم کی کتابِ حیات کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔
آصف الدولہ نے تخت نشین ہوتے ہی پر پرزے جھاڑنے شروع کیے۔ اس نے اپنی بخشش بیجا اور فضول خرچی سے ریاست کا خزانۂ عامرہ تھوڑے ہی دنوں میں خالی کر دیا۔ اس کے بعد وہ بہو بیگم سے طالب امداد ہوا۔ اوّل اوّل تو بیگم نے اسکی دل کھول کر مدد کی مگر جب اسے یقین ہوگیا کہ آصف الدولہ کا اصراف لوما فیوما بڑھتا ہی جاتا ہے تو اس نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماں بیٹے میں رنجش کی خلیج عمیق سے عمیق تر ہو گئی۔ آخر کار آصف الدولہ فیض آباد کو خیرباد کہکر لکھنؤ اُٹھ آیا۔ اور اس نے وارن ہیسٹنگز سے مدد کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ اس سازباز کا نتیجہ ۱۷۸۱ء میں معاہدہ چنار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس معاہدہ کی بدولت نواب نے پچپن لاکھ روپیہ تو اسی وقت خزانہ کلکتہ میں داخل کیا اور باقیماندہ بیس لاکھ بہت جلد ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ نواب چھ دن بعد وارن ہیسٹنگز سے بیگمات یعنی بہو بیگم اور نواب بیگم کی جاگیروں کی ضبطی کا حکم لیکر پہونچا۔ انگلستان کے آتش بیاں مقرر برک اور مشہور مؤرخ لارڈ میکالے کا بیان ہے کہ نواب وزیر اودھ اور گورنر جنرل نے ان دو بیکس عورتوں کو لوٹنے کے لیے اپنی سازش کا جال بچھایا۔ ہیسٹنگز کے خیال میں "بیگمات نے ۱۷۷۵ء میں اپنی اولاد کا حق غصب کر لیا تھا اور اب وہ وقت آپہونچا تھا کہ حقدار کو حق دلایا جائے"۔ انگریز مورخین کا بیان ہے

کہ "وارن ہیسٹنگز نے نواب سے اس امر کی قسم لی کہ وہ اپنے لواحقین کو معقول وظیفہ عطا کریگا اس امر کی اجازت دی تھی" مگر یہ ایک عذر لنگ ہے جو ہیسٹنگز اور آصف الدولہ کی ظالمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لیئے پیش کیا جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ چونکہ ہیسٹنگز کو اس وقت روپے کی اشد ضرورت تھی اسلیے نواب وزیر اودھ کو اپنا آلہ کار بنا یا۔

بہرنوع نواب آصف الدولہ لکھنؤ پہونچا۔ مگر جب اس نے حقیقت حال پر غور وخوض حاصل کیا ہے تو بیگمات کے مقابلہ میں اسے صریحاً شکست نظر آئی اسکی جراءت اور دلیری نے جواب دیدیا۔ اور حوصلہ پست ہو گیا۔ بڑھی ہوئی امیدوں کا خون ہوگیا۔ اور وہ اپنا سا منھ لیکر بیٹھ رہا۔ اب اس نے ہیسٹنگز کے مطالبات کو طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے ٹالنا چاہا مگر بیسود۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہیسٹنگز نے نواب کی وعدہ خلافیوں سے تنگ آکر اسے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ موعودہ رقم فی الفور داخل خزانہ نہیں کرے گا تو تمام انگریزی فوج اور ریزیڈنٹ لکھنؤ سے واپس بلا لیئے جائیں گے۔ چنانچہ مڈلٹن کے نام اس قسم کا ایک حکم موصول بھی ہوا۔ اس تمام کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کو طوعاً وکرہاً بیگمات کی جائداد کی ضبطی کیطرف اپنا قدم بڑھانا پڑا۔ سنہ ۱۷۸۲ء انگریزی سپاہ فیض آباد کے محلات کی طرف بڑھی۔ خواجہ سراؤں نے حق نمک ادا کرتے ہوئے اپنی جانیں بیگمات پر تصدق کیں مگر یہ مٹھی بھر آدمی ایک آزمودہ کار سپاہ اور متواعدواں فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ آخر کار سب تن بہ تقدیر بیٹھ رہے۔ انگریزی سپاہ نے دل کھول کر بیگمات کا خزانہ لوٹا۔ مگر مشرق اور مغرب کے مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انھوں نے بیگمات کے ساتھ کسی قسم کا تشدد آمیز سلوک نہیں کیا

آصف الدولہ کے بعد اس کا متبنیٰ وزیر علی مسند آرا ہوا۔ مگر وہ چند ماہ کی

حکومت کے بعد فوت ہو گیا۔ اسکے بعد بہو بیگم کا سوتیلا بیٹا سعادت علی گدی نشین ہوا۔ سعادت علی نے جس وقت بہو بیگم کے خزانوں پر دست تظلّم دراز کیا تو بیگم نے اپنی بہتری کے لیئے سرکار کمپنی سے ساز باز شروع کی۔ بیگم اپنی خودداری کا نتیجہ پیشتر ازیں بھگت چکی تھی اس لیے اپنے بچاؤ کے لیئے اور اپنے سرکش اور متمرد بیٹے کو نیچا دکھانے کے لیئے اس کارروائی کا آغاز کیا جسکو وہ دل سے ناپسند کرتی تھی۔ سعادت علی کو جس وقت بیگم کی اس کارروائی کا پتہ چلا تو وہ بہت سٹ پٹایا اور بہو بیگم سے اپنے گذشتہ گناہوں کے لیئے طالب عفو ہوا۔ اُسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۹۸ء میں نواب سعادت علی اور بہو بیگم نے سرکار کمپنی کی معرفت ایک عہد نامہ لکھا جس میں نواب سعادت علی نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ بیگم کی ہر طرح سے عزت اور حرمت کریگا اور وہ اس امر کی بھی سعی بلیغ کرے گا کہ بیگم کو ہر طرح کا آرام نصیب ہو۔ اُسنے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ محال اودھ اور فیض آباد کے مضافات کی تمام جاگیرات بیگم کے حق میں بحال کردے گا مگر نواب کی یہ تمام کارروائی منافقانہ تھی۔ بیگم اس بات سے واقف تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ نواب سعادت علی کی یہ کارروائی فقط اسکے جواہرات اور دولت کو لوٹنے کے لیئے ہے۔

اس عہد نامہ کے تھوڑے عرصہ بعد سعادت علی نے اپنے آپ کو پھر اپنی اصلی رنگت میں پیش کرنا شروع کیا چنانچہ سب سے اوّل اُسنے بہو بیگم کے برادرزادے کی جائداد ضبط کی۔ بعد ازاں بیگم کا روزینہ چار سو سے دو سو کر دیا۔ بہو بیگم اس کارروائی سے بھڑک اُٹھی۔ اور اُس نے نہایت طیش میں آکر ۱۷۹۹ء میں ایک نہایت زبردست مراسلہ لارڈ ولزلی کے نام لکھا۔ اس مراسلہ میں بہو بیگم نے لارڈ ولزلی سے استدعا کی کہ وہ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ یعنی مسٹر ملسڈن کو حکم دے

کہ وہ اس کے تمام متعلقین کو اور قرابت داروں کو واضح کردے کہ وہ اسکی جائداد اور معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔

اس کے بعد بہو بیگم نے مسٹر لمسڈن کو فیض آباد میں طلب کیا۔[۳] اور اُسے بتایا کہ وہ اپنی تمام جائداد سرکار انگلشیہ کو دیدینا چاہتی ہے۔ اس نے پالکی میں بیٹھکر ریزیڈنٹ سے رودررو باتیں کیں۔ اُسوقت بیگم کے ہمراہ فقط اُسکا وزیر جواہر علیخاں تھا۔ نواب سعادت علی کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی تو وہ جل بُھنکر کباب ہوگیا۔ اور اُس نے بیگم کو نہایت پُر جوش خط لکھا جس میں اُسپر یہ الزام لگایا کہ اُس نے تمام خاندان کی ہیٹی کردی ہے۔ بہو بیگم نے جواباً تحریر کیا کہ "یہ تمام معاملات تمھاری بدولت رونپذیر ہو رہے ہیں اگر تم راست روی سے کام لیتے تو معاملات اس حد تک نہ پہونچتے۔ اور تمھیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام میری ذاتی جائداد ہے جس سے ریاست یا والی ریاست کو کوئی تعلق نہیں" اس خط وکتابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہو بیگم اور نواب سعادت علی کے تعلقات بالکل منقطع ہوگئے۔

نوٹ ۳ امر واقعہ یہ ہے کہ بہو بیگم کی دولت اور جاگیر کو سعادت علیخاں کو ضبط کرنے کی فکر تھی۔ بیگم کو یہ بات قطعی طور پر ناگوار تھی۔ اور اُس حالت میں اُن کو سوائے انگریزوں کی امداد حاصل کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ وہ بیگم کو بلا معاوضہ امداد دینے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ لہذا سعادت علی خاں سے پناہ حاصل کرنے کیلئے بیگم کو وعدہ کرنا پڑا کہ وہ اپنی کُل جائداد انگریزوں کو دے ڈالیں گی۔ بیگم نے اس شرط کو سخت رد و قدح اور مجبوری کے ساتھ منظور کیا۔ ورنہ ان کی نیت ہرگز نہ تھی کہ اپنی جائداد اور دولت کو اپنے رشتہ داروں اور وفادار ملازموں کے ہوتے ہوئے انگریزوں کو سونپ دیتیں۔ جعفری

مسٹر لمسڈن نے لکھنؤ پہونچکر تمام صورت حال گورنر جنرل کی خدمت میں عرض کی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا کہ بہو بیگم کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی تمام جائداد اور املاک سرکار کمپنی کو بخش دے۔ مارکوئس ولزلی نے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے پاس تمام معاملات کی اطلاع بھیجکر منظوری طلب کی۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے جواب موصول ہوا۔ کہ بہو بیگم نے جو خواہش ظاہر کی ہے وہ پوری ہو سکتی ہے بشرطیکہ بیگم موصوف اس قسم کی ایک وصیت لکھکر سرکار کمپنی کے پاس بھیجدے۔ اپریل ۱۸۱۱ء میں بیگم کے پاس یہ اطلاع ریزیڈنٹ کی معرفت بھیجی گئی۔ بیگم نے تمام نشیب و فراز اور اپنی تمام مجبوریوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ وہ لارڈ ولزلی کی پیش کردہ شرائط پر عمل پیرا ہو۔ چنانچہ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ میں کپتان بیلی کو فیض آباد طلب کیا اور اس کے سامنے وصیت مرتب کی۔ مگر جلدی میں بیگم کی املاک اور جائداد کی فہرست شامل ہونے سے رہگئی۔ اس لیے یہ وصیت ۱۸۱۳ء میں دوبارہ بیگم کے پاس واپس ہوئی۔ بیگم نے فہرست مطلوبہ شامل کرکے اس کو

نوٹ:۔ "دلی خواہش" بھی ایک ہی فقرہ ہوا ہے! جو اُس زمانہ کے انگریز حکام کی مدبرانہ ذہانت اور رقابلیت کا بہت اچھا ثبوت ہے! اُس وقت بھی کمزوروں کی اعانت کو انگریزوں کی سیاست میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ یعنی ایک لالچی والیِ ملک کے مقابلہ میں کمزور مخلوق جو بیوہ بھی مستوجب امداد تھی بشرطیکہ وہ اپنا خزانہ۔ اپنے جواہرات۔ اپنی جاگیر کو حمایت کردگان کے حق میں وصیت کردے قابل توجہ تو یہ امر ہے کہ وصیت ہی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ بیگم کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے خزانہ اور اپنی دولت و جاگیر کی ایک فہرست بناکر بھی وصیت کے ساتھ منسلک کردیں۔ چنانچہ اُن کو اس شرط کی پابندی کرنی پڑی۔

مکمل کیا۔ وصیت پر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہو بیگم نے تین لاکھ روپیہ اپنے مقبرہ کی تعمیر کے لیئے داراب علی خاں خواجہ سرا کی تحویل میں جمع کرایا۔ نیز اسنے دس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر اپنے مقبرہ کے خرچ کے لیئے وقف کی۔ اُس نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ اسکی جائداد سے ایک لاکھ روپیہ کربلاے معلّےٰ نجف اشرف اور دیگر مقامات مقدسہ کے اخراجات کے لیئے بطور خیرات بھیجدیا جائے۔ بیگم نے اپنے دیرینہ نمک خوار اور جاں نثار داراب علی خاں کو بھی کچھ وظیفہ تاحین حیات عطا کیا۔ میرزا حامد علی (جو اسکی دختر خوانده لطف النسا بیگم کا شوہر تھا) کو بھی کچھ نقد اور جاگیر عطا کی۔ میرزا اصغر علی اور میرزا اکبر علی (جو نواب صفدر جنگ مرحوم کے بیٹے تھے) کے لیئے بھی معقول وظیفوں کا بندوبست کیا۔ بیگم نے اپنی وصیت میں یہ بات صاف طور پر واضح کر دی تھی کہ متذکرہ صدر تمام اخراجات وضع کرنے کے بعد جو جائداد اور نقدی بچ رہے اُسکی واحد مالک سرکار کمپنی ہوگی۔

۲۷ فروری ۱۸۱۶ء کو یہ مکمل وصیت لارڈ منٹو گورنر جنرل ہند کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جس پر کپتان بیلی کے نام حکم نافذ ہوا کہ وہ بہو بیگم سے ملکر جواہرات اور زر نقد کی فہرست بھی حاصل کرے اور نیز اُسے یہ بھی حکم ہوا کہ وہ بیگم پر یہ بات واضح کر دے کہ **نقدی جواہرات اور زیورات کو محفوظ رکھنے کے لیے سب سے اعلیٰ مقام سرکار کمپنی کا خزانہ ہے۔ جو کلکتہ میں واقع ہے[۵]**

۱۸۔ جولائی کو کپتان موصوف متذکرہ صدر ہدایات لیکر بہو بیگم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیگم نے پس پردہ اس سے باتیں کیں اور دوران گفتگو میں کپتان بیلی کو بتایا کہ وہ تاحین حیات اپنی نقدی۔ زیورات اور جواہرات کی فہرست نہ تو گورنر جنرل

نوٹ [۵] بے شک!

کے پاس بھیج سکتی ہے اور نہ انھیں اپنے پاس سے علیحدہ کرسکتی ہے مگر جب بیگم پر ہر طرف سے دباؤ ڈالا گیا اور اُسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تو اُس نے طوعاً و کرہاً ۲۶ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۸۱۲ء کو اپنی تمام املاک - جواہرات - زیورات اور زرنقد کی ایک نہایت مفصل فہرست کپتان بیلی کے سپرد کی اس فہرست کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بہو بیگم کے موتی محل میں ستر لاکھ روپیہ نقد موجود تھا - علاوہ ازیں اسکے خزانہ میں کئی صندوق روپیوں سے بھرے ہوئے موجود تھے - جو پرانی کوتوالی کے نیچے مدفون تھے - اس کے ذاتی جواہرات اور زیورات اس کے توشہ خانہ میں جمع تھے -

۱۸۱۶ء میں بیگم کا مزاج جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا اور وہ تھوڑا عرصہ بیمار رہکر اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرگئی - اسکی تاریخ وفات ۲۶ محرم ۱۲۳۱ھ ہے - اسوقت اس کی عمر ۸۶ برس کی تھی - اسکا مقبرہ داراب علی کے اہتمام میں جواہر باغ میں تیار ہوا - جو فیض آباد سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے -

بیگم کے اخلاق و عادات پر بحث کرتے ہوئے اکثر مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ ممسک تھی - مگر اسکی وصیت اور اسکے دوسرے کارنامے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ایک اتہام ہے جو اس عفیفہ پر توڑا جاتا ہے - وہ فیاض طبیعت رکھتی تھی مگر اسکی فیاضی اصراف نہ تھی - یہ اُسی بخشش اور قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ اُس وقت کی وحید العصر ہستیاں اس کے دربار سے وابستہ تھیں - یہاں تک کہ اودھ کے نوابوں کی بخشش بھی انھیں اپنے دربار میں نہ کھینچ سکی - ان ممتاز و مقتدر ہستیوں میں

نوٹ ۶ جملہ مصائب کا لازمی نتیجہ یہی تھا !

لچھمی نرائن لاہوری ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے وہ نہ صرف فارسی کا زبردست شاعر تھا بلکہ عربی کا بھی جید عالم تھا۔ مولوی محمد منیر جو اپنے وقت کے علما کا گل سرسبد تھے۔ بیگم کا وظیفہ خوار تھے۔ مولوی محمد منیر کی قوت حافظہ اسقدر زبردست تھی کہ وہ اکثر اوقات مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو زبانی حل کردیتے تھے۔ سینکڑوں کتابیں اُن کو ازبریاد تھیں۔ محمد فیض بخش بھی بیگم کا نمکخوار تھا اسکی مشہور تصنیف تاریخ "فرح بخش" ہے جس میں اس نے بیگم کے حالات نہایت شرح وبسط سے بیان کیئے ہیں۔ محمد خلیل اسکا درباری خوش نویس تھا جو تحریر کی اٹھارہ طرزوں کا استاد تھا اور قدیم مکتوبات کی نقل اس طرح اُتارتا تھا کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہیں رہتا تھا۔

میرزا محمد علی مُہر کن بھی اس کے دربار سے وابستہ تھا وہ اپنے فن میں عدیل اور بے نظیر تھا۔

بہو بیگم ایک طرف تو فضلا پروری کرتی تھی۔ دوسری طرف وہ یتیم اور بیکس لڑکیوں کی ملجا و ماوا تھی۔ ہزاروں بیکس عورتیں اس کے خوانِ کرم پر پرورش پاتی تھیں۔ اس نے انکی تعلیم و تربیت کے لیئے مکتب اور مدارس جاری کر رکھے تھے۔

بہو بیگم کی زندگی اُن ہستیوں کے لیئے تازیانۂ عبرت ثابت ہوسکتی ہے جو استطاعت اور طاقت کے ہوتے ہوئے اپنے فرائض منصبی کو فراموش کرچکی ہیں۔

آفتاب کا راز

از
حسن عابد جعفری صاحب آکسن - بیرسٹر ایٹ لا - ایڈیٹر شمع

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں - میرا قلم حرکت میں ہے! تھوڑی دیر میں مضمون ختم ہو جائے گا - اور قلم کی حرکت بھی رُک جائے گی - لیکن جس دن سے زمین عالم وجود میں آئی ہے متحرک ہے! اور تینتالیس ہزار دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے - مصور تصویریں کھینچ رہے ہیں - گھڑی ساز گھڑیاں بنا رہے ہیں - جوہری نازک زیورات کی پھول پتیوں میں جواہرات جڑ رہے ہیں - غرض کہ دنیا میں نازک سے نازک کام ہو رہے ہیں - مگر کیا مجال کسی کے ہاتھ میں جنبش آ جائے - یا کسی کو زمین کی حرکت کا احساس ہو جائے - لیکن فلکیات کے ماہر جانتے ہیں کہ زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے گھوم کر نہ صرف دن اور رات کے وجود کا باعث ہے بلکہ نہایت تیزی کے ساتھ اپنے ستاروں کی کشش سے کھنچتی ہوئی اُتر کی طرف جا رہی ہے - گھڑی کی ایک ٹک کی آواز کے ساتھ بارہ میل کا سفر کر لیتی ہے اور جب سے آپ نے یہ مضمون پڑھنا شروع کیا ہے - سیکڑوں میل کی مسافت طے کر چکی ہے -

اسوقت دنیا میں آفتاب کے متعلق بہترین معلومات ڈاکٹر ایبٹ کی ہیں جو بیس برس سے دنیا کو ترک کر کے آفتاب کی نباضی - مزاج شناسی اور اُسکے عادات و اطوار کے مطالعہ میں مصروف ہیں - اور ابتک کئی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کر چکے ہیں - اُن کا بیان ہے کہ خدا معلوم زمین کا منتہائے سفر کیا ہے مگر اسی کی برکت سے زمین پر روشنی اور گرمی ہے بادل بنتے ہیں ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں مینھ برستا ہے

اور دیگر ارضی قوتیں پیدا ہوتی ہیں ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست کو آفتاب کی حرارت میں شک تھا ان کا بیان تھا کہ زمین پر رہکر گرمی معلوم ہوتی ہے لیکن پہاڑ پر چڑھنے کے بعد خنکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر واقعی آفتاب میں گرمی ہوتی تو بلندی پر پہونچکر ضرور گرمی معلوم ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کرکے اپنے عزیز کی تشفی کردی لیکن واقعہ بجائے خود اس قدر دلچسپ ہے کہ قارئین کرام کی خاطر ہم بھی اسکو بیان کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا :۔ کہ پہاڑ کی چوٹی پر پوری گرمیاں گذارنے کا مجھے پارسال اتفاق ہوا۔ اور تین مہینہ تک ہمارا کھانا پکانا آفتاب کے سپرد رہا۔ یعنی بانوے ملیوں میل سے زاید فاصلہ سے آفتاب ہماری خدمت کرتا تھا۔ گوشت، ترکاری روٹی، چاول، غرض ہمارا پورا کھانا آفتاب کے ذریعہ سے پکتا تھا۔ اور اس تین ماہ کے عرصہ میں ہم نے آگ کی صورت تک نہ دیکھی۔ ترکیب معمولی تھی۔ مگر ابتدا میں متعدد تجربے کرنے پڑے۔ اور بالآخر آئینہ کی مدد سے آفتاب کی شعاعوں کو محصور کرنیکی تدبیر نکل آئی۔ آئینہ میں شعاعوں کا عکس پڑکر پانی کو گرم کرلیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اور اختراعات کی گئیں۔ اور تھوڑے عرصہ میں یہی شعاعیں کمر بستہ ہوکر حق خدمت گزاری ادا کرنے لگیں۔ چولھے میں شعاعوں کی حرارت ۱۷۰ ڈگری تک ہوجاتی تھی۔ اور یہ حرارت کئی دن تک قائم رہتی تھی۔ آفتاب کی حرارت سے اگر دنیا میں کام لیا جائے تو بہت کفایت ہوجائے۔ کیونکہ جو حرارت زمین تک آتی ہے اسکی مقدار حیرت انگیز ہے! ایک مربع گز زمین پر ایک طاقتور گھوڑے سے زیادہ طاقت کی دھوپ آتی ہے اور بآسانی انسان کی بنائی ہوئی کلوں اور انجنوں کو چلا سکتی ہے۔ برسات یا ابر میں تمازت آفتاب بہت کم ہوجاتی ہے لیکن اگر زمین پر اس حرارت کو مقید کرنے کا بندوبست ہوجائے تو یہی دھوپ

شعاعیں۔ برسات میں بھی کام آسکتی ہیں۔

ہوا حرارت کی دشمن ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر وادی سے زیادہ دھوپ آتی ہے اور اگر ہوا کو روک کر آفتاب کی ترچھی شعاعوں کو سیاہ سطح پر ڈالا جائے تو کوہ ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر اس قدر حرارت پیدا ہو جائے کہ دنیا کا کوئی بھاڑ یا چولھا اُسکا مقابلہ نہ کر سکے۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر زیادہ حرارت پہونچنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ہوا پتلی اور ہلکی ہوتی ہے اور دیر تک حرارت کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ بلندی کی فضا میں جو ٹھنڈی ہوا ہے وہ اپنا بوجھ ڈال کر گرمی کو ہوا سے جدا کر دیتی ہے۔ سطح زمین پر گرمی کا سبب وہ فضا ہے جو کئی میل موٹے لحاف کی طرح زمین سے لپٹی ہوئی ہے۔ سمندر کی سطح پر اسکی دبازت انتہائی ہوتی ہے لیکن جوں جوں بلند ہوتی ہے ہلکی ہوتی جاتی ہے امتحان کرنے سے معلوم ہوا کہ نصف حرارت کو یہ لحاف جذب کر لیتا ہے۔ مگر یہ لحاف ہمارے لیئے عطیۂ رحمت ہے۔ ورنہ ہم دن میں کباب سیخ کی طرح بھنتے۔ اور رات کو برف کی طرح منجمد ہو جایا کرتے چنانچہ ہمارے خیال کی تائید چاند سے ہوتی ہے۔

چاند فضا سے خالی ہے نہ وہاں ہوا ہے۔ نہ نمی ہے۔ اور نہ بادل ہیں چاروں طرف خلا ہے۔ ایک جدید اور نہایت نازک آلہ بولومیٹر کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی سطح میں جبپر سورج کی روشنی پھیلی ہوتی ہے۔ کھولتے ہوئے پانی کی حرارت ہوتی ہے۔ لیکن چاند گرہن کے موقع پر اس آلہ کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج کی شعاعوں کی صرف چند منٹوں کی علیحدگی سے چاند کی سطح نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر جاتی ہے۔ وہاں کے دن نہایت گرم تنور ہوتے ہیں۔ راتیں نہایت ٹھنڈی اور برف صفت ہوتی ہیں۔

مریخ سیارہ کو لیجئے۔ سورج کے گرد یہ بھی چکر کھاتا ہے۔ مگر اسکی راہ ہماری

راہ سے جدا ہے، اور چونکہ زیادہ فصل پر واقعہ ہوا ہے۔ اس لیئے آفتاب کی حرارت سے کم اثر پذیر ہے۔ اسکی فضا میں عجیب و غریب خاصیت ہے جس قدر گرمی، دن میں جذب کرتا ہے۔ رات کو جدا ہو جاتی ہے اور مریخ کے چاروں طرف فضا میں منتشر ہو کر جذب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ موسم گرما میں مریخ کے تاریک مقامات پر صفر سے ۶۰، ۷ ڈگری نیچے حرارت تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر مریخ آباد مقام ہے۔ تو اہل مریخ کو سخت مصیبت اٹھانی پڑتی ہوگی۔

اگر فضا کا موٹا لحاف ہماری حفاظت کے لیئے نہوتا، تو ہماری بھی یہی کیفیت ہوتی۔ ہمارے کرہ شمالی میں جاڑوں میں زیادہ سردی پڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سورج کی شعاعوں میں کمی آجاتی ہے۔ جاڑوں میں زمیں سورج سے زیادہ قریب ہوتی ہے کیونکہ مدار ارضی فطرتاً اسی طرح کا ہے۔ تعجب ضرور ہوتا ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ہم بہ نسبت جون کے جنوری میں آفتاب سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ ہمارا موسم سرما اس لیئے ٹھنڈا نہیں ہے کہ آفتاب کی شعاعیں کم ہو جاتی ہیں بلکہ اسکے دو وجوہ ہیں:-

(۱) کروی زمین اپنے دائرے کے گرد لٹو کی طرح ایک طرف جھک کر جاڑوں میں چکر کھاتی ہے اور دائرہ کے شمالی حصہ پر آفتاب کی شعاعیں ترچھی ہو کر پڑتی ہیں چنانچہ شعاعوں کو جاذب فضا کے زیادہ موٹی تہ میں ہو کر گذرنا پڑتا ہے اور اس کے علاوہ اپنے ترچھے پن سے دور تک پھیل جاتی ہیں۔

(۲) دن چھوٹے ہوتے ہیں، رات کو کافی مہلت حرارت کو دور کرنے کی ملجاتی ہے موسم گرما میں آفتاب کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں، اس لیئے دن بڑے ہوتے ہیں، اور راتیں مختصر، لیکن جاڑے میں یہی نظام برعکس ہو جاتا ہے۔

منطقۂ حارہ میں سرما اور گرما دونوں موسموں میں گرمی ہوتی ہے، کیونکہ

وہاں دن اور رات برابر ہوتے اور سال کے بارہ مہینہ سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں جو لوگ ہو آئے ہیں وہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں گرمی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آفتاب کیا ہے ؟ ماہرین فلکیات اس کو ستارہ کہتے ہیں، مگر یہ جواب کافی نہیں ہے! ستارہ کیا ہے ؟

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس سوال کے جواب کے واسطے ہم کو پھر حرارت کی طرف متوجہ ہونا پڑیگا۔ دنیا کی طرف نظر ڈالو، اور خیال کرلو کہ اسمیں آگ لگ گئی ہو اور اس قدر زیادہ حدت پیدا ہو گئی ہے کہ جمادات تک نہ صرف پگھل گئے ہیں، بلکہ غاس (گیس) کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسی کا نام آفتاب ہے۔ البتہ آفتاب کی وبازت زمین سے تیرہ لاکھ گنا زیادہ ہے۔

آفتاب کی شعاعوں کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی انھیں اجزاء سے مرکب ہیں جس سے ہماری زمین نے ترکیب پائی ہے، زمین کے تقریباً چالیس اجزاء لوہا، کیلسیم، ہائیڈروجن، نکل، المونیم، کاربن، تانبہ، چاندی وغیرہ انہیں موجود ہیں۔ اور اجزاء بھی ہیں لیکن وہ مشکل سے نظر آتے ہیں۔ زمین میں ایک چیز نہیں ملتی تھی لیکن سورج کی شعاع میں مل گئی۔ اور تیس سال کے بعد ایک ماہر نے اپنے معمل میں ایک دھات کے اندر اسکی شناخت کی، اور اب وہ دنیا میں ہیلیم کے نام سے مشہور ہے، ہائیڈروجن کے بعد یہی چیز ہلکی ہے اور اسکی طرح سریع الاشتعال نہیں ہے، غباروں اور ہوائی جہازوں میں یہی بھری جاتی ہے۔ امریکہ میں اس غاس کے قدرتی فوارے موجود ہیں۔

آفتاب کی شعاعوں میں دیکھکر ہیلیم کو زمین میں تلاش کرلینا، فلکیات کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے، کرۂ آفتابی میں ایک اور چیز دریافت ہوئی ہے جس کا ابھی تک زمین پر پتہ نہیں چلا ہے۔ اس کا نام مادۂ اکلیل ہے یقین ہے کہ ایکدن

زمین میں اسکے وجود کا بھی سُراغ ملجائے گا۔

آفتاب اگرچہ زمین کی بہ نسبت تیرہ لاکھ گُنا زیادہ دبیز ہے لیکن وزن میں صرف تین لاکھ بتیس ہزار گُنا زیادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب زمین کی طرح منجمد نہیں ہے۔ لیکن اگرچہ آفتاب سے ہر وقت مشتعل غاسین ہوتی ہیں لیکن انپر دباؤ بہت ہے اور اندرونی غاسیں دبکر پانی سے زیادہ موٹی ہو گئی ہیں۔

آفتاب کی کمیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اسکی سطح کی قوت کشش زمین کی قوت کشش سے تیس گُنا زیادہ ہے۔ ایک شخص جس کا وزن زمین پر دو سو پاؤنڈ ہے آفتاب پر تین ٹن کا ہو جائے گا۔ کشش آفتاب کی زیادتی زمین کی طرح ہر چیز کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ اور اس زیادتی کے باعث وزن بڑھکر اندرونی دباؤ کا باعث ہوتا ہے۔

یہی زبردست کمیت نظام شمسی کے سیاروں، اور زمین کو مدارات پر قائم اور آفتاب کے گرد گردش میں رکھتی ہے۔ اور یہ برکت ہے محض قوت کشش کی۔

سیارۂ نیپچون، آفتاب کا بعید ترین سیارہ مرکز شمسی سے دو ارب اسی کرور میل کے فاصلہ پر اتنے بڑے مدار میں گردش کرتا ہے، کہ پوری مسافت میں ایکسو چونسٹھ برس صرف ہوتے ہیں۔ یہ انسانی عقل مشکل سے باور کرے گی۔ لیکن آفتاب اور نیپچون کے درمیان قوت کشش کی مضبوطی اور استواری ٹھوس فولاد کے پانچ سو میل موٹے تار کے برابر ہے۔

آفتاب کی حرارت کی ابتک صحیح پیمائش نہیں ہوسکی، کیونکہ ہمارے پاس جو آلات ہیں اُن میں صرف چھ ہزار ڈگری تک معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اڈنگٹن نے حال میں ایک مضمون شایع کیا ہے جسمیں وہ آفتاب کی حرارت کا اندازہ ایک کروڑ اسی لاکھ ڈگری کرتے ہیں۔

اِن اعداد کو دیکھتے ہوئے ناممکن ہے کہ ہم آفتاب کی حرارت کا اندازہ کرسکیں۔ لوہا پہلے گرم، پھر زرد، اور پھر سفید ہوتا ہے، اور اُسکے بعد پگھل جاتا ہے۔ لیکن اگر اُسکو آفتاب کے سامنے رکھا جائے تو یقین ہے کہ غاس بنکر اُڑ جائے۔

آفتاب کی مشتعل حالت کا اندازہ اُسکے داغوں سے ہوتا ہے۔ جن کی عکسی تصویر ہمیشہ سیاہ آتی ہے، لیکن ہماری آنکھوں کو وہ بھی مشتعل نظر آتے ہیں۔ اور اُن کی روشنی کے مقابل ابتک دنیا میں کوئی روشنی پیدا نہیں ہوسکی ہے، سیاہ تصویر کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب میں بعض مقامات پر روشنی کم ہوجاتی ہے اور وہ تصویریں زیادہ چمک کے مقابلے میں سیاہ معلوم ہوتی ہیں۔

آفتاب کے داغ مداری (Storms) طوفان ہیں۔ اندرونی حدت کے بڑھ جانے سے سطح پر جوش سا آجاتا ہے، اور چونکہ غاسیں اندرونی دباؤ کی وجہ سے باہر پھیلتی ہیں کیونکہ اوپر دباؤ نسبتاً کم ہے، اِس لیئے اُن میں کسی قدر خنکی پیدا ہوجاتی ہے، یہی مقامات داغ کہلاتے ہیں، حالانکہ اُنکی اور آفتاب کی روشنی میں خفیف سا فرق ہوتا ہے۔

آفتاب کے داغوں کے ساتھ اور بھی مداری اثرات ظہور میں آتے ہیں۔ اور جس زمانہ میں داغ زیادہ ہوجاتے ہیں۔ مداری فضا، آفتاب کے طباق سے چھلک کر اُس کے چاروں طرف خوبصورت سچے موتیوں کے رنگ کی چیز بن جاتی ہے۔ اور گرہن کے موقع پر نظر آتی ہے، بعض مواقع پر آفتاب کے شعلے بلند ہوکر طباق سے باہر فضا میں لپکتے ہیں۔ اور جب داغوں کی کثرت ہوتی ہے تو اِن شعلوں کی بلندی کئی ہزار میل تک پہونچ جاتی ہے۔

آفتاب کی سطح مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے۔ جس پر بکثرت دانے بکھرے ہوئے ہیں، ہر دانہ روشن ہے، اور اسمیں بھی اختلاف ہے جس کو ہم آفتاب کا

دانہ کہتے ہیں وہ حقیقت میں ہزاروں میل لمبا چوڑا اور اونچا پہاڑ ہوتا ہے۔
آفتاب کی گردش کے وقت بعض اوقات ہم کو اس میں روشن مقامات نظر آتے ہیں، یہ مشعلیں انھیں مقامات پر روشن ہوتی ہیں جہاں داغ قائم ہونیوالے ہوتے ہیں۔ داغ پڑ جانے کے بعد خود غائب ہو جاتے ہیں۔
لیکن ان چیزوں کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ دانے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں شمعیں جلتی اور بجھتی رہتی ہیں۔ داغ پھیلتے اور سمٹتے رہتے ہیں۔ بعض داغ تو صرف چند دنوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور بعض مہینوں تک رہتے ہیں، اور آفتاب کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم کو نظر آتے رہتے ہیں، غائب ہو جاتے ہیں، اور پھر سامنے آجاتے ہیں۔ داغوں کی وسعت بھی مختلف یعنی چند سو میلوں سے لے کر ہزاروں میلوں تک کی ہوتی ہے۔
دنیا کی مشہور رصدگاہوں پر آفتاب کی روزانہ تصویریں کھینچی جاتی ہیں اور روزانہ کے نتائج نوٹ کیے جاتے ہیں، ۱۶۰۶ء سے ابتک کے روزانہ حالات موجود ہیں اور انکا مطالعہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔
کچھ عرصہ سے آفتاب کی حرارت کی پیمایش کا انتظام کیا گیا ہے اور آفتاب کے شعاعوں کی پیمایش روزانہ کی جاتی ہے۔ جدید تجربات کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ آفتاب کی حرارت روزانہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن چونکہ تجربہ کی ابتدا ابھی ہوئی ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کب تک قابل اعتماد اعداد و شمار معلوم ہو سکیں گے لہذا ہم کو بھی انتظار کرنا پڑے گا، لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ یہ ہے کہ زمین آفتاب کی جانب بہت تیزی سے سفر کر رہی ہے، یہ سفر کب شروع ہوا اور کیوں ہوا۔ اس کا علم تو صرف خدا ہے، مگر ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہم سیارۂ "لنسر" کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں، وہی ہمارا مشرقی سیارہ ہے

اور زمین سے بہت دور واقع ہے، اُسکے فاصلہ کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے، لیکن اِس سیارہ کی روشنی زمین پر چونتیس برس میں پہونچتی ہے، نسر بھی زمین کی طرف سفر کرتا ہوا آرہا ہے اور اُسکی رفتار فی سکنڈ دس میل ہے۔ اِس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نصف ملیون سال کے بعد ہماری زمین اور نسر مقابل ہوکر گذریں گے۔

یہ زمانہ خوش نصیبوں کے حصّہ میں آیا ہے، کیونکہ اب سورج کی وسعت اور اُسکی حدّت میں بہت کمی آگئی ہے۔ اور زندگی کو اُسکی تمازت ناقابل برداشت نہیں بناتی ہے، بلکہ اِس حدت سے جسمانی نشو ونما، اور زراعت کو ترقی ہوتی ہے۔ موجودہ نسل کا یہ خیال محض عبث ہے کہ آفتاب کب ٹھنڈا ہوگا۔ اور زمین کا کب خاتمہ ہوگا۔ اربوں برس کے بعد آفتاب میں صرف اسقدر خنکی آئی ہے کہ دنیا رہنے کے قابل ہوگئی ہے۔ اِس کو بالکل ٹھنڈا ہونے کے لیئے اربہا ارب برس کی ضرورت ہے، اور یہی کیفیت زمین کی ہے،

رہا یہ سوال کہ زمین اور آفتاب کا خاتمہ کس طرح ہوگا، اور کیا نتیجہ نکلے گا، اِس طرف ابھی ہم کو دماغ سوزی کی ضرورت نہیں ہے جب ثور کھلے گا، اور ہم قبروں سے نکلیں گے، خود دیکھیں گے کہ زمین کس طرح پُرزے پُرزے ہوتی ہے اور کس طرح دامنِ عشاق کی طرح آسمان کی دھجیاں ہوتی ہیں۔ سہ

اب تو آرام سے گذرتی ہے

کلام شاد مرحوم

افسانۂ عبرت

یہ قطعہ جناب مولینا شاد عظیم آبادی مرحوم اپنے مرض الموت میں تصنیف فرمایا تھا ہمکو جناب صادق صاحب ایوبی نے مرحمت فرمایا ہے۔ مدیر شمع

نظر اُٹھائی تو رستہ میں دیکھتا کیا ہوں — کہ اک شکستہ و کہنہ مزار باقی ہے
کہا یہ دل نے چلو چل کے فاتحہ پڑھ لیں — کہ مٹنے والوں کی یہ یادگار باقی ہے
کیا سوال یہ جا کر کہ اے مقیم لحد — جواب دے مجھے گر اختیار باقی ہے
وہی ہے دولت و عیش و نشاط کی مستی — اُسی شراب خودی کا خمار باقی ہے
وہی ہے دل میں ابھی اُلفتِ زن و فرزند — وہی محبتِ خویش و تبار باقی ہے
وہی ہے آج بھی تجھ میں خیال خودداری — ابھی وہی دلِ نخوت شعار باقی ہے
وہی ہے جسم کی ملحوظ اب بھی زیبائش — لباس میں وہی نقش و نگار باقی ہے
دیا جواب یہ اُسنے کہ آہ کیا کہیے — نہ اب وہ میں ہوں نہ جسم نزار باقی ہے
نہ اب وہ سر ہے کہ جسمیں منعم کا سودا تھا — نہ وہ جگر نہ دلِ غمگسار باقی ہے
لحد پہ پھول بھی تھے شمع بھی تھی لیکن اب — نہ خندہ زن نہ کوئی اشکبار باقی ہے
کچھ ایسی بیکسی و یاس ہو گئی طاری — نہ اب غرور نہ اب انکسار باقی ہے
کہاں کے اپنے پرائے پڑی ہے خود اپنی — عجیب واہمۂ ناگوار باقی ہے
نہ پیرہن گلے میں نہ سر میں اب سر بند — نہ اس کفن کا یہاں کوئی تار باقی ہے
ہر آن ٹوٹ کے گرتے ہیں قبر کے تختے — لحد میں تو وہ گرد و غبار باقی ہے
نہ دیمکیں ہیں نہ کیڑوں کی اب ہے بھیڑ رہی — نہ مورچوں کی یہاں اب قطار باقی ہے
اب اپنی روح کا ڈھونڈھے پتہ نہیں ملتا — کہاں وہ صاعقۂ بیقرار باقی ہے

کسی کے وعدۂ فردا نے جان رکھلی ہے
بس اک یہی خلش انتظار باقی ہے

۱. یورپ تک ریل کا سفر

از

جناب مس سلطانہ قاضی کبیرالدین صاحبہ

مرحوم مسٹر وارے انڈین سول سروس کے ممبر نے جو ہمیشہ مختلف راستوں سے ولایت جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ ٹرانس سائبرین ریلوے سے جو حال میں تیار ہوئی تھی یورپ کا سفر کیا۔ یہ نیا راستہ تھا۔ اس لیئے اُنھوں نے اپنا سفرنامہ مرتب کیا، اور میرے والد صاحب کو دیا۔ سُنا ہے کہ اُسکو اُنھوں نے ولایت میں طبع بھی کرایا تھا۔

اس راستے سے یورپ جاتے ہوئے سیام، چین، کوریا، جاپان، سائبریا وغیرہ ملکوں میں ہو کر جانا پڑتا ہے، اس لیے ہم ہندوستانیوں کے لیئے ان ملکوں کی کیفیت خالی از دلچسپی نہو گی۔ آج کل چین سے وحشت ناک خبریں آ رہی ہیں۔ لہٰذا اس مضمون کی دلچسپی اور بڑھ جائے گی۔ اسی خیال سے میں نے مسٹر وارلے کے سفرنامے ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔

۱۔ مسٹر قاضی کبیرالدین بیرسٹر ایٹ لا۔

(مس) سلطانہ قاضی کبیرالدین۔

بمبئی سے کولمبو کا سفر



پی اینڈ او کمپنی کے جہاز "ایس ایس دہلی" پر ہم لوگ ۳ مارچ کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔ کولمبو تک میرے ہمسفر خاصکر وہ اشخاص تھے جو بغرض تفریح سیلون جا رہے تھے یا وہ ڈاکٹر تھے جو بمبئی کے مڈیکل کانگریس سے واپس ہو رہے تھے۔ یہ کانگریس اسی زمانہ میں بمبئی میں منعقد ہو کر ختم ہوئی تھی۔ وہ شور و غل جو ولایت کے ڈاک کے جہاز کی روانگی کے وقت ہوتا ہے۔ مشرق کی طرف سے جانے والے جہازوں میں تقریباً معدوم ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹری معائنہ میں بھی بہت سی سختیاں جو دو دنیس کونونشن کے مطابق ضروری ہیں نہیں برتی جاتی ہیں۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری قسم کا جہاز بہت آرام دہ ہوتا ہے جو چین کے میل سروس میں استعمال ہوتا ہے اور بہ نسبت مسافروں کے مال زیادہ لیجاتا ہے۔ اور ڈی کلاس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جہاز بہت مضبوط ہوتے ہیں اور رسومی ہواؤں میں بھی انکی حالت اچھی رہتی ہے۔

کولمبو کا بحری سفر بہت پُر لطف ہوتا ہے کیونکہ بری حصہ شاذ و نادر نظروں سے اوجھل ہوتا ہے، اور کولمبو سے آنے والے جہاز ساحل کے پاس سے ہو کر گذرتے ہیں۔

جب ہمارا جہاز جنوب کی طرف روانہ ہوا تو بمبئی کا نظارہ بہت پُر کیف تھا۔ اور بہت سے آزاد خیال لوگوں نے جہاز کے ایجنٹ کی پرانی کہاوت کو تسلیم کیا ہوگا کہ "بمبئی کا بہترین نظارہ رخصت ہونے والے جہاز کے پچھلے

حصہ سے دکھائی پڑتا ہے۔"

کولمبو کے تمام سفر میں ہوا موافق رہی جس نے کسی قدر گرمی پیدا کردی۔ اور اگرچہ ابتدائی مارچ کا زمانہ تھا اس عرض البلد میں اچھی طرح موسم گرما شروع ہوگیا تھا۔ دوسرے روز ہم کاروار ہیڈ (Karwar Head) سے گذرے گو ہمارا جہاز اس خطۂ زمین سے کسی قدر فاصلہ پر دریا میں تھا مگر میں اس زمین کے نقشہ سے خوب واقف تھا کیونکہ بحیثیت ایک افسر یہاں مقیم رہچکا تھا۔ کاروار ایک قدرتی بندرگاہ ہے جو ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے کسی زمانہ میں اسکی وہی حالت تھی جو اب مارماگوا کی ہے یعنی جنوبی مرہٹہ ملک کے پیداوار کی نکاسی کا بندرگاہ تھا۔ مغربی گھاٹ سے یہاں پر ایک لائن کے لانے کی تجویز پیش تھی اور پیمایش وغیرہ بھی ہوچکی تھی۔ مگر اس خیال سے دست بردار ہوجانا پڑا کیونکہ اہل پرتگال نے جنوبی مرہٹہ ریلوے سے مارماگوا تک جو کاروار سے چالیس میل ہے، مغربی ہندی پرتگال لائن کے لانے کی تجویز شروع کردی تھی۔

کاروار کا منظر یعنی وہ گھنے درختوں کا جنگل جو پہاڑی سے لب ساحل تک پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے بہترین مناظر میں شمار ہوتا ہے۔ دوپہر میں ہم وہ جہاز "ملتان" کے قریب سے گذرے جو تیز رفتاری کے ساتھ بمبئی جارہا تھا تاکہ وہاں سے مسافروں کو لیکر ولایت جائے۔

۵۔ تاریخ کو ہم کوچین (cochin) سے گذرے۔ ہمارا دن کا زیادہ حصہ خشکی کے قریب گذرا۔ کوچن کا ریتیلا ساحل صاف نظر آرہا تھا۔ اسکی نیچی زمین پر کھجور کے بے شمار درخت تھے اور اس کے پہاڑ کا منظر بہت خوشنما تھا۔ یہاں سے ٹراونکور کے پہاڑ وںکے حسن کا اچھی طرح اندازہ

ہو سکتا تھا۔

۶ مارچ۔ علی الصباح ہم کولمبو پہونچے۔ اور ہمارا قیام سولہ گھنٹے رہا۔ جو وہاں کے دلچسپ اور دلاویز مقاموں کے دیکھنے لیئے بالکل ناکافی تھا۔ اگر صبح کی ٹرین کے وقت پر جہاز پہونچ جائے تو یہاں سے ریل کے ذریعہ سے کینڈی (Kandy) کا سفر بہت مقبول اور پرلطف ہے۔ آمد و رفت میں صرف ایک دن صرف ہوتا ہے۔

کینڈی یہاں کا قدیم دارالسلطنت ہے اور پہاڑیوں کے جھرمٹ میں ایک خوبصورت سی جھیل کے کنارہ پر واقع ہے یہ سفر بذات خود بہت دلچسپ ہے ریلوے لائن پہلے چاولوں کے کھیت سے گذرتی ہے جس میں بے شمار کھجور اور میوہ کے درخت ہیں اور پھر پہاڑی چڑھاؤ ہے جو کہ تقریباً ۱۳۰۰ فیٹ بلند ہے۔ یہاں سے کینڈی کا منظر بہت دلکش ہوتا ہے۔

شہر سے چار میل پر پیریڈ نیا باغ ہے جو دنیا کے نباتاتی باغات میں عمدہ شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بوٹنزبرگ کے باغات جو جاوا میں ہیں بہترین کہے جاتے ہیں کینڈی سے رکشا لیکر پیریڈنیا جنکشن تک جا سکتے ہیں۔

جہاز بمشکل اتنی دیر یہاں قیام کرتا ہے کہ اس جزیرہ کے دوسرے مقامات کی سیر کیجا سکے۔ مسافر کو صرف کولمبو اور اسکے اطراف کی سیر پر اکتفا کرنی پڑتی ہے کولمبو کا بندرگاہ قدرتی طور پر عمدہ ہے اور اکثر جہازات سے بھرا رہتا ہے جب ہم بندرگاہ سے گذرے تو بہت کم جہاز موجود تھے۔ مگر مسٹر گارڈن بینٹ "نیویارک ہیرلڈ"، کے مالک کا جہاز سب سے اچھا تھا۔ جو لوگ کولمبو میں اس ارادے سے اترتے ہیں کہ سیلون میں قیام کریں گے اُن کو پلیگ کے متعلق قوانین کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو صرف قیام تک ٹھہر کے پھر اسی

جہاز سے روانہ ہوتے ہیں صرف ایک پاس حاصل کرکے بہ آسانی سیر کر سکتے ہیں۔ کشتیاں مسافروں کو کنارے پہونچاتی ہیں۔ کولمبو میں دو ہوٹل عمدہ ہیں۔ ایک گرانڈ اورینٹل ہوٹل (Grand Oriental Hotel) اور دوسرا گیلی فیس (Gally Face) اول الذکر ہوٹل ساحل کے قریب ہے اور دوسرا ایک کھلے میدان میں سمندر کے کنارے واقع ہے اور رکشا یا گاڑی سے چند منٹ میں وہاں پہونچ سکتے ہیں۔ کولمبو میں دوکانیں عمدہ ہیں۔ بعض لوگ کولمبو کو مشرق کا پہلا نظارہ کہتے ہیں۔ مسافر کا وقت شہر کے دیکھنے اور زراعت کی سیر میں صرف ہو سکتا ہے۔ بہ آسانی اور جلد جانے کے لئے برقی ٹرام ہیں جو شہر کے اکثر حصوں میں جاتی ہیں۔

چونکہ میں پہلے سے ان سب باتوں سے واقف تھا۔ اس لیے میں نے میوزیم وکٹوریا باغ اور کوہ لاونیا (Mount Lavinia) کی سیر پر اکتفا کی۔ میوزیم اچھی حالت میں ہے۔ آثار قدیم (archaeological) کا حصہ بہت دلچسپ ہے اور ہر وقت کی تصاویر اور دیگر نادر اشیا بھی جمع ہیں۔ ڈچ کی ناس کی ڈبیاں اور تمباکو کا بکس بھی قابل دید ہیں جو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ عروج کی یادگار ہیں۔ ایک دلچسپ چیز یہ بھی ہے کہ ایک چوہا سیپ کے منھ میں ہے جو کہا جاتا ہے کہ پرتشری کا ایک واقعہ ہے۔

علم طبقات الارض کا حصہ جو اہرات کی حرفت کا نقشہ پیش نظر کرتا ہے جسکے لئے سیلون مشہور ہے۔ اصلی اور نقلی اقسام کے نیلم قابل توجہ ہیں "کم درجہ" کے پتھر کو مختلف رنگ دیکر چمکا دینے کی ترکیب سیلون والوں کو خوب آتی ہے چنانچہ اس کے نمونے بھی اس جگہ موجود ہیں۔ کولمبو کو جانے والے سیاح اکثر پھیری والے آدمیوں سے جواہرات خرید لیتے ہیں۔ اور یہ "جواہرات"

اکثر بیکار اور فضول ہوتے ہیں - اور اگر انکی کچھ قیمت ہو بھی تو لینے والے کو چاہیئے کہ اسکے مصنوعی نہونے کا پہلے اطمینان کرے -

وکٹوریہ باغ ناقابل ذکر ہے - اگر وقت نہ ہو اُس کو دیکھنے کی تکلیف نکرنی چاہیئے

ماؤنٹ لاوینیا - کولمبو سے جنوب کی طرف سات میل پر بذریعہ ریل واقع ہے ریلوے لائن ناریل کے بیشمار درختوں سے گذر کے لب ساحل سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی ہے - سمندر کا پانی اکثر لائن کو چھپا دیتا ہے - ماؤنٹ لاوینیا ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے - وہاں ایک خوبصورت ہوٹل بھی ہے جسمیں کولمبو سے آکر ایام تعطیل میں مسافر قیام کرتے ہیں -

لنچ کھانے کے بعد آدمی بآسانی کولمبو واپس آسکتا ہے -

---

(۳)

سفر پینانگ و سنگاپور



۷ - مارچ کو جب ہم لوگ سیلون کے جنوبی کنارے سے گذر رہے تھے - بارش ہو رہی تھی - مگر بعض وقت اندرون ملک کے پہاڑ نظر آجاتے تھے یہاں سے سنگاپور تک روزانہ بارش ہوتی رہی - اور ۱۰ تاریخ کی رات کو بادل کی گرج بجلی کی تڑپ اور بارش نے ایک خاصہ طوفان بپا کر دیا - ہوا بہت تیز تھی جس سے مجبوراً تمام سونے والوں کو نیچے کے ڈِک پر جانا پڑا -

۱۰ مارچ کی صبح کو چھ بجے ہم اچین ہیڈ (Achin Head) سے گذرے - جو شمالی سماترا کا اخیر حصہ ہے - ٹھیک طلوع آفتاب کے وقت

وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ہم اس قدر قریب سے گذرے کہ وہاں کا گھنا جنگل جو پہاڑی کو چھپائے ہوئے تھا صاف نظر آنے لگا ایک نمایاں مقام جسپر گذرتے وقت نظر پڑی وہ ماؤنٹ یامورا (Mount Yamura) تھا یعنی "طلائی پہاڑ" (جہازرانوں کی اصطلاح میں اسی نام سے مشہور ہے!) ورزمین ۵۰۰۰ ہزار فیٹ بلند ہے۔

ہم ۱۱ رتاریخ کو پینانگ پہونچے۔ مگر بندرگاہ میں صرف دو گھنٹہ ٹھہر سکے۔ یہ قلیل وقت صرف رکشا پر بوٹینکل گارڈنز تک جانے آنے کے لیے کافی تھا۔ اثنائے راہ میں شہر کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

پینانگ یا پرنس آف ویلز آئلنڈ۔ ایک تنگ راہ کے ذریعہ سے صوبہ ویلزلی سے جدا ہوتا ہے۔ زمین بہت ناہموار ہے۔ مگر درختوں سے جنگل بھرا ہوا ہے جانب مشرق ایک ہموار حصہ زمین پر شہر پینانگ واقع ہے۔ عمارتیں اور رہائشی بنگلے اچھے ہیں۔ شہر کی ساخت اور سڑکوں کی بناوٹ بھی خوب ہے شکر کا مقام ہے کہ قریب کی پہاڑیوں سے گرینائٹ (Granite) کی کافی آمد ہے تجارتی حصہ بندرگاہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور رہائشی حصہ شہر کا سلسلہ پہاڑیوں کے اندر تک دو تین میل چلا گیا ہے۔ اسی کے قریب بوٹنکل گارڈنز ہے جو عمدہ حالت میں ہے۔ پہاڑی سے ایک چھوٹا سا جھرنا بھی جاری ہے اور ان پہاڑیوں کے پیچھے پہاڑ ہیں جو تقریباً دو ہزار فیٹ بلند ہیں اور بیشمار درختوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ہوٹل ہے، جس پر سے بڑا عظم کا بہت عمدہ نظارہ حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ پہاڑی پینانگ کے باشندوں کے لیے تفریح کی جگہ ہے جہاں وہ آسانی سے پہونچ سکتے ہیں۔ بوٹینکل گارڈنز کے قریب چڑھائی کے لیے کرسیاں ملسکتی ہیں کیونکہ اگر پیدل چڑھائی کیجائے تو گرمی کی وجہ سے

تھک کر انسان کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔

پینانگ کا موسم گو شدت گرمی یا سردی سے آزاد ہے تاہم رہائش کے لیے تمام سال تقریبًا یکساں موسم رہتا ہے۔ مگر تری کی زیادتی سے گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے بعض آدمی اسی موسم کو پسند کرتے ہیں۔

جزیرہ نما میلی میں (Malay Peninsula) میں ٹین کی کانیں ہیں اور ٹین کی تجارت ہوتی ہے۔ ٹین کا زیادہ حصہ پینانگ سے دنیا کے اکثر حصوں میں جاتا ہے۔ ریاستہائے متصلہ میلے (Federated Malay states) کے پایہ تخت کوالالمپور تک ریل جاتی ہے وہ پینانگ کے ایک گوشہ سے نکلی ہے۔ اور جزیرہ نما میں ہو کر گذرتی ہے۔ یہ لائن عنقریب سنگاپور تک جاری ہو جائے گی اور مسافر بہ آسانی پینانگ سے ریل میں جاسکے گا اور ملے پینسولا کی دلکش سینری کا لطف اٹھاتا ہوا کوالالمپور میں رات گزار کے صبح کی گاڑی سے سنگاپور پہونچ سکیگا تاکہ پھر جہاز پر سوار ہو جائے۔ ریاستوں (states) کی دوسری بڑی صنعت ربر ہے۔ کئی ایکڑ جنگل میں ربر کے بیشمار چھوٹے درخت لگائے جاتے ہیں۔

پینانگ بر ہلد سنگاپور۔ اور ملے اسٹیٹ میں اہل چین بہت مشہور ہیں۔ اور بندرگاہ کی تجارت چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ شہر کا زیادہ حصہ چینیوں سے آباد ہے۔ جہاں عجیب قسم کے تختے لٹکتے ہیں جن پر چینی زبان میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔ پینانگ سے جاتے وقت ہم نے سمپان دیکھی۔ یہ عجیب قسم کی کشتی ہوتی ہے جس کا پچھلا حصہ بکس کی طرح ہوتا ہے جس میں صرف ایک مسافر بیٹھ سکتا ہے آگے کا حصہ گاؤدم ہوتا ہے اور پانی کی سطح سے اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک ہی آدمی اسکو چلاتا ہے۔ اور چین، جاپان اور ملے پنسولا کے دریاؤں میں بکثرت استعمال ہوتی ہے اگر موسم خراب نہو تو بہت اچھی چیز ہے۔ ہم لوگ کنارہ سے جہاز تک اسی میں سوار

ہو کر سے گئے تھے۔

ہمارا جہاز تیزی کے ساتھ آبنائے ملاکا (Malacca Straits) ہوتا ہوا دوسرے روز بعد دوپہر سنگاپور پہونچگیا۔

جزیرہ سنگاپور بر اعظم سے الگ ہے۔ جزیرہ کے جنوبی حد پر شہر واقع ہی۔ اور ٹھیک اسکے سامنے کئی مضبوط قلعہ بند جزیرے ہیں جن کے بیچ میں بندرگاہ ہے۔ جس میں داخل ہونے کا راستہ مشرق اور مغرب کا ہے۔ ہم مغربی راستہ سے داخل ہوئے گو یہ راستہ تنگ ہے مگر مضبوط ہے۔ پختہ کنارہ لمبا ہے اور کئی بڑے بڑے جہاز وہاں جا لگتے ہیں چونکہ جہاز کو کوئلہ لینا تھا۔ بہت سے مسافر رات گذارنے کے لیے کنارہ پر چلے گئے تاکہ جہاز کی گرمی سے رات کو محفوظ رہیں۔ شہر بندرگاہ سے قدرے فاصلہ پر ہے مگر رکشا اور تیز رفتار قلیوں اور برقی ٹرامویے کی امداد سے یہ مشکل حل ہوجاتی ہے

چونکہ میرے پاس ایک افسر کا تعارفی خط تھا اس لیے میں سرکاری کشتی سے گیا یہ کشتی ہر بیس منٹ کے بعد بالکن مٹی کو جاتی ہے۔

بالکن مٹی وہ جزیرہ ہے جس پر بندوق چلانے والے (گنرز) مقیم ہیں۔ وہاں کے افسروں نے سنگاپور کو جانے اور آنے کی مشکلات کی وجہ سے شکایت کی۔ مگر ان کا کلب جو لب سمندر رہے ٹینس کورٹ اور دلچسپیوں کے دیگر سامان انکی مشکلات کی تلافی کر دیتے ہوں گے۔

سنگاپور میں گولف کلب بہ کثرت ہیں۔ گورنمنٹ ہاوس بھی اچھی جگہ پر واقع ہے اس میں ایک گولف کورس بھی ہے۔

تجارت پیشہ لوگوں کی زیادہ تعداد شہر سے باہر رہتی ہے۔ جہاں ان کے بہت عمدہ مکانات ہیں۔ یہ لوگ صرف دن بھر کے لیے سنگاپور میں آتے ہیں۔ سنگاپور میں صرف چند قابل دید مناظر ہیں۔ مگر شہر کی ساخت عمدہ ہے

سڑکیں چوڑی اور سیرگاہیں وسیع ہیں۔ ایک بڑا تھیٹر بھی ہے جو حال میں بنا ہے۔

بہت سے مسافر بوٹینکل گارڈنز دیکھنے گئے اور خشکی پر کھانا بھی کھایا اور وہیں سوئے بھی۔ لیکن کچھ تو گرمی کی وجہ سے اور کچھ اس خوف سے کہ کہیں زیادہ دیر تک نہ سوتے رہ جائیں رات بھر قریب قریب جاگتے رہے۔ کئی مسافر تو دوسرے روز جہاز پر نہ آسکے۔ جو لوگ جہاز پر رہ گئے تھے۔ انھوں نے ٹھنڈی رات کا خوب لطف اٹھایا بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد ایسی خنکی آج ہی نصیب ہوئی تھی۔ پانی کے برس جانے کی وجہ سے ہوا صاف ہوگئی تھی۔

صبح قبل روانگی جہاز میں نے ٹیننجونگ پیگر ڈاک کا کام دیکھا۔ جو اب گورنمنٹ کے زیر نگرانی ہے۔ ٹھیکہ دار بہت محنت سے کام کرا رہے تھے۔ اور بہت سے سکاٹلینڈ کے افسر جنکو سر جان آرڈ کی کمپنی نے ملازم رکھا تھا موجود تھے۔ انجن کے ذریعہ سے سامان اکٹھا کیا جا رہا تھا اور انجن ہی کے ذریعہ سے لکڑیاں کٹ رہی تھیں۔

ہم مشرقی راہ سے بندرگاہ سے باہر آئے کنارہ پر کئی جہاز لنگرانداز تھے ان میں ایک ڈچ سٹیمر جاوا کو جانے والا تھا۔ جاوا سنگاپور کا۔ پہاڑی سٹیشن کہلاتا ہے۔

جہاز چل رہا تھا مگر خشکی کا حصہ برابر نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم کیپ رومانیا تک پہونچ گئے۔ جو ایشیا (A سند) کی انتہائی جنوبی حد ہے۔ اُسکے پاس پہونچکے ہمارے اسٹیمر نے شمال کا رُخ کیا اور خشکی کا حصہ اوجھل ہوگیا۔

(باقی دارد)



غزل

از

جناب میرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی جانشین میرؔ و غالبؔ



تم نے بجھا دیا یہ جفا تھی کہ پیار تھا
تصویر میرے دل کی چراغِ مزار تھا

تھا ہجرِ گل خزاں میں جو دل بے قرار تھا
کیا تھا بہار میں جو سوا انتشار تھا

اللہ رے خارِ عشق کی وحشت نوازیاں
کیا ذکر جیب و دامن دل تار تار تھا

دو اشک غم بہا نہ سکی جب لحد پہ شمع
وہ آپ سے شہیدِ جفا کا مزار تھا

سمجھا تھا کس امید پہ میں دل کو شامِ غم
اُس رات زندگی کا کسے اعتبار تھا

منصور نے جو دار پہ چڑھکر نگاہ کی
ثابت ہوا کہ منزلِ آخر میں خار تھا

مجرم وہ کہہ رہے ہیں شبِ ہجر کا مجھے
ہاں! اُنکے ساتھ موت کا بھی انتظار تھا

دم بھر کو عاریت کی طرح بھی خوشی نہ دی
اتنا میں چشمِ دہر میں بے اعتبار تھا

باتوں میں راہِ منزلِ ہستی گذار دی
دنیا میں جو ملا وہ غریب الدیار تھا

خود دار تھی مٹی ہوئی نازک دلوں کی خاک
برہم ہوائے تند سے اپنا غبار تھا

تیغِ جفا پہ قتل کا الزام کیا ضرور
یہ رشتۂ حیات ہی ناپائدار تھا

جو دل سے مٹ گئی وہ مژہ کی خلش نہ تھی
جو چبھ کے رہ گیا وہ محبت کا خار تھا

آئے ہو وقتِ دفن تو شانہ ہلا کے جاؤ
آنکھ اُسکی لگ گئی ہے جسے انتظار تھا

تقدیر سے ہے قید و رہائی وگرنہ میں
بیہوش تھا کبھی نہ کبھی ہوشیار تھا

میّت تو اُٹھ گئی وہ نہ آئے نہیں سہی
ثاقب کسی کے دل پہ کوئی اختیار تھا

"عید"

از

جناب علی عباس صاحب حسینی۔ ایم۔ اے

عبدالقیوم نے ڈرتے ڈرتے اپنے باپ سے کہا "ابّا پرسوں عید ہے۔ ہم کس کے ساتھ کھیلیں گے؟"

شیخ عبدالرؤف اسی طرح مقدمہ کے کاغذات دیکھتے رہے۔ لیکن غالباً اُنھوں نے عبدالقیوم کی آواز سُن لی اور یہ محسوس کیا کہ اُنکا نو برس کا بے ماں کا بچہ کچھ کہہ رہا ہے اسلیئے اُنھوں نے کاغذات سے آنکھ نہ ہٹائی مگر اتنا پوچھا "قیوم کیا تم نے کچھ کہا؟"

قیوم اپنی کرسی سے اُٹھ کر باپ کے پاس آنکھوں میں کھڑے آکر کھڑا ہو گیا شیخ صاحب نے اسکی قربت تو محسوس کی لیکن تجویز سے نظر نہ کھسکائی اور بولے "ارے تو کہتے کیوں نہیں کیا چاہتے ہو؟"

قیوم نے دو تین مرتبہ اپنے پتلے پتلے ہونٹ چاٹے اور دونوں ننھے ننھے ہاتھ مَلکر بولا "پرسوں عید ہے"

کاغذات سے نگاہ نہ اُٹھی۔ مُنھ سے آواز نکلی "پھر"

وہ معصوم تھرائی ہوئی آواز میں بولا "جی آپ کہتے ہیں کہ آپ کل اناؤ مقدمہ میں جائینگے"

کاغذات میں یقینی گوند لگی تھی۔ اسلیئے کہ آنکھ اسی طرح اُنمیں چپکی رہی۔ ہاں زبان نے ترس کھایا اور یوں جواب ملا "ہاں میاں تو عید بقرعید تمھارے لیئے ہے کہ ہم ایسے بڈھوں کے واسطے"

شیخ صاحب نے اب نظر اُٹھا کر قیوم کیطرف مسکرا کر دیکھا۔ وہ گردن جھکائے آنکھوں میں

آنسو بھرے اپنی شیروانی کے ایک بٹن کا تاگا نوچ رہا تھا اور اُسکے پنکھڑی سے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ شیخ صاحب نے بھی اپنی حلق میں ایک عجیب طرح کی تلخی محسوس کی، اور ہاتھ بڑھاکر اُسے گود میں سمیٹ لیا۔ اور زانو پر بٹھا کر پیار سے بولے "تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں اندور نہ جاؤں؟"

بچّے کے بے آس دل کو اِس سوال سے ڈھارس سی ہوئی۔ اُسنے اپنی چھوٹی چھوٹی باہیں باپ کی گردن میں ڈالدیں اور پھول سے رخسار سینے سے لگاکر روتی ہوئی آواز میں کہا "جی ہاں"

وکیل صاحب کا دل جو حرص زر کا معمول تھا اور جو بہت کچھ سخت ہو چکا تھا تھوڑا بہت مچلا لیکن اِس خیال نے کہ بچّے کی ایک ذراسی ضد کیوجہ سے ہزاروں روپیہ روزانہ کا نقصان ہوا جاتا ہے اُسے پھر پتھر بنا دیا اور وہ ترش ہو کر کہنے لگے:۔

کیوں؟...... تم بھی بعض وقت ایسی ضدیں کرتے ہو جو سمجھ میں نہیں آتیں! یہ تمھارے دل میں کیوں ہٹ سمائی ہے کہ میں یہ عید یہیں کروں!

قیوم ہچکیاں لیکر بولا۔ ابّا ہم عید کی سوّیاں کس کے ساتھ کھائیں گے؟۔ اور۔ اور۔ ہم کو عیدی کون دیگا۔

وکیل صاحب بولے "عیدی! تم عیدی ابھی لیلو۔ اور سوّیاں تم ماسٹر صاحب اور منشی جی کے ساتھ کھالینا!"

اِس نے بھولے پن سے کہ ان میں میرا کوئی ہمجولی نہیں۔

شیخ صاحب نے ڈانٹ کر کہا "تو میں کیا تمھارا ہمسِن ہوں۔ میں تمھارے لیئے بچّہ بننے سے رہا۔ جاؤ ماسٹر صاحب کے پاس جاکر سبق یاد کرو۔ میرے پاس ایسی فضول باتوں کے لیئے وقت نہیں۔

قیوم باپ کی گود سے اُترا اور گردن جھکائے کمرے کے باہر چلا گیا۔

شیخ صاحب نے بیٹے کو ڈانٹ کر چپ تو کر دیا تھا اور اسے پڑھنے بٹھا بھی دیا تھا۔ لیکن کاغذات کی طرف جو پھر نظر کی تو انکے دیکھنے کو جی نہ ابھرا۔ اسوقت بچے کی باتوں نے اسکی مرحوم ماں کو یاد دلایا تھا۔ اس لیے کہ ایک موقع پر اسی طرح گیارھویں شریف کے دن انھیں ایک مقدمہ کی پیروی کے لیئے کہیں سی۔ پی میں جانا تھا..... ہاں ٹھیک ہے جبلپور ہی تو!.. اور انکی پیاری بیوی نے اصرار کیا تھا کہ گھر کا نیاز چکھ کر تو جانا اور یہ انھیں جھڑک کر چلدیے تھے لیکن لوٹنے پر معلوم ہوا کہ سنجیدہ انکی چار برس کی لڑکی نے دفعتہً چوبیس گھنٹے کی علالت میں انتقال کیا تھا۔ اس دن سے جبتک کہ وہ مرحومہ حیات رہیں باوجودیکہ وکیل صاحب اپنے کو توہم پرستی سے مبرّا سمجھتے تھے لیکن اسپر بھی کبھی تہوار کے دن باہر نہیں گئے تھے، ہاں البتہ جب سے کہ وہ نیک بیوی جنت کو سدھاری شیخ صاحب کو سوائے مقدمہ کے اب کوئی بات یاد نہ رہگئی تھی۔ گیارھویں کی نذر۔ عید۔ بقرعید۔ شبرات۔ ان سب کا پوچھنا ہی کیا۔ انھیں نماز و روزہ تک یاد نہ تھا اور اگر قیوم آج نہ کہتا تو شاید انھیں یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ پرسوں عید ہے!۔

"لیکن قیوم کی واقعی عید کیسے ہو سکتی ہے؟ نو برس کی جان۔ کوئی ہمسن نہ ہمجولی جسے دیکھیئے وہ بڈھا۔ ابا جان بڈھے۔ ماسٹر صاحب بڈھے منشی جی بڈھے۔ نوکر ملازم سب پچاس سے اوپر! وہ اپنے دل کی کس سے کہے؟ وہ آخر کس سے ہنسے بولے؟ آج کہتا تھا کس کے ساتھ کھیلیں گے؟ کاش حنیف سے اور مجھ سے اس طرح کی ان بن نہوئی ہوتی۔ میں کیا کروں زیادتی تو اسمیں سراسر انکی بیوی ہی جی کی تھی۔ اگر انھوں نے خواہ نخواہی اس مرنے والے کی ہر موقع پر اس طرح کی ذلت نہ کی ہوتی کہ جیسے انھیں کا دیا وہ کھاتی تھی تو آج قیوم اس طرح اکیلا کیوں رہتا؟..... اور پھر دیکھیئے نہ تقسیم جائداد اگر آپس میں کرلی ہوتی تو کاہے کو یہ دن نصیب ہوتے؟ لیکن وہ تو حنیف پر انکی بیوی صاحبہ بھوت کی طرح مسلّط تھیں اور جبتک کہ ہائیکورٹ سے فیصلہ نہ کردیا گیا۔

وہ مانا ہی نہیں۔ پھر آخر میں اپنا خرچہ کیوں نہ لیتا؟ آخر انکو بھی تو مقدمہ لڑنے کا کچھ مزہ معلوم ہونا چاہیے تھا!۔

وکیل صاحب کے خیالات کی لڑی منشی جی کی آمدنی توڑی۔ یہ ایک بادن ترپن برس کے موٹے سے آدمی تھے۔ اور بانکپن یہ کہ سپید داڑھی میں مہندی کا خضاب کرتے تھے انکے سرخ سپید چہرے پر یہ لانبی سرخ داڑھی کچھ اس طرح بدنما معلوم ہوتی تھی کہ محلے کے لونڈوں نے انکا نام "سرخا" رکھدیا تھا۔ اور یہ نام ان پر کچھ اس طرح ٹھیک اترا کہ بڑے بوڑھے۔ جوان۔ مرد وعورت سب ان کے پیٹھ پیچھے اسی نام سے پکارتے۔

منشی جی نے وکیل صاحب کو جھک کر سلام کیا اور بولے " تو حضور آج رات کی گاڑی سے اندور جائینگے نا؟"

وکیل صاحب نے کہا " ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ انھوں نے کتنا روزانہ دینے کیلیے لکھا ہے؟

منشی جی " ڈھائی ہزار روپیہ روزانہ "

وکیل صاحب " اور کتنے دن قیام کرنا ہوگا؟"

منشی جی " کم از کم ایک ہفتہ "

وکیل صاحب مسکرا کر بولے۔ تو پھر ابکی اندور سے واپسی پر تو چھ لاکھ پورے ہوجایں گے۔ کیوں منشی جی؟"

منشی جی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے " انشاءاللہ ضرور!"

اور وکیل صاحب کے دل سے وہ چھوٹی سی روتی ہوئی صورت بالکل محو ہوگئی اُسکی جگہ ان کے خزانۂ دل میں زرد وسپید چھوٹے بڑے چمکتے ہوئے سکے تھے۔ اور ان کے کانوں میں انھیں کی مست ومدہوش کرنے والی جھنکار!۔

(۲)

شام کے وقت کچہری سے واپسی پر وکیل صاحب آرام کرسی پر دراز سگار منھ

ہیں دیائے اُس دن کے ''مسلم آؤٹ لک'' معائنہ فرمارہے تھے کہ ماسٹر عبداللہ آئے اور سلام کرکے ایک کرسی کی طرف بڑھے، گو ماسٹر صاحب انکے ہموطن اور ساتھ کے کھیلے اور ساتھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے لیکن زمانہ اور ثروت ایک ذہین گریجویٹ اور ایک معمولی گریجویٹ جنمیں سے ایک صرف ماسٹر ہو کر رہ گیا ہو اور دوسرا وکیل صاحب اور وہ بھی کامیاب وکیل صاحب بن چکا ہو بہت کچھ تفاوت کردیتا ہے پھر اگر وہی ماسٹر وکیل صاحب کے لڑکے کے پڑھانے پر ہی متعین ہو تو اُسکی وقعت تو ایک معمولی نوکر سے کچھ ہی زائد اور ایک جاہل غیر شریف مگر روپیہ والے موکل سے تو یقینی کم ہوتی ہے! یہی وجہ تھی کہ ماسٹر صاحب کے سلام کا جواب تو وکیل صاحب نے کچھ سگار چبا کر ضرور دیا لیکن اس طرح کہ مونچھوں ہی میں اٹک رہا۔

ماسٹر عبداللہ اسکے عادی تھے۔ وہ چپکے ایک کرسی پر بیٹھ رہے وکیل صاحب جب اخبار دیکھ چکے تو بولے :-

آج میاں قیوم نیا رنگ لائے۔ کہتے تھے کہ میں اندور نہ جاؤں۔ اس حماقت کا بھی کوئی جواب ہے!''

''جی ہاں۔ لیکن بچہ ہے۔ تقاضائے فطرت ہے کہ جو کچھ اور گھروں میں ہوتا دیکھتا ہے وہی وہ بھی چاہتا ہے۔ عید۔ بقر عید بھی اگر آپ گھر پر نہ کریں گے تو اسکا دل کیوں نہ دکھیگا؟''

''اچھا تو یہ آپ ہی کی تعلیم کا اثر ہے!''

''جی نہیں عرض کیا نہ کہ یہ مقتضائے فطرت ہے۔ یہ علم قدرت نے خود سکھا دیا ہے''

''تو صاحب ایک ذراسی ضد کی وجہ سے میں ہزاروں روپیہ کا نقصان کرلیتے رہا''

''تو کیا دنیا میں روپیہ ہی محبت کرنے کے قابل شے ہے؟''

''جی میں اسکے متعلق آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا''

"جیسی آپ کی خوشی۔ لیکن اتنا تو کم از کم ضرور ہی کر دیجئے کہ اُسکے لیئے کچھ عید کے کپڑے بنوا دیجئے!"

وکیل صاحب بے توجہی سے آزردہ ہو کر بولے "تو اسکے لیئے منشی جی سے کہیئے وہ انتظام کر دینگے.... !"

ماسٹر عبد اللہ نے دبی زباں رُکتے رُکتے کہا "بہت ... اور... اور.. آپنے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ کپڑے آپ یتیم خانے کے بچوں کے لیئے دینگے..."

"بھئی ماسٹر۔ یار تم پریشان کرتے ہو۔ اب اسوقت پُرانے بکسوں کا کھولنا!.... خیر آئیے"

دونوں صاحبان ساتھ آئے اور اُس حصۂ مکان میں داخل ہوئے جو قیوم کی ماں کی زندگی میں "زنانہ" کہلاتا تھا۔ وہاں ایک اندر کے کمرے میں بہت سے اسٹیل کے چھوٹے بڑے بکس رکھے تھے۔ وکیل صاحب نے ایک ایک کر کے اُن کو کھولنا شروع کیا اور اُنمیں سے استعمال شدہ شیروانیاں قمیصیں۔ کوٹ نکالکر علیحدہ رکھتے گئے۔ دفعتاً ایک مخملی کوٹ اُنھوں نے اُٹھایا۔ دس بارہ برس کے بچے کا معلوم ہوتا تھا۔ جیبوں سے کچھ آواز سی آئی۔ اور اُنھوں نے ہاتھ ڈالکر ایک لٹو چند گولیاں اور پانچ چار پیپرمنٹ کی ٹکیاں نکالیں۔

ماسٹر عبد اللہ نے دیکھا کہ وکیل صاحب کا رنگ زرد ہو گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور وہ ایک مرتبہ تھرّا کر کوٹ گود میں لیئے وہیں بکس پر بیٹھ گئے۔ دیر تک چپکے بیٹھے رہنے کے بعد ماسٹر سے کانپتی ہوئی آواز میں بولے:۔

"ذرا۔ ڈرائیور کے ہاں کہلا بھیجیے کہ موٹر فوراً لائے ... اور قیوم سے کہدیجئے کہ شیروانی پہنکر ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔"

ماسٹر عبد اللہ نے استعجاب سے پوچھا "کیوں خیریت تو ہے؟"

وکیل صاحب نے درد بھری آواز میں زور سے کہا "ارے ٹھہر جاؤ...... میں اسوقت رسول پور جاؤنگا۔

ماسٹر صاحب تھوڑی دیر انکو استعجاب و گھبراہٹ سے دیکھتے رہے اور دو تین مرتبہ انکے لب اسطرح ہلے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن پھر چپکے وہاں سے چلے گئے۔

اور شیخ عبدالرؤف نے اُنکے جاتے ہی اِدھر اُدھر جلدی جلدی دیکھا اور حنیف میرا حنیف! میرا بھائی! کہکر کوٹ کو سمیٹکر کلیجہ سے لگا لیا۔

(۳)

رسول پور کے لوگ کسان پیشہ۔ دن بھر اپنے کام کاج میں منہمک رہنے والے۔ چراغ جلتے ہی ساگ ستو جو کچھ جو کچھ ملتا اُسے کھاکر سو رہتے۔ پھر اب تو شب کے دس بج رہے تھے۔ کالی رات اور تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ سب اپنے دروازے بند کرکے خرّاٹے لے رہے تھے۔ کہ شیخ صاحب کا موٹر گاؤں کی کچی اور کھانچوں سے بھری سڑک پر کیچڑ اور پانی کا مقابلہ کرتا ہوا ہچکولے لیتا ہوا ایک خام مکان کے سامنے آکر رکا۔ شیخ صاحب بیٹے کو ساتھ لیے ہوئے اُترے۔ باہری دروازہ کی جگہ بانس کی کھپچیوں کا ایک ٹٹر سا لگا تھا۔ اسکے اندر داخل ہونے پر ایک کشادہ صحن ملا۔ جسکے آخری حصہ میں ایک دالان اور ایک کمرہ تھا۔ اُسوقت دالان میں ایک مٹی کا چراغ جل رہا تھا جسے ہوا کے جھونکے قبل از وقت چراغ سحری بنائے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک ٹوٹا سا پلنگ۔ ایک جانب بکری کی مینگنیاں پڑی تھیں۔

وکیل صاحب نے کچھ ایک نظر میں دیکھا اور داہنی طرف بڑھے۔ جہاں اندر جانے کا دروازہ تھا اور کنڈی کھٹکھٹاکر "حنیف! حنیف!" پکارے اندر سے کسی بڑھیا کی آواز آئی "کون ہے؟"

انھوں نے گرفتہ اور محجوب آواز میں جواب دیا "میں ہوں عبدالروف!"

کواڑ کھلا اور سامنے ایک ٹھگنی سی بڑھیا چھینٹ کا گھٹنا۔ چوندری کا شلوکہ پہنے اپنے سپید بال ایک میلے سے دوپٹہ سے چھپائے کھڑی دکھائی دی۔ "اور میرا دولال" کہکر چٹ چٹ بلائیں لینے لگی۔ وکیل صاحب کا چہرہ ضبط جذبہ سے سرخی مائل ہوگیا اور سر نہوڑائے کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بولے "بوا حنیف کہاں ہیں؟"

ضعیفہ کی آنکھوں سے آنسو سیلاب کی روانی سے بہ نکلے اور وہ انکا ہاتھ پکڑے ایک دالان میں لیگئی جہاں ایک پلنگ پر ایک لاغر جوان بیہوش پڑا تھا۔ وکیل صاحب "حنیف! حنیف!" چلائے اور پلنگ پر گر پڑے۔ مریض نے آنکھیں کھولدیں اور "بھیا" کہکر دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اور بھائیوں نے ایکدوسرے کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

آنسوؤں کا زور کم ہونے اور گرفتہ آواز پر قابو پانے کے بعد معلوم کہ حنیف کی بیوی نے ایک ماہ کے بیشتر سل کے مرض میں انتقال کیا اور خود حنیف جب ہی سے صاحب فراش ہیں۔ قریہ کے حکیم وویداور آس پاس کے سارے اطبا جواب دے چکے وکیل صاحب اٹھکر کھڑے ہوگئے "میں ابھی سول سرجن کو لاتا ہوں!"

حنیف نے ہاتھ بڑھاکر بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "اب اسوقت نہیں۔ کل صبح" پھر قیوم کی طرف دیکھکر کہنے لگے "یہ میرا قیوم ہے" اور وکیل صاحب کے سر ہلاکر ہاے بھرنے پر اس سے کہا "آؤ بیٹا کلیجہ سے لگ جاؤ"

دیر تک اسے چھاتی سے لگائے رہے۔ اور وہ بچہ سسکیاں لیتا رہا وکیل صاحب نے دایہ سے پلٹکر پوچھا "ارے غنی کہاں ہے؟" معلوم ہوا وہ دس برس کی جان تین راتوں سے سویا نہیں تھا آج تھک کر پڑگیا اور آنکھ لگ گئی ہے۔ قیوم کو حکم ملا تو اپنے بھائی کے پاس جاکر سو رہو۔ دایہ اور قیوم ادھر گئے اور ادھر

شیخ عبدالرؤف نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حنیف! حنیف! میرا قصور معاف کردو۔ تمہاری یہ حالت ہوگئی اور میں نے خبر نہ لی!"

حنیف نے لرز کر کہا "بھائی جان مجھے گنہگار نہ بنایئے۔ قصور میرا تھا۔ میں نادم و شرمسار ہوں" اور رونے لگے۔ رؤف بولے "میاں رو ؤنہیں۔ کلیجہ کے ٹکڑے ہوتے ہیں!"

حنیف نے ایک پوست استخواں ہاتھ سے آنسو پونچھے اور اٹھنے کی کوشش کی۔ بڑے بھائی نے سرہانے بیٹھکر اپنے ماں جائے کو گود میں لیلیا۔ اسوقت دو دل ایک ہورہے تھے اور محبت کی ایک برقی لہر دونوں سینوں میں ایک ساتھ دوڑ رہی تھی۔ پرانے دکھڑے پچھلی باتیں دہرائی جانے لگیں۔ بچپنے کے اذکار تھے اور ایک دوسرے کی محبت کے ثبوت میں پرانی سرگذشتیں بیاں ہورہی تھیں"

وکیل صاحب نے کہا "حنیف تمھیں وہ دن یاد ہے جب ابّا نے ہم دونوں کو ایک ایک لٹو شہر سے خرید کے لاکر دیا تھا؟ ایک سُرخ اور دوسرا سفید۔ سُرخ اسمیں سے خوبصورت تھا اور ہم دونوں اس پر مچلے تھے کہ اسی کو لیں گے۔ ابّا نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ "رؤ تو بڑا ہے" تمھیں سُرخ لٹو دلوادیا تھا اور میں اپنے کمرے میں مُنہ لپیٹے پلنگ پر پڑا رورہا تھا کہ تم نے آکر اپنی چھوٹی چھوٹی باہیں میرے گلے میں ڈالدی تھیں اور سبز و سرخ دونوں لٹو مجھے دیئے تھے! ...... آج وہ لٹو مجھے اپنے پرانے مخملی کوٹ میں ملا"

"اور بھائی جان آپ کو یاد ہے کہ جب کبھی شلغم کا سالن گھر میں پکتا تھا تو ابّا دو ایک قاشیں اسکی نکال کر میری اور آپ کی طشتریوں میں رکھدیتے تھے اور گو مجھے متلی آنے لگتی تھی لیکن میں مارے ڈر کے کچھ نہ کہتا تھا۔ بلکہ آنکھ بچا کر آپ کی طرف بڑھا دیتا اور گو آپ بھی شلغم سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن میرا حصہ چپکے سے ضرور کھا ڈالتے ....."

"..... اور حنیف ہم تم تو جو گولیاں کھیلا کرتے تھے وہ بھی آج اسی جیب میں ملیں -
اور وہ پیپر منٹ کی ٹکیاں جو میں نے تم سے چھین لی تھیں اور مارے غصہ کے خود بھی نہیں کھائی تھیں ! "

غرض اُمڈے ہوئے دل تھے اور بھرائی ہوئی آوازیں اور محبت و اُخوت کے فسانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور کوشش اسکی تھی کہ اپنی فروگذاشتوں کا ذکر ہو اور دوسرے کے اظہارِ خلوص کے مواقع دہرائے جائیں کہ دفعتہً حنیف کو بڑی شدید کھانسی آئی اور کف کے ساتھ بہت سا خون! عبدالرؤف نے انھیں اور گود میں سمیٹ لیا - اور اُنکے چہرے کا رنگ دیکھکر اِن کا کلیجہ مُنھ کو آنے لگا - اسلیے کہ حنیف کی پیشانی اور ننھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلک رہے تھے اور سارے چہرے میں ایک بوند بھی لہو کی باقی نہ تھی گلے میں خرخراہٹ اور آنکھوں میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی ، .... لیکن لبوں پر مسکراہٹ تھی اور مُنھ سے آواز نکل رہی تھی -

"بھائی جان دیکھیے سامنے ابا اماں کھڑے ہیں ... ابا اماں ... اماں ...... عید کا جوڑا ... میرے لیے سُرخ حریر کا ... لیے ہیں ... اچھا - اچھا میں پہنونگا ... لیکن غنی کے لیے ؟ ... ہاں غنی کے لیے ؟ ... ارے وہ دیکھیے ... اسکی ماں ... شکایت کر رہی ہیں ! ... ہاں ... ہاں ... بھائی جان ... ہیں ... اچھا بھائی جان ... غنی ... میرا غنی ... آپ کے سپرد ! ... ابا کہتے ہیں ... اماں کا ... اصرار ہے ... آغوشِ محبت ... پھیلائے ... کھڑی ہیں ... مجھکو بلا رہی ہیں بھائی جان ... بھائی جان ... مجھے ... چھو ... چھوڑ ... دی ... دیکھیے ...

آ ... آیا ... ام ... ہاں ... میری ... ام ... ماں ... آ ... آ ... یا ! ! "

دونوں ہاتھ پھیلے - ٹانگیں سکڑیں پھر دفعتہً گردن ڈھل گئی اور اعضا خود بخود ڈھیلے ہو گئے .... اور پھر ایک خاک کا پتلا قبلہ رو لٹایا ہوا تھا جس میں وہ حرارت نہ تھی جسے روح کہتے ہیں !

..... اور گھر میں "حنیف! حنیف! ہائے ۔ حنیف" پکار پکار کر رونے والا بھائی تھا ۔ ایک نیم بسمل دایہ تھی جسے اپنے گود میں ایک ہمکتا ۔ ہنستا کھیلتا شیرخوار یاد آ آکر دل مسوستا اور جگر کے ٹکڑے کرتا تھا ۔ وہ بلکتے تڑپتے صغیرسن تھے اور اندھیری رات کے سناٹے میں بھیانک صورتیں اور ڈراؤنے خیالات تھے ۔

(۴)

ایک دن بیچ کر کے عید ہوئی ۔ نئے جوڑے جو ایک ہی دن میں تیار ہوئے تھے غنی اور قیوم کو پہنائے گئے ۔ آگے آگے وکیل صاحب اور ماسٹر عبداللہ اُن کے پیچھے دونوں بچے اور سب کے بعد دو ملازم یوں عیدگاہ آئے ۔ قصبہ کے مسلمانوں کا ہجوم تھا اور ہر شخص ان سے واقف ۔ صدر میں جگہ ملی بلکہ سب کے اصرار سے وکیل صاحب نے نماز پڑھائی ۔ اور خطبہ پڑھنے کے لئے ممبر پر عصا پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے ۔ رسمی خطبہ کے بعد بولے "مسلمانو! میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ واعظ بلکہ آپ حضرات سے کہیں زیادہ گنہگار بندہ ۔ اس رب ذوالجلال کا جسے ہم مسلمان واحد جانتے ہیں ۔ میری داستان غم سے آپ حضرات واقف ہیں لیکن جو لوگ کہ نہ جانتے ہونگے اُن کے لیئے عجب نہیں کہ عبرت آموز ہو ..... دنیا کے لالچ اور علم دینی کی طرف سے ناتوجہی نے مجھے بھائی سے جدا کیا ۔ فلسفہ حماقت نے آباؤ اجداد کے طور طریق ترک کرائے ۔ زبان سے اشہدان لاالہ الا اللہ کا ضرور مقر تھا لیکن دل میں حضرت زر کو قاضی الحاجات سمجھا بیٹھا تھا ۔ نماز روزہ ۔ زکواۃ خمس سب کچھ بھول بیٹھا تھا ۔ بیٹی کے مرنے ۔ بیوی کی جدائی نے آنکھ نہ کھولی ۔ پرسوں حنیف میرے چھوٹے بھائی حنیف نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا ۔ خدا کی طرف سے یہ میرے گناہوں کا بدلا ہے ..... میں آپ سب حضرات کے سامنے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی جائداد غیر منقولہ ان دونوں بچوں قیوم و غنی کے

درمیان برابر تقسیم کردی اور میرے بعد مال متروکہ میں یہ برابر کے شریک ہوں سے
آپ بھی اس کاغذ پر دستخط کردیں!"

پاک دل مسلمانوں کا مجمع تھا اور ایک غیور کا انکسار جنکی آنکھیں نم نہ تھیں۔
اُن کی گردنیں ضرور خمیدہ تھیں۔ رجسٹری کیا ہوا ہبہ نامہ ہاتھوں ہاتھ گھمایا گیا
اور سب پڑھے لکھوں نے اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

وکیل صاحب نے عینک اُتار کر آنکھیں پونچھیں اور کانپتی آواز سے پھر
بولے :۔

"اور میں نے آپ کے اور اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس قریہ میں ایک
انگریزی اسکول جو قومیت اور مذہبیت دونوں پیدا کرے کھولنے کا مصمم ارادہ
کرلیا ہے اور اس کام کے لیے پانچ لاکھ روپیہ وقف کر دیا ہے!"......

نمازی جوش مسرت سے بیکبار اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس جھجکتے ہوئے تائب
کے قدم لینے کو بڑھے۔ کہ ماسٹر عبداللہ لپک کر وکیل صاحب سے چمٹ گئے اور
مجمع کی طرف پلٹ کر بولے :۔

"مسلمانو! پڑھو درود شریف!.... اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد!"

بہ آواز بلند ایک بار درود شریف!

غزل

از

عالیجناب پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب ایم اے صدر اردو ڈپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی

گر حسن جنوں افزا میں رنگِ وفا ہوتا — بستی نہ اُجڑ جاتی جنگل نہ بسا ہوتا
وہ ساتھ مری میت کے دو ہی قدم چلتے — کچھ دیر تہہ و بالا عالم تو ہوا ہوتا
اک ڈھنگ پہ گر اپنی طاعت اُنھیں خوش آتی — پھر شیخ و برہمن میں جھگڑا نہ پڑا ہوتا
تم اپنی نقابِ رخ اِکدن تو اُٹھا دیتے — دنیا میں اگر محشر ہوتا بھی تو کیا ہوتا
گر چاہتے وہ خود بھی کوئی انھیں پہچانے — ہنگامِ نظارہ کیوں ہر جلوہ نیا ہوتا
دو باتوں کی خواہش ہے بیمار محبت کو — یا دیکھتے وہ آکر یا درد سوا ہوتا
کیونکر کہوں خوش ہوتا غم دوست ہوں مدت سے — کیا رنج نہ ہوتا جب غم دل سے جدا ہوتا
ہوتا نہ مقابل گر تیرے خمِ ابرو کے — کاہیکو ہلال اتنا انگشت نما ہوتا
سودائی کو ہاتھوں سے گر طوق پنہا دیتے — پھر دیکھتے اک عالم دیوانہ بنا ہوتا
پنہاں ہیں حجابوں میں اُس پر تو یہ عالم ہے — ظاہر جو کہیں ہوتے کیا جانیے کیا ہوتا
گر گر کے نقاب اُٹھتی تھم تھم کے نظر پڑتی — رک رک کے نکلتا دم رہ رہ کے فنا ہوتا

سن لیتا اگر ضامن میرا کوئی افسانہ
دنیا سے محبت کا پھر نام مٹا ہوتا

کتب بغرض ریویو

ہمارے پاس ذیل کی کتابیں بغرض ریویو وصول ہوئی ہیں جنکی رسید شکریہ کے ساتھ پیش کی جاتی ہے عنقریب ان پر مفصل ریویو کیا جائے گا۔

آئین اردو۔ مؤلفہ مولوی زین العابدین صاحب فرجاد۔ نامی پریس میرٹھ۔ ۸ر

مرآۃ الشعر۔ مصنفہ مولوی عبدالرحمن صاحب۔ پروفیسر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی۔ ۷ر

ابتدائے طبیعات حصہ اول خواص المادہ مولوی منہاج الدین صاحب ایم۔ ایس سی۔ اسلامیہ کالج پشاور ۷ر

〃 〃 〃 دوم علم الحرارت 〃 〃 〃 〃 〃 ۶ر

〃 〃 〃 سوم علم حفظ صحت 〃 〃 〃 〃 〃 ۸ر

مبادی الطبیعات یا مطالعہ فطرت۔ 〃 〃 〃 ۶ر

ہیئت جدید حصہ اول مؤلفہ مولوی منہاج الدین صاحب۔ ایم۔ ایس سی و مولوی برکت علی صاحب۔ ایم اے اسلامیہ کالج پشاور

مجلد ۱۲ر غیر مجلد ۱۱ر

〃 〃 حصہ دوم 〃 〃 〃 〃 ۱۲ر 〃 ۸ر

〃 〃 حصہ سوم 〃 〃 〃 〃 ۱۲ر 〃 ۸ر

زینت آسمان یعنی ستارے 〃 〃 〃 ۸ر

انتخاب غزلیات ذوق معہ موازنہ ذوق و غالب مؤلفہ آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ

الہ آباد۔ نظامی پریس بدایوں ۸ر

قصائد ذوق معہ دیباچہ و فرہنگ 〃 نظامی پریس بدایوں ۸ر

معاون شعراء یعنی گنجینہ قوافی۔ مرتبہ جناب یوسف صاحب گجرات، پنجاب ۸ر

طبی فارماکوپیا۔ جلد اول مرتبہ زبدۃ الحکما حکیم محمد حسن صاحب قریشی پرنسپل طبیہ کالج ایگزامنر پنجاب یونیورسٹی لاہور

پتہ = ناظم صاحب کتبخانہ مشیر الاطبا حویلی کابلی مل لاہور ۲ر

نامورانِ سائنس مترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ کلکتہ ۱۰ر

تسخیر قدرت۔ مترجمہ پروفیسر عبدالقادر صاحب اسلامیہ کالج لاہور 〃 〃 ۱۲ر

منیجر شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ

جلد ۵	فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۲۷ء	نمبر ۵ و ۶

شبیہ { آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم۔اے۔ ال ال۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا۔ جج ہائی کورٹ۔ الہ آباد۔

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کیلئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا۔ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر خدمت ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کیجائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری کا شوق ہے تو

جون ۱۹۲۷ء تک جو افسانہ وصول ہوگا اُسکے معاوضہ میں شمع چھ ماہ تک مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک وہ شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اُسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپ کو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے بعد اشاعت اُسکی بیس کاپیاں مفت حاضر کیجائینگی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپکی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا۔

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اُسپر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائیگا

واضح رہے

جو مضمون، فسانہ، ناول، نظم یا غزل، ناپسند ہوگی وہ ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس کردیجائیگی البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے باحتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں، شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپ کا کلام شائع ہوگا، بلا لحاظ اسکے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جائیگا

مطبوعات جدید

جو ۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، اُن پر دو انعامات ہیں۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائے گا جو بہترین کتاب بھیجیں گے۔

(۲) انعام حسب تجویز کمیٹی اُنکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائینگے۔

خادم منیجر شمع

شمع

مئی و جون ۱۹۲۷ء

تاریخ کا ایک بوسیدہ ورق (جونپور)

از

جناب سید علی ضامن صاحب ترمذی بی۔ اے

شہر جونپور گومتی ندی کے کنارے اب ایک اُجڑا ہوا مقام ہے دو سو برس پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا علمی مرکز اور مغلیہ بادشاہوں کا سرمایہ ناز و "شیراز ہند" تھا۔ وہی آج آبادی اور زندہ دلی کے لحاظ سے ایسی بستی جہالت اور گمنامی میں پڑا ہوا ہے

کہ تاریخ نہ جاننے والے کے لئے ایک ادنیٰ سی بستی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا مگر اس عالم میں بھی اُسکی عالیشان عمارتیں جنھیں پتھروں کا پہاڑ کہنا نازیبا نہ ہوگا سیاحوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں جن کے در و دیوار کا جلالت خیز سکوت اگوشہ عظمت کی داستانیں دوہراتا ہے ان مٹی ہوئی عمارتوں کے سوا اب کوئی شے ایسی نہیں رہگئی جس سے یہاں کے پچھلے عروج کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مگر اس شہر کی بڑی حق تلفی ہوگی اگر کھوتے ہوئے زمانے کو یہاں کی عبرت خیز حالت یاد نہ دلائی جائے یہ شہر نہ صرف مسلمانوں کے زمانہ میں بلکہ ہندوؤں کے دور میں بھی نمودار مقام تھا جس کی جھلک تاریخی صفحوں کے گوشوں میں کہیں کہیں ملجاتی ہے۔

عام خیالوں میں یہ غلطی جمی ہوئی ہے کہ جونپور فیروز شاہ تغلق کا بسایا ہوا شہر ہے لیکن تاریخ کی چھان بین کرنے والوں کی نظر پچھلے دوروں میں دور تک جاتی ہے۔ فیروز شاہ کے وقت میں یہاں آبادی موجود تھی اور ہندوؤں کے زمانے کی کچھ کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں بھی رہگئی تھیں۔ شہر کا پرانا نام یونا پور یا جونا پور بھی غالبًا زبانوں پر چلا جاتا تھا۔ یہ بستی کاشی اور اجودھیا کی پرانی شاہراہ پر ہونے سے آتے جاتے جاتریوں کے لئے پڑاؤ کی جگہ تھی جو کہ مُکت گھاٹ (متصل محلہ سپاہ) پر اشنان کرکے پوتر ہوتے تھے۔ یہ راہ شمالی ہند میں بہت پُرانی سڑک تھی۔ یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ یہ شہر پہلے پہل کب بسایا گیا۔ لیکن اتنا کھوج ملتا ہے کہ فیروز تغلق کے ہاتھوں اسکی آبادی کی تیسری بہار تھی (مقالات خضریہ قلمی) تاریخ ابھی تک اسے تحقیق نہ کرسکی کہ پچھلے دو بار کب اور کس کے ذریعہ سے اس کو رونق ملی۔ مگر اس میں شبہہ نہیں کہ اسکی ابتدائی بنا افسانوی عہد میں پڑی جو اب سے تین ہزار برس پہلے ہے۔۔۔

حال کے فلسفی تاریخ دانوں نے ہندوستان کی تاریخ کو دو مختلف حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ زمانہ کہ جب تک یونانی حکیموں کی طرح ہندوستان میں بھی علم و حکمت کی تعلیم کا سلسلہ زبانی اور دل و دماغ تک محدود تھا۔ کتاب اور لکھائی کی محتاجی کو سبک نگاہ

سے دیکھتے تھے ۔ انسانی سینہ کتب خانہ اور دل کے صفحے کتاب تھے جن پر سننے کی قوت قلم کشی کرتی تھی (اسے اصطلاح میں طرز اصلا کہتے ہیں) ہندوستان میں بھی اسوقت تک لکھنے کا رواج نہ تھا اور نہ واقعات کو تاریخ اور سنہ کے قید سے منضبط رکھا جاتا تھا۔ علمی مضامین ہوں یا واقعات زیادہ تر نظم کی صورت میں ہوتے تھے (تاکہ یاد رکھنے میں آسانی ہو) اور دانش والے طبقوں کی زبانوں پر سلسلہ وار چلے آتے تھے اسلیے اس زمانہ کو افسانوی عہد (اپیکل پیریڈ) کہتے ہیں ۔ چنانچہ رامائن اور مہابھارت نظم کی صورت میں اُسی عہد کی یادگاریں ہیں جن کے اشلوک کو زبانی یاد کرنے کا رواج آج تک پنڈتوں میں باقی ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان بہت سادہ مگر پاکیزہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ جو نہایت عاقلانہ اصول پر قائم تھی ۔ ضروریات زندگی کے پھیلاؤ سے محتاجیوں کا بڑھانا بہت برا سمجھا جاتا تھا ۔ اسکے بعد جب ملک نے تمدنی ترقی کی طرف قدم بڑھائے یا دوسرے لفظوں میں آزاد فطرت انسان محتاجی کے جنجالوں میں الجھا تو اور بکھیڑوں کے ساتھ پوتھیوں کی تھیاں بھی بندھنے لگیں اور قلم کاغذ کے صفحوں پر دوڑنے لگا ۔ علم دل کے صفحوں سے کاغذی سطح پر اُترا اور اشرف المخلوقات انسان درختوں کے پتوں (بھوج پتی) چھالوں یا سڑے ہوئے مسالوں (کاغذ) کا دست نگر بنا ۔ واقعات بھی سنہ اور تاریخ کی جکڑ بند میں آنے لگے اور یہیں سے تاریخ عہد (ہسٹاریکل پیریڈ) شروع ہوا ۔ یہ طرز اصطلاح میں طرز انشا کہلاتا ہے ۔

افسانوی عہد کے جو حالات ملتے ہیں وہ بہت اجمالی ہیں اسلیے اُسوقت کی کوئی بات پوری پوری نہیں معلوم ہوتی محض کچھ معاشرتی (سوشل) اور تمدنی کیفیت یا کسی بات کے ہونے نہونے کا اندازہ ملتا ہے زبانی روایات سے جونپور کا تعلق رامائن (کرار کوٹ کی لڑائی کا افسانہ جہاں اب قلعہ ہے اور کرار بیر کا رام چندر جی کے ہاتھ سے مارا جانا) اور مہابھارت دونوں سے معلوم ہوتا ہے ۔ جو واقعات

بیان کیئے جاتے ہیں خواہ وہ اصلی ہوں یا استعاری (الیگاریکل) لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ اُس وقت جونپور کا وجود تھا خواہ وہ کیسی ہی ابتدائی حالت میں ہو۔ افسانوی عہد پر گمنگی کا دھندھلکا چھایا ہوا ہے اسلیے مدت کا صحیح اندازہ ہونا ممکن نہیں۔ ہاں صرف اس قدر کہ تین ہزار برس سے پہلے کے واقعات ہیں۔ ہری ونسا میں جو مہابھارت کا ضمیمہ ہے یونندرپور نامی بستی کا ذکر ہے جس کے بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جونپور کا قدیمی نام ہے جو آگے بڑھکر کسی صورت سے یوناپور ہوا اور یہ نام ہندوؤں کے اخیر زمانہ تک قائم رہا۔ بلکہ غالباً اسلامی عہد کے ابتدائی دو سو برس تک بھی جاری رہا۔ جب کہ یہ مقام گمنامی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

دوسری آبادی اس شہر کی کب ظہور میں آئی تاریخیں کچھ نہیں بتاتیں لیکن اگلے پچھلے حالات کو سوچنے کے بعد میرا ذاتی قیاس ہے کہ غالباً کشن بنسی راجاؤں کے زمانے میں جب کہ بودھ پنتھ کا اثر سارے ہندوستان پر چھایا ہوا تھا اس مرجھائے باغ میں دوسری بہار آئی۔

کشن بنسی ساکا یا تورانی قوم کے باہر سے آنے والے اجنبی تھے جنکا دور دورہ ہندوستان میں پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ پرومش پور (پیشاور) اُنکی راجدھانی تھی اور اوتر کھنڈ (شمالی ہند) میں اُنکی عملداری بہار (مگدہ دیس) تک تھی۔ راجہ کنشک گھرانے کا نامور مکٹ دھاری (تاجدار) تھا جو نہ فقط ہندوستان کا سوامی (مالک) تھا بلکہ اُسکی ملکی سیواے ایران توران اور چین سے ملے ہوئے تھے یہ سب کے سب بودھ پنتھی تھے اور اُنھوں نے اپنا پنتھ ہندوستان سے باہر بہت پھیلایا ایسے باہر سے آنے والوں اجنبیوں کو سنسکرت میں یونا کے نام سے پکارا گیا ہے اسی زمانہ میں سنگی تعمیرات کا مذاق ہندوستان میں پھیلا اور سنگ تراشی کا فن کمال کو پہونچا بودھ پنتھ اور جین پنتھ کے درمیان (جو ہندو دھرم کو دباتے ہوئے ساتھ ساتھ

بڑھ رہے تھے) مذہبی بستیاں بسانے اور عمدہ عمارتیں بنانے کی لاگ ڈانٹ چلی جس نے ہندوستان کے فن تعمیر کو چار چاند لگا دیے۔ جونپور کی پرانی عمارتوں میں بودھ پنتھ کی تعمیری نشانیاں کھلی کھلی موجود ہیں اور اس عہد کے خاص نقش و نگار اور کندہ کاری عمارتوں کے پتھروں میں نمودار ہیں حال میں موضع پچپلیا کے قریب کچھ عمدہ مورتیاں جینی پنتھ کی بھی ایک کھیت سے برآمد ہوئی ہیں کہ آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کی تھیں جو بنارس گئیں۔ اس لیے جونپور کی دوسری بنا بودھ پنتھی دور سے متعلق ہونے کا خیال بیجا نہیں ممکن ہے کہ اسی سلسلہ میں کشن بنسیوں کے اثر سے اسکا نام یونا پور رہا ہو۔

آٹھویں صدی عیسوی سے راجپوت ابھرنے لگے جنھوں نے بودھ پنتھیوں کا ہندوستان میں ستھراؤ کر دیا۔ اور ان کے سنگرموں (عبادت خانوں) اور وہاروں (خانقاہوں) کو مندر اور شیوالا بنا ڈالا۔ جونپور میں اٹل دیوی کا مندر پہلے بودھ پنتھ کا وہار تھا جسے راجہ بجے چند رگھوار قنوج والے نے مندر بنایا۔ اس عمارت کے نقش و نگار بودھ پنتھ کے طرز تعمیر کی دلیل ہیں جیسا نمودار ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر فہرر نے (شرقی آرکیٹکچر آف جونپور۔ تعمیرات شرقیہ جونپور) میں لکھا ہے۔ یہی عمارتیں کہنگی اور موسم کے جھٹکے اٹھا کر اور خود بخود مٹ مٹا کر اسلامی زمانے میں جو لا بدلنے پر مسجدیں بن گئیں۔ اور موجودہ زمانے کے مصلحت نگار مورخوں نے کہنگی۔ فرسودگی۔ موسمی تصرفات۔ بارش کی چیرہ دستیاں۔ بے عزتی اور بے توجہی کے نقصانات زمانہ کے تغیرات سب کا الزام صرف مسلمانوں کے سر ڈال دیا ہے سلطان فیروز تغلق نے بنگال کی مہم پر جاتے ہوئے یہاں کی خوش سوادی پر فریفتہ ہو کر جب نیا شہر بسانا چاہا تو پرانی آبادی بیمراج پور (دریا کنارے جنوبی حد) سے خاص حوض تک موجود تھی۔ قدیم آبادی کا اندازہ پرانی عمارتوں کے موقع اور محل پر ہو سکتا ہے (جنکا تاریخوں سے پتہ ملتا ہے) غور کرنے سے اچھی طرح ہو سکتا ہے۔

چاچک پور (محلہ سیاہ) میں مکمت گھاٹ پر راجہ بجے چندر کا مندر تھا جہاں
جھنجھری مسجد ہے۔ اس سے آگے تقریبًا میل بھر پچھم کو دریا کنارے کرار کوٹ تھی جسے
اب قلعہ کہتے ہیں۔ لیکن محلہ اب بھی کرار کوٹ ہی کہلاتا ہے۔ پھر کچھ اور آگے تقریبًا ڈیڑھ
میل پر جس جگہ ندی کا بہاؤ مڑ گیا ہے (پورب پچھم سے اتر دکھن ہو گیا ہے) اونچے
ٹیکری پر راجہ بجے چندر کا راج بھون (شاہی محل) جو ہندوؤں کے وقت میں بجے منڈل
اور مسلمانوں کے زمانے میں بدیع منزل کہلایا گیا۔ یہ بلند اور دلکشا ویرانہ بیراج پور میں
دریا کے گھماؤ سے بنے ہوئے گوشہ پر واقع ہے اور اتنا اونچا ہے کہ وہاں سے تمام شہر زیر نظر
رہتا ہے۔ اب ایک بزرگ کی قبر ہونے سے پیر دکی پکارا جاتا ہے۔ آس پاس دور تک
زمین بہت اونچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ میں کبھی عالیشان عمارتوں
کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ عمارتوں کا اب کوئی نشان نہیں۔ ہاں کہیں کہیں
سیڑھیاں یا بلندی پر ایک فٹ موٹی گچ یا بدررو کے سنگی چوڑے دہانے مٹے ہوئے
محلوں کا سراغ دیتے ہیں۔ یہاں سے پورب آدھ میل پر خالص پور ہے یہاں راجہ
بجے چندر کا دوسرا دیول تھا۔ جہاں اب چار انگل کی بوسیدہ مگر وسیع مسجد (مسجد خالص)
ہے۔ اس جگہ سے اترا اور پورب (دو فرلانگ پر) پرانی بازار کے قریب اس سڑک سے
اوتر جو بارہ ڈوریا کے پہلو سے گذرتی ہے کبھی کو ٹھیا بیر کا استھان یا شیوالہ تھا۔
جسکا پیالہ نما حوض ایک ڈال پتھر کا کھیت میں پڑا ہوا تھا اور حال ہی میں بجلی کے صدمے
سے چور ہو گیا۔ یہاں سے اوتر آدھ میل پر مشہور تالاب راجہ ساگر (خاص حوض) اور
اسی سے ملا ہوا محلہ شاہ گنج کی سڑک کے دوسرے کنارے پر رانی ساگر تھا۔ خاص حوض
کا پرانا نام راجہ ساگر سنا گیا ہے۔ یہ بڑے پھیلاؤ کی بلند سنگی عمارت تصویر کے قابل تھی
چاروں طرف چوکو رحدوں میں اونچی عمارتیں تھیں۔ جسکے بیچ ایک میل کے رقبہ میں لہریں
لیتا ہوا پانی درمیانی جزیرہ نما محل کے دامنوں سے اٹکھیلیاں کرتا تھا ٹیلوں سے

پرانی شان کے آثار اب تک نمایاں ہیں اور قدیم عمارت کا مٹا سا خاکہ باقی ہے ۔ سلطان محمود شرقی نے بدیع منزل چھوڑ کر اس کے پوربی حصے پر اپنا محل سجایا تھا ۔ تالاب کی درستی ہو کر اس کا پانی شاہی مصرف اور عام سیرابی کے لیئے مخصوص ہوا اور پہرے بیٹھے کہ کوئی نہانے دھونے سے گندہ نہ کرے ۔ جب ہی سے یہ خاص حوض کہلایا ۔ (مقالات خضریہ) سکندر لودی میں بربادی کی تمام مشرقی عمارات کے ساتھ یہ بھی تباہی کے لپیٹ میں آگیا ۔ اس کے طرز تعمیر کا خاکہ بندیل کھنڈ کے راجاؤں کی تعمیریت سے میل کھاتا ہے ۔ کلچریا راجپوتوں کا تسلط کچھ دنوں ان پوربی حصوں میں کاشی پر قبضہ کی لالچ سے ہوا تھا اور یہ سب وسط ہند سے پھیلے تھے ۔

عمارتوں کا یہ وسیع سلسلہ ہند عہد کے شہر کی وسعت کا پتہ دیتا ہے ان کے موقع کا لحاظ کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر مسلمانوں کے تسلط سے پہلے کوئی چھوٹا مقام نہ تھا بدقسمتی سے ہندوؤں کے زمانہ میں تاریخی مذاق ایسا بجھا ہوا تھا کہ اسوقت کی معدوم حالت پر تاریخیں آجتک سوگوار ہیں تاہم تعمیری طرز کے مشاہدے اور کچھ اسلامی تاریخوں کی مدد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ہندوؤں کے مختلف عہد کی عمارتیں پچھلے زمانہ میں موجود تھیں ۔ اسمیں نہ صرف ہندو دیکی قدیم عہد کے آثار تھے بلکہ بدھ مذہبی دور اور اسکے پیچھے آنیوالی ہندوؤں کا تازہ دور یعنی گپت بنسی راجاؤں کا زمانہ تھا ۔ (جن کی راجدھانی پہلے پٹنہ پھر اجودھیا اور اوجین میں ہوئی ۔ اس گھرانے کا دوسرا چندر گپت بعض مورخوں کے نزدیک بکرماجیت یا دکراوت کے عرف سے مشہور ہے) چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں اور سب سے آخر راجپوتی دور سب کچھ نہ کچھ اپنی نشانیاں یہاں پر چھوڑ گئے ۔

سلطان معز الدین غوری (جو عام طور پر شہاب الدین غوری مشہور ہے) کے دوسرے حملہ میں راجہ جے چند گھڑوار والی قنوج پہلی شکست چندوار (ضلع آگرہ) کے میدان میں اٹھا کر پیچھے ہٹا اور اپنی پوربی راجدھانی منیچھ یا ظفر آباد (مضافات جونپور) میں ٹھہر کر مغربی سیلاب کو روکنے کیلئے تیار ہو گیا ۔ دوسری لڑائی قطب الدین ایبک سلطانی ہراول سے اسنی کوٹ کے سامنے منیچھ کے میدان میں ہوئی اور یہ خطہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا ۔

... تاریخ فرشتہ ذکر قطب الدین ایبک ۔ چراغ نور تاریخ ظفر آباد قلمی ۔ مناقب درویشیہ ۔

لیکن قطب الدین نے یہاں کی حکومت پھر گھرواروں کو دیدی - اور جیت سنگھ گھروار کہ جے چند کا منتری (وزیر) اور سمبندھی (رشتہ دار تھا) یہاں کا راجہ خراج گذاری کے اقرار پر مقرر ہوا - اُس زمانے سے تغلقوں کے عہد تک (تقریباً دو سو برس) انھیں لوگوں کا راج رہا - اور یہی وجہ ہے کہ اتنے دنوں تک اس حصہ کی تاریخ پر گہری خموشی چھائی ہوئی ملتی ہے - خلجیوں کا چراغ گُل ہونے پر خسرو خاں کی آفت گردی میں منیچہ کا راجہ سکیت سنگھ سرکشی کی ہوا میں اُڑنے لگا - یہاں تک غنیمت تھا - لیکن اُس نے ستم یہ کیا کہ اس جوار سے مسلمانوں کے صاف کرنے پر تل گیا اور ہزاروں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا - اس واقعہ سے ہلچل پڑ گئی - حضرت مخدوم آفتاب ہند سید اسد الدین زیدی (مدفون ظفرآباد) اور مخدوم چراغ ہند[1] شیخ صدر الدین قریشی جو مشرقی حصوں میں دعوت اسلام کی خدمت میں مصروف تھے اس فتنہ کی خبر سُنکر ادھر دوڑ پڑے اور سلطان غیاث الدین تغلق کو اطلاع دیکر دہلی سے بھی مدد منگائی - شہزادہ ظفر خاں (تغلق کا چھوٹا بیٹا) چھ ہزار سوار لیکر دوہری منزلیں مارتا آپہونچا - انتقام آسان تھا - لیکن مخدوم آفتاب ہند اسلامی مشنری اور خانوادہ سیادت کے ستارے تھے اُنھوں نے تلوار کھینچنے سے پہلے تصفیہ پر توجہ کی - یکہ تازی (سنگل کمبیٹ) کے میدان میں جسمانی قوت کے مقابلے اور مناظرے کی بساط پر علمی اور روحانی قوت کے مقابلے پر فیصلہ ٹھہرا - مخدوم نے یہ پیچیدہ معرکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر جیت لیا - انگریزی مورخ اس پُرامن فتح کے ذکر میں انگاروں پر لوٹتے نظر آتے ہیں اور تفرقہ انداز حکمت عملی کے اصول پر بیجا دہانت صرف کر کے انوکھے قیاسات سے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں اور واقعات کو بُرے[2] رنگ میں اچھی طرح رنگا ہے - لیکن آفتاب پر کوئی بھی خاک ڈال سکا ہے

[1] چراغ ہند کا بھی ظفرآباد میں مزار موجود ہے ۱۲ ع [2] تاریخ جونپور جو زیر قلم ہے اسمیں ضلع جونپور کے گزیٹیر نویس کی طباعی پر پوری تنقید کر کے غلط بیانیاں اچھی طرح واضح کی گئی ہیں ۱۲

سکیٹ سنگھ کو باوجود ایسی خونی بغاوت کے ضلع مرزاپور میں جاگیر دیکر ہٹا دیا گیا جہاں اُسکی نسل کے خانزادے ابھی تک موجود ہیں۔ اور یہ خطہ براہ راست مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا۔ کیا ۱۸۵۷ء کے بعد بھی کوئی ایسی مثال ڈھونڈھے سے ملسکتی ہے۔ اسکے بعد تقریباً پچاس برس تک مشرقی صوبہ کا پایۂ حکومت ظفر آباد رہا جو شہزادہ ظفر خاں کے نام پر موسوم ہوا۔

جب ۷۶۰ھ میں سلطان فیروز تغلق بنگالہ کی دوسری مہم پر جاتے ہوئے ظفر آباد میں برسات گذارنے کو ٹھہرا (تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف) تو سرزمین جونپور کے نصیب سوتے سوتے جاگ پڑے۔ بلکہ انگڑائی لیکر اُٹھ بیٹھے۔ غالباً اس وقت کرار کوٹ بھی ویران اور آس پاس کی زمین اُجاڑ پڑی ہوئی تھی جہاں نیا شہر بسانے کی تجویز ہوئی اور پرانی بستی ملاکر ایک کر دیگئی۔ اس شہر کا نیا نام پڑنے کی وجہ کے متعلق بعض مورخ فیروز تغلق کا ایک خواب بیان کرتے ہیں اور جونا خاں عرف سلطان محمد تغلق کا رویا میں نئے شہر کو اپنے نام پر موسوم کرنے کی ہدایت کرنا نقل کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن لطیفہ یہ ہے کہ صاحب تاریخ فیروز شاہی جو ہم عصر مورخ ہیں وہ جونپور کی بنا میں خواب کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ کھلی ہوئی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ پرانا نام یونا پور یا جونا پور (جو سنسکرت کے اصول ہجی کی رو سے دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ جیسے جوگی اور جوگی ایودھیا اور اجودھیا) اتفاق سے محمد تغلق کے اصلی نام (جونا خاں) سے میل کھاتا تھا اس لیئے اُس طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس میں خواب و خیال کی باتوں سے زیادہ شاعرانہ طبیعت کی جودت نظر آتی ہے۔

فیروز تغلق کو سلاطین ہند میں رفاہ عام کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی بہت سے مدرسے۔ کارواں سرائیں۔ شفاخانے۔ پل۔ کنوئیں۔ نہریں۔ شکارگاہیں۔ باغات۔ عمارتیں۔ مسجدیں۔ حمام۔ کئی شہر اور اکثر قلعے اُس کے بنائے اور بسائے ہوئے ہندوستان

میں جابجا موجود ہیں اور اس نقارہ فخر کی آواز کسی طرح نہیں دب سکتی کہ محکمہ آثار قدیمہ (آرکیالوجی) کی بنیاد ڈالنے والا وہی نیک نیت سلطان تھا۔ (فیروز شاہی از سراج عفیف)

دہلی واپس پہونچکر بھی سلطان کو اس نئے شہر کا خیال رہا اور اُسکی آبادی کے لیئے برابر توجہ رہی۔ علم و ہنر والے۔ کمال و فن کے واقف کار صنعت و حرفت کے پیشہ ور۔ ہر قسم کے دستکار ملک کے حصوں سے چن کر نئی آبادی کی رونق بڑھانے کو بھیجے گئے۔ اور انھیں انعام اور وظیفوں سے پوری مدد دیگئی۔ اس طرح بارہ برس کی کوششوں میں یہ شہر کچھ سے کچھ ہوگیا۔ شاہی عمارتیں تیار اور شہر آباد ہونے پر دربار کے خوش فکروں نے تکمیل آبادی کی تاریخ **شہر جون پور** (۷۷۲ھ) سے نکالی۔ اکثر مورخوں نے اسے غلطی سے بنا شہر کی تاریخ سمجھا ہے۔ لیکن جب فیروز کے مہم بنگالہ کے سال پر نظر کی ہے تو گڑ بڑ اٹھ جاتی ہے۔ بڑی عمارتوں کی تیاری اور شہر کے بسنے میں برسوں لگتے ہیں اور بنا و تکمیل کے زمانے میں بہت تفاوت ہوتا ہے۔ اس لیئے ۷۷۲ھ عمارات واور شہر کی تکمیل کی تاریخ ہے جس میں بارہ برس صرف ہو گئے۔

تغلقیہ خاندان کے زوال پر جونپور کی قسمت جگمگا اٹھی۔ شرقی سلاطین کے عہد میں اس شہر کا عروج دوپہر کے سورج کی طرح چمکا۔ اور جس رنگ سے ہر طرح کے کاملوں اور فاضلوں کا ہجوم اِس مشرقی فلک رفعت پر ستاروں کی سی جلوہ گری دکھا گیا وہ عالم دہلی کے سوا دوسرے شہر کو ہند میں نصیب نہوا۔ اِس دور سے یہاں کے حالات گو مجمل سہی مگر تاریخوں میں جابجا نظر آتے ہیں جن کے بعض رخوں کو آئندہ تحریر میں نمایاں کیا جائیگا اور پراگندہ واقعات کو سمیٹ کر دبے ہوئے پہلو ابھار دیے جائیں گے۔

غزل

جناب میرزا ثاقب صاحب لکھنوی جانشین میرؔ و غالبؔ

قہقہے ہم نے سُنے دنیا میں اور فریاد بھی
ایک ہی رستے سے گذرے شاد بھی ناشاد بھی

زندگی ہے گو مٹائے ظلم بھی بیداد بھی
کیونکہ باقی ہیں ابھی آنسو بھی اور فریاد بھی

نام کو عشرت نہیں اور کاروانِ غم ہزار
اِک ہی دل ہے جو ہے آباد بھی برباد بھی

جوششِ گریہ سے پھندے پڑ رہے ہیں حلق میں
میں اسیرِ دام ہوں تو قید ہے فریاد بھی

صبحِ محشر کا سماں ہے ہو گئے اپنے بھی غیر
اُف ری بیہوشی کہ میں بھولا ہوں دل کی یاد بھی

ایک میری گردنِ لاغر کے دشمن سیکڑوں
تیغ آتشبار بھی ہے خنجرِ فولاد بھی

رنگ تصویروں میں کیا ٹھہرے کہ دنیا ہی سراب
مٹ گئی عالم سے شکلِ مانی و بہزاد بھی

آہنی قیدیں تو کٹ جانے کے قابل تھیں مگر
عشق کی بیڑی سے شل ہیں بازوئے حداد بھی

غم بھی تھا گوشہ نشیں فرقت کی شب تھی وہ مہیب
لاکھ چاہا پر نہ نکلی دل سے اک فریاد بھی

گھٹ رہی ہے عمر دنیا بڑھ رہا ہے شوقِ حشر
سب کے آگے آئیگی اک دن مری روداد بھی

کیوں لگا دی آگ میرے دل میں او کافر نژاد
اک تمنا کیا اسی میں تھی خدا کی یاد بھی

آشیاں جس شاخ پر تھا ڈھونڈھتے ہیں اسکو لوگ
ہو گیا پرسش کے قابل خانۂ برباد بھی

یہ حیاداری ہے یا کیا سب تو آئے تھے مگر
حشر کے مجمع میں آیا وہ ستم ایجاد بھی

تنگیٔ دل کے سبب یہ بزم افروزِ جمال
ایک میری یاد کیا بھولی خدا کی یاد بھی

آج مقتل کی زمیں میں حالِ مقتولوں کا دیکھ
کل تو بولے گی زبانِ خنجرِ فولاد بھی

سب نے جانا حالِ دل وہ پاس جس کے دور ہوں
اسکا شاہد میں ہی ہوں ثاقبؔ مری فریاد بھی

آنریبل جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب ال ال ڈی

از

حسن عابد جعفری صاحب آکسن، بیرسٹر ایٹ لا مدیر شمع

ہندوستان کو، اور بالخصوص ہمارے صوبہ کو آنریبل مسٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب ایم۔ اے (کیمبرج) ال، ال، ڈی، بیرسٹر ایٹ لا، جج ہائی کورٹ الہ آباد کی ذات والا صفات پر جس قدر ناز ہے بجا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے مشہور اور ہردلعزیز ہیں۔ اور اگرچہ شرافت اور نجابت کے اعتبار سے اس صوبہ کے نہایت ممتاز خاندان کے رکن ہیں، لیکن اُنکی حیرت انگیز ترقی، اور کامیابی محض اُن کی ذاتی صفات اور قوت بازو کی مرہون منت ہیں۔ اُن کی زندگی ہمارے نوجوانوں کے لیئے روشن مثال، اور بوڑھوں کے لیئے دلچسپ اور مسرت بخش داستان ہے، والدین اپنے بچوں کو، اور اُستاد اپنے شاگردوں کو، اُنکی طالب علمی کے کارنامے ذوق اور شوق سے سُناتے ہیں۔ اور گذشتہ بیس بائیس برس سے اُنکا نام نامی ہمارے صوبے میں ہر لکھے پڑھے آدمی کی نوکِ زباں ہے۔

ممدوح کے والد مولوی عثمان صاحب جون پور کے مشہور وکیل اور رئیس تھے۔ اُن کی ذہانت، اور قانون دانی دور دور تک مشہور تھی، نانا مولوی حافظ عابد حسین صاحب جون پور کے نہایت وضعدار رئیس اور وکیل تھے، اور حسن اخلاق، وضعداری اور مہمان نوازی کے اعتبار سے زمانہ قدیم کی یادگار تھے۔ اخیر عمر تک اُنھوں نے قدیم روش کو نبھایا۔

راقم الحروف کو وہ اور مولوی محمد عثمان صاحب اچھی طرح یاد ہیں۔ اور اب اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو وہ مرقع آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو اسلامی معاشرت، اور انسانی شرافت کا بہترین نمونہ تھا۔

خان بہادر مولوی محمد محسن صاحب ذوالقدر۔ مولوی حافظ عابد حسین صاحب وکیل، مولوی باسط علی صاحب وکیل، خان بہادر محمد کاظم صاحب، مولوی محمد عثمان صاحب۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب رئیس منڈیاہوں، مفتی زین العابدین صاحب، حکیم مولوی مبارک حسین صاحب، مولوی عبدالعلیم صاحب، آسی، و نیز دیگر بزرگوں کے وجود سے جونپور سرسبز اور شاداب بنا ہوا تھا۔ نواب عبدالمجید صاحب بیرسٹر الٰہ آباد میں رہتے تھے مگر جونپور میں بھی اُنکا قیام رہتا تھا، افسوس کہ ہمارے تمدن کی آخری جھلک اِن بزرگوں کے ساتھ جونپور سے رخصت ہوگئی۔ اور اب اُن میں سے ایک ہستی بھی دنیا میں موجود نہیں۔

جونپور صدیوں سے مرکز مشاہیر رہا ہے لیکن زمانے نے اِس ورق کو بھی اُلٹ دیا۔ یعنی

برسوں میں جنکو جمع کیا تھا وہ مر گئے
گویا کبھی جہاں میں نہ تھے، یوں گذر گئے

ڈاکٹر صاحب کی نشو و نما اُس زمانے میں ہوئی جب یہ بزرگ موجود تھے، اور جونپور کے مخصوص گھرانوں میں قدیم تہذیب اور تمدن کا چرچا تھا، چونکہ مولوی حافظ عابد حسین صاحب کے اولاد ذکور میں سے کوئی نہ تھی اِس لیئے اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم و تربیت میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ مرحوم کا خیال تھا کہ اِن کو انگریزی سے بقدر ضرورت واقفیت کرادیجائے اور مذہبی تعلیم دیکر عالم بنایا جائے۔ چنانچہ عربی فارسی اور دینیات پر بہت زور دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب چھوٹی سی عمر میں حافظ قرآن

ہو گئے اور علوم قدیمہ میں بہت جلد خاطر خواہ ترقی کر لی۔ اسی زمانے میں آنکی ذہانت کی تعریفیں ہوتی تھیں، لیکن تقدیر میں وہ مرتبے لکھے ہوئے تھے جن پر آج ڈاکٹر صاحب پہونچکر آسمان شہرت کا درخشندہ ستارہ بنے ہوئے ہیں۔ اس لیئے موصوف نے اپنی مرضی سے علوم انگریزی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور مخالفتوں نے ہمت شکنی کی بجائے ترغیب دی۔ شوق، محنت اور فطری ذہانت نے مساعدت کی نتیجہ یہ ہوا کہ موصوف انٹرنس کے امتحان میں نہ صرف اول درجے میں کامیاب ہوئے بلکہ الہ آباد یونیورسٹی میں شاید چوتھا یا پانچواں نمبر رہا۔ اب اِن کو روکنا بیکار تھا۔ اور وہ میور سنٹرل کالج الہ آباد میں فرسٹ ایر الف۔ اے میں داخل ہوئے۔ اور عربی اُنکی سکینڈ لینگویج رہی۔ ایف۔ اے میں بھی اُنھوں نے اول درجے میں کامیابی حاصل کی اور تمام یونیورسٹی میں دوسرا نمبر رہا۔ پہلا نمبر اُس طالبعلم کا تھا جس نے سائنس لی تھی (دوسرے نمبر پر رہ جانا موصوف کی ذہین طبیعت پر شوق کا تازیانہ ثابت ہوا) اور اُن کے ہاتھوں سے وہ کار نمایاں ہوا جس کی مثال اِس سے قبل یا بعد ہندوستان کی کوئی یونیورسٹی پیش نہ کر سکی۔ یعنی آپ نے اُستادوں کے مشورے کے خلاف بی۔ اے میں ریاضی لے لی۔ اِس موقع پر بھی مخالفت اپنا کرشمہ دکھا کر رہی اور ڈاکٹر صاحب بی۔ اے کے امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اول آئے۔ ریاضی میں ممتاز ہوئے۔ کاکس میڈل حاصل کیا۔ اور سرکاری وظیفہ سے انگلستان تشریف لے گئے۔ خیال تھا کہ سول سروس کا امتحان دین گے اور اعزا اور احباب کا بھی یہی تقاضہ تھا۔ مگر انگلستان پہونچکر موصوف نے سول سروس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ کیمبرج سے بی۔ اے کیا اور لندن سے بیرسٹری کی اور ڈبلن سے ال۔ ال۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں۔ اپنا وقت اُن علوم اور فنون کی تحصیل میں صرف کیا۔ جو بعد کو اُن کے پیشے یعنی بیرسٹری میں مفید ثابت ہوئے، چنانچہ معاملہ فہمی، خوش بیانی، قانونی لیاقت، نظایر پر عبور، فطری

ذہانت، اور سخت محنت، وہ مخصوص صفات تھیں جو اُن کو بہت جلد پبلک کے سامنے لے آئیں اور اُنکی وسعت اخلاق، اور ذاتی شرافت اور رواداری نے نہایت قلیل عرصہ میں اُنکو پیشہ میں کامیاب بنا دیا۔ اور وہ بہت جلد الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہو گئے۔ اس کم عمری میں اب تک کوئی ہندوستانی ہائی کورٹ کا جج نہیں ہوا۔ اور اس وقت بھی وہ ہندوستان میں سب سے کم عمر ہائیکورٹ کے جج ہیں۔

بیرسٹری کا زمانہ موصوف کے انتہائی انہماک کا زمانہ رہا ہے۔ اور اب بھی اِن کو سخت دماغی محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن ذوق علمی، اور کتب بینی نے کبھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جو لوگ ڈاکٹر صاحب کے طالبعلمی کے کارناموں سے واقف ہیں یا جنھوں نے الہ آباد میں وکالت کی منہمک زندگی میں اُن کو بدل و جان منہمک دیکھا ہے اور جو اُنکو ہائی کورٹ کی ججی کی کرسی پر متمکن دیکھتے ہیں۔ یا اُن کے عالمانہ قانونی فیصلہ جات کو پڑھتے ہیں وہ یہ معلوم کر کے حیرت میں رہجائیں گے کہ موصوف اُردو کے زبردست حامی اور ادیب ہیں، اُن کو ادب اُردو پر حیرت انگیز دسترس ہے، وہ اُردو شاعری کے سچے دلدادہ ہیں، اور صحیح معنیوں میں بے مثل نقاد ہیں، اُن کے کتب خانہ میں پندرہ سو شعرا کے دیوان موجود ہیں۔ اور اُنھوں نے حال میں خاقانی ہند ذوق مرحوم دہلوی کے قصائد، اور اُنکی غزلیات کو دو جلدوں میں ترتیب دیکر خوش ذوقی، وسعت نظر کثرت مطالعہ ادبی نقادی، اور جوہر شناسی کا ایسا دل آویز اور مسرت بخش ثبوت دیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنی پڑتی ہے۔ دونوں جلدیں نظامی پریس بدایوں میں نہایت سلیقہ سے چھپ کر شایع ہو چکی ہیں اور ہمارے پیش نظر ہیں۔ دور جدید کی ادبی کرامات نے خاقانی ہند کو مردود بنا دیا تھا۔ اور نئی اُمت کے بعض نقاد اُن کو شاعر تک نہ مانتے تھے۔ غالب مرحوم کی کورانہ پرستاری، اور ادب اُردو کی ناشناسی کی اِس سے زیادہ حسرتناک مثال نہ ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اخلاقی جرأت، اور نقادانہ

ہمت کو بروئے کار لاکر ذوق مرحوم کی حمایت میں ادب اُردو کی قابل قدر خدمت کی۔ اور مرحوم کو اس گمنامی سے بچا لیا۔ جو تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کی بدولت اس یگانۂ روزگار شاعر کے نصیب میں آچلی تھی۔ ذوق مرحوم کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی اُسکو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختصر اور مؤثر دیباچوں کے ذریعہ سے نہایت صفائی اور خوبصورتی سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم نہ غالب کے وکیل ہیں اور نہ ذوق کے طرفدار، لیکن انصاف پسندی، اور حق بینی تنقید کی روح، اور ادب کی جان ہیں۔ ان سے منھ پھیرنا، اور کسی صاحب کمال کو مردود بنا دینا، فنِ تنقید میں گناہ عظیم ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اساتذہ کے سلسلۂ کلام کی اشاعت کا تہیہ فرمالیا ہے۔ قصائد ذوق اور انتخاب غزلیات ذوق اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ قصائد ذوق میں دس صفحوں کا دیباچہ ہے جس میں اُستاد ذوق کے سوانحی حالات، انتخاب کلام۔ ترتیب کلام وغیرہ پر مجمل بحث ہے۔ مختصر تنقید بھی ہے، قصائد کے ساتھ نامکمل مثنوی، اور قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں۔ اخیر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ ہے۔ تمہید میں قابل مؤلف نے وجہ تالیف بیان فرمائی ہے کہ "نوجوانانِ قوم کو جو اکثر ادب اُردو سے ناآشنا ہوتے ہیں یہ موقع ہاتھ آئے کہ اُردو شاعری کے ایک مستند اُستاد کے کلام کو نئے لباس میں ملبوس دیکھکر اس کے مطالعہ کی طرف مائل ہوں اور اُسکی نازک خیالی، فصاحت اور بلاغت سے لطف اُٹھائیں اور معلوم کریں کہ ہماری فراموش کردہ زبان میں کیسے کیسے جوہر موجود ہیں"، یہ خیال بجائے خود قابل توصیف ہے، اور ہم خوش ہیں کہ موصوف نے ایک رقم علیحدہ کردی ہے جس میں وہ حسب ضرورت اضافہ کرتے رہینگے اور اُسی سرمایہ سے اساتذہ کے کلام کی اشاعت ہوتی رہے گی۔

ذوق کے قصائد کو پڑھکر بعض انگریزی خواں نوجوان جیں بہ جبیں ہوں گے انکو

چاہیے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ذیل کے الفاظ کو غور سے پڑھیں "اور قصائد اردو کی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، درست یہ ہے کہ قصائد میں مبالغہ کثیر ہے، اکثر اشعار نیچرل شاعری کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، لیکن مبالغہ اردو شاعری کی جان ہے، یہ طرز مشرقی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے، بلا اس کے نظم بے نمک ہے۔ ہر سخن فہم مبالغہ کو خوب سمجھتا ہے اور مبالغہ سے قطع نظر کرکے صرف بلندی خیال کو دیکھتا ہے۔ مبالغہ کو تشبیہ و تمثیل کے متوازی خیال کرتا ہے، مبالغہ صرف ایک جامہ زریں ہے کہ جس میں اصل خیال آراستہ کیا جاتا ہے غرض صرف اعلیٰ مشا بہت سے ہے مبالغہ خوبی کلام ہے نہ کہ نقص"۔

انتخاب غزلیات ذوق میں ڈاکٹر صاحب نے صرف اُن اشعار کو لیا ہے جو اُن کو مرغوب ہیں لیکن ہم جناب مؤلف کے ذوق شاعری کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے بہترین انتخاب کلام فرمایا ہے۔ ذوق کے کلام کا بڑا حصہ ضایع ہو چکا ہے اور جو کچھ آزاد مرحوم کی کوشش سے محفوظ ہو گیا تھا وہ بلا لحاظ اسکے کہ کس پایہ کا تھا شایع کر دیا گیا تھا اسکو کلام غالب کی طرح حُسن انتخاب نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتخاب شایع شدہ کلام کا عطر ہے۔ اور باوجود زمانہ کی دستبرد کے ذوق غزلیات میں بھی مسلم الثبوت اُستاد نظر آتے ہیں۔ اُن کا کلام مشاعروں میں پڑھا گیا، اور مقبول ہوا لیکن غالب کا کلام عام فہم نہ تھا اور جب تک اُن کا منتخب کلام شایع نہ ہوا مشہور نہ ہوا۔ لائق مولف نے موازنہ ذوق و غالب کے عنوان سے نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی ہے جو تنقید کا پاکیزہ نمونہ ہے۔ قصائد میں لائق مؤلف نے ذوق کو غالب پر ترجیح دی ہے۔ اور اگرچہ ذوق کے بہت سے قصائد ناپید ہو گئے پھر بھی دو قصائد موجود ہیں جو غالب کے قصائد کے ہم ردیف و قافیہ ہیں، اور غالب کا ایک قطعہ ذوق کے ایک قصیدہ سے ملتا ہے۔ لیکن یہ تینوں قصائد ذوق کے بہترین قصائد میں سے نہیں ہیں۔ تاہم عام موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کا مرتبہ بلند ہے۔ مثنوی غالب مرحوم کے یہاں

بھرے سے غائب ہے۔ سہرا، غالب مرحوم نے خوب لکھا تھا مگر اُنھیں قافیوں کو باندھنا اور بڑھا دینا ذوق کا کمال تھا۔ قطعات میں کہیں غالب بڑھے ہوئے ہیں تو کہیں ذوق کو فضیلت ہے۔ رباعیات میں دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ اب رہا غزل کا میدان اس میں لائق مؤلف تسلیم کرتے ہیں کہ دمجموعی طور پر بلاشبہ غالب کی غزلیات ذوق کی غزلیات کے مقابلے میں اعلےٰ ہیں۔ لیکن اسقدر تفاوت ہرگز نہیں ہے جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ غالب کے کلام میں ترکیب فارسی، منتخب مضامین اور پیچیدہ خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ فلسفہ غالب کا حصہ ہے۔ لیکن مشکل ترکیبوں کی وجہ سے عام فہم نہیں ہیں۔ دیر تک غور کیے بغیر اکثر اشعار سمجھ میں نہیں آتے، لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو بلند پروازی ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشاعروں میں غالب کی غزلوں کو وہ مقبولیت حاصل نہوسکی جو ذوق کو تھی یا مومن خاں کو ملی .... برخلاف اسکے ذوق کی زبان روزمرّہ کے محاوروں سے مملو ہے۔ الفاظ فارسی و عربی کا استعمال کثیر ہے لیکن ترکیب فارسی مقابلتہً کم ہے۔ زیادہ تر اشعار بذات خود مکمل ہیں کوئی لفظ محذوف نہیں ہے جو الفاظ شعر میں ہیں وہ اُس شعر کے پورے مضمون ادا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ذوق کی غزل کو نثر میں تبدیل کرنا نہایت آسان ہے۔ زیادہ الفاظ بڑھانے کی ضرورت نہوگی۔ لیکن غالب کے اشعار میں تصور کو زیادہ دخل ہے۔ الفاظ خیالات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جب خیالات ذہن میں پیدا ہوگئے تو پڑھنے والا کمی الفاظ کو بھول جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اُن خیالات کو ادا کرنے کے لیے کافی الفاظ اشعار میں موجود نہیں ہیں۔ صرف بلند خیالی کا لطف اُس کمی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسکا پتہ اُسوقت چلتا ہے جب یہ کوشش کیجاوے کہ غالب کی ایک غزل کو نثر میں تبدیل کریں اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ مزید الفاظ بڑھانے کی کس قدر ضرورت ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ علاوہ برتری کلام ایک سبب زیادہ مقبولیت کا یہ بھی تھا کہ غالب کا منتخب کلام شایع ہوا، جو اشعار دیوان میں شایع کیے گئے وہ چیدہ تھے۔ ایک یہ وجہ بھی ہوئی کہ غالب نے بحر و قافیہ و ردیف کے انتخاب میں بہت کچھ احتیاط کی زیادہ تر بحریں ایسی رکھیں جو پڑھنے میں بھلی معلوم ہوں اور گانے میں اچھی سخت زمین یا غیر معمولی ردیف و قافیہ سے غالب نے حتی الامکان پرہیز کیا۔ مثلاً ج۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ق کی ردیفوں میں غالب کی کسی غزل کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر ذوق نے سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیفوں میں ہمیشہ طبع آزمائی کی اور اپنی قادر الکلامی دکھائی۔ بحر و قافیہ کے انتخاب میں احتیاط نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہ لحاظ فن شاعری غزلیات غالب کی نازک خیالی و مضموں بندی کو نہ پہونچ سکیں۔ غالب نے سخت زمین میں اپنے اعلیٰ پیمانے کی غزل کہنے کی دشواری کو ضرور محسوس کیا ہوگا اور اسی وجہ سے معمولی اشعار کہنے کے بجائے دیوان میں اکثر ردیفوں کو متروک کرنا پسند کیا....... بہتر طریقہ موازنہ کا یہ ہے کہ ایک ہی طرح کی غزلیں ساتھ پڑھی جائیں۔ اور پھر ذوق کی پختگی کلام صحت زبان، سلاست بیان اور فصاحت کا مقابلہ غالب کی مضمون بندی فارسی تراکیب، نازک خیالی اور بلاغت سے کیا جاے۔ ہر طرح کی غزلوں کا مقابلہ کرنا ایک طویل امر ہوگا۔ صرف ایک طرح کے اشعار ایک دوسرے کے مقابل تحریر کیے جاتے ہیں۔ اور ترجیح صرف پڑھنے والے کی راے پر چھوڑی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے موازنہ کا یہ نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف چند اشعار نقل کرتے ہیں:۔

ذوق۔ جل اٹھا شمع نمط تار رگ جاں میرا | آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا
دھیان میں آئینہ رخ کے گئی جاں نکل | رہ گیا ہاے کھلا دیدہ حیراں میرا

غالب۔ سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

ذوق۔ لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کی مژگاں کا
نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا
غالب۔ خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ذوق۔ بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج
غالب۔ لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ذوق۔ ہم اپنے جذبۂ دل کا اثر کو دیکھتے ہیں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں
ہے اُنکی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم
جدھر ہو اُنکی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں
عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اس رخ پر
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں
جہاں کے آئنہ سے دل کا آئنہ ہے جدا
اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں
غالب۔ یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ذوق۔ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھکر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اُنھیں کیا اضطراب میں

غالب۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
غالب چھٹی شراب پہ اب بھی کبھی کبھی　　　پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

ڈاکٹر صاحب نے قابل دید موازنہ کیا ہے اور آخیر میں ایک پُرلطف سوال قائم کیا ہے "اِن اشعار کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں پڑھکر آپ کس اُستاد کے کلام کو ترجیح دیتے ہیں؟" ہم بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمزبان ہوکر قارئین شمع سے اِس سوال کا جواب مانگتے ہیں۔ اور اگر وہ اِس قلیل اقتباس کو رائے زنی کے لیے کافی نہیں سمجھتے تو ہم سفارش کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی دونوں تالیفات کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ اور ذوق کے کلام میں خود اپنی طبیعت کی افتاد کے مطابق اِس سوال کا جواب تلاش کریں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ قارئین کرام کس اُستاد کو ترجیح دینگے، لیکن اس بات کے ہم ضامن ہوتے ہیں کہ ذوق مرحوم کی طرف سے جو بدعقیدگی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے وہ ضرور دور ہو جائیگی۔ اور ماننا پڑے گا کہ ذوق مرحوم ہی وہ بزرگ تھے جن کو زمانے نے اُستاد تسلیم کیا، اور جن کے جیتے جی غالب مرحوم کا کلام مقبول عوام نہ ہو سکا۔ قصائد ذوق کی قیمت عہ ہے اور یہی قیمت انتخاب غزلیات ذوق کی ہے۔ دونوں کتب منیجر نظامی پریس بدایوں سے مل سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی، اور اُن کے کارنامے ... شوخیٔ ... فریاد ...
ناکافی ہیں۔ موصوف کے متعلق ان سطور ... جو ہے منہ دیکھ رہا ہے ترے فریادی کا
معلوم ہو جائے کہ موصوف مغربی علوم ... میں اپنی یہ ہے تحقیق جدید
اُن کو خاص شغف ہے، اور وہ ا...
کی تحریر کے اقتباسات بھی ... ایجاد کیا عشق نے جلادی کا

بے بصری

(ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور کے افسانہ کا ترجمہ)

از

جناب محمد سلیم خاں صاحب

میرے بیاہ کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ایک مردہ بچہ پیدا ہوا، اور میری جان کے لالے پڑ گئے۔ صحت تو رفتہ رفتہ درست ہو گئی، لیکن آنکھیں دن بہ دن کمزور ہوتی چلی گئیں۔

جس زمانے میں مجھ پر یہ بلا نازل ہوئی۔ میرے شوہر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اُنھوں نے بلا تامل میرا علاج شروع کر دیا، اور اپنی طبی لیاقت صرف کر دی، میرے بھائی جو وکالت کی امتحان کی تیاری کر رہے تھے عیادت کو آئے، وہ میری آنکھوں کی حالت دیکھکر حیران رہگئے، اور میرے شوہر سے کہنے لگے "تم کیا کر رہے ہو۔ کمو کی آنکھیں بگاڑے ڈالتے ہو، کسی ہوشیار ڈاکٹر کو دکھاؤ"۔ وہ بگڑ کر بولے "کیوں؟ مجھ سے بہتر کون علاج کر سکتا ہے، معمولی مرض ہے۔ اس کا تو ہر شخص علاج کرے گا" بھائی نے کہا "دیکھیر تو آپ کے نزدیک آپکی اور پروفیسروں کی قابلیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے" اس جملہ پر وہ جھنجھلا گئے اور کہنے لگے "آپ کی اگر شادی ہو گئی ہوتی اور بیوی کی جائداد کے متعلق مقدمہ ہوتا تو آپ میری قانونی رائے پر ہرگز عمل نکرتے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ علاج کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں؟"

باتوں ہی باتوں میں دونوں میں نوک جھونک ہو گئی، لیکن اسکا خمیازہ

مجھے اُٹھانا پڑا۔

والدین کو چاہیئے کہ شادی کے بعد اولاد کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ کیونکہ شادی کے بعد لڑکی کا ہر رنج و غم شوہر کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، لیکن میں اپنی بدنصیب آنکھوں کو کیا کہوں جنکی بدولت میرے بھائی اور شوہر کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو گئی۔

اُنکی غیر موجودگی میں ایک دن، دادا نے ہوشیار ڈاکٹر کو بلا کر میری آنکھوں کا معائنہ کرا دیا، ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور تاکید کی کہ آنکھوں کی طرف سے آیندہ غفلت نہ کیجائے۔ دادا نے دوا فروش کے یہاں نسخہ بھیجکر دوا منگا دی۔ مگر میں نے بہت منت و سماجت سے کہا کہ وہ آیندہ علاج میں نہ بولیں کیونکہ اندیشہ تھا کہ ڈاکٹر کو چھپکر بلانے سے مزید رنجشیں پیدا ہو جائیں گی۔ مجھے اپنی جسارت پر خود حیرت ہوئی۔ کیونکہ میں دادا کا بہت ادب کرتی تھی، میری ہمت پر دادا کو بھی ضرور تعجب ہوا ہوگا۔ وہ میری گفتگو سنکر تھوڑی دیر کیلئے بالکل چپ ہو گئے، اور کہنے لگے "آیندہ احتیاط کروں گا لیکن جب دوا آجائے تو تم اُس کا استعمال ضرور کرنا" یہ کہکر دادا تو چلے گئے، لیکن جب دوائیں آگئیں تو میں نے اُن کو کنوئیں میں پھنکوا دیا، بھائی کی مداخلت پر میرے شوہر بہت خفا ہوئے اور میرے علاج میں اور زیادہ توجہ کرنے لگے۔ طرح طرح سے علاج کیا، اور میں نے بھی اُن کے حکم مطابق پٹی باندھ لی، رنگ برنگ کے چشمے لگائے، قسم قسم کے سفوف استعمال کیئے، اور مچھلی کا تیل اتنا پیا کہ گلے میں خراش ہو گئی۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ شفاخانے سے واپس آکر سیدھے میرے پاس چلے آتے، اور پوچھتے "کہو کمو۔ کیسی رہیں؟" میں جواب دیتی "اچھی طرح رہی" مگر واقعہ یہ ہے کہ اس طرح ضمیر کے خلاف باتیں کر کے مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں جب زیادہ پانی ہوتا تو میں اس خیال سے دل کو تسلی دیا کرتی کہ نقصان رساں پانی کا نکلجانا ہی اچھا، اور جب ریزش میں کمی ہوتی تو اُن کی لیاقت پر پھولی نہ سماتی۔ لیکن

چند دنوں میں تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی، اور میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی "دن رات سر میں درد رہنے لگا، وہ بھی بہت فکرمند ہوگئے، اور قراین سے معلوم ہوا کہ وہ کسی ہوشیار ڈاکٹر کو بلانے کا بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ میں نے اُنکی رائے کی تائید کی۔ جس سے اُن کو گونہ اطمینان ہوگیا اور وہ ایک انگریز ڈاکٹر کو بلا لائے، میں نہیں کہہ سکتی کہ دونوں میں کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن اُس نے میرے شوہر سے کُرید کُرید کر کرخت سوالات کیے، اور اُس کے چلے جانے کے بعد وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کی فکر دور کرنے کو میں نے کہا "یہ فرنگی تو بالکل اناڑی معلوم ہوتا ہے، تم کو بلانا تھا تو ہندوستانی ڈاکٹر کو بلاتے جس کا اخلاق ٹھیک ہوتا، کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ میرے مرض کو تم سے بہتر سمجھ سکتا ہو" وہ چپ چاپ سُنا کیے اور کچھ دیر سکوت کے بعد شکستہ آواز میں کہنے لگے "دیکھو! تمھاری آنکھ پر نشتر دیا جائے گا" میں نے تسلی دینے کے لہجے میں جواب دیا "خواہ مخواہ اتنی دیر بات چھپائی، اگر تم جانتے تھے تو مجھ سے کہنے میں کیا ہرج تھا، میں کوئی ناسمجھ بچہ نہ تھی جو نشتر کے نام سے ڈر جاتی؟" یہ سنکر اُن کی صورت بحال ہوگئی، اور کہنے لگے "نشتر کے نام سے لوگ عام طور پر خوف کھاتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "بجا ہے! مرد صرف عورتوں کے سامنے بہادر ہوتے ہیں" وہ سنجیدگی سے میری طرف دیکھکر کہنے لگے "تم سچ کہتی ہو، ہم لوگوں میں ظاہری نمایش بہت ہے" مجھے اس سنجیدگی پر ہنسی آگئی، اور اُن کو چھیڑنے کے لیے کہا "غور طلب یہ امر ہے کہ کیا آپ لوگوں کو ہماری ظاہری نمایش پر زدوکوب کرنیکا کیا کوئی حق حاصل ہے؟"

جب دادا آئے تو میں اُن کو الگ لیگئی، اور چپکے سے باتیں بنا کر بہلا دیا، کہ "بھائی تمھارے ڈاکٹر صاحب کے علاج سے ضرور اچھی ہوگئی ہوتی، مگر افسوس مجھے زخم دانے مرہم کا خیال بالکل نہ رہا، اور نہ ابتک اُسکا استعمال کرسکی۔ میری آنکھیں خراب ہوگئیں

اور اب نشتر لگانے کی ضرورت ہوگی"۔

دادا نے کہا "تم اپنے شوہر کا علاج نہیں چھوڑتی تھیں، اس لیئے میں نے تمھارے پاس کا آنا چھوڑ دیا تھا"۔

میں نے جواب دیا "نہیں، تمھارا خیال غلط ہے، میں پوشیدہ طور پر تمھارے ہی ڈاکٹر کا علاج کرتی رہی ہوں"۔

افسوس! ہم عورتیں جھوٹ بولنے میں کیسی مشاق ہوتی ہیں! شادی ہوتے ہی جھوٹ بولنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اور شوہروں کی تسلی، یا اگر بچے ہوگئے تو اُن کو بہلانے کے لیئے جھوٹ بولنا پڑتا ہے، اور تمام عمر ایسی بدعت کی پابندی رہتی ہے"! بہرکیف میر دماغ ایسا خوش تدبیر تھا کہ دادا اور شوہر کے درمیان صفائی ہوگئی۔ داد کو ندامت تھی کہ اُنھوں نے ڈاکٹر کا معاملہ چھپانیکی مجھے تاکید کی تھی۔ اور شوہر کو یہ خفّت تھی کہ اگر وہ شروع میں اُنکا کہنا مان لیتے تو آج یہ دن کیوں نصیب ہوتا؟" غرض دونوں میں صفائی ہوگئی، اور دونوں نے مشورہ کرکے ایک انگریز ڈاکٹر کو بُلایا، بائیں آنکھ پر نشتر لگا، یہی آنکھ کمزور تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رہی سہی بصارت بھی جاتی رہی، اور دوسری آنکھ پر خودبخود تاریکی چھاگئی۔

ایک دن میرے شوہر سرہانے آکر کھڑے ہوگئے، اور کہنے لگے "میں کس مُنھ سے تمھاری ہمدردی کروں! میری ہی سہل انکاری سے تمھاری بصارت چلی گئی"۔ آنسوؤں کی وجہ سے اُنکی آواز گلوگیر ہو رہی تھی، میں نے اُنکا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر جواب دیا "تم نے تو حتی الوسع بھلائی کی کوشش کی تھی، اگر خدا نخواستہ تم خود اس بلا میں گرفتار ہوجاتے تو یہی کرتے جو میرے ساتھ کیا ہے کسی غیر ڈاکٹر کے ہاتھوں سے میری آنکھیں خراب ہوجاتیں تو میں اپنے دل کو کس طرح تسکین دیتی؟

جو کچھ ہوا اچھا ہوا، میری تشفی اور دلجمعی کیلئے یہی خیال کافی ہو کہ میری آنکھیں تمہارے پیارے ہاتھوں سے رخصت ہوئیں، آخر وہ بھی تو ایثار تھا کہ سری رام چندر جی کو جب صرف ایک گل نیلو فر ملا اور اسکو اُنھوں نے پرمیشور کے نام پر چڑھانے کے لئے کافی نہ سمجھا، تو اپنی دونوں آنکھیں نکال کر چڑھا دیں، اسی طرح میں نے بھی خدا کی راہ میں اپنی آنکھیں دے ڈالیں، اب اگر کوئی ایسی چیز نظر آئے کہ جس کو دیکھکر تمھارا دل خوش ہو تو مجھ سے اسکا ذکر کیا کرنا، میں وہی مسرت حاصل کر دنگی، جو تمکو ہوا کریگی۔"

مگر ان باتوں سے مجھے اطمینان نہ ہوا، کیونکہ مجھے اٹکل نہ تھی کہ اس قسم کی گفتگو سے اُن کے قلب پر کیا اثر ہوتا تھا۔ مجھے اس طرح کی باتوں کی عادت ہو گئی، اور اُن کو روز دوہرانے لگی۔ جب میرے قلب پر رنج و غم کا ہجوم ہوتا یا میرے قدم صبر و شکر کی راہ میں ڈگمگاتے یا جی گھبراتا، تو میں بے اختیار ہو کر رونے لگتی، مگر فوراً ہی ان باتوں سے اپنے دل کو اس طرح سمجھاتی۔ جیسے کوئی بچہ کہی ہوئی کہانی کو دوہراتا ہے اُسوقت صبر آجاتا، طبیعت راضی بہ رضا ہوتی، اور مایوس کن خیالات سے پناہ مل جاتی۔

جس وقت ہم دونوں باتیں کر رہے تھے، میں نے اپنے خیالات کو اُن پر اچھی طرح ظاہر کر دیا وہ کہنے لگے "دکمّو، مجھ سے جو غلطی ہو گئی۔ اُسکی تمام عمر تلافی نہیں ہو سکتی، البتہ میں ایک کام کر سکتا ہوں، یعنی ہمیشہ تمھارے پاس رہوں، اور حتی المقدور تمھاری معذوری کو دور کرنے کی کوشش کروں"۔ میں نے کہا یہ کیونکر ممکن ہے؟ میں تمھارے گھر کو اندھی عورت کا شفاخانہ نہیں بنا سکتی۔ بہتر ہے کہ تم دوسری شادی کر لو"۔

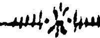
میں نے یہ الفاظ کہہ تو دیے مگر حلق خشک ہو گیا، کھانسنے کے بہانے سے میں نے طبیعت کو روکنا چاہا، لیکن وہ بات کاٹکر بولے "دکمّو، میں جانتا ہوں کہ میں

سخت نالائق ہوں، بلکہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہوں، لیکن میری طبیعت کمینی نہیں ہے تمھاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں شادی کروں تو مجھ پر اپنے ماں اور باپ کی جان لینے کا پاپ لگے"! مجھے ایسی سخت قسم کی اجازت نہ دینی چاہیے تھی، لیکن آنسوؤں کے بہاؤ کی وجہ سے میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ مگر ان الفاظ کو سن کر میں آپے میں نہ رہی، اور اپنی اندھی صورت کو تکیہ میں چھپا کر دیر تک روتی رہی، جب کسی قدر سکون ہوا، تو میں نے اُن کا سر اپنے سینے سے لگا کر پوچھا "تم نے ایسی بڑی قسم کیوں کھائی؟ کیا میں نے نفسانی اغراض کے لیئے شادی کرنے کو کہا تھا؟ نہیں میرا یہ مطلب نہ تھا بلکہ یہ خیال تھا کہ جس طرح میں تم کو آرام دیا کرتی تھی، اب وہ دیا کرے گی"، کہنے لگے "آرام تو خدمتگاروں سے بھی مل سکتا ہے، میں ایسا پاگل نہیں ہوں کہ ایک لونڈی کو لا کر اپنی دیبی کے تخت کا شریک بنا دوں"۔

زبان سے "دیبی" کا لفظ نکلتے ہی انھوں نے میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے لیا۔ میری پیشانی کو چومنے لگے، اسی وقت مجھے القا ہوا کہ میری عقل کی تیسری آنکھ بینا ہو گئی ہے۔ اور میں دل میں کہنے لگی "بہت اچھا ہوا۔ گھر کے معمولی کام کاج نہ کرسکوں گی نہ سہی۔ لیکن نئی دنیا کی سیر کیا کرونگی، خدا کی عبادت کرونگی۔ اور دنیا کے پیچ و فریب سے پناہ میں رہونگی، شاید اسی بہانے سے میرے گناہ معاف ہو جائیں"، اُس روز تمام دن میرے دل میں کشمکش رہی، اور اِس خیال سے بہت خوشی ہوئی کہ اتنی بڑی قسم کھا کر، اب وہ دوسری شادی نہ کرسکیں گے لیکن نئی روح جو مجھ میں حلول کر گئی تھی اور نسائیت سے معمور تھی بولی، "ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ تمھارے شوہر کو قسم کا توڑ دینا آسان ہو جائے، اور وہ دوسری شادی کرلیں، اصلی روح نے کہا وہ ممکن ہے! لیکن اتنی بڑی قسم کو توڑ ڈالنا آسان نہیں" دل نے میری اصلی روح کی ہمنوائی کر کے اس طرح تشفی کردی انھیں کیا شک سا ہے؟

اُنھوں نے واقعی بہت بڑی قسم کھائی ہے"

غرض میرے دماغ میں اسی طرح کے خیالات آتے رہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نئی روح جس نے ابھی حلول کیا تھا، مجھ سے خفا ہو گئی، کیونکہ خوف و ہراس کی مہیب شکل میرے سامنے آ گئی اور میں خوف زدہ ہو کر کانپنے لگی۔



میرے پشیمان شوہر، میرے کاموں کو اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے اور نوکروں کو پاس تک نہ آنے دیتے۔ اُن کے ہاتھوں ضروریات کے رفع ہونے پر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اور اُن کی صحبت میں میرا وقت ہنستے بولتے گذرنے لگا، نابینا ہو جانے کی وجہ سے میں چاہتی تھی کہ وہ ہر وقت میرے ہی پاس رہیں کیونکہ جلوت کا وہ لطف جو کبھی آنکھوں کے ذریعہ میسر تھا، مجھکو اب عالم نابینائی میں ملتا تھا، پہلے جب کبھی وہ کہیں چلے جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے باندھکر ہوا میں لٹکا گئے ہیں، اور میں بے بس ہوں۔ اُن کو اگر شفا خانہ سے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں کھڑکی کھول دیتی اور سڑک کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھا کرتی گویا سڑک اُن کے اور میرے قلب کے درمیان ایک رشتہ تھی، لیکن اب چونکہ بصارت چلی گئی تھی اور سڑک نظر نہ آتی تھی، اسلیئے میں اُن کے تصور میں ہمہ تن انتظار رہتی تھی، وہ رشتہ جو بینائی کے وجود سے قائم تھا، شکست ہو گیا تھا، اور ایک ناقابل عبور دریا حائل تھا، اُنکی جدائی سے اس دریا کے کنارے چوڑے ہو جاتے، اور اُنکی آمد پر ساحل نزدیک ہو جاتا۔ لیکن یہ بیتاب تمنائیں، اور ناقابل اعتبار خیالات بے کار تھے۔ مرد کے لیئے عورت بجائے خود بوجھ ہوتی ہے، اور نابینائی کا اضافہ اس بوجھ کو قطعی ناقابل برداشت بنا دیتا ہے۔ اس لیئے میں نے عہد کر لیا کہ میں ہر دکھ اور مصیبت کو تنہا برداشت کرونگی اور اس بلا میں اُنکو شریک نہ کرونگی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں، میں نے چھونے، سُننے، اور آواز پہچاننے کی مشق سے گھر کے کل کام کاج کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی، اور میں نابینائی کی حالت میں، بینائی کی بہ نسبت ہر کام کو جلد سیکھ لیتی تھی، کیونکہ بینائی بجائے ترغیب دینے کے اکثر ہمت شکن ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ میری قوتیں جو خوابیدہ تھیں جاگ اُٹھیں، اور فرائض کو مستعدی اور اطمینان کے ساتھ انجام دینے لگیں۔ متواتر مشق کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں کسی کام کو اپنے شوہر پر نہ چھوڑتی۔ ابتدا میں اُنھوں نے اعتراض کیا کہ میں اُن کے منفعل قلب کو فرائض کی انجام دہی سے محروم رکھتی ہوں۔ لیکن میری ہمت اور استقلال میں فرق نہ آیا۔ میں اُن کے الفاظ کی وجہ سے نہیں کہتی ہوں۔ بلکہ خود میں نے محسوس کیا۔ گھر کے مشاغل میں وقت صرف کرکے اُنکو خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ نابینا بی بی کی روزانہ خدمت کا پابند ہوجانا دنیا میں کسی شوہر کے لیئے موجب مسرت نہیں ہوسکتا۔

(۲)

وہ دن بھی آگیا کہ میرے شوہر کی تعلیم ختم ہوئی۔ اور وہ ڈاکٹر ہوگئے۔ کلکتہ کے ایک چھوٹے قصبے میں اُنھوں نے ڈاکٹری شروع کی، میں یہاں آکر بہت خوش ہوئی، گویا مادر وطن کے گود میں پہونچ گئی۔ آٹھ برس کی عمر میں مجھے کلکتہ جانا پڑا تھا وہاں دس برس رہکر وطن کی یاد دل سے محو ہوگئی تھی۔ جبتک آنکھیں تھیں کلکتہ کی مہذب طرز زندگی نے بچپن کی یاد نہ آنے دی، حالانکہ میں جانتی تھی کہ کلکتہ کے نظارے صرف آنکھوں کو لبھاتے ہیں، اُن سے قلب کو تسکین نہیں ہوتی، مگر نابینا ہوتے ہی ہر بچپن کی باتیں اسی طرح تازہ ہوگئیں جس طرح غروب آفتاب کے بعد ایک ایک کرکے ستارے نکل آتے ہیں۔

شروع نومبر میں ہم لوگ ہرسنگھ پور پہونچ گئے۔ یہ جگہ بالکل نئی تھی۔ لیکن دیہات کی زندگی مجھے بیحد پسند تھی۔ تازہ جُتے ہوئے کھیتوں میں ہوکر پھولوں کی مہک آتی تھی

دور سے چرواہے لڑکوں کے گانے کی آوازیں اور گاڑی کے پہیوں کی گھنگھناہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی، اور بہتے ہوئے چشمے الگ کھینچتے تھے کہ میں اُن کے کنارے پر بیٹھکر روح کو تازہ کردں۔

یہاں بچپن کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں، خود بہ خود محسوس ہوا کہ میں بچپن کی زندگی کا لطف اُٹھا رہی ہوں، البتہ ماں کی غیر موجودگی سے کلیجہ پر چوٹ سی لگتی تھی، تصور میں بچپن کی ایک ایک چیز سامنے آجاتی۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں گھر میں بیٹھی ہوں، پیپل کے پرانے درخت کھڑے ہیں، اور ہمارے گاؤں کے چشمے اُبل رہے ہیں، کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ بوڑھی دادی دھوپ میں بیٹھکر بال سکھا رہی ہیں اور کمزور آواز میں گاتی جاتی ہیں، شام کو مویشیوں کی جگالی کی آواز سنتی تو ماں کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی، اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ابھی چراغ لیکر مویشیوں کے حاطہ میں گئی ہیں، وطن کی تازہ اور ہری گھاس کی بھینی بھینی خوشبو دماغ میں بس جاتی، اور دور کے مندروں سے گھنٹیوں کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔

لمبے چوڑے کلکتہ میں ایک کشش ہے۔ جو دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے، مگر وہاں میری زندگی کی تازگی، اور معصومیت قطعی مفقود ہوگئی تھی، وہاں ایسی باتیں پیدا ہوجاتی تھیں جن سے دل کو تکلیف ہوتی تھی، ایک دن کا ذکر ہے کہ میری ایک ملنے والی کہنے لگی "دکھو! توبہ ہے!! تم بھی کیسی بے حس ہو! اگر میرا شوہر ایسا سلوک کرتا تو میں تمام عمر اسکی صورت نہ دیکھتی" یہ جب کی بات ہے کہ میرے شوہر دوسرے ڈاکٹر سے میرا علاج کرا رہے تھے، اُسکا کہنا مجھے بہت ناگوار گذرا اور میں نے صاف کہدیا، بہت رنج ہوا۔ میں نے، وہ میرا اندھاپن کچھ کم بُرا ہے جو خواہ مخواہ شوہر کی بُرائیاں کروں۔ اس جواب پر وہ خفیف سی ہوگئی۔ مجھ سی کم عمر عورت سے اس جواب کی اُسکو مطلق اُمید نہ تھی مگر وہ سر کو جنبش دے کر، اور تنک کر میری بات کو سنی اَن سنی کرگئی۔

بہرکیف میری طبیعت پریشان ہو گئی اور اُس کے الفاظ میرے دل سے کبھی نہ مٹے کلکتہ میں نئے سے نئے قصوں کی بھرمار دلوں کو سخت بنا دیتی ہے، مگر یہاں پھر میری بھولی ہوئی تمنائیں اور بے ریا محبت کی باتیں پھر عود کر آئیں گویا خدائے کریم نے اپنی رحمت مجھپر نازل فرمائی جس نے میرے دل اور میری روح کو منور کر دیا میں اپنے معبود حقیقی کی ذرہ نوازی پر قربان جاتی اور بار بار شکر کرتی کہ "تو نے اپنی دی ہوئی نعمت مجھ سے چھین لی، لیکن ہزار شکر ہے کہ تو میرے ساتھ ہے" مجھے یوں نہ کہنا چاہیئے، یہ الفاظ گستاخی پر محمول ہو سکتے ہیں، کیونکہ بندہ تو صرف دعا مانگ سکتا ہے مجھکو یوں نہ کہنا چاہیے، کہ تو میرے ساتھ ہے" بلکہ یوں کہنا چاہیئے میں دعا کرتی ہوں کہ خدایا! میرے دل سے تیری یاد کبھی محو نہ ہو! اور جب زندگی میں کوئی شے باقی نہ رہے اُسوقت بھی تیری یاد میرے دل میں قائم رہے!!۔

(۳)

قصبہ میں رہتے کئی مہینہ ہو گئے تھے، یہ زمانہ ہنسی خوشی میں گذرا۔ میرے شوہر نے ڈاکٹری کے پیشہ میں تھوڑی بہت شہرت حاصل کر لی اور اُنکے ہاتھوں میں روپیہ آنے لگا لیکن اس آمدنی میں کچھ حصہ حرام کا بھی تھا۔ میں اپنے خیال کی تائید میں کوئی خاص واقعہ بیان نہیں کر سکتی ہوں، لیکن اندھوں کا ضمیر آنکھ والوں کی بہ نسبت صاف ہوتا ہے اسلیئے دولت میں ترقی کے ساتھ میرے شوہر میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں، اُن کا مجھکو اچھی طرح علم تھا، اوائل عمری میں اُن کو حق اور انصاف کا بہت خیال رہتا تھا۔ اور اکثر کہا کرتے کہ جب میں ڈاکٹر ہو جاؤنگا، غریبوں کی مدد کرونگا، اور بلا فیس اُنکی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھونگا، وہ اُن شریف طبع ڈاکٹروں کی توصیف کیا کرتے۔ جو بلا فیس غریبوں کا علاج کرتے تھے۔ لیکن افسوس اب اُن کے وہ خیالات نہ تھے۔ مزاج بہت سخت ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک غریب عورت اپنے بچہ کو لائی اور اُنکی

فیاضی اور سخاوت کا واسطہ دیکر امداد کی طالب ہوئی، مگر انھوں نے بُری طرح جھڑک دیا اور جب میں نے سفارش کی، تو نہایت لاپرواہی سے ٹال کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے جب ہم غریب تھے ہمکو حصول دولت کی زیادہ آرزو نہ تھی، اور ہمارا ایمان سلامت تھا مگر جب سے بنک میں روپیہ جمع ہونا شروع ہوا، تو اکثر مہاجنوں کے دلالوں، اور شہر کے بداعمالوں سے اُنکی گھنٹوں صحبتیں رہنے لگیں، اس کا جو کچھ مطلب ہو سکتا ہے اُسکے اظہار کی ضرورت نہیں!۔

آہ! یہ کیسا انقلاب تھا! یہ وہی میرے شوہر تھے جنکو میں نابینائی کے قبل اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی! یہ وہی تھے جنھوں نے میری پیشانی کو چوم کر مجھے ایک مقدس ہستی کہا تھا، اور وہی کے تخت پر بیٹھنے کی عزت دی تھی! افسوس انکی حالت میں کیسا انقلاب ہو گیا تھا۔!

جو لوگ فوری جذبہ سے متاثر ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں وہ پھر اثر پذیر ہو کر اپنی اصلی حالت پر آ سکتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو رفتہ رفتہ اپنے اخلاقی مادہ کو تحلیل کرتے ہیں، یا بیرونی اثرات سے متاثر ہو کر روح کو بیچیں اور برباد کر دیتے ہیں۔ اُن کے جذبات قطعی سوخت ہو جاتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی دنیا میں کوئی صورت نہیں۔

نابینائی کی وجہ سے آنکھوں سے نظر نہ آنا، محض فرضی علٰحدگی ہوتی ہے۔ لیکن آہ یہ خیال کیسا روح فرسا تھا کہ اب وہ (میرے شوہر) مجھ سے واقعی جدا تھے، اور میرے نہ تھے! حالانکہ اگر ہم دونوں، ہم خیال ہوتے تو زندگی کے لمحات پُر مسرت ہو جاتے! اصل جدائی آنکھوں سے نہیں دلوں کے فرق سے ہوتی ہے! میں اپنے دل کو محبت اور وفا کا زیر اثر رکھکر تسلیاں دے لیتی تھی۔ لیکن وہ صبر اور شکر کی راہ سے قطعی جدا ہو گئے تھے، اُن کو فانی، اور بے ثبات چیزوں کی تلاش رہتی اور دولت جمع کرنے کا جنون ہو گیا تھا۔ اُن کی یہ حالت دیکھکر بعض اوقات مجھکو شک ہوتا کہ شاید نابینائی کے

باعث ہیں ہی غلطی پر ہوں ، اور نمائشی چیزیں اتنی بُری نہیں ہیں جتنی کہ معلوم ہوتی ہیں ۔ ممکن ہے اگر میری بینائی ہوتی تو میں دنیا کو اُس کے اصلی رنگ میں قبول کر لیتی اور نمائشی اور غیر نمائشی فانی اور غیر فانی ، اصلی اور مصنوعی ، چیزوں کے جھگڑے میں نہ پڑتی ۔ بہرکیف میرے شوہر کا اور میرا ، نقطۂ نظر جداگانہ تھے ، میں ہر چیز کی حقیقت کو دیکھتی ، اور وہ اُسکی سطح کو ،

ایک دن ایک بوڑھا مسلمان اُن کے پاس آیا ، گود میں اُسکی پوتی تھی جس سے وہ بہت مانوس معلوم ہوتا تھا ، بچی بہت بیمار تھی ، اُسنے بہت منت و سماجت کی ، حضور مَیں ایک غریب بیکس آدمی ہوں ، آپ میری مدد کریں ، خدا آپ کا بھلا کرے گا ، ، مگر وہ بہت بُری طرح پیش آئے "زیادہ مت بکو ، بتاؤ کیا فیس دے سکتے ہو !" میں ان باتوں کو سُن رہی تھی ، سخت صدمہ ہوا ، خدا نے مجھے اندھا کیا تھا ، بہرا اور بنا دیتا ۔ غریب بُڈھے نے لمبا سا سانس کھینچا ، اور اُٹھکر چلا گیا ، میں نے ماما بھیجکر بُڈھے کو بلالیا اور دروازے پر اُس کے ہاتھ میں کچھ روپیہ دیکر کہا ۔ یہ روپیہ بچی کے علاج کے واسطے ہے ، مہربانی کرکے اس کو قبول کرو ، کسی ہوشیار اور ایماندار ڈاکٹر سے اس کا علاج کرانا ، اور میرے شوہر کے ایمان کی سلامتی کے لیے دعا کرنا"

اُس صدمہ کی وجہ سے میں نے تمام دن کچھ نہ کھایا اور جب دوپہر کو وہ سوکر اُٹھے تو متعجب ہوکر دریافت کیا "کیا بات ہے اسقدر رنجیدہ کیوں ہو" میں حسب معمول جھوٹ بولنا چاہتی تھی ، مگر مکر اور فریب کے دن گذر چکے تھے ، اس لیے میں نے صاف صاف کہدیا ، میں تم سے کئی دن سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ۔ لیکن اس وقت خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کہنا ہے ، اور نہ جو کچھ میرے دل و دماغ میں ہے وہ زبان پر آسکتا ہے ۔ لیکن میں جانتی ہوں تم کو خود معلوم ہے کہ اس زمانہ میں تم میں کیا تبدیلیاں ہوگئی ہیں ! اور تمھاری اور میری زندگی میں کیسا انقلاب ہوگیا ہے ؟

اُن سے کچھ نہ بن پڑا کہنے لگے انقلاب تو قدرت کا قانون ہے ۔ میں نے جواب دیا

یہ تو میں بھی جانتی ہوں، لیکن دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں انقلاب نہیں اور وہ قطعی غیر فانی ہیں۔ وہ چیں بر جبیں ہو گئے، اور بگڑ کر بولے "بہت سی عورتیں اس لیے رنج و مصیبت میں مبتلا ہیں کہ اُن کے شوہر ایک پیسہ نہیں کماتے، اور بہت سی ایسی بدنصیب ہیں جنکو شوہر پیار نہیں کرتے۔ لیکن تم سخت ناشکری ہو۔"

اُس روز سے مجھ پر یہ حقیقت اور واضح ہو گئی کہ نابینائی نے مجھکو اُن چیزوں کے دیکھنے کی قوت دیدی ہے، جو لافانی ہیں، اور جن کو تغیر نہیں ہے، میں دوسری عورتوں کی طرح ناشکری نہیں کرتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے شوہر میرے خیالات کو سمجھنے سے بالکل معذور رہے۔

(۴)

ہم میاں بیوی، کی زندگی ایک حالت پر گذر رہی تھی جس میں کوئی بات قابل ذکر نہیں تھی، اور یہ طرز جاری رہتا۔ لیکن میرے شوہر کی چچی کے یکایک آ جانے سے ہماری معاشرتی استواری درہم برہم ہو گئی۔ اُنھوں نے آتے ہی زہریلا اثر پیدا کر دیا۔ اور واری اور قربان ہو کر فرمانے لگیں "کمو، مجھے تم پر بڑا ترس آتا ہے، لیکن اس مصیبت میں اپنے شوہر کو کیوں شامل کرتی ہو، تم کو چاہیے کہ اُنکو شادی کی اجازت دیدو۔"

اگر میرے شوہر اس گفتگو کو مذاق میں اُڑا دیتے تو یقین ہے کہ وہ جھیپ جاتیں، یا اگر ہنس دیتے تو اُن کو اطمینان ہو جاتا، مگر اُنھوں نے اس موقع پر جو گفتگو کی وہ اٹک اٹک کر، اور دبی آواز میں بادلِ ناخواستہ کہنے لگے "چچی کیا آپ کا ایسا خیال ہے؟ آپ کو تو اس قسم کی باتیں نہ کرنی چاہییں۔"

ذرا سہارا ملتے ہی اب وہ مجھ سے مخاطب ہو گئیں "کمو، کیا میں نے جھوٹ کہا تھا؟"

میں نے ہنسکر ٹال دیا "اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے جو معاملات کو ہم سے

بہتر سمجھتا ہو، گرہ کٹ، کھکر کسی کی جیب نہیں کاٹا کرتے ‘‘

فرمایا ’’ ٹھیک کہتی ہو ‘‘ اور بھتیجہ سے بولیں ’’ بٹیا ابنیاش آؤ، ہم تم الگ چلکر باتیں کریں ‘‘

کچھ روز کے بعد انھوں نے میری موجودگی میں چچی سے پوچھا کہ وہ کسی ایسی شریف خاندان لڑکی سے واقف ہیں جو ہمارے گھر میں رہکر کام کاج کر دیا کرے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے خانگی کاموں میں کسی کی امداد کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن میں سنکر خاموش ہورہی۔

چچی نے جواب دیا ’’ ایسی ہزاروں موجود ہیں، خود میرے چچا زاد بھائی کی بیٹی ہر جو بیاہ کے قابل ہے اور بہت خوبصورت ہے، وہ لوگ خوشی سے تمھارے ساتھ بیاہ کر دیں گے۔

انھوں نے کہا ’’ مگر میں شادی کے لیے کہتا کب ہوں ‘‘

چچی نے جواب دیا ’’ تو پھر ایسی کونسی شریف زادی ہوگی، جو بن بیاہی تمھارے گھر میں رہے ‘‘، جواب کی معقولیت پر وہ خاموش ہوگئے اور اٹھکر چلے گئے، اُن کے جانے کے بعد میں تنہا رہگئی اور بیٹھے دعا مانگی ’’ یا اللہ! تو میرے شوہر کو بچا ‘‘

ابھی چند ہی دن گذرے تھے، میں پوجا کے کمرے سے برآمد ہورہی تھی کہ چچی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، اور کہنے لگیں ’’ کمو! جس لڑکی کا اُس دن ذکر ہوا تھا، میرے ساتھ آئی ہے۔ تم ملکر بہت خوش ہوگی، آؤ پیاری بیٹی، ادھر آؤ، اپنی بہن سے ملو،

اس کا نام ہمنجنی ہے۔ عین اُسیوقت وہ بھی آنکلے۔ اور گھر میں ایک بن بیاہی لڑکی کو دیکھکر بظاہر متعجب ہوگئے۔ اُلٹے پاؤں لوٹنے کو تھے مگر چچی نے لاد کی لیا ’’ پیارے ابنیاش! پردہ نہیں ہے۔ میرے چچا زاد بھائی کی بیٹی ہو تم سے ملنے آئی ہے بیٹی! اسلام کرو ‘‘

وہ سٹ پٹائے ہوئے تھے، مگر باتیں بنانے لگے اور اس ٹوہ میں رہے کہ کنواری لڑکی کے آنے کا سبب کیا تھا، میں تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی، لیکن ممنجھنی کا ہاتھ پکڑ کر کمرہ میں لیگئی، اور محبت سے اسکے چہرے کو ٹٹولنے لگی۔

حقیقت میں وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی، چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی "کیا تم مجھے خواب میں لا رہی ہو؟" اُسکی بے ریا اور بے تکلف ہنسی نے غیریت کا پردہ ہٹا دیا، اور میں نے اُس کے گلے میں داہنا ہاتھ ڈال کر کہا "پیاری بہن میں تم کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں" اور اپنا بایاں ہاتھ اُس کے چہرے کی طرف بڑھایا، وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی "کیا تم سچ مچ مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو، میں کوئی گل بوٹا ہوں جس کے رنگ اور بو کو معلوم کرنا چاہتی ہو؟

میں سمجھ گئی کہ اس کو میری بدنصیبی کا علم نہ تھا، میں نے بتا دیا "بہن میں نابینا ہوں" میں نے محسوس کیا کہ اُسکی خوبصورت، نرگسی آنکھیں میرے چہرے کو بغور دیکھ رہی ہیں۔ اور وہ مجھکو قابل رحم سمجھتی ہے، وہ اپنے استعجاب کو چھپا نہ سکی۔ "اِس لیے تمھارے شوہر نے اپنی چچی کو رہنے کے لیے بلایا ہے"

میں نے جواب دیا "نہیں! بالکل غلط ہے، اُنھوں نے ہرگز نہیں بلایا، چچی اپنی مرضی سے آئی ہیں"

وہ بولی "تو پھر دوسروں کو تو زیبا نہیں کہ بن بلائے چلی آئیں؟ میں بتائے دیتی ہوں کہ وہ یہاں کچھ دن رہکر جائینگی" اور اس خیال سے وہ خود مغموم ہوگئی اور مجھ سے پوچھنے لگی "مجھے بتا جی نے یہاں کیوں بھیجا ہے؟ پیاری بہن تمھیں کچھ خبر ہے؟"

ہم دونوں باتیں کر رہی رہے تھے کہ چچی آگئیں، لڑکی نے پوچھا چچی، کب تک واپس چلوگی؟ چچی گھبرا گئی اور بات ٹالنے کے لیے کہنے لگی "اس سوال کا کونسا موقع ہے؟ میں نے تم سی لڑکی دنیا جہان میں نہیں دیکھی، ابھی آئی ہو اور ابھی چلنے کا تقاضہ شروع ہوگیا"

لڑکی نے کہا "چچی، بُرا ماننے کی کیا بات ہے، تم اپنے بھتیجہ کے گھر آئیں، ٹھیک کیا۔ مگر میں کون ہوں جو یہاں رہوں، میں تو صاف کہتی ہوں کہ میں یہاں نہیں رہوں گی" اور میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی "کیوں بہن؟ میں غلط کہتی ہوں؟"

میں نے اُسکو سینہ سے لگا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ چچی پریشان تھی۔ ڈری کہ معاملہ ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس لیے بات کاٹکر کہنے لگی "بیٹی، چلو ندی پر اشنان کر آئیں" مگر لڑکی مجھ سے چمٹ گئی اور کہنے لگی "نہیں میں تو ان (یعنی مجھ سے مطلب تھا) کے ساتھ اشنان کو جاؤنگی"، اس مخالفت سے چچی کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے"

راستہ میں ہمنجنی نے پوچھا "بہن! تمھارے کوئی اولاد نہیں ہوئی؟" مجھے اس سوال پر بہت تعجب ہوا، مگر میں نے بتا دیا "نہیں، مجھے خدا نے کوئی اولاد نہیں دی، یہی سبب ہے........"

اُس نے قطع کلام کر کے شوخی سے کہا "نہیں، یہ بات نہیں ہے، ایسا کبھی نہوگا اطمینان رکھو، لیکن تم نے کوئی بُرا پاپ کیا ہے۔ دیکھو چچی بھی لاولد ہے۔ اُسکو تو اُسکے گناہوں کا ثمرہ ملا ہے، تم نے کیا پاپ کیا تھا؟"

مجھے اِس گفتگو سے بہت تکلیف ہوئی اُسکا وہم دور کرنے کے لیے میرے پاس جواب ہی کیا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر دل میں کہا "اللہ، تو ہی واقف ہے کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے"۔ مجھے غمگین دیکھکر وہ چلا کر کہنے لگی، نیک بخت، پاکدامن رانی، تم نے ٹھنڈا سانس کیوں بھرا؟" میری باتوں کا خیال نہ کرو، اور اُس کے ہلکے قہقہے، ندی کی لہروں میں مل گئے۔

(۵)

میرے شوہر کے پیشہ میں روز بروز رکاوٹیں پیدا ہوتی جاتی تھیں۔ اُن کا دل کام سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ باہر کے مریضوں کی طرف بالکل توجہ نہ کرتے تھے، اور مقامی

مریضوں سے بھی بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔

پہلے تو وہ صرف دوپہر اور رات کو مکان کے اندرونی حصہ میں چچی سے باتوں کا وقت معین تھا۔ مگر اب یہ حالت تھی کہ دن میں کئی کئی بار جانے لگے۔ چچی لڑکی سے گلاس میں پانی منگوایا کرتی تھیں۔ مگر میں سمجھ جاتی تھی! چند روز تک تو لڑکی حکم کی تعمیل کرتی رہی، لیکن اس کو تامل ہونے لگا، تو چچی بہت پیار سے پکارنے لگیں "ہیمو! ہیمو!! بیٹی ہمنجی"، مگر وہ مجھ سے چمٹ جاتی اور اداس ہو جاتی۔

اس زمانہ میں میرے بھائی بھی کلکتہ سے آ گئے۔ ان میں دلدہی اور محبت کا مادّہ بہت تھا مگر وہ سخت اور انصاف پسند آدمی تھے، اس لیے میں ڈری کہ دونوں میں پھر کہیں جھگڑا نہ ہو جائے۔ میں اُن کے سامنے ہر وقت خوش رہتی، اور میں نے اپنی تکالیف کا بالکل اظہار نہ ہونے دیا، لیکن اُن کے قیام سے میرے شوہر کو بہت اذیت تھی وہ مجھ سے بار بار پوچھتے "تمھارے بھائی کب تک چلے جائیں گے؟" بھائی نے بھی اُن کے طرزِ عمل کو محسوس کر لیا اور بہت جلد رخصت ہو گئے۔ چلتے وقت وہ دیر تک اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھے رہے۔ اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رو رہے ہیں اور زیر لب دعائیں دے رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ گاؤں کی ہاٹ ختم ہو گئی تھی، کاروباری لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہوا میں تیزی تھی، طوفان کے آثار تھے۔ اور بھیگی ہوئی زمین اور ابر کی وجہ سے حبس ہو رہا تھا۔ چونکہ احتیاط کے خیال سے میں اپنے کمرے میں چراغ نہ رکھتی تھی اس لیے میرے کمرے میں تاریکی تھی۔ میں فرش پر بیٹھی ہوئی عبادت میں مصروف تھی۔ "اے دونوں جہان کے مالک! مجھے تیرے درشن کس طرح نصیب ہوں گے، میں تو اندھی ہوں اور دل شکستہ ہوں۔ میرا قلب زخمی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے زخم کو دبائے ہوئے بیٹھی ہوں، طوفانِ حوادث مجھے بہائے لیے جاتے ہیں!

تو ہی مجھپر اپنا فضل و کرم فرما۔ آخر کب تک .... کب تک .... میرا امتحان جاری رہیگا!!

اسی حالت میں میری گردن تکیہ پر جھک گئی اور میں زار و قطار رونے لگی۔ مجھے کسی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی، ہمنجنی آکر گلے سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔ میں کمرے میں اتنی دیر تک اپنے قیام کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتی ہوں۔ اُس نے بھی کوئی بات نہ پوچھی اور نہ کچھ منھ سے بولی، البتہ نرم اور نازک ہاتھوں سے میری کنپٹی سہلاتی رہی اور میری پیشانی کو چوم کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اُس نے صبح کو میرے سامنے چچی سے کہا ”تم چاہو تو قیام کرو، مگر میں تو نوکر کے ساتھ گھر جاتی ہوں،،

چچی نے جواب دیا ”تنہا جانے کی کیا ضرورت ہے، میں بھی چلونگی،، اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک انگوٹھی نکالی جس میں موتی جڑے ہوئے تھے اور بہت پیار سے کہنے لگی ”پیاری بیٹی، میرا ابنیاش تمھارے لئے کیسی خوبصورت اور بیش قیمت انگوٹھی لایا ہے؟،،

”چچی، دیکھو میں کیسا اچھا نشانہ لگاتی ہوں،، یہ کہکر ہمنجنی نے کھڑکی سے باہر تالاب میں انگوٹھی پھینک دی۔ بوڑھیا کے ہوش غائب ہو گئے۔ بالکل بوکھلا گئی، میرا ہاتھ پکڑ کر بار بار کہتی ”کملو، ابنیاش کو خبر نہو، اُسکو بہت غم ہوگا،، میں نے کہا۔ ”ڈرنے کی کیا بات ہے! تم اطمینان رکھو، میں اپنی زبان سے ایک حرف نہ کہونگی،،

دوسرے دن رخصت ہونے سے پہلے لڑکی میرے پاس آئی، اور گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگی ”بہن، دل میں رکھنا، مجھے بھول نہ جانا۔ میں نے کئی بار اُسکے چہرے کو ہاتھوں میں لیا، اور یقین دلایا، ”بہن، اندھوں کی یاد بہت دیر پا ہوتی ہے۔ اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا، اور اُس کے بالوں کو چومتی رہی۔ اُس کے جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل کی دنیا ویران ہوگئی۔ اُسکی خوبصورتی شوخی

اور جوانی سے ہر وقت میں لطف اُٹھایا کرتی تھی۔ اب میں بیک وقت اُن سے محروم ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آگئے، مہمانوں کے چلے جانے پر اطمینان و بشاشت میں نقصان کا اظہار محض اُنکی بناوٹی بات تھی۔ ابتک تو صرف میرا اندھاپن اُن کے اور میرے درمیان صرف ایک رُکاوٹ تھا، لیکن اب ہمنجنی کے فراق کا اور اضافہ ہوگیا۔ لہٰذا ہر وہ لاپرواہی ظاہر کرتے تھے، مگر مجھے یقین تھا کہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔

شروع مئی میں ایک دن خادمہ نے پوچھا "ندی کے کنارے جلوس کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ مالک، کہاں جارہے ہیں؟ آنے والی مصیبت کو میں سمجھ گئی، مگر میں نے یہ کہکر ٹال دیا، مجھے کیا معلوم، کیسا جلوس ہے اور کہاں جارہے ہیں۔ اُس دن کے بعد خادمہ کو پھر جرأت نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے اس بارہ میں سوال کرتی۔ ایک ٹھنڈا سانس لیئے باہر چلی گئی، اور اُسی شب کو تھوڑی دیر بعد وہ خود میرے پاس آکر کہنے لگے، باہر گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے، دو تین دن میں واپس آؤنگا"

میں اُٹھ بیٹھی اور بلند آواز سے کہا "تم جھوٹ بولتے ہو" وہ اٹک اٹک کر کہنے لگے۔ "اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

میں نے کہا "تم شادی کرنے جارہے ہو"

یہ سُنکر وہ دم بخود ہوگئے، اور مکان میں سناٹا پڑ گیا، مگر میں خود ہی بولی۔ "چپ کیوں ہو؟ مردوں کی طرح کیوں نہیں کہتے، ہاں! عورت لینے جارہا ہوں"

دھیمی آواز میں اقرار کیا "ہاں"

میں نے تیز ہوکر کہا "ہرگز نہ جانے دونگی، میں تم کو قسم توڑنے کے عذاب سے بچاؤں گی۔ تمھاری بیوی ہوں اپنا فرض ضرور پورا کروں گی، کیا میں نے اسی دن کے لیئے عبادت کی تھی؟"

کمرے میں بالکل خاموشی تھی، میں فرش پر گر پڑی اور اُن کے پیروں سے لپٹ کر

کہنے لگی "میں نے کیا گناہ کیا ہے ؟ کونسی تقصیر کی ہے، دوسری شادی کی وجہ کیا ہے ؟"
اب اُن کو دبی آواز میں کہنا پڑا "اگر تم کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں سچ کہتا ہوں، مجھے صرف تمھارا ڈر لگتا ہے ۔ مگر میں مجبور ہوں، تم نابینائی کی چار دیواری میں مقید ہو میرا جی اس اندھیرے میں گھبراتا ہے، میرے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، تم میرے لیے ایک اجنبی عورت ہو گئی ہو، میں تمھارے ساتھ روزمرہ کی زندگی کیسے گذار سکتا ہوں مجھے خدا کی بنائی ہوئی معمولی عورت چاہیے۔ جس کے ساتھ زندگی کے دن آرام سے گذار سکوں ۔"

میں نے دل میں کہا "میرے دل کو چیر کر دیکھو! میں وہی ہوں، جو ایک دن دلھن بنکر تمھارے گھر آئی تھی ...... اور میں نے تم پر سب کچھ قربان کر ڈالا"، یاد نہیں کہ میں نے اس وقت کیا کیا کہا ۔ مگر اتنا کہنے کا ضرور خیال ہے "میں تمھاری حقیقی محرم راز ہوں ہرگز وہ کام نہ کرنے دونگی جس سے تم سخت عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، مجھے یقین ہے یا تو میں بیوہ ہو جاؤنگی، یا وہ لڑکی مر جائے گی"، جب مجھے ہوش آیا تو ہر طرف تاریکی اور ناقابلِ بیان خاموشی تھی ...... میرے شوہر روانہ ہو چکے تھے، میں تمام دن عبادت کرتی رہی اور اپنے کمرے سے باہر نہ آئی ۔

شام کو تیز ہوائیں چلنے لگیں، اور طوفان کے آثار نمایاں ہو گئے، بادل کی گرج، اور بجلی کی کڑک سے درو دیوار تھرا اٹھے ۔ مگر میں بدستور عبادت میں مصروف رہی مجھے یقین تھا کہ طوفاں خیز ہواؤں میں کشتی جھکولے لے رہی ہوگی، لیکن میری زبان سے اُن کے لیئے دعا کا ایک حرف نہ نکلا، مجھے بس ایک دھن تھی! کسی طرح وہ اپنی قسم کو توڑنے سے بچ جائیں، اور چاہے ہم دونوں کا کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو جائے، یہ رات بھی گذر گئی، اور دوسرا دن بھی پرمیشر کی یاد میں گذر گیا، شام کو کسی نے دروازے پر دستک دی، اور شور و غل کی آوازیں آنے لگیں، دروازہ کھلنے پر

مجھے بیہوش پاکر دوسرے کمرے میں لٹا دیا گیا، نہ معلوم میں کتنی دیر غافل رہی جس وقت مجھے ہوش آرہا تھا اُسکا مجھے کچھ کچھ خیال ہے، میرے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا "بہن! بہن!!" یہ آواز مانوس تھی! میں نے آنکھیں کھول دیں، "ہمنجنی کی گود میں میرا سر تھا اور وہی مجھے پکار رہی تھی، میں نے کروٹ بدلی تو عطر عروس کی خوشبو دماغ میں بھر گئی

ہائے افسوس میری دعا بیکار گئی اور تقدیر کا لکھا آخر کار پورا ہو کر رہا!!

خوبصورت لڑکی نے گردن جھکا کر آہستہ سے کہا "بہن! میں اپنے بیاہ پر مبارکباد لینے آئی ہوں" میرا لہو خشک ہو گیا، میری حالت اُس درخت کی سی تھی جس پر ایک بجلی گری ہو، کلیجہ مسوس کر بیٹھ گئی، اور بہ مشکل طبیعت کو قابو میں لاکر بولی "میں تم کو کیوں نہ مبارکباد دوں گی۔ اس میں تمھارا قصور ہی کیا ہے؟" وہ ہنس پڑی، اور کہنے لگی "قصور کیسا؟ اور کس کی خطا؟ تمھاری شادی کے وقت تو سب کچھ جائز تھا، لیکن میرا بیاہ ہوتے ہی خطا، اور قصور نکل آئے ہیں"

میں نے جواب میں مسکرانے کی کوشش کی، مگر مجھ سے ہنسا نہ گیا۔

البتہ دل میں کہنے لگی "میری آخری تدبیر میری دعائیں تھیں! لیکن خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہو سکتا ہے!

خیر! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب میرے سر پر آرے ہی کیوں نہ چلیں، مگر میرے ایمان اور عقیدہ میں خلل نہ آنے دونگی" ماس نے بڑھکر میرے قدم چھو لئے، اور میں نے دعا دی "تمھیں تمھارا شوہر مبارک ہو! اور اللہ تم کو شاد و آباد رکھے، تمھاری عمر دراز ہو، اور تم سہاگن بنی رہو"

سنگدل کو اس پر بھی اطمینان نہوا، کہنے لگی "مجھ اکیلی کو مبارکباد دینے سے کیا حاصل! ہم دونوں کو مبارکباد دو، اور ہاتھ اٹھا کر ہمارے حق میں دعا کرو، میرے شوہر کو اپنا مہمان بناؤ، اور اگر اجازت دو تو اُن کو تمھارے سامنے لے آؤں؟"

میں نے کہا "اجازت ہے! اُن کو ضرور میرے سامنے لاؤ" مجھے کسی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی، میں اس آہٹ کو پہچانتی تھی، ساتھ ہی آواز آئی "دلہو ایسا مزاج ہے؟"

میں چونک پڑی، اور گھبرا کر کہا "دادا؟"

دلہن پھر ہنسنے لگی، معلوم ہوتا تھا اُس کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے، کہنے لگی، تم ابھی تک اِن کو بڑا بھائی کہتی ہو؟ کیسی بیوقوفی کی بات ہے، اب اِن کو چھوٹا بھائی کہا کرو، ذرا اِن کو کان پکڑ کر ٹہلاؤ! انھوں نے تمھاری چھوٹی بہن سے شادی کر لی"

اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے شوہر کی قسم قائم رہی، اور اُن کو خدا نے اپنے فضل و کرم سے بچا لیا، میں سمجھتی تھی کہ والدہ کے انتقال کے بعد دادا نے تمام عمر مجرد رہنے کا پختہ عہد کر لیا تھا، اور ایسا کوئی نہ تھا جو اُن کے خیالات کو بدل دیتا، لیکن اُنھوں نے محض میری خاطر سے اپنی شادی کر لی، میرا دل بے قابو ہو گیا، اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت چاہتی تھی کہ آنسوؤں کو روکوں مگر وہ اُمڈ اُمڈ کر آتے تھے، اور جس قدر ضبط کرتی تھی بے قابو ہوتی جاتی تھی، انتہائی مایوسی اور غم کی حالت میں واقعات کے خوشگوار اختتام نے دل کی عجب حالت کر دی تھی۔ دادا، نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور دلھن میرے گلے سے لپٹ گئی، اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی"

بستر پر لیٹ کر مجھے نیند نہ آئی، کیونکہ وہ ابتک نہیں سوئے تھے! میں جانتی تھی کہ اُن کو اپنی ناکامیابی پر نہایت سخت صدمہ ہوگا، نصف شب کے بعد مکان کا دروازہ کھلا اور میں اُٹھ بیٹھی، جوں جوں اُن کے پیروں کی آہٹ قریب ہوتی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھتی تھی، وہ میرے بستر کے قریب آ گئے، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "تمھارا دادا نے مجھے زندہ کر دیا، ورنہ میں فوری جوش سے مغلوب ہو کر اپنی زندگی برباد کر چکا تھا، واقعات نے مجھے اندھا کر دیا تھا، خدا ہی علیم ہے کہ میں دل پر کتنا

وزنی پتھر رکھکر کشتی میں سوار ہوا تھا! راستہ میں طوفان آگیا، آسمان کا لاٹر گیا اور اُس وقت جب کہ کشتی جگر کھا رہی تھی، میں نے سچے دل سے دعا مانگی، کہ اللہ مجھکو غرق کردے! متھرا گنج تک میرے دل کی یہی حالت رہی - مگر وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ تمھارے دادا نے اُس لڑکی سے شادی کرلی! میں نے وہیں شکر کا سجدہ کیا، اور کشتی میں سوار ہوکر سیدھا واپس چلا آیا - راستہ میں یاد آیا کہ میں نے قسم کھاکر تم سے وعدہ کیا تھا! اَب میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ دنیا میں تمھاری ذات کے سوا میرے لیئے کوئی اور ہستی عیش اور راحت کا باعث نہیں ہوسکتی ہے!! اور کیوں نہ ہو! تم میری دیبی ہو"

میں ہنسنے لگی، اور ذرا سخت ہوکر بولی، نہیں! ہرگز نہیں!! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، میں دیبی نہیں ہوں، تمھاری وہی پرانی لونڈی ہوں، اور یہی عزت میرے لیئے فخر کا باعث ہے"

"میری پیاری، میری عزت اور آبرو! میں بھی تم سے ایک اقرار لیتا ہوں، اَب آیندہ تم مجھکو اپنا بھگوان کہکر شرمندہ نہ کرنا"

صبح ہوتے ہی تمام قصبہ میں خبر پھیل گئی، لیکن اُس خطرناک طوفان کا راز کسی کو نہ معلوم ہوا جب کہ دریا کی ہر لہر موت کا ایک پیغام تھی"!

حقیقتِ شمع

از

جناب مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل وکیل حیدرآباد دکن

تخلیق کا جب میری قدرت کو خیال آیا　　　شبنم سے لیئے آنسو، بلبل سے لیا نالہ
پھر برق کی بیتابی رکھدی مرے سینے میں　　　کچھ رنگ شفق کا بھی طینت میں مری ڈالا
تاروں سے ضیا لیکر غنچوں کے تبسم میں　　　یوں کالبدِ نوری سانچہ میں مرا ڈھالا

پھر میری سرِ محفل روشن ہوئی جب ہستی　　　ظلمت کدۂ دل میں باقی نہ رہی تاریکی
خلوت ہو کہ جلوت ہو۔ میں مونس و ہمدم ہوں　　　تسکینِ دلِ عاشق اک ذات ہی میری تھی

گذری تھیں بہت راتیں ایسی ہی مرے سر پر　　　تا صبح میں کاہش سے روتی رہی جل جل کر
تھی کس کو پڑی میری، کرتا کوئی غمخواری　　　بیتاب رہا شب بھر آخر یہ دلِ مضطر

آ، کان ادھر لانا اک بات حقیقت کی　　　کہتی ہوں تجھی سے میں کہنا نہ کسی سے بھی
ہو جائے گا گر افشا یہ رازِ محبت کا　　　عالم میں تلاطم ہو، بہہ جائے نہ یہ کشتی

قدرت کا یہ منشا ہے ہو سوز مرے دلمیں
اوروں کو جلا کر پھر خود آپ ہی جل جانا

"حافظہ کو ترقی دینے کے سات طریقے"

از
حسن عابد جعفری صاحب آکسن، بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر رسالہ شمع

ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا حافظہ اچھا ہو، اس لیے ہم آپکو سات گر بتانا چاہتے ہیں لیکن اُن کو بتانے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ حافظہ اپنا فعل کس طرح کرتا ہے، چونکہ اس مسئلہ کا تعلق سائنس سے ہے، اور وہ خاصہ پیچیدہ ہے، اس لیئے سائنس کی بحث کو تو اس موقع پر نظر انداز کرتے ہیں، البتہ دو موٹے اور ابتدائی اصول بتلائے دیتے ہیں تاکہ کُل مضمون کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ رہے۔

اوّل یہ کہ دنیا میں ہر قسم کا تجربہ حواس خمسہ کے ذریعہ سے اپنا اثر قائم کرتا ہے خواہ وہ اثر دماغ کے خلیہ (cells) پر ہو خواہ عمود نخاعی (spinal coloumn) پر ہو، خواہ پٹھوں کے کسی مرکز پر ہو، ان میں سے بعض اثرات تمام عمر قائم رہتے ہیں، بعض کچھ عرصہ کے بعد مٹ جاتے ہیں، اور بہت سے ایسے اثرات بھی ہیں جو پیدا ہوتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جو باتیں ایک مرتبہ ہمارے تجربہ میں آ جاتی ہیں ہمارے دماغ نیم شعوری میں اس طرح محفوظ رہتی ہیں کہ حسب ضرورت اُن کو حافظہ کام میں لا سکے، لیکن ایسے ہزاروں گہرے اثرات بھی ہیں جو قائم رہ جاتے ہیں، اور حافظہ کی ترقی اسی طرح ممکن ہے کہ ان اثرات پر زیادہ زور ڈالا جائے اور اُن کو ایسے قاعدہ سے ترتیب دیا جائے کہ ضرورت کے وقت اُنکی بڑی تعداد فوراً کام میں آ سکے، اگرچہ اصول سائنس

کی رو سے مندرجہ ذیل مثال درست نہ ہوگی۔ مگر ہماری اغراض کے لیے کافی ہے، ان اثرات کو جو ہمارے تجربات دنیوی کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے پٹھوں کے سیلز اسی طرح قبول کرتی ہیں جس طرح کہ ایک کیمرے کی پلیٹ عکس کو قبول کرتی ہے، پلیٹ کے اوپر بعض عکس ہلکے آتے ہیں اور بعض گہرے، ہلکے عکس کی تصویر چند دنوں میں غائب ہو جاتی ہے، لیکن گہرے عکس کی تصویر قائم رہتی ہے، یہی حال حافظہ کا ہے۔ جس قدر صاف اثر پیدا ہوگا اور جس قدر آپ کا دماغی مرکز درست ہوگا۔ اسی قدر آسانی سے آپ کا حافظہ کام کریگا۔

بعض آدمیوں کا حافظہ کیمرہ صفت ہوتا ہے، ایک مرتبہ کا دیکھ لینا، سن لینا یا محسوس کرلینا اُن کے حافظ کے لیے کافی ہوتا ہے، چنانچہ لکھنؤ میں ایک صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ میر انیس مرحوم کی مجلس میں بیٹھکر دو دو سو اور ڈھائی ڈھائی سو بندوں کے مرثیے صرف ایک مرتبہ سن کر یاد کرلیتے تھے، اور گھر واپس آکر پورا مرثیہ زبانی سنادیتے تھے، اسی طرح بعض آدمیوں کو ہندسے اور رقمیں یاد رکھنے مہارت ہوتی ہے، غالباً انھیں وجوہ کی بنا پر کہا گیا ہے کہ حافظہ کئی قسم کا ہوتا ہے، لیکن یہ بحث بھی سائنس سے تعلق رکھتی ہے، اور ہمارے لیے چنداں مفید نہیں ہے، ہمارا تعلق صرف معمولی حافظہ سے ہے جس میں کچھ نقص ہونا ضروری ہے، اور اسی حافظہ پر انسان کو بھروسہ نہ کرنا پڑتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حافظہ ایک فطری صفت ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ اسکو ترقی دینا یا ناقص بنالینا ہمارا ذاتی فعل ہے اور بہرکیف یہ بحث بھی ہمارے لیے بیکار ہے لیکن ہم اس قدر ضرور بتادیں گے کہ ماہرین نفسیات نے اس قسم کی تقسیم کو کوئی جگہ نہیں دی ہے، بلکہ اس موضوع پر علاقلانہ اور عام فہم انداز سے روشنی ڈالی ہے، اُن کے نزدیک حافظہ میں ترقی کی گنجایش ہے، اور ہر شخص جو معمولی دماغ رکھتا ہے اپنے حافظہ کو بہت زیادہ وسعت دے سکتا ہے کیونکہ حافظہ کی ترقی کا انحصار چند قواعد

پر ہے جو قطعی قرین قیاس ہیں اور بآسانی تجربہ میں آسکتے ہیں، یہی ہمارے مضمون کا موضوع ہے اور اس اصول کی تحت میں ہم اپنا مضمون پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم ابتدائی اور غالباً نہایت غیر دلچسپ طریقہ کو بیان کرینگے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کی مدد سے آپ نے اپنے بچپن میں الفاظ کہنے شروع کیے، اور مدرسہ میں جا کر ہجے کرنا اور ریاضی میں ضرب کرنا سیکھا۔ اس طریقہ کو ورد کرنا یا دوہرانا کہتے ہیں،

بچہ شروع میں اماں، اور بابا کہنا سیکھتا ہے، یہ الفاظ اسکی زبان سے کیوں ادا ہوتے ہیں؟ اس لیئے کہ وہ بار بار انھیں الفاظ کو سنتا ہے، چنانچہ سیکڑوں مرتبہ کے ورد کے بعد یہ الفاظ اس کے دماغ میں ایسا گہرا اثر پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ خود بھی انکا اعادہ کرنے لگتا ہے۔

اس طرح محض اتفاق سے وہ یہ بھی سیکھ لیتا ہے کہ وہ حرکت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ سکتا ہے، چنانچہ وہ بار بار اسکی مشق کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مشق ہوتی ہے اس قدر دماغ پر زیادہ گہرا اثر پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایسا وقت آتا ہے کہ وہ بآسانی چلتا پھرتا ہے اور معمولی اشاروں میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہونچ جاتا ہے۔ یعنی نقل و حرکت اسکی فطرت میں داخل ہو جاتی ہیں، ورد کر کے کسی چیز کو یاد کرنا پرانا قاعدہ ہے، اور غالباً حافظہ کی مشق کا قدیم تریں طریقہ ہے چنانچہ اسلامی ممالک میں قرآن شریف کا حفظ کرنا معمولی بات ہے۔ لیکن چونکہ یہ نتیجہ ہے باربار دوہرانے کا، اس لیئے حافظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ محنت اور کاوش کے لحاظ سے قابل وقعت ہے، اگر انسان صبر اور استقلال سے کام لے تو محض رٹ کر بہت سی باتیں یاد کر سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ جس سے حافظہ کو ترقی ہوسکتی ہے، یہ ہے کہ جس چیز کو حفظ کرنا منظور ہو اسکی طرف اپنے حواس کو پوری طرح متوجہ کر دیا جائے، پیدائش کے وقت

انسان میں جبلّی رجحانات ہوا کرتے ہیں، مثلاً رونا، اکڑنا، مُسکرانا، وغیرہ وغیرہ۔ اِس کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے اُنکا ذریعہ محض حواس ہوتے ہیں، یعنی دیکھنا، سُننا، چھونا، سونگھنا، چکھنا وغیرہ وغیرہ وہ قوتیں ہیں جو بچہ کو دنیا میں نئی باتیں سکھاتی ہیں آپ کو حیرت ہوگی، مگر واقعہ ہے کہ اندھیرے میں جو قوت آپ کو زینہ پر بآسانی چڑھا دیتی ہے، وہ محض اعصابی تحریک پر منحصر ہے، اور اُسکا تعلق بھی حافظہ کی قوت سے ہے،

ممکن ہے کہ آپ کو یہ سمجھنے میں دشواری ہو کہ حواس کو کس طرح متوجہ کیا جاتا ہے اسکی مثال یوں ہے کہ آپ ایسے شخص کو سیب دکھائیں جس نے پہلے کبھی سیب نہیں دیکھا ہے، وہ اُسکو دیکھکر اپنے ساتھ چند اثرات لیجائیگا، لیکن اگر وہ سیب کو ہاتھ میں لیکر دیکھے گا تو اُسکے وزن کو محسوس کرے گا، اسی طرح اگر اُسکو سونگھے گا، چکھے گا، اور دانتوں سے چبائے گا تو اُس پر اور بھی زیادہ صاف اثر پیدا ہوگا جو کبھی ضایع نہ ہوسکے گا۔

اس واقعہ کی سائنس کے ذریعہ سے اِس طرح معقول توجیہ ہوسکتی ہے کہ عصبی قوت کو پیدا اور ہمارے خیالات کو جمع کرنے کے لیئے نظام عصبی میں کروروں سیلز (خلئے) ہوتے ہیں جب آپ کسی بات کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو کسی قدر عصبی قوت کا اخراج ہوتا ہے اور وہ قوت کروروں چھوٹے چھوٹے رشتوں کی مدد سے سیلز کے مختلف مجموعوں میں ہوکر پورے نظام عصبی میں بجلی کی طرح تیر جاتی ہے، نگاہ کے ذریعہ سے جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسکو قبول کرنے والے سیلز اُن سے مختلف ہوتے ہیں جو سماعت کے اثرات کو قبول کرتے ہیں، اسی طرح دیگر حواس کے ذریعہ سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں اُنکے سیلز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اِن کُل سیلز میں باہمی تعلقات بھی ہیں، چنانچہ اثرات کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اُسی قدر مضبوطی کے ساتھ وہ آپکے دماغ نیم شعوری میں وہ مجموعۂ اثرات جاگزیں ہو جائیگا ؛؛

نام اور صورت یاد رکھنے کے لیئے یہ اصول خاص طور پر قابل توجہ ہے میں ایک مل کے منیجر سے واقف ہوں جنکا حافظہ معمولی تھا لیکن ملازمت کے بعد کارخانہ کے آدمیوں کے نام اور صورتیں یاد رکھنے کی انکو سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس مشکل کو انھوں نے اس طرح حل کیا کہ کارخانہ کا جب کوئی ملازم ان کے پاس کسی کام سے آیا تو انھوں نے پہلے اُس کے نام کو اچھی طرح ذہن نشیں کرلیا، پھر اُسکو اپنے قلم سے لکھا اور بغور دیکھ لیا اسطرح اُن کے عصبی اور بصری حواس پر ایک خاص اثر پیدا ہوا گفتگو کے دوران میں وہ اس شخص کا نام بار بار دوہراتے تھے اور اُسکی صورت اور چہرے کی ساخت کا مطالعہ کرتے جاتے تھے، گفتگو ختم ہونے پر اُن کے ذہن میں اُس آدمی کا صاف عکس اُتر آتا تھا اور اُسکا نام بھی دماغ میں محفوظ ہوجاتا تھا۔ اور (اب اُنکی یہ حالت ہے کہ کم از کم دس ہزار آدمیوں کے نام اور اُنکی صورت سے اچھی طرح واقف ہیں) اور مہینوں بلکہ برسوں کے بعد بھی غلطی نہیں کرتے ہیں۔

جن لوگوں کو نام یاد نہیں رہتے اُسکی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ نام کو صاف طور پر سُنتے نہیں ہیں یا اُسکی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں۔ غالبًا اُنکی توجہ اُس آدمی کی اور باتوں کی طرف منعطف ہوجاتی ہے۔

اگر آپ کو صورت یاد رہتی ہے لیکن نام یاد نہیں رہتا تو پہلا کام یہ کرنا چاہیئے کہ آپ اُس کے نام کو صاف طور پر سُنیں، پھر اُسکے نام کے ہجّے کریں، اُسکے بعد دوران گفتگو میں اُسکا نام کئی بار لیں اور جب موقع ملجائے اُسکو قلمبند کرلیں، پھر اُسکو غور سے پڑھیں اور اُسکی صورت کو پیش نظر رکھیں، صورت اور نام یاد رکھنے کا یہ ایک طریقہ ہے لیکن بعد کو اور طریقے بھی بیان ہونگے۔

اگر آپ صرف ایک اثر قبول کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کی قوت بصری طاقتور ہے، بعض ماہرین نفسیات کا تو خیال ہے کہ انسان کے دماغ میں آنکھوں کے ذریعہ سے پچھتر فیصدی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

حافظہ کو تقویت پہونچانے کا ایک اور موثر اور کامیاب ذریعہ توجہ ہے، بے توجہی حافظہ کو بدنام کرنے والی بدعت ہے، لوگ ایک وقت میں ایک چیز کو صاف طریقہ سے ماسکہ (Concentration) پر نہیں لاتے، اور باتیں کرتے وقت اسکا خیال نہیں کرتے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے، بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ آیندہ کیا کہے گا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خیالات اُلجھ جاتے ہیں اور کسی ایک بات پر قائم نہیں رہتے۔ کسی خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار تعریف کرنے لگتے ہیں لیکن اُسکی تفصیل پر نگاہ نہیں رکھتے۔ کتاب پڑھتے وقت جلد جلد ورق گردانی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسکو فوراً ختم کرلیں لیکن اس کا ذرا خیال نہیں رکھتے کہ کتاب میں کیا کیا باتیں لکھی ہیں، ایسے لوگوں کی زندگی ایسے ہی غلط انداز و خیالات سے معمور نظر آتی ہے، اور جب اُن کے حافظہ کو ٹٹولا جاتا ہے تو اُسمیں بہت کمی معلوم ہوتی ہے۔

مجھے صحیح دماغ اور اعلیٰ درجہ کے حافظہ کا ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جس کی قوت مشاہدہ اور قوت توجہ عمدہ نہ رہی ہو اگر آپ کا حافظہ کمزور ہے تو توجہ کی قوت کو بڑھائیے، توجہ کے معنی یہ ہیں کہ نفس معاملہ پر دماغ لڑا دیا جاے اور فروعات میں نہ پھنسنے پائے۔

صاف اور واضح تصویر لینے کے لئے کیمرے کے شٹر (Shutter) کو تنگ کردیا جاتا ہے، حافظہ کے لیے بھی انسان کو اپنے دماغ کے شٹر کو تنگ بنانے کی ضرورت ہے، یعنی اُسکو توجہ کے استعمال کی طرف رجوع ہونا لازم ہے۔ اگر آپ کسی کی گفتگو یاد رکھنا چاہتے ہیں تو اُسکے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کو نہ دوڑائیے اور اُس سے دریافت کرنے کے لئے اپنے دل میں سوالات نہ پیدا کرتے جائیے، بلکہ پوری گفتگو ختم کرلینے دیجیے۔

تمام گفتگو کو سنکر آپ جو سوال کرینگے معقول ہوگا۔ جس بات کو یاد رکھنا منظور ہو

اُس کی تفصیل اور تشریح پر نگاہ رکھیے،

ایک بنک کے خزانچی سے میری واقفیت ہے، اُن کو آدمیوں کی صورت یاد نہ رہنے کی شکایت تھی، اس لیئے اُنھوں نے نئے آدمیوں کی صورتوں کا تصور اپنے دماغ میں قائم کرنا چاہا، مگر وہ تصویریں دماغ سے بہت جلد مٹ گیئں، پھر اُنھوں نے چہروں کے خط و خال پر توجہ کرنی شروع کر دی، یعنی فلاں شخص کی ناک کس قسم کی ہے، ٹیڑھی ہے یا سیدھی، چھوٹی ہے یا موٹی، پتلی ہے یا اونچی، آنکھیں کنجی ہیں یا سیاہ، چھوٹی ہیں یا بڑی، چمکدار ہیں یا بے رونق، کان بڑے ہیں یا چھوٹے، غرض کہ اس طرح چہرے کے ایک ایک حصہ پر توجہ کرنے لگے، اور اُن کو فوراً محسوس ہونے لگا، کہ جب سے اُنھوں نے چہرے کے خط و خال پر توجہ شروع کی اُن کے ذہن میں اُن کے واقفکاروں کی صورتیں بھی محفوظ رہنے لگیں۔

فرانس کے مشہور مصنف ہودین نے اپنے حافظہ کو ترقی دینے کی بہت آسان ترکیب نکالی تھی، وہ کھلونوں کی دوکان کے سامنے گذرتے وقت تین کھلونوں کو اپنے ذہن میں رکھ لیتے، دوسری مرتبہ چار کھلونوں کو، تیسری مرتبہ پانچ کھلونوں کو، غرضکہ اسی طرح وہ دوکان کے تمام کھلونوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے کے عادی ہو گئے اور پھر تو اُنکی یہ کیفیت ہو گئی کہ کسی دوکان کو صرف ایک مرتبہ دیکھنا کافی تھا، اور وہ اُسکی تمام چیزوں کو یاد کر لیتے تھے،

جو چیزیں مشاہدے میں روزمرّہ آتی رہتی ہیں، ہم اُن کو بھی یاد نہیں رکھتے ہیں ہم تاش کھیلتے ہیں، لیکن ہم کتنے کھلاڑی ایسے ہیں جو یہ بتا سکیں گے کہ چاروں رنگ کے بادشاہوں میں کس کی تصویر پورے چہرے کی ہے، اور کس کی نصف چہرے کی ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ درخت سے بلّی اپنے جسم کے اگلے حصے سے اُترتی ہے یا پچھلے حصہ سے؟ گائے اگلی ٹانگوں کے بل اُٹھتی ہے یا پچھلی ٹانگوں کے، یہ سوالات

بذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن ان سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم اکثر دیکھتے رہتے ہیں وہ بھی یاد نہیں رہتی ہیں۔

حافظہ کے لیے چوتھی ضروری چیز ایتلاف ہے جس کو ہم سب کم و بیش استعمال کرتے ہیں اور اُس پر ترقی حافظہ کے کئی مروج طریقوں کا دارومدار ہے، ہم کو ایک شخص کا نام اس لیے فوراً یاد ہو جاتا ہے کہ وہ ہمارے ایک گہرے دوست کا ہمنام ہے، یا اُسکا نام کسی افسانہ کے کریکٹر سے ملتا جلتا ہے، یا اُسکا تعلق کسی ایسی واقعہ سے ہے جو ہمارے دل میں موجود ہے، اگر بلا وجہ بار رٹہ ڈالا جاے تو ایتلاف ہی حافظہ کا زبردست معاون ہے، جو غالباً آسان ترین طریقہ ہے، اور قطعی فطری بھی ہے۔

علی الصباح آنکھ کھلتے ہی ایتلاف کی زنجیر بننی شروع ہو جاتی ہے، گرم گرم بستر کا خیال آتے ہی جلد اُٹھکر دفتر جانے کا ناگوار خیال آجاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ کئی کام یاد آجاتے ہیں جن کو انجام دینا ضروری ہے، میز پر تھیٹر کا اشتہار دیکھتے ہی اپنا تھیٹر جانا یاد آجاتا ہے، اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ اس تماشہ میں کون سی اچھی نقل ہوئی تھی اور ہمارے دوستوں نے کیا مذاق کیا تھا! غرضنکہ اسی طرح ایتلاف در ایتلاف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور بیحد وحساب خیالات دماغ میں آجاتے ہیں اور اُنکی زنجیریں بنتی چلی جاتی ہیں تاآنکہ کسی بیرونی وجہ سے وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اس طریق کی لاجواب مثال الف لیلیٰ یا داستانِ امیر حمزہ ہے۔

ہر شخص کے دماغ میں بہت سے واقعات مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہوتے ہیں ایتلاف کے ذریعہ سے اُسی ذیل کے بہت سے واقعات کو ہم پیدا کر سکتے ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر آسان ایتلاف ہوگا اُسی قدر کم بوجھ ہمارے حافظہ پر پڑے گا۔

حافظہ میں چھٹی ضروری چیز دلچسپی ہے، اگر آپ کو حقیقی اور گہری دلچسپی ہے تو

اس طرف توجہ کا منعطف ہو جانا لازمی امر ہے۔ جن لوگوں کو نام یاد رکھنے میں دشواری ہوتی ہے وہ اُن کے نام خوب یاد رکھتے ہیں جن سے اُنکو دلچسپی ہے یا محبت ہے، فرض کیجیے کہ آپ نے سر مہاراجہ صاحب بہادر والی محمود آباد کی خدمت میں عرضداشت پیش کی۔ اور اُنھوں نے اُسکو ملاحظہ فرماکر ارشاد فرمایا کہ آپ کی درخواست پر ضرور توجہ کی جائے گی، اور دو ایک دن کے بعد اطلاع دیجائیگی، تو آپ کو ممدوح کے ایک ایک لفظ کے یاد رکھنے میں مطلق زحمت نہ ہوگی اور نہ ممدوح کا حلیہ آپ کے ذہن سے اُتر سکے گا۔

بعض لوگوں کو گیند بلّے کے کھیل سے دلچسپی ہوتی ہے اور اُن کو تمام مشہور کھلاڑیوں کے نام اور اُن کے کارنامے ازبر ہوتے ہیں مگر دو چار گھنٹے کے بعد اپنے اور ملاقاتیوں کی صورت بھول جاتے ہیں۔

ایک صاحب کے پاس عکسی تصاویر کا بڑا ذخیرہ ہے، اُن کو نہ تو صورتیں یاد رہتی ہیں، اور نہ کسی کا نام، لیکن اُن کو ایک ایک تصویر یاد ہے اور ہر صاحب تصویر کے مفصل حالات نوک زباں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اُنکو عکسی تصاویر جمع کرنے کا شوق ہی نہیں ہے بلکہ جنون ہے۔ نپولین کو اپنے ہزاروں سپاہیوں کے نام یاد رکھے، امریکہ کے مشہور سُراغرساں فرینک ولکنسن کو کم و بیش بیس ہزار جرائم پیشہ اشخاص کے نام اور اُنکی صورتیں یاد ہیں، اس شخص کو امن پسند اشخاص سے کوئی سروکار نہیں ہے، سُراغرسانی اُسکا فن ہے اور وہ اُس میں منہمک رہتا ہے، اسی وجہ سے مجرم کی ایک بار صورت دیکھ لینا اُسکے لیے کافی ہوتا ہے۔

دوکانداروں کو صورت شناسی اور نام یاد رکھنے میں اکثر ملکہ ہوتا ہے کیونکہ مال کی بکری گاہکوں پر منحصر ہوتی ہے، اور دوکاندار کو اپنا مال فروخت کرنے کے شوق میں گاہکوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

میری اس تحریر کا عملی لب لباب یہ ہے کہ جس بات کو آپ یاد کرنا چاہیں اس سے پوری دلچسپی پیدا کر لیجیے، اسکی دلاویز خوبیوں کو تلاش کر کے نکالیے، اور اپنے دماغ میں اسکا اثر پیدا کیجیے، اور سوچیے کہ اس کو حاصل کر کے یا اس سے متمتع ہو کر آپ کو کس قدر راحت اور مسرت حاصل ہو گی، ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ اسکو عمر بھر فراموش نہ کر سکیں گے۔

حافظہ کے لیے بڑی ضرورت سمجھنے کی ہے، اگر کسی چیز یا کسی معاملہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں تو اسکو یاد رکھنے کی آپ سے توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ لہذا جو بات حافظہ کو سپرد کرنی منظور ہو اسکو پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے،

حافظہ کی ترقی کا آخری اصول انتخاب ہے، ہر بات کا یاد رکھنا انسانی قوت سے باہر ہے، اور اگر ہر بات کو یاد رکھنے کی کوشش کیجائے گی تو کچھ بھی یاد نہ رہے گا۔ لہذا آپکو چاہیے کہ احتیاط اور غور کے ساتھ صرف ان باتوں کا انتخاب کریں جنکا یاد رکھنا ضروری ہو اور پھر ان پر اپنے دماغ کی شعاعیں ڈالیے۔

عام طور پر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک ہزار روپیہ کی قیمت کے اوزار سے ایک آنہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہم اپنے احباب کے لمبے چوڑے پتے اور انکے ٹیلیفون نمبروں کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ چاہیے یہ کہ کسی مناسب مقام پر ان کو نوٹ کریں اور حافظہ کو زیادہ اہم اور ضروری کاموں کے واسطے محفوظ رکھیں، دنیا میں سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جنکو بجائے حافظہ کے آپ کی یادداشت کی کتاب میں جگہ ملنی چاہیے۔ آپ کو اپنی منزل مقصود معلوم کرنی چاہیے اور یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ وہاں پہونچنے کا ذریعہ کیا ہے۔ اس کے بعد پھر صرف انھیں واقعات کو ذہن میں محفوظ کیجیے، جن کی آپ کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے، چونکہ ہر شخص کے واقعات جداگانہ ہوا کرتے ہیں، اس لیے ان کے ضروری اور غیر ضروری ہونے کے بارے میں کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آپ اگر اپنے ماحول پر نظر ڈال کر ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ضروری باتوں کو

چھانٹنا چاہیں گے تو آپ اُن کو ضرور چھانٹ سکیں گے، اور ذہنی ترقی کی طرف آپ ایک قدم آگے بڑھ سکیں گے۔

ہوشیاری کے ساتھ اپنے حافظہ اور توجہ کو ماسکہ (Concentration) پر لائیے محال کے لئے ابتدا میں آرزو نہ کرنی چاہیے، اگر نام اور صورتیں یاد نہیں رہتی ہیں تو ان کو یاد رکھنے کی اس طرح ابتدا ہونی چاہیے کہ ہر شخص کا نام اور اُسکی صورت کو یاد رکھنے کی کوشش کی جائے، ان میں بہت سی ایسی صورتیں ہونگی جن سے آپ کو عمر بھر واسطہ نہ پڑے گا، اور شاید ہی کوئی ایسا موقع آئے کہ وہ آپ کے کام آسکیں یا آپ اُن کی مدد کر سکیں، لہٰذا آپ صرف دو تین صورتوں کا انتخاب کر لیجئے اور اُنکو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش کیجئے اُن کے نام اور اُنکی خصلتوں کو لکھ لیجئے، دوسرے دن اُن پر نگاہ ڈالیئے) اور اپنے حافظہ میں اُنکو تازہ کیجئے، اس مشق کو جاری رکھیے اور ناغہ نہونے دیجئے، چند دنوں میں اسکے نتائج پر خود آپکو حیرت ہوگی۔

اگر آپ کو شکایت ہے کہ جو کچھ آپ پڑھتے ہیں وہ یاد نہیں رہتا، تو بیکار خواندگی کو یک لخت ترک کر دیجئے اور اشد ضروری مقامات کو انتخاب کر کے نہایت توجہ کے ساتھ روزانہ پڑھیے، ہر جملہ کو پڑھکر توقف کیجئے اور دیکھیے کہ جو آپ نے پڑھا ہے وہ یاد ہے؛ اگر صاف طور پر یاد نہیں ہے تو پھر پڑھیئے، بظاہر یہ طریقہ دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ آپ کے دماغ کی منتشر اور پراگندہ مشین کو درست کرنے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی مفید ترکیب نہو۔

بعض آدمی بہت زیادہ اور ہر وقت پڑھتے ہیں، روزانہ اخبار پڑھنے والے جو اخبار کو الف سے لیکر ے تک پڑھتے ہیں، اور علاوہ خبروں اور مضامین کے اشتہارات تک کو ایک نگاہ میں ہڑپ کر جانے کے عادی ہیں وہ اس اصول کے لحاظ سے پرانے مجرم ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی اخبار بینی سے حافظہ کو مدد نہیں ملتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حافظہ کے مسئلہ سے دلچسپی ہے، ورنہ آپ

اِس مضمون کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کرتے اور غالباً اِس کے مطالعہ کے وقت آپ کا شوق اور آپ کی توجہ اس طرف رہی ہیں۔ پس اگر آپ صحیح طور پر اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ بہترین حالات میں آپ کا حافظہ کس طرح کام کرتا ہے تو براہ کرم مندرجہ ذیل آٹھ سوالات کے جوابات دینے کی زحمت گوارا فرمائیے۔

(۱) حافظہ کو ترقی دینے کے سات طریقوں کے کیا نام ہیں؟

(۲) اِس مضمون میں نام اور صورت کو یاد رکھنے کے بارے میں جتنی ہدایات کی گئی ہیں اُن کو بتائیے۔

(۳) کون سے حاسّوں کا ذکر کیا ہے جو اثرات کو نظامِ عصبی کے سیلز تک پہونچاتے ہیں؟ ان کے نام بتائیے۔

(۴) فرانس کے مصنف ہودن کے طریقہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ طریقہ کیا تھا؟

(۵) بنک کے خزانچی نے اپنے حافظہ کو ترقی دینے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی تھیں؟

(۶) بصارت کے ذریعہ سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں اُن کا اوسط کیا ہے؟

(۷) سُراغ رساں ولکنسن کتنے مجرموں کو فوراً شناخت کر سکتا ہے؟

(۸) اِس مضمون کو پڑھتے وقت آپ نے اپنے حافظہ کو ترقی دینے کے لیے جن تدابیر پر عامل ہونے کا ارادہ کیا تھا اُن کو بتائیے؟

غزل

از
مولوی سید غلام مصطفیٰ صاحب ذہن حیدرآبادی

خوشدلی میں رنج بھی راحت کا ساماں کیوں نہ ہو
لیتے ہیں لطف گلستاں ہم بیاباں کیوں نہ ہو

کون ناظر کون ہے منظور کچھ کھلتا نہیں
آئینے کو دیکھکر آئینہ حیراں کیوں نہ ہو

اسکے شمع رخ کا پروانہ ہے یہ سارا جہاں
حسن عالم سوز پر اپنے وہ نازاں کیوں نہ ہو

ہے تصور ہی سے لطف دید و وصل دلربا
جب خیال آئے مرے دل میں وہ مہماں کیوں نہ ہو

ان گناہوں پر بھی ہے یارب وہی تیرا کرم
تیرے اس احساں سے بندہ پشیماں کیوں نہ ہو

تو ہی خالق تو ہی رازق تو ہی رب تو ہی رحیم
ساری دنیا اے خدا تیری ثناخواں کیوں نہ ہو

رحمۃ للعالمیں کی حق نے خود کی ہے ثنا
جو خلیق ایسا ہو وہ محبوب یزداں کیوں نہ ہو

جور ہو یا مہر دونوں کا اسی سے ہے لگاؤ
وہ کرے ظلم و ستم بھی تو یہ احساں کیوں نہ ہو

غم مرا مونس ہے میں غمخوار ہوں غم کا ذہن
نام کو سنکر مرے راحت گریزاں کیوں نہ ہو

پادشاہ مرگیا، پادشاہ زندہ باد

(مترجمہ جناب حاجی محمد خاں صادق ایوبی صاحب)

جس کمرے میں بادشاہ بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا، وہاں کچھ بہت خاموشی نہ تھی لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اور وہ دبے پاؤں مضطربانہ انداز میں کانوں کان کچھ کہہ بھی رہے تھے۔

خفیف آہٹ بھی بعض اوقات گھبراہٹ پیدا کر دیتی ہے جس کی تاب بیمار آدمی مشکل سے لا سکتا ہے۔ لیکن اس اندیشہ سے کیا حاصل تھا، جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اسے اب کچھ سنائی نہیں دیتا، اور نہ ہی اس نے اپنی قوت سماعت کا کوئی ثبوت دیا تھا، ورنہ اپنی حسین و جمیل بیوی کو جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس حالت میں دیکھ سکتا تھا؟

چند دنوں تک اس بات کا بہت خیال کیا گیا کہ کمرے میں روشنی نہ آنے پائے، لیکن افراتفری میں یہ التزام نہ رہ سکا اور پردے چھٹتے رہے۔ لیکن یہ اندیشہ بھی فضول تھا! جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ "وہ اب اندھا ہے" کچھ دنوں تک وہاں صرف تیمار دار ہی تیمار دار جا سکتے تھے۔ لیکن آج ہر شخص کیواسطے دروازہ کھلا تھا۔ جو در آئے۔ اب کیا مضائقہ تھا؟۔

جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ "وہ کسی کو پہچان بھی نہیں سکتا" وہ بہت دیر تک پلنگ پوش پر اپنا ہاتھ پھیلائے اس طرح پڑا رہا ہے کہ گویا وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے، ملکہ نے جوش محبت سے بیخود ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ لیکن جواب میں گرمجوشی نہ تھی، اور بالآخر اس کی آنکھیں،

منہ اور دل کی حرکت بند ہو گئیں۔ جو لوگ پاس کھڑے تھے آپس میں کہنے لگے "بادشاہ کا چہرہ کس قدر حسین معلوم ہوتا ہے!"

جب بادشاہ آپے میں آیا تو کمرے میں سناٹا تھا، اُس نے دل میں کہا کہ "یہ سکوت اور یہ تاریکی کتنی مسرت آفریں ہے۔ وہ اس نئی کیفیت سے بیحد متاثر ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہشت میں ہے۔

کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا، رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی سے آرہے تھے۔ پائینتے موم بتیوں کی قطار تھی۔ اور ہلکی ہلکی روشنی کے ساتھ جل رہی تھیں۔ بادشاہ سیاہ مخمل کی چادر میں لیٹا پڑا تھا۔ صرف اُسکا چہرہ اور سر کھلا ہوا تھا۔ چار پانچ آدمی اس کی حفاظت کے لیے متعین تھے۔ لیکن اب وہ بھی سو گئے تھے۔

اطمینان کی یہ نامتناہی کیفیت جس کا اُس کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا اِس قدر گہری اور عمیق تھی کہ اُس نے جنبش تک نہ کی، اور خاموش پڑا رہا۔ لیکن جب محل کے بڑے گھڑیال نے گیارہ بجائے تو اُس نے کروٹ لی اور خفیف تبسم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا وہ آپ بیتی یاد رکھتا تو کس نوع سے، جب کہ اُسکا دل ہی اُسکا ساتھ چھوڑ چکا تھا، اور ہوش و حواس پراں ہو گئے تھے۔ آخر اُس نے عصباتی ہیجان پر قابو پا کر اُس غیر منصفانہ فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جو اُسے ایسی حالت میں دنیا سے علیحدہ کر رہا تھا۔ جب کہ دنیا والوں کو اُسکی شدید ترین ضرورت تھی۔ معاً اُسے ایک آواز سنائی دی "موت کے بعد تجھے گھنٹہ بھر کی مہلت ہو گی! تجھکو اگر اِس عرصہ میں تین شخص بھی ایسے مل جائیں کہ جو تیری دوبارہ زندگی چاہتے ہوں، تو اِس دنیا میں پھر زندہ رہ سکتا ہے"

موت نے اُسے ایک گھنٹہ کی قلیل مہلت دی تھی۔ لیکن وہ اِس تھوڑی میعاد سے مخوف نہ ہوا۔ کیونکہ وہ ایک نیکدل حکمراں تھا، اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے واسطے شب و روز سرگرم عمل رہ چکا تھا۔ اُسکا قلب مطمئن تھا، لیکن اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی نہایت شیریں ہے۔

اِس سے قبل وہ اِس عشرت کا اندازہ نہ کرسکا تھا۔ کیونکہ وہ خودغرض بھی تھا اُس نے اپنے ایک غیر تکمیل یافتہ کام کے خلاف نیا قانون نافذ پاکر بہت رنج ہوا، وہ کمرے سے نکل کر وہاں پہونچا۔ جہاں محافظین گہری نیند سو رہے تھے اُسے بعض چیزوں میں کچھ تغیر تبدّل بھی نظر آیا۔ وہ صحیح طور پر خیال کرنے لگا کہ میری کاوشیں کچھ زیادہ وقیع نہیں ہیں، مجھ سے بہتر آدمی اس وسیع و عریض دنیا میں موجود تھے، جو مجھ سے کہیں زیادہ خوش اسلوبی کے ہاتھ کام سرانجام دے سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اَب دنیا و مافیہا اُسے وسیع و عریض بھی نظر آنے لگتی تھی، اُسے اپنے گھر اور محل سے بیحد محبت تھی، رات ہی سے اُسے یہ سُونے دکھائی دینے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد اُسے معلوم ہوا کہ اُسکا ملک اور گھر اپنی حالت پر بدستور قائم ہیں۔

وہ دروازہ سے نکلکر ایک لمحہ کے لیئے ہچکچایا کہ پہلے ملکہ کے پاس نہ جانا چاہیئے۔ پھر وہ ملکہ کے غم و اندوہ کے خیال سے کانپ گیا، وہ اُس سے ملنا کبھی نہ چاہتا تھا جب تک وہ خود اُس سے ہم آغوش ہوکر خوشی کے آنسو نہ بہائے۔

اَب اُس نے اندازہ کیا کہ مہلت کی میعاد صرف ایک گھنٹہ ہے اور بارہ بجنے پر ہیں دوبارہ جامۂ زندگی پہن لونگا۔ موت اور موت کی کارفرمائیاں خواب و خیال ہوجائیں گی ....

بادشاہ پھر اپنے بستر مرگ کے پاس آیا، جس سے وہ علیحدہ ہوچکا تھا۔ اور

کہا کہ "میں خوف کے باعث ابھی کچھ نہیں کر سکا"

یہ کہکر وہ معاہدہ کی شرط پر ہنسنے لگا۔ سامنے چاندنی میں اس کا شہر جگمگا رہا تھا اُس نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "نہیں نہیں میں تین ہزار آدمی ایسے تلاش کرونگا، جو دوبارہ میری زندگی چاہتے ہونگے۔ تمام ملک میرا پرستار اور دلدادہ ہے" جونہی وہ دروازہ سے گذرا، زینہ پر ایک بچی نظر آئی جو رو رو کر چلا رہی تھی۔

ایک محافظ نے رُک کر کہا "ننھی کیا بات ہے، روتی کیوں ہو؟"

بچی نے سسکی لے کر کہا "اماں اور بابا محل میں گئے ہیں۔ ہمارا نیک دل بادشاہ مر گیا ہے اور میری گڑیا بھی ٹوٹ گئی ہے، اور وہ ابھی واپس نہیں آئے۔ میں تھک گئی ہوں۔

کاش! کہ ہمارا بادشاہ دوبارہ زندہ ہو جائے" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن بادشاہ اس گفتار سے کچھ زیادہ مسرور نہ ہوا۔ اُس نے کہا کہ "میری رعیت میں یہ پہلی بچی ہے جو مجھے دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتی ہے"

بادشاہ لاولد تھا۔ وہ ٹھہرتا اور اس بچی کو چمکار کر بہلاتا۔ لیکن کئی کام ضروری تھے۔ اور وقت کم تھا۔

وہ اپنے ایک دوست کے گھر کی طرف روانہ ہوا جو اُسے بہت عزیز تھا اور اُسکی انتہائی ناامیدی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لاکر کہنے لگا "غریب ایاز مجھ پر جو گذرتی ہے، کچھ نہ پوچھ! میں مسرور ہوں کہ تو اس دنیا میں موجود ہے ورنہ میں اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکتا"

جب وہ اپنے دوست کے گھر کے صحن میں آیا تو لوگ شمعیں ہاتھوں میں لیئے جا رہے تھے، اور گھوڑے سازوسامان سے آراستہ و پیراستہ کیے جا رہے تھے جن کی وجہ سے کچھ گھبراہٹ پھیل گئی تھی، مگر اُسے اپنا دوست نظر نہ آیا جیسے وہ

ایک بار نہیں ہزار بار دیکھ چکا تھا۔ تلاش یار میں وہ ایک ایک کمرے میں گیا۔ یکایک وہ اس خیال کے آتے ہی تھرا گیا۔ "کہیں ایاز میرے غم میں جان تو نہیں دے چکا۔" آخر کو وہ اس خاص کمرے میں آیا جہاں وہ کئی بار مل کر مصروفیت کے لمحے مسرت و انبساط کے ساتھ کاٹ چکے تھے۔ لیکن اسکا دوست یہاں بھی موجود نہ تھا۔ قیاس اور قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔ کتابیں اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اور ایک چھوٹی سی تصویر بھی پڑی ہوئی تھی۔ جس کا چوکھٹا گرنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے اٹھا کر دیکھا تو وہ خود اسی کی تصویر تھی! اس نے تصویر کو اٹھا کر پھینک دیا، آگ روشن تھی۔ کاغذ کے ٹکڑے کچھ جل چکے تھے اور کچھ ابھی جلنے سے بچ رہے تھے، انھیں اٹھا کر دیکھا تو یہ اس کے اپنے آخری خط کے پرزے تھے۔ اس خط میں اسنے اپنی ایک خاص تجویز پیش کی تھی۔ افسوس کہ موت نے مہلت نہ دی اور تجویز دل کی دل میں رہگئی۔

اس نے اپنے خط کے پرزوں کو آگ کے سپرد کیا ہی تھا کہ دو آدمی باتیں کرتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد تھا۔ جو بوٹ اور مہمیز لگائے ہوئے تھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی دور و دراز سفر سے واپس آیا ہے۔

اس نے پوچھا "ایاز کہاں ہے؟"

عورت نے جواب دیا "وہ نئے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کیلئے گیا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق ہم بیحد پریشان ہیں۔ یہ نیا بادشاہ اس قطع و قماش کا انسان نہیں ہے جیسا کہ وہ مرنے والا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اس سے تنفر بھی تھا۔ ایاز کو پچھلے رسوخ کے باعث نئے دربار میں بہت سی۔

دقتوں کا سامنا ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ جلد یہ کانٹے صاف کرے گا۔ اس نے یہ تو ابھی سے اعلان کر دیا ہے کہ مجھے اِن فضول اصلاحات کے نفاذ میں مرحوم بادشاہ سے ایک حد تک خصوصیت تھی۔ لیکن خیالات کا معاملہ جدا چیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کے جذبات و حسیات کا خیال تک نہیں کرتے۔ لیکن ہم لوگوں کو جمہور کی آزادی کا ہمیشہ احترام رہا ہے۔ اس لیے بادشاہ کی موت کے بعد ایاز یہاں سے فوراً چلا گیا۔ اَب میں اُسکی سواری کا انتظام کر رہی ہوں۔ مرد کو بادشاہ نے پہچان لیا تھا وہ اُس کا سفیر تھا۔ مرد نے کہا "بالکل بجا ہے میں بھی اس کی تقلید کرونگا۔ آپ اور ہم لوگ ہی تو ملک کے سچے بہی خواہ ہیں۔ یہ نوخیز بچّہ تو سیاست کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ ہاں مرنے والے نے جنگ کے خاتمہ کے واسطے ایسے وقت میں مجھے مجبور کیا تھا کہ جس کا نتیجہ ملکی مفاد کے لیے کسی طرح سے بھی اچھا نہ تھا۔ میں مسرور ہوں کہ اَب جنگ جاری رہے گی۔ اگر وہ ہم میں موجود ہوتا تو فوج کی ترقی کا سوال تک نہ اُٹھتا"

بادشاہ یہاں کچھ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا، اور کہنے لگا "میں اپنی رعایا کے پاس جاؤنگا، جنھیں میرے جانشین سے کچھ زیادہ سروکار نہیں بلکہ اُسکے تخت نشیں ہوتے ہی میرے دیے ہوئے حقوق و مراعات بھی اُن سے چھین لیے جائیں گے"

وہ آگے بڑھا تو گھڑیال نے سوا گیارہ بجائے۔

وہ ایک شریف النفس اور نیک دل حکمراں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت کے غریب طبقہ سے بھی واقف تھا۔ وہ ایک بار نہیں کئی بار بھیس بدلکر اُس طرف جا چکا تھا، اُنکی مفلسی سے متاثر ہو کر اُسنے وہ رعایتیں کر دی تھیں جو اس سے قبل کبھی عالم وجود میں نہ آئی تھیں۔

اُس متعدی بخار کے چمٹنے کی جگہ سے، جو اُسے قبر میں لے گیا تھا کوئی بھی واقف نہ تھا۔ لیکن بخار کے متعلق خود اس کا اپنا شبہہ نہایت قوی تھا۔ یعنی انھیں افلاس زدہ لوگوں میں جانے سے وہ اس مرض کا شکار ہوا تھا۔ چنانچہ اب بھی اُس نے سیدھا اُسی طرف کا رُخ کیا اور مسکرا کر کہا "اب مجھے کسی قسم کا بخار نہیں آسکتا ہے۔ ان کے گھر اُسی طرح خستہ و خراب حالت میں تھے اور لوگ ویسے ہی بیمار اور میلے کچیلے تھے۔ اگرچہ وقت زیادہ گذر چکا تھا۔ لیکن لوگ ابھی بازار میں جوق در جوق اسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور اُسی کا نام برابر لیا جا رہا تھا۔ سب سے زیادہ لطف انگیز باتیں اسکی بیماری کا تذکرہ اور اُس کے جنازے کے کوائف تھے۔

ایک معمولی سے شراب خانہ میں پانچ سات آدمی گول میز کے گرد بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بادشاہ ان کی باتیں سُننے کے لیے رُکا۔ ایک آدمی کو جسے وہ بخوبی جانتا تھا کہنے لگا "لو خوب چھٹکارا ہوا ایسے بادشاہ سے کیا فائدہ جسنے فراخدلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ کبھی ایک اٹھنّی بھی خرچ نہ کی۔ اس قسم کے مصارف سے تجارت کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ یہ نوخیز بچہ اُس قطع وقماش کا نہیں ہے۔ اب تو خوب روپیہ اچھالینگے۔

دوسرے نے بات کاٹ کر کہا "وہ تنگ دل انسان تھا اور خواہ مخواہ دخل در معقولات دیا کرتا تھا۔ اُسے کیا حق حاصل تھا کہ ہمارے معاملات میں اُلجھا کرے۔

ہمیشہ اسکی بارگاہ سے گھروں اور مکانوں کی صفائی کے احکام جاری ہوتے تھے۔ اوّل تو بادشاہ وادشاہ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ہو بھی تو ایک ایسا نوجوان ہونا چاہیے جو اپنی جورو سے دب کر نہ رہے اور کم سے کم شراب،

مگر اصفہانی شراب کا دلدادہ ضرور رہو"

چوتھے نے چلّا کر کہا "اب تو پھانسی والنسی کی سزا بھی موقوف ہونے لگی تھی۔ جس کا مدعا محض یہ تھا کہ قیدی مدت العمر جیل خانوں میں پڑے سڑا کریں اور اِن سے سخت کام لیئے جائیں"

اس وقت بادشاہ کا سب سے بڑا دشمن بھی گالیاں دیتا تو شاید وہ اتنا اذیت کوش نہ ہوتا۔ لیکن بادشاہ اِن الفاظ کی تاب نہ لا سکا۔

جب وہ یہاں سے رخصت ہوا تو گھڑیال ساڑھے گیارہ بجا چکا تھا! وہ سیدھا اُس قیدخانہ میں پہونچا، جہاں پھانسی پانے والے محبوس تھے، وہ خوش ہوا کہ ابھی پھانسی کی سزا موقوف نہوئی تھی۔ اِس کلبۂ احزاں میں صرف ایک پستہ قد انسان موجود تھا۔ جو اپنے گھٹنے پر کاغذ رکھ کر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ بادشاہ اُسے ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن اَب خصوصیت سے دیکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں داروغہ جیل اور مجلس وزرا کے صدر اول آ گئے جن کے ساتھ بادشاہ کو بھید اُنس تھا قیدی نے گردن اُٹھا کر کہا "میرے لیئے توکل کا دن مقرر تھا"، ساتھ ہی قیدی نے محسوس کیا کہ یہ کہنا کہیں بزدلی پر محمول نہ کیا جاے۔ اسلیئے کہنے لگا "بہرکیف میں ہر لمحہ تیار ہوں، کیا آپ یہ خط میری بیوی تک پہونچا دینگے؟"

مجلس وزرا کے صدر اول نے متانت کے ساتھ جواب دیا "بادشاہ مرچکا ہے، تمھاری سزا بھی معاف کر دیجائے گی۔ کیونکہ نئے بادشاہ کے خیالات کچھ اور ہیں"

قیدی نے متحیر ہو کر پوچھا "بادشاہ مرچکا ہے ......؟"

"جی ہاں بادشاہ مرچکا ہے"

قیدی نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہا "میرے دل میں اسکا قدر اور احترام ہے، کچھ بھی ہو وہ ایک بادشاہ تھا۔ میرے ساتھ اسکا برتاؤ شریفانہ رہا۔ میری طرح اسکی بیوی بھی نوجوان ہے

کاش کہ وہ ایک بار پھر زندہ ہو جائے"
یہ کہکر الماس کے نگینے توڑنے لگا۔

جب بادشاہ زندان سے نکلا تو گھڑیال نے پونے بارہ بجائے۔ اُس نے دشمن کا رحم ایک دوست کے تنفر سے کہیں زیادہ ناقابل برداشت پایا۔ وہ اس ذلت اور رسوائی کے خیال سے زمیں میں گڑ گیا، حقیقتاً ایک ایسے شخص کی وساطت سے زندگی کا دوبارہ حصول اسکے لیئے باعث ننگ تھا۔ بہرکیف وہ ایک نجیب تھا۔ اسلیے شریفانہ خیالات سے مسرور رہوا۔ اسنے اپنے حالات پر تبصرہ کیا اور کہا "میری کاوشوں کا اچھا صلہ ملا محبت اور وفاداری کا اعتماد محض ایک خواب تھا وہ بھی پریشان جن لوگوں کے واسطے میں آمادہ کار تھا، افسوس! کہ انمیں اتنی بھی صلاحیت نہ آئی کہ وہ اصلاح لے سکیں۔ میرا حلقۂ احباب ایک فیاض دشمن اور ایک بیوقوف ننھی بچی تک محدود ہے۔ ایسے عالم میں زندگی کی تمنا بیسود ہے۔ میرے لیئے بہتر ہوگا کہ میں صبر و سکون کے ساتھ موت کے خلاف تگ و دو چھوڑ دوں۔ مجھے سبق ملگیا ہے میں اب اطمینان کی گہری نیند سوؤنگا۔ تقدیر کا فیصلہ برحق اور درست ہے۔ گیا ہوا اگر میری رعیت بے وفا اور جھوٹی ہے؟"

اب وہ ٹھنڈے دل سے غور و خوض کر رہا تھا!

چاند بادلوں میں چھپ گیا اور سردی شدت کے ساتھ تیز ہو گئی، اُسے اپنی بیکسی اور تنہائی کا احساس ہونے لگا اور دل خود بخود بیٹھنے لگا۔

"حقیقتاً میری کسی کو پرواہ نہیں ہے؟"

اب وہ تلطف آمیز کرم کے ساتھ دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کو تیار تھا۔ اور اعتراف محبت کا بیحد متمنی تھا۔

وقت مہلت میں ابھی کچھ لمحے باقی تھے اور یہ انتظار اُسے بیحد شاق تھا لیکن وہ مطمئن تھا کہ ابھی حقیقی مسرت اسکے لیئے دنیا میں موجود تھی..... مگر آہ یہ محض فریب خیال تھا!

موجودہ تلخ تجربہ کی بنا پر وہ اپنی بیوی کے دروازہ پر رکا اور کشمکش میں پڑ گیا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں؟ ممکن ہے کہ یہاں بھی امید کو پیام مرگ مایوسی ملے۔ میرے لیے بہتر ہوگا بغیر اسکو اطلاع کیے رخصت ہو جاؤں۔ مگر اسکو یہ خیال پسند نہ آیا کیونکہ وہ دنیا میں کبھی خوف زدہ نہوا تھا۔ وہ کمرے میں گھس گیا سامنے آگ کے قریب منھ چھپائے اسکی ملکہ بیٹھی تھی اور اسکے لمبے لمبے بال پریشان تھے۔ پہلی نظر میں اسنے صحیح طور پر محسوس کیا "میرا خوف فضول ہے"!

اسکی انگلی میں بادشاہ کی دی ہوئی انگوٹھی ابتک موجود تھی وہ اسکو کبھی جدا نہ کرتی تھی اس انگوٹھی کا نگینہ چمک کر رہا تھا۔ اور کمرہ میں صرف اسی نگینہ کی روشنی تھی!

بادشاہ کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنی بیوی کی تسلی کر سکے۔ ساتھ ہی وہ متحیر تھا کہ اس کی سہیلیوں نے اسے کیوں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ یہ ماتم کی پہلی رات ہے۔

ملکہ خاموش بیٹھی خیالات کے جال بن رہی تھی۔ بادشاہ نے دل میں کہا "کیوں نہ اسکا نام پکار کر اسکی دنیائے الم برباد کر دی جائے"؟ لیکن ایکدم ایک آواز نے بادشاہ کو چونکا کر دیا۔ دیوار میں ایک خفیہ دروازہ تھا جسکا علم ملکہ اور بادشاہ کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ وہ خفیہ دروازہ کھلا اور ایک شخص ملکہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

ملکہ نے اپنی انگلی لبوں پر رکھی جسکا مقصد تھا کہ نووارد بالکل خاموش رہے۔

پھر اس نے اپنی باہیں پھیلا کر اسکو سینہ سے لگا لیا۔ ....

ملکہ نے کہا "میں خوش ہوں کہ تم آ گئے۔ مرتے وقت مجھے اسکا ہاتھ تھامنا پڑا۔ اب میں تن تنہا بیٹھی ہوئی اس خوف سے کانپ رہی تھی کہ کہیں اسکی روح بھوت بنکر مجھپر سوار نہو جائے۔ شکر ہے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ اب ہمارے دن خوشی سے کٹیں گے" یہ کہکر اسنے اپنی انگوٹھی اتار کر اس آدمی کو پہنا دی.....

جس وقت گھڑیال نے بارہ بجائے محافظین چونک کر اٹھ بیٹھے۔ مگر بادشاہ کی لاش اسی طرح سر رکھی تھی البتہ اسکے چہرہ کی حالت مسخ ہو گئی تھی۔ محافظین آپس میں کہنے لگے "اب ملکہ کو اسکا چہرہ نہ دکھانا چاہیے"

(میری کالرج)

غزل

جناب صدق صاحب جائسی

کیا تیر تھے چھپے ہوئے چشمِ سیاہ میں
تڑپا دیا کسی نے مجھے اِک نگاہ میں

بھر دی ہے کوٹ کوٹ کے شوخی نگاہ میں
اِک برق کوندتی ہے تری جلوہ گاہ میں

کیونکر نسیم کوچۂ جاناں کو دوں خبر
مثلِ غبار کب سے پریشاں ہوں راہ میں

ظالم یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہوئی
اُف اُف میں رات کٹتی ہے دن آہ آہ میں

کہتے ہیں آکے دل میں تصور بھی شرط ہے
ہم بھی کمی کرینگے نہ اس رسم و راہ میں

انجان بنکے دوست سے اک دن نشانِ دوست
جی چاہتا ہے چھیڑ کے پوچھوں میں راہ میں

کیا بد نصیب دل ہے کہ اس باوفا کی قدر
میری نگاہ میں نہ تمھاری نگاہ میں

سننے لگے ہیں صدق کے اشعار بزم میں
آنے لگا ہے لطف انھیں آہ آہ میں



یمن کے قدیم آثار اور علمائے یورپ

ایک اطالوی مستشرق کے لیکچر کا خلاصہ

از

جناب مولوی محمد حسین صاحب حسانؔ

یمن کی سرزمین کا چپہ چپہ قدیم کھنڈرات کتبات و آثار سے لبریز ہے جو وہاں کی قدیم تاریخ تہذیب و تمدن کی نمایاں دلیل ہے۔ اہل یورپ نے ان کتبات و آثار اور ان کے ذریعہ یمن کی قدیم تاریخ کو برافگندہ نقاب کرنے کیلئے جو کوششیں صرف کی ہیں تلاش و جستجو میں جس طرح چند در چند مصائب و تکالیف برداشت کی ہیں اور تمام مشکلات موانع پر قابو حاصل کر کے جسطرح کامیابی حاصل کی ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قومیں علمی تحقیقات میں کسقدر شغف رکھتی ہیں آج کی صحبت میں ہم ان زندہ دل اہل یورپ کی سعی و کاوش اور جد و جہد کا تذکرہ کریں گے جو گوناگوں مشکلات کا سامنا کر کے یمن میں پہونچے ہیں اور وہاں زبردست اور اہم تاریخی انکشافات کئے۔

بلاد یمن اور حضرموت بحر احمر کے ساحل اور خلیج عدن پر واقع ہیں اور اس موقع پر ہونیکی وجہ سے ان کو بہت بڑی تجارتی اہمیت حاصل تھی اکثر ہندوستان اور دیگر ممالک کے درمیان آنے جانے والی جہازات اور کشتیاں یمن سے ہو کر گذرتی تھیں، سولھویں صدی عیسوی میں یورپ کے جہازات بھی اکثر اسی طرف سے ہو کر گذرتے تھے۔

لودیکو قارتلتیا اہل یورپ میں پہلا شخص جو بلاد یمن میں داخل ہوا وہ لودیکو قارتلتیا ہے جسوقت وہ عدن میں آیا وہاں کے ایک رئیس نے گرفتار کرلیا اور ۶ مہینے تک قید رکھکر چھوڑ دیا اس قید سے رہائی پانے کے بعد اس نے صنعا کا

سفر اختیار کیا پھر وہاں سے وہ جنوب کی طرف لوٹا ظفار، اور تعز کی سیاحت کی پھر زبید اور بحر احمر ہوتا ہوا اٹلی کی طرف واپس گیا وہاں جاکر اس نے مشرق کے حالات میں ایک زبردست کتاب (سفرنامہ) لکھی اور یمن کے حالات کے لئے ایک جز مخصوص کر دیا۔

ڈی لاغریلو دییر Della Greaudiere

یہ دوسرا سیاح ہے جو ۱۷۱۲ء میں بلاد یمن میں داخل ہوا لیکن اس نے یمن کے بہت تھوڑے حصہ کی سیاحت کی وہ ایک فرانسیسی جہاز پر ہندوستان سے آرہا تھا جو مخا کے بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گیا۔ امام یمن ان دنوں بیمار تھا۔ اسے جب خبر ہوئی تو اس نے فوراً جہاز کے طبیب ڈاکٹر کو بلا بھیجا سیاح نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ڈاکٹر کی معیت اختیار کری، اور شہر مواہیب[۱] تک جہاں اسوقت امام یمن قیام پذیر تھا اسکے ساتھ رہا۔ اس نے اس مختصر سی سیاحت کا چھوٹا سا سفرنامہ بھی لکھا۔

میخائلس Michaelis **کی مہم**

میخائلس ایک جرمنی عالم عبرانیوں کے آثار اور توراۃ کے نسخوں اس کی اصل اور شروح کے متعلق بحث و تحمیص میں مشغول تھا کہ اس کے دل میں مشرق سیاحت اور وہاں کے عادات واخلاق رسم ورواج تاریخی وجغرافی حالات حیوانات و نباتات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا خصوصاً توارۃ میں یمن ملوک یمن اور وہاں کے تمدن و تہذیب اکثر مقامات پر تذکرہ دیکھکر اس کے خیال کو اور تقویت ہوئی اور یمن جانے کے لئے ایک مہم ترتیب دینے کی تجویز اس کے ذہن میں آئی اور اس تجویز کو اس نے شاہ ڈنمارک کے سامنے پیش کیا جس نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ اور اسے اس مہم کی ترتیب کا حکم دیا۔ اس نے جرمن، سویڈ اور ڈنمارک سے پانچ علما کو منتخب کیا جن میں کارسین نیبر Carsten Niebuhr

---

[۱] ذمار کے قریب ایک شہر تھا۔ یمن کا امام اس وقت امام مہدی محمد بن احمد بن الحسن تھا۔ ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۶ء) میں پیدا ہوا اور رمضان ۱۱۳۰ھ ( ) میں وفات پائی مواہیب کے قلعہ میں دفن کیا گیا (ترجمہ)

ڈنمارک کا فوجی افسر اور فورسکل (Forsskal) سویڈی ماہر نباتات بھی تھے۔
۱۷۶۱ء میں یہ مہم قسطنطنیہ اور وہاں سے قاہرہ گئی اور قاہرہ میں اتنی مدت تک قیام کیا کہ سویڈی ماہر نباتات نے مصر کی نباتات کے متعلق ایک کتاب لکھی، ۱۷۶۳ء میں یہ لوگ گئے اور یمن میں داخل ہو کر صنعا تک چلے گئے، اور مہم کے دو ارکان مر جانے کے بعد وہاں سے مخا چلے آئے۔ پھر ہندوستان کی طرف سفر کرتے وقت دو رکن اور مر گئے اور صرف نیبھر باقی رہ گیا۔ اس نے وطن واپس ہونے کے بعد دو اہم کتابیں لکھیں ایک جزیرۃ العرب کے حالات میں اس کتاب میں اس نے تمام معلومات کو ترتیب دیا جنھیں سواحل بلاد میں بیٹھکر جمع کیا تھا، دوسری کتاب صرف بلاد یمن کے حالات میں لکھی تھی اپنی سیاحت کے دوران میں حمیری کتبوں سے مطلع نہ ہوا البتہ لوگوں نے بتایا کہ اس قسم کے کتبے ظفار میں پائے جاتے ہیں جو یریم سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔

سٹزن Seetzen

نیبھر کی کتاب نے ایک جرمنی عالم سٹزن کو جس نے اپنی زندگی کا کافی حصہ قیصر روس کی خدمت میں بسر کیا تھا مشرق اور یمن کی آثار کی تفتیش پر آمادہ کیا اس نے شام اور فلسطین کا سفر کیا اور ان دونوں کا ایک سفر نامہ لکھا پھر یمن کا قصد کیا اور ۱۸۱۰ء میں حدیدہ گیا اور مسلمان ہو گیا حدیدہ سے صنعا گیا وہاں سے جنوبی سمت کا رخ کیا اور وہی راستہ اختیار کیا جو نیبھر نے اپنی کتاب میں بیان کیا تھا یہانتک کہ ذمار پہونچگیا اور موضع حذافہ کا پتہ دریافت کیا لیکن اس اطراف کے لوگ کچھ نہ تبلا سکے کیونکہ اس گاؤں کا صحیح نام ضاف تھا، وہ برابر جنوبی سمت بڑھتا چلا گیا اور ظفار پہونچ گیا وہاں اس نے تین کتبے پائے جن میں ایک خرید لیا دوسرا بلند مقام پر تھا جہاں اس کی رسائی نہ ہو سکی اور تیسرے کو وہاں سے جلد منتقل ہو جانیکی وجہ سے نقل نہ کر سکا پھر ایک گاؤں کی مسجد میں جو ظفار سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر تھا، پانچ کتبے پائے جن میں سے تین پر بلندی کی وجہ سے اس کی رسائی نہ

ہوسکی دو کتبوں کی نقل لیلی اور انھیں یورپ بھیجدیا۔ یہ اولین حمیری کتبے تھے جو یورپ میں داخل ہوئے نیبھر نے دوسرے مقامات کی بھی سیاحت بھی کی مگر بعد میں وہ مفقود الخبر ہو گیا اور نہیں معلوم کہ کہاں مرگیا۔

حکومت بمبئی کا جہاز نیبھر کے پچیس برس بعد تک یمن کے دوسرے کتبوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی، البتہ سنہ ۱۸۳۰ء میں حکومت بمبئی (ہندوستان) نے سواحل یمن کی جانب وہاں کے نقشے مرتب کرنیکی غرض سے اپنا ایک جہاز بھیجا اور اس جہاز نے سنہ ۱۸۳۳ء میں حضرموت کے ساحل حصن الغراب کے سامنے لنگر ڈال دیا، جہاز کے افسروں کو جنمیں سے ایک افسر کا نام ولسٹڈ (Wellsted) ہے۔ حصن غراب کے پہاڑ میں کچھ کھنڈرات نظر آئے جنکی وجہ سے ان کے دل میں پہاڑ پر چڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا جب وہ چوٹی پر پہونچے تو انھیں کثرت سے قدیم آثار ملے جنمیں عظیم الشان برج بھی تھے جو غالباً اس محفوظ ترین قلعہ کے دروازے تھے جو پہاڑ کی بلندی پر قائم تھا وہاں انھوں نے دو کتبے دیکھے جنکے حروف کو حبشی زبان سے مشابہ پایا اور حمیری سمجھکر نقل کر لیا اور یورپ واپس جا کر ان کتبوں کو شائع کر دیا۔

دوسرے سال اس جہاز نے پھر سواحل یمن کا قصد کیا ساحل پر اتر کر الحاف چلے گئے جہاں ان کو بتایا گیا کہ یمن کے اندرونی حصہ میں بہت سے کھنڈرات ہیں جنمیں کثرت سے کتبے پائے جاتے ہیں، یہ سنکر انھوں نے اندرونی مقامات میں جانیکا تہیہ کر لیا اور نقب الھجر کے خرابات میں ایک پہاڑ کی اس بلند مقام پر پہونچگئے جو وادی میفعہ کیجانب مائل ہے تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اس پہاڑ کے نیچے کی تہائی حصہ کی مرتفع میدان کو عظیم الشان برجوں کی دیوار احاطہ کئے ہوئے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قلعہ کی شکل میں ایک زبردست شہر آباد تھا جسکے جنوب و شمال میں دو دروازے تھے ولسٹڈ وہاں داخل نہ ہوسکا لیکن بعض کتبونکو نقل کر لیا اور اپنے ساتھ یورپ میں لیتا آیا لیکن کتابت غیر واضح ہونیکی وجہ سے علما اس سے مستفید نہ ہوسکے۔

ولیسٹڈ نے حصن غراب میں جن چیزوں کا انکشاف کیا ان میں عمدہ اور بہترین بنے ہوئے نقشے بھی تھے جن کے نشانات سرخی سے رنگے ہوئے تھے اس کے علاوہ دوسری تحریروں کا پتہ چلایا جنھوں نے حمیری تحریر کا راز معلوم کرنیکا دروازہ کھولدیا۔ اور مسٹر ولیلم جسینیوس Wilhelm Gesenius اور امیل رودجر Emil Rödiger نے انکے مطالبہ کرنے میں بہت جد و جہد کی دونوں نے ۱۸۴۱ء میں ان خطوط کی تفسیر میں ایک رسالہ شائع کیا وہ ان کے بہت ہی کم الفاظ سمجھ سکے، رودجر نے دوسرے سال پھر سخت کوشش کی اور اس مرتبہ وہ نصف کتبوں کی تشریح میں کامیاب ہوگیا۔

سر کروٹندن Cruttenden

جولائی اور اگست ۱۸۳۶ء میں ایک انگریز افسر سر کروٹندن نے مخا سے صنعا کا قصد کیا اسے شہر کے راستہ میں اور منزلوں میں سفید سنگ مرمر کے پانچ کتبے ملے جو مارب سے حاصل کئے گئے تھے ان میں سے دو برونز (لوہے تانبے جست سے مخلوط دہات) پر کھودے ہوئے تھے ان دونوں کی اس نے پوری نقل لیلی اور یورپ بھیجدیا مسٹر رودجر نے ان دونوں کتبوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ مگر بقیہ کتبوں کی وہ نقل نہ لے سکا کیونکہ وہ امام یمن کے محل میں گویا بالکل نظر بند ہو رہا تھا، مگر نظربندی و قید دوسری طرف مفید بھی ثابت ہوئی اس محل سے متعلق باغ میں ایک مرمریں مجسمہ کے سر کا پتہ چلایا جو بلاد مارب سے لایا گیا تھا اس نے اسے حاصل کرکے لندن بھیجدیا یہ سر اب تک لندن کے متحف (عجائب خانہ) میں موجود ہے۔

کروٹندن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مارب کے عرب سونے کے مربع ٹکڑے صنعا میں لاکر فروخت کرتے ہیں اور بعض مقامات میں جب شدت کی بارش ہوتی ہے تو پانی کے ساتھ جواہرات بھی بہ کر آجاتے ہیں جنکو عرب کے دیہاتی اٹھا لیتے ہیں اور یہ تمام چیزیں قدیم یمنی تہذیب و تمدن کے زبردست ثبوت ہیں

ٹوماس یوسف اور نڈ Thomas Joseph Arnaud. فولجانس فرنل Fulgence Fresnel

۱۸۴۳ء تک میں حمیری

کتبوں کا انکشاف ان کی تعداد پندرہ سے آگے نہ بڑھ سکی ساتھ ہیں انکی تحریر نہایت غیر واضح تھی جس کی وجہ سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں حاصل کیا جاسکا بعض بالکل ناقص تھے، مگر ۱۸۴۳ء میں توماس اور نورڈ کی سعی مشکور سے بہت سے مینی آثار اور کتبوں کا انکشاف ہوا جس کی وجہ سے ہماری معلومات میں بہت ترقی ہوگئی۔

یہ شخص پہلے مصری فوج میں کمپونڈر تھا وہاں سے ۱۸۴۰ء میں صنعا چلا گیا اور امام یمن کے یہاں اس خدمت پر مامور ہو گیا، اس اثناء میں وہ مارب کے آثار اور کتبوں کے متعلق بہت سی خبریں سنا کرتا تھا، کچھ دنوں بعد وہ یہاں سے بھی علیحدہ ہو کر جدہ چلا گیا، وہاں اُسکی فرانسیسی مستشرق فولجانس فرنل سے ملاقات ہوئی۔ مستشرق مذکور ایک طویل عرصہ تک مصر میں قیام پذیر رہا، وہاں اس نے عرب ان کی زبان ان کے حالات ان کی تاریخ اور انکی تصنیفات کی جانب پوری توجہ صرف کی اور اغانی اور عقد الفرید جیسی بہترین عربی کتب کا ذخیرہ جمع کیا۔ اس وقت وہ نہایت جدوجہد اور کاوش سے یمن اور حضرموت سے حجاز آنیوالے لوگوں سے ان دونوں مقامات کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا اور ابتک جو کچھ مسالہ جمع ہو گیا تھا اسے ایک خوبصورت رسالہ کی صورت میں مرتب کر لیا تھا، ٹوما میں یوسف جس وقت جدہ پہونچا مستشرق فولجانس سے ملاقات کی اور یمن کے خرابوں کے متعلق تمام واقعات جو دیکھے یا سنے تھے بیان کئے۔ فولجانس نے اسے پھر واپس ہونے اور ان خرابوں میں حمیری آثار کی تفتیش کی ترغیب دی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں عثمان پاشا والی حجاز نے جدید امام یمن کی تخت نشینی کی تہنیت میں ایک وفد بھیجنے کا قصد کیا اور نرد اس وفد کے ساتھ ہو لیا مگر جس وقت صنعا پہونچا تو اس نے دیکھا کہ ترک اہل یمن کو اب اور بھی نفرت اور بیزاری کی نظر سے دیکھتے ہیں اسلئے اس نے وفد سے علیحدگی مناسب سمجھی اور وفد سے جدا ہو کر وہاں کی ایک سرائے میں اتر پڑا پھر اس نے وہاں ایک دوست سے مارب جانیکے متعلق گفتگو طے کی اور جولائی ۱۸۴۳ء میں کھانے پینے کا اسقدر سامان لیکر جو پندرہ دن کو کافی ہو سکتا تھا منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے اور نودنے یمن

کا لباس پہنکر اپنے کو بالکل یمنی بنالیا۔ چھ منزلوں کے بعد مارب پہونچے تین دن قیام کیا اس عرصہ میں بعض قدیم خرابات دیکھے اور تو دنے بعض کتبوں کو نقل کیا۔ اور وہاں سے واپسی کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا راستہ میں ایک گاؤں سے ہوکر گذرا جسکا نام اس نے خربہ رکھا حالانکہ صحیح نام سرواح[۱] ہے۔ اس غلطی کا سبب ایک دوسری غلطی ہے جسکا ذکر بعد میں کیا جائیگا۔

سرواح میں اسے مختلف قسم کے کتبے ملے اور تمام کتبے جو اس عرصہ میں اس نے جمع کئے انکی تعداد ۵۶ تک پہونچ گئی چنانچہ ۳ صنعا میں ۸ اس مقام میں جسکا نام اس نے خربہ رکھا تھا اور ۴۶ مارب میں دستیاب ہوئے۔ راستہ میں جو لوگ اس کے پاس سے ہوکر گذرتے تھے اس کے چہرہ کا رنگ دیکھکر شک میں پڑجاتے تھے، کوئی جاسوس سمجھتا تھا، کوئی ساحر، اور اگر میر مارب اسکی پشت پناہی نہ کرتا تو یہ شکوک اس کی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیتے۔ اس سیاحت میں اسکی آنکھوں میں کچھ فتور ہو گیا جس کی وجہ سے دس مہینہ تک وہ اپنی آنکھوں کو کام میں نہ لاسکا اس نے فرنل کو خط لکھا اپنے اور ان ممالک کی جغرافی حالات لکھے جن کی بناپر فرنل نے اپنے نقشے مرتب کئے اور فرانسیسی گورنمنٹ کے حکم سے تمام کتبوں کی نقل ایک کتاب میں چھاپدی۔

فرنل نے اپنے اجتہاد سے ان حروف کی عربی حروف سے مقاربت ثابت کرنیکی کوشش کی اور اس بحث اور تحقیق کے نتائج کو ضمیمہ کے طور پر کتاب میں شامل کردیا اسے جسنیوس نے جو کچھ لکھا تھا صرف اسی کی اطلاع ہوسکی رودجر نے اس بارے میں جو کوشش کی تھی۔ اس سے وہ بالکل بے خبر رہا اور نہ بہت سی چیزوں کے سمجھنے میں جنھیں وہ ابتک نہیں سمجھ سکا تھا اسے قیمتی مدد ملتی۔

عمران کے کتبے

اس کے بعد ایک انگریزی افسر نے ۳۴ یمنی کتبے جو برنز پر تھے عدن سے خرید کر برطانی متحف (عجائب خانہ) میں پیش کردئے ان میں سے اکثر عمران کے کتبے ہیں جو اللحیہ اور مارب کے درمیان واقع ہے یہ کتبے نہایت اہم

[۱] یہاں بعض اثری خرابات ہیں جو مقام حاشد اور ارحب کے قریب واقع ہیں۔

ہیں اور ان پر تصویریں اور مختلف رنگ کے نقش و نگار منقوش ہیں جو قدیم اہل یمن کی فنون جمیلہ میں مہارت کی دلیل ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ کتبے بعد میں جدید بحث و تحقیق کی بنیاد پڑ گئے جس پر پروفیسر ارنسٹ اوزنڈر Earnest Osiander نے بہت کچھ لکھا ہے اور ۱۸۶۵ء میں اس مبحث پر ایک کتاب بھی تالیف کی ہے (سیو شارل لنورمان Charles Lenormant) کے مصنوعی کتبے)

۱۸۷۶ء میں ماہر اثریات شارل لنورمان نے پانچ کتبے شائع کئے اور یہ بیان کیا کہ یہ تمام کتبے ابین میں دستیاب ہوئے ہیں اور ایک فرنچ ڈاکٹر نے ان کو ۱۸۴۷ء میں نقل کیا ہے اور یہ نقول ۱۸۷۰ء میں نورمان کے سپرد کی گئی ہیں۔ شائع ہونے کے بعد پیرس کے ۱۸۷۰ء کے فتنہ میں ان کی اصل ضائع ہوگئی۔

یہ موسیو لنورمان کا خیال تھا لیکن جیسا کہ مستشرق داؤ ہافرنچ مور ۱۸۸۲ء (David Heinrich Muller) کے بیان سے ظاہر ہوا یہ کتبے مصنوعی نکلے معلوم نہیں اس علمی خیانت سے ان کتبوں کے مصنف کا کیا مقصد تھا۔

دوسرے مصنوعی کتبے

پھر ۱۸۷۰ء میں تین یمنی کتبے جو برنز پر منقوش تھے عدن سے یورپ لائے گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ بھی مصنوعی ہیں اور یمن کے تانبے کے کاریگر (ٹھٹھیرے) نے جب سنا کہ ان پرانے کتبوں کو مستشرقین اسقدر قیمتی سمجھتے ہیں تو وہ بعض اثری پتھروں برنز کے حروف اور کلمات برنز کے مصنوعی کتبے بنا کر ان پر نقل کرنے لگا۔ اور اس سے اس کا مقصد محض ذاتی منفعت تھی لیکن ان مصنوعی کتبوں سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا کیونکہ ان میں فقرے نہایت صحت کے ساتھ نقل کئے گئے تھے۔ اسی طرح صنعا کے ایک دوسرے شخص نے بھی جو پتھر پر کھدائی کا کام کرتا تھا وہی حرکت شروع کی ہاتھ کے بنے ہوئے پتھر امام یمن کے پاس

پہونچے اور انہوں نے ان کو قسطنطیہ کے عجائب خانوں میں بھیجدیا۔

اب ہم ایک ایسے شخص کا تذکرہ کرتے ہیں جس نے حمیری زبان کے اسرار و دقائق پر سے نقاب اٹھا کر اور کثیر التعداد کتبوں اور تاریخ کے گمشدہ اوراق کا انکشاف کر کے ایک اہم اور مشکل ترین خدمت انجام دی ہے۔

یہ علامہ ہالیقی (Joseph Halévy) ہے شروع شروع میں بلاد عثمانیہ میں مقیم تھا وہاں سے فرانس چلا آیا۔ اور اساتذہ کی صف میں شامل ہوگیا۔ ہالیقی کے متعلق کچھ کہنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آثار قدیمہ کے انکشاف سے دلچسپی رکھنے والوں کی جو عام رفتار تھی اس کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔

انیسویں صدی کے نصف میں برلن کی انجمن علمی نے ان تمام قدیم لاتینی کتبوں کے جمع کرنے کی تحریک کو جو یورپ ایشیا اور افریقہ میں منتشر تھے علمی جامہ پہنانا شروع کیا اور اس مجموعہ کا جو متعدد ضخیم مجلدات پر مشتمل تھا (Corpus Inscriptionum Latinarum) نام رکھا۔

۱۸۶۵ء میں پیرس کی مجمع علمی نے برلن کی انجمن کے قدم بقدم چلنے کا ارادہ کیا اور وزارت تعلیم کے سامنے سامی کتبوں کا مجموعہ مرتب کرنیکی تجویز پیش کی اور اس کا نام

Corpus Inscriptionum Semiticarum.

رکھا اور اس کی چار بڑی تقسیمیں کیں۔

۱۔ فینیقی کتابے۔

۲۔ آرامی زبانوں کے کتابے۔

۳۔ عربی کتابے۔

۴۔ حمیری کتابے۔

انہوں نے اس موقع پر صرف حمیری کتبوں کا ذکر کیا کیونکہ عرب کے جنوبی بلاد کی

زبانوں مثل سبایہ اور معینیہ وغیرہ کا اس وقت تک انکشاف نہیں ہوا تھا وزارۃ نے تجویز منظور کر لی اور پیرس کی انجمن علمی نے ان حمیری کتبوں کے جمع کرنیکے لئے ہالیقی کا انتخاب کیا۔ وہ ۱۸۶۹ء میں فرانس سے چل کھڑا ہوا اور عدن میں اترا وہاں سے لحج گیا لیکن اسے کچھ ہاتھ نہ آیا اسلئے دوبارہ حدیدہ کی جانب واپس ہوا وہاں سے یمن میں داخل ہوا تا آنکہ صنعا پہونچگیا اور ایک مدت تک اثری کتبوں کی تفتیش کرتا رہا لیکن وہاں اسے قابل ذکر کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اول تو وہاں اس کے کتبے بمنزلہ سرے سے نہیں اور ہیں بھی تو ایسے بلند مقامات پر کہ ان تک پہونچنا محال اور ناممکن ہے اسی طرح بعض کتبے ان مسجدوں میں ہیں جنمیں اجنبی شخص خاص اجازت حاصل کئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

پروفیسر نلینو کہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ صنعا کی ایک مسجد میں نہایت قدیم کتبے ہیں لیکن "مسلمان" کے سوا کسی دوسرے کی وہاں تک رسائی ناممکن ہے۔

ان مشکلات کے علاوہ اہل صنعا نے قدیم پتھر اپنے مکانات کی تعمیر میں استعمال کر لئے ہیں جنکی وجہ سے ان کے حروف محو ہو گئے ہیں۔

ہالیقی صنعا کے اطراف میں پھرتا رہا بے انتہا صعوبتیں برداشت کیں لیکن اس کے مقابلہ میں فائدہ بہت ہی کم ہوا اور بجز پتھر کے چند ٹکڑوں کے جن پر قرآن کی آیتیں یا سورتیں کندہ تھیں اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہاں کی کھدائی ممکن ہوتی تو کتبوں اور اثری پتھروں کے انکشاف اور حصول میں بڑی حد تک کامیابی ہوتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ غمدان صنعا میں ہے اور یہ ظہور اسلام سے قبل ملک یمن کا ایک رفیع الشان قصر تھا جسے امیر المومنین عثمان بن عفان نے اپنے عہد حکومت میں توڑوا ڈالا۔ قدیم تاریخی کتب کے ذریعہ سے اس عظیم الشان محل کی تعریف جو ہم تک پہونچی ہے وہ یہ ہے کہ "اس میں بیس چھتیں ہیں (شاید منزلیں) جن میں ایک دوسرے کے اوپر بے شمار کھڑکیاں ہیں، اور سفید سنگ مرمر کی تمام لوحیں زمین میں مدفون ہیں یہ ہمدانی مولف "کتاب الاکلیل" کا قول

ہے یہ کتاب دس حصّوں میں منقسم ہے جن میں سے ہم تک صرف اٹھواں اور نواں حصہ پہونچا ہے اور ان دونوں کا بھی بہت تھوڑا سا حصّہ چھپا ہے جس کو پروفیسر مولر .... نے شائع کیا ہے۔

ہالیقی نے ایک مدت تک صنعا میں قیام کے بعد بلاد جوف کی جانب سفر کا ارادہ کیا جو صنعا کے شمال میں ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے پہلے کوئی اثری اس طرف نہیں گیا تھا، یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ بلاد جوف پر آنیوالے خصوصاً اجنبی کے لئے گویا قبرستان ہے جہاں سے زندہ واپس آنیکا خیال فعل عبث ہے لیکن ہالیقی نے جوف میں داخل ہونے کے لئے یہ ترکیب کی کہ قدس کے یہودیوں کا لباس اختیار کر لیا۔ اسلئے اس کے لئے آسانی ہوگئی خصوصاً جبکہ وہ واقعہ میں یہودی تھا۔ اور اس کا نام بھی مشہور یہودی ناموں میں سے تھا۔ اس نے ایک بات یہ بھی کی کہ حاخام صنعا کے مذہبی یہودی عالموں سے جوف کے یہودیوں سے سفارشی خطوط لکھوائے کیونکہ یمن میں عیسائیوں کا وجود گھس لگانے کیلئے نہیں یہودی بہت قدیم سے تھے اور اسلام کے بعد بھی باقی رہے لیکن نہایت ذلت و حقارت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اہل یمن ان کی اور ان کے مذہب کی ہنسی اور مذاق اوڑاتے ہیں بہرحال یہ بات ضرور ہے کہ وہ یمن کے ہر حصّہ میں آزادی کے ساتھ آجا سکتے ہیں۔

ہالیقی نے ایک یہودی ٹھٹھیرے کے ساتھ جو وہاں کا اصلی باشندہ تھا اور حاتیم حشبوش نام تھا اپنا سفر شروع کیا اس یہودی ٹھٹھیرے کی وجہ سے اسکو بہت سہولت رہی لیکن اس کے باوجود اسے بعض ایسے زبردست خطرات سے دوچار ہونا پڑا کہ اسکی جان کے لینے کے دینے پڑ گئے وہ کھلم کھلا کسی کتبے کی نقل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے آستین میں قلم اور کاغذ لئے رہتا تھا۔ اور کوئی کتبہ مل جاتا تھا اسے لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور جہاں کہیں سے بھی کسی آدمی کا شبہ ہوتا تھا تو سونے کی صورت بنا لیتا تھا اور اسی لئے وہ نماز کی مشغولیت کے اوقات کو بہترین موقع سمجھتا تھا اور اسی وقت نقل کرتا تھا۔ اس کے یہودی ہمسفر نے اسے حمیری حروف سکھا دیے تھے

تاکہ اسے لکھنے میں مدد پہونچائے۔

لیکن ہمیں ہالیقی کے طرز عمل سے حیرت ہوتی ہے کہ اس نے اس سفرنامہ کے متعلق جو رسالہ لکھا ہے اس میں اس یہودی کا بالکل تذکرہ نہیں کیا ہے، اور نہ اس ہمسفری اور اس کی وجہ سے جو اسے امداد و اعانت حاصل ہوئی اس سے تعرض کیا ہے۔ معلوم نہیں اس بات کے پوشیدہ رکھنے سے اس کی کیا غرض تھی۔ یہ بات مدت تک پوشیدہ رہی تا آنکہ ۱۵ برس بعد علامہ گلیزر (Glaser) یمن گئے۔

ہم نے اس لئے اسکا تذکرہ کیا کہ ہالیقی کے کتبوں میں ہمیں عجیب باتیں نظر آئیں۔ بعض تو بہت بہتر لکھے ہوئے تھے، اور بعض کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ غفلت کی حالت میں لکھے گئے ہیں، جن کی غلطیاں بہت واضح تھیں۔ تحقیق و تدقیق کے بعد معلوم ہوا کہ بہت سے ٹکڑے ایک دوسرے کو مکمل کررہے ہیں ورنہ وہ ایک بڑا قطعہ ہے جس کے لکھنے میں ٹکڑے ٹکڑے کردئے گئے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ حسنبوش یہودی نہایت بے ایمان چالاک اور حریص تھا اجرت پر کام کرتا تھا جسقدر لکھتا تھا اس کی اُجرت پاتا تھا۔ اور ہالیقی اس کو بڑے اور طویل قطعہ کے لکھنے کی بھی اتنی ہی اجرت دیتا تھا جتنی چھوٹے قطعہ پر اسی لئے حسنبوش کسی بڑے لمبے قطعہ کو پاتا تھا تو زیادہ اجرت حاصل کرنے کے لئے نقل کرتے وقت کئی کئی ٹکڑے کردیتا تھا۔

بلاد جوف۔ نجران۔ الاخدود

جوف ایک نہایت اہم مقام ہے کیونکہ وہ مملکت معین کا وسطی حصہ ہے جس سے ہالیقی سے پہونچنے اور وہاں کے چشم دید حالات میں ایک رسالہ لکھنے کے قبل کوئی اس سے واقف نہ تھا۔

وہ اپنے رسالہ میں شہر معین کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو چاروں طرف فصیل کی دیواروں سے قلعہ بند ہے لکھتا ہے۔

وہ ایک ٹیلہ پر ہے جسکا طول ۲۸۰ اور عرض ۲۴۰ میٹر ہے فصیل کی دیوار جو ٹیلہ کے نیچے ہے

وہ صرف شمالی جانب کچھ تھوڑی سی باقی رہگئی ہے، دو دروازے بھی ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مقابل ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی جانب۔ وہ اتبک اچھی حالت میں ہیں۔ اسی طرح ان سے قریب کے برجوں کی بھی حالت بہت بہتر ہے۔ یہ بہت طویل و عریض خوشنما اور شاندار ہیں۔

یہ عمارتیں برابر اور صاف کئے ہوئے پتھروں کی ہوئی ہیں اور باوجودیکہ ان پر صندلہ یا پلاسٹر نہیں پھر بھی دیکھنے والیکو ایک پتھر معلوم ہوتا ہے، اور ان میں سے اکثر پر کتبے نقوش ہیں جنکا طول تعجب انگیز مقدار کو پہونچتا ہے۔ مگر چہار دیواری کے اندر عرب کے بدؤں نے ان آثار کو بالکل خراب خستہ اور برباد کرڈالا ہے انھوں نے اس کے وسط میں رہنے کا ارادہ کیا اور مسجد تک اس کے قدیم پتھروں ہی سے بنائی۔

بلاد کے جوف میں اپنا کام پورا کرکے ہالیقی نے شمال کا رخ کیا اور جون ۱۸۷۰ء میں مخلاف پہونچا یہ ایک وسیع وادی میں ایک گاؤں ہے اس وادی کا نام وادی نجران ہے، اور یونان کے قدیم مورخین کے خیال کے مطابق نہیں پر مشہور اور عظیم الشان شہر نجران واقع تھا۔ مخلاف کے چاروں طرف پانی ہے۔ جس کے کنارے سرسبز و شاداب درخت اُگے ہوئے ہیں۔

مخلاف کے خرابوں میں ایک جگہ ہے جسکا نام انھوں نے شہر اخدود رکھا ہے۔ انکا (مسلمانوں کا) خیال ہے کہ یہ وہی مقام ہے جس کی طرف کلام پاک (سورۂ بروج) میں اشارہ کیا گیا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝

اور کوئی شک نہیں کہ ان اطراف میں بے شمار اور بیش قیمت اہم اور مفید آثار اور کتبے پائے جاتے ہیں، لیکن چونکہ ان مقامات کے لوگ (بنو یام) اسماعیلی (باطنی) فرقہ سے تعلق رکھتے تھے متعصب تھے مسلم یا غیر مسلم جو ان کے عقیدہ کے خلاف ہو اس کی تکفیر کرتے تھے اس لئے اب چھپ چھپ کر اور یہودیوں کی آڑ لیکر کام کرنا غیر ضروری اور بیکار تھا۔

یہاں سے صنعا کی جانب واپسی کے وقت یرآقش اور اسی قسم کے دوسرے گاؤں میں اسے خرابے" (کھنڈر) اور کتبے ملے جنہیں سے بعض کو اس نے نقل کر لیا۔

اگست ۱۸۷۰ء میں وہ مارب پہونچا۔ مگر اہل مارب نے اسے کتبے نقل کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔ پھر ان "خرابوں" سے ہو کر گذرا جسکا نام ارنود (Arnaud) نے الخربہ رکھا حالانکہ صحیح نام (صرواح) ہے۔ یہ مملکت سبا کے بڑے شہروں میں تھا اور یہاں بیش قیمت اور مفید ترین کتابے ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق ہالیقی کا قول ہے کہ "میں نے یہاں کی طرح طویل ترین کتبے کہیں نہیں دیکھے"۔

باوجودیکہ حالات ہالیقی کے مساعد نہیں تھے پھر بھی اس نے ۶۸۶ کتبے جمع کئے۔ اسقدر کتبے نقل کر لینے کی وجہ سے حمیری زبان کے کتبوں کے انکشاف میں اس کو زبردست فضل و تقدم حاصل ہو گیا۔ وہی ایک تنہا شخص ہے جس نے مملکت معین کے آثار کا انکشاف کیا جنکا عرب۔ روم۔ یونان کے قدیم مورخین نے بھی اپنی قدیم تاریخوں میں تذکرہ نہیں کیا۔

ہالیقی نے حمیر۔ سبا اور معین کی زبانوں کا صرف و نحو لکھتے وقت انھیں کتبوں پر اعتماد کیا اور ۱۸۷۲ء میں ایشیاٹک جرنل (Journal Asiatique) میں شائع کرایا۔

اور باوجود نسخ کی اسقدر غلطیوں کے جو اول تو لکھتے وقت اطمینان و سکون نہ ہونے دوسرے حبشوش یہودی کی شرارتوں بے ایمانیوں اور دھوکہ بازی سے واقع ہوئیں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ حمیری زبان کا علم ہالیقی کے اس سفر کی بدولت کئی قدم آگے بڑھ گیا اور ان چیزوں پر سے نقاب اٹھ گئی جو پردۂ غیب میں مستور تھیں۔ اور یہ امر روشن ہو گیا کہ بلاد

عرب کے جنوبی حصہ اور ان ممالک میں بھی جنکا یونان، روما اور عرب کے مورخین نے تذکرہ نہیں کیا ہے قدیم تہذیب موجود تھی۔

کوئی شبہ نہیں کہ یمن سے متعلق اسوقت تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں ہالیقی کے مساعی کو بہت بڑا دخل ہے اور یہی وجہ ہے کہ علمائے مستشرقین میں یمن کے آثار کی تحقیق کا عام شوق پیدا ہوگیا، ملک میں مختلف لباسی وجود کی بنا پر اضطراب نہ ہوتا نیز اہل یمن اجانب خصوصاً اہل یورپ سے اسقدر پرہیز نہ کرتے تو علمائے مستشرقین میں یمن کی آثار کی تحقیق کا عام شوق پیدا ہوجاتا۔ یہی وجہ تھی جس نے یورپ کی مہموں کو طویل عرصہ تک یمن کے قیام سے بالا رکھا۔

لانجر Siegfried Langer ہالیقی کے تقریباً بارہ برس بعد سگفرڈ لانجر نماوی نے بلاد یمن میں اسی غرض سے داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اور ۱۸۸۲ء میں اس ارادہ کی تکمیل کی غرض سے وہ یمن کیجانب روانہ ہوگیا۔ لیکن جوف میں داخلہ نہ ہوسکا۔ بلکہ حدیدہ سے بیت الفقیہ۔ طوران اور ضاف ہوتا ہوا جو اس کے راستے میں پڑتے تھے صنعا چلا گیا، یہاں پہونچکر بھی وہ قیام نہ کرسکا کیونکہ والی نے جو ترک تھا اس کو فوراً حدیدہ کی جانب واپس ہونے پر مجبور کیا۔ اس پر بھی اس نے ۲۲ کتبے لکھ ہی لئے جن میں اسے ضاف میں ملے تھے۔

ان مشکلات سے اس کے عزم و ارادہ میں مطلقاً فرق نہیں آیا۔ اور اس نے دوسری مرتبہ عدن کی جانب سے یمن میں داخل ہونیکا ارادہ کیا۔ مگر جسوقت وہ وادی بنا میں پہنچا جو عدن سے ۰۹ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے کہ ڈاکوؤں نے اسے روپیہ کے لالچ سے قتل کردیا

یہ دوسرا شخص ہے جو یمن کے آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو پر قربان ہوا۔

اس شخص کے بعد یورپ میں یمن کے آثار اور کتبے پہونچنا بند ہوگئے البتہ خود وہاں کے باشندے کچھ پاتے تھے تو تاجروں کے ہاتھ بیچڈالتے تھے اور یہ تھر

یا بر ونز[۵] کی لوحیں مٹی کے بخور سلگانے کے ظروف خصوصاً مجسموں کے ٹکڑے اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے سر ہوتے تھے۔ اور جن متاحف (عجائب خانوں) نے ان چیزوں کو اپنے یہاں لیا ان میں قسطنطیہ کا قصر چنیلی کا کتبخانہ بھی ہے۔

ان میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں جن میں سے اکثر کے متعلق معلوم نہیں کہ کہاں سے نکالی گئیں ہیں اور یہ بات ایسی ہے کہ علم آثار کی حیثیت سے ان کی وقعت و اہمیت کو کم کر دیتی ہے۔

معینی علا میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ معینی زبان کے ۶۹ کتبے ایسی زمین میں دستیاب ہوئے جو مین سے خارج ہے۔ انکے انکشاف اور نقل کرنیکا سہرا جولیس اوتینگ (Julius Euting) کے سر ہے (۱۸۸۳ء) یہ موضع علامیں چٹانوں پر منقوش ہیں یہ موضع حجاز میں مدینہ اور حدود شام (فلسطین) کے درمیان شمالی حصہ میں واقع ہے۔ مدائن صالح بھی اس سے قریب ہیں جنکا نام رحجر ہے ان اطراف کے رہنے والوں کا بیان ہے کہ چٹانوں کے اندر جو غار ہیں ان میں ثمود رہتے تھے اور یہی حضرت صالح علیہ السلام کا وطن ہے۔ اور قابل یقین بھی ہے کیونکہ نبطی اور خود اول کی زبانوں میں لکھے ہوے کتبات و آثار سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔

سب سے حیرت انگیز بات اس مقام میں جو مملکت معین سے بہت دور ہے ان کتبوں کا وجود ہے۔ ان کتبوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ معین کے تاجروں کا بڑا حصہ ایک طویل مدت تک علا اور اس کے گرد و نواح میں قیام پذیر رہا، اور یہ معین کے ان نو بادشاہوں کے زمانہ میں جنکا تذکرہ ان کتبات میں ہے۔ یہ لوگ (معینی) اپنی حفاظت کی غرض سے قلعے اور برج تعمیر کرتے تھے۔ ہیکلیں بناتے تھے جن میں آلہہ، معین (معین معبودوں) کی پرستش کرتے تھے۔　　(ملخص)

---

[۵] تانبے بیتل اور جست سے مرکب ایک دہات

غزل

از
جناب نسیم صاحب صبحی

یاس بس رحم یہ کیا مجھپہ غضب ڈھاتی ہے
خلشِ آرزو بھی ہاتھ سے اب جاتی ہے

دیکھکر حال مرا ان کو ہنسی آتی ہے
میری امید ترحم بھی رہی جاتی ہے

ہجر کی رات قیامت ہے کہ ہوتی نہیں ختم
موت فرقت زدہ کو دیکھئے کب آتی ہے

بس یہ دلسوز فسانے نہ سُنا اے بُلبُل
خوگر رنج کو کب تیری صدا بھاتی ہے

سر میں سودا ہے خلش دل ہیں جگر میں سوزش
آگ سی ایک بدن بھر میں لگی جاتی ہے

تجارت

از

جناب سید امیر حیدر صاحب بخت اکبرآبادی

وہ کیا شے ہے کہ جسکے ہمقدم اقبال و دولت ہو ۔ تجارت ہو، تجارت ہو۔ تجارت ہو تجارت ہو
جو کل گمنام تھے وہ آج نام آور ہیں عالم میں ۔ تجارت کی بدولت آج دنیا میں وجاہت ہو
جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں حق انکا معاون ہو ۔ یہی قانونِ فطرت ہو یہی قانونِ قدرت ہو
تجارت چھوڑ دی جس قوم نے اسکو زمانہ میں ۔ الم ہو رنج ہو افلاس ہو ادبار و نکبت ہو
تجارت میں نہیں ہو دخل جسکا اس زمانہ میں ۔ اکارت زندگی ہو مال و زر کو اُسے نفرت ہو
مدد قومی تجارت کی نہ خود شوق تجارت ہو ۔ نحوست پر نحوست ہو قیامت پر قیامت ہو
جو تاجر آپکے ہیں وہ شکار کس مپرسی ہیں ۔ نہ ہمدردی ہو کچھ ان سے نہ کچھ ان کی اعانت ہو
(خیال اسکا نہیں مشرک نجس قرآں میں آیا ہو ۔ جنھیں نفرت ہو دل سے آپکو اُن سے محبت ہو)
کہاں ایثار نفس و پیروی دینِ حق لیکن ۔ خلاف عقل اب اخلاق کی معدوم جرأت ہو
نہ چونکے آپ افسوس انقلاباتِ زمانہ سے ۔ جہاں میں آپکی غفلت بھی ایک تصویرِ عبرت ہو
مگر پھر بھی نہیں مایوس ہونے کی ضرورت ہے ۔ کھلا چاروں طرف دُنیا میں میدانِ تجارت ہو

بنواب دستکار اور اپنی صنعت کو ترقی دو | کر ضائع نہ وقت اپنا کہ جو دم ہے غنیمت ہے
قلیل انسان کی عمر ہیں کثیر اشغال دنیا میں | تعجب ہے دوزہ زندگی میں جنکو فرصت ہے
اسی پر منحصر ہیں کاروبارِ عالمِ ہستی | ضروری آدمی کیواسطے دنیا میں محنت ہے
بڑے جو لوگ گذرے ہیں جو مشہور زمانہ ہیں | تواریخ جہاں میں وصف جنکے جنکی شہرت ہے
انھیں محنت کی عادت تھی ریاضت سے محبت تھی | ہوئے مخدوم وہ جس فخر سے وہ فخر خدمت ہے
حقیقت میں تجارت کی اگر ہے جان سرمایہ | تو ایمان تجارت واقعی تاجر کی محنت ہے
جو کاہل ہے دو عالم میں خدا کی اوسپہ لعنت ہے | خدا جس چیز سے خوش ہے وہ کیا ہے صرف محنت ہے
ہماری کاہلی سے یہ ہماری آج نوبت ہے | وہ جاہل ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ حق کی مشیت ہے
کلہاڑی پاؤں میں ماری ہے ہمنے اپنے ہی ہاتھوں | گلہ تقدیر کا ہے اور نہ گردوں کی شکایت ہے
تجارت میں بڑھیگا اعتبار ایمانداری سے | یہ ہے ایمان کی ایمانداری سے تجارت ہے
زمانہ بھر کو اخلاقِ حسن ہم نے سکھائے ہیں | خدا کی شان اب مفقود خود ہم میں وہ نعمت ہے
کہانی دردِ غم کی اہل دل کے روبرو کہدی | نہ کچھ رنگیں بیانی ہے نہ اظہار فصاحت ہے

نہ کی قدر تجارت بخت جس نے اُسکی قسمت میں
ترقی ہے نہ عزت ہے۔ نہ بے فکری نہ راحت ہے

معلومات

از

جناب حسن عابد جعفری صاحب۔ (آکسن) مدیر شمع

مصر میں طوطن خامن کے مقبرے کی کھدائی کا کام کچھ عرصہ سے ہو رہا ہے، اور چونکہ صرف جاڑے کے موسم میں کام ہوتا ہے اس لیئے کھدائی کا سلسلہ سرما کی پانچ فصلوں سے جاری ہے۔ عمارت میں داخل ہونے کے لیئے زینہ ہے، اور ایک برآمدہ ہے جس میں ہو کر چاروں حجروں تک پہونچنے کا راستہ ہے، پہلے حجرے کی کھدائی میں ایک فصل صرف ہوگئی، لیکن بے شمار چیزیں ہاتھ آئیں، یہاں سے چھوٹے حجرہ میں داخل ہونے کا راستہ ہے، مگر ابھی تک اس سے ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے، قیاس ہے کہ بہت سی چیزیں برآمد ہونگی۔ گذشتہ تین فصلیں صرف اُس حجرہ کے کھودنے میں صرف ہوئے ہیں جسمیں فرعون کا مقبرہ ہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۲۳ء کو اس حجرہ کی دیوار شکست کی گئی، اور ایک گز کے فاصلہ پر اصل مقبرہ کی طلائی دیوار چمکتی ہوئی نظر آئی، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ دیوار لکڑی کی ہے اور سونے کا پانی پھرا ہوا ہے، اصل مقبرہ اور حجرہ دیوار کے درمیان میں دونوں جانب دو دو فیٹ جگہ ہے، جہاں بعض نہایت نفیس چیزیں دستیاب ہوئی ہیں، ایک قرنا ہے، شراب کے پیپے ہیں، شاہی کشتی کی گاڑیاں اور الاباسٹر کی دو قندیلیں ہیں ایک قندیل کا قبہ بظاہر صاف ہے، لیکن چراغ روشن کرنے سے قبہ کی سطح پر فرعون اور اُسکی ملکہ کی نہایت حسین تصویریں نمودار ہو جاتی ہیں۔

چوبی مقبرہ سترہ فیٹ لانبا، گیارہ فیٹ چوڑا، اور نو فیٹ بلند ہے دیواروں پر جنازے کے مناظر منقوش ہیں، مقبرے کی چوبی دیواروں کے اندر دو دیواریں اور ہیں،

پہلے مقبرے کے دروازے پر مُہریں نہ تھیں، لیکن دوسرے مقبرے کے دروازے سربمُہر تھے
دونوں مقبروں کے درمیان دو بڑے مرتبان رکھے ہوئے ملے۔ چھوٹے مرتبان کا ڈھکنا شیر کی وضع
کا ہے، اور اس کے اندر مرہم ہے، دیوار کے قریب کونوں میں فرعون کی استعمالی چھڑیاں
ہیں جن پر طرح طرح کے نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، دوسرے مقبرے پر کپڑا لگا ہوا ہے
اور اُس پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے طلائی گلاب کے پھول ٹکے ہوئے ہیں، یہ کپڑا مقبرے
پر منڈھا ہوا نہیں ہے، لکڑی کے چوکھٹوں پر تنا ہوا ہے، لیکن چوکھٹے اور کپڑے کی
موجودہ حالت بالکل ناقص ہو چکی ہے، تینوں مقبروں اور کپڑے سے منڈھے ہوئے
چوکھٹے کو ہٹانے میں انتہائی احتیاط کی گئی، یہ کام اس قدر دشوار اور نازک تھا کہ ایک
پوری فصل نذر ہو گئی۔ مگر کام کرنے والوں کو قائل ہونا پڑا کہ فرعون کی نعش کی حفاظت
کے لیے اس سے بہتر اور کامیاب تر طریقہ ممکن نہ تھا، ۴ جنوری ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر کارٹر نے
اخیر مقبرے کا دروازہ کھولا، اور قبر کی پہلی جھلک نظر آئی، قبر عہد فراعنہ کے طرز قدیم کا
نمونہ ہے، بادشاہوں کے نام اور اُن کے خطاب لکھے ہوئے ہیں، اور چاروں گوشوں پر
اُبھرے ہوئے کام کی آئی سس، نیب تھائس، نیتھ، اور سرکیٹ دیویوں کی مورتیں
ہیں، جو نعش کے اوپر پروں کو پھیلائے ہوئے ہیں، نعش کے اوپر پتھر ہے، لیکن زمانہ دراز
کے باعث بالکل بودا اور بے جان ہو چکا ہے، قبر میں داخل ہو کر جس قدر کام ہوا وہ
احتیاط اور ہوشیاری کے لحاظ سے عدیم المثال ہے، اور اُسکی اہمیت اور دشواریاں
صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، وزنی پتھر کو اونچا اُٹھانا معمولی کام نہ تھا، کیونکہ معمولی
ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا اور احتمال تھا کہ نیچے رکھی ہوئی نعش اور اسکے
تین صندوقوں یا کفنوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ جائے گا، مگر یہ کام بھی انجام کو
پہونچ گیا، اور کاریگروں نے نہایت ہوشیاری سے پتھر کو اونچا اٹھا لیا، غالباً جس چیز نے
اس مشکل کو حل کر دیا وہ اِن لوگوں کا شوق تھا! کیونکہ عام طور پر یقین تھا کہ اس پتھر کے

نیچے فرعون، طوطن خامن کی نعش ملیگی - پتھر کے اُٹھتے ہی سفید کفن نظر آیا، اس کے اندر فرعون کی نعش کا صندوق ملا جس پر نہایت اعلےٰ درجے کا طلائی کام ہو رہا ہے اور سر اور مُنھ خالص سونے کے ہیں، اور سر مرصع ہیں، ہاتھوں میں عصا، اور چنور اور پیشانی پر عقاب، اور کُبریت سانپ بنے ہوئے ہیں، ان کے گرد نازک پھولوں کا ہار ہے جسکو دیکھکر چشم تصور میں وہ نقشہ پھر جاتا ہے جبکہ نوجوان، بیوہ ملکہ نے اسکو اپنے شوہر سے عقیدت کی آخیر یادگار میں بچشم گریاں دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چڑھایا ہوگا! دوسرا صندوق اوپر کے صندوق سے جکڑا ہوا ملا، اس پر بھی سنہری کام ہو رہا ہے، اور سفید کفن پڑا ہوا ہے، قیمتی جواہرات کے گلوبند سے مرصع ہے۔ صندوق کے اندر ایک تیسرا صندوق ہے جو خالص سونے کا ہے اور جسکی قیمت آٹھ لاکھ روپیہ ہے، اس پر انواع و اقسام کے بیشمار جواہرات کا کام ہے، ہاتھوں اور شکم کے اوپر عقاب اور کبریت سانپ کی چمکدار تصویریں ہیں، اور پیروں پر آئی سس، اور نیپتھائس دیویوں کی تصویریں ہیں۔

سونا آٹھ لاکھ روپیہ کی قیمت کا ہے لیکن دنیا کے ماہرین فن اور نقادوں کی رائے ہے کہ اس سے بہتر آرٹ کا نمونہ ابتک دنیا کی آنکھوں نے نہ دیکھا تھا! اسکی تعریف سے قلم عاجز ہے، اور یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قدرت خداوندی کے بعد یہی ایک چیز ہے جسپر روز قیامت تک انسان فخر کرے گا! تینوں صندوقوں کے اوپر مصری صناعوں نے طوطن خامن کی صحیح تصویر بنانی چاہی ہے تاکہ اگر اصلی نعش قدرتی یا دیگر وجوہ سے پاش پاش ہوجائے تو طلائی مورتیں متوفی کی صورت کو روز قیامت تک صفحۂ دنیا پر برقرار رکھیں۔

آخیر صندوق کے تختہ کو جدا کرنے پر تماشائیوں کی حریص نگاہوں نے وہ سماں دیکھا جسکی برسوں سے آرزو تھی، اور جو مدت تک دلوں سے محو نہ ہوسکے گا! ان کے سامنے خود فرعون طوطن خامن کی نعش تھی - سر کے اوپر مخروق طلائی خود تھا، سینہ پر عقاب، اور انسانی کھوپڑی کی تصویریں تھیں اور نعش پر کئی گز کپڑے کی دھجیاں تھیں جن کے اندر

شاہی جسم تھا، افسوس ہے کہ روغن ڈالنے کی مذہبی رسوم نے ممی سازوں کے بہترین نمونۂ کمال کو شدید نقصان پہونچا دیا! ڈاکٹری معاینہ سے معلوم ہوا کہ فرعون بالکل نوخیز نوجوان تھا اور مرتے وقت اُسکی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی) اس کا عہد حکومت چھ برس رہا، اس لیے تخت نشینی کے وقت اُسکی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ تھی، ممی کے اوپر کپڑے کی دھجیوں کے درمیان بیشمار جواہرات ملے، اُن میں ایک کلغی بھی ہے اور بہت سے جواہرات زیورات میں جڑے ہوئے ہیں، گلے میں عقاب کی شکل کا کنٹھا ہے جسمیں دسو پچیس جواہرات ہیں) دو خنجر ہیں جنکے دستے طلائی اور مرصع ہیں پھل لوہے کے ہیں یقین ہے کہ اُسی زمانہ میں مصر میں لوہا آیا ہوگا اور بیش قیمت رہا ہوگا)

موجودہ فصل میں پہلا کام یہ ہوا کہ وزنی پتھر کے اندر فرعون کی نعش کو بدستور رکھدیا گیا کیونکہ عوام کے طبائع کو نعش کے برآمد ہونے پر ملال تھا، اور اُنکی متفقہ آرزو تھی کہ یہ ہڈیاں عجائب خانوں کی زینت نہیں،

مقبرے کے حجرے میں ہوکر ایک اور کمرے کا راستہ ہے، اس سال وہ کمرہ بھی کھول لیا گیا ہے یقین ہے کہ اسمیں بھی عجیب و غریب چیزیں نکلینگی، ابتک یہ تو کشتیوں کے نمونے اور ایک طلائی صندوق میں چار مرتبان برآمد ہوئے ہیں جن کے اندر طوطن خامن کے پیٹ کے اندر کی آلایش محفوظ ہے، صندوق کے چاروں کونوں پر محافظ دیویوں کی تصویریں ہیں، لوگوں کا بیان ہے کہ اس بکس کو دیکھکر انسان کا دل بے قابو ہوجاتا ہے!

ابھی اس حجرے میں کام ہو رہا ہے اور آئے دن نئی نئی چیزیں نکل رہی ہیں، نقادوں اور آرٹ کے ماہروں کی عید ہے کہ اُن کی معلومات میں جدید اضافہ ہو رہا ہے، لیکن حسرت شناس دلوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے کیا انسان کو یہ بھی گوارا نہیں کہ ہزاروں برس کے خفتگانِ لحد کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے ـــ

امریکہ میں تقریباً ایک لاکھ طالب علم ایسا ہے جو اپنی تعلیم کے اخراجات کو قوت بازو سے پورا کرتا ہے، یہ تعداد ان طلباء کی ہے جو اس ملک کی مشہور یونیورسٹیوں میں داخل ہیں اور فرصت کے اوقات میں، یا وقت نکال کر محنت اور مزدوری کرتے ہیں، رکابیوں کو دھونا، قالینوں کو صاف کرنا، گھروں میں جاکر مکان اور دیواروں کی جھاڑ پونچھ کرنا وغیرہ انکی معاش کے ذرایع ہوتے ہیں، انمیں بہت طلباء ایسے بھی ہیں جو علاوہ تعلیم کے رہائش اور قیام و طعام کے کل اخراجات کے لیے بھی روپیہ پیدا کرتے ہیں، لیکن جو طلباء ہیج کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں انکی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، طلبا میں ذکور اور اناث شامل ہیں، اور باوجود محنت اور مزدوری کرنے کے انکی تعلیمی رفتار بہت اچھی اور انکے مقابلے میں ممتاز ہوتی ہے جو والدین، یا اپنے ذاتی اثاثہ کی امداد کی ذریعہ سے حصول تعلیم میں مصروف ہیں، قوت بازو پر بھروسہ کرنا، امریکہ کا زرین اصول ہے، اور اسی کی برکت سے ملک متمدن اور قوم آزاد ہے، ہندوستان اور بلاد اسلامیہ میں بھی کبھی یہ طریق تعلیم رائج تھا اور جاپان میں تو اب بھی اس طریقہ کو فروغ ہے۔

ہندوستان میں ماہرین تعلیم اور گورنمنٹ نے اس مسئلہ پر ابتک توجہ نہیں کی حالانکہ ملک کی اقتصادی حالت، اور تعلیم کی روز افزوں گرانی ایسی مصیبتیں ہیں کہ جن کو رفع کرنا حکومت کا فرض اولیں ہے۔ خدا معلوم اس ملک کے ارباب حل و عقد اس طرف کیوں توجہ نہیں کرتے، اور مدارس و یونیورسٹیوں میں اوقات و زمانۂ تعلیم کو اسطرح کیوں منضبط نہیں کرتے کہ طلباء کو حصول معاش کے مواقع مل جایا کریں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ طلباء کو تعلیم دینے کے علاوہ انکی فرصت کے اوقات کے لیئے ملازمتیں تلاش کریں، اور ان کے لیئے ایسی سہولتیں پیدا کریں کہ وہ روپیہ کما سکیں، ہمارے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ خود بھی توجہ کریں اور قوت بازو سے کمائی پیدا کرنے کو اپنا فخر سمجھیں۔ افسوس ہے کہ اس ملک میں نوجوانوں کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی

طرف مطلق رغبت نہیں ہے، بلکہ ہاتھ سے کام کرنا عیب سمجھتے ہیں، اور اُن کے نزدیک زمانۂ طالب علمی میں روپیہ پیدا کرنا سیلف ریسپکٹ کے منافی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں اور بالخصوص شرفاء میں افلاس بڑھ رہا ہے، اور ادنے طبقہ کے آدمی محض قوت بازو کی برکت سے ترقی کر رہے ہیں، اور اُس زمانہ میں جبکہ یورپ اور ایشیا کے اتصال سے مادیت کو عروج ہو رہا ہے، شرفاء نہایت سرعت سے زوال پذیر ہو رہے ہیں۔



امریکہ میں ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ایک تیرتی ہوئی یونیورسٹی کی تکمیل ہوئی، یعنی ایک بہت بڑے جہاز پر قائم کی گئی، چار سو پچاس طالب علم اور چالیس فاضل اُستاد اس میں شامل ہیں، یہاں تعلیم دینے کے لیے متعدد کمرے، معمل، بڑا کتب خانہ اور ورزش کے تمام ضروری سامان موجود ہیں، جہاز تمام عالم کا چکر لگا کر ایک سال کے بعد امریکہ کو واپس ہوگا، اس عرصہ میں چوالیس بنادر، اور تیس ممالک میں ہو کر گذریگا، طالبعلم ہر مقام کی جہاں پر جہاز لنگر انداز ہوگا، سیر کریں گے، ترتیب طلباء اس طرح پر رکھی گئی ہے، ایک تہائی تو وہ ہیں جو اسکولوں میں زیر تعلیم تھے اور اُن کے والدین کی خواہش ہے کہ کالج میں جانے سے پہلے وہ دنیا کو دیکھ لیں، ایک تہائی وہ ہیں جو امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں تھے، اور اُن کے والدین چاہتے ہیں کہ وہ وسیع، اور غیر محدود تجربات اور تربیت حاصل کریں، بقیہ ایک تہائی فارغ التحصیل ہیں جو مخصوص موضوعات اور مضامین کے متعلق ذاتی تحقیقات اور تجربات کرنا چاہتے ہیں، اور اُن ہی طلباء کے لیے یونیورسٹی بنائی گئی ہے۔ انتخاب طلباء میں یہ اصول پیش نظر رہا ہے کہ کمزور اور سست طلباء پر مضبوط اور چست طلباء کو فوقیت دیگئی ہے۔

جہاز میں آرٹ، ادب قدیم، سیاسیات، تعلقات بین الاقوام، حکومت، معاشیات، فلکیات۔ معدنیات، جغرافیہ، تاریخ، اقتصادیات وغیرہ وغیرہ کی تعلیم کا انتظام ہے

اور ریڈیو لگا دیا گیا ہے تاکہ جہاز میں رہکر امریکہ سے تعلقات قائم رہیں۔

حال میں یہ یونیورسٹی بمبئی پہونچی تھی اور اُستاد اور طلبا ارض تاج کی سیر کے لئے آئے تھے۔ اُن سے ملکر اور تبادلہ خیالات سے ہم کو حقیقی مسرت ہوئی۔

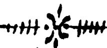
مختلف ممالک میں سیاحت کرکے طلبا اور اُستادوں نے جو معلومات فراہم کی تھیں حقیقت میں حیرت انگیز تھیں، ہماری یونیورسٹیوں کو اِس مثال سے متاثر ہونا چاہیے، اور اگر مالی مشکلات کی وجہ سے وہ طلبا اور اساتذہ کو ممالک غیر نہ بھیج سکیں تو کم از کم ہندوستان کے مختلف حصوں میں اِس قسم کی جماعتیں ضرور ہر سال روانہ کرنی چاہئیں۔ اِس صوبہ کے رہنے والوں کو برما کی سیاحت یا مدراس، بنگال وغیرہ کی سیاحت از بس مفید ہوگی۔ اور ملک کے مختلف حصوں کا بچشم خود مطالعہ کرکے نوجوانوں میں حوصلہ مند، وسیع اخلاق اور اپنے اوپر بھروسہ کرنیکے پاکیزہ جذبات پیدا ہوسکیں گے، اور تعلیم کے سلسلہ میں جو تجربات کرنے کا اُنکو موقع ملیگا اُسکی خوبیوں کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔

ہم کو یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر جناب ابوبکر احمد حلیم صاحب۔ بی۔اے (آکسن) بیرسٹر، پروفیسر تاریخ نے سال گذشتہ کے آخر میں اپنے ہونہار طلبا کو لیکر ٹیکسیلا کا سفر کیا تھا۔ یہ علمی سفر امتحاناً کیا گیا تھا، اور جہاں تک معلوم ہوا ہے کچھ زیادہ خرچ طلب بھی نہ تھا، مگر اِس سفر سے طلبا کو جو مسرت حاصل ہوئی اور جو فوائد انکو حاصل ہوئے اُنکی تعریف میں وہ رطب اللسان ہیں، ہم جناب پروفیسر صاحب سے متوقع ہیں کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو بہ حیثیت اُستاد قلمبند فرماکر قارئین شمع کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کرنیکے لیے ضرور مرحمت فرمائینگے، اور اُنکے ہونہار طالبعلم بھی اپنے نقطۂ نظر سے اِس سفر کے حالات ہمکو بھیجینگے۔ یقین ہے کہ ان حالات کو پڑھکر اُستادوں اور طلبا میں پروفیسر صاحب کی قابل قدر اور نہایت مفید عملی تحریک کی تقلید کا شوق پیدا ہوگا۔ پروفیسر حلیم صاحب اپنی ذاتی صفات، علمی قابلیت اور مسئلہ تعلیم میں گہرے انہماک کی وجہ ملک کی مایۂ ناز ہستی ہیں، اور ہم اُن کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

تبصرے

نظریہ اضافیت - جناب مولوی منہاج الدین صاحب ایم ، ایس ، سی ، پروفیسر علوم طبیعات اسلامیہ کالج پیشاور کی تازہ تالیف ہے، پنجاب گورنمنٹ میں ساڑھے سات سو روپیہ مؤلف کو انعام دیا ہے، آئن اسٹائن کی نظریہ اضافیت نے انسان کے تصورات اور قیاسات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے، اور بقول جناب مؤلف " فضائے بسیط غیر متناہی نہیں رہی، زمانہ اور طول مستقل ہونے کے بجائے اضافی حرکت پر منحصر ہیں کمیت مادہ بھی رفتار سے اثر پذیر ہوتی ہے - آئن اسٹائن نے اس نظریہ کے تمام مسایل اصول ریاضی سے حل کئے ہیں،، لیکن لائق مولف نے علم ریاضی سے حتی الوسع اجتناب کیا ہے چنانچہ ریاضی سے ناواقف اصحاب بھی نظریہ اضافیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں) ریاضی کے اصول حاشیہ پر درج کر دیے گئے ہیں، تاکہ ریاضی داں اصحاب بھی مستفید ہو سکیں، غرضکہ عجب جامع کتاب ہے جسکو لائق مؤلف نے نہایت محنت اور قابلیت سے تالیف کیا ہے، اُردو میں بالکل نئی چیز ہے اور اس لائق ہے کہ ملک کے روشن خیال اور علم دوست حضرات اسکو ضرور خریدیں - اُردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ہے -

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ حجم مع غلط نامہ ۲۴۶ صفحے قیمت صرف للعہ مجلد للعہ جناب مؤلف سے مل سکتی ہے - کتاب نہایت سلیقہ سے طبع ہوئی ہے اور دیدہ زیب ہے -



نفسیات ترغیب - جناب پروفیسر سید وہاج الدین احمد صاحب کنتوری کی تالیف ہے قابل مؤلف نے بڑا کام کیا ہے کہ ایسے ضروری فن کو نہایت صفائی کے ساتھ اُردو کے قالب میں اُتار لیا ہے، مولانا عبدالماجد صاحب بی اے نے مختصر مگر دلچسپ

دیباچہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے ناواقف کو بھی نفسیات ترغیب سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں بالکل نئی چیز ہے، اُردو کے قدر دان اور بہی خواہ اصحاب پھولے نہ سمائیں گے کہ اس زمانے میں ہمارے نوجوان کس محنت اور کوشش سے یورپ کے علمی خزاین کو نہایت قابلیت کے ساتھ اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔

ترغیب، بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے اور اب تو یورپ کی فضا میں جدید تحقیقات نے اس کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے، بقول مولوی عبدالماجد صاحب "نفسیات میں ایک اہم اور دلچسپ بحث ترغیب کی آتی ہے۔ عمل ترغیب کی ماہیت نفسی کیا ہے؟ انسان کو خود کیونکر کسی فعل کی جانب ترغیب ہوتی ہے۔ اور وہ دوسروں کو کیونکر ترغیب دیتا ہے؟ جذبات اور عقل کا ترغیب سے کیا تعلق ہے؟ دلائل منطقی اور ترغیب نفس کے درمیان کس قسم کا رشتہ ہے؟ مؤیدات ترغیب اور موانع ترغیب کیا کیا ہیں؟ ترغیب کے صحیح مواقع استعمال کیا ہیں؟ غلط رجحانات اور باطل ترغیبات سے کیونکر بچنا ہے۔ اس قسم کے سارے مباحث کے لیے ایک جامع نام نفسیات ترغیب ہے"

لائق مؤلف نے یہ تمام مسائل اُردو زبان میں بہت صفائی سے بیان کر دیے ہیں۔ اور کُل کتاب کو دلچسپ اور مفید بنانے میں کافی محنت اور دماغ سوزی کی ہے، ہم خوش ہیں کہ دارالمصنفین مفید اور قابل قدر کتب کی اشاعت کی طرف متوجہ ہے۔ طباعت کی خوبیوں کے لیے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کا اسم گرامی کافی ہے۔ قیمت عہ روپیہ ہے اور دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔



التربیۃ الاستقلالیہ - یعنی اولاد کی تعلیم و تربیت اور صحیح طریقہ پرورش کے متعلق زبان فرانسیسی کی ایک مشہور کتاب انیسویں صدی کا "امیل" کا ترجمہ جو اول مصر میں فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھی، اب اس کے ضروری حصول کا

جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے حسب الارشاد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی - عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور تعلیم قدیم وجدید کے نقائص پر اپنی طرف سے اسمیں ایک مقدمہ اضافہ کیا، اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ نے شایع کیا -

پوری کتاب دلچسپ اور مفید ہے قابل مترجم اُردو کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں، اولاد کی تعلیم کا مسئلہ جیسا کچھ روکھا پھیکا ہے اور جی کا جنجال ہے اسکو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی تقدیر میں چھوٹے بچوں کا باپ ہونا لکھا ہے لیکن اس موضوع کو شگفتہ بنا دینا جناب مترجم ہی کا کام تھا! کتاب کے چار حصے ہیں - پہلا حصہ ماں کے متعلق ہے - دوسرا بچے کے متعلق، تیسرا قریب البلوغ لڑکے کے اور چوتھا جوان لڑکے کی تربیت کے متعلق ہے، ہر حصہ میں چند خطوط ہیں جو دو فرضی میاں بیوی نے لکھے ہیں - شوہر کسی سیاسی جرم میں قید ہو گیا اور میاں بیوی کے درمیان طویل جدائی ہو گئی لیکن شوہر اپنی زندہ یادگار بیوی کے پاس چھوڑ گیا اور اُسی کے متعلق میاں بیوی کے درمیان خط وکتابت ہوئی، مصنف نے اس فرضی لڑکے کی تعلیم و تربیت کا انتظام دو مختلف ملکوں میں کیا ہے، یعنی انگلستان کو اُسکی تربیت کے لیئے منتخب کیا ہے کیونکہ اُس کے نزدیک تمام یورپ میں انگریزی قوم کی اخلاقی حالت سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور قابل تقلید ہے - اور اُسکو اعلےٰ تعلیم جرمنی میں دلوائی ہے جو علمی ترقی کے لحاظ سے تمام یورپ میں ضرب المثل ہے .... زمانہ حمل سے لیکر زمانہ شباب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے غیر مرتب اصول درج ہیں اور ان تمام اصول میں فرانس کی اصلی روح کے لحاظ سے صرف یہ مقصد پیش رکھا گیا کہ طلباء کو ایسی تعلیم و تربیت دیجائے جس سے اُن میں آزادی اور استقلال کی روح پیدا ہو اور اُن کے تمام اعمال اور افعال خود اُن کے "ارادہ اور اختیار سے صادر ہوں، جبر، اضطرار اور تقلید کی اُن میں آمیزش نہو"

تمام خطوط دلچسپ ہیں - ہندوستانی والدین ان کا مطالعہ کر کے بہت کچھ اپنے بچوں کی اصلاح کر سکیں گے - اور اُنکی اصلاح سے خود اُن کی ذہنیت کی بھی اصلاح ہو جائے گی جس کی فی زمانہ سخت ضرورت ہے - لائق مترجم نے ایک بسیط دیباچہ لکھکر بڑا کام کیا ہے اور چونکہ وہ خود قدیم اصول پر تعلیم پا چکے ہیں اور جدید اصول سے واقف ہیں اسلیے اُن کا تبصرہ قابل وقعت ہے - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کتاب کو شایع کر کے ملک پر احسان کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت اچھی - حجم ۳۰۰ صفحہ - قیمت عہ دفتر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے مل سکتی ہے -

---

فطرت اطفال - یعنی ایک انگریز فلسفی اور ماہر نفسیات کرسچین ڈی لارسن کی تصنیف کا اُردو ترجمہ مترجمہ منشی فاضل مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی - یہ رسالہ بھی نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی فرمائش سے ترجمہ ہوا ہے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ نے شایع کیا ہے - بچوں کی نفسیات کے تمام ضروری شعبوں پر بحث ہے - بچوں کی انرجی - رُجحانات طبعی - تربیت تخیل، احساسات لطیفہ، ملکۂ نقالی، تاثرات فطری - اور تعمیر سیرت کے سات ضروری عنوانات پر رسالہ کو تقسیم کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے تحت میں جدید اور دلچسپ تجاویز اور اشارات ہیں - اور لائق مترجم نے اصل کتاب کی دلچسپی کو ایک بڑی حد تک قائم رکھا ہے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنی جدید مطبوعات کے ذریعہ سے اہم خدمات انجام دینے کا بیڑا اُٹھایا ہے - تعلیم یافتہ والدین اور استاد اس قسم کی کتابوں کی جسقدر عزت کریں کم ہے - دفتر ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے یہ رسالہ مل سکتا ہے - قیمت ۴ر ہے

قرآن مجید کا اردو ترجمہ حسب تحریک و انتظام عالی جناب خان بہادر صاحبزادہ محمد سرفراز علیخاں

صاحب چیف سکریٹری حضور سرکار عالی دام اقبالہ دربار جاورہ و بمنظوری حضور پر نور لفٹننٹ کرنیل
ہز ہائینس فخر الدولہ نواب سر محمد افتخار علیخاں بہادر صولت جنگ کے ۔سی ۔آئی ۔ای فرمانروائے
ریاست جاورہ شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی مرحوم کے ترجمۂ قرآن مجید کی پہلی جلد
دار الطبع سرکار عالی جاورہ سے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم
کا ترجمہ ملک میں مقبول ہو چکا ہے مزید تعارف کا محتاج نہیں ۔لیکن ابتک اصل عربی
کے ساتھ ترجمہ شائع ہوتا تھا ۔صاحبزادہ صاحب نے محض ترجمہ کو علیحدہ شائع فرماکر
ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا فرمایا ہے پہلی جلد پندرہ پاروں کا ترجمہ ہے ۔خوشخط
ہے ،اور نفاست کے ساتھ چھپی ہے ۔تمام ضروری نوٹ اور حواشی بھی دئے گئے ہیں
جن کی وجہ سے ترجمہ بہت دلچسپ اور سبق آموز بن گیا ہے ۔ہمارے خیال میں صاحبزادے
صاحب کی توجہ لائق ستائش ہے اور یقین ہے کہ شائقین اس بے مثل ترجمہ کو ضرور
خریدیں گے پہلی جلد کا حجم چار سو چوبیس صفحات ہے ،کاغذ سفید ہے ،اور رحمن علیصاحب
کاتب ہیں ۔باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت للعہ ،مستورات ،اور عربی نہ جاننے ولے
لوگوں کے واسطے یہ ترجمہ ایک نعمت ہے اور اس لائق ہے کہ کتب خانوں و مدارس میں
خرید کر رکھا جائے ۔ ملنے کا پتہ ۔

دار الطبع سرکار عالی جاورہ ریاست ۔

قواعد اردو ۔مؤلفہ مولوی عبد الحق صاحب بی ۔اے ۔علیگ

انتخاب کلام میر ۔معہ مقدمہ مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب بی ۔اے علیگ

مثنوی خواب و خیال ۔خواجہ اثر مرحوم ،مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب بی ۔اے علیگ

یہ تینوں کتابیں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے شائع کی ہیں ۔انجمن مذکور

ہر سال متعدد مفید کتابیں شایع کرتی ہیں۔ ٹائپ کے حروف میں چھپی ہیں۔ جلد بندی بہت نفیس ہے، اور قیمتیں بالکل واجبی ہیں، ٹائپ کو رائج کرنے میں جو کوشش انجمن مذکور کی جانب سے ہو رہی ہے وہ حقیقت میں قابل قدر ہے۔

قواعد اُردو۔ مولوی صاحب کی مشہور تالیف ہے۔ کچھ عرصہ سے کمیاب تھی اب دوبارہ شایع ہوئی ہے۔ لائق مؤلف نے اسکو جدید اور آسان اُصول پر تالیف کیا ہے۔ اس مرتبہ عروض کا اضافہ کر دیا ہے۔ بہ لحاظ ترتیب اور جامعیت کے، لاجواب کتاب ہے۔ مجلد عہ؍ غیر مجلد عما؍

انتخاب کلام میر۔ بہت مقبول انتخاب ہے۔ تیسری بار شایع ہوا ہے مولوی صاحب نے مقدمہ لکھکر ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ انتخاب اور مقدمہ دونوں کی تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ بعض طبایع انتخابات کو پسند نہیں کرتے، لیکن ہمارا خیال ہے، کہ جہاں شاعر، چار چار اور پانچ پانچ دیوان لکھنا اپنی اُستادی کی دلیل سمجھتے ہوں، وہاں عوام کے لیے انتخاب نہ کرنا، خود شاعر کے اوپر ظلم کرنا ہے، طلبا، یا عوام کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ روپیہ کہ وہ ایک ایک صاحب دیوان، کی سیکڑوں، غزلوں، قصائد، قطعات، اور مثنویوں کے سمندر میں غوطے لگا کر آبدار اشعار نکال لایا کرے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ اصل دیوان بالائے طاق رکھ دیے جائیں۔ ہم صرف اس قدر عرض کرتے ہیں کہ انتخابات کی بہت ضرورت ہے، اور شعرا کو عوام میں مقبول بنانے کا یہی ایک موثر طریقہ ہے۔ مجلد عما؍ غیر مجلد عہ؍

مثنوی خواب وخیال۔ خواجہ دردؔ مرحوم دہلوی کے بھائی خواجہ اثرؔ کی مثنوی ہے جو نایاب تھی۔ مگر مولوی عبدالحق صاحب نے پیدا کر دی، اور اپنے دلچسپ اور مفید مقدمہ کے ساتھ شایع کر کے ملک پر بڑا احسان کیا۔ مولٰنا حالیؔ مرحوم کا خیال تھا کہ حکیم نواب مرزا شوقؔ مرحوم لکھنوی نے اس مثنوی کو اپنا ماخذ قرار دیا تھا، مثنوی خواب وخیال کے

مطالعہ سے مولانا مرحوم کے خیال کی طرف حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے، مثنوی نہایت پاکیزہ ہے اور فصاحت اور سلاست کے اعتبار سے لاجواب ہے، خواجہ اثر مرحوم کا دیوان ناپید ہے، مگر مثنوی میں اُنکی جا بہ جا غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزلگوئی میں بھی باکمال تھے، مجلد عہ، غیر مجلد عہ۔

یہ تینوں کتابیں خریدنے اور مطالعہ کرنے کے لائق ہیں۔ انجمن ترقی اُردو بڑا کام کر رہی ہے، اور مولوی صاحب اسکے مسیحا ہیں۔ یقین ہے کہ اُنکی دماغی کاوشیں ملک میں مقبول ہو گئیں، اور اہل ذوق ان پاکیزہ کتب سے لطف اندوز ہونگے۔ چھپائی نہایت صاف اور خوبصورت ہے۔ جلد بندی مضبوط، اور نفیس۔ قیمت کم۔ غرض ہر اعتبار سے کتابیں اپنی خریداری کی خود سفارش کرتی ہیں۔

آئین اُردو، مؤلفہ جناب مولوی محمد زین العابدین صاحب فرجاد کوٹانوی (نامی پریس میرٹھ عہ) قواعد اُردو پر نئی کتاب ہے جو محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے۔ چونکہ مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری کی مصباح القواعد، اور مولوی عبدالحق صاحب کی قواعد اُردو کے بعد تالیف ہوئی ہے اسلیئے لائق مؤلف کو ہر دو کتب مذکورہ کی خوبیوں سے مستفید، اور اُنکی غلطیوں سے محفوظ رہنے کا پورا موقع ملا، لائق مؤلف نے ابتدا میں دونوں بزرگوں کے تسامحات کی فہرستیں لکھدی ہیں۔ کسی زبان کے قواعد مرتب کرنا آسان کام نہیں، اسی لیئے مؤلفین میں اختلاف آرا کا ہوجانا بھی تعجب کی بات نہیں۔ لائق مؤلف نے قواعد اُردو کی بعض غلطیوں کی صحیح گرفت کی ہے اور بعض جگہ خود بھی غلطی کی ہے، ابھی کچھ عرصہ تک کوئی کتاب قواعد کے متعلق غلطیوں سے پاک نہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان پھیلی ہوئی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بحث و تنقیح کے بعد ایک دن آئے گا جب کہ مکمل قواعد مرتب ہوسکیں گے۔

لیکن اُس وقت بھی اختلاف آراء کا سلسلہ بدستور قائم رہے گا۔ لائق مؤلف نے بہت محنت کی ہے اور اُردو کے قواعد کو حتی الوسع جامع بنایا ہے، لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہیں کہیں غلطیوں کا ہو جانا غیر معمولی بات نہیں ہے، مولوی فتح محمد خاں صاحب تو دنیا میں نہیں ہیں جو مؤلف کو جواب دیتے، لیکن مولوی عبدالحق صاحب زندہ ہیں اور بہت زیادہ زندہ ہیں۔ اُنھوں نے اپنی کتاب کے متعلق رسالہ اُردو میں جواب دیدیا اور لائق مؤلف کی کتاب آئین اُردو میں متعدد غلطیاں نکال کر رکھدیں "تاکہ فاضل مؤلف کو معلوم رہے کہ لغزشوں کا صادر ہونا اُن سے بھی ممکن ہے" اس جھگڑے میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی کھینچنا پڑا، حسب تحریر مولوی عبدالحق صاحب "کتاب (آئین اُردو) کے سرورق پر جلی قلم سے یہ بھی تحریر ہے، مصدقہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی عظیم دارالمصنفین اعظم گڈھ، اور قابل مؤلف کا یہ لکھنا بجا بھی ہے کیونکہ سرورق کی پشت پر اس سے بھی جلی قلم میں حضرت علامہ موصوف کا نامۂ صداقت بھی منقول ہے جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے ماہ رمضان کی فرصت میں آپ کی پوری کتاب (آئینِ اُردو) دیکھی مجھے تو کہیں حرف رکھنے کی جگہ ملی نہیں ...."

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی   کسی کے مارے تھی پر چپی کسی کی آن لگی

مولوی صاحب کو شاید خیال نہ رہا کہ علامہ موصوف نے اپنی رائے صرف ایک کارڈ پر۔ اور وہ بھی رمضان کے مہینہ میں لکھکر بھیجدی تھی، ورنہ مولوی صاحب المقدور خفا ہوتے! چونکہ اُردو کے اور رسالوں میں بھی فریقین کے تسامحات پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اس لیے مزید رائے زنی عبث معلوم ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب قابل قدر ہے، اور مقبول ہے، جدید طرز کی تالیف ہے۔ اس میں غلطیوں کا رہجانا مقتضائے بشریت تھا۔ آئین اُردو بالکل تازہ تالیف ہے، اس میں بھی غلطیاں ہیں، یہ بھی بشریت کا اقتضا ہے لیکن معمولی غلطیوں کے ہونے سے ہر دو کتب کی قدر و قیمت میں کمی واقع نہیں ہوتی جناب جاوید

صرف کے حصہ کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اور جدتیں بھی پیدا کی ہیں یقین ہے کہ اُنکی محنت ٹھکانے لگے گی، اور ملک میں کتاب مقبول ہوگی۔ اُنھوں نے ایک قابل قدر ادبی خدمت انجام دی ہے جسکے لیئے وہ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں حجم ۳۱۶ صفحے جناب مصنف سے مل سکتی ہے۔

آئینۂ حقیقت نما - جلد اول مصنفۂ مولٰنا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی جناب مولٰنا نے اس کتاب کو نیک نیتی سے تصنیف کیا ہے۔ اُن کا خیال بالکل بجا ہے کہ انگریزی مدارس میں حال کی لکھی ہوئی تواریخ کا مطالعہ مسلمانوں کے عہد حکومت کی تواریخ سے بے اعتنائی اور لیڈروں کی خود بینی نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو شدید نقصان پہونچادیا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے سنہ ء لغایتہ سنہ ء یعنی گیارہ سو برس مسلمانوں نے ہندوستان میں حکومت کی، لیکن اُن کے تعلقات ہندوؤں سے بہت اچھے رہے۔ افسوس ہے کہ انگریز مورخوں نے سچائی پر قصداً پردہ ڈالا، جھوٹے اور غلط واقعات کو مدرسوں اور کالجوں کے طلبار کے دماغ میں جاگزیں کرایا، باہمی منافقت بڑھائی۔ اصلی کتب تواریخ جو فارسی میں تھیں اور صحیح واقعات وحالات کی حامل تھیں اُن کو پس پردہ ڈالدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درسگاہوں کی فضا میں سمیت پھیل گئی، اور دلوں میں مغائرت اور عناد کی آگ بھڑک اٹھی، اُسکو جاہ طلب اور عزت کے خواہاں بد نصیب لیڈروں نے اپنی اغراض کے لیئے تمام ہندوستان میں پھیلا دیا۔ مولٰنا اپنی تصنیف کے ذریعہ سے غلط خیالات کو دور کرنا چاہتے ہیں، اور بتانا چاہتے ہیں کہ مسلم حکومت ابتدا سے انتہا تک ہندو دوست تھی، ہندو کش نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ صحیح تاریخی واقعات اور حالات کے تحت میں اگر کوئی کتاب اس اہم موضوع پر لکھی جاے تو ملک اور قوم کے لیے بیحد مفید ثابت ہوگی، اور مورخانہ حیثیت سے اُسکا مرتبہ بلند ہوگا ہم نے آئینۂ حقیقت نما کو جستہ جستہ دیکھا

مولنا کا طرز استدلال مدعیانہ ہے اور وہ کمزور روافعات کو بھی اپنی قوت سے مضبوط بنانا چاہتے ہیں یہ باتیں فن کے اعتبار سے قابل گرفت ہیں، ہندوستانی مورخ عموماً انگریزی میں کتابیں لکھتے ہیں اور بمشکل خالی الذہن ہو کر تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں۔ شروع سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہندو مسلم کشیدگیاں اُس زمانہ میں بہت زیادہ تھیں اور اسی رنگ کی عینک چڑھا کر حالات اور واقعات کو دیکھتے اور موشگافیاں کرتے ہیں اور اس بدعت کو ریسرچ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مولنا نے جو ریسرچ کی ہے وہ بھی ایک خاص رنگ کے تحت میں ہے۔ اس لیے اُن کو ہر مقام پر مسلمان بادشاہوں کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ ہم ممنون ہیں کہ مولنا کا قلم ایسے موضوع پر گل فشانیاں کر رہا ہے جس سے خیر و برکت کی توقع ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اصل فارسی کتب کو پیش کرتے ہیں۔ انگریز مورخین کی تحریرات کو سامنے لاتے ہیں اور پھر اُنکی قلعی کھولنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسی کوشش میں کبھی کبھی وہ خود مغالطہ میں آجاتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کی رواداری اور اُنکی منصفت مزاجی کو ایک حد تک صحت اور صفائی سے ظاہر کر سکے ہیں۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ بے تعصبی کے ساتھ صحیح تاریخی استدلال اور استخراج کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ موجودہ تصنیف جلد اول ہے اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی اور خسرو خاں کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ مولنا اگر مدعیانہ طرز کے ہوتے ہوئے بھی اپنے قلم کو حد اعتدال کے اندر رکھتے تو بہتر ہوتا، بعض جگہ وہ ہندو مورخین اور اہل ہنود کے متعلق سخت الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جنکی وجہ سے لفظی بحثوں میں اصلی تاریخی حالات غائب ہو جاتے ہیں، یہ تو ایک موٹی سی بات ہے اگر مسلمانوں میں رواداری نہ ہوتی تو گیارہ سو برس تک ہندوستان میں کس طرح رہ سکتے تھے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ رواداری کو واضح کرنے میں اگر مخالف ہندو مورخین یا ہندوؤں کی بے عنوانیاں نظر آئیں تو اُن کا ذکر سخت الفاظ میں کیا جائے ؟ -

بہرکیف کتاب پڑھنے کے قابل ہے اور ہندوستان کی تاریخ کے طلباء کو ضرور مطالعہ کرنی چاہیے حجم ۲۳۳ صفحے قیمت عہ، نجیب آباد میں مصنف سے مل سکتی ہے۔

عبرت - یعنی تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کا وہ حصہ جس میں سورہ یوسف کی معنی خیز تفسیر ہے - از جناب خواجہ محمد عبدالحیٔ صاحب فاروقی استاد تفسیر و ناظم دینیات جامعہ اسلامیہ دہلی - ایک جامع اور عالمانہ تفسیر ہے جس کے مطالعہ سے بصیرت حاصل ہوتی ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، مولٰنا عالم و فاضل ہیں محقق ہیں اور بالغ نظر بزرگ ہیں - اُنھوں نے جا بجا ضروری اور مفید معلومات کا اضافہ کرکے تفسیر کو بہت ہی دلکش بنا دیا ہے - جامعہ ملیہ نے اس کتاب کو شایع کرکے مسلمانوں کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے - ہمارا خیال ہے کہ وہ غیر مسلم بھی اس تفسیر کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے جنکو اسلام سے دلچسپی ہے، اور اُنکی بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی جو باوجود مسلمان ہونے کے عقلی اور نقلی دلائل یا جہل و کم علمی کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں ایسی مفید مذہبی کتابوں کی اشاعت از بس ضروری ہے اور ہم منتظر ہیں کہ اسی انداز سے مولوی صاحب پورے کلام مجید کی تفسیر جلد شایع فرمائیں گے -

قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۱۲؍، پتہ: - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

دیوانِ شیدا - یعنی جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب شیدا کا فارسی اور اردو کلام، حضرت مسیح الملک مشہور حکیم، اور مستند ادیب ہیں - ممکن نہ تھا کہ ظاہری اور باطنی آراستگی کے ساتھ اُن کے قلب پر محبت کی چوٹ نہ ہوتی، اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ انسان بغیر عشق کے کامل نہیں ہو سکتا، یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو اگر قلب انسانی میں موجود نہو تو عالم بے عمل اور محقق محض مقلد رہجاتا ہے - حضرت مسیح الملک کے قلب کی کیفیت اُن کے اشعار میں نمایاں ہے -

فارسی کے چند اشعار جو ملاحظہ طلب ہیں:—

بزیرِ گنبدِ گردوں اگر رنج و محن دارم — مکن نسبت بہ گردونش کہ من از خویشتن دارم
کنوں در عشقِ تو جاناں نہ جاں دارم نہ تن دارم — ولے دل با ہزاراں آرزو زیرِ کفن دارم
حبیبا! از لبِ جاں بخش خود یک قطرۂ آبم دہ — بسے بگذشت در فرقت کہ من آتش بہ تن دارم
بدار ایمن خدایا از حوادث ایں ودیعت را — نہاں در خانۂ دل آنچہ زاں رشکِ چمن دارم

دلبرا در گردش آور جام را — تا ز خسارت بجوئیم کام را
بادۂ گلگوں بہ بانگِ کوس خور — پشت پا زن چرخِ نیلی فام را
چوں زدی در وادیٔ الفت قدم — ننگ را برہم زن و ہم نام را
تا رہد شیدا از جورِ آسماں — ساقیا برخیز و پُر کن جام را

آں بیخودم کہ بر لبِ من آہ و نالہ نیست — مستم ز عشقِ یار و بدستم پیالہ نیست
از دردِ دل ہر آنچہ کہ بسپردہ شد بشعر — در گوش کن کہ گفتۂ شیدا رسالہ نیست

گہ بزلفش او بپیچم گہ بُرخ زنم بوسہ — ناصحا ز من بگذر عالم جوانیہاست
دی تو با رقیبِ من زیرِ لب چہ بر گفتی — دلبرا مکن عیبم عشق و بدگمانیہاست

غمِ دل با کہ تواں گفت کہ غمخواری نیست
ہمہ مستند دریں میکدہ ہشیارے نیست

صد ہزاراں جاں شد و بازش مبیں — شمع در بزم است خنداں الغیاث

فارغ از راحت و رنج دو جہانم کردی — مرحبا عشق کہ ہم این و ہم آنم کردی

مژدہ اے یاراں کہ باز آں دلستاں آید ہمی — در گلستانم بہار بے خزاں آید ہمی

دستِ تہی ز برگ و ساز ، پائے شکستہ رہ دراز
خود تو بگو ، جہانِ ناز ، چوں کنم از جستجو
آنچہ کہ رفت ماجرا ، گرچہ نہفتہ ز ما
لالہ رخا ، سمنبرا ! زلفت تو گفتہ مو بمو
حور و سروش انس و جاں ، خلق زمین و آسماں
ہرچہ کہ ہست در جہاں ، میکند از تو گفتگو



اُردو کلام ملاحظہ ہو :-

لو مبارک ہو لٹا پھر نقدِ دل لوٹا ہوا — پھر پھنسا دامِ بلا میں مرغِ جاں چھوٹا ہوا
یاس و نومیدی کے ہاتھوں اس دلِ بیتاب میں — پھر رہا ہے حسرتوں کا قافلہ لوٹا ہوا

آباد بلبلوں سے خزاں میں بھی تھا چمن — ہر ہر قدم پہ سنتے ہیں اِک اِک ہزار تھا
خلوت میں کٹ رہی تھی کسی سے نہ تھی غرض — غم تھا نہ جامِ مے کا ، نہ فکرِ نگار تھا
اِتنے میں تیرہ ابر اُٹھا کوہسار سے — وہ ابر جو کمیں میں بہت بے قرار تھا
پھر آرزوے بادہ مجھے لے چلی کہیں — یاد آیا میکشوں سے جو قول و قرار تھا
لیکن ابھی لیا بھی نہ تھا جام ہاتھ میں
دیکھا تو فصلِ گل بھی ، نہ ابرِ بہار تھا

لذت ہی تھی کچھ ایسی کہ چھوڑا نہ صبر کو | کرتے رہے وہ جور و ستم میں سہا کیا
کیا شے تھی وہ جو آنکھ سے دل میں اتر گئی | دل سے اٹھی تو اشک کا طوفاں بپا کیا
تیری کشاد لب ہے مری موت کا پیام | نکلے گا دم جو تو نے تبسم ذرا کیا

ظلم کی تیری کریں فریاد کیا | لطف ہو جب اسمیں پھر بیداد کیا
وصل ہی شیدا اجل کا نام ہے | دیتے ہیں اسکی مبارکباد کیا

واعظ یہ فصل گل ہے، یہ گلرو، یہ میکدہ | قصہ نہ چھیڑ آج حرام و حلال کا

آنکھ کے ظرف سے اندازۂ مظروف نہ کر | ہم نے دریا کو اسی کوزے میں بھر رکھا تھا

تو اے بخت سیہ سن لے کہ اک دن وہ بھی آئیگا | نہ ہم ہوں گے نہ تو ہوگا، نہ دور آسماں ہوگا

مجھ سے پوچھو اثر بادۂ گلگوں واعظ | میں ہوں رندوں میں بہت تشنہ رس جام شراب

آخر لبوں تک آ ہی گئی آرزوے دل | کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروے دل

مرنا بھلا ہے ضبط کی طاقت اگر نہو | کتنا ہی درد دل ہو مگر چشم تر نہو
مل جاؤ تم تو شب کو بڑھالیں گے تا ابد | مانگیں گے یہ دعا کہ الٰہی سحر نہو

عصیاں کے تلاطم نے کیا ہے تہ و بالا | یہ ہاتھ مگر دامن ساحل کے لیئے ہے

ہے راہ سپر بے سر و ساماں ترا مجنوں — لیلی ہی ساماں تری منزل کے لیے ہے
کہتے ہیں جسے مرگ نہیں مرگ وہ ہرگز — پہلا یہ قدم لیجئے منازل کے لیے ہے
آئی ہے بہت شان سے گو فصل بہاری — پیغام مگر مرگ عنادل کے لیے ہے

شیدا سے کہا راز یہ اک صاحب دل نے
جو کچھ ہے جہاں میں وہ فقط دل کے لیے ہے

رہیں یہ آرزو میں یا نکل جائیں برابر ہیں — مریض عشق سے پوچھو تو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
کبھی صیاد کا ڈر ہے، کبھی خوف خزاں اسکو — گلستاں میں دل بلبل پہ غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وہ لیلی اٹھی مگر جذب محبت سے ہوئی مجنوں — کتاب عشق میں شیدا رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

رخسار پر ہے رنگ حیا کا فروغ آج — بوسہ کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

پھرتے ہیں چاک جیب و گریباں پیے ہوئے — ہم دست عشق کے ہیں پریشاں کیے ہوئے
پھر داغ ہجر تازہ کرونگا بہار میں — مدت گذر گئی ہے چراغاں کیے ہوئے

درد کو رہنے بھی دے دل میں دوا ہو جائگی — موت آئیگی تو اے ہمدم شفا ہو جائے گی
محتسب اور ہم ہیں دونوں متفق اس باب میں — برملا جو میکشی ہو بے ریا ہو جائے گی

کب بدلتے ہیں زمانہ سے حقیقت آگاہ — میں نہیں اور، زمانہ کی ہوا اور سہی
ہے بقا دہر کی ہر لحظہ ہم آغوش فنا — تم بقا اسکو سمجھتے ہو فنا اور سہی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے حضرت شیدا کے دیوان کو نہایت نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ جرمنی میں چھپوایا ہے۔ پاکٹ سایز ہے اور کاغذی بکس میں فروخت ہوتا ہے۔ جلد سنہری اور نفاست طبع کا اعلے نمونہ ہے قیمت صرف عہ/ ہے شروع میں مکرمی جناب قاضی عبدالغفار صاحب بی۔ اے۔ علیگ کا دیباچہ ہے، جو مجسم کیف ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔

ہم کو دلی مسرت ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی علمی دنیا میں نہایت سرگرمی کے ساتھ علمی ترقی کر رہی ہے۔ دعا ہے کہ خدا ے برتر جامعہ کو کامیاب فرمائے۔

جامعہ ملیہ سے ایک رسالہ جامعہ بھی شایع ہوتا ہے، مولٰنا اسلم صاحب جیراجپوری، اور جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایڈیٹر اور ہمارے عزیز دوست جناب محمد مجیب صاحب آکسن، ناشر ہیں۔ رسالہ ملک کا مشہور علمی پرچہ ہے سالانہ قیمت ے، روپیہ ہے۔



کتب بغرض ریویو

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو وصول ہوئی ہیں۔ شکریہ کے ساتھ رسید پیش کیجاتی ہے، ان کتب پر عنقریب ریویو کیا جائیگا۔

میخانہ۔ تالیف ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی، باعتناء مولوی محمد شفیع صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور ے؍

حقیقت اسلام۔ مصنفہ نواب سرامین جنگ بہادر کے، سی، آئی ای نظامی پریس بدایوں۔ عہ؍

پیامِ صلح (نظم) ماسٹر باسط صاحب بسوانی و جناب نیساں لکھنوی۔
نظامی پریس بدایوں ۸/

پس پردہ - مجموعہ مضامین جناب آغا حیدر صاحب دہلوی مرتبہ مولوی عبد الباسط صاحب ایم۔ اے۔ علیگ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ - ۱۲/

خطبات اسلامیہ مدراس - مصنفہ جناب سید سلیمان ندوی صاحب انجمن الاصلاح وسنہ ڈاک خانہ استھاوان ضلع پٹنہ ۸/

دیباچہ صحت - مصنفہ میجر لطافت حسین صاحب۔ آئی۔ ایم۔ ایس انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

باغبانی - مترجمہ حامد حسین صاحب قادری بچھرایونی میسرز میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ ۱۲/

صحت کی کہانی - مترجمہ مولوی عابد حسن صاحب زیدی۔ ایم۔ اے۔ ایل ٹی " " ۸/

الکحل اور زندگی - مترجمہ مولوی حامد حسن صاحب قادری " " " ۸/

حکایات پنجاب - مترجمہ سید عبد القادر صاحب ایم۔ اے " " " ۱۲/

خیابان عرفاں - مولفہ مولوی محمد حسن صاحب بلگرامی۔ حیدرآباد دکن ۵/

بزم ایران - مولفہ حاجی آغا محمد رضا صاحب قزوینی - رام پور ۸/ ۲/

اقبال - مصنفہ جناب مولوی محمد دین صاحب وکیل لاہور۔ ۸/

میرا پیارا وطن - فیاض محمد عبد القدوس صاحب آف مستان قیملی نمایندہ اسمبلی، ممبر جن پٹن - میسور

اردو ترجمہ قرآن - ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم دہلوی ۵ اسیپارہ حصہ اول سرکاری پریس ریاست جاورہ - للعہ

جلد ۶ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۷ء | نمبر ۱

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کیلئے عنایت فرمایئے شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا۔ دس خریدار مرحمت فرمائینگے تو شمع ایکسال تک مفت حاضر خدمت ہوگا۔ اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کیجائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری کا شوق ہے تو

آپ اپنا تحریر کردہ فسانہ ہکو مرحمت فرمایئے ہم آپکو اُسکے معاوضہ مین رسالہ شمع چھ ماہ مفت ارسال کرینگے۔ اور اگر کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک وہ شمع مین چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت مین اسکی بیس جلدین بھی نذر ہونگی۔

اگر آپ کو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمایئے بعد اشاعت اُسکی بیس کاپیان مفت نذر کی جائینگی۔

اگر آپ شاعر ہین

اور آپکی نظمین یا غزلیات سال بھر مین سب سے زیادہ تعداد مین شمع مین شایع ہوئین تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع مین ہر مضمون جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر مین بہترین ہوگا اُسپر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائیگا۔

واضح رہے

جو مضمون، فسانہ، ناول، نظم، غزل، ناپسند ہوگی وہ ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس کر دیجائیگی البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے باحتیاط واپس کر دینے کے ذمہ دار ہین، شمع کے جس نمبر مین آپکا مضمون یا آپکا کلام شایع ہوگا، بلالحاظ اسکے کہ آپ انعام کے مستحق ہین یا نہین، وہ نمبر آپکی خدمت مین مفت روانہ کیا جائیگا۔

مطبوعات جدید

جو سنہ ۱۹۲۷ع مین بغرض ریویو وصول ہونگی اُن پر دو انعامات ہین۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُنکو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجینگے۔

(۲) انعام حسب تجویز کمیٹی اُنکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد مین کتب ارسال فرمائینگے۔

خادم منیجر شمع



ماہ جولائی ۱۹۲۷ء

علم تاریخ

اور

تاریخ ہند کا موضوع

سید جمیل حسین - ایم اے (علیگ) حیدر آباد (دکن)

"ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو"

تاریخ ایک بہت وسیع اور قدیم علم ہے۔ اسکی وسعت اور قدامت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر وہ شے جس پر مکان اور زمانہ کا اطلاق ہوتا ہے تاریخ کا مضمون بن سکتی ہے

ڈلائل برنس کے قول کے مطابق "تاریخ اس بات کی تشریح ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہین وہ کیونکر کرنے لگے"، بالفاظ دیگر دور حاضرہ سے واقفیت حاصل کرنیکے لئے عہد ماضی کا مطالعہ ضروری ہے۔ اِس تغیر و تبدل کے دکھانے سے اصل مین یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ کیونکر ہم اپنے مستقبل کو بہتر یا بد تر بنا سکتے ہین۔ علامہ اقبال نے اسی فلسفہ کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

سر زند از ماضی تو حال تو   خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن از خواہی حیات لازوال   رشتہ ماضی ز استقبال و حال

ایک قوم کی ترقی اور نشو و نما کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ تاریخ کے معنی اہم واقعات اور ان کے سنین کو خیال کرتے ہین۔ اسطرح کی واقفیت سے ہماری معلومات میں چنداں مفید اضافہ نہیں ہوتا اور نہ اِس سے ہم اپنی آئندہ زندگی پر ہی اثر ڈال سکتے ہیں۔ ہم کو یہ نہین معلوم ہوتا کہ اس دور کا عام رویہ کیا تھا۔ برخلاف اسکے ہم ایک غیر معمولی واقعہ کو اہم خیال کرنے لگتے ہیں۔ یہ اصل میں غلطی ہے۔ ہم کو غیر معمولی واقعات سے زیادہ عام حالات سے واقفیت ہونا چاہئے کیونکہ انہی سے تمام ترقی یا تنزلی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ بعض عہد ماضی کے مشاہیر کے کارناموں کا مطالعہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس گردہ کا قول ہے کہ کسی عہد کی عام حالت کا اندازہ اس کی زبردست ہستی کے افعال و اقوال سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ماحول کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور گرد و پیش کے حالات ہی اسکو وہ بنا دیتے ہین جو وہ نظر آتا ہے۔ بعض کے نزدیک دور گذشتہ کے تمدن و معاشرت کی چھان بین بس ہوتی ہے۔ یہ ایک حد تک درست ہے۔ بعض ایک قدم آگے اور جاتے ہیں اور یہ بھی غور کرتے ہین کہ طبعی حالات لوگونکی تمدنی و سیاسی زندگی پر کیا اثرات ڈالتے ہین

لیکن صحیح معنی مین تاریخ کے مطالعہ سے ہماری غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ یادِ رفتگان پر غم کے دو چار آنسو بہا لیا کریں بلکہ درحقیقت تاریخ ایک درسِ عمل ہے۔ پچھلی داستانوں، مشاہیر کے کارناموں، اور عوام کی زندگیوں سے ہم کو سبق لینا چاہئے کہ کیونکر ہمارا مستقبل

کارآمد اور مفید بن سکتا ہے۔ ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے سلف کس چیز کے طالب تھے اور اُن کی دلی آرزو کیا تھی؟ کہاں تک وہ اسمیں کامیاب ہوئے اور کیا کام وہ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑ گئے۔؟ دور حاضرہ کے لوگوں کا کام یہ ہے کہ بزرگوں کے کارنامے کی تکمیل کریں اپنے مستقبل کو شاندار بنانیکے لئے ہمارے واسطے اس سے بہتر اور کوئی شاہراہ عمل نہیں ہوسکتی۔ ہمارے منصوبے ہی ہمارے مستقبل پر اثر ڈالتے ہیں اور اگر فی الحقیقت ان میں کچھ خلوص اور اصلیت ہے تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور پورے ہوکر رہیں گے۔ اس اُصول کو مدنظر رکھ کر ہم کو سب سے زیادہ توجہ دور حاضرہ پر دینی چاہیئے اور اگر کوئی عہد ہمارے لئے بیسویں صدی سے زیادہ دلچسپ ہوسکتا ہے تو وہ اکیسویں صدی ہے۔

علامہ اقبال نے تاریخ کی اہمیت کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے

"جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعین عمل وذوق حقایق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشو ونما، اسکے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے، اسی طرح ملل واقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، ترتیب اور استحکام میں مضمر ہے۔ اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد قوم کسی آئین مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود متعین کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقص مٹکر تمام قوم کیلئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورتمیں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے اقوام کی صورتمیں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لئے بمنزلہ قوتِ حافظہ کی ہے جو اسکے مختلف مراحل کے حیات واعمال کو مربوط کر کے قومی انا کا زمانی تسلسل محفوظ وقایم رکھتی ہے"

بدقسمتی سے تاریخ ہند کا مطالعہ جستہ جستہ واقعات سے کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ راجاؤں اور بادشاہوں کے ذاتی افعال واقوال کا کارنامہ معلوم ہوتی ہے جنہوں نے

اکثر و بیشتر اپنے پیش روؤں کے طرزِ عمل کو پس پشت ڈال کر بمصداق "ہر کہ آمد عمارت نو ساخت،" اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائی۔ تاریخ کے ایک سچے طالب علم کی نظر صرف ان انقلابات ہی پر نہیں پڑنی چاہیے جو انتظام حکومت کی اوپری سطح پر واقع ہوئے بلکہ بہ نظر تدقیق و تحقیق تمدنی و معاشرتی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے جس پر محلوں کے انقلابات حکومت کے ظاہر ار دو بدل کا کوئی گہرا اثر نہیں پڑا۔ ہماری حکومت کی بنیاد ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے البتہ مختلف معماروں نے عمارت کی وضع قطع اپنی اپنی حسب منشا بنا لی۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب فرماتے ہیں۔

"ہندوؤں کے تیرتھوں، راماین اور مہابھارت کے افسانوں، دیہاتی پنچایتوں اوران کے آزاد جمہوری طرز حکومت، علاوہ ازیں مہا بانا بدھ مت کے قدیم فلسفہ اور منو کے دھرم شاستر میں ہم لاتعداد تاثرات دیکھتے ہیں۔ جنھوں نے متبرک آریاورت کے باشندوں کو آئندہ ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا۔ اگر یہ کام پہلے سے نہ ہو چکا ہوتا تو علاالدین اور اکبر کی فتوحات ہر اخلاقی قوت سے بے بہرہ رہتیں اوران کی سلطنتیں بھی سکندر کی سلطنت کی طرح یک روزہ اور قلیل الحیات ہوتیں۔"

اِس نقطہ نظر سے ہماری تاریخ میں بھی مثل اور قومی تاریخوں کے ایک تسلسل اور ربط پایا جاتا ہے اور اسکا مطالعہ بھی اسی قدر دلچسپ معلوم ہوتا ہے جتنا کہ تاریخ انگلستان کا دور حاضرہ کی بنیادیں عہد وسطیٰ میں نظر آتی ہیں اور ہماری تاریخ کا قدیم زمانہ بغیر کسی اچانک انقلاب کے ساتھ عہد وسطیٰ میں منتقل ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی مورخین نے بہت کم اسطرف توجہ کی ہے کہ ملک کے تدریجی نشوونما کو ایک مختصر اور جامع پیرایہ میں ظاہر کریں، جو ملک کے نونہالوں کے لئے درس قومی اور آیندہ کے لئے شاہراہ عمل بن سکے۔ بعض نے اگر قدیم حکمت و فلسفہ کو سراہا ہے تو بعض نے وسطائی عظمت و شان کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ بعض کی کوشش محض تاریخی شخصیات کی

تحقیق پر صرف ہوتی ہیں۔ظاہر ہے کہ اس قسم کی تواریخ علمی پہلو کے اعتبار سے زیادہ مفید نہیں ہوسکتیں۔تاریخی شخصیات کے سوانح نگاروں کے لئے وہ ہستی جس کو وہ پیش کرتے ہیں ایک ہیرو بن جاتی ہے۔مصنف اسکو اتنا بڑھاتا چڑھاتا اور اسکی اہمیت کو اتنا جتاتا ہے کہ توازن تاریخ قایم نہیں رہتا۔ہمارا تعلق افراد کی ذاتیات سے صرف اتنا ہی ہونا چاہئے جس حد تک وہ اپنے عہد کو متاثر کرتے ہیں، کیونکہ اصل مقصد ان کی ذات کا مطالعہ نہیں ہوتا بلکہ غرض وغائت ان احساسات و رجحانات کو معلوم کرنا ہوتی ہے جو دنیوی تحریکات مین رونما ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں اہل انگلستان کا واقعی ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کے ارتقائی مدارج کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ نسلی افتخار اور حکومت کی برتری دکھانے کی کوشش نے ان کے نقطہ نظر کو بدل دیا۔ان کے نزدیک برطانوی حکومت سے پہلے ہندوستان جہالت مین گرفتار تھا، نہ اندرون ملک مین امن تھا نہ باہر کے حملوں سے بچاو، راستے قزاقوں سے پر تھے اور قحط اور طرح طرح کی بیماریاں آئے دن لوگوں کو گھیرے رہتی تھیں ایک جابر حکومت نے لوگوں کو آہنی پنجوں میں دبوچ رکھا تھا، جس کو نہ رعایا کے حقوق کا پاس تھا نہ ان کی آزادی کا خیال۔لیکن جب سے انگریزوں نے اس زمین پر قدم رکھا ہے ہندوستان یکلخت ان مصیبتوں سے محفوظ و مامون ہے۔لوگ آزاد، خوشحال اور فارغ البال ہیں، اور ملک روز افزوں مادی ترقی پر ہے" لہذا اہل ہند کو چاہئے کہ موجودہ حکومت کے وفادار اور جانثار رہ کر اپنی ترقی مین کوشاں رہیں"[1] اس امر کے تسلیم کرنے سے کسی شخص کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہم نے اِس عرصے میں بہت کچھ ترقی کی ہے اور کر رہے ہیں۔اِس لئے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔لیکن ہر عہد کا اندازہ اِس زمانے کے رسم و رواج اور طرز معاشرت سے لگانا چاہئے قدیم تمدن کو آجکل کے معیار تہذیب و شائستگی پر پرکھنا سراسر غیر منصفی ہے اور پچھلے کا زمانے کو

[1] مذکورہ بالا عبارت کو میں نے پروفیسر ونسنٹ سمتھ صاحب کی تاریخ ہند میں سے اپنے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ آخری جملہ انکی کتاب کا نچوڑ ہے اور واضح طور پر مولف کی غرض و غایت کو روشن کر دیتا ہے۔

جدید ترقیات میں شامل نہ کرنا احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے۔

برخلاف اسکے بعض ہندوستانی حضرات بالکل ہی دوسرے سرے پر پہنچ گئے ہیں وہ آجکل کی ہر تحریک اور ہر مسئلہ کا وجود قدیم زمانہ میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رادھا مکرجی، لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ تاریخ نے علی گڈہ مین اپنی ایک تقریر کے دوران مین فرمایا تھا کہ ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت (Federalism) کا نفاذ کوئی نئی چیز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ یہ طریقہ پہلے ہی یہاں موجود تھا اور لوگ اس سے آشنا ہیں۔ قدیم تاریخ ہند کے اوراق اُلٹنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ اشوک کا نظام حکومت وہی تھا جس پر آج امریکہ نازاں ہے جس شکل میں کہ وہ ہندوستان قدیم کو پیش کرتے ہیں۔ اسکو صحیح مان کر اگر ہماری ترقی کا اندازہ لگایا جائے تو ہندوستان کو یوروپ سے بھی دو قدم آگے ہونا چاہئے مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی معکوس کیوجہ اسکے جواب مین بعض کا خیال ہے کہ ہندوستانکے تنزل کا سبب وہ غیر قومی عنصر ہے جو دسویں صدی عیسوی میں درۂ خیبر کا راہ آریا ورت کی مقدس سرزمین پر وارد ہوا اور جس نے ہندوستان کی یک جہتی کا شیرازہ بکھیر دیا مسلمانوں نے یہاں کے آزاد طریقہ حکومت کو ہٹا کر استبدادیت قایم کردی، ہندوؤں کو پامال کیا۔ اور حتی الوسع ان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ اصلیت سے دور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ابتدائی دو صدیوں کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ مسلمان ہمیشہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حیثیت سے رہے ہیں۔ علاالدین خلجی کے عہد حکومت کا مطالعہ اس امر کو خوب واضع کر دیگا کہ مسلمان بادشاہوں کا مطمح نظر سراسر ہندی تھا۔ وہ مذہب کو حکومت سے جدا رکتے تھے اور ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا مسلمانوں کو ہندوستان ایک غیر عنصر سمجھنا بالکل خلاف عقل ہے۔

مورخ کو نسلی اور مذہبی تعصبات سے بالاتر ہونا چاہیے کیونکہ تاریخ کا تعلق ملک سے ہے اور اسکا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مختلف قوموں نے ملکی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں کیا کیا

انقلابات پیدا کئے۔ اس میں ہر نسل اور ہر قوم کا ایک حصہ ہے اور اسی لحاظ سے اسکی اہمیت بھی ہے۔ تیرہویں صدی کے آخر تک ہماری قومیت مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد پھر کبھی نئی نسل کا اضافہ نہیں ہوا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جبکہ انگلستان کی آخری حملہ آور قوم نارمنوں کے آنے کے بعد وہاں کی قومی یک جہتی کا قیام ہوا۔ اسوقت سے ان کی ایک متحد نسل چلی آتی ہے۔ چونکہ وہ خارجی حملوں سے بیخوف تھے اسوجہ سے انھوں نے ملک کی اندرونی خوشحالی اور فارغ البالی کی کوششیں کیں اور بیرونی فتوحات سے اپنا سکہ عالم پر بٹھا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ طبعی حیثیت اور جغرافی حالات نے بھی انگلستان کی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ برخلاف اسکے ہندوستان میں وہ یک جہتی کیوں قایم نہ رہ سکی؟ ہمارے سلف نے اپنی قوت اور ذہانت سے جس کو وہ چاہتے تھے حاصل تو کر لیا لیکن اسکو نبھا نہ سکے۔ ان کی کامیابی کا ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا لیکن جسقدر تیز رفتاری سے وہ چڑھا۔ اسی قدر سرعت کیساتھ اُتر بھی گیا۔ سیاست، فلسفہ، علم و ادب، فنون لطیفہ اور تمدن و معاشرت میں ہماری ترقی کی ایک حد تھی جہاں پہنچکر ہم میں میخ نکالنے اور باریکیاں چھانٹنے میں مصروف ہو گئے اور اصلی ترقی کو خیرباد کہدیا۔ سیاست کی باریکیاں ان بے شمار سازشوں، خانہ جنگیوں اور فرقہ بندیوں میں رونما ہوئیں جسکا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں حکمت و فلسفہ کی چھان بین کی بدولت سینکڑوں مذہبی فرقے حشرات الارض کی طرح زمین سے اُبل پڑے، ادب میں گل و بلبل کی حکایات نے شاعری کو محدود کر دیا اور نثر دربار کے خوشامدی ماحول میں پنپنے نہ پائی، صناعی، نقاشی و دیگر فنون لطیفہ میں ظاہری ریپ زینت اور خوشنمائی کے خیال نے اصلی جوہر کو نیست و نابود کر دیا۔ اجنتا کی تصاویر کا سترہویں یا اٹھارہویں صدی کے نقاشی کے نمونوں سے مقابلہ کیا جائے تو صاف فرق نظر آنے لگتا ہے۔ ایک مغل نقاش اپنی تصویر میں ذرا ذراسی جزئیات تک دکھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتا کہ تصویر کا حسن اخفا اور ادھورے پن میں ہے اور ہر چیز کو ظاہر کر دینے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسمیں شک نہیں کہ بظاہر وہ بہت مرصع اور مکمل نظر آئیگی، مگر اس میں وہ

گہرائی اور روح نہیں ہوگی جو اجنٹا کی تصاویر میں پائی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستانی جغرافیہ اور سرزمین نے ہماری عادات واطوار پر گہرا اثر ڈالا: ہم کو کاہل، خودپسند، مغرور، اور حد درجہ کا قناعت پسند بنا دیا، اور ہم میں وہ وسعت نظری پیدا نہیں کی جو اعلیٰ مثالوں سے اکتسابی۔ علامہ البیرونی نے ہندوستانیوں کو "خودرائے اور بیوقوف" لکھا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہماری تنگ نظری ہی ہمارے قومی انحطاط کا باعث ہوئی ہے۔

تاریخ کے جدید علمی تخیل کے لحاظ سے ہم کو سب سے زیادہ توجہ دور حاضرہ پر دینی چاہیئے تاکہ مستقبل کو بہتر بنا سکیں۔ لیکن موجودہ سے واقفیت کے لئے گذشتہ کا علم ضروری ہے۔ اس کیلئے یہ لازمی نہیں کہ ہم قدیم اور وسطانی عہد کے ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ پر غور کریں۔ یہ کام ایک دوسرے گروہ کا ہے جس کا تعلق "اجتہاد و تحقیق" سے ہے۔

قومی تاریخ کے لئے اسکی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ وہ کون سی کمزوریاں ہیں جو ہماری قومی پستی وانحطاط کے باعث اور ہماری ترقی میں سدراہ ہوئی ہیں۔ ترقی کے زینے کی پہلی سیڑھی اپنی جہالت کا علم ہے۔ صحیح حالت سے مطلع کر دینا مورخ کا کام ہے اور ترقی کی راہیں سوچنا اور نکالنا سیاس اور مدبر کا۔ موخرالذکر سے ہماری یہاں بحث نہیں ہے اسلئے اسکو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے مطلع پر جو تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، جا بجا ہندو مسلم نفاق سننے میں آتے ہیں۔ قومی روح فنا ہو چکی ہے، اس کی وجہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں صرف تاریخی غلط بیانی ہے جس نے بچپن سے ہمارے دماغوں میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ ہندو مسلمان ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں اور اسلامی دور حکومت میں ہندوؤں کو سخت تکالیف پہنچائی گئیں ہیں۔ یہ دعویٰ بھی اسقدر بے بنیاد ہے جس قدر کہ یہ کہنا کہ مسلمان ہندوستان میں ایک غیر قومی عنصر ہیں یا لغو ہے۔ مورخین کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر کوششیں تاریخ ہند میں ایک قومی ماحول پیدا کر دینے میں صرف کریں جو ہمارے

جبتک کہ دوسرے بہی ہمارے ساتہ ترقی نہ کرین صرف یہی کافی نہین ہے کہ ہم تنہا آگے بڑہے چلے جائین ۔ ہزارون جو پیچہے رہ گئے ہین ان لوگون کو جو آگے بڑہنا چاہتے ہین بڑہنے نہ دین گے لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اُنکی مدد کرین ورنہ ترقی ناممکن ہو جائیگی۔

مہمان۔ یہ خیالات پاکیزہ ہین اور قابل تعریف ہین ، مین چاہتا ہون کہ ہر نوجوان مین یہی خیالات ہون آپ لوگ صحیح راستہ پر ہین مگر ذرا ہوشیار رہئے گا اس راہ مین بیشمار خطرے بہی ہین ایسا نہ ہو کہ آپ نمائشی شہرت کی طرف جہک پڑین ، یہ یاد رہے کہ جس گہڑی آپ اپنی محنت کی داد چاہنے لگیں گے اُسیوقت سے آپ کے ایثار کی خوبی مین فرق آجائیگا۔ ماسوا اسکے آپ کو اہی اور بلند ہونا ہے۔ اب تو آپ فرائض کے احساس سے کام کر رہے ہین ، لیکن سنجیدگی کیساتہ اس راستہ پر لگے رہئے تو یہی کام آپکے لئے موجب راحت ہو جائیگا۔ یہ نہ خیال کیجئے کہ مجہے آپکی راستگی مین کلام ہے مگر مین تو صرف ایک خطرہ سے آپ لوگون کو آگاہ کرنا چاہتا ہون جس مین آپسے پہلے اکثر لوگ مبتلا ہو چکے ہین۔

اُستاد نے تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور مہمان رخصت ہوا۔ کیدار اُسکو اپنے کمرہ پر لایا مگر اُس نے آرام نہ کیا اور اپنی چیزون کو جمع کرنا شروع کر دیا اور انکی پوٹلی بنالی۔ اور کیدار کیطرف متوجہ ہو کر کہنے لگا" بابا مین نے تم کو بہت تکلیف دی۔ آپکی رحمت سے میری مدتکی دلی تمنا بر آئی۔ رام تمہارا بہلا کرے اور تم اپنی دلی مرادین پاؤ"

یہ الفاظ کہکر وہ باہر نکل گیا اور قبل اسکے کہ کیدار کچہ کہہ سکے وہ رات کی تاریکی مین غائب ہوگیا کیدار سوچ مین پڑگیا اُسکے لئے مہمان ایک معمہ تہا۔ اُسکی سمجہ مین نہ آیا کہ وہ اُسکو کیا کہے جب بیل کی سیٹی ہوئی اور وہ اپنے خیالات سے چونکا تو اس معمہ کے حل سے اُتنا ہی دور تہا جتنا کہ پہلے تہا"

مترجمہ۔ سید حسن زاہد جعفری
از ڈہاکہ یونیورسٹی جرنل

دولت بنی اُمیہ پر ایک نظر

(محمد یوسف آعظمی ندوی)

دولت بنی اُمیہ اسلام میں وہ پہلی حکومت ہے جس نے خلافت کے بجائے سلطنت کا لقب حاصل کیا اُس کے بانیوں نے اگرچہ اپنی ناجایز حرکت اور سنت راشدہ کو ترک کر کے بنی اُمیہ کو بہت بدنام کر دیا۔ لیکن حکومت کی ترقی اور وسعت جہاں تک تعلق ہے اُن کے سیاسی کارنامے کوچہ و بازار کے افسانے سے کچھ کم مشہور نہیں اُنھوں نے اپنی ہیبت وجلال کے آگے دنیا کے زور مند اور فاتح اقوام کو سرنگوں بھی کیا، اُنھوں نے اندلس و غرناطہ کی وادیوں میں فتح و نصرت کا علم بھی بلند کیا، اُنھوں نے سطح آب پر رومی بیڑوں کو شکست فاش بھی دیا اور قیصر و کسریٰ عظیم الشان حکومت کو چشم زدن میں پاش پاش کر دیا، امیر معاویہ اور عبد الملک اس حکومت کے ہیرو خیال کئے جاتے ہیں لیکن ملک گیری کے نقطۂ نظر سے ولید بن عبد الملک کا عہد حکومت مخصوص طور پر قابل ذکر ہے جس میں مغرب و مشرق کے بہت سے ممالک فتح کئے گئے اور نظم ملت کی وہ تمام رسیاں جو ٹوٹ کر قریب فنا کے تھیں اُن کو مضبوط و استوار کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں مگر جس ذات نے ولید کی تمناؤں کو بار آور نہ ہونے دیا۔ وہ سلیمان کی کینہ پرور شخصیت تھی، قتیبہ اور وکیع کا اگرچہ اس عالم فانی پر وجود باقی نہیں رہا مگر خراسان اور بخارا کے لوگوں کو اُن کے افسانے اب بھی یاد ہونگے، یہ تاریخی واقعات ہیں جن کو فراموش کر دینا کسی طرح جائز نہیں، تمدنی اور علمی ترقی سے بھی اموی زمانہ خالی نہیں رہا ہے، اُنکی کوششوں سے اسلامی علوم فقہ حدیث تفسیر و ادب سیر و تواریخ کی سیکڑوں کتابیں تصنیف کی گئیں جو آج بھی اپنی نوعیت اور انتخاب کے لحاظ سے سرمایہ ناز ہیں، فن حدیث کا جو تحریری سرمایہ اُس وقت یمن کوفہ اور مدینہ میں متفرق طور پر موجود تھا۔ عمر بن عبد العزیز نے نہایت تلاش و محنت کے بعد

اُن اجزائے پریشان کو ایک مجموعہ کی صورت میں جمع کردیا، عبدالملک خود ایک زبردست اور لائق عالم تھا چنانچہ امام شعبی کہتے ہیں کہ میں نے اُس سے بڑھکر کسی کو اپنا نظیر نہیں پایا وہ عربیت اور ایام جاہلیت کے اشعار کا بڑا ماہر تھا، اُس کی استدعا پر علامہ ابن جبیر نے کلام پاک کی تفسیر لکھی جو اپنے فن کی دنیائے اسلام میں پہلی کتاب خیال کی جاتی ہے، تاریخ ایران کا عربی ترجمہ ہوا، اور علم طب و کیمیا کے فن میں خالد بن یزید نے اکثر رسالے تصنیف کئے[1] غرضکہ اُس وقت کی علمی سوسائٹی بہت کامیاب رہی اور اگرچہ یہ امر تسلیم ہے کہ امرائے بنی اُمیہ نے عوام کی تربیت کا کچھ انتظام نہ کیا مگر تابعی علماء میں بہت سے باکمال ارباب ایسے بھی تھے جنہوں نے محض خالصتہً للہ اپنے گھر کے تاریک حجروں میں قرآن و حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ امام شعبی جیسے جلیل القدر تابعی کوفہ میں امام تھے، علقمہ و ابراہیم نخعی اُنہیں کے نقش قدم پر چلتے رہے، سعید بن مسیّب مدینہ کے فقیہہ اعظم تھے جنکی بے مثل فقاہت اور جلالت شان کا ولید کو اعتراف کرنا پڑا اور کہا کہ سچ ہے "سعید بزرگان سلف کی یادگار ہیں" ان چند مختصر باتوں کو معلوم کرنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خلفائے بنی اُمیہ کے گنجینہ معائب میں چند ایسے انمول موتی بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی چمک میں کسی پارہ الماس سے کم نہیں، ان محاسن اور خصائص سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُموی دور میں مادی ترقی کے ساتھ علمی و تمدنی ترقی بھی شروع ہوگئی بکثرت علماء پیدا ہوئے اور علمی مشاغل بھی رہے، لیکن بااینہمہ سعادت مندی چند اسباب ایسے پیدا ہوگئے جس سے یہ سارا کام رُک گیا اور علم و فضل کی جگہ کذب و جہل اور ترقی کے بجائے انحطاط کا ظہور ہوا، اس جگہ ہمارا مقصد زیادہ تر انہیں اسباب تنزل سے بحث کرنا ہے۔ بنی امیہ کے حق میں جو شئے زیادہ مہلک و تباہ کن ثابت ہوئی اور وہ مسلمانوں میں مختلف الخیال جماعتوں کا پیدا ہونا تھا جن میں سے ہر گروہ اپنے کو مستحق خلافت سمجھتا تھا۔ بنو عباس کا یہ خیال تھا کہ حضرت عباس رسول کریم کے قرابت مند اور چچا تھے اس لئے جناب رسالتمآب کے بعد یہ مرتبہ اُنہیں کو ملنا چاہیئے یہی وہ خیال تھا جس نے

[1] دیکھو فہرست لابن ندیم صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۴، ایضاً اخبار الحکماء ۳۷۹

ان کو بنی امیہ کی بیخ کنی اور استیصال پر آمادہ کر دیا، بنو فاطمہ کا گمان تھا کہ خلافت آلِ علی کا حصہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ اموی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے رہے چنانچہ عراق میں امام زید اور محمد بن حنفیہ کے وقت میں یہ فتنہ انتہائے ترقی پر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بنی امیہ نے اس معاملہ میں بہت زیادتی کی اور اسلام میں اُن کی ذات سے اِس بدعت کا آغاز ہوا، لیکن بہت ممکن تھا کہ اگر امت میں اتنا اختلاف نہ ہوتا تو وہ اپنے کو زیادہ عرصہ تک اپنی اصلی حالت پر قائم رکھ سکتے تھے، اس لئے اب ضرورت ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق ایک تفصیل کے ذریعہ ایک قاعدہ اور اصول کلی معلوم کیا جائے جس سے سلاطین امیہ کی لغزش اور اُن کی سیاسی غلطیوں کے بیان کرنے میں یک گونہ آسانی ہو، یہ مسئلہ ابتدائے اسلام ہی سے مختلف فیہ رہا ہے، علماء اور محققین نے اپنے عقائد اور مذاق سلیم کے مطابق اس بارے میں نہایت دقیقہ سنجی اور کدوکاوش سے کام لیا ہے، قرن صحابہ میں ایک گروہ کا خیال تھا کہ منصب خلافت خاندان قریش کے لئے مخصوص ہے، دوسری جماعت سمجھتی تھی کہ اسلام کی حکومت ایک جمہوری سلطنت ہے جن کا پریسیڈنٹ عوام کے صلاح و مشوروں سے معاملات کو طے کریگا لیکن بدقسمتی سے آخر الذکر خیال کے لوگ دور صحابہ کے بعد دنیا سے مفقود ہوتے گئے اور رسول اللہ کی وہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی جس میں آغاز فتنہ اور اختتام خلافت کا اشارہ کیا گیا تھا۔ اس مسئلہ کے متعلق دو متضاد حدیثیں ہیں۔

الائمۃ من قریشٍ ۔ خلیفہ قریش سے ہوگا۔

"دوسری حدیث یہ ہے قال النبی صلعم اِن امر علیکم عبدٌ مجدّع اسودُ یقودکم بکتاب اللہ تعالیٰ فاسمعوا لہٗ واطیعوا۔"

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر میں تم پر کسی حبشی نکٹے غلام کو بھی حکمراں بنادوں تو تم اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کرو"

---

[1] مسلم شریف جلد اول صفحہ ۴۱۹۔

بادی النظر میں جہاں تک الفاظ کا ظاہری تعلق ہے حدیث اول سے نظام شخصی کی تائید ہوتی ہے۔ حدیث دوم اُس کے بالکل مخالف ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ حدیث بطور ایک پیشین گوئی کے ہے۔ جس کے بارے میں رسالت مآب صلعم نے سیکڑوں خواب دیکھے تھے،

امام بخاری نے ابوھریرہ سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال صلعم بین انا نائمٌ رائیتی علی قلیبٍ علیہا دلوٌ فنزعت منہا ماشاء اللہ ثم اخذھا ابن ابی قحافۃ (ابوبکر) فنزع منہا ذنوبا اوذنوبین وفی نزعہٖ ضعفٌ واللہُ یغفرلہٗ ثم استحالت غربًا فاخذھا ابن الخطاب فلم ار عبقریًا من الناس ینزع نزع عمر حتی ضرب الناس بعطن (بخاری)

رسول اللہ صلعم نے فرمایا ایک روز جبکہ میں سو رہا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک کنوئیں پر کھڑا ہوں جہاں ایک ڈول رکھا ہوا ہے میں نے اُس ڈول سے جس قدر خدا کو منظور تھا پانی نکالا، میرے بعد ابوبکر نے اُسے لے لیا اور ایک یا دو ڈول پانی نکالا مگر اُن کے نکالنے میں کچھ کمزوری تھی، خدا اُنھیں معاف کرے پھر وہ ڈول بڑا بن گیا اور عمر ابن خطاب نے اُسے لیکر پانی نکالنا شروع کیا، میں نے کسی زور آور اور قوی انسان کو اس طرح پانی نکالتے ہوئے نہیں دیکھا تھا حتیٰ کہ لوگ خود آسودہ ہو گئے اور اپنے اونٹوں کو بھی سیراب کر لیا۔

اس حدیث کو امام ترمذی اور ابن مردویہ نے بھی ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ صحیحین، دارمی اور ابوداؤد میں ابوھریرہ سے ایک حدیث مروی ہے۔

عن ابن عباس کان ابوھریرۃ یحدّث ان رجلًا اتی النبی صلعم فقال انی رائیت اللیلۃ ظُلّۃً ینطف منہا السمن والعسل فاری الناس یتکفّفون بایدیھم

ابوہریرہ کہتے ہیں آنحضرت کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا آج میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک ابر کا ٹکڑا ہے جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے لوگ ہاتھوں ہاتھ کمی وبیشی کے ساتھ

والمستکثر والمستقل واری سبباً واصلاً
من السماء الی الارض فاراک یارسول اللہ
اخذت بہ فعلوت ثم اخذ بہ رجل آخر
فعلا بہ ثم اخذ بہ رجل آخر فعلا بہ ثم اخذ
رجل آخر فانقطع ثم وصل فعلا بہ فقال
ابوبکر بابی انت وامی لتدعنی فاعبرھا
فقال اعبرھا فقال اما الظلۃ فالاسلام
واما ینطف من والعسل فھو القرآن
لینہ وحلاوتہ واما المستکثر والمستقل
فھو المستکثر من القرآن والمستقل منہ
واما السبب الواصل من السماء فی الارض
فھو الحق الذی انت الیہ تاخذ بہ فیعلیک اللہ
ثم یاخذ بہ بعدک رجل فیعلو بہ ثم یاخذ
بہ رجل فیعلو بہ ثم یاخذ بہ رجل فینقطع
ثم یوصل لہ فیعلو بہ ای رسول اللہ لتحدثنی
شئی اصبت اخطات فقال النبی صلعم
اصبت بعضاً واخطات بعضاً فقال اقسمت
یارسول اللہ لتحدثنی ما الذی اخطات
فقال النبی صلعم لاتقسم، (دارمی
وصحیحین)

اُسے لے رہے ہیں اور کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان سے
زمین تک ایک رسی لٹک رہی ہی پھر میں نے یا
رسول اللہ آپکو دیکھا کہ آپ اُسے پکڑ کر آسمان پر
چڑھ گئے ہیں پھر ایک اور شخص اُسکی مدد سے آسمان
پر چڑھ گیا بعد اسکے ایک دوسرے نے رسی پکڑی
اور وہ بھی چڑھ گیا اس کے بعد ایک تیسرے
شخص نے رسی پکڑی مگر وہ ٹوٹ گئی اور وہ بھی
بمشکل چڑھ گیا ابوبکر نے کہا اگر اجازت ہو تو اسکی
تعبیر تبلاؤں فرمایا کہو انہوں نے کہا ابر سے اسلام
اور روغن و شہد سے قرآن کی نرمی و شیرینی مراد
ہی اور زیادہ اور کم لینے والا وہ آدمی ہی جو قرآن کا
مفہوم زیادتی اور کمی کے ساتھ سمجھتا ہی اور لٹکتی
ہوئی رسی کا مقصد حقانیت اور دینِ اسلام کی
صداقت ہی جو آپ در رسالتمآب کا خاص شیوہ ہی
پھر آپ کی وفات کے بعد ایک مرد صالح اُسی
رسی کو پکڑے گا اور بلند مرتبہ ہوگا پھر دوسرے
شخص کی باری آئے گی اور وہ بھی صاحب
عزت ہوگا حتی کہ ایک تیسرا اُٹھے گا وہ رسی ٹوٹ
جائیگی مگر پھر متصل ہو جانیکے بعد وہ بھی اُسی مرتبہ
تک پہونچ جائیگا، ابوبکر نے کہا یا رسول اللہ فرمائیے
غلط کہا یا سچ، فرمایا کچھ غلط کچھ صحیح، اسپر ابوبکر رضہ نے کہا میں قسم دلاکر کہتا ہوں آپ اس کی تصحیح فرما دیں

حضورِ اقدس نے کہا قسم مت دلاؤ۔

آنحضرت کا ابوبکر سے یہ فرمانا تم نے کچھ غلط کہا کچھ صحیح علماء نے اسکی بہت کچھ توجیہیں کی ہیں۔ لیکن اس بارے میں اپنی ذاتی رائے پیش کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اس موقع پر علمائے اسلام اور محققین ملت میں سے ایک ایسے فردِ کامل کا فیصلہ منظور کیا جائے جو نہ صرف محدث بلکہ متکلم بھی ہے وہ علوم ظاہری کا ماہر ہی نہیں بلکہ اسرار باطن اور علوم قدسیہ کا ایک عارف باکمال بھی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

"علما در وجہ خطا سخنہا گفتہ اند لیکن آنچہ در ذہن فقیر مقرر شدہ آنست کہ مراد از خطا ترک تسمیۂ این خلفاء است بوجہے از استعارہ بلفظ خطا تعبیر کردہ شدہ است [۱]

علما نے اس خطا کی توجیہ میں بہت کچھ کہا ہے مگر جو کچھ اس فقیر کے ذہن میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ غلطی سے مراد اُن خلفاء کے ناموں کا نہ ظاہر کرنا ہے جسکو ایک طرح کے استعارہ میں لفظ "غلطی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو بذریعہ الہام اور رویائے صادقہ کے یہ پہلے سے معلوم تھا کہ میرے بعد ابوبکر و عمر وغیرہ خلیفہ ہونگے اور بارگاہ الٰہی میں اس کا فیصلہ ہو چکا ہے، مگر صراحتہً اس کے بارے میں کچھ کہنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے، "ڈول والی حدیث میں دیکھیے شیخین کی خلافت اور آنحضرت کے بعد اُن کی جانشینی کے مسئلہ کو کس لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے، اسی طرح حدیث دوم سے بھی شیخین کے علاوہ حضرت عثمان کی امارت پر استدلال کیا گیا ہے اور اُن کے زمانہ میں جو فتنۂ محشر بپا ہونے والا تھا اس کو رسی کے ٹوٹ جانے سے تعبیر کیا ہے، رویا کے اس باب میں جتنی حدیثیں مروی ہیں جہاں تک تحقیق اور تتبع سے کام لیا جاتا ہے میرے خیال میں وہ سب درجۂ مستفیض کو پہونچی ہوئی ہیں۔ مگر ان میں بار بار خلفائے ثلاثہ ہی کا نام آیا ہے اس کی وجہ جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے غالباً یہ ہے کہ

[۱] ازالۃ الخفاء صفحہ ۲۱۔

حضرت مرتضیٰ کا زمانہ چونکہ فتنوں اور باہمی مخالفت کا گھر تھا اِس لئے اُن حدیثوں میں جن میں کامل صلح و امن کا تذکرہ ہے اُن کا نام نہیں آیا ہے۔

علامہ محب طبری نے ابوہریرہ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلعم استلف من یھودی شیئاً الی الحول فقال ارئیت ان جئت ولم اجدک فالی من اذھب فقال الی ابی بکر فقال فان لم اجدہٗ فقال الی عمر قال ان لم اجدہٗ قال ان استطعت ان تموت فاذا مات عمر فمت[1]

آنحضرت نے کسی یہودی سے ایک سال کے وعدہ پر کچھ قرضہ لیا، اس یہودی نے کہا اگر آپ زندہ نہ رہے تو پھر کس کے پاس جاؤنگا، فرمایا ابوبکر کے پاس جانا کہا اگر وہ بھی نہ ملے، فرمایا عمر سے لے لینا، کہا اُن سے بھی نہ مل سکا اس پر حضور نے فرمایا جب عمر انتقال کر جائیں تو اگر تم سے ہوسکے تو تم بھی مرجانا

طبری نے اس حدیث کو ابراھیم بن سعد سے روایت کیا ہے۔

اس بارے میں اگرچہ اکثر حدیثیں صحاح کی کتابوں میں موجود ہیں جن سے اشارۃً اور کنایۃً ہر طریقہ سے مذکورۂ بالا مسائل کی تائید ہوتی ہے مگر یہ سلسلہ کچھ اس قدر طویل ہے کہ جس سے خواہ مخواہ ہم ناظرین کو تکلیف دینا نہیں چاہتے، اور بخوف طوالت اس آخری حدیث پر اکتفا کرتے ہیں!

عن ابن عباس قال رسول اللہ صلعم لحفصۃ ابوک و ابو عائشۃ اولیاء الناس بعدی فایاک تخبری بہ احداً،

رسالت مآب صلعم نے حضرت حفصہ سے فرمایا تمھارے اور عائشہ کے باپ میرے بعد لوگوں کے والی ہونگے مگر خبردار کسی سے کہنا مت

اس حدیث کی ملا واحدی نے تخریج کی ہے جس کے بعض طریقے اسناد کتاب النضرہ میں موجود ہیں اور وہ صحیح ہیں، یہ حدیث اپنے مفہوم کے لحاظ سے جس قدر واضح ہے وہ ظاہر ہی

[1] الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ صفحہ ۳۵ مطبوعہ قسطنطنیہ

مگر اس کو آپ ہر کہ و مہ کے سامنے بیان کرنا معیوب سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے بعد اپنی غلطیوں کی آنحضرت سے اصلاح چاہی تو حضور نے خاموشی سے کام لیا کیونکہ اُس وقت دربارِ نبوی میں عوام کا ایک مجمع تھا جو ان باتوں کو سن کر کبھی ضبط و استقلال کے ساتھ قایم نہیں رکھ سکتے۔ اب ان حدیثوں کو سامنے رکھکر آپ "الائمۃ من قریش" کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں، علاوہ اسکے بہت سے قرائن اور دیگر تاریخی شواہد موجود ہیں جن سے ہمارے مقصد اور زیر بحث مسلک پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے مثلاً آپ کے مرض الموت کی حالت میں حضرت ابوبکر کا لوگوں کی امامت کرانا اور آنحضرت کی جانب سے نائب ہوکر حج کو تشریف لے جانا، یہ سب ایسے امور ہیں جن سے ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے لئے یہ تمامتر بارگراں امارت کے اُٹھانے کا دیباچہ تھا، چنانچہ جس وقت انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد بن عبادہ رئیس خزرج کو خلیفہ منتخب کرنیکے لئے جمع ہوئے حضرت ابوبکر بھی وہاں پہونچ گئے اور کہا الائمۃ من قریش یہ حدیث بطور ایک پیشین گوئی کے ہے اور یہ کوئی حتمی حکم نہیں کہ خلیفہ کا انتخاب ہمیشہ قریش سے ہوا کرے؛ آنحضرت کی وفات کے بعد خلفاء کا انتخاب قریش ہی سے کیوں ہوا، دراصل یہ ایک ضمنی بحث ہے اہل عرب باوجود غیر متمدن ہونیکے غیرت مند تھے۔ اور اگرچہ وہ اپنے خصائل اور طبیعت سے مجبور تھے مگر کسی غیر قوم کی اطاعت اُن کے لئے قطعاً ناجائز تھی، یہی وجہ ہے غسانیوں نے جب کبھی اپنی فوجی اور جنگی قوت سے انکو محکوم بنانا چاہا تو انہیں ہمیشہ ناکامیابی رہی البتہ اہلِ عرب کے دلوں میں خانۂ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کی یادگار کی عظمت و محبت تھی، وہ سال کے تمام ایام میں لڑتے تھے مگر حج کے متبرک مہینوں میں اُن کے لئے لڑنا حرام تھا۔

قریش چونکہ خانہ کعبہ کے خدمت گزار اور کلید بردار تھے اس لئے عرب ان کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور اُن کی سیادت اپنے لئے باعث فخر خیال کرتے تھے، یہی اسباب تھے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی زمانہ میں خلفاء کا انتخاب قریش ہی سے کیا

تاکہ وہ اُن کی اطاعت سے متنفر نہ ہوں اس کے علاوہ اگر انصار میں سے کسی فریق کو اسکا حق دیا جاتا تو اس سے یقیناً ایام جاہلیت کی وہ معیوب صفت جسے " عصبیت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں پھر عود کر آتی اور مذہب اسلام جس شئے کی تردید کے لئے آیا تھا اُس صورت میں اُس کی تائید ہو جاتی بہر کیف اسلام نے جو جمہوری نظام قایم کیا وہ ہمیشہ ایک شورہ کا محتاج ہے اور خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اُمت کی ایک بہت بڑی جماعت اسکی امامت پر دل سے متفق ہو اسی اصول کے مطابق جب خلفائے بنی امیہ کی سیاسی کارنامونکا جائزہ لیا جاتا ہے تو ہمیں اُنکی سب سے بڑی غلطی کا اعتراف اُس وقت کرنا پڑتا ہے جب کہ آستانہ سلطنت کے منحوس مقام سے اُنکا پہلا قدم گذرا، یہ واقعہ ہے کہ امیر معاویہ نے شامی افواج کی اعانت سے اہل حجاز اور عراق سے بیعت حاصل کی تھی، لوگ اُن سے خوش نہ تھے، دلوں میں انتہا کا بعد تھا یہی وجہ تھی کہ اگرچہ لوگ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے مگر امت کے کثیر التعداد افراد کی تلواریں اُنکے خلوت نیام سے باہر تھیں خارجی اور بنو ہاشم ہمیشہ اسی کوشش میں لگے رہے کہ جس طرح ممکن ہو خلفائے بنی امیہ کی شوکت اور ریاست کا خاتمہ کر دیا جائے مگر اُنکے سر پر غرور میں جو سودا تھا وہ بدستور باقی رہا اور خیالات میں جو تموج و بلند پروازیاں تھیں وہ اب بھی قایم رہیں، ادھر عام رعایا کے دلوں میں جو جذبات موجزن تھے وہ اُس جدید حکومت کے حق میں سخت مضر تھے، اہل حجاز پر شیخین کا اثر غالب تھا چنانچہ جس وقت امیر معاویہ یزید کیواسطے لوگوں سے بیعت کے لئے مدینہ تشریف لے گئے صحابہ کی ایک بڑی جماعت وہاں موجود تھی انھوں نے بہتیرا سمجھایا مگر قلم قدرت نے صحیفہ تقدیر پر جو سیاہ نقوش بنایا تھا اُسکا محو ہونا قطعاً ناممکن تھا، اب تک اہل مدینہ سیاسی حیثیت سے اپنے یقین اور ارادہ میں کچھ زیادہ پختہ نہ تھے مگر اس واقعہ کے بعد اُنکی آتش غضب اور بھڑک اُٹھی۔ اس دلی منافرت اور باہمی تنغض کا سب سے بڑا کرشمہ اُسی وقت نظر آتا ہے جب کہ عبداللہ ابن زبیر کے زمانہ میں دولت اموی کا شیرازہ قریب قریب ہمیشہ کے لئے منقطع ہو چکا تھا، مروان ابن حکم

کا اب کوئی دوست نہ رہا، شام کے عمائدین اور ارباب حل وعقد جو کبھی امیر معاویہؓ کے قوتِ بازو تھے بنی امیہ کے مخالف بن گئے، اہل حجاز اور عراق نے ابن زبیر کی سیادت تسلیم کر لی مگر حسن اتفاق سے والی فلسطین کی امداد اور چارہ جوئی نے بستر مرگ پر لیٹے ہوئے مریض کی جان میں جان ڈال دی، دولت بنی امیہ کے لئے اس سے زیادہ نازک موقعہ اور کیا ہو سکتا ہے مگر اس کی علت بجز اس کے اور کیا قرار دی جا سکتی ہے عام مصالح اور مشترکہ حقوق پر شخص معاذ کو ترجیح دی گئی اور خلافت کو سلطنت سے بدلکر امت کے دلوں کو اپنی طرف سے بیزار بنا دیا گیا ممکن ہے کہ دنیا کی دیگر قومیں اس طریقۂ انتخاب پر اگرچہ وہ دل سے متفق نہوں مگر شاہی دبدبہ اور پولیٹیکل قوت سے خائف ہو کر سکوت کر جائیں مگر مسلمان جیسی زندہ دل قوم سے اس کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی اور عبدالملک کے عہد حکومت میں عالم اسلامی اپنے گوناگوں انقلابات اور آئے دن کے جھگڑوں کے باعث محشرستان کا ایک نمونہ بنا ہوا تھا، خوارج کے فتنوں سے عراق عرب میں شاہی اقتدار خطرہ میں تھا اور شیعان علی اپنے مذہب کی اشاعت اور موجودہ طرز حکومت کی مخالفت میں نہایت سرگرم تھے۔ چنانچہ عبدالملک کا اکیس سالہ دور حکومت محض اندرونی ہنگاموں کے فرو کرنے میں صرف ہو گیا، امت چونکہ ہمیشہ سے بنی امیہ سے مخالف تھی اس لئے اُن کے عزیمت اور ارادوں میں ضعف و نقاہت کا کہیں گذر نہ تھا اور اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے اُنکی بڑھتی ہوئی طاقت کو توڑ کر کمزور کر دیا گیا مگر اُن کے دلوں میں بغض و عداوت کے وہی جذبات موجزن تھے جنکا فنا کر دینا عبدالملک کے لیے ناممکن تھا۔ نظام سیاست اور نسق حکومت خواہ کتنا ہی اپنی جگہ پر مستقل اور مضبوط کیوں نہو مگر رغبت پبلک کی طرف تاوقتیکہ اس کی تائید نہ ہو محض بے کار اور بے سود ہے۔ خلفائے بنی اُمیہ میں بڑی بڑی تجربہ کار اور سیاست داں ہستیاں پیدا ہوتی رہیں جنھوں نے عراق عرب میں مصلحتاً نہایت سخت مزاج اور تندخو حکام مقرر ہوئے مگر اُن کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اُنھوں نے مخالفین کی استمالت اور اُنکی دلجوئی کا کچھ بھی خیال نہیں کیا اگر اُن کے خلفاء امیر معاویہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش

کرتے اور بنو ہاشم اور شیعان علی کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ سرداری اُمت کا یہ شرف اُن کے خاندان میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہجاتا اور ہلاکت کے جو آثار کسی ریاست کے حق میں برباد کن ثابت ہو سکتے ہیں اُن سے اُن کی شان امارت ہمیشہ مستغنی و بے نیاز رہتی، لیکن افسوس ہے کہ ان کے متبعین بجائے سیاسی امور میں منہمک ہونے کے زیادہ آپس کی خانہ جنگیوں اور جانشینی کے مسئلہ میں اُلجھے رہے جس سے اُنکا سارا وقت اس کام میں بسر ہو گیا، دنیا میں اسکی اکثر مثالیں پائی جاتی ہیں کہ سخت سے سخت حریف اور مد مقابل کو بھی فیاض دریادلی اور خوش اخلاقی کے روبرو جھک جانا پڑا ہے، معاندین کو خاموش کر دینا اُن کے لئے بہت آسان تھا مگر اس لئے سلیمان اور هشام بن عبد الملک کے بجائے، امیر معاویہ اور عمر بن عبد العزیز کی ضرورت تھی امیر معاویہ کی طرف جو تاریخی واقعات منسوب ہیں ان میں پولٹیکل حیثیت سے جو زیادہ قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ جس کو علامہ فضل ابن طاہر بغدادی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے جنگ صفین میں حضرت علی کی جانب بہت سی ایسی عورتیں بھی موجود تھیں جو رجزیہ اشعار پڑھکر عوام کو برانگیختہ کیا کرتی تھیں چنانچہ جسوقت عراق و حجاز کی خلافت امام حسن نے امیر معاویہ کو سونپ دی، امیر معاویہ کے سامنے دمشق میں وہ تمام عراقی حاضر کئے گئے جنھوں نے حضرت علی کی موافقت میں بنی امیہ سے جنگ کی تھی، انہیں میں بکارہ ہلالی ایک سن رسیدہ ضعیف عورت بھی تھی جس کی مردانہ ہمتوں نے اُسے طبقۂ نسواں سے بالاتر صنف میں شامل کر دیا تھا دربار میں وہ نہایت بیباکی کے ساتھ آکر خلیفہ کے سامنے بیٹھ گئی، معاویہ کے پاس اُس وقت عمر ابن العاص فاتح مصر بھی تشریف فرما تھا، اُنھوں نے کہا معاویہ تم جانتے ہو یہ کون عورت ہے، یہ وہی شاعرہ ہے جس نے آپ کی شان میں یہ گستاخی کی تھی،

(۱) اترى ابن هند للخلافة مالكا	هيهات ذاك وما اراد بعيدٌ
(۲) منتك نفسك فى الخلاء ضلالة	غراك عمرٌ للشقاء وسعيدٌ

(۱) ای ابن ہند (معاویہ) تم خلیفہ ہونا چاہتے ہو؟ افسوس یہ تمھاری خام خیالیاں ہیں،

(۲) نفس نے تجھے آرزو دلا کر گمراہ کر دیا اور عمرو (عمرابن العاص) اور سعید نے تجھے بدبختی پر آمادہ کر دیا ہے۔

سعید وہاں موجود تھا اس نے یہ سن کر کہا حضور اس نے تو اس سے بھی سخت کہا ہے۔

فوکنتُ آملُ ان اموتَ ولا اریٰ ۔۔۔ فوقَ المنابرِ من امیۃ خاطباً،

میری یہ تمنا تھی کہ میں مرجاؤں اور سر منبر اموی خطیب کو تقریر کرتے ہوئے نہ دیکھوں،

فاللّٰہُ اخّرمدتی فتطاولت ۔۔۔ حتیٰ رئیت من الزمان عجائباً

لیکن (کیا کروں) خدا نے میری عمر دراز کی ۔۔۔ اور مجھے زمانہ کی عجیب غریب نیرنگیاں دیکھنی پڑیں

فی کل یوم لا یزال خطیبہم ۔۔۔ وسطَ الجموعِ لِآلِ احمد ائتیاً،[۱]

(چنانچہ اب حالت یہ ہے) کہ اموی خطیب روزانہ مجمع میں کھڑے ہو کر آلِ رسول کو برا بھلا کہتے ہیں،

بکارہ نے نہایت سچائی اور جرأت کے ساتھ اسکا اعتراف کیا اور ایک آہ سرد بھر کر کہا ہائے امیر المومنین (علی) کے بعد دنیا اب رہنے کی جگہ نہ رہی، ظاہر ہے کہ وہ دشمن جو عملی اور لسانی دونوں طریقوں سے مخالفت کرتا اور اپنے جرم کا اعتراف بھی کرتا ہو قابو میں آجانے کے بعد کوئی شخص بغیر انتقام لئے ہوئے اُس کو رہا نہیں کر سکتا، مگر سچ پوچھو تو امیر معاویہ کی دور اندیشی اور مصلحت دانی کا اس سے بڑھ کر اور کوئی موقع امتحان نہ تھا، عمر ابن العاص اور سعید دونوں بار بار اُسے ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر معاویہ ٹس سے مس نہیں ہوتے چنانچہ اُسکا قصور معاف کر دیا جاتا ہے اور بکارہ ہاتھوں میں اشرفی کا توڑا لئے ہوئے دربار سے رخصت ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ مخالفین کی دلجوئی کا جو طریقہ امیر معاویہ کو معلوم تھا اُسکو عمر ابن عبدالعزیز جیسا صلح جو اور امن پسند حکمراں بھی نہ سمجھ سکا بنی اُمیہ کے عراق و حجاز میں جو دشمن تھے امیر معاویہ نے انھیں گراں قدر عطیہ دیکر خوش کر دیا اور اپنی عام فیاضی میں سخاوت اور عفو پسندی کے ذریعہ قریب قریب تمام امت اسلامیہ کو اپنا ہمنوا بنالیا معاویہ کے بعد بنی اُمیہ میں بہتیرے صاحبِ فہم اور روشن ضمیر ارباب پیدا ہوتے رہے مگر انھوں نے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا۔

[۱] بلاغات النساء صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰،

البتہ عمر بن عبدالعزیز میں اسکی صلاحیت تھی مگر اُنکی خشک زاہدانہ طبیعت فیاض وسخاوت کی خوگر نہ تھی، پھر بھی انکار ممکن نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے عہدِ مبارک سے کچھ کم نہ تھا بالخصوص خوارج کے شر وفساد کے دفع کرنے میں وہ بہت کچھ کامیاب ثابت ہوئے، دنیا میں آج تک جتنی شخصی وجمہوری حکومتیں قایم ہوئی ہیں ہر حکمراں کے بعد ایک ہی ولی عہد مقرر کیا جاتا تھا جو اُس کے بعد تخت وتاج کا وارث ہوتا تھا مگر خلفائے بنی امیہ نے اس کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا جو اُنکے خیال کے مطابق اگرچہ حکومت شخصی کی سنگ بنیاد کو مستحکم کرتا تھا لیکن دراصل وہ خاندانی جھگڑوں اور قضایائے فاسدہ کا مولد تھا، جس کے برے نتائج صفحہ عالم پر کچھ اس طرح ظاہر ہوئے کہ خود اُن کا وجود معرض خطر میں آگیا، مروان اول نے اس کی ابتدا کی اسکے بعد عبدالملک نے مرنیکے کچھ روز پیشتر اپنے بعد یکے بعد دیگرے ولید اور سلیمان دو ولی عہدوں کو مقرر کیا، ولید کا زمانہ بلحاظ دنیاوی جاہ وجلال کے ایک ممتاز اور معروف وقت تھا جس میں اسلام کو وہی ترقی ہوئی جس کی نظیر آج بمشکل مل سکتی ہے، قتیبہ بن مسلم باہلی، محمد بن قاسم فاتح سندھ موسیٰ بن نصیر جیسے سالارات نے اپنی صدائے جہاد سے دنیا کو خوف زدہ کر دیا تھا مگر ولید سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سلیمان کے بجائے اپنے بیٹے کو اُسکی جگہ ولی عہد بنانے کی خواہش ظاہر کی اور اسی معاملہ میں حجاج اور قتیبہ سے مشورہ طلب کیا لیکن موت کی عجلت نے اُسے کامیاب نہونے دیا اور سلیمان خلیفہ ہو گیا۔ سلیمان چونکہ ولید سے ناخوش تھا اس لئے جن لوگوں نے اُسے ولی عہدی سے معزول کرنیں ولید کا ساتھ دیا تھا اُن سب سے انتقام لینا شروع کیا، قتیبہ ترکستان میں مارا گیا، قاسم کو اس قدر سخت سزا دی گئی کہ پھر جانبر نہ ہو سکا، بہرکیف ولید نے جو کچھ کمایا تھا سلیمان نے اُسکو مفت برباد کر دیا اور یہ خرابی محض یکے بعد دیگرے دو دو ولی عہدوں کو مقرر کرنے سے پیدا ہوئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ جب اُن دونوں میں ایک حکمراں ہوتا تھا تو وہ اپنے بعد آنیوالے کو معزول کر کے اسکی جگہ پر اپنے کسی عزیز کا تقرر کرتا تھا جسکی وجہ سے خاندانی جھگڑوں کی ابتدا ہوئی نیز یزید ثانی نے بھی اس غلطی کا اعادہ کیا۔ اور ہشام اور ولید ثانی کو اپنے بعد ملک وریاست کا والی مقرر

مقرر کر گیا، چنانچہ ہشام نے وہی حرکت کی اور اس سے ولید اور غضب ناک ہو گیا جس سے بنی اُمیہ کو سخت نقصانات اُٹھانے پڑے اور اسکا سلسلہ آخر وقت تک باقی رہا خاندان بنی اُمیہ میں جسکی بدولت باہمی اختلافات اور کینے پیدا ہوئے وہ اسی طریقۂ جدید کا تباہ کن اثر تھا، چنانچہ مروان ثانی کے عہد میں ایک طرف آپس کی خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں جنکی قوت کمزور ہو گئی تھی اور دوسری طرف خوارج نے جو ضحاک بن قیس شیبانی کی ماتحتی میں سر اوٹھایا تو اب حکومت دمشق اس قابل نرہی کہ اِن فتنوں کا استیصال کر سکتی، پھر محکمہ سی، آئی، ڈی، کے ٹوٹ جانے کے بعد بنو عباس کی سازش سے وہ بالکل بے خبر رہے حتی کہ اب وہ زمانہ آیا جب پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس بن سفاح کی امارت کا اعلان کیا گیا اور مروان اُنکی قوت کی تاب نہ لاکر شام سے فرار ہو گیا۔ اس کا سبب وہی ہے جس کو مینے ابھی اوپر کر دیا ہے، لیکن اگر آپکو اصل علت کی تلاش ہے تو یہ ساری بربادیاں خلافت کو سلطنت سے بدل دینے کی وجہ سے لاحق ہوئیں جو اصول اسلام اور قانون ملت کے بالکل خلاف ہے، قوم اگرچہ حاکم وقت کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو مگر لوگوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جو اعتدال پسندی اور میانہ روی کا ساتھ دیتا ہے۔ اُس زمانہ میں ایسے اشخاص کی تعداد بکثرت تھی مگر بدنظمی اور ملکی مناصب پر حد سے زیادہ تندمزاج اور ہلاکو صفت امرا کا تقرر اسکے لئے خلاف مصلحت تھا، کیونکہ اِس سے خاموش و ساکت کرنے کے بجائے اُنکو اور برانگیختہ کرنا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ضرورت نے اُنھیں مجبور کر دیا تھا مگر دراصل احتیاج اتنی نہ تھی جتنا کہ انہوں نے احساس کیا اور حقیقت حال وہ نہ تھی جس کو اُنھوں نے بلا غور و فکر کے سمجھ رکھا تھا، لیکن اگر تلاش و تتبع سے کام لیا جائے تو اِن تمام افعال اور حرکات کا ذمہ وار خود اُنکا ذاتی اور فوجی مصارف تھا جسکی گرانباریوں نے رعایا سے زبردستی مال و اسباب حاصل کرنے پر اُنھیں مجبور کر دیا تھا چونکہ آئے دن انکی مصروفیتوں میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اس لئے ضرورت پیدا ہوئی کہ فوج کے سامان رسد اور آلات جنگ کے لئے قوم سے ایک کثیر رقم وصول کی جائے، یہی اسباب تھے جنکی وجہ سے عمال سلطنت پر حکومت کی طرف سے بار بار دباؤ ڈالا جاتا تھا چنانچہ اُنھیں اِس حکم کو عملی صورت میں لانا پڑا

کرنے کے لئے ہر اُس غیر انسانی فعل کا مرتکب ہونا پڑا جو شرع اور اصول اخلاق کے منافی تھا، عمرو بن العاص حاکم مصر سے ایک مرتبہ ایک عامل نے سوال کیا کہ میرے علاقہ پر کس قدر جزیہ ہے، انہوں نے کہا تم ہمارے خزانے ہو اگر ہم پر سختی ہوگی تو تم پر سختی کرینگے اور اگر تخفیف ہوئی تو تم پر بھی تخفیف کی جائیگی[1] اس سے معلوم ہوا کہ ان تمام زیادتیوں کی ذمہ دار جو وقتاً فوقتاً رعیت پر ہوتی رہی ہے امرائے سلطنت سے زیادہ خود خلیفہ کی ذات تھی جنکے حکم کی تعمیل وہ اپنا فرض منصبی خیال کرتے تھے، حجاج بن یوسف ثقفی، زیاد اور ابن زیاد یہ وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے قوم کے ستانے اور اُنھیں تکلیف دینے میں کچھ بھی دریغ نہیں کیا اور اس سے عوام کی نفرت بنی امیہ سے اور بڑھتی گئی، صرف حجاج نے لاکھوں بنی آدم کو بلا جرم شہید کر دیا، مورخ ابن اثیر نے اسکے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے چنانچہ وہ یہ ہے۔

قال الشافعی بلغنی ان عبد الملك ابن مروان قال للحجاج مامن احد الا هو عارف بعیوب نفسه فعب نفسك ولا تخبها منها شیئاً قال یا امیر المومنین انا لجوج حقود قال له عبد الملك اذا بینك وبین ابلیس نسب فقال الشیطان اذا رانی سالمنی[2]

امام شافعی نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ عبد الملک نے ایک مرتبہ حجاج سے کہا دنیا کا ہر انسان اپنے عیوب ونقائص کو پہچانتا ہے تم بھی اسکو پہچانو اور پردہ پوشی سے کام نہ لو، حجاج نے کہا امیر المومنین میں تو سر تا پا سرکشی وکینہ کا مبتلا ہوں خلیفہ نے کہا پھر تمہارا نسب ابلیس سے ملتا ہوگا اسپر حجاج نے کہا جی ہاں شیطان جب مجھے دیکھتا ہے تو صلح کر لیتا ہے

عبد الملک کو ابن زبیر اور مختار جیسے مدعیان خلافت کا مقابلہ کرنا پڑا اس جنگ میں کثیر رقم کی حاجت تھی مگر یہ صرف حجاج ہی کی شخصیت تھی جس نے اُس تمام جنگی مصارف کو قوم سے وصول کرکے پورا کر دیا، قوم بخوشی دینے پر راضی نہ تھی مگر زبردستی اُن سے وصول کر لیا گیا، عہد بنی اُمیہ میں یہ خاص دستور تھا کہ قابل زراعت اور ناقابل کاشت ہر زمین پر خراج لگایا جاتا اور رعایا کے لئے

[1] تاریخ التمدن الاسلامی جلد ثانی صفحہ نمبر ۱۵، [2] کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ نمبر ۳۲

فقط اس قدر چھوڑ دیا جاتا تھا جو اُن کے لئے بمشکل کافی ہوتا تھا، حجاج نے ایک مرتبہ عبدالملک کے پاس لکھا کہ اگر آپ کی رائے ہو تو رعیت سے پیداوار کا وہ حصہ بھی لے لیا جائے جو زمین کی حالت درست رکھنے کے لئے ان کے پاس چھوڑ دیا جاتا ہے، اس کے جواب میں عبدالملک نے لکھا،

لا تکن علیٰ درھمك المأخوذ احرص	جو درہم تم نے وصول نہیں کئے ہیں اس پر بھی وصول
منك علیٰ درھمك المتروك وابق	کئے ہوئے درہم سے کم توجہ نہ کرو، اور فقط اُنکا
لھم لحوماً یعقدون بھا شحوماً له	گوشت اور چمڑا چھوڑ دو،

سعید بن العاص عراق عرب کا عامل تھا وہ بطور تکیہ کلام کے یہ کہا کرتا تھا،

ما سواد الا بستان قریش ما شئنا	سواد قریش کا باغ ہی جتنا ہم چاہیں اس میں سے
اخذنا منه وما شئنا ترکناه [۲]	لے سکتے ہیں اور جسکی خواہش نہیں اسکو چھوڑ دینگے

جب بیچارے کسانوں پر اس قسم کی سختیاں ہونے لگیں اور ان سے زبردستی گرانقدر رقم وصول کی جانے لگی تو وہ دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں جا بسے تاکہ ان مظالم سے یگگونہ آسانی میسر آئے مگر وہاں جانے کے بعد حجاج نے اُنھیں پھر گانوں میں واپس بھجوا دیا اور وہ بادلِ نخواستہ روتے ہوئے اپنے مکان کو چلے گئے چنانچہ ایک مورخ کا بیان ہے،

ان عمال الحجاج کتبوا الیه ان الخراج	حجاج کے پاس عمال نے لکھا کہ خراج کم ہو گیا ہی اور
قد انکسر وان اھل الذمة قد اسلموا	اہل ذمہ مسلمان ہو کر شہروں میں جا بسے ہیں، جواب
ولحقوا بالامصار فکتب الی البصرة وغیرھا	میں حجاج نے اہل بصرہ و دیگر شہروں کی باشندوں
ان من کان له اصل من قریة فلیخرج الیھا	کو لکھا کہ وہ دیہات کو چلے جائیں چنانچہ حجاج نے
فاخرج الناس من لتوخذ منھم الجزیة	جزیہ کی خاطر اُنھیں شہروں سے خارج کر دیا
فجعلوا یبکون وینادون یا محمداہ یا محمداہ	اور وہ روتے ہوئے یا محمداہ کے نعرے مارتے
ولا یدرون این یذھبون [۳]	ہوئے چلے گئے اور عالم پریشانی میں اُنھیں یہ بھی

[۱] مادردی صفحہ ۱۴۳ [۲] اغانی جلد ۱۱ صفحہ ۳۰ [۳] کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳

نہ معلوم ہو سکا کہ کدھر کو جائیں تحصیل خراج کا یہ طریقہ نہ صرف حجاج ہی کے ساتھ مخصوص تھا بلکہ عبداللہ بن حجاب جو خلیفہ ہشام کی طرف سے ملک مصر کا عامل تھا، جراح حاکم خراسان اور یزید بن ابی مسلم وغیرہ نے عوام پر خراج وجزیہ کے بارے میں بہت کچھ ستم رانیاں کی ہیں، خلافت راشدہ میں خراج کی جو مقدار معین تھی بنی امیہ نے اُس میں اور اضافہ کر دیا، چنانچہ محمد بن یوسف جو حجاج کا بھائی تھا اس نے یمن کے زمینداروں پر ایک جدید ٹکیس لگایا جسکو وظیفہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اس قسم کے واقعات کی مجھے اس جگہ تفصیل کرنی مقصود نہیں محض دکھلانا یہ ہے کہ جنگی مصارف کی کثرت نے بنی امیہ کو کس قدر ظالم وسفاک بنا دیا تھا کہ وہ بے دریغ رعیت کے مال وآبرو پر حملہ آور ہوتے تھے اور اس سے عوام الناس کے جذبات جو بھڑک اُٹھے وہ کہانتک اُنکے حق میں مضر ثابت ہوا، اب تک میں بنی اُمیہ کے جائز اور ناجائز مطالبات کے پورا کرنے والے امرا اور عمال سلطنت ہی کی تھی جو عموماً سخت گیر اور ظالم تھے لیکن یہ اُنکے قوت بازو تھے جو جاہتے تھے وہ اُسکو پورا کرتے تھے، بقیہ سارا عالم انکا دشمن تھا لیکن بنی امیہ سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے جوش انتقام میں رؤسا اور امرا کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا، سلیمان بن عبدالملک نے محمد بن قاسم فاتح سندھ کو گرفتار کر کے مار ڈالا، قتیبہ جس نے سمرقند بخارا اور مشرقی ترکستان کا سارا علاقہ ولید کے عہدِ حکومت میں فتح کیا تھا وہ اسی خلفشار میں ہلاک ہو گیا، موسیٰ بن نصیر جس کے حکم سے طارق بن زیاد نے اندلس کو فتح کیا تھا اس پر اس قدر تاوان لگایا گیا کہ اُس نے لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر کسی طرح اُس رقم کو پورا کیا نہ صرف سلیمان کی ذات تک اس کا سلسلہ قایم رہا بلکہ ہشام نے عربوں میں جاہلیت کی قدیم عصبیت کو دوبارہ زندہ کر کے ملک وقوم کو بہت زیادہ نقصان پہونچایا چنانچہ خالد بن عبداللہ قسری جو عراق کا گورنر اور اپنے حسن انتظام سخاوت اور کرم گستری کے باعث قوم سے نیک نامی کا تمغہ حاصل کر چکا تھا ہشام نے اُسے قید میں بری طرح مار ڈالا، خالد چونکہ ایک ملنسار اور خلیق آدمی تھا، اس لئے شعرائے وقت نے درد انگیز لہجہ میں اس کا مرثیہ کہا،

لہ ملخص از کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۲۴،

ابو الشعب عبسی نے جو اسکے خوان نعمت کا پروردہ اور اس کے دستِ کرم کا منت شناسا تھا، ایک بہت طویل مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار ابو تمام نے بھی حماسہ میں درج کیا ہے اور وہ ہیں

الا ان خیر الناس حیاً و ھالکاً اسیرُ سقیفٍ عندھم فی السلاسل

لوگو! دنیا کے بہترین لوگوں میں خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ ثقیف کا قیدی یعنی خالد ہے جو آج (بدقسمتی سے) آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے،

لقد کان یبنی المکرمات لقومہٖ و یعطی اللُّھیٰ فی کل حقٍ و باطلٍ

اُس نے اپنی قوم کے لئے بہت سی کارگزاریاں کیں اور ہر جائز و ناجائز عمل میں وہ (بے دریغ) مال صرف کرتا تھا،

فان تسجنو االقسریّ لا تسجنوا اسمہ و لا تسجنوا معروفہ فی القبائل

پس اگر تم نے قسری (خالد) کو قید کر دیا ہے تو یاد رکھو، تم اُس کی نیک نامی اور اُس کے احسانات کو کبھی مقید نہیں کر سکتے، اِن واقعات کو دیکھ کر ملک کے ذی اقتدار رؤسا اور عمال کے دلوں میں بنی امیہ کی طرف سے ایک عام نفرت پیدا ہو گئی اور جس خلوص و محبت کا اظہار وہ اپنے آقائے نعمت کے ساتھ کیا کرتے تھے اب اسکا عشر عشیر بھی باقی رہا ملکی ترقی اور ارتقاء کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو فتوحات پر بھی اسکا کافی اثر پڑا ہے کیونکہ جہانتک تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ولید بن عبد الملک کے عہد تک ہمیشہ نئے نئے ممالک فتح کئے گئے اور عالم اسلامی کا ایک بہت بڑا رقبہ مثلاً سندھ ترکستان اندلس اور شمالی افریقہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا لیکن سلیمان یا اس کے جانشینوں کے عصر حکومت میں بہت کم اسلام کے ملکی حدود میں اضافہ ہوا اور وہ بھی کچھ ایسا نہیں جس کو نمایاں کر کے دکھلایا جا سکے، بنی امیہ کے آخری دور میں جو خلفاء ہوئے اُنکی عدم توجہی اور تعیش پرستی کا بھی ملکی حالت پر بہت برا اثر پڑا، یزید ثانی دن رات عیش و عشرت میں غرق رہتا اور انتظام مملکت سے اُسے بہت کم تعلق رہتا تھا، ولید ثانی بھی اسی خیال کا خلیفہ تھا شراب نوشی اسکے حیات کی ایک روح افزا چیز تھی، چنانچہ یہ اسی کا اثر تھا کہ اُن کی فضول خرچیوں کے

باعث ملک کی اقتصادی اور مالی حالت روز بروز اور ابتر ہوتی گئی اور اُنکی غفلت شعاری اور مدہوشی سے بنو عباس کو اپنی کامیابی نظر آنے لگی، آخری ایام میں اس آرام طلبی کی یہ حد ہوگئی کہ عمال کا یا قاعدہ تقرر بالکل بند ہوگیا اور ہر وہ شخص جس میں انتظامی قابلیت اور سیاست کا کچھ بھی مادہ نہ ہوتا وہ محض خلیفہ کی کسی منظور نظر لونڈی کی ادنی سفارش سے صوبوں کا حاکم اور افسر اعلیٰ بنا دیا جاتا تھا، چنانچہ جنید بن عبد الرحمن کو خلیفہ ہشام نے فقط اس بات پر خراسان کا حاکم بنا دیا کہ اُس نے اُسکی محبوبہ کے لئے ہدیۃً ایک بیش بہا گلے کا ہار پیش کیا تھا، چنانچہ تاریخ میں ہے،

استعمل الجنيد بن عبد الرحمٰن على خراسان وكان سبب استعماله انه اهدى لام حكيم بنت يحيى بن الحكم امرة هشام قلادة من جوهر فاعجبت هشاما فاهدى لهشام قلادة اخرى فاستعمله[۱]	ہشام نے جنید کو خراسان کا عامل بنا دیا، سبب یہ تھا کہ جنید نے اُم حکیم یعنی اُس کی زوجہ کو ایک قیمتی ہار دیا تھا جو ہشام کو پسند آگیا، لہذا جنید نے اس کو ایک دوسرا ہار عنایت کیا اور عامل بنا دیا گیا،

یہ خلاصہ ہے اُن حالات اور واقعات کا جو سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بنی اُمیہ کی کارگزاریوں کا مجموعہ ہے اور یہ سچ ہے کہ تنہا محض ایک شے کسی قوم کی تنزل کا سبب نہیں ہوا کرتی جب تک کہ دیگر خارجی اسباب اُس کے گرد و پیش سے آکر شریک کار نہ بنیں اس لئے دولت بنی اُمیہ کے تمدنی اثرات اور نظام سیاست کے حق میں جتنے مضرت رساں اسباب پیدا ہوتے گئے اُنکی تعداد بکثرت ہے، مگر سب سے زیادہ مہلک اور تباہ کن چیز جو اس حکومت کے لئے ثابت ہوئی وہ خلافت شرعیت ایک جدید اصول ریاست یعنی "شخصی حکومت" کا قائم کرنا تھا باقی دیگر چیزیں شاخیں ہیں جڑ نہیں فروعات ہیں اصل نہیں،

(محمد یوسف اعظمی ندوی)

[۱] کامل ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۶۲،

ملک میں بے روزگاری

از

پروفیسر محمد حبیب صاحب بی۔ اے۔ (آکسن)

ممبر لیجسلیٹو کونسل و مدیر شمع

مجھے بحیثیت ایک معلم کے اکثر اس تکلیف دہ سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے طلبار مدارس اور یونیورسٹی سے اپنی تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد جب دنیا میں قدم رکھیں تو وہ کیا پیشہ اختیار کریں، اور انکی معاش کا کیا ذریعہ ہو؟ وکالت اور سرکاری ملازمت اب تک تعلیم یافتہ ہندوستانی کے لئے دو ذرایع معاش تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ بی۔ اے۔ پاس کو ڈپٹی کلکٹری یا کم سے کم نائب تحصیلداری ضرور مل جاتی تھی۔ لیکن تعلیم کی توسیع کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان نان و نمک کو محتاج ہو گئے ہیں۔

ملک کی ترقی تعلیم پر منحصر ہے۔ لیکن تعلیم کی توسیع اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے کوئی ذریعہ معاش موجود نہ ہو۔

ہندوستان میں اقتصادی ترقی کی بہت گنجائش ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارا موجودہ نظام تعلیم صنعت و حرفت سے بالکل خالی ہے محض چند کتابیں رٹنے کے سوا کچھ نہیں سکھاتا۔ اگر یہی حالت رہی تو ہندوستان کے اکثر سمجھدار لوگ عبید زاکانی کی نصیحت پر عمل کرنا عار نہ سمجھیں گے،

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم — کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز — تا داد خود از مہتر و کہتر بستانی

موجودہ نظام تعلیم کے درست کرنے کی صرف ایک دوا ہے وہ یہ کہ ریاضی اور انگریزی کے ساتھ کم سے کم ایک صنعت ہر طالب علم کو ہر اسکول اور ہر انٹرمیڈیٹ کالج میں سکھلائی جائے

تاکہ وہ آیندہ چل کر اسکو اپنا ذریعہ معاش بنا سکے۔ گذشتہ کونسل کی نشست میں محمد حبیب صاحب بی۔ اے۔ (آکسن) ممبر لیجسلیٹو کونسل صوبہ جات متحدہ پروفیسر سیاسیات و تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے قوم کی توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے امید ہے کہ اس مسئلہ کو ہمارے اصحاب حل و عقد کسی نہ کسی طرح سے طے کرینگے۔ بہتر ہوگا کہ کونسل کی ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرنے اور شہادت جمع کرنے کے واسطے مقرر کیجائی تاکہ موجودہ نظام تعلیم میں وہ ضروری اصلاحات جوکہ اب ناگریز ہو رہی ہیں داخل کی جاسکیں،

آنرایبل وزیر تعلیمات نے فرمایا تھا کہ وہ انٹرمیڈیٹ کمیٹی کی رپورٹ کے منتظر ہیں۔ یہ رپورٹ آج تک شایع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن عام طور سے معلوم ہے کہ انٹرمیڈیٹ کمیٹی نے صنعت و حرفت کی تعلیم کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی، علاوہ ازیں انٹرمیڈیٹ کمیٹی صرف اُن اصلاحات پر رائے دے سکتی تھی جو بغیر انٹرمیڈیٹ ایکٹ کو تبدیل کئے ہوئے ممکن تھیں۔ ہمارے نظام تعلیم کے لئے ضروری یہ ہے کہ نہ صرف انٹرمیڈیٹ ایکٹ بلکہ تمام مدرسوں کالجوں، اور یونیورسٹی کی تعلیم کے بنیادی اصول کلیۃً تبدیل کئے جائیں تاکہ یہ درس گاہیں اپنے قومی فرایض کو ادا کرسکیں اور صرف گورنمنٹ ملازمین اور وکلا پیدا کرنے پر اکتفا نکریں۔

خاکسار

شیخ علی جواد بی۔ اے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پروفیسر صاحب ممدوح کی تقریر کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"جناب والا مین بجٹ مین ثانوی (گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ) کالجوں کی مدین ایک روپیہ کی تخفیف پیش کرنا چاہتا ہون۔ میری تحریک کا مقصد اولاً یہ ہے کہ مین گورنمنٹ اور خصوصاً آنرایبل وزیر تعلیمات کی توجہ اپنے ملک کی بے انتہا ضروری مسلہ کی طرف مبذول کراؤن، اور وہ تعلیم یافتہ اشخاص کی بے روزگاری کا مسلہ ہے۔ ثانیا یہ کہ مین وزیر ممدوح کی توجہ ابتدائی، ثانوی اور اعلے مدارس مین صنعتی و حرفتی تعلیم کی اسکیم کے نفاذ کی طرف مائل کرانا چاہتا ہون۔

یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ہمارے ملک اور خصوصاً ہمارے صوبہ کا تعلیمی نظام نہایت ہی ناقص اور اصلاح طلب ہے۔ مین پہلے موجودہ تعلیمی نظام کی تاریخ کو کسی قدر تشریح کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہون کیونکہ یہ نظام جن چند مخصوص اغراض کو مدنظر رکھکر تیار کیا گیا تہا وہ واقعتاً پورے ہو چکے ہین۔

موجودہ تعلیمی نظام کا منشا شروع مین ایسٹ انڈیا کمپنی کے واسطے ادنے درجہ کے ملازمین کا پیدا کرنا تھا۔ ان کو اہلِ علم بنانا منظور نہ تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ یہ لوگ اتنی انگریزی سمجھ سکین کہ اپنے انگریز آقاؤن کے احکام کی بخوبی تعمیل کر سکین۔

وہ معمولی طور پر انگریزی سمجھ لیتے تھے، اگرہ کی تھوڑی بہت عقل بھی رکھتے تھے، لیکن اُن مین جدت آفرینی نام کو نہ تھی۔ وہ اچھے ماتحت یا اعلےٰ درجہ کے ہیڈ کلرک اور بڑے بابو بن جاتے تھے؛

مگر جناب والا گذشتہ نصف صدی سے ہمارا تعلیمی نصب العین تبدیل ہو رہا ہے۔ تعلیم بجائے اسکے کہ لوگون کو سرکاری ملازمت کے قابل بناتے، اب تعلیم ملک مین ترقی و فلاح کی ایک بہت بڑی مشین خیال کیجاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ فرسودہ دقیانوسی نظام ابتک جاری ہے اور ہمارے ملک کو قعر مذلت کی طرف لیجا رہا ہے۔

آنرایبل وزیر تعلیمات نے اپنی تقریر کے آخری حصہ مین مسلہ بے روزگاری کیطرف

بھی اشارہ فرمایا ہے۔

ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کی رپورٹ کے اعداد و شمار بھی اس وقت میرے پیش نظر ہین۔ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالجون مین فی الحال پانچ ہزار چھہ سو چھیاسٹھ اور ہائی اسکول مین چھیاسٹھ ہزار پانچسو پچپن طلبا زیر تعلیم ہین۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ "یہ طلبا آیندہ زندگی مین کیا کرین گے؟"

مین سمجھتا ہون کہ آنرایبل وزیر تعلیمات اور آنرایبل ڈائرکٹر تعلیمات کو اور نیز اس کونسل کو ہمارے نوجوانون کی تعلیم سے بیحد دلچسپی ہے۔ ان جوانون کا مستقبل ہمارے ضمیر پر ایک نازک امانت ہے۔ ہمارے ملک مین جبری ابتدائی تعلیم کے واسطے کچھ عرصے سے بہت شوق ظاہر کیا جا رہا ہے لیکن تا وقتیکہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کی اصلاح نہو جائے اور تا وقتیکہ ان تعلیم یافتہ اشخاص کیواسطے چند معاشی ذرایع مہیا نہو جائین ہمارے تعلیمی نظام کو بہت سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے

بدقسمتی سے ہمارے ملک مین تعلیمی نظام کی صحیح اور باقاعدہ علمی جانچ کبھی نہین کی گئی ہے مجھسے پہلے جو صاحب تقریر کر رہے تھے وہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا حوالہ دے چکے ہین، لیکن وہ تنہا اور بدقسمتی سے نامکمل تحقیقات ہے جو اسوقت تک ہمارے ملک مین علمی نقطۂ خیال سے ہوئی ہے، اس کمیشن نے صنعتی تعلیم کے متعلق کافی شہادت جمع کی ہے اور اپنے خیالات اور آرا کو بھی اجمالاً بیان کیا ہے۔ کمیشن ہذا کے سامنے شہادت دیتے ہوئے مسٹر پی۔ این دت نے بیان کیا تھا کہ "زمانہ حاضرہ کا بڑا مسلہ روٹی کا مسلہ ہے۔ ہماری یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نوجوانون کے واسطے تحصیل معاش کا سوال روز بروز مشکل ہو رہا ہے، اگر کافی سرمایہ نوجوانون کی موزون اور مناسب تعداد، اور بہتر تنظیم کا بندوبست ہو جاتے تو ہندوستان اپنی قدرتی پیداوار کے اعتبار سے یونیورسٹی کے نوجوانون کی روٹی اور روزگار کے مسلہ کو زیادہ کامیابی کے ساتھ حل کر سکتا ہے"، ایک دوسرے ماہر فن نے کمیشن مذکور کے سامنے اپنی شہادت مین کسی قدر مبالغہ آمیز طریقے سے بیان کیا تھا کہ کسی ماہر صنعتی تعلیم کے پانچ پرجوش شاگرد جو عمل مین لاتاک

اور بے تکلفی کے ساتھ کام کر رہے ہوں وہ کلکتہ یونیورسٹی اور نیز تمام ہندوستان کے مستقبل کے لئے پانچ ہزار بی۔اے اور ایل ایل بی سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

ہمارے لئے یہ ایک بہت مشکل مسلہ ہے تاہم ہمارے ملک کے تعلیمی کارکنان کا فرض ہے کہ تعلیم کی بقا کی خاطر اس مسئلہ کو حل کریں۔

پہلا سوال جو صنعتی تعلیم کے متعلق پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صنعتی تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

جناب والا، مین تسلیم کرتا ہون کہ اگر صنعتی تعلیم ملک کی بے روزگاری کے لئے دارو ئے شفا ہے تو اسکا مقصد اعلےٰ صنعتی تعلیم اور اس مین علمی تحقیقات ہرگز نہین ہے۔ اور نہ اُسکو معدنیات انجنیری، ڈائرکٹری وغیرہ وغیرہ کی طرح ۶ یا ۸ برس کی دیدہ ریز تعلیم سے کوئی واسطہ ہے، بلکہ اس صنعتی تعلیم کو اسقدر عملی بنا دینا چاہئے کہ معمولی قابلیت کے لڑکے بھی اسکو حاصل کرکے بازار یا اپنے محل مین کام کرکے اپنی معاشی تکالیف کو دور کر سکین۔ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے بیشک صوبہ بنگال کی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا ہے کہ چمڑہ سازی، کیمیائی صنایع، روغنیات وغیرہ کی ساخت، اور پارچہ بافی سے تعلیم صنعتی مدارس کی ابتدا ہونی چاہئے

میری قطعی رائے ہے کہ ابتدائی، ثانوی، اور اعلےٰ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ہمارے صوبہ مین ایک مفصل اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی اشد ضرورت ہے۔

بجائے اسکے کہ علحدہ علحدہ فارم کھولے جائین یا جدید آزمائشی کالج قایم کئے جائین۔ میری رائے مین مناسب ہے کہ ہر کالج مین چند ماہرین فن مقرر کئے جائین جو طلبہ کو صنعتی حرفتی تعلیم کے عملی اصول کی تعلیم دے سکین۔

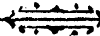
صنعتی تعلیم سے فارغ ہوکر ہمارے طلبہ انٹرمیڈیٹ یا بی اے کی ڈگری لینے کے بعد تجارتی بازار مین قدم رکھ سکتے ہین اور محض تھوڑے سرمایہ کی مدد سے اپنا تجارتی کاروبار کر سکتے ہین، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بھی اُن کو ملازمتین مل سکتی ہین۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو اس رائے سے اختلاف ہو کیونکہ ابھی بہت سے ایسے

اشخاص ہین جو تعلیمی درسگاہون کو صنعتی کارگاہون سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے ہین۔ لہذا تنگی وقت کو خیال کرتے ہوئے مین مثالاً عرض کرتا ہون کہ ہمارے صوبہ مین مرغیون کی پرورش کے لئے ایک فارم ہے جہان ولایتی مرغیون کی غور پرداخت اور پرورش اس عمدگی اور نفاست سے کیجاتی ہے کہ بہت سے ہندوستانی اور بیشک بعض انگریز بھی اپنے بچون کی اس قدر حفاظت اور نگرانی نہین کرسکتے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ مرغیون کے فارم صوبہ ہذا کی تعلیمی درسگاہون سے کلیتاً علیحدہ رہے گئے ہین۔

میرا خیال ہے کہ بعض مدرسون مین بھی اس فن کے معلّم ہونے چاہئین۔ چونکہ یہ اسکیم نہایت دشوار ہے اسلئے مین آنرایبل وزیر تعلیمات سے درخواست کرتا ہون کہ چند ماہرین فن تعلیمات اور چند ماہرین صنعت و حرفت کو اس بے انتہا ضروری مسلہ پر غور و خوض کرنے کے واسطے مقرر فرمائین تاکہ ایسی اسکیم تیار کیجائے جو بہ لحاظ مقامی اقتصادی حالات کی ہر مدرسہ اور ہر انٹرمیڈیٹ کالج مین جاری کیجاسکے۔

میری رائے مین بعض اختیاری مضامین کے بجائے صنعتی مضامین بھی سکھلائے جائین تاکہ ہمارے طلبہ تعلیم کو ختم کرنیکے بعد عزت اور ایمان داری سے اپنی معاش حاصل کرسکین۔



معلومات

از

مولوی محمد حسین صاحب حسان

امریکہ اور تعلیم

ولایات متحدہ امریکہ اسوقت تعلیم سے متعلق جدید سے جدید اسالیب اور نت نئی جدت طرازیون کے اعتبار سے تمام قومون کا قبلہ ہو رہا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم اسوقت تعلیم مین امریکہ سے زیادہ نہین خرچ کر رہی ہے شاید ہی کوئی دولت مند مرتے وقت کسی علمی معہد کے لئے ایک خطیر رقم کی وصیت نہ کرتا ہو جسطرح ہم لوگ مسجدون اور مندرون کیلئے وقف کرتے ہین۔

ولایات متحدہ مین اسوقت ۳۰۰۰۰۰ تعلیم گاہین ہین جن مین ۸۰۵۹۲۳ معلمین کام کرتے ہین۔ اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد مین ۶۲۸۴۱۷، عورتین ہین اور ۱۷۷۵۱۶، مرد معلمات کی اتنی زبردست تعداد سے ہماری تعلیمی پستی کیوجہ دریافت کیجا سکتی ہے۔ ابتدائی مدارس جو تمام ملک مین جال کی طرح پھیلے ہوئے ہین، طلبہ کی ممکن سے ممکن تعداد پر مشتمل ہین۔ یہ طالب العلم بالکل لڑکے یا نچے ہوتے ہین جو الف۔ب۔ یا بالکل ابتدائی علوم سیکھتے ہین اور عورت فطرتاً مان کی طرح بچون سے محبت کرتی ہے اور اُن کی طفلانہ حرکتون اور بچپن کی شرارتون پر صبر کرتی ہے۔ اور ہم پردہ کی وجہ سے تعلیمات سے محروم ہین۔ اسکو چھوڑئے کہ عورتین مردون کے مقابلہ مین کم معاوضہ پر کام کرتی ہین۔

ہر ولایت تعلیمی انتظامات و معاملات مین بالکل خود مختار ہے البتہ چند عام اصول ہین

جن پر تمام ولایات متحدہ عمل پیرا ہین۔ مثلاً حکومت کے مدارس مین مذہبی علوم نہین پڑہائے جاتے اور پانچ اور پندرہ سال کے درمیان تعلیم مفت اور جبریہ ہے عام رواج کے مطابق تعلیم کے تین درجے ہین ابتدائی ثانوی اور اعلے، ابتدائی تعلیم کے لئے آٹھ ثانوی کے لئے پانچ سال ہین، اور اعلے تعلیم یونیورسٹیون مین ہوتی ہے۔

یونیورسٹی ایک خود مختار نظام ہے جو اپنے تمام کامون مین خود مختاری کے لحاظ سے تجارتی کمپنی سے زیادہ مشابہ ہے وہ حکومت سے صرف اپنے قیام کی سند اور طلبہ کو سرٹیفکٹ دینے کی... اجازت حاصل کرتی ہے اسکے علاوہ حکومت کے لئے مداخلت کا کوئی موقع نہین، ہر یونیورسٹی کے لئے ایک کورٹ کی مجلس ہوتی ہے (مجلس منتظمہ) جو کورٹ کے ممبران چانسلر اور اُن کالجون کے پرنسپلز پر مشتمل ہوتی ہے جو یونیورسٹی سے ملحق ہین،

یونیورسٹی چند کالجون پر منقسم ہوتی ہے۔ ہر کالج مین ایک پرنسپل ہوتا ہے، ولایات متحدہ مین ۵۰۰ سے زائد یونیورسٹیان ہین جس سے قارئین کرام اندازہ لگا سکتے ہین کہ اہلِ امریکہ تعلیم کی طرف کس قدر زیادہ توجہ کرتے ہین۔ ایک ہم ہین کہ اتنے بڑے وسیع ملک مین ۱۶-۱۷ یونیورسٹیون سے زیادہ نہین ہین۔

مثال کے طور پر ہم کولمبیا یونیورسٹی کو لیتے ہین وہان کی تاریخ کے پروفیسر کے دلمین خیال پیدا ہوا کہ وہ بجائے اسکے کہ مروجہ طریقے کے مطابق، لیکچر دے۔ موجودہ عہد سے ابتدائی عہد کیجانب رجوع کرے، کہ یہ کالجونکی موجودہ مروجہ طرز کے مقابلہ مین طلبہ کے لئے زیادہ نشاط انگیز سہل الفہم اور تاریخ کے تصور کے لئے موزون ترین طریقہ ہے، وہ اپنے لیکچرون کی اوس کی موجودہ اشاعت سے ابتدا کرتا ہے، تدریجاً اور آہستہ آہستہ پیچھے کی رجعت کرتا ہے اور اُنیسوین صدی پھر اٹھارہوین صدی کو لیتا ہے حتیٰ کہ آخر شس بابل نینوا اور مصر وغیرہ کے ابتدائی تمدنون تک پہونچ جاتا ہے اور ہر نتیجہ کو اوسکے اسباب کے ساتھ مربوط کرتا جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب بدعت ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مستقبل مین اسکو خاص اہمیت دی جائیگی۔ امریکہ کی یونیورسٹیون مین طالب دو

طالبات مین کوئی امتیاز نہین دونون ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہین، اُٹھتے بیٹھتے ہین لیکن تین یا چار کے درمیان فصل کر دیا جاتا ہے قابل ذکر بات یہ ہے کہ بیرونی امریکن یونیورسٹی نے بھی تعلیمی معاملہ مین اس اشتراک کو تسلیم کر لیا ہے اور اسوقت مشقی عورتون کی ایک کافی تعداد مردون کے ساتھ طب کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

امریکہ کی یونیورسٹیان تین باتون کا خاص طور سے انتظام کرتی ہین۔ اوّل علوم وفنون کا ذخیرہ جمع کرنا، اسکی دو صورتین ہین، اوّل ایک کتبخانہ جو اُن تمام اعلےٰ ترین اشیا کو حاوی ہے جو اسوقت دنیا مین شایع ہین، دوسرے لیکچرون اور علمی اسباق کے ذریعہ ان کی وضاحت دوسرے مہارت مین زیادتی کے لئے بحث وتحیص اس لئے ہر یونیورسٹی مین ایک معمل اور تجربہ گاہ ہے جو اساتذہ کی تمام ضروریات پر مشتمل ہے اِن معملون مین پروفیسر اپنی بحث وتحیص جاری رکھتے ہین جو اکثر وبیشتر صنعت وزراعت کے لئے سودمند اور نفع بخش ثابت ہوتی ہے اور اسی لئے دوسرے اسباب کے علاوہ یہ بھی ایک سبب ہے کہ جو دولتمند حضرات کو بڑی بڑی جائدادین اور روپیہ وقف کرنے پر مایل کرتا ہے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیون مین پروفیسرون کو ہر چھ سال بعد ایک سال بلا وضع تنخواہ رخصت دیجاتی ہے وہ اپنی اس رخصت کو غیر ممالک مین بھی گذار سکتے ہین، چنانچہ اکثر پروفیسر معلومات مین اضافہ کی غرض سے اجنبی ممالک مین چلے جاتے ہین یا علمی وعملی تجربون مین مصروف رہتے ہین۔

تیسرے نشر واشاعت چنانچہ ہر یونیورسٹی کے لئے لازمی ہے کہ جو طلبہ کے علاوہ عوام کیلئے اساتذہ کی علمی بحثون کو شایع کرے۔

لیکن امریکہ کی تعلیم کو دیگر ممالک کی تعلیم کے مقابلہ مین جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ تجربہ اور اختیار کی روح ہے جو ابتدائی سے لیکر اسکے اعلےٰ تک تعلیم کے تمام ادوار مین پائی جاتی ہے وہان مدرس علم کی تلقین نہین کرتا بلکہ وہ طالبعلم کے دل مین یہ بات راسخ کر دیتا ہے کہ بحث وتحیص مین اُستاد اور شاگرد دونون ایک حیثیت رکھتے ہین، وہ طالب علم کو پڑہانیکی بجائے اِس امر مین اپنی توجہ زیادہ

صرف کرتا ہے کہ اِس بحث سے وہ خود ان علوم مین ترقی کرے خواہ تجربہ گاہون مین یا کتابون کے ذریعہ سے۔

مثلاً ابتدائی مدرسہ کا مدرس اُصول صحت کی تعلیم کے وقت صحت کے مبادیات کی تعلیم نہین دیگا بلکہ وہ لڑکون کے سامنے ایک مرض کی کیفیت اور اُس سے محفوظ رہنے کا طریقہ بیان کریگا پھر وہ ان کو اوس گھر مین بھیجدیگا جہان یہ مرض پھیلا ہوا ہے اور وہان وہ اس گھر اور گھر کے رہنے والونکے حالات مطالعہ کرینگے، طلبہ کی خاص کتاب کے انتخاب مین اور اُن کے اُصول کے معلوم کرنے مین جنکے ماتحت بحث کیجاتی ہو بہت تھوڑی اعانت حاصل کرتے ہین۔ ہان نتائج کے اخذ کرنے مین وہ اساتذہ سے مباحثہ کرتے ہین، ہر طالبعلم اسی طرح نشو و نما پاتا ہے اور اوسمین فطری طور پر ایک خاص مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو اوسمین عبرتاً حاصل کرنے تعلیم تمام علوم و فنون کے اکتساب کا جوش و ولولہ و امعان نظر کا سلیقہ پیدا کر دیتا ہے۔

اسی پر یونیورسٹیون کو قیاس کر لیجئے مثلاً عمرانیات (تمدن اور آبادی) کا پروفیسر طلبہ کو اسکے مبادمات کی تعلیم نہین دیتا بلکہ وہ اُنکے سامنے عمرانیات (مثلاً فقر۔ شجاعت۔ مرض۔ یا دیہات اور شہر مین مقابلہ وغیرہ) کے مسئلہ کو اُنکے سامنے پیش کرتا ہے اور اس پر غور کرنیکی ہدایت کرتا ہے اوسکی حیثیت ایک رہنما کی ہوتی ہے اور وہ ایسی کتابون کی طرف جنکا اس سلسلہ مین پڑھنا ضروری ہے اُن اعداد و شمار کی جانب جنکا علم ناگزیر ہے اور اُن مقامات کی طرف جنکا دیکھنا اس مسئلہ کی تحقیق کیلئے ضروری ہے۔ غرضکہ ان تمام چیزونکی جانب رہنمائی کرتا ہے اور اسوقت شاگرد اور اُستاد دونون موضوع تحقیق و تدقیق کیلئے ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہین، اور قارئین کرام کو یہ معلوم کرکے حیرت نہ کرنا چاہیئے کہ اکثر اوقات اُستاد ہی شاگرد کی بحث اور رائے سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔

علمی شعبہ

نوبل پرائز پانے والون کا شمار ۱۹۰۱ء سے اسوقت تک ۷۲ تک پہونچ چکا ہے جنکی ترتیب مختلف ممالک کے لحاظ سے حسب ذیل ہے۔

جرمنی	۲۱
برطانوی	۱۱
فرانسیسی	۱۰
ہولنڈی	۶
امریکی	۴
اہل اسوج	۴
اہل ڈنمارک	۳
اہل سوئٹزرلینڈ	۳
آسٹرین	۲
کناڈین	۲
ایطالی	۲
روسی	۲
بلجیکی	۱
اسپینی	۱

نوبل پرائز کا علمی انعام سوائے یورپ اور شمالی امریکہ کے کسی کو نہین ملا۔

اور اگر انعام پانے والون کے لحاظ سے ہر ایک کے ملک کے باشندون کا شمار کیا جائے تو اوسکی ترتیب حسب ذیل ہوگی۔

ہالینڈ اور سوئزرلینڈ مین فی	۱	ملین		ایک انعام پانیوالا
جرمنی اسٹریلیا اور کینڈا مین فی	۳	"		"
اسپین اور اطالیہ مین	۲۰	"	فی	"
ولایات متحدہ	۲۸	"	فی	"
روس	۶۶	"	فی	"

اکتوبر کے مجلہ "جغرافیہ امریکہ" مین دنیا کے وسیع ملکون مین فی مربع میل کے حساب سے آبادی کا شمار کیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

سوڈان	۱۱	انسان	فی مربع میل
ولایات متحدہ	۳۵	"	"
ہندوستان	۱۷۷	"	"
چین	۲۴۶	"	"

ولایات متحدہ چین اور ہندوستان کے اُن پہاڑی سلسلون کو نکالدیا گیا ہے جو غیر آباد ہین (سوڈان مین اس قسم کے پہاڑی سلسلے نہین ہین) اور سوڈان سے اُن جنگلات کو نکالدیا گیا ہے جو غیر آباد ہین،

سوڈان مین آبادی کی قلت کا سبب اس رسالہ نے یہ تبایا ہے کہ وہان کی طبعی حالات اسباب اسکے مقتضی نہین ہین کہ وہان کی آبادی مین، افزائش نسل کی کثرت ہو۔

سیسہ کو ۳۲۷ درجہ تک گرم کیا جائے تو فوراً پگھل جاتا ہے لیکن سیسہ کے تار پر برقی حرارت پہونچے تو اگرچہ اوسکی گرمی کا درجہ ۵۰۰ تک پہنچ جائے وہ بجائے پگھلنے کے بظاہر روشن

ہو جائیگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بالکل پگھل جاتا ہے مگر اُسکے گرد سیسہ کے اکسید کا حلقہ پیدا ہو جاتا ہے، جو اُسکو اصلی صورت مین محفوظ رکھتا ہے، گویا وہ اسکی نلکی کے اندر ہے، کیونکہ اگر ہائڈروجن اور نیٹروجن کے گیس مین بجلی کے ذریعہ سے اُسکو گرم کیا جاتے تو اس درجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی پگھل جاتا ہے۔

باسی یا سورا ایک افریقی قوم جو جنوبی افریقہ مین بر نجوا اور تفروین بہت بڑا جزیرہ کوینسلنڈ۔ اسٹریلیا کے شمال مشرق کیجانب ایک مستعمرہ نو آبادی ہے جو سو برس سے مجرمین کے قید خانہ کے لئے مشہور تہا، انگریزون نے اوسکی طرف مہاجرت شروع کی اور اب وہانکی آبادی کی تعداد ایک ملین کے قریب پہونچ گئی ہے لیکن اُنکے حاصلات کی قیمت ۵۲ ملین پونڈ کے قریب پہنچ گئی ہے گویا ہر شخص کی سالانہ آمدنی ۵۲ پونڈ ہے اور یہ آمدنی اس حساب سے ہے،

اون	۱۱	ملین
دودھ	۱۰	ملین
گنا	۵	"
مویشی	۳	"
لکڑی	۱½	"
پہل وغیرہ	۱	"
اناج	۱	"
مصنوعات	۱۵	"

قدیم تاریخون مین بحث ونظر سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ مین اسوقت کیطرح نشی اشیاء کے استعمال کا عام رواج نہین تہا، ہان نشہ اور اُسکے نتائج، جنون وفقر اور محرمات کے ارتکاب

سے سب لوگ واقف تھے، لیکن اسکا استعمال صرف عام لوگون کی دسترس سے باہر تھا صرف بادشاہون اُمراء اور رؤسا تک محدود تھا اور اب تو معمولی سے معمولی اور غریب سے غریب اسکا استعمال کرتا ہے۔ حکومت برطانیہ کیطرف موٹر کے متعلق جو اعداد و شمار شایع ہوتے ہین اُنسے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ مین ایک ملین اور چار لاکھ موٹر ہین اُنمین سے

خاص موٹر	۵۴۳ ہزار
موٹر سائیکل	۵۴۳ ؍؍
موٹر لاری (اسباب وغیرہ کیلئے)	۲۳۰ ؍؍
موٹر ٹیکسی	۱۱۹ ؍؍

اسلئے انگلستان مین	۳۰ آدمیون مین	ایک موٹر
جرمنی مین	۲۷۲ ؍؍	؍؍
فرانس مین	۹۹ ؍؍	؍؍
جاپان مین	۲۷۰ ؍؍	؍؍
روس مین	۹۰۰۰ ؍؍	؍؍
چین مین	۴۰۰۰۰ ؍؍	؍؍

لیکن امریکہ مین پانچ چھ آدمیون مین ایک موٹر ہے۔ کل تقریباً ۲۰ ملین موٹر ہین۔

ٹوکیو (جاپان) مین پرنس کو توہیتو کی نگرانی اور وزیر اعظم کی صدارت مین ایک علمی مجلس ۳۰ اکتوبر سے ۱۱ نومبر تک منعقد کی گئی۔ جن علوم مین بحث و تمحیص کی گئی اُن کی دو قسمین کر دیگئین طبیعیہ اور بیولوجیہ اون مین سے ہر ایک علم کی بہت سی شاخین ہین، علوم طبیعیہ مین (جن کو یہان بہت بڑی اہمیت دی گئی ہے) تیورولوجیا اور زلزلون اور آتش فشان پہاڑونکا علم ہے، اور بیولوجی مین پاسیفک اور دیگر جزائر کے قریب کے نباتات کا علم اور انسان کا علم ہے

اس جہت سے کہ وہ ان مین رہتے ہین ۔

انگلستان

جامع کیمبرج انگلستان مین اُس مکان کی توسیع کے لئے جو حیوانات کی تاملیل اور نشو و نما کے لئے تعمیر ہوا ہے، ۶۰ ہزار پونڈ کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ مسٹر روک فیلر (مشہور امریکی کرُوڑپتی) نے اس سلسلہ مین ۳۰ ہزار پونڈ اس شرط پر دینے کا وعدہ کیا ہے کہ ۳۰ ہزار پونڈ اہل انگلستان فراہم کرلین انگلستان نے اُن کی اس عطیہ اور اس شرط کو شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا ہے اور رئیس الجامعہ نے اعلان کیا ہے کہ لارڈ ” لفتون (شایرو لنگن) نے دس ہزار پونڈ مرحمت فرمائے ہین اور ” ترقی جامعہ“ کی انجمن نے بقیہ رقم فراہم کرنیکا پورا وعدہ کرلیا ہے۔

پڑوگراڈ (اطالیہ) مین گذشتہ اکتوبر مین سرخ بارش ہوئی، راستو مین ٹیک کے درختون کے پتون تک کو سُرخی نے گویا ڈھانک لیا تھا، یہ واقعہ ظہر کے وقت کا ہے۔ بارش کے ساتھ نہایت تیز و تند مشرقی گرم ہوا تین بھی تھین پھر پھرات کیوتت رعد و برق نے بھی خوب زور باندھا۔ اسکی بلندی کوئی دو ہزار ۰۰ ۵ فٹ ہوگی۔ گمان کیا جاتا ہے کہ اسکی وجہ سرخ ریت ہے جسکو ہوا مشرقی افریقہ سے اوڑا لائی ہے بعد کو اوسمین اور بادلون سے آمیز ہوگئی ہے۔

اس سال جنیف مین انجمن تعاون فکری (جو جمعیۃ الاقوام کے زیر ہدایت مرتب کیگئی ہے) کے ارکان کا اجتماع ہوا مشہور علمی لوگون مین مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

آئنشٹین جرمنی کا مشہور طبیعی عالم۔

لورنتز ہالینڈ کا عالم طبیعات (صدر انجمن)

پروفیسر گلبرٹ مرے (پروفیسر یونانی ادبیات اکسفورڈ)

فرنز کلوج امریکی ماہر بیالوجی

میڈم بوزیٹی پروفیسرہ حیوانات (اوسلو وسیرج)

سرجے سی بوسس ہندوستان کا مشہور ماہر نباتات وغیرہ

بلاشبہ ایسے اساطین علم کا اجتماع بہترین علمی فائدون کا موجب ہوگا۔

اسوقت نیویارک کی مردم شماری کا اندازہ چھ ملین لگایا گیا ہے اور اُمید کیجاتی ہے کہ سن ۱۹۵۰ء تک یہی تعداد ۱۵ ملین تک پہونچ جائیگی اور اسوقت گویا صرف نیویارک کی آبادی کا تناسب تمام ممالک امریکہ کی آبادی کے لحاظ سے ۱/۱۰ ہوگا۔ایسی حالت مین برقی قوت کی بھی اسی تناسب سے ضرورت ہوگی۔اسی ضرورت کو مدنظر رکھکر اڈیسن کی برقی کمپنی نے (جسے اڈیسن نے ۱۸۸۲ء مین قایم کیا تھا) ایک برقی اسٹیشن قایم کرنے کی تجویز پیش کی ہے جو دنیا کے تمام اسٹیشنون سے بڑا ہوگا اور اُس سے جو طاقت پیدا ہوگی وہ ایک ملین گھوڑون کی برابر ہوگی، اور تین ملین مکانات مین روشنی کے لئے کافی ہوگی (ہر مکان مین چھ کمرے ہونگے)۔

یورپین اقوام مین علما کو علمی لیکچرون کی ترتیب دینے کے لئے بہترین طریقے اور اسلوب ہین وہ جب کسی شخص کی ہمیشہ کے لئے عزت کرنا چاہتے ہین تو ایسے شخص کی یادگار قایم کرنے کیلئے کچھ لوگ کچھ روپیہ جمع کرکے بنک مین داخل کردیتے ہین تاکہ اُسکا سالانہ منافع اُس عالم کو دیا جائے جو اس شخص کی یادگار مین ایک علمی لیکچر دے اسمین اس شخص کی یادگار بھی قایم رہتی ہے اور عام فائدہ بھی ہے۔

یورپ کے ماہرین سائنس نے حال مین انکشاف کیا ہے کہ اولاد نرینہ، اور دختر پیدا کرنا والدین کے اختیار مین ہے۔چنانچہ متواتر تجربات کی بنا پر اب یہ مسئلہ عوام کے سامنے لایا گیا ہے اور ر۔۔۔

مسیز مون ٹیچ ارسکن نے اِس موضوع پر ایک کتاب Sex at Choice بھی لکھی ہے جسمین وہ دعوی سے کہتی ہین کہ اُن کے مشورون پر عمل کرنے سے امرا کے وارث، اور عوام کے یہان اولاد پیدا ہوتی ہین۔ اُنکا بیان ہے کہ اولاد کی تعداد مقرر کر لینا بھی والدین کے اختیار مین ہے۔ خود اُن کی اولاد مین چار لڑکے اور ایک لڑکی ہین۔ اِن بچون کے والدین نے باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا تھا کہ پانچ اولاد سے زائد نہوگی اور اُنمین چار لڑکے اور ایک لڑکی ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اِس مسئلہ پر اندنون اچھی طرح بحث ہو رہی ہے۔ اور دو باتین معرضِ بحث ہین۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اولاد کو نر یا مادہ پیدا کرنا ماں کے اختیار مین ہوا کرتا ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ صرف باپ مین یہ قدرت ہوتی ہے، بہر کیف دونوں فریقوں کا یہ فیصلہ ہے کہ ماں اور باپ دونوں متحد الخیال ہو کر اپنی مرضی کے مطابق بیٹا یا بیٹی پیدا کر سکتے ہین۔ اِسی سلسلہ مین ایک اور بحث بھی چھڑ گئی ہے یعنی نر مادہ اور مادہ نر بن سکتے ہین یا نہیں۔ چند ماہرین فن اِس دعوی کو پیش کر کے اعلان کر چکے ہین کہ بہت جلد مرد، عورت اور عورت، مرد بن جایا کرینگے، چنانچہ اُنھوں نے ایک نر مرغ پیش کیا ہے جو پہلے مرغی تھا اور مرغی ہونیکی حالت مین وہ انڈے دیا کرتا تھا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد انڈے دینے بند ہو گئے اور اُسکے سر پر کلغی نکل آئی اور وہ مرغ ہو کر بانگ دینے لگا، قیاس ہے کہ کسی مرض کے باعث اسکی مادہ ہونیکی صفات زائل ہو گئین اور اونکی بجائے نر کی صفات پیدا ہو گئین۔

نوٹ مدیران۔ مگر یقین ہے کہ یہ اطلاع اس ملک مین دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیگی۔ اور بہت سے گھرون مین شوہرون کو اپنے طرزِ عمل پر غور کرنیکا موقع ملے گا بلکہ اُن کو یہ بھی سوچنا پڑیگا کہ بحیثیت شوہر اُنھون نے جو مظالم روا رکھے تھے اب اُنمین ترمیم کی ضرورت ہے یا نہین۔ اور شوہرون کا ایک طبقہ غالباً اِس مسئلہ پر بھی بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کریگا کہ آئندہ اُسکو بیوی بنکر رہنے مین فائدہ رہیگا یا نقصان، بعض جگہ تو میان بیویون مین تبدیل جنس کی کشمکش قابل دید ہوگی!

خدا وہ دن تو کرے!

تبصرے

مراۃ الشعر

مصنفہ

مولوی عبدالرحمٰن صاحب پروفیسر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی

کتابیں روز چھپتی ہیں اور فراموش ہو جاتی ہیں، لیکن مراۃ الشعر ہندوستان میں برسوں زندہ رہے گی، تقریب کے سلسلہ میں لایق مصنف نے لکھا ہے "شعر ایک خیالی لسانی اثری۔ (ادبی۔تاریخی) چیز ہے، اور یہ چیزیں بہ تقاضاے حال و مقام بدلتی اور کچھ سے کچھ ہوتی رہتی ہیں اسلئے شعر سے بحث بھی ان تمام حیثیات سے ہو سکتی ہے، اگرچہ اصل ان سب کی خیال ہے اور وہی بہرحال مقصود بالذات ہے تاہم کبھی وہ مسلسل ہوتا ہے.... اور کبھی مسلسل نہیں ہوتا...... زبان و صناعت بیان بہرحال لازمہ کلام ہے۔ با این ہمہ شعر میں اکثر مذکورۂ بالا دونوں حیثیات میں سے ایک حیثیت غالب رہتی ہے۔ میں نے اس مختصر میں خیال کے ثانی الذکر پہلو کو پیش نظر رکھا ہے زبان جس کی ترجمانی کرتی ہے اور صناعت اس منتہاے کمال تک پہونچاتی ہے کہ شعر مجسمہ حسن و جمال ہو جاتا ہے، جسکے بغیر وہ شعر، یا اعلےٰ شعر کہلانیکا مستحق نہیں ہوتا۔ یہ ساری لسانی و صناعی کارسازیاں بھی غور سے دیکھئے تو خیال ہی کرتا ہے، وہی زر ہوتا ہے اور وہ زرگر و زیور بھی۔ خود ہی سجتا۔ سجاتا، اور سج دہج کا ساز و سامان بہم پہنچاتا ہے مگر کہیں شاہد رعنا ہوتا ہے اور کہیں پیرد انا۔ چونکہ شباب کی شوخیاں پہلے آتی ہیں، میں نے بھی خیال خود آرا کو مقدم رکھا ہے، رہا دوسرا خیال یا اوسکی دوسری حیثیت۔ اگر اسباب نے مساعدت کی تو اس سے آیندہ بحث کرونگا.... میں نے بہ لحاظ موضوع جن امور عامہ شعر کا

اِن اوراق مین ذکر کیا ہے اُن کو خود شعر کی زبان حال یا اُسکے ترجمان کی مستند مقال سے لیا ہے اور مشرقی شاعری اور اُسکی صناعت کو مشرقی نگاہ سے دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے تاکہ چیز اپنے اصلی رنگ روپ مین نظر آئے۔ یہ نہ ہو کہ لاگ کے شیشہ سے کچھ کی کچھ ہوجائے گھر مین جو چیز ہے اُسکی صورت نظر نہ آئے۔ اور جو صورت شیشہ دکھائے، اُسکی اصل ڈھونڈنے سے بھی کہین نہ پائی جائے۔،،

اِن الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مصنف کا مافی الضمیر کیا ہے اور کن ضروریات کو پیش نظر رکھکر اُنھون نے قلم اُٹھایا ہے، آخر مین ایک مفصل فہرست کتاب ہے، جسمین موٹی سرخیان قایم کرکے اُن کے تحت مین جن اُمور سے بحث کی ہے صفحات کا حوالا دیدیا ہے، پڑھنے والونکو بہت سہولیت ہوجاتی ہے۔

ہم خوش ہین کہ مصنف نے مشرقی شاعری کو مشرقی نگاہ سے دیکھنے دکھانیکی کوشش کی ہے، بہتر اور موثر طریقہ یہی ہے، بیچ مین انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، یا جرمن شاعری کے اگر پیوند ہوتے تو خلط مبحث ہوجاتا،

مولوی صاحب نے شعر کی تعریف سے ابتدا کی ہے، شعر کی تعریف دھوان دھار نہین ہے، اسمین ‟ازمنہ تعریفات مختلفہ، تعریفات پر ایک اجمالی نظر،، ‟مسلک جدید اور میرا خیال،، نئے مسلک کی تحقیق،، کلام کی تقسیم مین اختلاف،، تقلید بیجا،، وزن کی ضرورت پر تحقیقی بحث،، ‟اُردو مین نئے اوزان اور مستزاد،، ‟الفاظ بحیثیت صوت کے،، ‟الفاظ بحیثیت معانی کے،، وغیرہ وغیرہ کی سرخیان قایم کرکے تحقیق اور تنقید کا حق ادا کیا ہے، اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے‟ مسلک جدید اور میرا خیال ہے،، کے عنوان سے مولویصاحب فرماتے ہین،، اگر آیندہ زمانہ شاعری مین وزن وقافیہ کا التزام چھوڑ دے اور عام طور پر ناموزون، غیر مقفےٰ، رنگین خیالی نثر پر بھی شعر کے اطلاق ہونے لگے تو میرے نزدیک شعر کی اس تعریف مین بھی کوئی ہرج نہوگا۔ لیکن ابھی مغرب ہی جسکی تقلید مین بعض مشرقی اِس تعریف کو اختیار کرتے جاتے ہین، عموماً کلام غیر

موزون پر پوئٹری کا اطلاق نہین کرتا۔ اِس لئے ابھی وہ دن دور ہے، اور شاید دور ہی ہے کہ کلام غیر موزون ہمارے ہان شعر کہلائے اور جب تک کلام غیر موزون عام طور پر شعر نہ مان لیا جائے اِس تعریف کو جس کا عالم شعر و شاعری مین ہمارے ہان کوئی مصداق ہی نہین، شعر کی تعریف کہنا میرے نزدیک نہ کوئی مفید تحقیق ہے، نہ کوئی دانشمندی کی بات، اگر بعض اہل مغرب کلام غیر موزون کو پوئٹری مانتے ہین، مانا کرین، اپنا اپنا شعر اور اپنی اپنی رائے ہے،، پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد، اور نیز مختلف ضروری مسایل پر اُن کی بے تکلف تحریر حکیمانہ استدلال اور مجتہدانہ ذاتی رائے، اُن کی قابلیت کا بے مثل ثبوت ہین، اُنھون نے جا بجا عربی، فارسی، اور اُردو شاعری کی مثالون سے اپنے بیانات کو واضع اور دلکش بنا دیا ہے، اور شاعری کے لطیف موضوع پر پاکیزہ اور جامع بحث کی ہے، شروع سے اخیر تک ضروری معاملات اور نکات پر نہایت سنجیدہ بحث ہے، غیر ضروری، اور مبہم باتین سرے سے غائب ہین، غرض قابلِ قدر اور قابل دید کتاب ہے، اور طباعت کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے، لایق مصنف عربی، فارسی، اور اُردو کے عالم ہین، اور صاحب ذوق ہین، اکثر مقامات ادبی حیثیت سے قابل تعریف ہین تنقید ادب کی جان ہے جو قابل مصنف سے کبھی جدا نہین ہوتی۔ میر انیس مرحوم کا ایک بند ہے،،

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد	مخمل سی وہ گیاہ وہ گلِ سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد	یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دِل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

مولویصاحب فرماتے ہین ،،کس شان کا چہرہ ہے، ٹھوڑی سے ماتھے تک حسن کا مجسمہ ہے مگر ایک تل کی کسر رہ گئی۔ زبان کا عام انداز کہتا ہے، پھونک پھونک کر ہونا چاہئے، ذوق کی باریک نظری کو دیکھئے کہ ہر پھیر کر اُسی کمی پر جاتی ہے۔ مصرع مصرع کو دیکھکر تڑپ اُٹھتی ہے مگر

یہ کہنے سے باز نہین آتی کہ پھونک پھونک کر ا ہوتا تو کیا خوب ہوتا،، ایک جگہ غالب کے اشعار۔

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب | پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا | تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

کے متعلق لکھا ہے۔

"لفظ لفظ مانوس و فصیح، ترکیب مین وہ انسجام و روانی کہ معلوم ہوتا ہے پھول جھڑ رہی ہے، یا موتی ہین کہ طشت طلائی مین پڑے ڈھلک رہے ہین اور معانی وہ کہ نقش ناز بھی شرما جائے۔ طاؤس رقصان کی کیا حقیقت ہے۔ لیکن اس اردو زبان کو دیکھئے کیسے جھاگ لگے ہین۔ کہتی ہے، اور بے لاگ لپیٹ صاف کہتی ہے کہ یہ شعر پھولون کے گجرے ہین یا موتیون کے ہار مجھے نہین بھاتے۔ یہ میری پسند۔ میرے مذاق کے نہین بنے۔ آیا اور رانگا کے سوا ان مین میرا کیا رکھا ہے، باقی پھول ہین تو بدیسی جنکی بوباس سے میرا سر چکرا تا ہے، اور موتی ہین تو موتی، میرے سر نہ چپکاؤ۔ فارسی کے پاس لیجاؤ۔ شیراز و اصفہان پہونچاؤ۔ وہان بھی کوئی خریدار نہ پاؤ تو زبان غالب کے نام کی ایک نئی دنیا بناؤ۔ اور اوس مین جا سجاؤ۔ غالب میرا سر تاج ہے اوسکی نظم و نثر کا میری قلمرو مین رواج ہے۔ مین اسکی عزت کرتی ہون۔ اونچی اونچی کرسیون مین جگہ دیتی ہون۔ مگر نہ فارسی اور اس انوکھی شاعری کے زور پہ بلکہ اس طرز و اطوار پر جو میرا ہے، جب غالب اوسکا ہے تو میرا ہے۔ اس سے زیادہ میرا اُسکا واسطہ نہین مین نے اُسکے ایسے کتنے ہی طبع زاد خود اُسکے قلم سے کٹوا کر اپنی قلمرو سے نکلوا دئے۔ یہ اکا دُکا جو رہ گئے ہین یہ اوسکی اور اُسکے یارون کی سینہ زوری ہے مین اوسکی عزت و تعظیم کرتی ہتی اور کرتی ہون لیکن اِن ناشدنیون کی خاطر مین نے اُن کو نہ آجتک منہ لگایا ہے نہ لگاونگی۔ جو آج ان کے طرفدار ہین کل دیکھ لینا وہ بھی اِن سے منہ موڑ لین گے۔ کھوٹا کھرا الگ ہو جائیگا اور اپنا پرایا معلوم ہو جائے گا۔

" فصاحت و بلاغت کلام کا حُسن ہے جس کے پیدا کرنے یا قایم رکھنے کیلئے الفاظ کی سلاست و روانی ترکیب کی صفائی اور اسلوب زبان کی پابندی لازمی ہے اِس حد سے

آگے تجنیس ترصیع، توازن وتقابل، وہ بیسیوں مزخرفات جن کو فن بدیع مین محاسن کلام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خاص کر لفظی محاسن اصلی نہین نقلی ہین۔ حسن فصاحت وبلاغت کے ساتھ اگر کہین اتفاقاً جمع ہوجائین تو مستحب ہین فرض وواجب نہین۔ یہ صحیح کہ دل پر اثر ان کا بھی ہوتا ہے لیکن مقصود کلام کا معانی ہوتے ہین، نہ تزئین الفاظ"

اس قسم کے بیسیوں جملے کتاب مین نظر آئین گے۔ الفاظ، مجاز، معانی۔ جذبات، خیال، تخیل، جدت ادا۔ فکر۔ وصف۔ حسن ادا، کے تحت مین مصنف نے شاعری کے بڑے اور چھوٹے اصول غرض سب پر نہایت صفائی کے ساتھ دلنشین پیرایہ مین بحث کی ہے۔ اور سرخیان قایم کر کے ہر عنوان پر مفصل اور مدلل باتین بیان کین ہین۔ مصنف کا طریقہ ہے کہ وہ پہلے ایک مستقل باب قایم کرتے ہین اُس پر مفصل اور فاضلانہ بحث کے بعد اُسکو مختلف پہلوؤن سے جانچتے ہین، اور پھر اوسکی تقسیم کرتے ہین۔ ہر عنوان کے ابتدا مین اوسکی تعریف ہوتی ہے، اور بعد کو تفصیل، مثالین، اور تنقید ہوتی ہین۔ اِس اصول پر وہ اخیر تک کاربند رہے ہین اور ۳۰۲ صفحات کے اندر ضروری مسایل کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے مین قطعی کامیاب ہوئے ہین۔ کہنے کو تو عربی شعر ایک مستقل تصنیف ہے۔ لیکن حقیقت مین اُردو کے شائقین کے لئے ایک نعمت ہے۔

مصنف نے جا بجا فارسی مثالین بھی دی ہین۔ یہ کتاب عرصہ تک مصنف کا نام زندہ رکھے گی، اور غالباً یہی ایک تصنیف انکی شہرت کیلئے کافی ہے۔

بیان دلاویز ہے، اور ہر حصہ غور اور شوق سے پڑھنے کے لائق ہے۔ ملک مین ایسے لوگ کم نکلین گے جو اسکے مطالعہ سے اپنی معلومات مین کچھ نہ کچھ اضافہ نہ کرسکین۔

اُردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہین ہوسکتا۔ طلباء کیواسطے اِس سے بہتر کتاب نہین اور نہ غالباً کچھ عرصہ تک تصنیف ہوگی۔ کاغذ اچھا، لکھائی چھپائی بہت اچھی۔ قیمت ۳ روپے ہے جناب مصنف سے مل سکتی ہے۔

اصلاحِ سخن

مشاہیر شعرائے عصر کی اصلاحونکا آئینہ

جامع

محمد عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی

اِس کتاب کو شایع کرتے ہی مؤلف صاحب مصیبت مین گرفتار ہوگئے اور چارون طرف سے اعتراضون کی بوچھار ہوگئی، کتاب کی ترتیب اِس طرح پر ہے کہ پہلے مولف نے اپنی ایک غزل جلی قلم سے لکھدی ہے اور پھر ہر صفحہ پر اسکا ایک شعر لکھدیا ہے اور نیچے اپنے اُستاد شعراء کی اصلاحین درج کردی ہین اور اُنکا بھی حوالہ دیدیا ہے جنھون نے اصل شعر کو بجنسہٖ رہنے دیا ہے یا اوسکی تعریف کی ہے۔ اسی سلسلہ مین چند خطوط بھی جو اُن کو شعراء نے لکھے تھے۔ شایع کردئے ہین بعض شعراء نے اصل شعر کو سمجھا ہی نہین اور اپنی استعداد کے مطابق، اصلاح دیدی یا اپنی جانب سے نیا مضمون اور نیا شعر یا مصرعہ لکھکر حوالے کردیا۔ ساری لے دے اِس بات پر ہے کہ۔

(۱) ایک سے زیادہ شاعر سے اصلاح کیون لی۔

(۲) اصلاحون کو چھاپ کر اُستادون کو ہدف اعتراض بننے کا سامان کیون کردیا۔

(۳) اُستادون کے نجی خطوط کیون شایع کردئے۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم نے اصلاح سخن پر مقدمہ لکھا ہے جو شامل ہے، مرحوم نے کتاب کو جس نظر سے دیکھا اُس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوسکتا ہے۔

"اُردو کی عالم شاعری پر یہ احسان کیا کہ ان سب اصلاحون کو اس رسالہ کے ذریعے سے ملک کے

تمام ذوق سخن رکھنے والون کے سامنے پیش کر دیا جس سے فن زبان پر ایک بالکل نئے انداز سے نظر ڈالنے اور غور کرنیکا موقع ملتا ہے،،

"جناب شوق کی تصنیف مین شعر کی اصلاح سے زیادہ اساتذہ کے اختلاف مذاق اور اُردو شعراء کے موجودہ تنوعات کا اعتبار ہے جو آجکل کے محققین کے لئے ایک نہایت ہی دلچسپ بحث اور بڑا نازک اور غورطلب معاملہ ہے،،

"الغرض مین حضرت شوق کی اس کوشش کو محض اُستادونکی اصلاح تک محدود نہین رکھتا بلکہ اُسے آئندہ تحقیق کا ایک نہایت ہی نفع بخش خیمہ تصور کرتا ہون،،

نیاز صاحب فتحپوری کی لکھی ہوئی تقریب بھی شامل ہے اُن کو "اُمید ہے کہ اس رسالہ کا دوسرا ایڈیشن زیادہ وسیع پیمانہ پر شایع کیا جائیگا اور اسی کیساتھ اساتذہ اپنی اصلاح و ترمیم کو استدلال فن سے مستحکم کرکے پیش کرینگے اور اس صورت مین افادہ و استفادہ کے لئے ایک علمی بنیاد قایم ہوجائے گی،،

محترمی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پی-ایچ-ڈی کتاب پر تبصرہ مین ارشاد فرماتے ہین-اگر انصاف آنکھ سے دیکھیے تو شوق صاحب کی یہ جدت نہ تو بدعت سیئہ ہے نہ اُستادونکی شان مین گستاخی-یہ تو ایک ایسی بدعت حسنہ ہے جس کا شکر کرنا اُردو کے ہر قدر شناس پر واجب ہے۔ . . . . مختلف اصلاحون پر ذرا سا غور کرنے سے شعر کے سارے حسن و قبح واضح ہوجاتے ہین اور اصلاح کے اُصول نظر کے سامنے آجاتے ہین،،

محترمی مولوی امیر احمد علوی صاحب بی-اے نے ظریفانہ انداز مین تبصرہ لکھا ہے۔

"فی الحقیقت ایک اُستاد کے خود ساختہ جبریہ اصول و ضوابط کی پابندی قوت فکر کی بلند پروازی کے لئے جانگسل زنجیر ہے اور جبتک موقع موقع سے اساتذہ کے درمیان جنگ زرگری نہ ہوتی رہے نہ تو اُستادون کے جوہر کمال پر صیقل ہوسکتی ہے اور نہ شاگرد کو اس امتیاز کا موقع ملسکتا ہے کہ زمانہ حال کے لاتعداد و بزعم خود اُستاد شعراء مین سے کس کی نظر وسیع تر ہے، کون زبان پر جان

دیتا ہے؛ کون طرز بیان کا شیفتہ ہے؛ کس کو تازگی مضامین پسند ہے؛ کس کو صفائی بندش پر اصرار ہے۔ . . . . . . "

سلطان حیدر صاحب جوش نے مقدمہ لکھا ہے جو شعر و شاعری پر چھوٹا سا مضمون ہے اُن کا خیال ہے "اگر نقوش الفاظ و مضامین کی گوناگون قطع و برید صاحب نظر کے سامنے کلام شوق کے محاسن اور خامیون کے علاوہ خود مصلحان سخن کے متعلق ایک لطیف موازنہ و مقابلہ پیش کرے تو اس نتیجہ ناگزیر سے حضرت شوق پر کوئی الزام نہین آتا۔ نقوش اصلاح بجنسہ و بعینہ بلا کسی رائے زنی کے پیش کئے گئے ہین"

غرض اِن اقتباسات سے یہ تھی کہ اعتراضات کی بھرمار مین تصویر کا روشن پہلو بھی موجود ہے جس کو نظرانداز نہ کرنا چاہئے بلکہ برائیون کو بھول کر بھلائیون کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ لفظ محشر کی تحقیق پر جناب ڈاکٹر صدیقی صاحب کا خط عالمانہ ہے اور قابل دید ہے۔ کتاب کی بڑی تقطیع ہے۔ مقدمہ تبصرے کے علاوہ حجم ۲۳۴ صفحات۔ قیمت صرف تین روپے (۳؎)

ملنے کا پتہ:- حکیم محمد بہاء الدین صاحب صدیقی۔ وائٹ گنج۔ ھردوئی

غزل

از سلطان حسین متخلص بہ حسرت [illegible]

ضعف سے رُک جائین گے نالے جو مجھ دلگیر کے
عرش تک پہونچین گے شعلے آہ پُرتاثیر کے

جو ہوا عشقِ نبی مین وہ مقدر سے ہوا
ہم کبھی قایل نہ ہون گے خلق مین تدبیر کے

عشق احمد مین ہوئے ہین جو تہِ تیغِ ستم
حشر مین وہ ساتھ ہون گے حضرتِ شبیر کے

رات دن رکھتے تصور مین نگاہِ پاک کا
دیکھئے کس روز ہون نخچیر ہم اُس تیر کے

سر رگڑتے ہی نبی کے آستانے پاک پر
حرف برگشتہ تھے جتنے مٹ گئے تقدیر کے

جب مؤذن نے اذان مین نام حضرت کا لیا
دہر سے ناقوس نے نعرے کئے تکبیر کے

بڑھ گیا جوشِ جنون جب عشق زلفِ پاک مین
چٹکیون سے ہم نے ٹکڑے کر دئے زنجیر کے

طبی فارماکوپیا حصہ اوّل

مؤلفہ

جناب نبض الحکماء حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کلاسز پنجاب یونیورسٹی لاہور

یہ امر موجب مسرت ہے کہ کچھ عرصے سے ملک کے مشہور اطباء طبی کتب کی تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہین۔ جناب حکیم صاحب نے طبی فارماکوپیا کو تالیف فرما کر ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے کتاب کی ترتیب سے قابل مؤلف کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسمین متعدد امراض کیلئے بکثرت نسخے ہین۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آزمودہ اور مجرب ہین اور حتی الوسع ایسے نسخون کو لیا ہے جو کم خرچ ہین اور آسانی سے تیار ہو سکتے ہین۔ ہمارے خیال مین یہ کتاب بہت مقبول ہوگی افسوس ہے کہ اکثر ناواقف لوگ محض روپیہ کمانیکے لئے طرح طرح کی طبی کتب اور نسخے جات کی آئے دن اشاعت کیا کرتے ہین جن سے بعض اوقات سخت نقصان پہونچ جاتا ہے لیکن موجودہ تالیف کے متعلق اس قسم کا خیال ہی نہین ہو سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگون کو چاہئے کہ مستند اور قابل اطباء کی تصانیف سے فائدہ اُٹھائین اور یہ کتاب اس لایق ہے کہ خرید کر گھرون مین رکھی جائے۔ بلاوجہ ڈاکٹرون کی فیسون اور قیمتی ادویہ سے بہت پناہ ملے گی اور معمولی امراض کا علاج معمولی لکھا پڑھا آدمی ہی کر لیا کریگا۔ حجم ۶۳۲ صفحے۔ قیمت تین روپے (۳ر)

نوٹ۔ ہم اُمید کرتے ہین کہ جلد ثانی بھی بہت جلد شایع ہو کر ملک کو فائدہ پہونچائے گی۔

پتہ۔ ناظم صاحب کتب خانہ مشیر الاطباء حویلی کابلی مل شہر لاہور پنجاب

جلد ۶ فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ اگست وستمبر ۱۹۲۷ء نمبر ۲-۳

اسیر لکھنوی عزیز

معذرت

اگست و ستمبر کا یکجا پرچہ حاضر ہوتا ہے، شمع کو اڈیٹروں نے محض علمی اور ادبی خدمت کے شوق میں نکالا تھا، اور گذشتہ تین سال سے پیہم مالی نقصانات ہمارے حصہ میں آتے رہے۔ خریداروں کی کم التفاتی ہمارے لئے سوہان روح ہے، ہم ہر ماہ تقریباً سو کاپیاں کم استطاعت اور اہل ذوق حضرات کی خدمت میں شروع سے مفت نذر کر رہے ہیں، لیکن پھر بھی یہ حالت ہے کہ کسی بزرگ نے ابتک توسیع اشاعت کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ یہ تحریر شکایت پر مبنی نہیں ہے مدعا محض اظہار حقیقت ہے، خریداروں کی لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ ہر ماہ وی۔ پی بڑی تعداد میں واپس کر دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی عدم پابندی اشاعت کی شکایت فرماتے ہیں، ہماری یہ حالت ہے کہ تین برس سے ہر ماہ نقصان اٹھا کر رسالہ نکالتے ہیں اور پورے ہندوستان میں ایک ہستی بھی ایسی نظر نہیں آتی ہے جو ہماری زحمتوں کا اندازہ کر کے ہماری ذمہ داریوں کو ہلکا کر دے،

ہمارے لئے یہی ایک امر تسکین کا موجب ہے کہ رسالہ بند نہیں ہوا، جاری ہے، اور انشاءاللہ اس حالت میں بھی جاری رہیگا۔ اکتوبر، نومبر اور دسمبر کا رسالہ زیر طبع ہے، عنقریب حاضر ہوگا قارئین کرام اگر ایک مرتبہ بھی تھوڑی سی توجہ فرمائیں اور سال آئندہ کے واسطے اپنی خریداری کو قائم رکھیں اور صرف ایک ایک خریدار مرحمت فرمادیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ رسالہ ہمیشہ وقت پر شائع ہوتا رہے اور اُس کے معیار میں ترقی، اور دلچسپیوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے،

منیجر شمع

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

سخت تھا۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ "میجر منرو نے مالگذاری کے نرخ میں تو خاصی کمی کردی مگر جس سختی کے ساتھ اس نے تحصیل کا انتظام کیا اسکی بدولت آمدنی اسقدر بڑھ گئی کہ کبھی اس سے پہلے اتنی نہیں تھی۔"

یہاں پہنچکر ڈاکٹر نے جنوبی ہندوستان کا دورہ ختم کیا اور ۶ رجولائی ۱۸۰۱ء کو مدراس واپس پہنچ گیا۔ (باقی دارد)

غزل

(از نواب فصاحت گل جلیل مانکپوری)

میں ہوں قائل تری آنکھوں کی فسوں کاری کا
مست ہو کر یہ سبق دیتی ہیں ہشیاری کا

اس سے کیا بڑھ کے تمنائے شہادت ہو گی
آپ دیتا ہوں ثبوت اپنی گنہگاری کا

کسی واعظ کو جلیس اپنا بنالیتا ہوں
لطف آتا نہیں تنہا مجھے میخواری کا

سنتے ہیں باغ میں جس روز بہار آئی ہے
ہائے دن تھا وہی بلبل کی گرفتاری کا

اک خزانہ ہے تری نرگس فتاں کیا ہے
شوخی و مستی و چالاکی و عیاری کا

شیشۂ و جام جو ٹوٹیں تو نہیں کچھ پرواہ
ساقیا راز نہ پھوٹے مری میخواری کا

وہ شب وعدہ نہ آنا تھا نہ آئے تا صبح
خواب دیکھا کئے ہم بخت کی بیداری کا

لذت بیخودی عشق کوئی کیا جانے
بادہ خواروں سے مزہ پوچھیئے میخواری کا

مرغ تصویر پہ رشک آئے نہ کیوں بلبل کو
نہ رہائی کا جسے غم نہ گرفتاری کا

چشم بیمار تو ہر ایک سے ملتی ہے جلیل
ہم سے ملنے میں مگر عذر ہے بیماری کا

حصول مدد سے اجتناب

از حسن عابد جعفری صاحب، آکسن، بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر رسالہ "شمع"

دنیا میں غیور انسانی طبائع نے کبھی زیر بار احسان ہونا قبول نہیں کیا، اور اس کو ننگ انسانیت سمجھا، کچھ مغرب پر منحصر نہیں ہے، مشرق میں بھی خودداری ایک صفت تھی۔ اور بہت قدر کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اب ہندوستان میں خودداری کو زوال ہے، اور استادوں کا تو کیا ذکر ہے۔ ماں باپ بھی اپنی اولاد کو خوددار بنانے کی کوشش نہیں کرتے، وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے باپ خوددار نہیں ہیں،

سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ کامیابی اور ترقی کا انحصار زیادہ تر ذاتی توجہ اور کوشش پر ہے۔ "خودداری" کو کس طرح فروغ دیا جائے۔ ہمارے نوجوان عموماً عبرت کا مرقع نظر آتے ہیں۔ قدم قدم پر اُن کو سرپرست اور مربی کی ضرورت ہے، اور بات بات پر وہ سفارش کے لئے چاروں طرف دوڑتے ہیں۔ ایسے نوجوان دنیا کی کشمکش میں کبھی کامیاب ہو سکتے ہیں؟ ایسے نوجوان کبھی اپنی زندگیوں کو قابل فخر اور لائق رشک بنا سکتے ہیں۔

یہ انتہائی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے کہ ہمارے نوجوان امداد اور سفارش کی بھیک مانگنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے، میں اکثر سوچتا ہوں کہ جس ملک میں ایسے بے غیرت تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہوگی وہ ملک کیونکر ترقی کر سکیگا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو اس معاملہ میں مطعون کرنا عبث ہے، جو کام ہم اپنے گھروں پر انجام نہ دے سکے وہ غیر کیا خاک انجام دینگے اس ملک کے والدین کا فرض ہے کہ اپنی اولاد کو خوددار بنانے کی کوشش کریں، ورنہ اُن کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اولاد کی تعلیم میں کثیر روپیہ صرف کرنا محض روپیہ کی بربادی ہے۔

اسوقت ہمارا روے سخن اُنکی طرف ہے جو خواہ والدین کی غلطی سے، خواہ اپنی عقلمندی سے بُزدلی کا شکار ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے، اگرچہ بظاہر بیکارسی اور بے وقعت معلوم ہوتی ہے کہ اگر ہم اُس تمام وقت کو جو دوسروں سے امداد حاصل کرنے اور سفارشیں بہم پہنچانے میں صرف کرتے ہیں، اپنی مدد آپ کرنے میں صرف کریں تو ہم کو زیادہ فائدہ حاصل ہوگا، اور اگر ہم اپنی حالت پر قانع رہیں یعنی موجودہ حالت سے بہترین فوائد حاصل کرنے کی کوشش کریں اور زیادہ کی ہوس ترک کردیں تو ہماری مالی حالت بدرجہا بہتر ہوجائیگی، کیونکہ جو بات اپنے قبضہ میں نہیں ہے اسکے واسطے روح کو تحلیل کرنا اور اُسکے عدم حصول پر اپنی طبیعت کو جلانا سخت حماقت ہے۔ اگر ہم اپنے دل کو مضبوط کرکے اپنے ماحول پر نظر دوڑاویں اور پھر اپنی حالت کا اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ذراسی توجہ اور ذراسی کوشش سے، ہم اپنی زندگی کو زیادہ آسودہ بناسکتے ہیں اور اُن باتوں سے جو ہمارے قبضۂ قدرت میں ہیں ایسی اعانت اور مستقل امداد حاصل کرسکتے ہیں کہ ہماری زندگی کامیاب زندگی بن سکتی ہے۔

مجھے جب کبھی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جانیکا اتفاق ہوتا ہے۔ طلباء کی کثیر تعداد کو تعلیم میں مصروف دیکھکر میرے قلب کی حالت ناقابل بیان ہوجاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس کثیر جماعت میں ایک نونہال بھی ایسا ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کی خوبیوں سے واقف ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ دُنیا ایک زبردست بازی گاہ ہے اس میں وہی کامیاب ہوسکتے ہیں جو اپنے ہاتھ پیر چلاکر آگے بڑھنے کی ہمت رکھتے ہیں؟ میں مدرسہ کے لڑکوں سے، کالج کے نوجوانوں سے، فارغ التحصیل نونہالوں سے باربار دریافت کرتا ہوں کہ وہ تعلیم سے فارغ ہوکر کیا کرینگے؟ مجھے بتاسف اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہزار میں ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ میں دنیا میں داخل ہوکر [illegible] کر لڑائیاں لڑونگا اور فتحمند ہوکر کامیاب انسان بنونگا، یہ انکشاف ایک حقیقت ہے جس سے ہم منھ نہیں موڑ سکتے، اور نہ اس کو پس پشت ڈال سکتے ہیں۔

دفتروں میں مُحرر نالاں ہیں کہ ترقی نہیں ہوتی - ہماری کوئی بات نہیں پوچھتا، افلاس کے ہاتھوں زندگی حرام ہے، اگر یہ اللہ کے بندے ذرا غور کریں، اور اُن لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں جو اس دنیا میں نام آور اور دولتمند ہوئے ہیں تو اُن پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ وہ بھی انکی طرح ایک دن بے روزگار تھے، اور اُنکا بھی کوئی دستگیر اور مددگار نہ تھا، نہ اُنکے باپ مالدار تھے، اور نہ اُنکے عزیز او احباب بڑے آدمی تھے لیکن اُن کا دل غیور تھا اور وہ اپنی مدد آپ کرنا جانتے تھے، کیا انکی کامیاب زندگی کی داستانیں ہمارے مفلس اور بے سرمایہ نوجوانوں کیلئے شاہراہ کامیابی پر پہونچانے کیلئے کافی نہیں ہیں،

دنیا میں کامیابی نام ہے ذاتی ترقیوں کے مجموعہ کا - کامیابی ایک دن میں حاصل نہیں ہوتی، اور دنیا میں ایسی کوئی ہستی نہیں ہے جو ایک دن میں معراج ترقی پر پہونچگئی ہو، جبتک چھوٹے چھوٹے کاموں میں کامیاب ہونے کی قوت نہیں ہوگی، بڑے کام کیونکر اور کسطرح سر ہو سکیں گے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ دنیا کو الزام دیتے ہیں. اپنی ناکامیوں کی داستانیں رنگین الفاظ میں سُناتے ہیں، اور ان سب کا جوابدہ تقدیر کو قرار دیتے ہیں - بار بار کہتے ہیں کہ سب کچھ کیا مگر تقدیر کے آگے کچھ پیش نہ آئی، احباب کا گلہ ہے کہ مدد نہیں کرتے، جو دوستی کا دم بھرتے تھے وہی آنکھیں چراتے ہیں، کوئی مددگار نہیں، ہم ہیں اور ناکامی، گوشۂ تنہائی ہے اور تقدیر کا ماتم! اب یہ حالت ہے کہ ہمت شکستہ ہے، ہاتھ پیر چلتے نہیں، دماغ کام دیتا نہیں، طبیعت اُٹھتی نہیں، کائنات عالم میں ہمارے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آتی، اور ہر چیز میں ہم کو نقص نظر آتا ہے، البتہ جو چیز بے عیب نظر آتی ہیں وہ ہماری ذات پاک ہے، ہماری ہی ہستی بے عیب ہے، اور ہمارا کل ماحول بلکہ ہماری پوری دنیا عیب دار ہے، اور ہمارے ہی لئے آمادۂ پرخاش ہے! لیکن اگر توجہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ ہماری ناکامیابی کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے شکست کھا چکے ہیں۔

مدد یا اعانت فی نفسہ بُری نہیں - بیماری اور جسمانی تکلیف میں ڈاکٹر اور دوا کی مدد سے جسم کو آرام پہنچتا ہے بخار کی شدت اور کمزوری کی زیادتی میں تیمارداری ایک نعمت ہے۔ اور جب ہم

تنہا ہوں اور مصائب کا ہجوم ہو تو دوست کی صورت پریشانی کو رفع کر دیتی ہے۔ طبیعت میں عزم اور آگے بڑھنے کی خواہش ہو تو اپنی مرضی کے مطابق موقعہ ہاتھ آجانا بڑی بات ہے روپیہ کی طرف سے تنگی ہو تو بنک کے منیجر کا یہ وعدہ کہ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو بنک حاضر ہے ۔ دل کی پوری پوری تسلی کر دیتا ہے' اسی طرح دگدے کی حالت میں منجانب اللہ صحیح راستہ پر چل نکلنا رحمت ہی رحمت ہے ۔

لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے انسان ہی اپنا بہترین طبیب ہے، وہ ہی اپنا بہترین دوست ہے' اور وہ ہی اپنے واسطے بہترین مواقع پیدا کر سکتا ہے۔ وہ خود ہی اپنا منیجر ہے اور خود ہی اپنا پیغمبر اور ہادی ہے ۔

جس شخص نے اپنا پتہ لگانا' اپنا کام خود کرنا' اور اپنی طبیعت کو خوش رکھنا معلوم کر لیا تو سمجھئے کہ اُسکو بہترین راہبر مل گیا ۔

میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جب کبھی مجھے مدد ملی ہے مجھے اُسکی قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے، تمام دنیا کا یہی حال ہے ۔ اپنے کام کو اگر ہم خود کریں تو جلد ہو جاتا ہے اور اُس سوار کی طرح وقت ضائع نہیں ہوتا جو صرف نصف میل جانے کے لئے دو میل پیدل چلکر گھوڑے کو لایا تھا ۔

دنیا میں انسان کو عموماً تین باتوں کی خواہش ہوا کرتی ہے ۔ یعنی :-

(۱) اچھی حالت رہے' اور زیادہ خوشیاں نصیب ہوں ۔

(۲) موجودہ حالت سے بہتر اور افضل حالت ہو جائے ،

(۳) اچھی چیزیں ملیں اور بہ کثرت ملیں ۔

سب سے پہلے خواہش نمبر ایک کو لیجئے ۔ اگر دنیا کے قابل اور تجربہ کار ہستیوں کے اقوال اور تجربات پر اعتماد کیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ مسرت انسان کی اندرونی حالت کی بہتری پر منحصر ہوا کرتی ہے ۔ اور اس مسرت کو ثبات ہے ۔ موجودہ علماء نفسیاتی کا بھی یہی قول ہے' اور دنیا کے

مشہور مذاہب نے بھی اس کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ جبتک غذا ہضم ہو کر جزو بدن نہ بنجائے، بیکار ہے، اسی طرح دوسروں کے خیالات، تاوقتیکہ وہ تمھارے ذہن میں داخل نہ ہو جائیں، مفید نہیں ہوسکتے، موسیقی ہی کو لیجئے، آدمی ایکدن میں نہ گویا بن سکتاہے اور نہ ستار بجانے میں ماہر ہوسکتا ہے، اسی طرح کوئی ایسا چٹکلہ بھی نہیں بتا سکتا ہے کہ انسان کو یکایک مسرتیں حاصل ہو جائیں؛ عقل انسانی بازار میں فروخت نہیں ہوتی ہے، ترکہ یا وصیت کے ذریعہ سے دولت کا ملنا تو ممکن ہے لیکن عقل، کریکٹر اور سمجھ کا اسطرح پر حاصل ہونا ممکن نہیں، رہا سوال اپنی ترقی تو اس زینہ پر چڑھنا جب ہی ممکن ہے کہ انسان اپنے پیروں کو استعمال کرے۔ گیند کی طرح اُچھل کر چوٹی پر پہونچ جانا ممکن ہے، لیکن چوٹی پر جم کر قائم رہجانا اُسیکا کام ہے جو زینہ کی ایک ایک درجہ پر سنبھل سنبھل کر اور قدم جما کر چڑھتا ہوا چوٹی پر پہونچا ہے، لیکن کیا چوٹی پر پہونچنا ضروری ہے اور کیا بغیر اسکے انسان کامیاب نہیں ہوسکتا ہے! میرے خیال میں تو یہ جنون ہے کہ ہر شخص چوٹی پر پہونچنے کی دُھن میں گرفتار ہو جائے اگر جنگل میں درخت سب سے اونچا ہونے کی فکر کرے تو کیا نتیجہ ہو! اور کیا یہ ممکن ہے کہ پورے جنگل میں ہر درخت سب درختوں سے اونچا ہو معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی جگہ پر پہونچ جائے خواہ وہ جگہ اونچی ہو، درمیانی ہو یا نیچی، وہ اپنی جگہ پر بھی شہرت اور نام و نمود حاصل کر سکتا ہے اور جو شخص اپنے اوپر اعتماد کرتا ہے وہ اُسی جگہ کو قبول کرے گا جس پر وہ قائم رہ سکے، اور وہی اسکی اصلی جگہ ہے!

یہی حال مقبوضات کا ہے، ہم سب چاہتے ہیں کہ مالدار ہو جائیں، یعنی ایسی مالی حالت پر پہونچ جائیں کہ اگر کبھی بیمار ہو جائیں یا دنیاوی اتفاقات کے باعث چندے بیکار رہنا ہو تو ہمارا پس انداز ہمارے کام آئے۔ اور ہماری آمدنی ہماری مشکلات کو حل کرتی رہے، اور ہم کو در بدر نہ ہونا پڑے۔ اسی طرح دنیا کی اچھی چیزوں پر متصرف اور قابض ہو کر جو نیک نامی یا شہرت حاصل ہوتی ہے وہ بھی انسانی طبائع کو مرغوب ہے، لیکن قلب انسانی کو اوس مدیہ سے راحت ملتی ہے جو اُسنے اپنی قوت بازو سے کمایا ہے، دنیا میں ایسی مثالیں بکثرت ہیں کہ بغیر ہاتھ پیر

چلائے روپیہ ملگیا ہے، مگر ایسے لوگوں کو کبھی خوش نہ دیکھا، جیب میں روپیوں کی کھنکھناہٹ قلب کو عجب سکون پہونچاتی ہے بشرطیکہ وہ روپیہ آپ ہی کا ہو، اور آپ ہی نے اسکو پیدا کیا ہو اسی مسرت کو ثبات ہے،

امداد اور اعانت کی فکر میں رہنا طبیعت کو غمگین بنا دیتا ہے، وہ خوشی بھی کیسی ناپائدار اور بے ثبات ہے جسکا دار و مدار تقدیر یا دوسروں کی مرضی پر ہو، ممکن ہے کہ تقدیر بدل جائے اور احباب بھی اپنی فکروں میں ہم کو ذرا فراموش کر دیں لیکن اگر میری خوشی منحصر ہے میری قوت بازو پر، میرے طریق عمل پر، میرے خیالات پر، اور میرے فیصلہ اور میری قدرت نفس پر، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میری خوشی کو مجھ سے چھین کر لیجانے والا دنیا میں کوئی نہیں ہے، یہ وہ خزانہ ہے جسکو چوروں کا کھٹکا نہیں، اور یہ وہ دولت ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ لیکن دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اس راز سے واقف ہیں، اور اس مسرت سے اپنی زندگی کو سدا بہار بنانا چاھتے ہیں! اپنی ذات سے، بلا شرکت غیرے، مسرور اور بےغم ہو رہنا بھی عجیب نعمت ہے۔

امداد اور اعانت طبیعت کی اُپج کو ضائع کر ڈالتی ہے، حالانکہ انسان کی طبیعت کی اُپج ہی وہ چیز ہے جسکی انسان کو سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے،

کارخانوں میں ایسے آدمیوں کی مانگ ہے جن کو بتانے کی ضرورت نہ ہو، اور تجارت میں وہی فروغ پاتے ہیں جو دوکان کے سامان کو اپنے طور پر سمجھ کر فروخت کرتے ہیں، اور معاملات کو اپنے دماغ پر زور دیکر چلاتے ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی صفت اُپج ہے، اور جو لوگ اس کو ترقی دیتے ہیں وہی اپنے اوپر اعتماد کر سکتے ہیں۔

امداد اور اعانت کے خلاف ایک بات اور بھی ہے، یعنی یہ عادت دوستی کو منقطع کر ڈالتی ہے دوستوں کو منحرف کرنے کے لئے اس سے زیادہ سریع الاثر کوئی نسخہ نہیں ہے کہ اُن سے امداد طلب کیجائے اور اُنکو اپنی مصلحتوں اور سہولتوں کی خاطر "استعمال" کیا

جائے،

ہم خود ایسے لوگوں سے گریز کرتے ہیں جو ہر وقت ہماری امداد کے طالب رہتے ہیں اور اگر یہ واقعہ ہے تو ہمکو دوسرے کیوں منھ لگانے لگے! ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ دوست اُن پھولوں کی طرح ہیں جو باغ میں کھل رہے ہیں، اُن کو دیکھکر روح کو نشاط حاصل ہوتا ہے، اور اُن میں پھرنے سے طبیعت تازہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ پھول توڑنے کے لئے نہیں ہیں۔

میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جنکے دل میں دنیا سے سخت تنفر ہے اور اُنہوں نے اہل دنیا کے خلاف بغاوت مچا رکھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب وہ خوشحال اور فارغ البال تھے تو تو اُنکے احباب کا حلقہ وسیع تھا، لیکن جب پریشانیوں میں مُبتلا ہوگئے تو اُنکے احباب بھی رخصت ہوگئے۔

مگر میرا خیال ہے کہ انکا علاج یہی تھا، جو لوگ آسودگی کے زمانہ میں خوشامدیوں کے حلقہ کو دیکھکر خوش ہوں اور اُسکو اپنے ہمدرد اور سچے رفیقوں کی جماعت سمجھنے لگیں تو اس کے صاف معنی یہی ہیں کہ وہ خود بھی اُسی قماش کے انسان ہیں۔ دنیا میں دوستی نہایت پاکیزہ نعمت ہے، لیکن ایسی نازک بیل ہے کہ ذرا سے بوجھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

ہمارے بہترین دوست وہ ہیں جو نہ ہمکو قرض دیتے ہیں اور نہ ہم سے قرض مانگتے ہیں۔ وہ محض دوستی کی غرض سے محبت رکھتے ہیں اور اس وجہ سے نہیں ملتے کہ ہم اُنکے حق میں کیا کرتے ہیں۔

امداد کی طلب، طبیعت کی آزادی کو غارت کر دیتی ہے کیونکہ آزادی وہ بیش بہا جوہر ہے جسکی فضا میں روح بالیدہ ہوتی ہے۔

ہم بچوں کو اس سے بہتر سبق نہیں دیسکتے کہ وہ خود اعتمادی کو سیکھیں، ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بچوں کے ساتھ بہترین سلوک کریں اور اُن کو بہترین نعمتوں سے مالامال کر دیں لیکن کوئی سلوک اور کوئی نعمت وہ اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے سے زیادہ بیش قرار نہیں ہے۔ ہمارے

بچے اسکولوں میں جاتے ہیں اور وہاں سوائے ایک صفت کے اور سب خوبیاں حاصل کرتے ہیں یعنی اُن کو اپنی مدد آپ کرنیکا اصول نہیں سکھا جاتا، اگر ہم بچوں کو اُن کا سبق خود انہیں سے یاد کرائیں، اور اُن کو مدد نہ دیں، اور کھیل کے بعد اُن کو مجبور کریں کہ وہ اپنے جسم کو خود صاف کریں، بالوں میں برش کریں، اور اپنے کپڑوں کی آپ مرمت کریں اور اُن کو ابتدا ہی سے بتائیں کہ دوسرے سے اپنا کام لینے میں کیا روحانی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو یقین ہے کہ یہ بچے دنیا میں داخل ہونیکے لئے کافی طور پر تیار ہو سکیں گے۔ اور زندگی کو اچھی طرح بسر کرنے کے اہل ہو سکیں گے بچے اگر غلطی کریں اور اسپر شرمندہ ہو کر آزردہ ہوں تو ہرگز اُنکی آزردگی کو دور کرنیکی کوشش نہ کرنی چاہئے کیونکہ یہ ابتدائی سبق ہے اُن کو اپنے اوپر اعتماد کرنے اور آیندہ غلطیوں سے اجتناب کرنیکا۔

اکثر ایسے الفاظ سننے میں آتے ہیں "میں بہت کمزور ہوں، بالکل مجبور ہوں، مجھ میں مطلق طاقت نہیں ہے، دوسروں پر بھروسہ نہ کروں تو کیا کروں" اس قسم کے الفاظ بری عادت اور غلط تربیت کے شاہد ہوتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ جس شخص کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں وہ محض کمزور طبیعت کا آدمی ہے۔

پیار اور محبت میں بھی ہم کو اپنے اوپر اعتماد کرنیکی ضرورت ہے، اسی سے عقیدہ میں استواری اور ایمان میں سلامتی پیدا ہوتی ہے۔ ناکامیوں میں اگر دل قوی ہو تو حادثات واقع نہ ہوں، اور طبیعتیں غم کا شکار نہ ہو جایا کریں۔

مختصر یہ ہے کہ دنیا میں کوئی طاقت سوائے تمھاری طاقت کے نہیں ہے اور دنیا کا تمام علم و فن بیکار ہے، عبث ہے اور قابل نفرت ہے، اگر اس کے حصول سے تمھاری عقل کو ترقی نہ ہو، دنیا کی رونق اور دُنیا کی بہار اسی وقت تک ہے جبتک کہ تمھارے دل میں رونق اور بہار ہے، تمھارا خزانہ اور تمھاری دولت وہی ہے جو تمھاری مٹھیوں میں ہے، میں تو یہاں تک کہونگا کہ اگر تم خدا کے قایل ہو، اور یہ سمجھتے ہو کہ اُسنے دنیا کی اور تمھاری تخلیق کسی غرض

اور مصلحت سے کی ہے تو یہ تمہاری انتہائی کم ہمتی ہے اور ناقابل عفو گناہ ہے کہ تم خدا کی خدائی میں ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھے رہو، اور کمر ہمت باندھ کر اُسکی نعمتوں سے آسودہ نہ ہو سکو!

نینی تال

(از جناب مولوی سید محمد عبدالودود صاحب قدر بریلوی)

جناب اڈیٹر صاحب!

جناب مولنا کی یہ دلپذیر نظم جناب کی خدمت والا میں روانہ کرتا ہوں، امید ہے کہ آپ اسے شمع میں جگہ دینگے اور ناظرین اس سے لطف اندوز ہونگے۔ اس نظم کے متعلق جناب مولنا وحید الدین صاحب سلیم اپنے ایک گرامی نامہ میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

آپکی نظم نینی تال پہونچی۔ یہ نظم مجھے بہت زیادہ پسند ہے، پورا سین کھینچ دیا ہے، غالباً آپ میرے بعد وہاں گئے، افسوس ہے کہ اُس زمانہ میں مجھے اپنے ساتھ نہ لیگئے جبکہ میں بریلی میں تھا، آپکی یہ نظم نہایت عمدہ ہے، گویا میں حیدر آباد میں بیٹھا نینی تال کا نظارہ کر رہا ہوں۔ "حسن پر ہراس" کی داد کے لئے الفاظ نہیں ملتے، اسکے علاوہ آپکی دیگر تشبیہات بھی لاجواب ہیں، مثلاً دھوئیں کو "میخانۂ رواں" سے تالاب کو "کوہ قاف کی پریوں کے پنگھٹ سے"، بنگلوں کو انسان کے "گھونسلے" بتانا۔ پہاڑ کی چوٹیوں کو "صد دیو در بغل" کہنا۔ پائین کہسار کو "گہوارۂ اجل" بتانا۔ ... میں اگر نینی تال دیکھتا تو ایسی نظم نہ لکھ سکتا ... ... بہرحال آپکی یہ نظم تمام نظموں سے بڑھ گئی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ والسلام

وحید الدین سلیم

(پروفیسر) محمد عبدالشکور (ایم۔اے)

آنکھوں کی یہ بہشت، یہ نظارہ دیدہ زیب
منظر ہے نینی تال کا کیا کیا نگہ فریب

یہ حسن، یہ بہار، یہ کہسار و آبشار
یہ چیڑ کے درخت، یہ جنگل، یہ سبزہ زار

آب و ہوا میں تبت و پامیر کی نظیر

شادابیوں میں خطۂ کشمیر کی نظیر [1]

تالاب سے عیاں ہیں عجب دلفریبیاں | پابوس کو جھکی ہوئی بلسی کی ڈالیاں
آئینہ دیکھتا ہے کوئی بات بات میں | نظارۂ نامیہ کا ہے آب حیات میں

سرسبز جھاڑیاں ہیں کہ دامانِ گلفروش
رندوں کو کر رہی ہیں جو ایمائے نائو نوش

اس سر بلند کوہ پہ تالاب ؟! العجب ! | جس سے ہے سارے ہند میں یہ کوہ منتخب
دھندلا سا سطح آب پہ وہ عکس مرتعش | ذوقِ نظر کے واسطے سرمایۂ کشش
ظلماتِ سبز پوش میں آب حیات ہے | دجلہ کی کوئی شاخ کہ عین فرات ہے
پنگھٹ ہے کوہ قاف کی پریوں کا یا کہیں | جنت سے آگیا ہے کوئی جام زمردیں

ساغر چھلک رہا ہے یہ حسن و شباب کا
یا بھر کے رکھدیا ہے کٹورہ گلاب کا

رہ رہ کے اُٹھ رہا ہے پہاڑوں پہ جو دھواں | میخانۂ بہار ہے ہر سو رواں دواں
یہ لکۂ ہائے ابر تو آئے برس گئے | افسوس اُن پہ جو کسی شے کو ترس گئے

تا مختتم ترا کم ابر سیاہ ہے
دنیا میں ماہتاب کے یا داغ ماہ ہے

اونچی پہاڑیوں پہ یہ بنگلوں کے سلسلے | ہیں باغ کوہسار میں انساں کے گھونسلے
بجلی کے قمقمے ہیں یہ شبہائے تار میں | جگنو چمک رہے ہیں کسی مرغزار میں

ہر ایک ارتفاع یہاں دلنواز ہے | پستی ہر ایک یہاں کی سراپا نیاز ہے
ہر قلہ بلند ہے صد دیو در بغل | پائین کوہسار ہے گہوارۂ اجل

---

[1] بلسی نام درخت جسکی قطار تالاب کے کنارے سے ہے۔

تاریک سبزہ زار کا یہ حسن پر ہراس
اڑتے ہیں جسکو دیکھ کے انسان کے حواس

القصہ نینی تال ہمالہ کا پھول ہے
لیکن بغیر بادہ کے بالکل فضول ہے

ڈاکٹر ٹیگور کے فسانے کا ترجمہ

(۱)

دستبرداری

پھاگن کے مہینے کی شروع تاریخیں تھیں اور چاندنی نے اپنی نورانی چادر سے زمین و آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا - بہار شباب پر تھی - ہوا کے نرم جھونکے آم کے درختوں میں سے گذر کر ان میں لگی ہوئی کلیوں کی خوشبو چاروں طرف پھیلا رہے تھے - تالاب کے کنارے لگے ہوئے لیچی کے درخت میں ایک پپیہا پتوں میں چھپا سریلی آواز سے پی کہاں پی کہاں گا رہا تھا - اور اس کی آواز - مکرجی کے خاندان کے ایک ایسے کمرے میں جس کے رہنے والے باوجود اسقدر رات گذر جانے کے ابتک جاگ رہے تھے - بار بار آ رہی تھی - اس کمرے میں ہمنتا کبھی اپنی بیوی کے بالوں کی لٹ اپنی انگلی پر لپیٹتا تھا - کبھی اسکی چوڑی کو سونے کے کڑے کے ساتھ آہستہ آہستہ بجاتا تھا جس سے ہلکی ہلکی آواز پیدا ہوتی تھی - کبھی پھولوں کے ہار کو جو اُس کے سر سے لپٹا ہوا تھا پکڑ کر خفیف سی حرکت دیتا تھا اور چہرے پر لٹکتا چھوڑ دیتا تھا - اسکی حالت اسوقت شام کی چلنے والی اُس ہوا سے جو پھولوں سے لدے ایک درخت میں گذر کر اُس کو کبھی اِدھر جھکا دیتی ہو کبھی اُدھر - اس امید میں کہ اس کے خفتہ جذبات برافروختہ ہو جائیں - بہت مشابہ تھی - لیکن کلثوم اپنی جگہ بحس و حرکت بیٹھی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چاندنی کی بہار دیکھنے میں اسقدر محو تھی کہ اسے اپنے خاوند کی حرکات کی مطلق خبر نہ ہوئی - آخر کار ہمنتا نے اپنی بیوی کے دونوں ہاتھ پکڑ آہستہ سے ہلا کر کہا ”کلثوم - پیاری کلثوم - اسوقت تم کس بحر فکر میں غوطہ زن ہو - ایک بڑی دوربین بھی تم کو باوجود لگاتار جستجو کے اس جہاں کی حقیقت ایک ذرے

سے زیادہ نہیں بتا سکتی۔ تم اسوقت اپنے خیالات میں بہت دور نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ پیاری ذرا تو میرے قریب آجاؤ۔ دیکھو رات کس قدر پربہار ہے" کلثوم نے کھڑکی کے باہر سے نظر ہٹا کر اپنے خاوند پر ڈالی اور آہستہ سے کہا "مجھے ایک منتر آتا ہے جو ایک لمحے میں اس بہار کی رات اور چاند کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے" ہمنتا ہنسکر بولا "اگر تم کو ایسا منتر آتا ہو تو پیاری اسکو اپنی زبان پر مت لاؤ۔ لیکن اگر تمھیں کوئی ایسا منتر آتا ہو جو ایک ہفتہ میں تین یا چار اتوار کے دن لا سکتا ہو اور ان اتواروں کے دنوں کی راتوں کو دوسرے روز یعنی پیر کی شام کے پانچ بجے تک بڑھا سکتا ہو تو ضرور اسے پڑھو" یہ کہکر اس نے چاہا کہ اپنی بیوی کو اپنے قریب کھینچے۔ لیکن کلثوم قبل اسکے کہ وہ اُسے اپنی چھاتی سے لگاتا پھرتی کے ساتھ اسکی گرفت سے نکل گئی اور کہا "تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آج رات میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم کو اس راز سے آگاہ کر دوں جسے بستر مرگ پر ظاہر کرنے کی میں نے قسم کھائی تھی۔ میں یہ بھی تہیہ کر چکی ہوں کہ تم اسکی پاداش میں جو کچھ سزا مجھے دوگے اُسے نہایت خوشی سے برداشت کرونگی"

ہمنتا ہنسکر سزا کی بابت جے دیو کے اشعار میں سے ایک شعر پڑھنے ہی والا تھا کہ اسکو کسی کے سلیپر پہنے ہوئے جلد جلد کمرے کی طرف آنیکی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ وہ آواز اس کے باپ ہری ہر مکرجی کے چلنے کی تھی۔ ہمنتا اپنے باپ کے اتنی رات گئے اسطرح آنے کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسی وجہ سے وہ کچھ سٹ پٹا گیا۔

کمرے کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر ہری ہر نے کہا "ہمنتا۔ تم ابھی ابھی اپنی بیوی کو گھر سے باہر نکال دو" ہمنتا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا لیکن اُسکے چہرے پر گھبراہٹ یا تعجب کی کوئی علامت نہ پائی۔ اسکی بیوی نے اپنے منہ کو اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا اور اپنی روحانی طاقت کے ساتھ صدقِ دل سے چاہا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے مر جائے۔ پپیہا اپنی سریلی آواز سے اسی طرح گا رہا تھا اور اسکی آواز ہوا کے ساتھ کمرے میں آ رہی تھی۔ لیکن اب اسکو کوئی نہیں سن رہا تھا۔ کائنات کے کرشمے عجیب و غریب ہیں۔ لیکن افسوس یہاں کی ہر شے کسقدر

جلد فنا ہو جاتی ہے۔

(۲)

کمرے میں دوبارہ داخل ہونے کے بعد ہمنتا نے پوچھا "کیوں کیا یہ سچ ہے" کلثوم نے جواب دیا "ہاں"

"تم نے اس سے قبل مجھ سے یہ بات کیوں نہ کہی"

"میں نے اکثر مرتبہ کوشش کی لیکن ہمیشہ ناکامیاب رہی۔ میں ایک بدنصیب عورت ہوں"

"اچھا اب مجھے ہر ایک بات سچ سچ بتا دو"

کلثوم نے اپنے حالات نہایت دلیری سے سنائے اسکی آواز میں لغزش نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ برہنہ پا دہکتے ہوئے انگاروں پر سے نہایت استقلال کے ساتھ آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ اور کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ کس کس جگہ اسے چرکے لگے۔ اس کی کہانی کو آخر تک سننے کے بعد ہمنتا اپنی جگہ سے اٹھکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ کلثوم نے خیال کیا کہ اسکا شوہر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے پاس سے چلا گیا۔ شوہر کا یہ فعل اسے مطلق غیر معمولی نہیں معلوم ہوا۔ اسے اس واقعے کو روزمرہ کی زندگی کے ایک معمولی واقعے سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اسلئے کہ گذشتہ چند لمحوں میں اُسکے دماغ کی تمام قوتیں زائل ہو چکی تھیں۔ دنیا۔ محبت۔ اُسکے نزدیک دونوں نمائشی سراب تھے۔ شوہر کی محبت کو جو اُس نے شادی سے قبل اس سے ظاہر کی تھی اوّل اوّل قبول نہ کرنے کی یاد سے اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ گذشتہ ایام کی یاد نے اسکے غمزدہ دل پر اور بھی خنجرِ غم چلایا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ محبت جو ہمنتا کے رگ و پے میں اثر کر چکی تھی۔ جو اپنے ہمراہ اسقدر اشتیاق اور جذبات لائی تھی۔ جو ایک لمحے کی جدائی کو ناقابل برداشت اور تھوڑی سی دیر کی ملاقات کو از حد خوشگوار بنا دیتی تھی۔ جو اپنی وسعت میں لاحد اور قیام میں ازلی معلوم

ہوتی تھی۔ جس کے کبھی ختم ہونے کا خیال بھی نہ تھا۔ کیا یہی وہ محبت تھی۔ جہاں مذہب کے پیشوا نے نکاح کی گرہ لگانیکو اپنا ہاتھ بڑھایا اور تمھاری یہ ازلی محبت ایک دم خاک ہوگئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ہمنتا نے کہا تھا "کلثوم۔ دیکھو رات کسقدر پرلطف ہے" وہی رات ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہی پپیہا ابتک اپنی سریلی آواز سے گا رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے اسی طرح کمرے میں آکر چھپر کھٹ کے پردوں کو ہلا رہے تھے۔ کھڑکی سے باہر چمن میں چاندنی اُسی خوبصورتی کے ساتھ کھل رہی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا گویا کوئی عروس انتہائے خوشی سے تھک کر خواب راحت کے مزے لے رہی ہے۔

(۳)

دوسرے روز صبح ہی ہمنتا شب کو جاگنے کی وجہ سے تھکا ہوا پیارے شنکر گھوسل کے مکان پر پہنچا۔ اس کے چہرے سے اضطراب نمایاں تھا پیارے شنکر نے اسکو دیکھکر کہا "کہو بیٹا خیریت ہے" ہمنتا اس کے یہ الفاظ سنکر آگ بگولہ ہوگیا۔ غصے کو ضبط کرکے تھرائی ہوئی آواز سے کہا "تم نے ہماری ذات کو ناپاک کیا ہے ہم پر تباہی لائے ہو۔ لیکن یہ یاد رہے تمھیں اسکا مزا چکھنا پڑے گا" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اسکی آواز گلے میں اٹک کر رہگئی۔ پیارے شنکر نے مسکراکر طنزاً کہا "اور تم نے میری ذات کو برقرار رکھا۔ ناپاک نہیں کیا مجھے برادری سے نکالے جانے سے روکا اور میری پشت پر ہمدردانہ طریقے سے ہاتھ رکھا" ہمنتا کی اس وقت یہ حالت تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے برہمنی غصے کی آگ پیارے شنکر کو اسی وقت نیست و نابود کردے۔ لیکن اس آگ میں وہ خود ہی جلا جا رہا تھا۔ پیارے شنکر اس کے سامنے صحیح و سالم بیٹھا تھا۔

ہمنتا نے تھرائی ہوئی آواز میں ذرا زور سے کہا "کیا مینے کبھی تمھیں کوئی نقصان پہنچایا تھا"

پیارے شنکر نے جواب دیا "مجھے اس سے پہلے ایک سوال کا جواب دو۔ میری بیٹی۔ آہ میری اکلوتی بیٹی نے کیا تمھارے باپ کو کوئی نقصان پہنچایا تھا؟ جب کا میں ذکر کر رہا ہوں تم

اسوقت بہت چھوٹے تھے۔ اور شاید تم نے اس واقعے کو سنا بھی نہ ہو۔ اچھا اب مجھ سے سنو لیکن یہ خیال رہے کہ تم اس سے برافروختہ نہ ہو جانا۔ جو کچھ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اس میں بہت ظرافت ہے۔ اور تم اس کو سنکر ضرور محظوظ ہوگے"

تم چھوٹے ہی سے تھے کہ میرا داماد بنا کتنا میری لڑکی کا زیور چرا کر انگلستان بھاگ گیا تم کو یقیناً اچھی طرح یاد ہوگا کہ جب وہ پانچ سال بعد بیرسٹر بنکر واپس آیا تھا تو گاؤں میں ایک خاص شورش پیدا ہو گئی تھی۔ یا ممکن ہے تمھیں اسکی خبر نہ ہو کیونکہ ان دنوں تم کلکتے میں مدرسے میں تعلیم پا رہے تھے۔ تمھارے باپ نے جو خود کو برادری کا سردار کہتے تھے یہ حکم دیا کہ اگر میں اپنی لڑکی کو اسکے خاوند کے گھر بھیجوں تو پھر کبھی اسکو اپنے گھر نہ بلاؤں اور ہمیشہ کے لئے اس سے دستبردار ہو جاؤں۔ میں نے تمھارے باپ کے قدموں پر گر کر التجا کی اور کہا بھائی اس مرتبہ مجھے اس بلا سے بچا لو۔ میں اپنے داماد کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ وہ گئو ماتا کا گوبر نگل لے اور پرایاس چتم کی رسم کو ادا کرے۔ میرے حال پر رحم کرو اور اسکو پھر برادری میں داخل کر لو۔ لیکن تمھارے باپ نے میری اس عاجزی اور انکساری کی ذرا پروا نہ کی اور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ مجھے اپنی اکلوتی لڑکی کو جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں ہمیشہ کیلئے چھوڑ دینا گوارا نہ ہوا اور میں نے اپنے گاؤں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کلکتے کا رخ کیا۔ اور یہاں کی رہائش اختیار کی۔ قسمت کی گردش یہاں بھی ساتھ رہی اور تمھارے باپ نے میرا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا۔ یہاں جب اپنے بھتیجے کی شادی کا سارا سامان کر چکا تھا تو تمھارے باپ نے عین وقت پر لڑکی والوں کے خیالات کو میرے خلاف بھڑکایا اور یقیناً میرے داماد کا حال انھیں سنایا جس سے وہ لوگ اسقدر خائف ہوئے کہ میرے بھتیجے کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب یہ واقعہ اسطرح ظہور پذیر ہوا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے سچے دل سے قسم کھائی کہ جبتک میری رگوں میں برہمنی خون کا ایک قطرہ بھی باقی رہیگا میں تمھارے باپ سے اس ہتک کا بدلہ ضرور لونگا۔ میرا خیال ہے اب تو تم معاملے کو ایک حد تک ضرور سمجھ گئے ہوگے۔ لیکن ذرا ٹھیرو

جب میں اس تمام قصّے کو جو نہایت دلچسپ ہے بیان کر چکوں گا تو یقیناً تم اس سے مسرور ہو گے۔

جب تم کالج میں تعلیم پاتے تھے تو تمہارے مکان کے سامنے والے مکان میں ایک شخص بیراداس جیٹرجی رہا کرتا تھا۔ اُسکے مکان میں ایک نوجوان بیوہ جو ایک شریف کایستھ کی غریب یتیم لڑکی تھی رہا کرتی تھی۔ بیراداس کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ وہ لڑکی نہایت خوبصورت تھی اور بڈھا برہمن یہ چاہتا تھا کہ کالج کے طالب علموں کی بھوکی نظروں سے اس کے خداداد حسن کو بچائے رکھے۔ لیکن اس نوجوان لڑکی کے نزدیک اپنے بڈھے سرپرست کی آنکھوں میں خاک جھونکنا کچھ مشکل کام نہ تھا۔ وہ اکثر اپنے کپڑے جنھیں وہ دھو چکتی تھی سُکھانے کیلئے مکان کی آخری اونچی چھت پر چڑھا کرتی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی اپنی چھت پر مطالعہ کرنے کے لئے بیٹھنا بہتر اور آرام دہ سمجھتے تھے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم دونوں اپنی اپنی چھت پر سے ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے یا نہیں۔ لیکن اس نوجوان لڑکی کی حرکات سے بڈھے برہمن کو شک پیدا ہوا۔ وہ اکثر گھر کے ان فرائض کی جو اس کے ذمے تھے ادائیگی میں غلطیاں کرنے لگی اور پاربتی کی طرح جو اپنے محبوب کے تصوّر میں محو رہتی تھی اُسنے بتدریج کھانا پینا بھی ترک کر دیا۔ اکثر راتوں کو وہ اس شریف بڈھے کے سامنے بغیر کسی ظاہری وجہ کے زور زور سے رونے لگتی تھی۔ آخر کار بڈھے نے معلوم کر لیا کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو چھت پر سے بہت مرتبہ دیکھ لیا تھا۔ اور تم نے تو یہانتک کیا کہ کالج سے غیر حاضر رہنے لگے۔ دوپہر کے وقت تم کتاب ہاتھ میں لیکر اپنی چھت پر مطالعے کیلئے آ بیٹھتے تھے۔ یکایک تم تنہائی میں بیٹھکر مطالعہ کرنے کے اسقدر شائق ہوئے۔ بیراداس میرے پاس صلاح لینے آئے اور مجھ سے سب حال بیان کیا میں نے کہا "چچا۔ آپ عرصے سے اس بات کے متمنّی ہیں کہ بنارس جاکر جاترا کریں اس لئے مناسب ہے کہ آپ اب اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کریں اور وہاں چلے جائیں۔ اُس لڑکی کو آپ میری نگرانی میں چھوڑ جائیں۔ میں اسکی ہر طرح خبرگیری کرونگا۔

بیراداس اسکے بعد بنارس چلے گئے۔ میں نے اس لڑکی کو لاکر سری پتی چیٹرجی کے ہاں رکھا اور اُنکو اُس کا باپ مشہور کیا۔ اسکے بعد جو کچھ وقوع میں آیا تم خود جانتے ہو۔ میں آج تم سے تمام واقعہ اول سے آخر تک کہکر ایک بارِ گراں سے سبکدوش ہوا۔ یہ بالکل ایک فسانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کیا میں غلط کہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک کتاب کی صورت میں اس کو لکھوں اور اس کتاب کو چھپواؤں۔ لیکن تم جانتے ہو میں فسانہ نگار نہیں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میرا بھتیجا اچھا فسانہ نگار ہے میں اسے بلاکر کہوں گا کہ وہ اس فسانے کو میری خاطر سے لکھدے تاہم بہتر یہی ہوگا کہ تم اس سے مل لو تو واقعات کی صداقت تمہارے بیان سے صاف ظاہر ہو جائیگی کیونکہ اس فسانے کے خاتمے کا حال مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو"

پیارے شنکر کے آخری فقروں کو بغور سننے کے بدلے ہمنتا نے پوچھا "کیا کلثوم نے بھی اس شادی پر اعتراض نہیں کیا"۔ پیارے شنکر نے جواب دیا "اس بات کا پتہ چلانا ذرا مشکل ہے۔ بیٹا تم جانتے ہو عورتوں کے دماغوں کی ساخت قدرتاً کیسی ہے۔ جب وہ "نہیں" کہتی ہیں تو اس سے اُنکی مراد "ہاں" ہوتی ہے۔ نئے مکان میں تبدیل ہونے کے بعد اول اول چند روز وہ تم کو نہ دیکھنے کی وجہ سے تقریباً دیوانی ہوگئی تھی۔ تمہارا بھی یہی حال معلوم ہوتا تھا کیونکہ تم نے کسی نہ کسیطرح اُس کا نیا پتہ معلوم کرلیا اور گھر سے کالج جانیکے لئے نکلنے کے بعد تم راستہ بھول جاتے تھے۔ اور سری پتی کے مکان کے سامنے اکثر ٹہلا کرتے تھے۔ تمہاری آنکھیں حقیقت میں پریذیڈنسی کالج کی متلاشی نہیں معلوم ہوتی تھیں کیونکہ وہ ایک شریف شخص کے گھر کی سلاخدار کھڑکیوں کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھا کرتی تھیں جہاں کیڑوں اور نوجوان مردوں کے معشوقوں کی نگاہ سے گھائل شدہ دلوں کے علاوہ کسی کو باریابی نہیں ہوسکتی۔ میں تم دونوں کے لئے بہت کڑھتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ تمہاری تعلیم میں اسکی وجہ سے بہت حرج ہورہا تھا اور اسکے ساتھ ہی لڑکی کی حالت بھی تمہارے فراق میں قابلِ رحم تھی۔

ایک روز میں نے کلثوم کو اپنے پاس بلاکر کہا "بیٹی میری بات سنو میں بڈھا ہوں میرے سامنے تمھیں اپنا رازِ دل بیان کرنے میں شرم نہ کرنی چاہیئے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جسکو دل سے چاہتی ہو۔ اس نوجوان لڑکے کی حالت تمھارے فراق میں خراب ہے۔ کاش کہ میں تم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دینے میں کامیاب ہوتا۔ میرے اس کہنے پر یکایک وہ رونے لگی اور وہاں اٹھکر چلی گئی۔ اس روز کے بعد میں اکثر شام کو سری تپی کے ہاں جاتا اور کلثوم کو اپنے پاس بلاکر تمھاری بابت باتیں کرتا۔ اسطرح رفتہ رفتہ مینے اسکی شرم کو دور کر دیا۔ آخر کار ایک دن جب مینے اس سے کہا کہ میں تم دونوں کی آپس میں شادی ہو جانے کی کوشش کر دوں گا تو وہ بولی "یہ کسطرح ممکن ہے"، میں نے کہا "تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ میں تمکو ایک برہمن کی لڑکی کی طرح رخصت کرونگا" کافی سے زیادہ ردّ و بدل کے بعد اُسنے مجھ سے کہا کہ میں تم سے دریافت کر دوں کہ آیا تم بھی اس تجویز کو پسند کرتے ہو یا نہیں۔ اسپر مینے کہا "یہ فضول سی بات ہے کیونکہ نوجوان لڑکا فراق میں تقریباً دیوانہ ہو رہا ہے اُس کو ان پیچیدہ باتوں سے آگاہ کرنیکی کیا ضرورت ہے۔ شادی کی رسم ادا ہو جانے دو۔ اور پھر .. جو کام بطریق احسن انجام پاتا ہے بہت اچھا ہوتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جب اس راز کے افشا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تو اس سے کیا فائدہ کہ خواہ مخواہ ایک شخص کو زندگی بھر کیلئے ذلیل و خوار اور شکستہ دل کیا جائے"، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا میری اس تجویز کو کلثوم نے پسند کیا یا نہیں۔ لیکن اکثر وہ رویا کرتی تھی اور اکثر بہت ہی خاموش رہتی تھی اگر میں کہتا تھا "اچھا شادی کے معاملے کو جانے دو" تو وہ بہت بیچین نظر آتی تھی۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا تو مینے سری تپی کو تمھارے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ تم سے کلثوم سے شادی کر لینے کی بابت کہیں۔ تم نے بغیر سوچے سمجھے فوراً اس رائے سے اتفاق کیا اور ہر ایک بات طے پا گئی۔ شادی کی تقریب سے ایک روز پہلے کلثوم یکایک ایسی سرکش ہو گئی کہ اُسے اُسکے قول پر قائم رکھنے کیلئے مجھے بہت دقّت سے کامیابی ہوئی۔ وہ مجھ سے بار بار کہتی تھی "چچا۔ اس شادی کے معاملے کو جانے دو"، مینے ذرا ڈانٹ کر کہا "بیوقوف لڑکی

اسکے کیا معنی ہیں؟ ہم اب جبکہ ہر ایک تیاری کر چکے ہیں کس طرح شادی کو ترک کر سکتے ہیں۔ اُس نے عاجزی سے کہا "یہ مشہور کردو کہ میں مر گئی اور مجھے کسی اور جگہ بھیجدو"۔ مینے کہا "کہ اس خبر سے اُس نوجوان لڑکے کی کیا حالت ہوگی۔ وہ اِسوقت خوشی کے ساتویں آسمان پر ہے۔ اُسے امید ہے کہ کل اُسکی دیرینہ آرزوئیں پوری ہونگی آج تم یہ چاہتی ہو کہ میں اُسے تمہارے مرنے کی خبر سناؤں اِسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کل اس کے مرنے کی خبر تم کو سنانی پڑیگی اور کل شام ہی تک تمہارے مرنے کی خبر لوگ مجھے سنائیں گے۔ بیٹی کیا تم خیال کرتی ہو کہ میں اس بڑھاپے میں ایک برہمن کے لڑکے اور ایک لڑکی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر اور گنہگار بنوں، آخر کار شادی کی تقریب نیک گھڑی مبارک ساعت سرانجام پائی۔ اور میں اس عظیم الشان فرض سے جو میرے ذمے تھا سبکدوش ہوا۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا مجھ سے بہتر تم جانتے ہو"

ہمنتا تھوڑی دیر چپ رہکر بولا "کیا تم اس ناقابل اندمال زخم لگانے کے بعد بھی اپنے انتقام کے جذبے کو نہیں روک سکتے تھے۔ تم نے یہ تمام راز مجھ سے اب کیوں کہا اس سے پہلے کیوں نہیں بیان کیا"

پیارے شنکر نے نہایت اطمینان سے کہا "جب مینے دیکھا کہ تمھاری بہن کی شادی کا تمام سامان ہوگیا تو اپنے دل سے کہا "کہ میں نے ایک برہمن کی ذات کو اپنا فرض انجام دینے اور قسم پورا کرنے کی غرض سے ناپاک کیا لیکن اب ایک اور برہمن کی ذات معرض خطر میں ہے۔ اور اب صرف میرا ہی فرض ہے کہ اُسکو اس خطرے سے بچاؤں۔ پس میں نے لڑکے والوں کو لکھا کہ میں یہ اچھی طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ تم (ہمنتا) نے ایک شودر کی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے"

ہمنتا نے اپنے غصے کو بہت مشکل سے روک کر کہا "اب اس لڑکی کا کیا انجام ہوگا جسے میں اب اپنے گھر سے نکال دونگا کیا تم اُس کو اپنے پاس رکھو گے اور اسکے کھانے وغیرہ کے کفیل ہوگے"

پیارے شنکر نے آہستہ سے کہا "میرے ذمّے جو فرض تھا میں اسے انجام دے چکا۔ یہ میرا فرض نہیں کہ دوسروں کے گھر سے نکالی ہوئی بیویوں کی خبر گیری کروں۔ کوئی حاضر ہے۔ دیکھو ہمنتا بابو کیلئے ناریل کا شربت برف ڈال کر گلاس میں لاؤ اور تھوڑے سے پان بھی لاؤ۔"

ہمنتا فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بغیر اس نفیس تواضع کا انتظار کئے وہاں سے روانہ ہوگیا

(۴)

قمری مہینے کی انیسویں (۱۹) تاریخ تھی۔ رات نہایت تاریک تھی ہر طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ کسی پرندے کے گانے کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ سب آرام سے اپنے گھونسلوں میں بسیرا لے رہے تھے تالاب کے کنارے لیچی کا درخت سیاہی مائل زمین پر ایک بڑا سیاہ دھبّہ معلوم ہوتا تھا۔ جنوبی ہوا اس تاریکی میں نہایت زور کے ساتھ درختوں میں سے اسطرح گزر رہی تھی جیسے کوئی شخص خواب میں نہایت تیزی کے ساتھ اپنے دشمن کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو۔

آسمان کے شب بیدار سپاہی (تارے) اس تاریکی میں نہایت غور سے بغیر آنکھیں بند کئے چاروں طرف اس امید میں دیکھ رہے تھے کہ شاید کائنات کا کوئی سربستہ راز اُن پر آشکار ہو جائے۔

ہمنتا کے کمرے میں بالکل تاریکی تھی۔ وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پلنگ پر بیٹھا باہر کی تاریک فضا کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی کا عالم تھا۔ کسُوم دونوں ہاتھوں سے اُسکے پاؤں پکڑے اور اُنپر اپنا خوبصورت چہرہ رکھے فرش پر لیٹی تھی۔ صفحۂ عالم پر اس ازلی رات کو مصوّر تقدیر نے صرف ایک ہی تصویر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھینچی تھی۔ ہر طرف خوف ہراس کا عالم۔ بیچ میں جج۔ اسکے پاؤں پر پڑا ہوا ملزم۔

سلیپروں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ کمرے کے دروازے کے قریب آکر ہری ہر مکرجی نے کہا "تم کو غور کرنے کیلئے بہت وقت مل چکا ہے۔ میں اب اس سے زیادہ ایک منٹ بھی تم کو غور کرنے کیلئے نہیں دونگا۔ اپنی بیوی کو فوراً گھر سے باہر نکال دو۔"

کلثوم نے جب یہ الفاظ سنے۔ نہایت جوشِ محبت اور عقیدت سے اپنے خاوند کے پاؤں کو اپنے سینے سے لگایا۔ اُن پر بوسے دئے۔ احترام کے ساتھ اپنی پیشانی اُن پر رکھکر پھر الگ ہوگئی۔ ہمنتا پلنگ پر سے اٹھا اور دروازے کے پاس جاکر کہا "محترم باپ میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا"

ہری ہر نے چلاّ کر کہا "کیا کہا۔ جناب کیا اپنی ذات کو ناپاک کروگے"

ہمنتا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "مجھے ذات پات کی مطلق پروا نہیں"

"اچھا تو پھر میں تم کو ہمیشہ کے لئے چھوڑتا اور تم سے دستبردار ہوتا ہوں"

سید مصطفےٰ میرزا شریر

غزل

(از جناب نواب میر عباس حسین خانصاحب بزم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رائچور علاقہ سرکار نظام)

جھوٹ ہی سمجھو بیان دردِ دل | سن تو لو تم داستانِ دردِ دل
مٹ گئے ہم انتہا تھی سے ساتھ ہی | مٹ گیا نام و نشانِ دردِ دل
یہ نہ سمجھو دل لگی کی بات ہے | دل دُکھا دیگا بیانِ دردِ دل
دیکھنا ہے کسقدر اسکا ہے زور | آج لونگا امتحانِ دردِ دل
آپ بلوا کر کبھی مجھ سے سنیں | ہے مزے کی داستانِ دردِ دل
جو کوئی جانے وہ اسیر جان دے | راز ہے پنہاں میانِ دردِ دل
دیکھئے لیتا ہے کون اس جنس کو | کھولتے ہیں ہم دکانِ دردِ دل

داد میرے ضبط کی دیتا ضرور
بزم گر ہوتی زبانِ دردِ دل

"وہ مسیح نام مگر جسکو دیکھئے بیمار"

(از رئیس المتغزلین حضرت صدق جائسی)

ذیل کی نظم میں حضرت صدق نے ایک غارت گرِ صبر و قرار کے عنفوان شباب کی دلکش تصویر اپنے تخیل کی رنگینی سے ایسے سادہ اور پُر اثر الفاظ میں کھینچی ہے۔ جسکی نظیر موجودہ دَور کے شاعری ڈھونڈھے نہیں ملتی۔

صبا خرام مگر ایک دل شگفتہ نہیں
مسیح نام مگر جس کو دیکھئے بیمار (ریا)

جمال وہ کہ پڑے جس پہ لاکھ بار نظر
کمال یہ کہ رہے پھر بھی حسرت دیدار

ان اشعار میں جو چلتا ہوا جادو موجود ہے۔ اُسکا صحیح اندازہ کچھ صاحبانِ ذوق ہی کر سکتے ہیں سادگی اور بندش کی خوبی جسے اساتذۂ سلف جانِ تغزل سمجھتے تھے اس نظم میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت صدق کے اشعار بے تکلف زبان زد خواص و عوام ہو جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں تو اس نظم کی تمام خوبیاں جس حسین و جمیل ہستی پر ہو بہو صادق آتی ہوں۔ اُس غیرت ماہ کو بجا طور پر انسانی تخیل کا ایک آئیڈیل کہا جا سکتا ہے۔

(عزیز احمد خاں بی۔اے۔ از حیدر آباد دکن)

بچے مژہ سے تو چھوٹے نہ اُس نگہ سے شکار
نہ ہو جو تیر کی زد پر تو مار لے تلوار

کہیں گئی ہے وہ خالی منچی ہوئی ہو جو چوٹ
خطا نشانہ نہ ہو کیونکر جو ہاتھ ہو تیار

نکھار پر ہے فسوں کارِ دلبری کا چمن
بہار پر ہے جفا کارِ حسن کا گلزار

دکھائیں رُخ تو تڑپ جائے شیشۂ حلبی
سونگھائیں زلف تو پانی ہو خون مشک تتار

ہلائیں ہونٹھ تو بول اُٹھے طائرِ تصویر
ملائیں آنکھ تو سو جائے فتنۂ بیدار

ملے نگاہ تو سرمایۂ حیات ملے
پھرے نگاہ تو ہو جائے زندگی دشوار

اُٹھیں جگہ سے تو فتنے ہزار ساتھ اٹھیں
چلیں ادا سے تو محشر بپا کرے رفتار
کھنچیں بہ ناز تو غم مول لیجئے بہ خوشی
ملیں بہ لُطف تو دل نذر کیجئے ناچار
صبا خرام مگر ایک دلِ شگفتہ نہیں
مسیح نام مگر جس کو دیکھئے بیمار
جمال وہ کہ پڑے جس پہ لاکھ بار نظر
کمال یہ کہ رہے پھر بھی حسرتِ دیدار
مقدر اُس کا دِلائیں اُمید وصل جسے
نصیب اُسکے کریں جس سے وعدۂ دیدار

جو آستاں پہ ہیں اُنکے تو مرتبے ہیں بڑے
اُنھیں ہے ناز جو ہیں زیر سایۂ دیوار

سُرخ افواج

(از جناب سید حسن زاہد صاحب جعفری)

سوویٹ یعنی "سُرخ افواج" کا تبصرہ لکھنے سے قبل ۱۹۱۷ء میں روسی افواج کی حالت کا اندازہ لگانا ضروری ہے، اُسوقت جنگ عظیم میں کل روسی میدان جنگ کا نقشہ بدل چکا تھا اور جرمنی کی کرشمہ سازیوں اور انقلاب پسندوں کی بے اعتدالیوں سے روسی فوج صفحۂ دنیا سے کالعدم ہو چکی تھی۔ بارہ مہینہ تک روس میں فوج کا پتہ نہ تھا! اگرچہ کہنے کو دس لاکھ سپاہی موجود تھے، مگر ماتحتی اور احکام کی پابندی کا اُن سے واسطہ نہ تھا، ہر سپاہی خود مختار اور آزاد تھا، افسران فوج محض نمائشی تھے، اور اُنمیں سے قتل اور جلاوطنی سے جو بچ رہے تھے۔ اُنکا وجود سپاہیوں کی مہربانی کا ممنون تھا! سامان جنگ کی قلت کا یہ حال تھا کہ پانچ سپاہیوں میں سے ایک بھی پوری طرح تیار نہ ہو سکتا تھا!

جسوقت ٹروٹسکی نے رعایا کے محکمۂ جنگ کو اپنے ہاتھوں میں لیا روس بغاوت کا دہکتا ہوا تنور تھا! قواعد کبھی نہ ہوتی تھی۔ اُنکی جگہ سیاسی جلسوں نے لے رکھی تھی۔ چرب زبانی اور ڈھٹائی، ذاتی ترقی کا ذریعہ تھیں، اور ہر طرف بالشوی پروپیگنڈا کا بازار گرم تھا!

ٹروٹسکی اور اُسکا طرز عمل ہر چند قابل اعتراض سہی، لیکن اُسکی اعلی انتظامی قابلیت خداداد ذہانت، اور بے نظیر صفت حکومت کو تسلیم کرنا پڑیگا۔ اُسنے قلیل مدت میں انتہائی بدنظمی کو قابل اعتبار انتظام کی حالت پر پہونچا دیا، چنانچہ اُسکا اُسنے پہلا کام یہ کیا کہ شاہی افواج کے تمام سرداروں کو جدید حکومت سے یکدم وابستہ کر لیا، یہ کامیابی کسطرح اور کیونکر حاصل ہو گئی، ابھی تک معمہ ہے جسکو باوجود کوشش کے اہل یورپ حل نہیں کر سکے ہیں!

ٹروٹسکی نے اگرچہ روسیوں کے دلوں میں ڈر اور خوف پیدا کر دیا تھا، مگر کوئی صاحب فہم ماننے کے لئے آمادہ نہ ہوگا کہ شاہی افواج کے سردار، جو سرفروشی اور جانبازی میں کسی سے پیچھے نہ تھے، خوف زدہ ہو کر جدید نظام حکومت کے طرفدار ہو گئے، بہرکیف حقیقت حال کچھ ہو، امر واقعہ یہ ہے کہ جدید سرداروں میں ایسے لوگ بھی بہ کثرت شامل تھے جو فوج سے تعلق نہ رکھتے تھے، مگر انقلابی تحریک میں پیش پیش تھے، فوج میں انقلاب پسندوں کے داخلے نے خاص سہولتیں پیدا کر دیں، اور وہ زبردست جماعت جو سرخ فوج کے نام سے مشہور ہوئی، عالم وجود میں آگئی، اس کی ترتیب اگرچہ شاہی افواج کے اصول ترتیب کے مطابق عمل میں آئی۔ مگر جنگ عظیم کے تازہ تجربات کی بناء پر بعض اہم اصلاحیں بھی داخل تھیں،

احکام کی پابندی کے قاعدوں سے افواج کو رفتہ رفتہ مانوس کیا گیا، یہانتک کہ ۱۹۲۱ء کے قانون کے بموجب، بعض فوجی عدول حکمی کی سزا، موت قرار پائی اور چونکہ بہت بڑی فوج کو قائم رکھنے میں نہایت کثیر اخراجات ہوتے تھے، اس لئے ضروریات ملک کے اعتبار سے بڑی فوج رکھ لی گئی اور ماباقی سپاہیوں اور سرداروں کو غیر معین میعاد کی چھٹی دیکر رخصت کر دیا گیا، اس طریقہ سے شمار کے اعتبار سے فوج کی طاقت نصف رہگئی، لیکن باقاعدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر سامان جنگ کی فراہمی کے باعث اُسکی جنگ آزما صفات میں حیرت انگیز ترقی ہوگئی، گویا بیک وقت ٹروٹسکی کو غیر قابو یافتہ جم غفیر سے نجات ملگئی اور موجودہ سامان حرب و دیگر سامان متعلقہ جنگ، جو اُسنے فراہم کیا تھا، باقی ماندہ مگر چیدہ فوج کو دنیا کے سامنے باترتیب اور قابل اعتماد فوج کی حیثیت سے پیش کر سکا۔

ممالک غیر سے سامان حرب اور متعلقہ سامان کی خریداری کا سلسلہ نہایت نازک اور مشکل تھا، خود روس میں اسلحہ ساز اور گولہ بارود بنانے کے بڑے بڑے کارخانہ موجود تھے، لیکن انقلاب کے ہاتھوں اُنکی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اگر اُنکو از سر نو

قائم کرکے چلانے کی کوشش کیجاتی تو سویٹ حکومت کو وہ اقتدار ہرگز حاصل نہ ہوتا جو آج اُسکے حصہ میں ہے، مجبوراً جرمن سرحد پر جرمنوں سے رائفل، مشین گن، گولے، توپیں، کارتوس، باروت وغیرہ وغیرہ کے وہ ذخائر پوشیدہ طور پر خریدے گئے جو جنگ عظیم سے بچ رہے تھے۔ دیگر دول یورپ نے بھی اسلحہ وغیرہ فروخت کئے، بلکہ ایک یورپ کی طاقت نے تو جوش میں آکر روسیوں کو کثیر تعداد میں اسلحہ بہم پہونچادئے۔ لیکن اب اُنکی بڑھتی ہوئی طاقت اور اُنکے خوفناک کارناموں سے خود مضطرب ہے، اس عرصہ میں خاص روسی اسلحہ ساز کارخانے بھی اپنی اصلی حالتوں پر پہونچ گئے ہیں اور تین سرکاری، اور گیارہ نیم سرکاری کارخانے رائفل، مشین گن، اور ہلکے اور بھاری ہتیار بنانے میں مصروف ہیں۔

روس کے اسلحہ کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے، لیکن چونکہ اُسنے ممالک غیر سے اسلحہ کی خریداری بہت کم کردی ہے اسلئے بجا طور پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ خود روس ملکی اسلحہ سازی کی بنا پر ممالک غیر سے بے نیاز ہوچکا ہے، دو سال قبل ٹروٹسکی نے مفصل اعلان کے ذریعہ سے اسلحہ سازی کو تجارتی اصول پر امداد پہونچانیکا ارادہ کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکیم جاری ہوگئی، حکومت نے گولہ باروت کے کاموں کو ترقی دینے کے لئے عمارتوں میں اضافے کئے۔ اور ماہرین کیمیا کو سرکاری وظائف دئے گئے تاکہ وہ باروت، غاس، اور بھک سے اُڑجانے والے مسالوں میں نئی باتیں پیدا کریں۔

شہر ماسکو میں ایک بڑا کارخانہ، آہن پوش توپ خانوں بنانے اور اُنکی مرمت کرنیکے لئے قایم ہوا ہے۔

تیرہ کروڑ تیس لاکھ قابل جنگ آبادی کے ہوتے ہوئے سوئیٹ حکومت کو اپنی موجودہ فوج پر جسکی طاقت چھ لاکھ مسلح سپاہی ہے، کافی اطمینان ہے، اس تعداد میں دو تہائی تو حقیقت میں بہترین فوج شامل ہے، اور تین سال کی تربیت یافتہ ہے! مابقی ایک تہائی فوج کی دو سالہ تربیت ہے۔ اور وقت ضرورت اسکو فوراً میدان میں لاسکتے ہیں! قیاس ہے کہ

آئندہ چار برس میں اوسکی فوجی طاقت دس لاکھ سپاہ ہوگی جو فوراً میدان میں داخل ہوسکے گی، دنیا کے طریق ترتیب سے مختلف، مگر قابل تعریف سوئٹ طریقہ ہے، یعنی افسروں کی تعداد کا تناسب دیگر دول یورپ سے زیادہ ہے، تاکہ ضرورت کے وقت افسروں کی کمی واقع نہ ہو، فوجی نقطۂ نظر سے یہ ایک جدت ہے، اگرچہ خرچ طلب ہے۔

برّی افواج کی اصلاح اور ترتیب سے مطمئن ہونیکے بعد سوئٹ حکومت نے بحری افواج کی طرف توجہ کی، یہاں بھی طوفان بے تمیزی کا زور و شور تھا، اور عرصہ تک خود مختار رہنے کی وجہ سے بحری سپاہی اپنی مرضی کے مطابق زندگیاں بسر کرتے تھے، پرانے افسروں کی بڑی تعداد کو ظالمانہ طریقے سے قتل اور ذبح کرکے اُن لوگوں نے آپس میں افسروں کا انتخاب کرلیا تھا۔ جدید افسر برائے نام حاکم تھے، اور ہر معاملہ میں بحری سپاہیوں کے تابعدار تھے اور ہر وقت معطل اور برخواست ہوجانے کے خلفشار میں گرفتار رہتے تھے، بحری سپاہ کی حالت قابل افسوس تھی، سپاہی کاہلی اور عیاشی میں مُبتلا تھے اور جہاز زنگ آلودہ ہوکر صرف ایندھن کے مصرف کے رہگئے تھے، سوئٹ گورنمنٹ نے بار بار احکامات جاری کئے کہ بحری بیڑوں کی نمائش کیجائے، مگر سپاہیوں میں ایسی خود سری تھی کہ کسی حکم کی کبھی تعمیل نہ کی، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں ٹروٹسکی نے جب بیڑہ کو سامنے لائے جانے پر اصرار کیا تو جواب ملا کہ جہازوں میں کوئلہ ڈالنے والا کوئی نہیں ہے جو لوگ اس خدمت پر پہلے مامور تھے وہ اب انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کا ذلیل کام آزاد روسی باشندوں کے شایان شان نہیں ہے۔

مارچ ۱۹۲۱ء میں یہ خود مختاری نہایت خوفناک صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور بیڑہ بالٹک نے قلعہ کرونسٹاٹ کی مدد سے کھلم کھلا حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ ماسکو سے بغاوت کے دفعیہ کا حکم جاری ہوا۔ مگر بحری سپاہیوں نے اسکو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ فن لینڈ کے ایک تماشائی نے لکھا تھا کہ بحری سپاہیوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ حکومت کو

اُنہیں نے قائم کیا ہے لہذا ان میں یہ طاقت اب بھی موجود ہے کہ حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکدیں اس حکومت نے امن چین کی بجائے ملک میں فتنہ و فساد برپا کردیا ہے پہلے جہاں اطمینان تھا وہاں اب اضطراب اور بےچینی رونما ہے۔ ہمارے شریک حال اور لوگ بھی ہیں۔ جو بےچینی کی وجہ سے ہر وقت حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہیں"

نتیجہ یہ ہوا کہ منتظم شعبہ حکومت اور بحری بیڑہ میں سخت کشیدگی پیدا ہوگئی اور اس میں کلام نہیں کہ ایک ہفتہ تک بولشوی تحریک انتہائی خطرہ میں مبتلا رہی۔ کرونسٹاٹ کے اہل قلعہ کی قطعی رائے تھی کہ برف کے اوپر سے گذر کر اور سے نیم بام پر قبضہ کرلینا چاہیے کیونکہ وہاں کے رہنے والے باغیوں سے ہمدردی رکھتے تھے، اور پھر وہاں سے بڑھکر لیننگراڈ کو فتح کرکے آزادی کا اعلان کردیا جائے۔ اگر یہ طریق کار اختیار کیا جاتا تو اسکا کیا نتیجہ نکلتا؟ صحیح طور پر رائے زنی کرنا دشوار ہے مگر شکر ہے کہ یہ اسکیم عمل میں نہ آئی اور باغیوں نے اپنے آپ کو کرونسٹاٹ کے قلعہ میں جو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا بند کرلیا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے قلعہ کا توپ خانہ لگالیا۔ اِدھر حکومت نے تاخیر کو مضر خیال کرکے افواج کو ٹروٹسکی کی سرکردگی میں جمع کرلیا اور فوراً حملہ آور ہونیکا تہیہ کرلیا۔ اور قلعہ کے گرد برف کی موجودگی کو غنیمت سمجھکر قلعہ پر حملہ کردیا باغیوں نے دل کھول کر مقابلہ کیا۔ لیکن پہلی خندقوں کے نکلجانے کے بعد اُنکی ہمتیں پست پڑ گئیں اور وہ برف پر ہوکر فن لینڈ کو بھاگ گئے۔ جو باقی رہے گرفتار ہوئے۔ اور کتوں کی موت گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔

میدان فتح کرکے ٹروٹسکی نے بحری قوت کو درست کرنے کیلئے وہی طریقے اختیار کئے جو بری طاقت کے سنبھالنے میں استعمال ہوئے تھے۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا ناقابل افسروں کی کثیر جماعت برطرف کیگئی اور سپاہیوں کو صاف الفاظ میں متنبہ کردیا گیا کہ احکامات حکومت کی خلاف ورزی کی سزا موت دیجائیگی سرخ فوج کے معتبر سپاہی مسلح کرکے ہر جہاز پر تعینات کردئیے گئے تاکہ عدول حکمی کے ارتکاب کا خدشہ مٹ جائے۔

ماہرین کی کمیٹی بنائی گئی تاکہ ہر جہاز کا جائزہ لے، اور بندرگاہ اور کنارے کے ضروری مقامات کی پوری درستی اور مرمت کردی گئی کاہل اور ناقابل آدمیوں کو نکالدیا گیا اور زیادہ تنخواہ دیکر ہوشیار اور واقفکار انجنیر اور میکانک مقرر کئے گئے اور اسطرح پر تھوڑے عرصہ میں بحری طاقت بھی سرسبز ہوگئی۔

خاص خاص جنگی جہازوں کو سمندر میں لاکر اور اُن پر سوئٹ حکومت کا جھنڈا بلند کرکے بالٹک میں گشت کرایا گیا، اگرچہ ان جہازوں میں گولہ باروت موجود نہ تھا لیکن انکو دیکھتے ہی بالٹک کے کنارے کی بہکی ہوئی ریاستیں مرعوب ہوگئیں اور یہی حال فن لینڈ کا ہوا۔ سوئٹ بحری بیڑے کی ترقی کے افسانے ہر جگہ پھیل گئے اور شہرت ہوگئی کہ جرمن بحری افسر اور انجنیر سوئٹ حکومت کی ملازمت اختیار کرکے بیڑہ کو اور زیادہ درست کررہے ہیں، جرمن افسر اب بھی روسی ملازم ہیں مگر تعداد میں کم ہیں کیونکہ تنخواہیں قلیل ہیں اور روسی مزدور اُنکے مخالف ہیں۔ جہانتک شہادت ملسکتی ہے روسی بری اور بحری طاقتوں کو ترقی دینے میں جرمنی نے کوئی کارنمایاں خدمت انجام نہیں دی ہے۔

سوئٹ حکومت کا باعث کئی بڑے اور مسلح جہاز اور ٹارپیڈو ہیں۔ غرضکہ روسی بیڑہ کافی طور پر مضبوط ہے۔ اور یورپ کے دول کے درمیان میں اعتدال قائم رکھنے کی قوت رکھتا ہے ۱۹۲۵ء میں سولہ روسی جہازوں کا بیڑہ بالٹک میں نمودار ہوا اور پندرہ دن تک نشانہ بازی کی مشق کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روسیوں کے پاس سامان جنگ وافر ہے۔ بحری جنگ کا علم اور فن بہت پیچیدہ ہیں۔ اور معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کم ازکم دو ہزار تعلیم یافتہ اور ماہرین فن افسروں کی موجودگی میں بحری بیڑہ باقاعدہ لڑسکیگا، لیکن اسوقت سوئٹ حکومت کے پاس صرف تین سو ماہر افسر ہیں! حکومت ان خامیوں سے واقف ہے اور پوری توجہ سے اصلاحات میں مصروف ہے۔ دریں حالات روسی بیڑا ایسی طاقت نہیں ہے کہ اسکو نظر انداز کردیا جائے۔ جدید جہاز بسرعت بن رہے ہیں اور وہ تمام طریقے اختیار کئے جارہے ہیں جو

روسی بیڑہ کو بہت جلد قابل اعتماد بنا سکیں۔ یورپ کی ہر طاقت آجکل جہاز سازی میں منہمک ہے۔ جاپان کا بھی یہی حال ہے۔

رسالہ نائن ٹینتھ سینچوری میں روس کی بحری طاقت کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اُسکا اقتباس اوپر موجود ہے۔ قابل مضمون نگار نے اخیر میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے روسی حکومت نے بحری قوت کی سیاسی اور اقتصادی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ زبردست بیڑہ اُسکی سیاسی زندگی کی حفاظت کیلئے ضروری ہے۔ روس شمالی یورپ میں بہت بڑی طاقت بنجائیگا اور بحر اسود کے بیڑے کی تکمیل اور تنظیم سے مشرق قریب میں اُسکا وقار بہت بڑھ جائیگا۔

سویٹ حکومت کی بحری ترقی کے نتائج کا اندازہ لگانیکے لئے بہت زیادہ قابلیت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ روس اپنے کھوئے ہوئے منصب کو پھر قائم کرلیگا اور اوسکو یورپ اور ایشیا کی سیاست میں پھر وہی دخل ہو جائیگا جو کبھی تھا۔

بولشیوی طریق دنیا کیلئے بمنزلہ رحمت ہے یا نہیں اسکے بارے میں تو کوئی مستقل رائے قایم نہیں کیجا سکتی لیکن اسقدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ ایشیا میں اس تحریک پر جو توجہ کی جا رہی ہے وہ بہت قبل از وقت ہے اور چونکہ خود سویٹ گورنمنٹ نے ایشیا کے ساتھ نیک نیت رہنے کا قابل اطمینان ثبوت نہیں دیا ہے اس لئے ایشیا کو بہت عقلمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے اور یہ انتہائی حماقت ہوگی کہ سویٹ حکومت اور بالشوی تحریک کا پوری طرح تجربہ کئے بغیر ایشیا اس تحریک کو قبول کرلے۔ اور ممکن ہے کہ ایکدن اپنی آزادی کھو بیٹھے فقط

(مختار)

آل انڈیا جہل مرکب کانفرنس

از

(جناب مرزا حامد حسین صاحب بی اے۔ ال ٹی)

حضرات! تاریخ کے دلچسپ مطالعے میں کسی قوم و ملک کا کوئی زمانہ ایسی سرمایہ ناز ہستیوں سے خالی نہ ملیگا جنھوں نے بنی نوع انسان کی بہبودی و برتری کیلئے اولین و بہترین کوششیں نہ کی ہوں۔ ان مقتدر بزرگان ملت نے ان کوششوں میں نہایت سرگرمی سے کام لیا اور ابتک محنتوں سے اپنی قومی بقا و عروج کی بنیاد ڈالی ورنہ مدنیت کے سلسلے میں خودکشی کی فطرت نے حقوق طلبی آزادی قومی شیرازہ بندی وغیرہ کے نام سے صدہا ایسے ملت سوز راستے نکالے تھے جنکی روک تھام اور تدارک سوائے ان بزرگوں کی تدابیر کے ممکن نہ تھا۔ اس فطرت کا صرف ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شیرازہ تمدن منتشر ہو جائے اور بنی نوع انسان آخرکار تباہ و برباد ہو جائے۔ لیکن قدرت نے عوام کو اس فطرت کے دفاع کی ایک قوت بھی عطا کی ہے جسکو "جہل بسیط" کہتے ہیں۔ اسی قوت نے ملک کے ان سچے رہنماؤں اور محسنوں کی تمام ہمدردانہ کوششوں کو بار ور و کامیاب کرایا ورنہ اس فطرت کا نظر فریب تعمیری لائحہ عمل اس قدر تخریب منشا تھا کہ اگر اس کے عمل کو آزادی کے ساتھ اثر پذیر ہونے دیا گیا ہوتا تو تمام عالم کو مٹا کر چھوڑتا۔ درحقیقت آج تک دنیا کے جو قوم اور ملک مٹے اسی فطرت کے ہاتھوں مٹے کیونکہ رفتہ رفتہ یہ فطرت اوس قوم و ملک کے عوام و خواص سب پر غالب آگئی تھی۔

اب بھی ہمکو یہ فخر حاصل ہے کہ موجودہ سیاسیات اور اصول مدنیت کے بارے میں ہم دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ جاہل ہیں اور اس کی بدولت ہماری زندگی نہایت پرسکون قانع

اور یا امن و امان ہے۔ یہی وہ نعمتیں ہیں جو آج سوائے ہمارے دنیا کی تمام قوموں کے لئے عنقا ہیں۔

یہ روئداد کانفرنس ہمارے جہل سیاست من حیث القوم کے متعلق ہے۔ لیکن اس کے پیش کرنے کے قبل ہمکو اپنے جہل عام کے متعلق بکمال عجز و انکسار اتنا کہنا ہے کہ ہم وہی قوم ہیں جو اپنی انوکھی معاشرت نرالے دماغ اور عجیب قومی روایات کیلئے ہمیشہ سے مشہور رہیں۔ ہم میں تواضع اور ملنساری ہمیشہ اتنی موجود رہی کہ اپنے ملک میں تمام باہر کے آنیوالوں کو آغوش مادر کیطرح جگہ دی۔ اور اونکی محبت رفاقت اور اطاعت میں سر تسلیم و نیاز خم کرکے ہر بات میں اون کی قیادت و اثر قبول کرلیا۔ جذبۂ حب وطن ہمیشہ ہم پر اتنا غالب رہا کہ جب ہم یہاں غیر ممالک سے آکر بیٹھے تو ایسا پاؤں توڑکر بیٹھے کہ پھر ہمیشہ کے لئے باہر نہ نکلنے کی قسم کھالی اور اول روز ہی سے اپنی فطری وطن پرستی کے جذبات کے زیر اثر اپنے اسلاف کے روایات و معاشرت قدیم کو اسی طرح فراموش کردیا جس طرح ازل میں ہمنے اپنے دماغ کا جوہر لطیف گم کردیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کشمکش اور وطن کے پرشورش ماحول میں کیسے ہوسکتا تھا کہ ہمارے خواص کو اپنے عوام میں قومیت کے حیات سوز خیال اور مجنونانہ جوش کو دبائے رکھنے کی فکر نہوتی۔ ہوئی اور انھوں نے اسکا خاطر خواہ انتظام و تدارک اسطرح کیا کہ ملک کے تمام افراد کو جہل مرکب و بسیط کے مطالعہ و عمل میں مشغول و منہمک کردیا۔ جسکے بدولت ہماری تاریخ وطن کے موجودہ آخری صفحات تک غلامی آزادی اتحاد حب وطن وغیرہ کے بے نتیجہ مباحث کے اندراج سے خالی رہے۔

آپ بھی واقف ہونگے کہ جہل وہ جامع و مانع فلسفہ ہے جسکا اعتراف حکیم سولن و سقراط سے لیکر آخر عہد تک کے تمام حکمائے قدیم نے کیا ہے بلکہ یورپ کے بڑے بڑے دماغوں مثلاً بیکن و نیوٹن وغیرہم نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ وہ بحر زخار ہے جس میں ڈبکی (غوطہ) لگاکر باہر نکل آنا انسان کا کام نہیں۔ غور سے نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا آپکا سارا کام جہل ہی سے

چلتا ہے اور بغیر جہل ہماری زندگی دشوار ہے۔ اگر ہم کو اپنی سابق غلطی اور مصیبت اور دماغی روحانی یا قلبی تکلیف کے ساتھ یا درہے جو ہمکو اپنی کس مپرسی بیکسی مجبوری اور افسوس و ندامت پر غلطی یا مصیبت کے دوران میں یا بعد کو محسوس ہوئی تھی یا ہمکو اپنے سارے ناگزیر مستقبل کا علم ہوجائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم ایک سکنڈ بھی اس علم کے بعد زندہ رہ سکیں گے کون نہیں جانتا کہ حال کی طرف دنیا کے زیادہ لوگ کبھی توجہ نہیں کرتے اور اوسکو عمدًا اور کوشش کر کے بھولے رہتے ہیں کیونکہ اسی میں حال کی باآرام یا بہ تکلیف زندگی کا لطف ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ایسے ہی لوگ بڑے مزے میں رہتے اور بڑے چین سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

آنکس کہ نداند و نداند کہ نہ داند از جملہ مخلوق سبک بار بہ ماند

ہم کو تو آجکل ہر وقت اپنی بجسی کا ماتم کرنا ہے کیونکہ یہی بڑے کام کی بات ہے اور جب سے ہماری قوم نے (خدا پروان چڑھائے!) سن شعور کو پہونچکر آنکھیں کھولی ہیں اور میدان عمل اور دنیائے جد و جہد میں قدم رکھا ہے سوائے اس رونے۔ ہائے قوم! وائے قوم! چلانے اور لاؤ چندہ! دلواؤ چندہ! کی صدا لگانے کے اور کچھ نہیں کیا ہے مگر یاد رہے کہ اس چیخ پکار کے معاملہ میں ہم دنیا کی تمام اقوام سے گوئے سبقت لیگئے ہیں اور اُن سب سے افضل و برتر ہیں یہ ہمارے لئے کم سرمایہ فخر و ناز بات نہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہی ماتم بڑے کام کی بات ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اسی سے ہمارا پیٹ پلتا ہے اسی سے ہمارا نام بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ اور اسی سے ہمارے سارے کام چلتے ہیں خواہ وہ انفرادی اور ذاتی ہوں یا اشتراکی اور قومی۔ اور اسی کی بدولت ہم بیداری اور ترقی کے میدان میں بگٹٹ اور سرپٹ آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جتنا ہم بجسی کے ماتم میں دنیا کی تمام اقوام سے بڑھ چڑھکر ہیں اوتنا ہی بجسی میں بھی ہم سب سے افضل و برتر ہیں۔

اتحاد عمل کی ہمکو نہ کبھی ضرورت رہی نہ آیندہ ہوگی۔ اکیلے پیدا ہوئے اکیلے ہی مرینگے۔ پھر اتفاق سے کیا فائدہ؟ ہمکو اتفاق و نفاق کا فرق اور اتحاد کے نقصانات و عدم ضرورت

معلوم ہیں۔ ہم اپنی عمر کے سیکھے ہوئے اخلاق اپنے ہاتھ سے نہیں دے سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ترک موالات ہمارا پیدائشی حق ہے جبکہ فرقہ وارانہ مناقشات اور سنگھٹن وتنظیم کا معاملہ ہو مذہبی آزادی ہمیشہ ارتی واذان کے وقت ہم کو جان سے زیادہ عزیز رہی۔ سول نافرمانی اور مقاومت مجہول ہم ہمیشہ سے کرتے چلے آئے ہیں جہاں کہیں ہمارے دل کا لگاؤ ہوا ہے۔ مولانا عزیز لکھنوی فرماتے ہیں ؎

جائیے جائیے ہم مرکے بھی ہونگے نہیں دفن　　بڑے آئے ہیں ہمیں محفل سے اٹھانیوالے

داغ کے متعلق مشہور ہے کہ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ غالب مرحوم فرماتے ہیں کہ ؎

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

میر مغفور ہمیشہ "چپکے چپکے" اوسکی گلی" پہونچ جایا کرتے تھے۔ کتنی ہی "نافرمانی" اور تاکید وتگرانی کیوں نہو۔ یہ سب ستیاگرہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اور پھر اسی پر منحصر نہیں۔ ہم نے ہندوستانی اردلی تک سے اوسکا "حق" دینے میں ڈرتے ڈرتے ستیاگرہ کی ہے۔ اور استقلال عزم کو ہم نے ہاتھ سے نہیں دیا اور غلامی کی محبت اطاعت وچاکری کی آمادگی خطابات کی قیمت کی ادائیگی میں ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کیلئے لڑتے رہے۔ غلامی فخر وحاصل عمر سمجھ کر انجام دیتے رہے اور اسکی کامیابی اور تیاری کارنامہ نمایاں حیات سمجھا جیسا کہ لسان العصر فرماتے ہیں کہ ؎

میں کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

ان حالات کے ہوتے ہوئے کتنی سخت غلطی ہوگی اگر ہم اتحاد واشتراک عمل کریں۔ خدا نکرے ہندوستان کی وہ بری گھڑی اور نوبت آجائے کہ یہاں کے مذہبی یا سیاسی لیڈر متفق الخیال ومتحد العمل ہوکر کوئی کام کریں۔ اسلئے سابق الاسم گروہ "وطن دشمن" اور موجودہ "انجمن جہل مرکب" کی ممبری روحانی ہے۔ ہمارے تمام لیڈر محض اپنی مخصوص دماغی افتاد کی وجہ

سے اس انجمن کے ممبر ہیں اور سمجھے جائیں۔ اس مضمون کے ذریعہ سے ہمکو ہرکس و ناکس پر
بہ بانگ دہل یہ ظاہر کرنا ہے کہ علی گڈھ جوبلی کے زمانے میں "جہل مرکب لیگ" کے جو سالانہ
اجلاس حسب دستور قدیم ہوئے اونکی کارروائیوں سے ملک کے تمام لیڈروں کو کامل
ہمدردی اور دلچسپی ہے اور اون میں گو ہندوستان کے ہر گوشے کے ڈیلیگیٹوں کی "جسمانی
نمایندگی" نہ تھی مگر عملاً اور دل و دماغ سے سارا ہندوستان اس لیگ کی کارروائیوں میں شریک
تھا اگر آپ بھی اس انجمن سے ابدی فیض اور روحانی مسرت اٹھانیکی صلاحیت رکھتے ہیں
تو بسم اللہ ! بے تکلف برطرف حاضر ہیں حیلہ ہے نہ حجت ہے۔ نام لکھوانے یا چندہ دینے
کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف اسکے قرار دادوں پر کاربند ہونا شروع کرد۔

جہل مرکب کانفرنس کی افتتاحی تقریر جناب سید محمد رؤف علی صاحب بیرسٹر نے جو
صدر کانفرنس تھے۔ جوبلی کے موقع پر علیگڈھ میں بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء فرمائی تھی۔
اصل تقریر انگریزی میں تھی جو مسٹر حسن عابد جعفری صاحب بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر شمع آگرہ
نے انگریزی اخبارات میں شائع کرائی تھی۔ اُسکا ترجمہ میں نے کیا ہے، لیکن افسوس ہے
کہ خود میرے افکار اور جعفری صاحب کی طویل علالت کے باعث ابتک اشاعت کی نوبت نہ
آئی تھی۔ پہلی قسط ہدیۂ ناظرین ہے۔ دوسرا حصہ آیندہ مہینہ میں شائع ہوگا

مرزا حامد حسین مترجم

نوٹ مدیران - ہزار افسوس کہ سید محمد رؤف علی اس دنیا سے اُٹھ گئے، اور ہم بحسرت
اُنکی تقریر کو اُنکے بعد شائع کر رہے ہیں۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ۔۔۔ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تقریر صدر

برادر نمایندگان و حضرات! وطن کے صدروں کی روایات کی غلامانہ متابعت میں مجھے آپکا تہ دل سے شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اپنے عظیم الشان مجمع میں اپنی تجاویز کی صدارت کرنے کے لئے مجھے انتخاب کرکے جو عزت آپنے بخشی ہے مجھے اس سے پیشتر کبھی حاصل نہوئی تھی۔ یہ عظیم الشان مجمع ملک میں اپنی نوعیت کی آپ ہی نظیر ہے اور ہر طرح سے ایک یادگار جلسہ ہے اور اسکی وقعت و عظمت پوری طور سے میرے دل میں ہے اور اسی وجہ سے گو کہ جس عہدے پر میں ممتاز و سرفراز کیا گیا ہوں اوس کے سادے معمولی فرائض انجام دینے میں میرا دل کسی طرح کی دقت محسوس نہیں کرتا پھر بھی میں اپنی نالائقی کا اعتراف کرنیکے لئے حاضر ہوں جو ایسے موقعوں پر زمانہ دراز سے رائج و معمول ہے۔ اب چونکہ میں اپنے کو اس مہتم بالشان عہدۂ عظیم رفیعۂ جلیلہ یعنی ایک آل انڈیا جلسے کی صدارت پر فائز پاتا ہوں جس کی شرکت و شمولیت کی قابل رشک قسمت معدودے چند افراد کو ازل میں مخصوص نعمت کے طور پر عطا ہوتی تھی اسلئے لامحالہ مجھے بھی ضرور توقع کرنی چاہیئے کہ آپ ان اجلاس کو ایک شاندار اور کامل کامیابی بناکر دکھلا دینگے اور درخواست کرنا چاہیئے کہ میرے ساتھ موالات کرکے اس کاغذ کی ناؤ کو آپ اوسی جوش و خروش کے ساتھ چلائینگے جو ترک موالات کے زمانے میں ملک نے ظاہر کی تھی حالانکہ میں جانتا ہوں اور اوس قابل قدر اختصار سے بیخبر نہیں ہوں جو اس مدد کی درخواست قبول کرتے ہوئے آپ مجھے مدد دینے کے وقت کام میں لائینگے جسکی وجہ سے اپنی "تحریک" مجھے خود اپنے پیروں چلکر "سہل" کامیاب کرنا پڑیگی خواہ وہ "باد مخالف" اور "فصل ناموافق ہو یا حسب مزاج۔ جیسا کہ ہر فانی کو اس دنیائے ناموزوں اتفاقات" و حوادث میں کرنا پڑتا ہے!

حضرات! ہم سب آج کی رات یہاں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ باہم ملکر نہایت

غور و خوض اور فکر و توجہ سے اون ذرایع و تدابیر کو سوچیں جن سے ہمارا ملک جذبۂ قومیت کے طوفانی جھونکوں اور "نان کوآپریشن" کے زبردست زلزلۂ انقلابات کی کایا پلٹ تباہی سے محفوظ رہے۔ اس موقعہ پر براہ کرم استعارات و تشابیہ کی الٹ پھیر پر توجہ نہ فرمایئے میں جوش کے ساتھ کہہ رہا ہوں کیونکہ میں جوش کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں (۱) یہ مبحث وہ ہے جس نے ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک تباہ و برباد کر دیا ہے اور جس کی بنیاد اوس دبی ہوئی چنگاری پر رکھی گئی ہے جسکو ہمارے مالک و آقا "صاحبوں" نے انگریزی تعلیم کی شکل میں ملک میں پھیلائی تھی۔ یہ دوسرا مضمون (انگریزی تعلیم کے مضر اثرات۔ جو مترجم کی رائے میں ایسا ہی ترجمہ و اشاعت طلب ہے جیسا یہ تقریر) وہ ہے جس پر میں نے ایک مفصل تقریر بہ حیثیت صدر انجمن ترویج و اشاعت بعوام کئی برس ہوئے کی تھی اور جو انڈیا ریویو ۱۹۱۷ء کے جولائی نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر میں اس تفصیلی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلنے کے کیا مہلک نتائج ہوئے۔ اس جلسہ میں میرا مبحث و مضمون صرف اسقدر رہے کہ آپ کے و نیز عوام و پبلک کے سامنے ایک فرد گروہ "وطن دشمن" کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کروں۔ (عوام جنکو کاتبان اخبار کبھی کبھی "پبلک" لکھدیا کرتے ہیں اس اصطلاح "وطن دشمن" سے یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ معزز اور "سمجھناک" گروہ ملک کا دشمن اور مادر وطن کا بدخواہ ہے بلکہ اس سے منشا و مراد صرف جذبۂ وطنیت سے دشمنی اور اختلاف ہے اور یہ جذبہ جیسا کہ اس نفیس تقریر سے آگے چلکر ثابت ہو گا یقیناً ملک کے لئے مضرت رساں ثابت ہوا ہے۔ مترجم)

میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ آپ سب پر ظاہر و روشن ہے کہ ہم لوگ پیدائشی غلاموں کی ایک عجیب قوم ہیں اور اسلئے جبکہ اس حالت میں ہم نے پہلے پہل انگریزی تواریخ میں قومی تعمیر کے ارتقائی مدارج و منازل کے متعلق پڑھا تو اپنے آقاؤں کی غلامانہ تقلید کرتے

ہوئے ہم نے بھی ایک مستقل اور آزاد قوم بننا چاہا اور ہمارے آقاؤں نے اپنی قومی تعمیر میں جو طریقہ ہائے عمل اختیار کئے تھے اونھیں پر ہمنے بھی قدم بقدم چلنے اور عامل ہونے کی کوشش کی اور ذرا سا بھی خیال اسکا نہ کیا کہ ہماری جغرافیائی پوزیشن (اس لفظ کا ترجمہ مطلوب ہے) اور ہماری قومی حماقتیں ("خصوصیات" پر اس لفظ کو ترجیح ہے) اونسے کس قدر مختلف ہیں اور خود ہماری یعنی ہمارے ملک کی گذشتہ تاریخ ہمکو کیا سبق دے رہی ہے - آپ حضرات نفسیات کے اس مسئلہ سے بخوبی واقف ہونگے کہ غلام کے دماغ کی ساخت اور اقتضا ہے کہ وہ اپنے آقا کی اپنے چھوٹے پیمانے پر نقل کرے اور جو نتائج اوس کے اس فعل سے اوس پر وارد و نازل ہوں اونکے جھیلنے کے لئے آمادہ و تیار بلکہ پیشتر سے واقف بھی نہو۔ ٹھیک اسی طرح اپنی غلامانہ ذہنیت کے ساخت و اقتضا کے مطابق ہمنے بھی سیاست و معاشرت میں اپنے برطانوی آقاؤں کی نقل کرنا شروع کردی۔ ایک لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ (مترجم کے الفاظ) آل انڈیا نیشنل کانگریس کا نظام مرتب کیا اور تجاویز (رزولیوشن) پر تجاویز پاس کرنا شروع کردیا اور "رزولیوشن" کے صحیح منشا و معنی پر غور کرنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی اور نہ کبھی یہ غور کیا کہ "رزولیوشن" اور "رزولیوٹ" (مستقل عزم والے - ارادہ کے دھنی) میں جس سے رزولیوشن مشتق ہے کوئی خاص اور گہرا تعلق ہے کہ نہیں۔

ہمارے تازہ جوش سے بھرے لیڈروں نے اڈمنڈ برک۔ والپول اور ولیم پٹ کے طرز تقریر کی کامل اور بے عیب نقل کرتے ہوئے سرکاری کارروائیوں پر خواہ وہ مفید بھی ہوں گورنمنٹ کی نکتہ چینی کی اور نفرت و ملامت کے ووٹ پاس کرنا شروع کردئے (اور ہنگام بے ہنگام صدائے احتجاج بلند کرنے کا دڑبہ کھولدیا - مترجم) اور حضار جلسہ نے تالیاں بجانا (ٹوپیاں اچھالنا) اور ہاتھ اٹھانا سیکھ کر ہمیشہ کا معمول و مشغلہ بنالیا - اور اسکے بعد ہم مطمئن ہو بیٹھے کہ جو کچھ ہمیں کام کرنا تھا ہمنے کرلیا اور اپنا فرض انجام دے چکے اور ہماری کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری (قومی و آئینی تاریخ) مکمل ہوگئی - ایک ربع صدی سے زیادہ عرصے تک یہی

حالت رہی کانگریس کے سالانہ اجلاس اور اون میں یہ کارروائیاں یکساں طریقے پر ہوتی رہیں اور ہم لوگوں کے استقلال اطمینان قناعت اور غلامی پر ذرا بھی آنچ نہ آئی۔ ادھر ہمارے برطانوی آقا بھی خوشنودی و اطمینان اور حیرت و تعجب کے مخلوط جذبات کے ساتھ ہمارے ان وسیع و کامل نقالی کے نظاروں کو دیکھتے رہے۔ خوشنودی و اطمینان اون کو اپنی تعلیم و تربیت کی یہ تعجیل کامیابی پر تھا کہ وہ دنیا کو دکھلا سکے کہ اس قدر جلد انھوں نے اپنی محکوم و غلام قوم کو تہذیب یافتہ حقوق شناس (خواہ وہ آزادی کے حقوق ہوں خواہ غلامی کے) اور پڑھا لکھا قانع مطیع اور آقا سے ڈرنے والا الغلام بنا لیا۔ اور حیرت اونکو ہماری زبردست نقالی کی قدرت پر ہوئی کیونکہ اپنی خلقی غلامانہ ذہنیت کی بدولت ہم نے بہت جلد اور اون کے خلاف توقع اونکی پوری نقل اتار لی اور ساتھ ہی ساتھ نہ اونکے کسی آرام میں خلل پڑا اور نہ اونکو نقصان پہونچا اور نہ اس تربیت میں ہم نے اون کو تھکایا اور دق کیا۔

کانگریس کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اور اوس کے مختلف غیر "روحانی" اور "خشک" ابواب مثلاً گوکھلے تلک کی تفریق کی سرسری ورق گردانی کرتے ہوئے ہم عہد حاضر یعنی گاندھی جی کے دور تک پہونچتے ہیں۔ اب سب حضرات خوب واقف ہیں کہ ملک کے سیاسی مطلع پر مہاتما جی کے نمود کے قبل وکالت اور دیگر معزز پیشیوں کے شمع انجمن سربرآوردگان کے لئے یہ ایک فیشن ایبل تفریح اور مشغلہ تھا کہ ہفتہ کرسمس کی تعطیلات میں جمع ہو کر ہندوستان کی اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کی قابلیت پر بڑی لمبی چوڑی دھواں دھار تقریریں کیا کریں اور گورنمنٹ کے خلاف سرکاری ظلم و جبر استبداد و اشتداد کی شکایتوں میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہایا کریں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ہم نے یا ہمارے لیڈروں نے کبھی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ لیکن مہاتما جی نے جیسے ہی قدم رکھا اور سادہ لوح عوام کے دل و دماغ کو مسخر و مسحور کر کے اونکی ذہنیت و تخئیل پر قابو حاصل کر لیا ویسے ہی ہمارے آقاؤں کے ذہن و نظر میں ہندوستان کے امن و امان کے استحکام میں واقعی خلل پڑنے کا خطرہ و

اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس لئے کہ مہاتما جی نے اپنے وطن کے تا اینده پر سکون و بے خدشہ سیاسیات میں ایثار اور اپنی مدد آپ کرنیکے نمایاں خطرناک اصول شامل کر دیے تھے۔

گاندھی جی کے دور میں چند بنگالی فریب خوردہ نوجوانوں نے جو بغاوت کی مجنونانہ کوششیں کی تھیں اونکو میں اس موقع پر نظر انداز کرتا ہوں (کیونکہ ایک طرح سے یہ بھی ہمارے نام نہاد "وطن دشمن" اور حقیقتاً "وطن دوست" گروہ کے موافق منشا کوششیں تھیں۔ اور گاندھی جی سے براہ راست اون سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ملک کو غلامی سے آزاد کرنے کے لئے "مہاتما جی نے اپنے سر ایک خطرناک و مضر ذمہ داری لیکر جو صحیح اور کامیاب طریقہ حصول آزادی کا تھا اوس پر انھوں نے ملک کو چلانے کی کوشش کی۔ بغیر استبداد ترک موالات اور کھلی ہوئی بغاوت میں زمین آسمان کا فرق ہے اور گو کہ دونوں مختلف و متضاد طریقے ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے لئے ہیں مگر ایک ہی آدمی کے دماغ میں دونوں کی یکساں ضرورت کا احساس نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ایک کا حامی و عامل دوسرے کا بانی و ذمہ دار ہو۔ پس جو کچھ فریب خوردہ عوام نے جہل اور "گاندھیت" کے مجنونانہ جوش میں حد اعتدال سے بڑھ کر اور گاندھی کے احکام کے خلاف کیا اوس کی ذمہ داری مسکین مہاتما کے سر عائد نہیں کی جا سکتی البتہ ہم خوش و مطمئن ہیں کہ ہوا وہی جو ہم چاہتے تھے اور گاندھی جی ناکامیاب رہے۔ ع

ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اور چونکہ اسی میں ہماری جیت اور "سرکار کی جے" ہے اس لئے یہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ پنجاب و بنگال اور تمام دیگر مقامات کے فسادات اور کشت و خون کے بلکہ جنگ عظیم یورپ تک کے بانی مبانی مہاتما گاندھی جی ہیں اور ہمارے اکثر دست و باز و خیار اور لیڈر ان باتوں میں بآسانی ہمارے ہمنوا و ہمصفیر ہو جائینگے۔ یہ تشریح خانی دماغ مقرر اور فاضل بیرسٹر کے ذہن میں محفوظ رہگئی۔ ہمکو "جابلان غیب ایجنسی" کی معرفت پہونچی۔ مترجم) مہاتما جی

نے غضب تو یہ کیا کہ محض نظریہ سازی اور تعلیم اصول پر انحصار و اکتفا نہیں کی۔ ہماری تمام روایات قدیم اور اصول معاشرت ملی کے خلاف خود اپنی ذاتی مثال عمل پیش کر کے انھوں نے ایک ہوشیار تعلیم یافتہ ہندوستانی تک کے لئے بھی حکومت جلیلۂ دولت برطانیہ کی زبردست قوت کا سخت و کامیاب مقابلہ کر سکنا ممکن کر دیا۔ ان سب پر طرہ ادن کے پیغامات محبت و عدم اشدّاد تھے جو اپنی معراج تخئیل کے مرتفع مدارج سے وہ عوام تک پہونچا رہے تھے جنھوں نے غریب سیدھے سادے سادہ لوح دیہاتیوں کی بھی آنکھیں کھولدیں جو برسہا برس بلکہ پشتہا پشت سے خوشحال قانع مظلومانہ غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور جو احتیاج آب و ہوا کے برابر ہی ضروری و ناگزیر بیگار۔ لگان۔ نذرانہ۔ محنت فاقہ کشی اور برہنگی کو بھی سمجھ کر مدتوں سے اس کو خاموشی کے ساتھ جھیل رہے تھے۔

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیڑھ سال کے مختصر عرصے میں مہاتما جی نے برطانوی مشرقی اقتدار کے لئے ان مسکین غریب اطاعت شعار دیہاتیوں کو ابھار کر ایک زبردست خطرہ پیدا کر دیا۔ واقعی غضب ہی ہوگیا تھا ایک زمانے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف ایک کمی جو باقی رہگئی تھی وہ بھی انھوں نے پوری کر لی (اور اگر خدانخواستہ یہ خامی پوری ہوگئی ہوتی تو جیسا کہ آپ ہم سب جانتے ہیں آجکل جس آزادی اور سوراج کا غل و شور ہم سن رہے ہیں ہمیں کب کی حاصل ہوگئی ہوتی۔ یہ معاملہ یعنی مسلم ہندو اتحاد وہ لوح طلسم تھی جس سے بدیشی راج کا ہوشربا طلسم ٹوٹ گیا ہوتا۔ اس کے حاصل کرنے میں مہاتما جی نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر وہ تو کہو ہماری قسمت کا ستارہ گردش میں نہ تھا اور تقدیر سیدھی تھی کہ مہاتما جی کا منتر نہ چلا یعنی مقام شکر ہے کہ ادنکے عمل تسخیر قلوب کا جادو کچھ یونہی سا ہلکا ہو چلا تھا کہ ہمنے اپنے حواس و دماغ کا توازن کر لیا اور اپنے قدیم روایات کی پیروی کرتے ہوئے نفاق و مناقشات باہمی کی پرانی دیوار جو زمانے کی

ٹھوکروں سے کمزور ہو کر نان کو اپریشن کی آندھیوں میں گر چلی تھی پوری قوت و کوشش کے ساتھ از سر نو تعمیر و مرمت کرنا شروع کر دی۔

اسکے بعد باہمی قومی منافرت کی دیوار عدیم المثال استحکام کے ساتھ تا بفلک پہونچانے کا سہرا ہمارے مشہور و نیکنام لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی جی کے سر رہا۔ اس "آزاد مہاراج" کی تعریف میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کے دل و دماغ نے ہمیشہ مہاتما جی کے خطرناک تعلیم و اصول کا اثر قبول کرنے سے جو اس واستقلال کے ساتھ انکار کیا۔ یہ اسی کا دل گردہ تھا کہ گاندھیت کے فلسفہ کی زہریلی فضا کے اثر کو ہندو سنگھٹنی تحریک سے مٹا کر چھوڑے اور اس بے جگری اور کمال ہوشیاری کے ساتھ ایسی مفید و عالمگیر تحریک کے مقابلے میں اپنی زہریلی تحریک پیش کرے۔ سرکار اور رعایا تا قیامت جو ہماری غلامی کی میعاد ہے انکے ممنون احسان رہیں گے اور رہنا چاہئے۔ ایسے نازک وقت میں بظاہر گورنمنٹ سے الگ رہکر رعایا کا دل ہاتھ میں لینا اور رکھنا اور دراصل گورنمنٹ کا کام کرنا اور گورنمنٹ کے مفاد کو پوری تقویت پہونچانا۔ گاندھی جی سے علانیہ نہ بگاڑنا اور سوراج کی حمایت کے مدعی رہتے ہوئے کوئی ایسا ظاہر کام نہ کرنا جو اس دعوے کے خلاف بتایا جا سکے مگر پھر بھی ترک موالات اور ستیا گرہ کا ترکی بہ ترکی جواب دینا اور ابتدائی منازل ہی میں گاندھی جی کی ساری اسکیم مفلوج کر کے سوراج کو ناممکن الحصول بنا دینا معمولی ہمت و دماغ کا کام نہ تھا۔ ہماری نگاہ میں گاندھی جی اور مالوی جی دونوں بلحاظ اپنی حسن نیت کے دیوتا مہاراج ہیں اور ہم کو یہ مثال ناپسند ہے مگر لوگوں کے قول کی نقل ہے کہ "وطن پرست" اور "وطن دشمن" دونوں گروہ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے سیاست کے میدان میں مالوی جی اور گاندھی جی کی زور آزمائیوں میں رانکشش اور راوتار کی لڑائیوں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ غرضکہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں ملک کے لئے نہایت مبارک فال اور مستحسن ابتدا ہیں بقولے ؎

ابتدا جھگڑے کی ہے روتا ہے کیا | چند دن میں دیکھ تو ہوتا ہے کیا

ہم کو نہایت مسرت اس بات کی ہے کہ خود ؎

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

یہ تحریکیں ہمارے مخالف نام نہاد "وطن پرست" احرار قوم کے دو نہایت مقتدر قائدین کے ہاتھوں اجرا ہوئیں۔ اگر سوء اتفاق سے یہ باتیں سنکر کسی صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ ہم لوگ خود فرقہ دارانہ خیالات کے آدمی ہیں اور اپنے اپنے ہم فرقہ و مذہب گروہ کی تیج میں اسطرح کی باتیں بناتے ہیں تو اونکا شک رفع کرنے کے لئے ہم اون کو اپنے "وطن دشمن" گروہ کی ترکیب کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم بیشک فرقہ دارانہ مناقشات کے حامی ہیں اور ایک قوم بنجانے کے لئے ہندوستانیوں کے اتحاد کے خلاف ہیں اور آپس میں کٹ مرنے کیلئے جتنا بھی ملک کے مختلف گروہ مضبوط اور تیار کئے جائیں ہم اسکو پسند کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بس۔ ورنہ تیج طرفداری اور لگاؤ کے لحاظ سے ہمارے لئے ملک کے تمام گروہ اور فرقے برابر اور یکساں ہیں اور خاص طور پر ہم کسی کے حامی نہیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہر گروہ بقیہ تمام گروہ کو سبب بلا سبب ظالم غاصب خونخوار متعصب گمراہ اور بے ایمان اور مٹا دئے جانے کے قابل سمجھتا رہے اور اون کو مٹانے کی تیاری اور وقتاً فوقتاً اپنی اس تیاری کا امتحان کرتا رہے تاکہ ان بار بار کے فسادات و کشت و خوں سے سابق موجودہ گورنر صاحبان صوبہ اصلاحی سکیم توڑ دئے جانے کے قابل بتلایا کریں اور برطانوی حکومت ہند کے مقابلہ میں متحدہ مزاحمت ہو سکنے کا امکان بھی نہ پیدا ہو کیونکہ اسی میں ہماری بہبودی بہترین خوشحالی اور ترقی ہے اور ہمارے مالکوں کی خوشنودی۔ اور اگر یہی حالت برقرار رہی جو آجکل چند صاحبان کے بدولت اقبال چاروں طرف ملک میں پھیلا ہوا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم برابر اپنے قدیم غلامانہ طرز پر امن و عافیت کے ساتھ ترقی کرتے چلے جائیں گے۔

منشی ولایت علیخاں عزیز صفی پوری

ضلع اُنّاؤ ملک اودھ

خاندانی حالت

منشی ولایت علی خاں بن محمد یحییٰ علی خاں بن ثابت علی خاں بن رونق علی خاں بن خواجہ فیض محمد کا سلسلۂ خاندان خواجہ محمد عثمانؒ تک پہنچتا ہے۔ خواجہ محمد عثمان حضرت شاہ معین الدین اجمیری کے پیر تھے۔ خواجہ فیض محمد نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں نواب حیدر بیگ خاں کے پیشدست ہوئے۔ نواب حیدر بیگ خاں آصف الدولہ بہادر کے نائب تھے۔ عزیز کے پردادا منشی رونق علی خاں نواب سعادت علی خاں کے کل ایام دولت میں میر منشی رہے اور غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت میں بھی میر منشی رہے اور "امین الانشا" خطاب پایا۔ عزیز کے دادا منشی ثابت علی خاں غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد سے نصیر الدین حیدر کے وقت تک میر منشی رہے۔ نصیر الدین حیدر منشی ثابت علی خاں سے بے حد مانوس تھے اور "عمو جان" کہکر مخاطب کیا کرتے تھے اور "میر منشی ثابت علی خاں بہادر" کا خطاب دیا، پھر محمد علی شاہ نے ثابت علی خاں بہادر کو اخبار ملکی کا عہدہ دیا اور عزیز کے والد منشی یحییٰ علی خاں کو اخبار گشتی کا عہدہ دیکر اُنکے ماتحت کیا۔ منشی یحییٰ علی خاں نے امجد علی شاہ کے وقت تک کام کیا اور بعد میں استعفاء دیا مگر تنخواہ مبلغ پانچسو روپیہ ماہوار آخر سلطنت تک پاتے رہے۔ رونق علی خاں اور ثابت علی خاں تمام شہر لکھنؤ میں بہت عزت والے لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ خواجہ فیض محمد

سے منشی یحییٰ علیخاں تک کسی نے تنخواہ کے سوا ایک پیسہ رشوت کا نہیں لیا اور بادشاہ کی خیرخواہی میں نامور رہے اور انھیں لوگوں کے حقوق سے معہ ہوا پنشن کا سرکار انگریزی سے منشی ولایت علیخاں کو ابھی تک ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم

عزیز آٹھ نو برس کی عمر تک مثل اطفال پڑھتے رہے بعد ازاں مولوی محمد حسن بنگالی اور مولوی محمد رضا بانگرموی سے تعلیم پائی۔ منشی یحییٰ علیخاں نے مولوی محمد رضا سے کہا کہ "ولایت علی کو اتنا کردو کہ فارسی لکھنے لگے تاکہ میں بادشاہ کے سامنے پیش کر دوں اور کوئی عہدہ ملجائے۔" مگر مولوی محمد رضا صاحب نے نہ مانا اور جواب دیا کہ "منشی صاحب یہ لڑکا بہت ذہین ہے اسکو میں عربی ضرور پڑھاؤنگا" مولوی صاحب نے فارسی کے ساتھ عربی پڑھانا شروع کیا۔ عزیز کا سن چودہ یا پندرہ سال کا تھا کہ انگریزی ہوگئی اور واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں مٹیا برج چلے گئے۔ واجد علی شاہ کے کلکتہ جانے کے سوا برس بعد ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ عزیز کے مکانات جو شاہی محل سے ملحق تھے لُٹ گئے بعد غدر عزیز نے "وصفی پور" میں قیام اختیار کیا، کیونکہ بادشاہی جاتی رہی اور لکھنؤ میں قیام کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔

شاعری

ایک محب کے اصرار سے عزیز نے غالب دہلوی کو خط لکھا اور اُسی زمانہ میں عزیز نے فارسی میں "پنج رقعہ" لکھ کر غالب کے پاس بغرض اصلاح روانہ کیا عزیز کا سن اس وقت ۱۶یا ۱۷ برس کا تھا جبکہ "پنج رقعہ" لکھا۔ غالب نے ایک لفظ بھی کم و کاست نہیں کیا اور یہ خط لکھ کر روانہ کیا۔

غالب دہلوی کا خط

"خاں صاحب عنایت مظہر سلامت - آپ کا مہربانی نامہ آیا، اوراق پنج رقعہ نظر فروز ہوئے خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں - پنج رقعہ سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھکر ہے، اُس میں یہ معنی نازک اور الفاظ آبدار کہاں ہیں، مگر ایک امر میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں ہے - ارادت خاں متخلص بہ واضح عالمگیری سرداروں میں سے ایک شخص تھا - مینا بازار اور "پنج رقعہ" اُسکی فکر کا نتیجہ ہے تو ایسے کسرات کی طرز ایجاد کی ہوئی اُسکی ہے - موجد سے مقلد بہتر نکلا، یعنی تم نے خوب لکھا ع "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

جہاں آپ نے فقیر کا مطلع لکھا ہے وہاں آپ بعرف میرے معرف ہوئے ہیں متوقع ہوں کہ یا میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھدو - نجات کا طالب غالب"

اُسی زمانہ میں عزیز نے فسانۂ عجائب سرور کو پورا فارسی میں نظم کیا اور غالب کے پاس بغرض اصلاح روانہ کیا تاکہ زبان درست ہوجائے - غالب نے تحریر کیا کہ سرور کی فسانۂ عجائب اردو سے زیادہ دلچسپ نہیں ہوسکتا اگر میں لکھوں تو بھی نہ ہوگا آخر میں لکھا کہ ۶۶ برس کی عمر ہے اتنا کلام کثیر (بارہ ہزار اشعار) دیکھنے سے معذور ہوں، عزیز نے لکھا کہ اگر آپ اصلاح نہ دینگے تو میں چاک کرڈالونگا اور آپ بھی چاک کر ڈالئے - عزیز نے اپنے پاس کا نسخہ چاک کرڈالا اور غالب نے شاید اپنے کسی شاگرد کو دیدیا - قصیدہ حالیہ میں عزیز غالب کی شاگردی کا اقرار کرتے ہیں، اردو زبان میں وہ کسی کے شاگرد نہیں -

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا
شاگرد اس زماں میں ہوں اُس ذوالجلال کا

ہاں نظم فارسی میں ہوں غالب سے مستفید
منت گزار لطف ہوں دو تین سال کا

بھیجی تھی ایک نثر مطول بھی چار جزو
ہوں معتقد میں دونوں میں اُنکے کمال کا

لکھا کہ اس میں حک و تصرف کی جا نہیں
ہرگز محل نہیں ہے کسی احتمال کا

پس نثر میں بھی مجھکو تلمذ جو ہے تو یہ | اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا
اپنی زباں میں میں نے کیا ہے یہ سب کلام | موقع نہیں منازعت و اشتعال کا
انسان وہ نہیں جو کرے عیب پر نظر | اور مدح خواں نہو سخن بے مثال کا
لذت نہیں سخن میں جو ترک سخن میں ہے | کس سے کروں میں تذکرہ اس انفعال کا
اہل ہنر چھپائیں خطائے عزیز کو | رکھیں خیال زشتی ردِ سوال کا
نازش نہیں ہے مجھکو تبختر نہیں مجھے | میں بھی ہوں ایک بندہ اسی ذوالجلال کا

خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی اور امیر احمد مینائی نے عزیز کے کلام کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ ذیل کے خطوط سے ظاہر ہیں، اور بہت حضرات نے عزیز کے کلام پر مثلاً مولوی محمد ظہیر احسن شوق، مولوی نعمان احمد، مولانا محمد عباس بھوپالی وغیرہ نے رائے لکھی ہے مگر طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتا ہوں۔

۱- خط مولانا حالی از پانی پت کرنال

مورخہ ۲۴ جولائی ۱۸۹۹ء

والا جناب۔ التسلیم اولیٰ بالتقدیم۔ مکرمت نامہ مع ارمغان ولنورہان اور رسالہ اشعار الاشعار کے شرف ورود لایا نہایت افسوس ہے کہ بسبب مکروہات چند در چند کے ان تینوں عطیوں کی رسید اور شکریہ بھیجنے میں بہت دیر ہو گئی، امید ہے کہ آپ معاف فرماوینگے۔ اگرچہ ارمغان ولنورہان کو دیکھ کر اس لحاظ سے نہایت خوشی ہوئی کہ اس زمانۂ ناپرساں میں جبکہ قدیم کمالات بسبب کساد بازاری کے صفحۂ روزگار سے مٹتے جاتے ہیں، آپ جیسے صاحب کمال خاکدان ہند میں ابتک موجود ہیں اور جس متاع کا ملک میں کوئی خریدار نہیں رہا اُسکے آپ ہی مالک ہیں اور آپ ہی خریدار ہیں فارسی زبان کی کس میرسی حالت جو آجکل ہے اور آیندہ اس سے بھی زیادہ بقدر ہوتی نظر آتی ہے اسکا سخت افسوس ہے۔ ۵

مجلس چو بر شکست تماشا بمارسید | در بزم چوں نماند کسے جا بمارسید

ارمغان اور نور ہان کو میں نے بڑے شوق سے پڑھا اور چونکہ غالب مرحوم کے بعد یہ انداز بیاں ابتک کسی کی نثر و نظم میں نہیں دیکھا تھا، ان نثروں کو دیکھکر بے اختیار زبان سے نکلا "ہذا الذی رزقنا من قبل" مگر یہ تو ارشاد ہو کہ اس جگر کاوی اور دماغ سوزی کا کچھ نتیجہ بھی ظاہر ہوا؟ مجھے جس قدر ذوق اور لطف ان دونوں رسالوں کے پڑھنے سے حاصل ہوا ہے اُس سے دس گنی زیادہ خوشی اُسوقت حاصل ہوگی جب یہ سنونگا کہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ اور مدار المہام سروقار الامرا بہادر نے ان نثروں کی قدر اُنکے درجہ اور مرتبہ کے موافق فرمائی، پس میں نہایت ممنون ہونگا اگر جناب ان رسالوں کی سرگذشت سے جو حیدرآباد میں پہونچکر اُنپر گذری مطلع فرمائینگے زیادہ نیاز۔ خاکسار نیاز مند الطاف حسین حالی

۲- دوسرا خط مولانا حالی

مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۹۹ء

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم دام فضلکم۔ تسلیم۔ پیشکش شاہجہانی کی تین جلدیں عطیۂ جناب خاکسار کے پاس پہونچیں جنکو پڑھکر آپ کے کمال انشا پردازی کا دل سے اقرار کیا، افسوس ہے کہ اس طبقہ کے بعد جس میں کہ آپ اور میں ہوں کوئی ان کتابوں کا مطلب سمجھنے والا بھی نہ رہیگا چہ جائیکہ انکی خوبی کا سمجھنے والا اور مصنف کی لیاقت اور کوشش کی داد دینے والا کوئی نظر آئے۔

مجلس چو بر شکست تماشا بمار سید   در بزم چوں نماند کسے جا بمار سید

معلوم نہیں کہ ارمغان و نور ہان کے ساتھ کوئی سلوک حیدرآباد کی طرف سے ظہور میں آیا یا نہیں، خدا کرے کہ حضور شاہجہاں بیگم صاحبہ "پیشکش شاہجہانی" کی حسب دلخواہ قدر کریں اور آپکی کوشش اور لیاقت کی کما ینبغی داد دیں، میں آپکی یاد آوری اور عنایت اور غائبانہ محبت کا صمیم قلب اور خلوص دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، خدائے تعالیٰ آپکی عمر میں برکت کرے

اور آپکو فارغ البالی عنایت فرمائے، آپ اُن لوگوں کی یادگار ہیں جنکی نشانیاں صفحۂ روزگار سے روز بروز مٹتی جاتی ہیں، پس آپ کا وجود اس زمانہ میں غنیمت کبریٰ ہے۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار نیازمند الطاف حسین حالیؔ

۳- مولانا شبلی کا خط

مورخہ جون ۱۸۹۹ء

حضور والا! پورے سال بھر سے بیمار ہوں، امید زیست منقطع ہو چکی تھی، تحریر وصیت نامہ ہو چکا تھا۔ اب ذرا افاقہ ہے، اچھا ہو لوں تو آپ کے کلام کی داد دوں، اس بیماری میں بھی میں نے اسکو پڑھا اور اسقدر کہہ سکتا ہوں کہ آج ہندوستان میں کوئی اس طرز کو نباہ نہیں سکتا۔

شبلی نعمانی از اعظم گڈھ

امیر مینائی منشی ولایت علیخاں کے عزیز تھے اور انھوں نے متعدد خطوط لکھے اور عزیز کے کلام پر اپنی رائے ظاہر کی، بوجہ طوالت چند خطوط کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

۴- خلاصہ خط امیر مینائی

عزیز از جان اقبال نشان سخن آفریں و سخنداں سلکم اللہ المنان۔ "خمخانۂ ابدی" کو میں نے بنظر سرسری دیکھا اور تمھاری طباعی کا مزا اٹھایا کیا اچھا کلام ہے اور بیان مقاصد میں کیا حسن انجام ہے، بارک اللہ فی عمرکم۔ تمھارا کلام دیکھکر تمھارے دیدار فرحت آثار کی آرزو ایک سے ہزار ہو گئی، افسوس ہے کہ مجھے بعض امراض لوازمہ کی وجہ سے سفر کی قدرت نہیں ورنہ میں خود تم سے آکر ملتا اور بالمشافہہ تمھارے کلام کی داد دیتا۔ تم اگر چلتے پھرتے رہتے ہو تو کبھی ادھر بھی آنکلو کہ حسرتِ دیدار میرے دل میں نہ رہجائے، خمخانۂ ابدی کے دیکھنے سے ثابت ہو گیا کہ حسن تمھاری طبیعت میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ مختصر کلام جو بلا انتخاب آپ نے دواوین سے نقل کرکے روانہ

کیا، بوجہ رمضان میں اسکو پورا تو نہیں دیکھ سکا مگر جابجا سے دیکھا تو میری نظر میں سب مستحب قرار پایا۔ الحق آپ جوہر قابل ہیں اور ہر رنگ میں آپکا مذاق بہت اچھا ہے کیسی کیسی مشکل زمینوں میں آپ نے نعت کی غزلیں کہی ہیں کہ ان زمینوں میں شاعر سے عاشقانہ شعر مشکل سے نکلتے ہیں، کتاب نوربان کو میں نے سرسری نظر سے جابجا دیکھا آپکی بلند خیالی اور سخن آفرینی کی شان ہر جگہ سے نظر آئی۔ ارمغان کو جابجا سے دیکھا، آپ کی قابلیت پر آفریں کی، جو سخن آفرینی و طباعی آپ نے اس کتاب میں صرف کی ہے افسوس کہ اب کوئی اسکا قدر شناس نہیں ہے۔

امیر فقیر، رامپور ۱۸۹۹ء

عزیز فارسی کے بےمثل اور یکتائے دہر شاعر ہیں۔ ہندوستان میں اُنکی مثال نہیں مل سکتی وہ خود اپنی مثال ہیں، عزیز کے ایسا قانع، خداپرست اور صوفی مشرب میں نے نہیں دیکھا عمر بھر مفلسی میں تمام زندگی بسر کی اور آجتک کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا، عزیز نے قریب ۲۰ کتابیں فارسی اور اردو میں تصنیف کیں۔ بہت سی کتابیں بوجہ افلاس اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہو سکیں جس کا بیحد قلق ہے، عزیز بوجہ افلاس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوے ہیں، اور پبلک اُن سے مطلق واقف ہیں۔ عزیز اس شعر کے مصداق ہیں ؎

مثل گوہر تہِ دریا ہوں کہیں گوشہ نشیں — قدر کیا ہو مری میں گھر سے نکلتا ہی نہیں

ارمغان، نوربان اور پیشکش شاہجہانی خالص فارسی میں اور صنائع و بدائع سے مملو ہیں مگر افسوس ہے کہ مصنف کو کوئی ذریعہ ان کتابوں کے پیش کرنیکا نہ ملا۔ ارمغان حضور نظام خلد اللہ ملکہ اور نوربان سرو قار الامراء اور پیشکش شاہجہانی حضور شاہجہاں بیگم کے نذر دینے کیلئے لکھی گئیں شاہنامہ فردوسی کے طرز پر عزیز نے ۹ برس میں مثنوی فتح مبین لکھی اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی کل لڑائیوں کا حال مثل فردوسی نظم کیا مگر افسوس ہے کہ زمانہ نے اس مثنوی کی کچھ قدر نہ کی عزیز اب بہت مسن ہو گئے ہیں تقریب ۸۵ برس کے سن ہے اور اب بالکل چراغ سحری ہو رہے ہیں خدا عمر میں برکت دے۔ بوجہ پیرانہ سالی لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہیں "نظم دلفریب" کے

دیباچہ میں خود تحریر فرماتے ہیں:- "انقلاب روزگار سے فارسی کا چرچا بالکل نہ رہا اور فارسی کے اٹھ جانے سے زبان اردو بھی معدوم ہوا چاہتی ہے، اور نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو کوئی کسی کا قدردان نہیں رہا، اور نہ ان فنون سے کچھ کام نکلتا ہے، مگر جس کی تربیت پہلے سے یوں ہی واقع ہوئی ہو وہ کیا کرے؟- اسی شغل میں اپنا دل بہلاتا ہے، سخنوران قابل سے امید ہے کہ اگر کچھ پسند آئے تو دعائے خیر سے محروم نہ رکھیں، اگر نامطبوع ہو تو عیب پوشی فرمائیں۔

رُباعی

رُجحان ہے فارسی کی جانب کس کا — چرچا نہیں اب ہند میں ہرگز اس کا
اللہ نے وہ زبان دی مجھکو عزیز — کوئی بھی نہیں سمجھنے والا جس کا

عزیز کو اگر فردوسی ہند کہا جائے تو ہرگز ہرگز بیجا نہو گا- پنج رقعہ جسکی غالب مرحوم نے اس قدر تعریف و توصیف کی تھی بوجہ افلاس دوبارہ شائع نہو سکا۔

عزیز کا دنیا میں کوئی قدر کرنے والا نہیں اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گذار رہے ہیں، چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں:-

"دیوانِ عزیز است کتاب تہ دریا"

سید اشرف علی بی، اے (علیگ)
ایل، ایل، بی
یو، پی سول سروس
ڈپٹی کلکٹر- گورکھپور

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء

معلومات

از

مولوی محمد حسین صاحب حسان ندوی

ڈاکٹر ڈفری نے ایک فلم تیار کیا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت کو اثنائے حمل میں کیا کرنا چاہئے - اور پیدائش کے بعد شروع شروع میں صفائی صحت و مرض اور کھانے پینے وغیرہ کے معاملہ میں بچہ کی کیونکر تربیت ہونی چاہئے - یہ فلم پیرس میں لاربوازیر کے شفاخانہ میں دکھایا گیا تھا - ساتھ ہی ڈاکٹر موصوف نے ایک لیکچر بھی دیا جس میں اُسنے اپنے اغراض و مقاصد کو تصاویر کے ذریعہ سے دکھایا تھا - خواتین کی کثیر تعداد اس میں شامل تھی - یہ بہت مفید ثابت ہوا، اور عام طور پر مقبول ہوا۔

ہاورڈ یونیورسٹی کے سرمایہ کا ۵۳ ملیون ڈالر اندازہ لگایا گیا ہے یہ سرمایہ یونیورسٹی کی عمارتوں آراضی اور دیگر اسباب کے علاوہ ہے جو تقریباً ۲۳ ملیون ڈالر کے قریب ہے امریکہ کی تمام یونیورسٹیوں میں یہ علمی معہد سب سے زیادہ دولتمند ہے۔

وزارت داخلہ کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں ۱۲۱ یونیورسٹیاں ہیں - جن میں سے ہر ایک کا سرمایہ ایک ملیون ڈالر سے زیادہ ہے - ان میں سے اکثر کی مستقل حیثیت ہے۔

ان تمام یونیورسٹیوں میں ۱۸ ایسی ہیں جن کا شمار طبقۂ اولی میں ہے - بابل کی یونیورسٹی آراضی عمارات اور دیگر اسباب کے لحاظ سے ہاورڈ یونیورسٹی سے دوسرے درجہ پر ہے - اور اوس کے سرمایہ کا اندازہ ۲۱۰۸۹۰۲۸ ریال لگایا گیا ہے - کولمبیا - سنفورڈ شیکاغو - کورنل - جون ہوبکنس کی یونیورسٹیاں بھی اسی کے برابر ہیں۔

کولمبیا یونیورسٹی سرمایہ کے لحاظ سے ہاورڈ سے دوسرے درجہ پر ہے چنانچہ اس کا ۱۳۰۰۹۰۹ ، ٹکساس یونیورسٹی کا ۱۱۰۲۳۰۱۸ ، اور کیلیفورنیا کا ۱۳۰۱۷۷۵ ڈالر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

اول اول جس نے سونے اور چاندی کے سکہ استعمال کئے لیڈیا کا ملک ہے۔ یہ ایشیائے کوچک میں ایک قدیم مملکت ہے جو ۵۴۰ قبل مسیح کے قریب فارس کے قبضہ تصرف میں تھی

اسی طرح رومانے اپنی جمہوریت کے زمانہ میں تانبے کے سکوں کا استعمال شروع کیا۔ مصر میں بھی انھی کے زمانۂ حکومت میں اسکا رواج شروع ہوا اور اس کے بعد کو انگریزوں کے یہاں۔

لوہے کے سکوں کا استعمال سویڈن نے کیا جبکہ اوس کے بادشاہ شارل دوازدہم کا انتقال ہو چکا تھا اور لڑائیوں کی کثرت سے ملک کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔

چین میں قریب ہی زمانہ میں پتھر کے سکے استعمال کئے گئے۔

بیروت میں شارع اللنبی پر کھودتے وقت سنگ مرمر اور نہایت نفیس شاہ بلوط کے دو ستون برآمد ہوئے ہیں جن کا قطر دو مربع میٹر ہے (۲ گز ۶ گرہ) لاطینی حروف میں کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔

ایک پل بھی پایا گیا ہے جو رومن معبدگاہوں کے دروازوں کی شکل کا ہے۔

پیرس میں خواتین کی جانب سے ایک لائبریری کھولی گئی ہے جس میں عورتوں کی تصنیفات یا وہ مصنفات رکھی جائیں گی جو عورتوں سے متعلق ہوں خواہ فرانس میں لکھی گئی ہوں یا دیگر ممالک میں۔

لائبریری میں ایک بہت بڑا ہال ہوگا جس میں ہر ماہ کے تیسرے ہفتہ خواتین کا اجتماع ہوا کریگا۔ اور جدید ترین نسوانی تصنیف کے موضوع پر نقد و تبصرہ اور بحث و تمحیص کیجائیگی اسکے بعد چاء کا دور ہوگا اور اس وقت علمی۔ ادبی اجتماعی غرضکہ مختلف موضوع پر گفتگوئیں ہونگی۔

روپیہ اور دولت کے لئے جد و جہد میں شاید امریکہ سے بڑھکر کوئی قوم نہ ہوگی لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ دولت کی اون کے یہاں اتنی اہمیت نہیں جتنی علم کی ہے۔ جمہوریت کی صدارت وزارت وغیرہ غرضکہ سب کچھ علما اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے ہاتھ میں ہے۔

امریکہ ہی پر کیا منحصر ہے ابتدائے عہد میں جب روم و یونان کے تمدن کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت بھی یہی حال تھا۔ اب بھی تمام متمدن ممالک میں جمہوریتوں کی صدارت وزارت غرضکہ حکومت کا تمامتر نظم و نسق عالموں اور ادیبوں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔

امریکہ کے ایک اخبار نے اپنے ناظرین سے سینما کے متعلق ایک سوال کیا تھا کہ آیا وہ سینما میں کیا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

جوابات کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

۶۰ فی صدی ڈراما اور ٹریجیڈی افسانوں کو ترجیح دیتے ہیں ۳۰ فیصدی سیر و سیاحت انکشافات دریاؤں اور سمندر کی تیراکی کے مناظر پسند کرتے ہیں اور صرف ۱۰ فیصدی کومیڈی فسانہ پسند کرتے ہیں۔

اثرئین کی ایک جماعت نے کبادوک (الیشیائے کوچک) میں مٹی سے بنے ہوئے چند صفحات کا انکشاف کیا ہے جن پر حسابی رقوم لکھی ہیں۔ طویل بحث و تحقیق کے بعد اس امر کا پتہ چلا ہے کہ ۲۱۰۰ ق۔م کے کسی بہت بڑے تاجر کے حسابات کے رجسٹر ہیں۔ ان صفحات سے تمام ممکن معلومات اخذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یعنی ان ممالک کے حالات اس زمانہ بعید میں مختلف شہروں کے تجارت پیشہ لوگوں میں تجارتی تعلقات وغیرہ۔

حال میں بلجیکا کے وزیر تعلیم و صنعت و حرفت نے حکومت کے سامنے تجویز پیش کی ہے کہ حکومت کے تمام قناصل اور سفارتخانوں میں ذو مندوب محض اسلئے متعین کئے جائیں کہ بلجیکی فنون کی نشر و اشاعت اور بلجیکا کے مصور و ممثل کی قلمکاریوں کے رواج دینے کی کوشش کریں۔

وحشی قبائل میں طوطے کی بہت کچھ تقدیس کی جاتی ہے۔ اوسکا شکار اوسکا قتل اوسکو ایذا پہونچانا حرام سمجھا جاتا ہے امریکہ میں ابتک بہت سے وحشی قبائل ہیں جنکے مختلف النوع طوطے ہیں وہ اونکا بے انتہا احترام کرتے ہیں۔

ارکنزاس میں اس قسم کا ایک قبیلہ ہے جسکے لئے ایک امریکن نے ایک لکڑی کا ستون بنایا ہے جس میں طوطوں کی تصویریں اور سفید فام اقوام کے اس ملک میں داخلہ کے متعلق بعض تاریخی حادثات منقوش کئے ہیں۔

بعض اوقات کسی خوش منظر مقام کو دیکھکر انسان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ یہاں رہنے کا سامان کرسکتا لیکن خود اپنے مکان میں رہتے رہتے اوس سے

اسقدر محبت اور الفت ہو جاتی ہے کہ جدائی ناممکن معلوم ہوتی ہے اور یہی جی چاھتا ہے کہ کاش یہ مکان ہی اوٹھکر وہاں چلا جاتا۔

اسی طرح ایک تاجر کا بھی جو مناسب تر جگہ دکان منتقل کرنا چاھتا ہے یہی حال ہے غرضکہ انسان کے دل میں اس امر کی سخت آرزو پیدا ہوتی تھی اور ساتھ ہی ضرورت محسوس ہوتی تھی اسوقت تک اسکا تو وہم و گمان تک نہ تھا کہ مکان بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اب ایک امریکی مہندس ( ) نے اس مسئلہ ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے وہ ہر عمارت کو خواہ کتنی بڑی ہو بغیر کسی نقصان کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتا ہے۔ اوس کی صورت بہت آسان ہے اور سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ عمل کے بہت مشابہ ہے جو لکڑی کے تختوں پر کشتیاں قسطنطنیہ کے دروازہ تک لے گیا تھا اور اسی کے ذریعہ بالآخر فتحیاب ہوا۔

مہندس موصوف نے ریلوے لائن کی شکل کی لوہے کی پٹریاں بنائی ہیں ان پٹریوں پر تختہ رکھدئے جاتے ہیں۔

پہلے مکان کے گرد کھود کر اوس کو زمین سے نکالا جاتا ہے پھر وہ تختوں پر رکھدیا جاتا ہے۔ پورا مکان رسیوں سے باندھدیا جاتا ہے۔ یہ رسیاں گھوڑے کھینچتے ہیں اور منزل مقصود تک پہونچا دیتے ہیں، لیکن یہ گھوڑے مکان سے دور رکھے جاتے ہیں تاکہ ان کی حرکت سے مکان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچ جائے۔

چنانچہ مہندس موصوف نے ایک شہر (اوسبرن) جسکو حکومت نہروں کا مرکز بنانے کی غرض سے منہدم کرانا چاھتی تھی مع اسباب و حیوان و انسان دوسری جگہ کامیابی کے ساتھ منتقل کر دیا۔

زلزلہ اصل میں زمین کی تموجی حرکات سے آتا ہے اور اسکا سبب زمین کی اندرونی

اضطرابات ہیں ان حرکات کو تموج کہا گیا اسلیئے کہ یہ حرکت زمین کی چٹانوں میں منتقل ہوتی ہے خود چٹانیں منتقل نہیں ہوتیں اسی سے یہ تمام مقامات میں بیک وقت اور ایک ہی قوت کے ساتھ محسوس نہیں ہوتیں بلکہ مختلف اوقات اور مختلف قوتوں کے ساتھ لوگ اسکا احساس کرتے ہیں، کیونکہ یہ تموج ایک مرکزی نقطہ سے شروع ہوتا ہے اور پھر دور دور پھیل جاتا ہے اور جس قدر یہ موجیں مرکز سے دور ہوتی جائیں گی اُسیقدر قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ بالکل فنا ہو جاتی ہے یہ حرکات بالکل اون موجوں کے مشابہ ہیں جو پانی میں پتھر پھینکنے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

علمی بحث و تحقیق کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ مرکز اضطراب کا عمق تمام زلزلوں میں مختلف ہوتا ہے چنانچہ کبھی سطح ارض سے صرف ۳۰ میل دور رہتا ہے اور کبھی ۱۰۰ میل اور کبھی اس سے بھی زائد۔

بلاشبہ زمین کے قطر کی نسبت سے یہ فاصلہ بہت قلیل ہے۔

پیرس میں عورتوں کی انجمن نے اندازہ لگایا ہے کہ عورتوں کے ایک بڑے حصہ کو اس امر کی احتیاج ہے کہ دستکاری یا علمی کاموں میں حصہ لے لیکن خانگی انتظامات کی ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے کچھ نہیں کیا جاسکتا،

اب اس مجلس نے ایسے طریقہ کار کی تجویز کی ہے کہ دونوں کام بخوبی انجام پاسکیں۔ اس طرح کہ گھر کا کام کاج دن کے پہلے حصہ میں کیا جائے اور خارجی کام دوسرے حصہ میں اسپر تجربہ بھی ہو رہا ہے اور بہت کچھ کامیابی ہو رہی ہے۔

برلن کے ایک موجد نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جسکے ذریعہ ۵۰ فیصدی ہوا کو منجمد کیا جاسکتا ہے۔

فرانس میں جدید قسم کے موزے تیار کئے گئے ہیں جو تمامتر سونے کے ہیں ایک جوڑے کی قیمت ہزار ریال ہے سورج کی کرنیں پڑنے پر یہ جگمگا اوٹھتے ہیں۔

امریکہ کا ایک موجد اس فکر میں ہے کہ انسان کے لئے دو بازو ایجاد کرے جنکے ذریعہ وہ بالکل پرند کی طرح اوڑ سکے۔ ایجاد ہو چکے ہیں لیکن رس ریا کا سر جیتی ہر ہر اسے کو جو بعض ہی ہیں دیکھا ہے۔ گو لندن اور سنیرسس میں بھی نظر آئے۔ فقط

ایاغ بزم

نقاشِ نقش ثانی بہتر کشد زِ اوّل

ادب نواز نگاہیں اُٹھیں۔ فن شعر کے قدردان بڑھیں۔ زبان اُردو کے دلدادہ شوق کردامن پھیلائیں۔ ہم آج وہ تحفہ پیش کر رہے ہیں جسکی دنیا ایک عرصہ سے منتظر تھی۔ تشنہ کامان ادب کو جرعۂ اول کا سرور انبساط آجتک فراموش نہیں ہوا۔ دل اوسی کیفیت کا متلاشی۔ آنکھیں اوسی نشاط روح افزا کی مشتاق تھیں۔ یہ دور جدید نہیں بلکہ ادب اردو کیلئے حیات جدید ہے۔ آئیے اور شاہد سخن کے سحر طراز دامن کی فتنہ سازیاں دیکھئے تخیل کی بلندی اور فکر کی جدت کیساتھ زباں کے مزیدار پہلو۔ سیرکار دزمرہ۔ حسین تشبیہیں۔ رنگین استعارے۔ رازِ دنیا زِ سوز و ساز خم و خمخانہ شمع و پروانہ طور و کلیم حسن کی رفعت عشق کی حقیقت۔ دریائے معرفت کا تلاطم۔ جذبات کا تراکم ایک محشرستان نظم اگر دیکھنا ہو تو ملک کے مشہور و معروف مسلم الثبوت اُستاد فن سلطان القلم معراج الشعراء حضرت بزم اکبر آبادی کا دیوان ایاغ بزم دیکھئے جو ہمنے زر کثیر صرف کرکے طبع کرایا ہے حضرت بزم کی ذات محتاج تعارف نہیں آپ ان مایہ ناز افراد میں سے ہیں جنپر اس فن لطیف کی ترقی اور بقا کا دار و مدار ہے۔ بہت کم جلدیں طبع ہوئیں ہیں خریداری میں عجلت فرمائیے ورنہ حضرت بزم کے کلام کی مقبولیت کیوجہ سے ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ محروم نہ رہجائیں۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ صاف دیدہ زیب۔ کاغذ چکنا سفید۔ تقطیع ۲۶×۲۰۔ قیمت صرف دو روپیہ (عہ) حسب ذیل پتہ سے طلب فرمائیے۔

المشتہر خواجہ صدیق حسین منیجر اگرہ اخبار پریس آگرہ۔

تبصرے

نوشتہ

(حسن عابد جعفری صاحب آکسن بیرسٹرایٹ لا۔ مدیر شمع)

باقیات فانی

شوکت علی خانصاحب فانی (علیگ) بی اے ال ال بی۔ وکیل۔ اٹاوہ کا اردو دیوان ہے۔

فانی دور جدید کے ممتاز شاعر ہیں۔ اور مخصوص ادبی حلقوں میں کچھ عرصہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ دیوان زیر تبصرہ ادب اردو میں ایک شاندار اور گراں قدر اضافہ ہے۔ فانی کی شاعری دنیا میں ٹھہرنے والی ہے، اور بہت جلد ہندوستان کی حدود سے نکلکر مغرب امریکہ، اور ایشیائی ممالک میں مقبول ہوجائیگی۔ فانی کی شاعری حقیقی شاعری ہے، اُن کے یہاں واردات قلب کا اظہار بلا تصنّع ہے۔ وہ اگرچہ الفاظ کے ذریعہ سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اُنکے جذبات الفاظ کے تابع نظر آتے۔ حیات اور ممات کی جھلک اُنہیں کے یہاں موجود ہے، وہ زندگی کے سچے نوحہ خواں ہیں۔ اور غالباً اسی حیثیت سے وہ دنیائے شاعری میں ایک دن کامیاب ہوکر چمکیں گے۔ اور مدتوں تک یاد رہیں گے، اُن کے کلام میں یاس کا رنگ غالب ہے۔ یہ رنگ اُنسے کبھی جُدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی فطرت میں داخل ہوگیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ اُن کی فطرت یاس انگیز ہے اور وہی اُنکا رہبر ہے۔ وہ صناع نہیں ہیں، الفاظ کی جادوگری اُنکے یہاں نہیں، اور نہ وہ کبھی ترنم کے پیچھے اپنے جذبات کا خون کرتے ہیں۔ اُن کے الفاظ سے بظاہر غالب کا رنگ جھلکتا ہے۔

اور مضامین کے اعتبار سے کبھی کبھی میر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت کی رفتار جدا ہے، اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے غالب اور میر کی شاعری کا بہت عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اور دونوں کی بندشیں اور ترکیبیں بھی اُن کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے دونوں کی مشہور غزلوں پر غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور کہیں کہیں اُنکا تتبع بھی کرنا چاہا ہے۔ وہ زندگی کو موت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور خود زندگی کو مسلسل جانکنی کہتے ہیں۔ اُن کی نظر میں دنیا مقام یاس ہے۔ اور زندگی وہ ذریعہ ہے جو انسان کو عالم یاس سے گذارتی ہے۔ دنیا میں انسان اپنے بس نہیں آیا۔ دنیا میں اُسکا آنا ایک ناگزیر واقعہ تھا۔ اُس کے افعال اور اعمال جبر کے تابع رہے۔ عشق اُسکی سرشت تھا۔ اور حُسن کی تلاش اُس کو ازل سے عطا ہوئی تھی۔ دنیا میں عشق تلاش حُسن میں سرگرم رہا اور پیکر انسانی پر جو عشق کا حامل تھا، وہ سب حالتیں گذر گئیں جو باقتضائے بشریت اُس پر گذرنی چاہئیں ان حالتوں کو شاعر کا حساس قلب محسوس کرتا ہے۔ اور اُسکی فطری آزادی اس کشمکش سے رہائی چاہتی ہے۔ یہ کشمکش فانی کے کلام میں دیدنی ہے، اُن کا عقیدہ ہے کہ صرف موت ذریعہ نجات ہے! اور زندگی وہ کشتی ہے جو طوفان حوادث سے گذرتی ہوئی مسافر کو فنا کی طرف لئے جاتی ہے فانی کا عقیدہ ہے کہ انسان کا قلب عشق سے معمور ہے، اور وہ حُسن کی تلاش میں سراپا شوق ہے۔ اور بےچین ہے۔ تمام عمر اس حالت میں گذر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ موت، جو دُنیا کے معاملات پر پردہ ڈالتی ہے۔ حقیقت کا پردہ اٹھا دیتی ہے۔ اور طالبؔ و مطلوب، عاشق و معشوق، حُسن اور عشق، ایک ہو جاتے ہیں! اور انسان کو راحت ابدی اور سکون کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ عالم فراق یعنی زندگی محض بیکار ہے!

ان حالات میں فانی کی شاعری کو صرف ہندوستان کے لئے محدود کر دینا، اپنے ذوق شاعری کو مجروح کر دینا ہے، برخلاف عام شعراء ہندوستان کے۔ وہ ایک پیغام لیکر آئے ہیں۔ جس کو اپنی تصویر کے ذریعہ سے تمام عالم تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان کی زبان اردو ہے۔ لیکن یہ

محض اتفاق ہے - اور اہل ذوق اُن کے جذبات کو اسطرح تمام عالم میں پھیلادیں گے - جسطرح آج ٹیگور کی شاعری فضائے عالم میں رقصاں نظر آتی ہے -

شروع میں جناب رشید احمد صدیقی صاحب کا مقدمہ ہے - جو بہت دلچسپ ہے اور جناب فانی کی شاعری کے ہر پہلو پر بحث کی ہے - اور غالب مرحوم اور علامہ اقبال سے انکا مقابلہ کیا ہے - ہم ان کی رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر کچھ عرض کرنا ہوگا تو آئندہ کسی اور موقع پر تفصیل کے ساتھ عرض کرینگے -

بہرکیف باقیات فانی قابل قدر دیوان ہے - ذیل میں کچھ انتخاب درج کیا جاتا ہے - یہ انتخاب سرسری طور پر ہوا - اور مختلف مذاق کے اشعار کو قصداً داخل کر لیا گیا ہے -

حضرات اہل ذوق اگر کلام فانی سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں تو باقیات فانی کو بغور ملاحظہ کریں -

جناب فانی ابھی اور ترقی کر سکتے ہیں - ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنے رنگ کو نہ چھوڑیں آئندہ بہت نام پیدا کریں گے - کتاب ؀ میں جناب فانی سے ملسکتی ہے -

انتخاب باقیات فانی

ٹوٹا طلسم ہستیِ فانی کے راز کا ۔۔۔ احسانمند ہوں الم جانگداز کا

بے اجل کام نہ اپنا کسی عنواں نکلا ۔۔۔ دم تو نکلا مگر آزردہ احساں نکلا
اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی ۔۔۔ چاک داماں بھی باندازۂ داماں نکلا
شوق بیتاب کا انجام تحیر پایا ۔۔۔ دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانہ کا ۔۔۔ ایک گوشہ ہے یہ دنیا اُسی ویرانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے　　ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانیکا
تمنے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ　　آؤ دیکھو نہ تماشا میرے غم خانے کا
ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی　　زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

کسی کے ایک اشارے میں کسکو کیا نہ ملا　　بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا
مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اُس دل سے　　بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا
ظہور جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار　　کوئی اجل کی طرح دیر آشنا نہ ملا
میری حیات ہے محروم مدعائے حیات　　وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا
وہ نامراد اجل بزم یاس میں بھی نہیں　　یہاں بھی فانی آوارہ کا پتا نہ ملا

نامرادی حد سے گذری حال فانی کچھ نہ پوچھ　　ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

اے جذب بیخودی ترے قربان جائیے　　پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈھتا ہوا
میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
فانی طلسم راز حقیقت یہ ہے کہ ہے　　تجھ پر تری نگاہ کا پردا پڑا ہوا

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی　　فانی نا امید کو موت کا آسرا دیا

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں　　اک بیقرار تڑپا اک دل فگار رو دیا

کہتا ہے غم یار میں ہوں جان تمنا　　دنیا ہے مری عالم امکان تمنا

کچھ کم تو ہوا رنجِ فراوانِ تمنا		آغازِ جنوں گو نہیں پایانِ تمنا
جز وعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اسکی		دل کانپ اُٹھا دیکھ کے ایوانِ تمنا

عجلتِ پرواز جب ملنے بھی دے راہ گریز		یوں تو کھُلنے کو قفس کا در کھلا، اکثر کھلا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن		غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

چار زنجیرِ عناصر پہ ہے زنداں موقوف		وحشتِ عشق ذرا سلسلہ جنباں ہونا
خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں		کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا		عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا
دنیا میں حال آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ		بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

ہوتا ہے آج فیصلہ اُمید و یاس کا		مٹتا ہے اب وہ دل جو بسا اور اُجڑ گیا

ای اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کر دیا		مار ڈالا مرنے والے کو، کہ اچھا کر دیا
بچ رہا تھا ایک آنسو دار و گیرِ ضبط سے		جوششِ غم نے پھر اُس قطرہ کو دریا کر دیا
فانی مہجور تھا آج آرزو مندِ اجل		آپ نے آ کر پشیمانِ تمنا کر دیا

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا		اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت		تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا

محرومیاں ذریعۂ الہام ذکر تھیں
نالوں پہ انحصار پیام سروش تھا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبال دوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسمان تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی
ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

ہزار ڈھونڈیئے اُسکا نشان نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے، یعنی
تیری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں اٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اُٹھا

کسکی کشتی تہ گرداب فنا جا پہونچی
شور لبیک جو فانی لب ساحل سے اُٹھا

ملا ازل سے مجھے میری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحہ ہستی کہ صرف خواب ہوا

سکون قلب میسر ہے موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمہ رنج و اضطراب ہوا

شعبدے آنکھوں سے ہمنے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

عہد جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جبتک مر جانے کا زمانہ تھا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہیں بہار کیا
ہمتو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

دل ہی تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک
حوصلۂ اُمید کیا ظرف امیدوار کیا

اپنے کمال شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہئے۔ زحمت انتظار کیا
فانی اب اپنی زندگی حسن عتاب یار ہے
دیکھئے مرگ ناگہاں لائے پیام یار کیا

سانس کے جو آخری جھٹکو نمیں ٹکڑے ہوگئیں
ہائے اُن ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا

خدا رکھے شرار عشق کو وہ شمع سوزاں ہوں
جلے جانا جسے ممکن ہے یا خاموش ہوجانا
قیامت ہی یہ ٹکڑا داستان عشق کا یعنی
مری راحت طلب دل کا اذیت کوش ہوجانا

یاں ہوش سے بیزار رہوا بھی نہیں جاتا
اُس بزم میں ہشیار رہوا بھی نہیں جاتا

کسی کی غم کی کہانی ہے زندگی فانی
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا
پیام حسن محبت کی داستاں ہوتا
میرا وجود ہے میری نگاہ خود نہ شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

محتاج اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہوجا
غیرت ہو تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہوجا
اُس جان تمنا سے بے پردہ نہ شکوہ کر
وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہوجا

عشق ہے پرتو حسنِ محبوب
آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب
طلب محض ہے سارا عالم
کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب
قلب، ادراک، دماغ اور حواس
مجھ سے منسوب ہیں، تجھ سے مغلوب

فانیؔ وداعِ ہوش ہی کرنا پڑا مجھے
تن سے وداعِ رُوح میں تاخیر دیکھکر

عمرِ خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں
زندگی نئی پائی آپ سے جُدا ہوکر

دلِ مایوس کو اے عہدِ کرم شاد نہ کر
نازپروردۂ غم ہے اسے برباد نہ کر

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا اک دُکھ بھری آواز
صور و منصور و طور ارے توبہ
ایک ہے تیری بات کا انداز

دُور لیجا ہٹا کے سرحدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز
ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز
ہوں اسیرِ فریبِ آزادی
پر ہیں اور مشقِ حیلۂ پرواز
کیوں فلک انتہا ہوئی کہ نہیں
ایک دم رہ گیا ہے اب دمساز
جان فانیؔ ترے کرم پہ نثار
تو نے بخشی حیاتِ مرگ نواز

وادیٔ شوق میں وارفتہ رفتار ہیں ہم
بیخودی کچھ تو بتا کسکے طلبگار ہیں ہم
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ
دو گھڑی ہوش میں آنیکے گنہگار ہیں ہم

مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گذری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہی لہو برسوں

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا
شرحِ درازِ زندگیٔ مختصر کو میں

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخم دل پیدا کریں یا زخم دل اچھا کریں

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشک ندامت آ تجھی دریا کریں

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا - اب یہ بتا ہم کیا کریں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

بہار زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیش مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سُنتے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر شمع سحر سے

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی

لو آج مرگ فانی بیکس سے مٹ گئی
وہ اک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

ہم اپنے جی سے گذرے یوں سحر کی
شب غم بڑھ چلی تھی مختصر کی

مرا قتل اُسکے ہاتھوں یہ تو باتیں
کچھ اُنکے مُنھ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

مانا حجاب دید میری بیخودی ہوئی
تم وجہ بیخودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی

دل ہے وہ طاق غمکدۂ عمر دوش کا
رکھی ہے جس پہ شمع تمنا بجھی ہوئی

مرحوم کس ادا کی تماشائیوں میں تھا
پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی
یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اُس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

یہ ہستیٔ دو روزہ گویا کہ نہیں فانی
اللہ رے تیرا اے دل انداز پریشانی

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

آپ سوچا ہی کئے اُس سے ملوں یا نہ ملوں
موت مشتاق کو مٹی میں ملا بھی آئی
تو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا
آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

ہر لمحہ حیات رہا وقف کار شوق
مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

ہر بیگنہ سے وعدۂ بخشش ہے روز حشر
گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی
عبرت نے بیکسی کا نشاں بھی مٹا دیا
اُڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے
دنیا میں دیار دل فانی کے سوا ہائے
کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

شرمندہ وہم رشک سے اتنا نہ کیجئے
آئینہ دیکھکر مجھے دیکھا نہ کیجئے

سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں   یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجئے

وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر   شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے
زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر   موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے   ادا وہ یاد ہے گھبرا کے رُوٹھ جانے کی

نصیب ہو بھی تو کیا لطفِ وصلِ یار میں ہے   سوائے عیش سو تقدیرِ انتظار میں ہے
عزیزِ خاطرِ فطرت ہے جانِ عبرت ہے   ہر ایک ذرّہ جو اس عالمِ غبار میں ہے
گنہگار کی حالت ہے رحم کے قابل   غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدّعا کیوں ہو گئے   تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے   کیوں چارہ ساز تجھ کو امیدِ شفا بھی ہے

لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی   دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقّادِ سوزِ دل   لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے   موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں   جو اُجڑے پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کیا ہے خلق مجھے باوجود علمِ گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

یہاں بلائے شب غم وہاں بہار شباب
کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے
الٹ دیا غم عشق مجازنے پردہ
حجاب حسن ہیں کچھ راز تھے حقیقت کے

نہیں ضرور کہ مرجائیں جاں نثار تیرے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

اے تری شان کہ بتخانہ تو کعبہ بنجائے
دل کہ مسکن ہے ترا کعبہ سے بتخانہ بنے
لب تک آجائے غم ہجر تو شکوہ ہو جائے
آپ سن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی
دل انکے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

اب برق نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب
جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی

کسطرف جوش کرم تیری نگاہیں اٹھیں
کون محشر میں سزاوار عتاب آتا ہے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانی
عمر کو عذر بے وفائی ہے

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یا رب
در و دیوار دئے اب انہیں ویرانی دے

اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

ہر در سے ترے طالب ناکام پلٹ آئے
کعبے میں ہے سناٹا، بتخانے کو کیا کہئے
کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانہ کا جل بجھنا
جل کر نہ بجھے ایسے پروانہ کو کیا کہئے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

جو مجھ پہ ہوئی ایسی بیداد نہ کی ہوگی
اللہ کے بندوں پر اللہ کے دشمن نے
یہ رشک و محبت کی روداد ہے اے فانی
اک دوست کے پردے میں مارا غم دشمن نے

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا کے کہ جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

رباعی

ناکام ازل کی کامرانی معلوم
قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید
ورنہ فانی کی زندگانی معلوم



ضروری گذارش

شمع کے منتظم کلرک دفعتاً علیل ہوگئے، اور مسلسل کئی ماہ علیل رہ کر انتقال فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جملہ کاغذات اور امورات، وخطوط وغیرہ نہایت ابتر حالت میں ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ بعض حضرات کے خطوط کے جواب دفتر سے نہیں گئے ہوں، اور ممکن ہے کہ دوبارہ مانگنے پر رسالہ روانہ نہ ہوا ہو۔ ایسی صورت میں ہم خریدار حضرات سے معذرت خواہ ہیں، امید ہے کہ بہت جلد دفتر کی حالت درست کرکے تمام شکایتوں کی تلافی کردی جائیگی۔

جن حضرات کو اپنے جوابات کا جلد انتظار ہو وہ براہ کرم خادم کو پھر مطلع فرمادیں تاکہ ارشاد کی فوراً تعمیل کردی جائے فقط

منیجر شمع



مرزا ثاقب لکھنوی جانشین میر و غالب

جلد ۶ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۴۷ء | نمبر ۴-۵-۶

تصویریں (۱) مرزا ثاقب لکھنوی جانشین میر وغالب (۲) سید رؤف علی بیرسٹر مرحوم

رسالہ

شمع

بابتہ ماہ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۲۷ء

حضرت ثاقب لکھنوی

جانشین میر و غالب

از

(جناب شاکر حسین صاحب سہسوانی)

حسب و نسب مولد و مسکن — مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب کی اصل و نسل اہل طبرستان سے ہے۔ آپکے مورث اعلیٰ حاجی علی قزلباش[۱] ماژندانی تھے جن کو تاریخ عجم علی قلی خاں شاملو

---

[۱] قزلباش کمبرتین بمعنی سرخ سر۔ کسی خاص قبیلہ یا گروہ کا نام نہ تھا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی نے اپنی فوج کی وردی میں بجائے عمامہ ایک تاج سرخ کپڑے کا جسپر بارہ کنگرہ ہوتے تھے بر رعایت اثنا عشریت داخل کیا تھا۔ تمام ان فوج جو اس تاج کو استعمال کیا کرتے تھے اس روز سے قزلباش کہلائے جو بعد میں انکی اولاد کا موروثی لقب ہو گیا ۱۲

کے لقب سے روشناس عالم کراتی ہے یہ بزرگ شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ امرائے دربار سے تھے۔ شاہ موصوف نے جب عباس مرزا اپنے پوتے کو جو زمانہ مابعد میں شاہ عباس کے نام سے مشہور ہوا عالم خُرد سالی میں حکومت خراسان پر مامور کرکے بھیجا تو غایت وثوق کی بنا پر حاجی صاحب کو اُس کا اتالیق اور متکفل مہمات حکومت بنایا۔ شاہ طہماسپ کے بعد محمد مرزا پدر شاہ عباس کے مقابلہ میں شاہ عباس کے ساتھی رہے اور اُسکے استحکام سلطنت کا باعث ہوئے تعزیرات زمانہ کے اثر سے آبائے کرام بسلسلۂ تجارت وارد ہندوستان ہوئے جس کو تقریبًا دو سو برس کی مدت گزرتی ہے۔

مقام آگرہ محلہ گلاب خانہ میں ایک کوٹھی مع ایک مسجد کے پرانی بنی ہوئی ہے جس کے محاذ میں ایک عظیم الشان امام باڑہ ہے۔ یہ عمارتیں آپ کے اجداد حقیقی حاجی مہدی اور حاجی حسن کے نام سے مشہور ہیں۔ امام باڑے کے چپ و راست چند پختہ مکانات ہیں جن میں آپ کے اہل خاندان آباد ہیں اس محلے سے تھوڑے ہی فاصلہ پر حاجی حسن کا کٹرہ واقعہ ہے یہ مقام اب بھی آپ ہی کے اعزہ واقربا سے معمور ہے۔

عہد دولت برطانیہ میں آپ کے اہل خاندان کو بصلہ خیر خواہی گورنمنٹ شرکت دربار شاہی کا اعزاز حاصل ہوا اور خلعت فاخرہ سے معزز وممتاز فرمائے گئے۔ اکثر اراکین خاندان اپنی ذاتی وجاہت اور علم وفضل کے باعث عہدہ ہائے جلیلہ پر سرفراز رہے چنانچہ یہ سلسلہ بفضلہ تعالےٰ اسوقت تک جاری ہے۔

حسن اتفاق سے کالا محل جو میرزا غالب مرحوم کا مولد اور عنفوان شباب تک اُن کا مسکن رہا ہے اسی محلہ گلاب خانہ سے بالکل ملحق واقع ہے۔ وہیں ہمارا ہونہار مرزا ۱۹ ماہ مبارک صیام ۱۲۸۵ھ ہجری شب شنبہ مطابق ۲ ماہ جنوری ۱۸۶۹ء کو چار بجے صبح کے قریب شاعری کی مجسم تصویر بن کر عالم وجود میں آیا۔

کرشمہ قدرت کیا عجیب اتفاق ہے کہ جن اصحاب کمال کی ترکیب جسمانی میں آگرے کی خاک اور جمنا کے پانی کا امتزاج ہے دُنیا میں وہ کوئی نہ کوئی درجہ امتیازی حاصل کرکے رہے ہیں۔ دیکھیئے خان آرزو۔ میرتقی۔ مرزا غالب۔ نظیر اکبرآبادی اپنے اپنے طرز وروش کلام میں کس پایہ کے لوگ تھے اور اب ہمارے مرزا کی نسبت قدر شناسان سخن کا کیا خیال ہے۔

ایک جملہ معترضہ اہل کمالات کی ضمن میں خان آرزو وغیرہ غالب کے ساتھ نظیر اکبرآبادی کو منسلک کرنے پر بعض طبائع میں استعجاب ہوگا جو غالباً میری کورذاقی پر محمول کیا جائے مگر مجھے اسکا بالکل اندیشہ نہیں۔ حق کا پلہ ہمیشہ باطل پر غالب رہتا ہے۔ جسطرح دوسرے گل وبلبل کی فسانہ خوانی میں وقت عزیز صرف کرنے والے ظاہری رنگ آمیزی بے معنی کے دلدادہ اُس کے کلام کو رکیک وسوقیانہ سمجھتے ہیں میں بھی اوسی طرح اُن کی ہم نوائی کرتا مگر اس حقیقت سے نظر پوشی کرنا کیسے ممکن ہے کہ جو باتیں فطرتی شاعری کا جزو لاینفک ہیں نظیر کا کلام اُس سے بھرا پڑا ہے اور اسباب ہیں اوسکا ہر شعر بے نظیر ہے۔ کس قدر صریح ناانصافی ہے کہ مجمع اُدبا وفضلا میں جب شیخ الرئیس حکیم بوعلی سینا کے قصیدے کا جس کا مطلع یہ ہے۔

هبطت الیک من المحل الارفع ورقاء ذات تعزز وتمنع

اور جس کی شرح لکھنے میں متعدد ارباب کمال نے زور قلم کے جوہر دکھائے ہیں تذکرہ ہو تو سامعین کی روح وجد میں آجائے اور ہر طرف سے تعریف کے پل بندھ جائیں اور جب اُسی موضوع پر میاں نظیر کا ہنس نامہ سُنایا جائے تو عامیانہ متصور ہو۔ یہ دونوں نظمیں روح حیوانی کے بیان میں موزوں کی گئی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ شیخ کا کلام عربی ہے اور وہ خود اسقدر اک حقیقت میں دست وپا گم کرکے عالم حیرت میں جہاں تھا وہاں کا نہیں کھڑا رہگیا ہے اور میاں نظیر کی زبان اُردو ہے وہ اس مرحلے کو ایسا ہی پاک وصاف طے کرگئے ہیں جیسے نظر عینک سے بے تکان گزر جاتی ہے۔ پہلی نظم میں نفس کی تشبیہہ کبوتر کیساتھ ہے اور دوسری میں اسکو ہنس سے تعبیر کیا گیا ہے

رجوع الی المطلوب

مرزا صاحب کے سال پیدائش ہی کے ماہ جولائی میں اونکے والد بزرگوار مولوی آغا محمد عسکری قزلباش المعروف بہ مرزا محمد حسین وکیل مرحوم جو بوجوہ چند سکونت اکبرآباد سے برداشتہ خاطر و تنگدل تھے ہمیشہ کے لئے ارباب وطن کو خدا حافظ کہہ کر معہ اپنے اہل خانہ اور اس شش ماہہ مولود مسعود کے لکھنو چلے آئے جس کی آب و ہوا میں یہ نونہال چند سال تک نشو و نما پاتا رہا۔ ملازمت پیشگی کے باعث سے بڑے مرزا صاحب کا مستقل قیام شہر لکھنو میں غیر ممکن تھا اسوجہ سے بعض اعزہ کی موجودگی کی بدولت حسب معمول زمانہ کبھی یہ لکھنو میں رہے اور کبھی الہ آباد میں جہاں بسبب ملازمت بڑے مرزا صاحب سکونت پذیر تھے۔ یہاں تک کہ بڑے مرزا صاحب ملازمت سرکاری سے مستعفی ہو کر ۱۸۸۶ء میں بھوپال تشریف لائے اور ریاست سے درجہ اول کی سند وکالت حاصل کی۔ موصوف الیہ چونکہ فطرتاً نہایت ذہین و زکی الطبع واقع ہوئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ زیور علم و فضل سے بھی آراستہ تھے بہت جلد کافی نام و نمود حاصل کر لیا۔ اپنی طلاقت لسانی و سحر بیانی سے جماعت وکلا میں سربرآوردہ و ممتاز سمجھے جانے لگے۔ بارہ سال مستقل قیام کرنے کے بعد ۱۸ ر اپریل ۱۸۹۸ء کو آپ نے بھوپال چھوڑا اور لکھنو میں دائمی سکونت اختیار کر لی جہاں ۲۶ ر اگست ۱۹۰۱ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرما کر راہی دار البقا ہوئے۔ جناب مرزا صاحب مرحوم صاحب تالیف و تصنیف تھے۔

ابتدائی تعلیم اور جذبات شادی کا نمو۔ استبداد و حریت کی کشمکش

ثاقب والا مناقب کی تعلیم و تربیت محض امر کمبخت شاعری کی بدولت جناب میرزا صاحب مرحوم کے حسب منشا اعلیٰ پیمانے پر نہ ہو سکی جس کا افسوس ان مرحوم کو تادم واپسین رہا۔ مگر پھر بھی بحد کمال فارسی اور بقدر ضرورت عربی اور انگریزی میں اون کو کافی مہارت حاصل ہے ان کی طباعی و ذہانت علوم و فنون متداولہ میں ان کا کسی سے پیچھے رہجانا گوارا نہیں کرتی۔

بیٹا فطرۃً شاعر پیدا ہوا تھا اور باپ کو بالطبع اس فن سے نفرت کلی تھی جسکا انجام وہی ہوا جو قدرتاً ہونا چاہیے تھا یعنی اس ہونہار شاعر کے جذبات نفس دل ہی دل میں گھٹتے رہے اور سعادتمندانہ رضا جوئے پدری کی رکاوٹ نے آزادی کے ساتھ اونکو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہ امر داخل بدیہیات ہے کہ آلات رمی پر جسقدر دباؤ زیادہ ڈالا جائے اتنی ہی قوت رمی اون میں بڑھجاتی ہے۔ قدرت نے جو مادہ فن طبیعت میں ودیعت رکھا تھا وہ بیکار نہ تھا اور نہ اس لئے کہ اس کو غیر طبعی اسباب روکے رہیں۔ قدرتی سیلاب کا مصنوعی احتیاطیں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آخر جوش طبیعت دب نہ سکا اور اس سے بغیر گل کھلائے نہ رہا گیا۔ فطرتی طغیانی جذبات نے اپنے بہاؤ کیلئے ایک دوسرا راستہ نکال لیا۔ یعنی جبکہ آپ ۱۸۸۱ء میں آپ ایک طالب علم کی حیثیت سے تحصیل علوم میں مشغول تھے اور انوار سہیلی اور سکندر نامہ کا درس لے رہے تھے اور منازل عمر سے تیرھویں منزل کے جادہ پیما۔ موانع ناراضی پدر بزرگوار کے باعث سے خود نہ تو شاعروں میں شرکت کر سکتے تھے اور نہ علی رؤس الاشہاد غزل پڑھنے کی جرات تھی لیکن شاعروں کی طرحوں میں غزلیں لکھ کر اپنے ہم درس وہم مکتب طلبا کو جن کی فرمایش سے وہ غزلیں کہی جاتی ہیں دیدیا کرتے تھے۔ لکھوانے والے ان غزلوں کو اپنے اپنے نام اور تخلص سے شاعروں میں پڑھ کر سرخ روئی حاصل کرتے اور یہ فقط اتنا سننے ہی پر کہ فلاں غزل شاعری میں خوب پھیلی اور اس شعر کی اساتذہ باکمال نے اچھی تعریف کی۔ اکتفا کر کے اپنا مرجھایا ہوا دل خوش کر لیا کرتے۔ تھے۔

حکمائے محققین و اساتذہ علم ادب کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ فطرت ہی شاعر پیدا کرتی ہے۔ شاعر کسی کے بنانے یا خود بننے سے جیسا پہلے ابھی اشارہ کیا گیا ہے کوئی نہیں بن سکتا۔ طبع سلیم کو رہنما یا استاد کی احتیاج نہیں ہوتی۔ عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی طاؤس کے بال و پر میں گلکاریاں کر دی جایا کرتی ہیں۔ بلبل کی ترانہ سنجی دنیا کے کسی استاد فن موسیقی سے مشق تعلیم و سبق آموزی کی محتاج نہیں۔ الشعراء تلامیذ الرحمن ایک مشہور

مقولہ ہے جس کا بدیہی ثبوت ہمارے مرزا کی شخصیت ہے۔ درحقیقت یہ نعمت بے بہا ایک ودیعت آلہی و عطیہ یزدانی ہے جو نصیبوں سے صرف مستحقین ہی کو ملا کرتی ہے۔ ہر کہ دمہ اسکا اہل نہیں ہے کہنے کے لئے ہر موزون طبع شاعر ہے مگر صحیح معنی میں اس معزز لقب کا اہل وہی ہوگا جس کو فطرت نے شاعر پیدا کیا ہو ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نبخشد خدائے بخشندہ

یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں حشرات الارض کی طرح شاعر پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں مگر درجہ قبولیت حاصل کرنے والے ان میں شاذ ہی ہوتے ہیں جو اپنے بعد اپنا نام قیامت تک قائم رہنے کے لئے دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں۔

امتحان شاعری کا پہلا معرکہ

زمانہ قیام الہ آباد میں مرزا صاحب کی مشق سخن کو چوتھا سال تھا کہ شیخ محمد جان صاحب حیرت الہ آبادی کی تحریک معیت نے ان کو شاہزادہ میرزا قیصر بخت فروغ دہلوی کی صحبت میں جا پہونچایا یہ واقعہ ماہ دسمبر ۱۸۸۸ء کی یادگار ہے جناب شاہزادے صاحب مرحوم اس زمانہ میں وہاں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ گو ملک و دولت اس شاہی خاندان سے کنارہ کر چکے تھے لیکن علم و فضل اور صحت مذاق نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا جیسے شاہزادے صاحب برگزیدہ و مجمع اوصاف تھے ویسے ہی ان کی صحبت کے لوگ بھی منتخب و صاحب علم و ہنر تھے چنانچہ اس جلسہ میں علاوہ دوسرے اصحاب کمال کے حافظ زکریا خاں صاحب زکی تلمیذ غالب مرحوم قاضی نجم الدین خاں صاحب برق شاگرد مومن دہلوی خان بہادر ذو القدر خواجہ غلام غوث بیخبر دہلوی شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی موجودگی اس دعوی کا ثبوت بیّن ہے جناب حیرت نے ایک معقول تمہید و تقریر کے ساتھ حاضرین بزم علی الخصوص جناب شہزادہ صاحب

سے ان کا تعارف کرایا۔ یہ پہلا دن تھا کہ ہمارا ہونہار شاعر ایک اہل فن کی حیثیت سے ارباب کمال کی صحبت میں باریاب ہوا اور پہلا ہی موقع تھا کہ ایسی بھری محفل میں جہاں زبان کھولنا دشوار تھا امتحان سخت کا سامنا کرنا پڑا۔

جناب فروغ کے ارشاد سے چند شعر پڑھے جو بلحاظ سن و سال مرتبہ شاعر نومشق سے بالاتر سمجھے گئے۔ چونکہ جناب حسرت نے ہمارے نوعمر جوان طبیعت مرزا کے وہ فضائل و مناقب بیان کئے تھے جو اس کمسنی کے اعتبار سے کسی طرح قابل یقین نہ تھے امتحان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جناب فروغ نے ان کے سن و سال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مصرعے پر گرہ لگانے کی فرمایش کی۔ ع

پر مارتے ہیں چرخ کے سینے پہ پھٹاپھٹ

فروغ مرحوم کی زبان سے اس مصرعے کا نکلنا تھا کہ مرزا نے بغیر کسی توقف کے دوسرا مصرعہ بہم پہنچا کر یہ پورا شعر سنا دیا ؎

ایسے ہیں مرے نالہ و افغاں کے کبوتر
پر مارتے ہیں چرخ کے سینے پہ پھٹاپھٹ

تضمین سنتے ہی ساری محفل دنگ ہوگئی مرزا کی ذہانت و ذکاوت کی بے انتہا تعریف کی گئی۔ معاملہ اسی جگہ ختم تھا مگر جناب حیرت نے اپنے دعوے کو ناقص چھوڑنا قرین مصلحت نہ سمجھا کچھ اور فرمایش کی تحریک کی چنانچہ اُن کے اشارہ و ایما سے جناب برق دہلوی اس طرف متوجہ ہوئے اور یہ مصرع پڑھ کر۔ ع

نہ وہ آسماں کی ہیں گردشیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

ارشاد فرمایا کہ میاں اس طرح میں کچھ طبع آزمائی کرکے دو چار شعر سناؤ۔

حضرت کو نہ تو قلم دوات کی ضرورت تھی نہ خلوت کی احتیاج تھوڑی ہی سی مشغولی فکر یعنی کم و بیش نصف گھنٹے میں جبکہ حاضرین مجلس اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے گیارہ

شعر کی ایک مرصع غزل زبانی کہہ کر مطلع سے مقطع تک پڑھ کر سنا دی۔ حاضرین جلسہ نے نعرہائے تحسین و آفرین سے آیندہ شاعر کامل بننے والے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ خاں مرحوم نے ان الفاظ کے ساتھ دادِ سخن دی " میاں صاحبزادے اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہوگے "۔ یہ مبارک کلمات کچھ ایسی ساعتِ سعید میں اس مرحوم بزرگ قوم کی زبان سے نکلے تھے کہ انجام کار اس کی پیشین گوئی پوری ہو کر ہی رہی اور آج الفاظ " جانشین میر و غالب " ثاقب کے نام کے اجزائے لاینفک ہیں۔

وہ غزل اپنی اصلی حالت پر درج ذیل ہے جس کو ایک تازہ مشق نو عمر شاعر کا کلام ہونے کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے نہ کہ حال کے گھٹے منجھے ہوئے شاعر ثاقب کی نظر سے ؎

رخ و زلف کا ہوں فسانہ خواں یہی مشغلہ یہی کام ہے
مجھے دن کا چین عذاب جاں مجھے شب کی نیند حرام ہے

ترے انتظار میں ہے تعب یہ مریض ہجر ہے جاں بلب
کہیں آ بھی وعدہ خلاف اب کہ یہاں تو کام تمام ہے

نہ وہ مہر و ماہ کی تابشیں نہ وہ اختروں کی نمائشیں
نہ وہ آسماں کی ہیں گردشیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

کہوں حسرتوں کا ہجوم کیا درِ دل تک آ کے وہ بیوفا
مجھے یہ سنا کے پلٹ گیا کہ یہاں تو مجمع عام ہے

نہ ستائیں وہ نہ ستائیں وہ ادھر آئیں وہ ادھر آئیں وہ
نہ سہی مجھی کو بلائیں وہ یہ خیال باطل و خام ہے

مرے دم پہ عشق میں ہے بنی تجھے وعظ و پند کی ہے پڑی
مرے ناصحا تجھے بندگی تری دوستی کو سلام ہے

تپ غم سے ہوتی ہے اب مفر کہ طبیب رگ ہے چارہ گر

مرا قصہ آج ہے مختصر مری داستان تمام ہے

ہے کہاں وہ ساقیٔ تند خو کہ ہے میکدہ میں یہ ہائے وہو
کہیں سرنگوں ہیں خم و سبو کہیں شیشہ ہی کہیں جام ہے

نہیں دل کو فکر یہ بے سبب گیا دن کہاں ہوئی رات کب
مجھے روز وصل یہ ہے عجب ابھی صبح تھی ابھی شام ہے

نہ وہ میہمان حریم دل نہ خیال اسُ کا مقیم دل
ہوئی قطع رسم قدیم دل نہ پیام ہی نہ سلام ہے

کہیں حسن والوں کے درمیاں یہ غزل سُنی تو کہا کہ ہاں
یہ ہی نظم ثاقب خوش بیاں یہ اسُی کا طرز کلام ہے

سونے میں سہاگا

زبان انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جولائی ۱۸۸۷ء میں آپ بعض مقتضیات وقت کا لحاظ کرکے سینٹ جانس کالج میں داخلے کے لئے پھر آگرے بھیجے گئے۔ جہاں ماہ اپریل ۱۸۹۱ء تک آپ کو قیام کرنا پڑا۔ حُسن اتفاق سے وہاں انکا سابقہ ایک ایسے شخص سے پڑا جس نے ان کی شاعری کے لوازم اچھی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا دے۔ یہ بزرگ امروہے کے رہنے والے ملک الشعرا مہدی علیخاں ذکی مرادآبادی کے ارشد تلامذے تھے فن نظم کی مشق کرتے ہوئے انکی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ نام نامی مولانا میر مومن حسین اور صفی تخلص تھا۔ آگرے کے لوگ ان کو ماہر فن عروض و شاعر باکمال سمجھتے تھے۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر یکساں قادر تھے۔ خوشنویسی میں بھی اچھی درسگاہ تھی نسخ و نستعلیق دونوں خطوں کے اوستاد جید مشہور تھے۔ فن عروض و قافیہ میں رسالہ طوبیٰ العروض منظوم بزبان اردو جو غالباً ۱۸۷۲ء میں مطبع نول کشور واقع لکھنؤ سے شائع ہوا تھا انہیں مرحوم کی یادگار ہے۔

ہمارے مرزا جب ان کی خدمت میں باریاب ہوئے تو وہ ان کی جدت ذہن وجودت

طبع ملاحظہ کرکے بہت خوش ہوئے۔ اور بڑی قدر و منزلت فرمانے لگے ضیق فرصت کے باعث اپنے اکثر تلامذہ کا کلام اصلاح کے لئے ان کے سپرد فرما دیا کرتے تھے اور اس کے بعد عندالضرورت خود ترمیم فرماتے تھے۔ اُن کو مرزا صاحب کی سلامت طبع پر کچھ ایسا وثوق تھا کہ جب کسی شاعرے کے لئے خود کوئی غزل تصنیف فرماتے تو انتخاب اشعار کی خدمت انہیں کے سپرد کیجاتی فرصتِ وقت سے فائدہ اٹھا کر مرزا نے فن عروض اور کچھ حصہ علم معانی و بیان و بدیع کا انہیں مرحوم سے حاصل کیا ہے۔

سلسلہ تعلیم ختم ہونے کے بعد آپ کا قیام زیادہ تر بھوپال میں ہونے لگا۔ یہ زمانہ ان کے عنفوان شباب کا تھا اور جذبات طبع کی اُمنگیں شاعری کے لباس میں اپنے حسن روز افزوں کی بہار دکھا رہی تھیں۔ جن کی بدولت اکثر و بیشتر راتیں فکر سخن میں گزر گئی ہیں اور ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ شعر کی دُہن میں کھانے پینے کا مطلق ہوش نہیں رہا ہے۔ یہ حالات یک جائی و صحبت ہر روزہ کے سبب سے چشمدیدہ ہیں۔ مشاعروں کی صحبت میں اگرچہ شرکت کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا جس کی وجہ اوپر بیان کردی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی جب کبھی بزم انشاد میں آپ پہونچ جاتے تھے مشاعرے میں جان پڑ جاتی تھی۔

انداز غزل خوانی

قدرت نے جس طرح ان کو انداز سخن گوئی میں دوسروں سے ممتاز کیا ہے ویسا ہی طرز غزلخوانی میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اس دلکش انداز اور مؤثر لب ولہجہ سے شعر پڑھتے ہیں کہ سامعین پر ایک عالم وجد طاری ہو جاتا ہے اور چھوٹے بڑے فرط طرب سے مبہوت ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔ زمانہ سابق میں کسی لحن یا ترنم کے ساتھ غزل سرائی کا دستور نہ تھا یہ زمانہ حال کی ایجاد ہے جس کو بہت ہی کم مدت ہوئی ہے۔ یہ طرز کلام کو وقیع بنانے اور اوس میں دلکشی پیدا کرنے کی غرض سے ایجاد کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک عیب پوش و مؤثر ضرور ہے مگر موجودہ زمانے میں بھی بارہا تجربہ کیا گیا ہے کہ اچھے سے اچھا خوش لحن اور بڑے سے بڑا ماہر فن موسیقی بھی ہنگام غزل خوانی مرزا کی نہایت سادہ اور پرجوش

خواندگی کے سامنے بزم سخن میں اپنا رنگ نہیں جما سکا۔ اکثر دعوے کے ساتھ حریف بیٹھے ہیں اور بازی ہار کے اُٹھے ہیں۔

الہ آباد کا ایک مشاعرہ

تین چار ہی سال ہوئے ہیں کہ مجھے بعض ضرورتیں وطن سے الہ آباد لے گئیں وہاں پہونچکر دوران ملاقات میں مخدومی جناب میر اکبر حسین صاحب اکبر مرحوم الہ آبادی سے معلوم ہوا کہ آج شہر میں ایک جگہ بہت ہی بڑے پیمانے پر بزم مشاعرہ منعقد ہونے والی ہے جس میں نکتہ سنجان شہر کے علاوہ دوسرے مقامات کے مشاہیر شعرا بھی شرکت کے لئے طلب ہو کر آئے ہیں۔ میر مشاعرہ صاحب کی جانب سے جناب موصوف کو بھی دعوت شرکت جلسہ و تکلیف تحریر غزل دی گئی تھی۔ حضرت مرحوم چونکہ اپنے عوارض اور دوسرے خاص وجوہ کے باعث شرکت سے معذور تھے میری حاضری سے کچھ ہی قبل طرحی غزل لکھ کر معذرت نامہ کے ذریعہ سے روانہ فرما چکے تھے۔ مسودہ اُس کا موجود تھا جس سے میری سامع نوازی فرما کر تاکیداً شرکت جلسہ پر مجھے آمادہ کیا۔ گو ایسی صحبتوں سے مجھے کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہی ہے مگر بیکاری میں وقت صرف کرنے سے اُس وقت یہ مشغلہ بہتر معلوم ہوا۔ اس لئے اپنے ایک عزیز کے ساتھ جو اس صحبت میں مدعو تھے ایک تماشائی کی حیثیت سے میں بھی مشاعرے میں جا پہونچا۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میرا یہ جا پہونچنا اتفاقیہ تھا یا کسی کشش نے مجھے وہاں پہونچنے پر مجبور کیا تھا یعنی میری اُس خوشی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو وہاں پہونچ کر خلاف امید مرزا صاحب کی موجودگی اور اُن کے اچانک مل جانے سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد غزل خوانی شروع ہوئی۔ اُس صحبت میں جس کو بزم مشاعرہ بہ لحاظ حالات نمایشگاہ فن موسیقی کہنا ناموزوں نہیں ہے بیشتر ارباب کمال نے اپنے سخن سنجی کے پردے میں اس فن خاص کی مہارت کامل کا ثبوت ہر طرف کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے دلوایا اور اپنے کمال غزل سرائے و جولانی طبع کا نذرانہ سامعین کی تحسین و آفرین سے حاصل کیا لیکن جب شمع ہمارے مرزا کے سامنے آتی ہے تو سب کے چراغ گل تھے اور ان کی سالہ شعر خوانی سارے نغمہ و سرود کا لطف دلوں سے محو کر کے اپنا سکہ بٹھا رہی تھی۔

انکے رنگینی کلام حسن تخئیل کی مقناطیسی قوت پڑھنے کا انداز دل کھلکر دلونمیں وہ اثر پیدا کرتے ہیں جو دیکھنے اور سننے ہی سے تعلق رکھتا ہے معرض بیان میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ میرے محترم عنایت فرما اور خاص کرم گستر جناب قاضی میر محفوظ علی صاحب رئیس بدایوں ناقل تھے کہ لکھنؤ میں ثاقب صاحب کی غزل خوانی کا مجھپر یہ اثر ہوا ہے کہ بے اختیار بار بار جی چاہتا تھا کپڑے پھاڑ ڈالوں اور چیخیں مارکر رونا شروع کردوں۔ حاصل کلام یہ پال میں بلالحاظ سن وسال مرزا صاحب کا شمار اُن اصحاب فن میں ہونے لگا جن کی مشق سخن حد کمال کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ مقبولیت کلام اس حد پر تھی کہ ہر صاحب مذاق سلیم کی زبان پر آپکی خوش بیانی کا افسانہ تھا۔ ناقدان فن رؤسا و امرا و اکابرین ریاست بالاتفاق آپکے مداح اور آپکے کلام کے دلدادہ تھے ہر صحبت میں آپکا کلام پڑھا جاتا تھا اور سننے والے محظوظ ہوتے تھے خصوصاً حکیم سید عماد الحسن صاحب مرحوم صفی پوری اور مولوی شاہ قطب عالم صاحب صفی پوری تو گویا آپکے جواہر افکار کے عاشق زار تھے۔ قبلہ حافظ خان محمد خاں صاحب مرحوم شہیر تخلص مخاطب بہ افتخار الشعرا۔ شاگرد میرزا غالب مرحوم وجناب منشی صابر حسین صاحب مرحوم صبا بے سہوانی والد ماجد نامہ نگار جو فارسی و اردو میں مسلمہ طور پر اساتذہ فن سمجھے جاتے تھے مرزا صاحب کے کلام کو نہایت قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ بزرگانہ محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں صاحب خلف الصدق آقائی ومولائی جناب نواب محمد صدیق الحسن خاں صاحب مرحوم و مغفور جو اب ایک مدت دراز سے لکھنؤ میں قریب لال باغ تشریف فرما ہیں اور اُن کے برادر بزرگ نواب سید نور الحسن خاں صاحب مرحوم سے تو آپ کے بیحد مراسم تھے جو حضرت اول الذکر کے ساتھ آجتک بدستور قائم ہیں۔ نور محل اور شاہجہاں آباد میں شبانہ روز شعر و سخن کی خاص صحبتیں گرم رہا کرتی تھیں اور ہر وقت کی نشست و برخاست یک جائی تھی ؎

الا لیت ایام الشباب جدیدٌ
ودھرا قد مضی یا بثینُ یعوْدُ

مکرمی جناب منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی مصنف ترانہ شوق شاگرد رشید اسیر مرحوم

بھی بسلسلہ ملازمت اس زمانے میں وہاں موجود تھے وہ بھی ان کے معترف کمال رہا کرتے تھے۔

امتحان طبیعت کا دوسرا معرکہ

ایک مرتبہ بعض حسد پیشہ مدعیان سخن کی وجہ سے یہ امر قرار پایا کہ ایک جلسے میں سب سے غزلیں لکھوا کر ہمیشہ کے لئے یہ جھگڑا ختم کر دیا جائے۔ دن اور وقت مقرر ہو کر اس مشغلہ کے لئے غریب خانہ منتخب کیا گیا۔ حسن اتفاق سے ابھی جلسے کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ منشی تیغ بہادر صاحب مرحوم مالک مطبع انوار محمدی لکھنؤ اور خواجہ محمد وزیر صاحب ایک دوسرے صاحب مطبع لکھنؤ معہ دیگر چند احباب کے جو حضرت والد ماجد مرحوم سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے پہونچ گئے۔ ان حضرات نے شرکت صحبت کو اپنے رفع تکان سفر پر ترجیح دے کر نہایت خوشی سے لطف جلسہ حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی چنانچہ مجمع پورا ہو جانے پر غالباً خواجہ صاحب یا کسی دوسرے صاحب نے مصرع طرح تجویز فرمایا اور ایک گھنٹے کی میعاد مقرر کر کے جملہ حریفوں کے سامنے جن کی تعداد علاوہ سامعین کے پندرہ بیس کے اندر تھی کاغذ قلم دوات جو پیشتر سے مہیا کر رکھے تھے رکھوا دئے مرزا صاحب اگرچہ وقت مقررہ سے بہت پہلے اپنا کام انجام کو پہنچا چکے تھے مگر دوسروں کے لئے ختم مدت کا انتظار ضروری تھا۔ اس لئے وقت گذر جانے پر غزل خوانی شروع ہوئی کسی صاحب کے پانچ شعر تھے اور کسی کے ساتھ آٹھ مگر مرزا صاحب کی غزل تیرہ شعر کی تھی اور سب ایسی کہ جسکی بدولت یہ معرکہ انہیں کے ہاتھ رہا۔

ان پردیسی حضرات کی تحریک سے تیسرے روز ایک پورا مشاعرہ قرار پایا جس کے لئے اسی وقت مصرعہ طرح تجویز کر کے مشتہر کر دیا گیا تھا۔ جناب والد ماجد مرحوم جو بحصول رخصت وطن تشریف لائے ہوئے تھے ایک روز قبل اس مشاعرے سے وہ بھی واپس تشریف لے آئے غرض یہ کہ یہ دوسرا مشاعرہ جس میں اساتذۂ شہر اور بڑے بڑے ارباب ذوق سامعین کی حیثیت سے شریک صحبت تھے بہت آب و تاب کے ساتھ ختم ہوا اور اس میں بھی میدان سخن ہمارے مرزا ہی کے ہاتھ رہا۔

انداز شعر گوئی
کیف استغراق

ہمارے مرزا کو برجستہ و قلم برداشتہ شعر کہنے کا ایک خداداد ملکہ ہے جن حضرات نے ان کو دیکھا بھالا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت ہر وقت فکر سخن میں منہمک رہتے ہیں حتیٰ کہ راہروی میں بھی داہنے بائیں کسی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آپ کا سرمایہ شاعری زیادہ تر راستہ چلنے ہی میں مکمل ہوتا ہے۔ جس قدر تیز رفتاری میں ترقی ہو سمجھ لیجئے کہ اسی قدر افکار سخن کی اسٹیم تیز ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے سانحات پیش آئے ہیں کہ اس استغراق کی بدولت سخت صدمات اٹھانا پڑے ہیں ایک دن کا واقعہ ہے کہ مزدور سامنے سے خاردار لکڑیوں کا گٹھا سر پر رکھے چلا آرہا تھا حضرت عالم محویت میں اس سے ٹکرا گئے۔ اور پیشانی لہو لہان ہوگئی مگر جناب کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ کیا گذری اور کس راستے میں ایک دوست نے خون آلودہ پیشانی دیکھ کر جب اس طرف توجہ دلائی ہے تو آپ چوٹ سے آگاہ ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایک بار اپنی دھن میں مدہوش آپ ایک زنانہ مکان میں غلطی سے گھس پڑے۔ گھر والوں نے شور مچایا تو الٹے پاؤں واپس ہوئے ہیں خوش قسمتی سے صاحب خانہ آپ سے اچھی طرح واقف تھے ورنہ خدا جانے کیا نوبت آتی۔ کبھی کبھی استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنے خاص الخاص دوستوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ لکھنؤ میں ایک دوست نے آپ کے سامنے ہی بیان کیا کہ چودھری شفیق الزماں خاں صاحب تعلقہ دار رسیجہ (اودھ) جو آپ کے کلام کے شیدائی اور مربی و محسن ہیں اور جن کے جملہ اہل خاندان سے آپ کے گہرے تعلقات ہیں۔ ایک روز امین آباد کے بازار میں آپ کو مل گئے اور راہ میں ٹوک کر صاحب سلامت کی۔ خدا جانے حضرت اس وقت کس خیال میں محو تھے کہ سلام کا جواب حسب عادت دے کر مزاج پرسی کے بعد ان سے دریافت فرماتے ہیں کہ آپ کون بزرگ ہیں۔ چودھری صاحب کو اس ادا سے حیران ہو کر کہنا پڑا کہ میں شفیق ہوں تب کہیں آپ ہوش و حواس میں آئے اور نہایت عاجزی سے عذر خواہ تقصیر ہوئے۔ اس قسم کے اور بھی بہت واقعات ہیں جن سے مرزا صاحب کے ملنے والے یا جہاں جہاں آپ رہے ہیں وہاں کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔

تاریخ گوئی

اس فن سے میرزا صاحب کی طبیعت کو مطلق لگاؤ نہیں ہے مگر اکثر موقعوں پر دیکھا اور سنا گیا ہے کہ آپ نے فرمایش کے ساتھ مجبوری سے ادنے توقف میں برجستہ تاریخیں بھی کہی ہیں جو نہایت پسندیدہ و مقبول ہوئیں۔

حضور طبع

زود گوئی اور فی البدیہہ سخن سرائی کے جن واقعات کا تذکرہ اوپر آچکا ہے وہ خاص حالات کے ماتحت تھے لیکن اُس کے علاوہ بعض مواقع پر یوں ہی اُن سے فرمایشوں کی فوری تعمیل کرائی گئی ہے جس میں میرزا صاحب نے نہایت شگفتگی خاطر کے ساتھ حصہ لیا ہے یہ برجستہ شعر گوئی اُن کے حضور طبع کی بیّن دلیل ہے۔ بھوپال میں اکثر ان کے قلم برداشتہ غزل لکھنے کا لوگوں کو تجربہ ہے اسی بنا پر وہاں عامۃً یہ فقرہ زبان زد تھا کہ "میرزا شعر کہنے میں آندھی ہے"

ایک دن جناب سر مہاراجہ صاحب بہادر والی محمود آباد کو بہ مشورہ ماسٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم و شہزادہ مسعود قدر صاحب خیال ہوا کہ میر تقی مرحوم کی اس طرح میں ع

نیچی نیچی نظریں کیا یہ اوپر اوپر جائیں گی۔

اس قید کے ساتھ کہ ہر شعر کے ارکان صدر و ابتدا میں تکرار لفظی ہو میرزا سے غزل لکھوائی جائے یہ کوئی امتحان نہ تھا نہ فی البدیہہ غزل لکھنے کی فرمایش تھی لیکن مرزا نے اسی صحبت میں تھوڑی ہی سی فرصت وقت کے اندر سترہ شعر کی غزل کہہ کر پیش کر دی جو درج دیوان ہے۔ سر مطلع غزل یہ ہے ع

روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہائنگی

سلسلہ تالیف و تصنیف

شاعری کا انہماک ان کو کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا لہٰذا اسباب کے وقایع سے آپ کا کارنامہ زندگانی بالکل سادہ و معرا ہے البتہ ۱۹۰۲ء میں بعض احباب خاص کے اصرار بلیغ پر ایک ڈراما لکھا تھا جو بیحد مقبول خاص و عام ہوا۔

سرمایہ سخن

اس کثرت مشق و بے انتہا مشغولی فکر کے لحاظ سے مرزا صاحب کا ذخیرہ کلام ایک اچھی حیثیت کا معتدبہ مقدار میں مہیا ہونا چاہیئے تھا۔ مگر افسوس کہ بدقسمتی نے اُن کا اس امر میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ باوجود ایسی محنت شاقہ کے جس کا کافی اثر صحت جسمانی پر پڑ چکا ہے بلکہ جس کی بدولت مدتوں سے آج تک خون تھوک رہے ہیں اپنی جیب کی طرح بیچارے اس خزانے سے بھی محروم ہی رہے اُن کی اکثر غزلیں قصائد مثنویاں مسدس وغیرہ دوسری نظمیں بہ تعداد کثیر یا تو بے توجہی کے ہاتھوں برباد ہوئیں یا نذر احباب ہوتی رہیں کلام کے اس طرح تلف ہونے میں کچھ تو اُن کی استغنا ر لاپرواہی اور فیاضی کا دخل ہے اور کچھ شائبہ احتیاج مندی کا بھی شامل ہے جو ناگفتہ بہ ہے بہرکیف موجودہ دیوان میں وہی کلام درج ہے جو حُسن اتفاق سے یاروں کی دستبرد اور اضاعت و اتلاف سے بچ رہا ہے۔ یہ مجموعہ جس کی ابتدا ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتی ہے انکی پچیس سالہ محنت کا سرمایہ ہے جس کو مرزا کا حاصل زندگی سمجھنا چاہیئے۔ ابھی چند سال قبل کا واقعہ ہے کہ ایک مکمل بیاض جس میں تقریباً بیس بائیس قصیدے اور اسی نوے غزلیں درج تھیں چوری ہو گئی جس کی بعض غزلیں یا اشعار جو وقتاً فوقتاً یاد آئے متفرقات کی ذیل اور ناتمام غزلوں کی ضمن میں درج دیوان ہیں۔

اطوار و عادات

مرزا صاحب فطرتاً نہایت با اخلاق متواضع صاحب مروت سیر چشم ہیں۔ دوستوں اور احباب خاص کی خاطر و مدارات کا تو دوسرا ہی عالم ہے کسی اجنبی کے ساتھ بھی۔ دامے درمے۔ قدمے سخنے۔ جو کچھ حیطہ امکان میں ہو اس سے دریغ نہیں فرماتے۔ اس حالت نقدان نعمت میں بھی اُسی آن بان سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں جو کبھی زمانہ فراغت و خوش حالی میں حاصل تھی۔ کسی اہل غرض یا شاگرد کا جوابی کارڈ یا ٹکٹ جواب کے لئے آئے تو بے حد ناگوار ہوتا ہے اور اس امر کو اپنی توہین سمجھ کر بھیجنے والے کے پاس واپس کر دیتے ہیں طبیعت میں ایثار کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اپنی خواہشوں پر دوسرے لوگوں کی خواہش کو مقدم سمجھتے ہیں۔ عجز و انکسار کا یہ عالم ہے کہ ع۔ نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین

کا مجسم مصداق بنے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کمال اور تفوق کے جو اس وقت اردوئے معلیٰ کی شاعری میں ان کو ہمعصروں پر حاصل ہے کبھی ادعائے شاعرانہ نہیں کرتے۔ جیسا کہ اون کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

نازش فن کیا ہے کہتے ہیں کسے دعوائے نظم
اعترافِ بے سوادی ہے رعونت کچھ نہیں

۱۹۱۵ء میں جبکہ مختلف اخبارات و رسالجات ادبی کے مدیروں اور دیگر اہل الرائے صاحبان تصنیف نے آپ کے نام نامی پر الفاظ (جانشین میر و غالب) کا اضافہ فرمایا تو یہ ملکی خطاب بعض چند پیشہ معاصرین کی دلشکنی کا باعث ہوا۔ آپ نے اطلاع پا کر ایک قطعہ بہ عنوان "عرضداشت" لکھ کر جو ماہ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے رسالہ تمدن میں شائع ہو چکا ہے مجروح دلوں کی یوں مرہم پٹی کر دی ؎

قطعہ

جانشینی میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں
وہ خدائے فن تھے اُن سے مجھ کو نسبت کچھ نہیں

ہو گئے مشق سخن کرتے ہوئے پینتیس سال
اور اب تک حاصلِ رنج و مشقت کچھ نہیں

دوست اپنے حسن ظن سے مجھکو جو چاہیں کہیں
واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں قابلیت کچھ نہیں

آپ نے مجھ کو بُرا سمجھا بہت اچھا کیا
آپ نے تعریف کی تو اسکی حاجت کچھ نہیں

نازشِ فن کیا ہے کہتے ہیں کسے دعوائے نظم
اعترافِ بے سوادی ہے رعونت کچھ نہیں

آ گیا ہوگا کہیں سے میر و غالب کا مذاق
اپنے دل میں تو بجز ذوقِ جہالت کچھ نہیں

جلوہ گاہ حسن ظاہر ہو اگر باطن تو واہ
شعر ناقص ہے جو معنی میں لطافت کچھ نہیں

خاطرِ عزلت گزیں ہے دشمن نام و نمود
مر مٹی ہے جس پہ دنیا اُس سے رغبت کچھ نہیں

اپنے لطفِ طبع کے باعث ہے شغل شاعری
آپ خوش ہوں سُن کے اسکی بھی ضرورت کچھ نہیں

چھپ رہی محفل تو شانِ بے کمالی کیا گھٹی
واہ وا کا غل ہوا بھی تو فضیلت کچھ نہیں

جوہر قابل ہے جس کو مان لیں اہل مذاق
خود وحید عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں

مجھ کو دنیا نے نہ پہچانا غنیمت ہے یہی
شکر ہے اس ناشناسی کا شکایت کچھ نہیں

ذوق فطری چھیڑتا ہے جب تو کہہ لیتا ہوں کچھ　　وہ بھی جز افشائے اسرارِ محبت کچھ نہیں
واردات نفس کے جھگڑے ہیں یا طومارِ غم　　ماسوائے درد دل حرف و حکایت کچھ نہیں

دل نے سمجھایا ہے مجھے ثاقب یہ مفہوم خطاب
دوستوں کی بذلہ سنجی ہے حقیقت کچھ نہیں

حسد کا تو کچھ علاج ہی نہیں ع حسود را چہ کنم کوز خود برنج درست۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اپنے کمال کے ساتھ ہمارے مرزا کا یہ عجز و انکسار ہی زیادہ تر اون کی شہرت و ہر دلعزیزی کا باعث ہے۔ مشیت ایزدی میں چون و چرا کا دخل نہیں۔ کرشمہ ہائے قدرت خداوندی کیا کسی کی سمجھ میں آسکتے ہیں وہ اگر کسی کو عزت دینا چاہے تو کون سی قوت اوس کو روکنے والی ہے۔ دُنیا میں نام و نمود حاصل کرنے اور شہرت پانے کا ہر شخص خواہشمند ہے اگر جوہر ذاتی سے یہ نعمت ہاتھ نہ آئے تو ذرائع ڈھونڈے جاتے ہیں ارباب جاہ کے ساتھ متملقانہ تعلقات پیدا کئے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے مرزا کا خاصہ طبیعت بالکل اس کے برعکس ہے۔ دُنیا اس جوہر فرد کے پیچھے دوڑتی ہے اور یہ بھاگتا ہے۔ چنانچہ اسباب میں مرزا کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہے ؎

عروس دہر کو دل دیکے آزماؤں کیا
سنوارنے میں جو بگڑے اُسے بناؤں کیا

کبھی کسی دوست یار آشنا شاگرد سے اشارۃً و کنایۃً بھی ایسی خواہش نہیں کی کہ اُن کو کسی خاص لقب یا خطاب سے مخاطب کیا جائے۔ بلکہ اکثر احباب کو ایسے الفاظ کے استعمال سے منع کرتے رہتے ہیں۔ اول تو افکار زمانہ نے اتنی فرصت ہی کب دی کہ ایسا خیال بھی دل میں لاتے دوسرے آپ کی طبیعت کا استغنا بجائے خود ایسی نمائشوں کا دشمن سخت ہے۔ جیسا کہ اُن کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

خاطر عزلت گزیں ہے دشمن نام و نمود
مر مٹی ہے جس پہ دُنیا اُس سے رغبت کچھ نہیں

اپنا کلام کبھی اپنی خواہش سے کسی اخبار یا رسالہ میں شائع ہونے کے لئے نہیں بھیجتے۔ استدعا پر بھی ہزاروں حیلے اور عذر کئے جاتے ہیں اگر بپاس خاطر احباب یا کسی دوسری مجبوری سے کبھی کسی فرمائش کی تعمیل کی بھی گئی تو وہ بادل ناخواستہ ہوتی ہے۔ بعینہ یہی حالت شاعروں کی شرکت اور غزل خوانی کی ہے۔ اپنا کلام سنانے میں نہایت بخیل ہیں۔ اگر اتفاقیہ کہیں پھنس گئے تو غزل خوانی میں ہمیشہ اختصار پر نظر رہتی ہے اور اس امر کی تمنا کہ شائقین کلام کم سے کم پر رضامند ہو جائیں۔ یہ اغماض لوگوں کی اور زیادہ گرویدگی و اشتیاق کا باعث ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اطراف ہندوستان میں جہاں کوئی بڑی صحبت مشاعرہ منعقد ہوتی ہے بانی مشاعرہ اپنی وجاہت تعلقات کی بنا پر یا دوسرے مقتدر اصحاب کی سفارشیں بہم پہنچا کر مرزا صاحب کی شرکت کے متمنی رہتے ہیں اگر دعوت شرکت قبول ہوگئی تو یہ اپنی اور مشاعرے کی بہت بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔

تحریری مباحثہ مرزا صاحب لڑنے جھگڑنے کے آدمی نہیں مگر ایک بار محض اتفاق حق کی نیت سے اس میدان میں بھی اتر آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۹۳ء میں سید باقر حسین **ذبیح** نے جو لسان العصر سید اکبر حسین صاحب **اکبر** الہ آبادی کے برادر نسبتی اور حافظ زکریا خاں صاحب **زکی** کے شاگرد رشید تھے منشی امیر مرحوم لکھنوی کی ایک غزل پر کچھ اعتراضات وارد کئے تھے اور مقابلہ میں جناب شہزادہ میرزا قیصر بخت **فروغ** مرحوم دہلوی کا دوغزلہ پیش کیا تھا۔ انہیں یہ امر ناگوار گزرا۔ اور ایک مسلم استاد فن پر سے ذب ملام کے لئے کمربستہ ہو کر جملہ اعتراضات کا نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ہر اعتراض کو غلط اور بے بنیاد ثابت کیا۔ ساتھ ہی شاہزادے صاحب کی غزلوں پر نکتہ چینیاں بھی کیں اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کاواک اشعار میں جابجا ترمیم و اصلاح بھی کر دی۔ اس بحث نے اس قدر طول کھینچا کہ ایک مبسوط رسالہ تیار ہو گیا۔

اسباب معیشت اور اُن کا سلسلہ تلاش

دُنیا کی سب نعمتیں کمتر ایک ذات میں جمع ہوتی ہیں شاذونادر انسان یہاں غالب مرحوم کے اس شعر کے مصداق ہوں گے ؎

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو فطرت الٰہی نے کوئی کمال عطا فرمایا ہے وہ مال و دولت کی نعمت سے حرماں نصیب رہے ہیں۔ یہی حال ہمارے مرزا کا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے جس قدر حصہ کفاف ان کو ملنا چاہیئے تھا اُس سے بدرجہا زائد نہایت فیاضی سے وہ ان کو شاعری کی صورت میں دے دیا گیا۔ پہلے پہل تو ۱۸۹۶ء میں انہوں نے اپنے والد مرحوم کے ایما سے عبدالشکور نامی ایک بگڑے ہوئے مدراسی تاجر کی معیت میں سلسلہ کاروبار تجارت شروع کیا جس سے ابتدا میں تو فائدہ کثیر ہوا مگر من بعد نقصان پر نقصان اُٹھانا پڑے حتیٰ کہ کل اثاالبیت جمع جتھا اس تجارت کے نذر ہو گئے یہ ایک اصولی غلطی تھی یعنی جو شخص بدقسمتی سے اپنی بنی بنائی کافی دولت تباہ کر چکا تھا تقدیر جس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اُس کی رفاقت دوسرے کے کام کو کیونکر رو براہ ہونے دیتی۔ انجام کار وہی نتیجہ ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ اس ناکامی کی بدولت ان کی عمر کا بہت سا حصہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ اسی ضمن میں آپ کو عالی جناب امیرالدولہ سیدالملک سر راجہ محمد امیر حسن خاں صاحب بہادر اعلی اللہ مقامہ فی دارالجنان والئی ریاست محمود آباد کے دربار فیض آثار میں باریابی ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۸۹۸ء کا ہے حضرت محتشم الصدر اور خصوصًا جناب ولیعہد بہادر نے جو فی زمانہ مسند آرائے حکومت ہیں نہایت عزت افزائی اور قدردانی فرمائی محمود آباد و قیصر باغ لکھنؤ میں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہنے لگیں چھوٹے راجہ جناب محمد علی احمد خان بہادر مرحوم و مغفور بھی خاص طور پر قدرشناسی و نظر التفات فرماتے رہے۔ یہ سب کچھ ایک طرف تھا اور ایک طرف مرزا صاحب کی گردش نصیبی جس نے ایسے دربار سے جہاں کسی کا پہونچ جانا ہے اُس کی خوش نصیبی کی دلیل ہے ان کو بے نیل مرام نکالا یہ انہیں آلام و افکار میں مبتلا تھے کہ پدر شفیق کا سایہ سر سے اُٹھ جانے نے اور بھی اسباب

شدائد و مصائب کا تکملہ کر دیا - ہزارہا روپیہ تلف کرنے کی بعد تلاش معاش کی پریشانیوں سے
یہ زمانہ مرزا کے لئے سوہانِ روح تہا جو نا مساعدتِ روزگار سے روز بروز رو بہ ترقی تہیں -
آخر یہ حالت کب تک قایم رہتی - اس سلسلے کی کوئی انتہا بھی ہونی چاہیے تھی ع

دریں ہر گریہ آخر خندہ ایست

ایک صحیح و واقعی ضرب المثل ہے نومبر ۱۹۰۷ء میں بدبختی نے قدرے کنارہ کیا اور حسن اتفاق سے
اُن کو کلکتہ کا سفر پیش آیا - وہاں پہونچ کر سفارت خانہ ایران میں پرائیویٹ سکرٹری کی جگہ ملگئی
نواب نصیر الملک میرزا شجاعت علی بیگ خان بہادر مرحوم کانسل جنرل ایران آپ کے کمال فن
شاعری و انشا پردازی سے نہایت خوش اور رضا مند تھے - ایک سال کلکتے کے قیام کو
گزرے تھے کہ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں میر تجمل حسین صاحب تجملؔ نے بمقام محمود آباد اس عالم فانی
سے رحلت کی اور اُن کے قایم مقام میرزا صاحب تجویز کئے گئے - چنانچہ نومبر ۱۹۰۸ء سے ریاست
میں یہ اس خدمت پر فائز ہیں اور سرکار ردالاقتدار عالیجناب سر مہاراجہ محمود آباد
سے وظیفہ بلا شرط انجام دہی کسی کام کے ماہ بماہ ملا کرتا ہے -

قسمت سے ایسا رئیس ان کو مل گیا ہے جو ان کے کمال و ہنر کا قدردان کامل اور انکو
وقعت کی نگاہ سے دیکھنے والا ہے -

کلام حضرت ثاقب لکھنوی جانشین میرزا غالب

کس ہجوم نامرادی میں دلِ ناشاد تھا　　بیچ میں تھا میں ادھر گلچیں اُدھر صیاد تھا
اور کچھ کھو بیٹھتا ہوں ہوش ہوں وہ یا حواس　　جب وہ پہلو ڈھونڈتا ہوں جو کبھی آباد تھا
قیدِ تنہائی نے پھیرا زندگی بھر کا ملال　　میں جو بھولا تھا چمن میں وہ قفس میں یاد تھا
صحنِ زندان چمن میری نظر میں ایک ہیں　　قید سے گھبرائے وہ جو رنج سے آزاد تھا
یوں بدل دیں خوف نے ساری جہاں کی صورتیں　　کھول کر آنکھیں جدھر دیکھا اُدھر صیاد تھا
حشر میں میرا لہو چھپتا تو آخر کس طرح　　آپ ہی بھولے نہ تھے مجھ کو بھی کچھ کچھ یاد تھا
اشکِ غم آنکھوں میں جب آیا یا بی مرہم سے تھی　　دل کے زخموں میں بہم شورِ مبارکباد تھا
دل کہ جسکی خانہ ویرانی کا تم کو غم نہیں　　کیا بتائیں ہم تمہیں اس گھر میں کون آباد تھا

وصل کی شب آتے ہی ثاقب سحر طالع ہوئی
کوئی کیا کرتا کہ گردوں پر سرِ بیداد تھا

روشن چراغ تھے نہ ستاروں میں نور تھا　　فرقت میں آہِ دل کا اثر دُور دُور تھا
کیا چیز ہے حیات کہ مرنے کے بعد بھی　　جو چپ ہوا وہ گوش بر آوازِ صور تھا
برسوں کی آگ جس میں ہو اُس دلکو کیا کہوں　　جلتا جو دفعتہً تو سمجھتا کہ طور تھا
گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا　　میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا
کھینچے تھے ہاتھ پاؤں کہ دم توڑتا تھا میں　　نا آشنا ہی بحرِ فنا کا عبور تھا
پیدا کیے ہیں دل کے تعلق نے راستے　　نزدیک تھا جہاں میں کوئی نہ دور تھا
دل سرحدِ عدم پہ بھٹکتا تھا وقتِ نزع　　وہ آئے تھے تو مجھ کو ٹھہرنا ضرور تھا
گلچیں بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دیئے　　تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

جلوہ فروغ حسن کا ثاقب کے دل میں ہے
ملتا ہوا اُسی سے جو بالائے طور تھا

دیکھا حسن کا عالم جو نہ حیراں ہوتا
خیر یوں بھی سہی دل تو نہ پریشاں ہوتا

ہے بڑے کام کی گم گشتگی ہوش و حواس
آئینہ سنگ سے کم تھا جو نہ حیراں ہوتا

جیتے جی سایۂ دیوار چمن تک نہ گیا
مر کے کیا پھول کا شرمندۂ احساں ہوتا

پھر بھڑک اُٹھتے ذرا دہر کے خاموش چراغ
اُن کے ہاتھوں جو مزاروں پہ چراغاں ہوتا

بغض و دل ڈوب گئے ہجر میں روتے روتے
اور کیا چاہتے ہو نوح کا طوفاں ہوتا

کشتۂ آفت تقدیر ہے ہر شمع و چراغ
آگ لگتی نہ تو پھر کیوں کوئی عریاں ہوتا

دشمن زینت محبوب نہیں آہ رسا
اُن کا گیسو مرا دل تھا جو پریشاں ہوتا

میں نہ جی اُٹھتا مگر قبر پہ آتے تو کبھی
کچھ نہ ہوتا تو یہ کیا کم تھا کہ احساں ہوتا

جھگڑے آپس کے ہیں دل کھتا ہے وحشت لبس و بس
ہاتھ کہتے ہیں گریباں پہ گریباں ہوتا

رو رہا ہوں کہ مرا خاک شدہ دل ثاقب
جل نہ جاتا تو چراغ شب ہجراں ہوتا

وہ نہیں ہوں میں کہ جس پہ کوئی اشکبار ہوتا
کبھی شمع بھی نہ روتی جو مرا مزار ہوتا

مرے دل نے بڑھ کے روکا ترے تیر بے اماں کو
جو یہ بیچ میں نہ پڑتا تو جگر کے پار ہوتا

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انہیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

یہ زمانہ بڑھ رہا ہے فقط اضطراب دل سے
شب غم نہ یوں ٹھہرتی جو مجھے قرار ہوتا

وہ لحد پہ اُن کا آنا وہ قدم قدم پہ محشر
مری نیند کیوں اُچٹتی اگر ایک بار ہوتا

جو ہمارے دیکھنے کو کبھی آپ آ نکلتے
وُہی آنکھ در پہ ہوتی وُہی انتظار ہوتا

وہ شباب کے فسانے جو میں سُن رہا ہوں دل سے
اگر اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

وہ جہاں میں آگ لگتی کہ بجھائے سے نہ بجھتی
مرے دودِ دل میں ثاقب جو کوئی شرار ہوتا

جلوۂ حُسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا — میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا
ہم مذاقِ دل اگر تھا بھی تو اک طورِ کلیم — ہوگیا سرمہ مگر بارِ تجلّی سہہ گیا
ہوش ہی مجھکو نہ تھا جب پہلوؤں میں لوٹ تھی — مجھکو کیا معلوم کیا جاتا رہا کیا رہ گیا
زخم جو خونبار تھے وہ روتے روتے ہنس دیئے — کچھ نہ کچھ ناوک ترا قلبِ حزیں سے کہہ گیا
نزع کے عالم میں کیا تھا اُنکی پُرسش کا جواب — مرنے والا ایک ٹھنڈی سانس لیکر رہ گیا
کونسی اب ہوا میں جاکے ڈھونڈوں میں کہ دل — یا دھواں ہوکر اُڑا یا اشک بن کر بہہ گیا
دُور کی بھی آنچ ہے ان خشک تنکوں کو بہت — کیوں جلے گلچیں اگر میرا نشیمن رہ گیا
حادثوں کے زلزلوں سے جامِ دل چھلکا کیا — ایک چُلّو خون ہی کیا بہتے بہتے بہہ گیا
ذکرِ گلشن کرنے دیتا کون وہ بھی قید میں — پردۂ فریاد میں جو کچھ تھا کہنا کہہ گیا

صبح سمجھے تھے کسے ثاقب شبِ غم ہی طویل
دل کا کوئی داغ ہوگا جو چمک کر رہ گیا

ہر طرف گو اشکِ غم سے اک جہانِ آب تھا — موت آ پہنچی کہ بحرِ زندگی پایاب تھا
حلقۂ دامِ بلا میں پھنس کے پھر نکلا نہ میں — زندگی بھر جو نہ ٹوٹا پھیر وہی گرداب تھا

نزہتِ ایامِ عشرت پر ہیں نازاں کیوں حسین
جو نظر آیا اُنھیں وہ میرا دیکھا خواب تھا

غافلوں کو صاف دکھلائی نہ دی تصویرِ موت
پاس تھا آئینہ ہستی مگر بےآب تھا

قوتِ غم دیکھ زورِ ناتوانی پر نہ جا
زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

منفعل ہوں میں کہ ٹکڑے ہو گیا دامانِ صبر
اک ذرا مشکل مداوائے دلِ بیتاب تھا

ہو گئی تھی زخمِ دامن دار عالم کی فضا
جب سے چشمِ تر میں سرمہ کی جگہ خوناب تھا

کسقدر تھک کر گرے ہیں بستروں پر اہلِ قبر
جب گئے دن رات اس محفل میں دورِ خواب تھا

جلوۂ مقصد نظر آیا کہ دیکھی شکلِ دوست
وقتِ نزعِ روح ثاقبؔ روزِ فتح الباب تھا

دشمن کی دوستی کا نتیجہ بُرا ہوا
خنجر گلے ملا تو مرا سر جدا ہوا

گلشن سے اُٹھکے میرا مکاں دل میں آ گیا
اک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

کیا تیرگی لئے ہوئے آئی شعاعِ نور
دیکھا شبِ فراق ازل کا لکھا ہوا

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

جبتک تھا میں عروج پہ تھا حسنِ جانستاں
پھر کچھ خبر نہیں کہ مرے بعد کیا ہوا

صیاد کا گھر آج ہے جیسے چمن تھا کل
شاید قفس کا بیٹھنے والا رہا ہوا

ثاقبؔ خبر نہ تھی کہ فلک میں ہیں گردشیں
میں آکے دانۂ دہنِ آسیا ہوا

قید میں کھنچ کے نہ آ جائیگی تاثیرِ بہار
لاکھ دکھلائے مرا دل مجھے تصویرِ بہار

غنچے شب بھر جسے مٹھی میں چھپا رکھتے ہیں
صبح کو پھول دکھاتے ہیں وہ تحریرِ بہار

عشقِ بلبل کی گرہ کھلنے کے قابل نہ رہی
مشکلیں ڈال گئے ناخنِ تدبیرِ بہار

طوق تو گردنِ قمری کو ملا گلشن میں
دلِ دیوانہ بتا کیا ہوئی زنجیرِ بہار

مجھ سے بے پر کو ہے منبری کے نمو سے کیا کام
پر نکل آئیں تو سمجھوں کہ ہے تاثیرِ بہار

حلقۂ دام وقفس کی تو ضرورت ہی نہ تھی
پہلے ہی توڑ چکا تھا مرا دل تیر بہار

ہچکیاں غنچوں کی رُک جائیں تو کچھ بات کھلے
صاف ہوتی نہیں الجھی ہوئی تقریر بہار

کتنے نیرنگ چمن میں ہیں خدا ہی جانے
کچھ نہ کچھ ہر ورق گل پہ ہے تحریر بہار

فکر لائی ہے یہ گلدستۂ معنی ثاقبؔ
اہل محفل کو دکھاتا ہوں میں تصویر بہار

دل کیوں تپاں ہے کوچۂ دلدار دیکھ کر
آگے بڑھوں گا چرخ کی رفتار دیکھ کر

طے کر کے آج خانہ بدوشی کی منزلیں
بیٹھا ہوں اس کا سایۂ دیوار دیکھ کر

کچھ کچھ زمانہ جان گیا کار حسن و عشق
منصور کو جہاں میں سر دار دیکھ کر

پتھر نہیں کہ طور کے وار آزمائے جائیں ،
اے برق حسن حال دل زار دیکھ کر

اب دہر روشناس وفا و جفا ہوا
میرے گلے پہ آپ کی تلوار دیکھ کر

محشر میں کوئی پوچھنے والا تو مل گیا
رحمت بڑھی ہے مجھ کو گنہگار دیکھ کر

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر

کہتے ہیں دل لگی مری شام فراق کو
اچھا یونہی سہی مگر اک بار دیکھ کر

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فراز دہر
جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

کیا تھا کہ ایسے وقت میں صاحبدلانِ حشر
دیکھا کئے مجھے تری تلوار دیکھ کر

ثاقب عجب نہیں کہ سرِ طور امتحاں
غش دل کو آئے جلوۂ اشوار دیکھکر

نہ شرماؤ اگر ہم شکوۂ بیداد کرتے ہیں
محبت ہی تمہاری عادتوں کو یاد کرتے ہیں

ہماری داستانِ غم رُلاتی ہے زمانیکو
وہ ہم ہیں جو زبانِ غیر سے فریاد کرتے ہیں

خدا آباد رکھے ہمصفیرانِ گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

اسیرانِ قفس خود بھی بہت کچھ کہہ گزرتے ہیں
چمن کے تذکرے آپس میں جب صیاد کرتے ہیں

نہیں معلوم میں کس حال میں ہوں باغِ عالم میں
قفس والے بھی مجھکو دیکھ کر فریاد کرتے ہیں

عدو صیاد و گلچیں کیوں ہوئے میری نشیمن کے
یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنہیں برباد کرتے ہیں

خود اُن کا حسن میری داد خواہی اُنسے کرتا ہے
وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

لحد پہ چلنے والے تھم کہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے
زمیں رکھتی ہے مُنہ پر ہاتھ جب یاد کرتے ہیں

سرِ گورِ غریباں کچھ نہ پوچھو حال دل ثاقب
زمانہ جن کو بھولا ہے ہم انکو یاد کرتے ہیں

یا مرگِ خداداد ہو یا اُن کی نظر ہو
عالم کی بھری بزم میں کوئی تو ادھر ہو

لے آئی اُنہیں ساتھ مری نزع کی ہچکی
ڈوبی ہوئی آواز میں اتنا تو اثر ہو

بن جاتے ہیں لاعلم بہانے کے لئے دوست

وہ بےخبری میں ہیں جنھیں میری خبر ہو

ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہ سفر میں
بڑھتا ہوں اُسی سمت کہ شاید مرا گھر ہو

مُنہ دیکھ کے میرا نہ سمجھنا کہ میں خوش ہوں
دل کھو کے ہنسی آئے جو میرا سا جگر ہو

زنجیر کا شکوہ نہیں اے تنگیٔ زنداں
میں چل کے دکھا دوں جو کوئی راہگذر ہو

اُٹھ بیٹھ سے میری شبِ غم ہٹ نہیں سکتی
تکیے سے اُٹھائیں وہ سر اپنا تو سحر ہو

ویرانہ ہی اچھا ہے کہ ویران نہ ہوگا،
گھر ہو تو نہ دیوار ہو اس گھر میں نہ در ہو

سُنتا ہوں مرادوں کی صفیں گردہیں اُن کے
محفل تو بہت خوب ہے دیکھوں جو گذر ہو

ثاقب سخن خوب بجز مشق نہیں ہے
یہ عیب جو بڑھ جائے زیادہ تو ہنر ہو

سحر کو بھی مری محفل میں برہمی نہ ہوئی
تمام رات ہوئی درد میں کمی نہ ہوئی

غرور حسن تمنائے دل کا دشمن تھا
وہ کون دن تھا کہ جس دن ہماہمی ہوئی

الٹ الٹ گئے دل میرے انتقال کے بعد
یہ کیا کہ آپ کی زلفوں میں برہمی نہ ہوئی

یہ جسم روح بھی خواہ کار ہا دشمن
تمام عمر کبھی صلح باہمی نہ ہوئی

ہر ایک کے لئے کھنچنا روا نہیں ثاقب
بھوؤں کا حُسن ہی کیا ہے اگر خمی نہ ہوئی

شیخ الرئیس ابن سینا

از

(جناب مولوی محمد یوسف صاحب ندوی)

حسین بن عبد اللہ نام بو علی کنیت اور ابن سینا لقب تھا، لیکن بعد میں زیادہ تر لقب ہی کے ساتھ مشہور ہوئے، سنہ ولادت ۳۷۵ھ ہے، باپ کا نام عبد اللہ تھا جو بلخ کے ایک معزز اور ممتاز خاندان کے رکن تھے۔ مگر بہت زمانہ گزرنے نہ پایا کہ حوادث روزگار نے قدیم اور آبائی وطن سے جدا کر دیا اسلئے بخارا کی طرف چلے آئے جہاں ایک قصبہ میں سکونت اختیار کی اور کچھ دنوں بعد ستارہ نامی ایک حسین عورت سے شادی کرلی جس کے بطن سے شیخ جیسی یگانۂ روزگار اور فخر ملت ہستی پیدا ہوئی، تھوڑے دنوں بعد پھر یہ پورا خاندان کسب معاش کے سلسلہ سے بخارا کو منتقل ہو گیا جس کو انھوں نے اب مستقل حیثیت سے اپنا مسکن و مستقر قرار دیا، پیٹ کے دھندے اور حوائج زندگی کی طرف سے یک گونہ اطمینان اور سکون حاصل ہوا تو باپ کو خیال ہوا کہ ہونہار لڑکے کی تعلیم و تربیت ہونی چاہیے، چنانچہ اس تصور نے ان کے دماغ پر اتنا بار ڈالا کہ فوراً شیخ کو ایک مکتب میں جا بٹھلایا، ابتدائی تعلیم وہیں پائی اور تقریباً دس سال کی عمر میں قرآن ادب ہندسہ اور اصول دین کی اکثر باتوں سے شیخ کو مکمل آگاہی حاصل ہو گئی تھی، قدرے جبر و مقابلہ کے فن سے بھی آشنا تھے، چنانچہ شیخ کا خود بیان ہے کہ اس کمسنی میں لوگ مری فطری ذکاوت پر تعجب کرتے اکثر جب میں پڑھتا تو حیرت سے میرا منھ تکتے تھے، اور بعضوں کا گمان تھا کہ یہ خرق عادات اور خلاف فطرت واقعہ محض میری ہی ذات کے ساتھ مخصوص تھا جس کا ظہور تخلیق کائنات اور ابتدائے آفرینش کے وقت سے لے کر میری ولادت کے زمانہ مسعود تک کبھی نہیں ہوا تھا، شیخ کے والد فرقۂ اسماعیلیہ کے ایک

سرگرم رکن تھے، جنھوں نے اہل مصر کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کی تھی اور اسی ضمن میں انھوں نے بھتوں کو اپنا ہم مشرب وہم خیال بھی بنا لیا تھا، یہ لوگ جب کبھی اپنی خاص مجلسوں میں جمع ہوتے اور اعزہ واقارب سے گفتگو کی نوبت آتی تو ہمیشہ عقیدہ اسماعیلیہ کی اشاعت وتبلیغ کرتے تھے اور عقل ونقل کا فلسفہ جیسا کہ اس جدید مذہب کا خیال تھا ان کی زبانوں پر بے اختیار جاری ہوجاتا تھا۔ شیخ، اپنی کم عمری میں اس کو سنا کرتے تھے مگر ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ وہ مذہب جس کا عقیدہ اس قدر باطل اور غیر مدلل ہو کیونکر صحیح اور درست ہوسکتا ہے اور جب انھوں نے شیخ کو بھی اس کی دعوت دی تو انھوں نے صاف طور پر قبول کرنے سے انکار کردیا، یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ کی عمر دس سال سے کچھ زیادہ رہی ہوگی اور اگرچہ اپنی فہم ودانش سے انھوں نے علم وفن کے بہت سے نکتے خود بخود حل کرلئے تھے مگر ابھی شیخ کی ذہنی قابلیت اور فطری استعداد بہت زیادہ اصلاح وتربیت کی محتاج تھی، یہ حسن اتفاق اور شیخ کی خوش قسمتی تھی کہ عین اسی زمانہ میں حکیم ابو عبداللہ ناتلی ایک شخص بخارا میں فروکش ہوئے جو فلسفی کے لقب سے مشہور تھے، شیخ کے والد نے ان کی تعلیم وتربیت کی غرض سے ان کو اپنے یہاں مہمان رکھ لیا اور جب تک وہ رہے نہایت قدر وعظمت کی نگاہ سے انھیں دیکھتے رہے[۵۱]۔

شیخ نے ایسا غوجی شروع کی اور کافی محنت وغور وفکر کے ساتھ پڑھتے رہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جب مجھ سے جنس منطقی کی یہ تعریف بیان کی گئی کہ وہ ما ہو کے جواب میں کثیرین مختلفین بالنوع پر محمول ہوتی ہے تو میں نے تحقیق وغور سے کام لیا اور ایسی بحث کی جس سے حکیم ناتلی حیرت زدہ ہوکر خاموش ہوگئے اور پھر وجد میں آکر میری مدح سرائی کرنے لگے۔

ابن خلکان نے شیخ کی حسن طبیعت اور اختراع پسندی پر جو مجملاً اور ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی بدولت استاد ناتلی کو بہت سے ایسے رموز حاصل

---

[۵۱] عیون الانبیا رجلد دوم صفحہ ۳، ۱۲

ہوئے جوان کو پیشتر سے معلوم نہ تھے، اس لئے کہنے کو تو یہ استاد اور شاگرد کی ایک سادہ مجلس تھی مگر دراصل تحقیق اور باہمی استفادہ کی ایک علمی اکاڈیمی تھی جسکو ہمارے شیخ کی روشنی و نورانی طبیعت نے شمع انجمن اور قبۂ نور بنا دیا تھا، ابن سینا نے شیخ ناتلی سے محض اقلیدس حجبطی اور منطق کے دیگر چھوٹے چھوٹے رسالے پڑھے تھے، جن میں سادہ طرز پر فقط نفس مسئلہ کا ذکر تھا - بقیہ اس فن کی باریک اور لطیف نکتہ سنجیوں سے جو قدما نے پیدا کئے تھے چونکہ استاد کو مطلق بصیرت و آگاہی نہ تھی اس لئے شیخ نے بنفس خود ان کتابوں کا مطالعہ شرع کیا اور بغیر کسی خارجی اعانت اور معمولی سہارے کے ایک قلیل مدت میں سارے حقایق و مطالب کو حل کر دیا[۵۱] - شیخ نے جبر و مقالہ میں محض پانچ یا چھ شکل تک اوستاد سے پڑھا ورنہ ساری کتاب اپنی ذاتی قابلیت اور ذوق صحیح کی بدولت سمجھ لیا تھا، البتہ جب کبھی ہندسہ اور حساب دانی کی ضرورت محسوس ہوتی اور اشکال نظر آتا تو اسوقت استاد کی اعانت رہبری کرتی تھی، معقولات کے ساتھ شیخ کو دینیات اور اصول فقہ سے بھی رغبت تھی اور مولانا اسمٰعیل کے پاس جاکر جو اس زمانہ کے ممتاز اور مستند عالم تھے فقہ پڑھتے اور طلبا کے ساتھ بحث و مناظرہ میں شریک رہا کرتے تھے - اب وہ زمانہ آیا جب استاد ناتلی کی تربیت کا سایہ شیخ کے سر سے اٹھ گیا، اور وہ کسی وجہ سے سلطان مامون بن محمد کے پاس خوارزم چلے گئے[۵۲] - شیخ کی طبیعت کا میلان اب زیادہ تر فلسفہ اور طب کی جانب ہونے لگا اور طبیعات کی جتنی کتابیں انہیں مہیا ہو سکیں معہ شروح و حواشی کے سب دیکھ ڈالیں، اور آگے چل کر کئی سال کے عمیق کتب بینی کے بعد وہ اس فن کے اتنے بڑے ماہر ثابت ہوئے کہ اسلامی دنیا میں اب تک شیخ کا کوئی دوسرا ہم رتبہ و نظیر نہ پیدا ہو سکا، شیخ کو خاص کر علم طبعی سے غائت درجہ دلچسپی اور انسیت تھی چنانچہ ان کا سب سے بڑا

[۵۱] تراجم الحکما مطبوعہ مصر صفحہ ۲۷۰، ۱۲

[۵۲] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۵۲، ۱۲

کمال یہ ہے کہ فلسفہ کی اس خشک شاخ کو اپنی اختراع وایجاد کی آبیاری سے اُنھوں نے جس قدر شاداب بنا دیا متاخرین کی نگاہوں کے سامنے اُس سے بڑھکر دل کش اور دلپذیر سماں کبھی کھینچا نہیں جا سکتا، شیخ اُس زمانۂ طالب علمی میں تجربتہً اکثر اوقات غربار ومساکین کا علاج بھی کرتے رہے اور دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں انھوں نے صحرا و بیابانوں کی خاک چھانی، لیکن لطف یہ تھا کہ معمر اور سن رسیدہ اطبار شیخ کی صحبت میں حاضر ہو کر اُن کے تجربات اور معالجات سے استفادہ حاصل کرتے رہے اور اسپر حیرت و بوالعجبی یہ تھی کہ اُن کی عمر اُس وقت محض سولہ سال کی تھی، چونکہ فلسفہ ومنطق سے اُنہیں بالطبع ذوق تھا اس لئے تقریباً ڈیڑھ سال تک اسکی تکمیل میں شب وروز مطالعہ کرتے رہے اور کسی رات پوری نیند نہ ہوئی، دن میں بجز ضروری کاموں کے کبھی کتاب سے جدا نہ ہوتے تھے، اِس اثنا میں شیخ کا یہ دستور تھا کہ جب کہیں اشکال نظر آتا اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی تو اُس کو قیاسی مقدمات کی منطقی صورت میں ترتیب دے کر خود اوسط کے ذریعہ معلوم کر لیتے تھے مگر جب یہ صورت بھی کارگر ثابت نہ ہوتی تو جامع مسجد میں باوضو ہو کر ابتہال وتفرّع کیساتھ نوافل پڑھتے اور انکشاف مسئلہ کے لئے دعا کرتے تھے چنانچہ اس طرح اکثر باتیں خود بخود ظاہر ہو جایا کرتی تھی، شیخ کو اِن فنون میں اُس وقت اتنا توغل واستغراق تھا کہ خواب میں مسائل کی صورتیں جواہر واعیان کی شکل میں دکھلائی دیتی تھیں اور اُن کا بیان ہے کہ اس طرح اکثر باتوں کو وہ نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ لیا کرتے تھے، اب ایک سال کے عرصہ میں فلسفہ اور ریاضی کے متعلق شیخ کی وسعت معلومات اور ذاتی لیاقت کی کوئی انتہا نہ رہی اور اِس فن کے ماہرین اور ممتاز علمار نے ان کے سامنے سر ڈال دیا۔ قانون قدرت ہے کہ انسان ابتدائی زمانہ یا عالم شباب میں جو کچھ سیکھتا اور جانتا ہے مرور ایام کے ساتھ مشق وغور کرنے سے معلومات میں پختگی اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے، مگر شیخ کی دماغی کیفیت اس سے بالکل جداگانہ تھی اُنھوں نے اٹھارہ سال کے سن میں معقولات جیسے اہم اور مشکل فن کو جس طرح سمجھ لیا تھا آخری عمر میں بھی کچھ اسپر اضافہ نہ کر سکے[۵]، یہ اُن کی فطری ذکاوت اور غیر معمولی فہم کی ایک حیرت انگیز مثال ہے، اب شیخ

[۵] عیون الانبار ۲؛ طبقات الاطبار جلد دوم صفحہ ۲، ۱۲

کیلئے ایک الہیات کا فن اور رہگیا تھا مگر ابتدا میں یہ ان کے لئے اس قدر دشوار اور اہم ثابت ہوا کہ کتاب مابعد الطبیعیات کو بار بار دیکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی، اسی دوران میں ایک مرتبہ ان کا گذر بازار سے ہوا جہاں چند کتب فروش قدیم قلمی نسخوں کو سستے داموں پر فروخت کر رہے تھے انہوں نے شیخ کو ایک کتاب دکھلائی مگر اول بار کچھ توجہ نہ کیا بالآخران کے اصرار پر تین درم میں کتاب لیلی لیکن بعد میں شیخ کی مسرت اور تعجب کی کوئی حد باقی نہ رہی جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ رسالہ ابو نصر فاریابی کے قلم کا لکھا ہوا تھا جس میں مصنف نے الہیات کے مسائل کی مکمل وضاحت کی تھی، شیخ کتاب لے کر گھر آئے اور فوراً پڑھنا شروع کر دیا چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ ساری باتیں جو پیشتر اُن کے دائرہ فہم سے خارج تھیں اب خودبخود حل ہو گئیں[۵۱]، بے حد مسرور ہوئے اور فرط مسرت سے چہرہ چمک اُٹھا، اب شکرانہ میں نمازیں پڑہی گئیں غربار و مساکین کو صدقہ دیا گیا اور کچھ دنوں تک شیخ پر ایک وجد کی سی رندانہ کیفیت طاری رہنے لگی، ابن سینا نے اب تک اپنی زندگی کو جس گوشہ گمنامی میں بسر کیا اس کا اقتضا تو یہی تھا کہ اس کے علمی کارناموں کو فروغ نہ حاصل ہوتا کیونکہ ماسوائے اُن چند بزرگوں کے جو شیخ کے پاس اگر کسی خاص غرض سے اُٹھا بیٹھا کرتے تھے کسی دوسرے کو اُن کی ذات سے تعارف و شناسائی نہ تھی، لیکن خدائے قدوس کو یہ کب گوارا تھا کہ شیخ کے دماغی جواہر ریزوں کی قدر نہ پہچانی جائے، اتفاق سے سلطان بخارا نوح بن منصور جو دولت سامانیہ کا مشہور تاجدار تھا ایک مہلک عارضہ میں مبتلا ہو گیا، بغداد اور نیشاپور سے نامی اطبا رطلب کئے گئے مگر اُن کے علاج نے کچھ فائدہ نہ دیا، دربار میں امرائے شہریار سے شیخ کا تذکرہ کیا اور وہ بلائے گئے، چنانچہ اُن کی تشخیص اور دوائے سلطان کو بالکل اچھا کر دیا اور شیخ کی عظمت اسی دن سے امیر ممدوح کے دل میں بہت زیادہ بڑھ گئی، سلطان کے پاس اس وقت مختلف علوم و فنون کا ایک نادر علمی کتب خانہ تھا جسکو

[۵۱] تراجم الحکما رصفحہ ۲۶۸، ۱۲

اُن سے بہایت محنت اور زرِکثیر صرف کرکے ترتیب دیا تھا مصنفین کی اکثر کتابیں ایسی تھیں جن کے مضامین تو در کنار ان کے نام تک سے لوگ ناواقف تھے، امیر کی اجازت سے شیخ نے اُن کو پڑھنا شروع کیا اور ساری کتابیں ایک ایک کرکے دیکھ ڈالیں، لیکن شیخ کی موجودگی میں ایک دن اتفاقاً آتشزدگی سے یہ سارا ذخیرہ جل کر خاکستر ہوگیا اور اب بجز شیخ کے کوئی دوسرا اُن نادر مضامین کا جاننے والا نہ رہ گیا، چنانچہ مخالفین کا شیخ پر یہ الزام ہے کہ اُنہوں نے قصداً ان کتابوں کو جلا دیا۔ تاکہ اُن بیش بہا علمی مضامین کو کتابی صورت میں جمع و ترتیب دے کر اپنی طرف منسوب کردیں، لیکن جیسا کہ اُس زمانہ کے کوتہ بین ارباب نے شیخ جیسے عالی ظرف کو سمجھ رکھا تھا حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے، شیخ کو اس سے قبل تصنیف و تالیف کا مطلق خیال نہ تھا بلکہ اُنھوں نے اس کی ابتدا ر لوگوں کی فرمایش پر شروع کی چنانچہ ابوالحسن عروضی جو شیخ کے ملاقاتیوں میں سے تھے اُن کے کہنے پر کتاب المجموع لکھی جن میں ہندسہ اور ریاضی کو چھوڑ کر ساری علوم و فنون کو بھر دیا تھا۔ غالباً ان کی عمر اس وقت اکیس سال کی تھی جب یہ پہلی شاندار تصنیف اُن کے قلم سے نکلی ہے، اسی طرح ابوبکر خوارزمی جو شیخ کے معصر اور اسلامی علوم فقہ و تفسیر کے امام تھے اُن کی استدعا پر بیس جلدوں میں کمال جامعیت کے ساتھ "الحاصل والمحصول" اور نیز فن اخلاق اور تزکیہ نفس کے بیان میں "البر والاثم" لکھی جن کو ختم کرنے کے بعد امام ممدوح کے پاس بطور تحفہ کے بھجوا دیا تقریباً ۲۲ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوا، اب ضرورت پیش آئی کہ اکتساب معاش کے لئے کوئی تدبیر عمل میں لائی جائے اس لئے بخارا چھوڑ کر شیخ سلطان محمد بن مامون کے پاس خوارزم چلے گئے مگر شیخ کی تقدیر نے عجب گردش دکھلائی کسی جگہ سکون و قرار نہ تھا اور عرصہ تک طوسی خراسان اور جرجان کے شہروں میں پریشان حال پھرتے رہے کچھ دنوں تک امیر شمس المعالی قابوس کی خدمت میں رہے مگر جب وہ محبوس ہوکر قتل کردیا گیا تو دہستان کو چلے گئے اور ایک مرض میں مبتلا ہوکر پھر جرجان واپس آئے وہاں ابو محمد شیرازی کی صحبت میں ایک عرصہ تک قیام پذیر رہے، دوران اقامت میں اُنھوں نے ایک مطول قصیدہ تصنیف کیا تھا جس کو

پہلا شعر یہ ہے،

لمّا عظمت فلیس مصر واسعی لمّا غلا ثمنی عدمت المشتری

جرجان میں ابو عبید ایک ممتاز طالب علم تھے جو شیخ سے کئی سال تک انکی معیت میں رہکر منطق پڑھا کرتے تھے، ابن سینا نے اپنی اکثر کتابیں مثلاً المبدا والمعاد قانون، مختصر مجسطی اور ارصاد کلیہ وغیرہ جرجان ہی میں لکھی تھی، کچھ دن رہنے کے بعد وہاں سے رَے کو گئے جہاں امیر مجد والدولہ کے دربار میں رسائی حاصل کرکے حکومت سے تعلقات قائم کرلئے تھے لیکن پھر وہاں سے قزوین اور ہمدان پہونچے جہاں امیر شمس الدولہ نے انہیں صیغۂ وزارت پر سرفراز کر دیا[1]۔ مگر فوج نے بغاوت کی اور شیخ کا گھر لوٹ لیا، باغیوں نے سلطان سے شیخ کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی مگر وہ اسپر راضی نہ ہوا، اسی اثنار میں چالیس دن تک شیخ جان کے خوف سے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے اتفاق سے اس وقت شمس الدولہ کو قولنج کا درد ہونے لگا اس نے شیخ کو طلب کیا اور نہایت معذرت چاہی، اور صحت یاب ہونے پر پھر قلمدان وزارت کو شیخ کے ہاتھ میں سپرد کر دیا، شیخ اس زمانہ میں اپنی سب سے زیادہ معتبر اور شہرہ آفاق کتاب شفار لکھ رہے تھے، حالت یہ تھی کہ روزانہ پچاس صفحے لکھتے اور خود متن کی شرح بھی کرتے جاتے تھے حتیٰ کہ طبعیات والٰہیات کے اکثر ابواب مکمل ہو چکے تھے مگر ابھی کتاب میں بہت کچھ کسر باقی رہگئی تھی کہ یکبارگی شمس الدولہ انتقال کرگیا، اور اس کا بیٹا تاج الدولہ تخت و حکومت کا وارث قرار دیا گیا۔ اس نے شیخ پر یہ الزام عائد کرکے کہ وہ ایک دوسرے امیر علاؤ الدولہ سے حکومت کے خلاف مراسلات رکھتے تھے اُن کا نام وظیفہ خواروں کی فہرست سے خارج کر دیا، اب شیخ کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ اصفہان جاکر علاء الدولہ سے اپنا حال بیان کریں، چنانچہ مشائخ صوفیہ اور اہل باطن کے بھیس میں شیخ اصفہان پہونچے اور امیر ممدوح نے ان کی تعظیم اور عزت افزائی میں کسر اٹھا نہ رکھی،

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۵۳ ۱۲۰

علاء الدولہ نے جیسا کہ اُس وقت کا علمی مذاق تھا اپنے یہاں علما اور مشائخ کی ایک مجلس ترتیب دی اور اس میں شیخ الرئیس کو مدعو کیا، دیر تک مباحثہ اور مختلف مضامین پر عالمانہ گفتگو ہوتی رہی مگر شیخ سے کسی فن میں کوئی مقابلہ وہمسری نہ کرسکا، دلجمعی اور اطمینان حاصل ہونے کے بعد اب پھر شیخ کتاب الشفاء کی تکمیل کی طرف راغب ہوئے، اور ایک عرصہ کی کامل شب بیداری اور جانفشانی کے بعد اکثر ابواب مضامین کا اضافہ کرکے کتاب کو اختتام تک پہونچایا۔ نجاۃ بھی شفاء کے تھوڑے ہی دنوں بعد لکھی جبکہ وہ امیر کی معیت میں خواست کا سفر کر رہے تھے، شیخ کو دربار میں رسوخ اور کامل اعزاز حاصل تھا بڑے بڑے علما اور ارکان دولت تک اُن سے خوف کھاتے تھے، اجرام فلکیہ کی تحقیق اور علم ہیئت کی ترقی کے لئے سلطان کے صلاح ومشورہ سے شیخ نے آلہ رصد بنایا تھا جس کی تیاری میں خزانہ شاہی سے انہیں کئی لاکھ درم عطا کئے گئے تھے، شیخ نے ابتک جن مضامین کا مطالعہ کیا اُن کا تعلق زیادہ تر معقولات اور فن ریاضی سے تھا، علم ادب اور عربی لٹریچر میں اُنھیں چنداں مہارت نہ تھی لیکن آگے چل کر ادب وفن بلاغت کی جو چاٹ لگی درا صل اس جذبہ کا محرک ایک دلچسپ واقعہ ہے جس نے شیخ کی رگ حمیت میں تازہ جوش پیدا کر دیا۔ ایک مرتبہ کا تذکرہ ہے کہ امیر ممدوح کے پاس شیخ دیوان خاص میں بیٹھے ہوئے تھے ابومنصور جبائی جو عرب ادب وفن انشا کا امام وقت تھا وہ بھی حاضر تھے، لغت کے کسی لفظ پر گفتگو ہوئی شیخ نے اُس پر فوراً اپنے خیالات کا اظہار کیا ابومنصور نے شیخ کی اس جرأت وبے باکی پر کہا آپ فلسفی وحکیم ہیں ادیب نہیں، یہ گفتگو شیخ کو بہت ناگوار گذری اور غیرت وشرم میں آکر متواتر تین سال تک لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہے اور خراسان سے ابومنصور ازہری کی تہذیب اللغتہ منگا کر دیکھی اب ان کو محاورات ضرب الامثال اور لغات کی تحقیق پر کامل عبور حاصل ہوگیا اور تین ہتم بالشان قصائد تصنیف کئے جن میں غریب اور نادر الفاظ کو قصداً تلاش کرکے جمع کیا تھا، علاوہ بریں ادب میں تین کتابیں لکھی تھیں جن میں پہلی ابن عمید کے طریقہ پر تھی دوسری میں صابی کا رنگ نمایاں تھا اور تیسری میں صاحب کا طرز بیان اختیار کیا تھا، اب ابومنصور جبائی جو دربار میں آئے تو امیر نے

اُن کے روبرو قصا مدٗ اور کتابوں کو پیش کیا اور کہا کہ ہم نے دوران سیاحت اور شکار میں ان کو صحرا میں پایا تھا دیکھئے ان میں کیا لکھا ہے، ابو منصور نہایت غور سے دیکھنے لگا مگر جا بجا مشکل لغات آتے گئے جس کو وہ سمجھ نہ سکا شیخ نے کہا یہ الفاظ فلاں لغت میں موجود ہیں وہاں دیکھئے اب جا کر ان کو احساس ہوا کہ وہ رسالے خود شیخ کے تصنیف کردہ تھے اور متحیر و نادم ہو کر رہگیا، اس کے بعد شیخ نے فن لغت ایک کتاب لکھنی شروع کی جس کا نام لسان العرب رکھا تھا مگر ابھی مسودہ کو صاف نہ کیا تھا کہ انتقال کر گئے اور پھر کسی کو اُنہیں ترتیب دینے کی جرأت نہ ہو سکی[۱]

شیخ کے ہمعصر فضلا اور ارباب علم میں بہتیرے ایسے تھے جن کے مابین اُن سے ہمیشہ مباحثہ علمیہ پر گفتگو رہا کرتی تھی۔ ابو القاسم کرمانی ایک بزرگ تھے جنہوں نے شیخ کی کتاب النجاۃ پر سیکڑوں اعتراضات وارد کئے تھے، مگر جب شیخ کی طرف سے جواب میں پانچ جز کا رسالہ ایک شب کی کامل محنت کے بعد تیار کرکے بھیجا گیا تو وہ ششدر و حیران ہو کر رہ گئے اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی، ابو الریحان البیرونی جو دربار غزنی کے ممتاز عالم تھے شیخ کی ذات سے اُنہیں گہری عقیدت تھی اور اکثر امور میں اُن سے صلاح و مشورہ لیا کرتے تھے، نیز ان کی فرمائش پر شیخ نے بطلیموس اور یونانی حکیم ارسطو کے مصنفات کی شرحیں لکھی تھیں،

وفات کے حالات

اصفہان میں شیخ جب علاءالدولۃ کے پاس اقامت گزیں تھے یکبارگی قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے، ضعف و نقاہت کی حد نہ رہی، دن میں آٹھ آٹھ مرتبہ آلات کے ذریعہ دوا شکم میں پہنچائی جاتی تھی مگر افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی، آنتوں میں زخم پڑ گئے پھر لطف یہ کہ دوا جو تیار کرائی جا رہی تھی شیخ کے غلاموں نے خیانت سے اس میں افیون کا ایک جز شامل کر دیا، جس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اس سے پیشتر کے معاملہ میں بد احتیاطی کی تھی اور انہیں خوف تھا کہ شیخ صحت کے بعد انہیں ضرور سزا دیگا

[۱] عیون الانبیا جلد دوم صفحہ ۳ مطبوعہ مصر ۱۲

اس لئے کوشش کی کہ وہ جانبر ہی نہ ہوسکے۔ دوا پینے کے بعد اب شیخ کی حالت زیادہ نازک ہوگئی، اعضائے دماغی میں اختلال پڑ گیا اور ہفتوں تک ایک نیم بے خودی کی سی کیفیت طاری رہنے لگی اس اثنا میں علاء الدولہ نے اصفہان سے ہمدان کا قصد کیا شیخ بھی ہمراہ تھے لیکن راستہ میں مرض اپنے انتہا کو پہنچ گیا اور بہزار دقت ہمدان پہنچے[۱] دوا ترک کردی اور اکثر یہ فرمایا کرتے تھے وہ قوت مدبرہ جو میرے جسم میں ہے اپنی تدبیر سے عاجز آگئی ہے اسلئے دوا اب کارگر نہیں ہوسکتی، پھر غسل کرکے توبہ کیا جو کچھ پاس تھا سب خیرات کردیا مظلوم کا حق ادا کیا اور غلاموں کو آزاد کردیا۔ ہر تیسرے دن ایک بار قرآن ختم کرنے لگے[۲] پھر انتقال کرگئے اور ہمدان میں شہر پناہ کے مغربی حصہ کے تلے مدفون ہوئے، سال وفات ۴۲۸ھ ماہ رمضان المبارک بروز جمعہ ہے، غالباً کل ۵۳ سال کی عمر پائی، لیکن ابوالحسن ابن اثیر نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ شیخ کی وفات اصفہان میں ہوئی ہے، ان دو روایتوں میں تضاد ہے لیکن اس سے کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا کہ وفات ہمدان ہی میں ہوئی ہے، البتہ اختلاف اس میں رہگیا کہ شیخ مدفون کسی مقام پر ہوئے ہیں ممکن ہے مرنیکے بعد ان کی نعش اصفہان منتقل کردی گئی ہو لیکن جمہور کا خیال ہے کہ شیخ کا مزار بھی ہمدان ہی میں ہے۔

چونکہ شیخ الرئیس کا انتقال درد قولنج میں ہوا تھا اسلئے کمال الدین نے اس پر یہ اشعار لکھے تھے۔

رئیت ابن سینا یعادی الرجال ، و فی الحبس مات اخس الممات

میں نے ابن سینا کو دیکھا کہ وہ زندگی بھر درد قولنج کا علاج کرتا رہا مگر آخر کار وہ خود ہی اس مرض میں بری طرح ہلاک ہوا۔

---

[۱] تراجم الحکما صفحہ ۲۶۹، ۱۲

[۲] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۵۵، ۱۲

فلم یشف ما نالہٗ بالشفا   ولم ینج من موتہٖ بالنجاۃ

اس کی کتاب شفا نے اس کو غم و درد سے شفایاب نہ کیا اور نہ اس کی نجاۃ (کتاب) اسکو پنجۂ موت سے نجات دلا سکی،

شیخ کا مرتبہ

شیخ الرئیس کے علمی کمالات بصیرت کاملہ اور مجتہدانہ کارناموں کا استقصا کرتا بجائے خود ایک مشکل اور اہم ترین کام ہے، مگر خلاصہ یہ ہے کہ ان کے فضائل اور محاسن ذاتی کی فہرست اسقدر مطول ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے، اسلامی تاریخ میں شیخ کو جو عام مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا امتیازی شرف حاصل ہے غالباً جہاں تک میرا قیاس صحیح ہے بجز ابو نصر فارابی کے اور کوئی شخص اس درجہ کو نہ پہنچ سکا فارابی اور سینا میں فرق یہ ہے کہ خلفائے عباسیہ کے عہد خلافت میں مامون رشید نے یونانی فلسفہ کے عربی تراجم کا جو اہتمام کیا اگرچہ اس سے ملک کا اکثر تعلیم یافتہ طبقہ بہت کچھ بہرور اور روشناس ہو چکا تھا مگر پھر بھی بعض مسائل کچھ ایسے پیچیدہ اور دقت طلب تھے جن کو اچھی طرح عام حضرات سمجھ نہ سکتے تھے، ابو نصر فارابی نے اس دشوار گزار راستہ کو ہر قسم کی رکاوٹوں سے بالکل صاف کر دیا اور ارسطو کی جتنی کتابیں تھیں مثلاً البرہان، المغالطہ، الخطابتہ، مقولات، اور القیاس وغیرہ سب کی مکمل شرح لکھدی لیکن ایک غیر ملکی فن کو محض ترجمہ اور شرح کی بدولت اپنی زبان میں منتقل کر دینے سے اجنبیت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی خاص اصول و قاعدہ کے ماتحت اس کو ڈھال کر اپنا ذاتی فن نہ بنا لیا جائے، شیخ الرئیس کو اگر اسی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ انہوں نے جو کام انجام دیا وہ مسلمانوں اور نیز دیگر متمدن اقوام کے لئے بہت زیادہ سود مند اور مفید ثابت ہوا، شیخ نے فن معقولات میں جو کچھ لکھا وہ بہت زیادہ صاف سلجھا ہوا اور حشو و زوائد سے یکسر پاک ہے، غرضیکہ ان اجزائے پریشان کو جو ان کے ماقبل کے بزرگوں نے تیار کر رکھا تھا شیخ نے انہیں ایک خاص اسلوب اور نظم و ترتیب کی صورت میں جمع کیا

اور اس طرح مدون کیا کہ وہ خاص اسلامی فن بن گیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے کتاب الشفاء اور قانون دیکھی ہے انہیں معلوم ہوگا کہ مصنف نے طرز بیان میں اپنی غیر معمولی قابلیت کا کتنا زبردست ثبوت پیش کیا ہے کہ سارے مباحث اور ابواب کے پڑھ جانے کے بعد بھی کسی اجنبی فن ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ شیخ کو جس فن میں ید طولیٰ اور کمال حاصل تھا وہ طبیعات ہے اور دراصل وہ اسی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اسکو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ شیخ کی تصانیف اور رسالے تمام مہذب دنیا میں پھیل کر عام مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور آج بھی اُن کا نام ہر تعلیم یافتہ گروہ اور مہذب سوسائٹی میں ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، یورپ کو شیخ کی تصانیف سے جو ذوق ہے۔ مغربی علماء کو کتاب الشفاء سے جو تعلق ہے اور مستشرقین کو شیخ کی ذات سے جو والہانہ شیفتگی ہے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یورپ جب سے تمدن و ارتقاء کے منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوا ہے اس وقت سے لیکر آج تک تمام مغربی درس گاہوں میں شیخ کی تصنیفات کثرت سے پڑھائی جاتی اور درس میں داخل ہیں، یہ اور بات ہے کہ عمر خیام کی سی عالمگیر شہرت اگرچہ شیخ کو ہر مغربی انجمن میں حاصل نہیں مگر جو ارباب فن اور صاحب بصیرت ہیں اُن کے دل میں شیخ کی عظمت خیام سے کہیں زیادہ ہے، خیام کی شہرہ آفاق مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ اُن کا کلام عارفانہ نکات اور افکار و نتائج کا ایک فلسفیانہ مگر قابل فہم مجموعہ ہے جو ہر خاص و عام کو غائت درجہ محبوب ہے مگر شیخ کے ٹھوس اور عالمانہ خطبے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو حد سے زیادہ لائق اور صاحب فہم ہیں، یورپ چونکہ جاہ و ثروت کا طالب اور مادہ پرست ہے اور شیخ نے علم طبعی کے اسرار و نکات نہایت دیدہ ریزی سے بیان کئے ہیں اس لئے اُس کو ان چیزوں سے بہت دلبستگی ہے، فرانس، جرمنی اٹلی اور انگلستان کی تمام یونیورسٹیوں اور طبی کالجوں میں قانون شیخ اور شفاء کا خلاصہ خواہ وہ کسی صورت میں ہو طلباء کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل درست

ہے کہ مسیحی یورپ اور نئی دنیا نے فن طب اور مادیات میں جو حیرت انگیز اور نمایاں ترقی کی ہے وہ زیادہ تر ہمارے شیخ کی کدوکاوش اور خرمن کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہے، ہومیوپیتھک علاج جس کو مغربی حق شناسوں نے ایجاد و اختراع کی صورت میں پیش کیا ہے دراصل کوئی نئی چیز نہیں جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہوں بلکہ یہ بھی شیخ الرئیس اور ہمارے قدما کی ایجاد ہے، ایشیائی ممالک اور مشرقی دنیا میں جو شیخ کو عزت اور وقار حاصل ہے اُسکے متعلق محض اتنا سن لینا کافی ہے کہ طبی مدارس میں داخل ہوتے ہی طلبا کو فوراً شیخ کے اسم گرامی سے تعارف کرادیا جاتا ہے، اسلئے اگر شیخ کو طبیعات کا امام اعظم کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا۔

طبیعات سے مراد غالباً علم طب ہے

خلاصہ زندگی اور مخالفین کی دست درازیاں

شیخ کے حالات اور واقعات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کی نیرنگیوں نے انہیں اطمینان سے ایک جگہ رہنے نہ دیا، اُن کی آنکھوں نے سیکڑوں انقلابات دیکھے ملکوں کو اُجڑتے دیکھا اور سلاطین و تاجداروں کے مقتل کا مشاہدہ کیا، شیخ اگرچہ ایک عرصہ تک عہدۂ وزارت پر ممتاز رہے لیکن پھر بھی جان کا خوف زندگی بھر رہا، ان کا گھر کئی بار لوٹا گیا لیکن بایں جور و تعدی اپنا علمی مشغلہ کبھی نہ چھوڑا، اُن کی اکثر تصانیف ایسی حالت میں لکھی گئی ہیں جبکہ وہ اضطراب و سراسیمگی میں مبتلا تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حوادث و انقلابات سے وہ کچھ زیادہ متاثر نہ تھے بلکہ اُس کو ایک مشترکہ عذاب سمجھتے تھے جس سے دنیا کا کوئی فرد و بشر محفوظ نہیں رہ سکتا چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں،

لقد طفت فی کل المعاهد کلها ۔۔۔ وسیّرتُ طرفی بین تلك المعالم

میں نے تمام مقامات کی سیر کی ہے اور جب اپنی نگاہ کو پھیلا کر دیکھا

فلم ارالا واضعاً کف حائر ۔۔۔ علی ذقن او قارعاً سن نادم

تو ہر شخص کو متحیر و پریشان اور دندان ندامت کھٹکاتے ہوئے ہی پایا

معاصرت منافرت اور باہمی عداوت کا سبب ہوتی ہے، اس لئے دنیا میں کوئی باکمال ایسا نہیں گذرا جس کو مخالفین کی ستم آفرینیوں کا تختۂ مشق اور ہدف سلامت نہ بننا پڑا ہو، ابن سینا کے مصنفات پر اسی زمانہ کے بعض کج فہم اور کینہ پرور علما رنے پھر اعتراضات کر کے یہ چاہا تھا کہ اس کو ابھرنے کا موقع نہ دیا جائے، اس سلسلہ میں شیخ کو بہت کچھ دکھ درد اٹھانا پڑا مگر طبیعت میں عالی حوصلگی اور مزاج میں ثابت قدمی اس قدر غالب تھی کہ کسی کو خاطر میں بھی نہ لاتے تھے چنانچہ وہ خود اس کے متعلق اپنے اشعار میں لکھتے ہیں،

(۱) عجبًا لقوم یحسدون فضائلی — ما بین غیابی الی عذالی

مجھے تعجب ہے کہ یہ لوگ مرے فضائل پر کیوں حسد کرتے ہیں ان ملامت گردن کو کیا ہو گیا ہے

(۲) عتبوا علی فضل وذمّوا حکمتی — واستوحشوا من نقصہم وکمالی

وہ میرے محاسن کی وجہ سے ناراض میری حکمت کی مذمت کرتے اور اپنے نقائص اور میرے کمالات کے باعث مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں

(۳) انی وکیدھم وما عتبوا بہٖ — کالطود یحقر نطحۃ الا دعال

مجھے اُن کے مکر وغصہ کا مطلق غم نہیں کیونکہ پہاڑ کی مضبوط چٹان کو مینڈھوں کے ٹکر کی کیا پرواہ ہے!

(۴) واذا الفتی عرف الرشاد لنفسہٖ — ھانت علیہ ملامۃ الجہال[۵]

جب انسان کو اپنی سچائی اور ہدایت کا کامل یقین ہو جاتا ہے تو پھر جاہلوں کی ملامت اُسے ناگوار نہیں گذرتی

شیخ کی شاعری

شیخ کے مناقب اور فضائل میں شاعری کا عنصر اُن کی عالم گیر شہرت کا سبب نہیں۔ کیونکہ اپنے ہمعصروں میں کبھی اُنھوں نے

---

۵ عیون الانبیا، جلد دوم صفحہ ۴،

اپنے کو ایک شاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے نمایاں نہیں کیا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعض دوستوں اور معزز احباب کے کہنے پر بطور تفریح کے چند قصاید لکھے تھے جن میں بعض ایسے برجستہ اور لاجواب نکلے کہ ملک کے کامل ادیبوں نے بے ساختہ اُن کی حسن طبیعت اور خوبی کلام کی داد دی تھی، ناظرین کو معلوم ہوگا کہ شیخ نے ابو منصور جبائی کے مقابلہ میں محض اُن کو زک دینے کے لئے تین قصائد تصنیف کئے تھے، مگر اُن کی زبان اس قدر سخت اور نادر الفاظ کا اُن میں اتنا بڑا انبار موجود ہے کہ تا وقتیکہ کوئی لسان العرب اور قاموس کی ضخیم جلدوں کو لے کر نہ بیٹھے اشعار کو حل کرنا تو درکنار اشارہ وکنایۃ سے مفہوم بھی نہیں سمجھ سکتا شیخ کا سب سے زیادہ معروف اور عام پسند کلام قصیدہ عینیہ ہے جس میں انہوں نے روح کی دنیاوی سیر اور اس سیاحت کی علت غائی پر بحث کی ہے، طرز بیان اور طریقۂ ادا تقریبًا وہی ہے جو خواجہ فریدالدین عطار کا منطق الطیر میں ہے یعنی شیخ عطار نے جس طرح معارف اور اسرار الٰہی کو طیور سلیمانی ہدہد اور پرندوں کی زبان سے ادا کیا ہے شیخ نے بعینہٖ روح انسانی کو ایک قمری قرار دے کر عالم سفلی کی سیر کرائی ہے، وہ قصیدہ یہ ہے۔

(۱) هبطت الیك من المحل الارفع ورقاء ذات تعزز و تمنع

اے انسان! معزز اور آزاد طائر (روح) نے اوج سما سے تیری جانب نزول کیا ہے

(۲) محجوبۃ عن کل مقلۃ عارف وهی التی سفرت ولم تتبرقع

وہ ہر عارف کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے حالانکہ اس کے چہرہ پر نقاب تک نہیں ہے

(۳) وصلت علی کرہ الیك وربما کرهت فراقك وهی ذات تفجع

وہ اپنی خواہش کے بغیر تجھ سے آکر ملا لیکن اب تجھ سے جدا ہونا پسند بھی نہیں کرتا

(۴) انفتُ وما انست فلمّا واصلتُ الفت مجاورة الخراب البلقع

یہ پہلے غیر مانوس تھا لیکن اب اتر آنے کے بعد اس خراب آباد سے مانوس ہوگیا ہے

(۵) واظنّھا نسیت عھودا بالحمیٰ ومنازلا بفراقھا لم تقنع

میرا گمان ہے کہ وہ چراگاہ کے عہود و نشیمن کو بھول گیا ہے جس کی جدائی کبھی اُس کو گوارا نہ تھی

(۶) حتّی اذا تعلّقت بھاء ھبوطھا فی جسم مرکزھا بذات الاجرع

یہانتک کہ جب پتھریلی زمین کے میم مرکز سے ہائے ہبوط آملا تو ثائے ثقیل آویزاں ہوگیا (یعنی جب روح جسم سے ملگئی)

(۷) علقت بھا ثاء الثقیل فاصبحت بین المعالم والطلول الخضع

اور وہ پرند کھنڈرات میں زندگی بسر کرنے لگا

(۸) تبکی اذا ذکرت دیارا بالحمیٰ بمدامع تھمی ولما تقطع

وہ جب چراگاہ کے نشیمن کو یاد کرتا ہے تو رو دیتا ہے اور بہت آنسو گراتا ہے

(۹) وتظلّ ساجعةً علی الدمن التی درست بتکرار الریاح الاربع

اور اپنے قدیم آشیانہ کی یاد میں اُن کھنڈروں میں جاکر جنہیں ہوا نے برباد کردیا ہے آہ و فغان کرتا ہے

(۱۰) اذعاقھا الشرک الکثیف وصدّھا قفص عن الاوج الفسیح الاربع

کیونکہ (اجسام کے) قفس عنصری اور کثیف جال نے وسیع اور اونچی چراگاہ سے اُسے روک دیا ہے

---

(۱۱) حتیٰ اذا قرب مسیر الی الحمیٰ ودنا الرحیل الی الفضاء الاوسع

حتی کہ جب چراگاہ کی واپسی اور رحلت کا وقت قریب آجاتا ہے تو بے تابانہ چہچہانے لگتا ہے

(۱۲) سجعت وقد کشف الغطاء فابصرت مالیس یدرک بالعیون الہجع

اور اس وقت پردہ اُٹھ جاتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے جن کو وہ پہلے دیکھ نہ سکتا تھا

(۱۳) وغدت مفارقۃ لکل مخلف عنہا حلیف الترب غیر مشیع

اور خاکی بہا دلپسماندہ اور دون ہمت جسم سے تعلق منقطع کرلیتا ہے

(۱۴) وبدت تغرد فوق ذروۃ شاہق والعلم یرفع کل من لم یرفع

پھر بلند کنگرہ پر جاکر نغمہ سرائی کرتا ہے کیونکہ علم ہر پست کو بلند کردیتا ہے

(۱۵) فلای شی اہبطت من شاہق سام الی قعر الحضیض الاوضع

وہ بلند مقام سے اُتار کر پستی کیطرف کیوں بھیجا گیا ہے؟

(۱۶) ان کان ارسلہا الالہ لحکمۃ طویت عن الفطن اللبیب الاروع

اگر خدا نے کسی خاص حکمت کی بنا پر ایسا کیا ہے جس کو ارباب دانش معلوم نہیں کرسکتے

(۱۷) فہبوطہا ان کان ضربۃ لازب لتکون سامعۃ بما لم تسمع

تو میں کہوں گا کہ اس کا لازمی سبب یہ ہے کہ غیر مسموع باتوں کو سننے اور کائنات کی مخفی باتوں کا علم حاصل کرکے پھر لوٹ جائے

(۱۸) وتعود عالمۃ بکل خفیفۃ فی العالمین فخرقہا لم یرقع

---

(۱۹) دھی اللتی قطع الزمان طریقھا حتیٰ لقد غربت بغیر المطلع

وہ معزز طائر ایک مدت کی سیر و سیاحت کے بعد پھر اپنے مقام کی طرف پرواز گیا

(۲۰) فکانھا برق تألق بالحمیٰ ثم انطوی فکانہ لم یلمع

وہ اس تیزی سے آیا اور پھر چلا گیا گویا بجلی تھا جو چمک کر اس طرح غائب ہو گئی گویا کبھی چمکی ہی نہ تھی

علاوہ بریں شیخ نے اکثر نسخوں کو نظم میں تحریر کیا تھا، ایک مرتبہ ابو طالب علوی جو وزیر اور شاعر بھی تھے ان کی پیشانی پر چند دانے نکل آئے جس سے ان کو بہت تکلیف تھی، انھوں نے حسب ذیل اشعار میں اپنی شکایت لکھ بھیجی اور نسخہ کے طالب ہوئے۔

ضیغۃ الشیخ مولانا و صاحبہٗ وغرس انعامہ بل نشئی نعمتہ

شیخ کا احسان مند اور نعمت پرورد دوست اعلیٰ حضرت کی خدمت میں یہ شکایت کرتا ہے

یشکو الیہ ادام اللہ مدتہ آثار بثر تبدّی فوق جبہتہ

کہ اس کی پیشانی پر دانے نکل آئے ہیں اس لئے حضور سے ملتجی ہے کہ اس کو اچھا کرے

فامنن علیہ بحسم الداء ممتنًا شکر النبی لہٗ مع شکر عترتہ

ثواب عظیم حاصل کریں،

شیخ نے اس کے جواب میں یہ منظوم نسخہ عطا کیا جس میں نہایت برجستگی اور خوبی سے مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔

اللہ یشفی وینفی ما بجبہتہ من الاذی ویعافیہ برحمتہ

شفا تو خدا ہی کے اختیار میں ہے اور وہی عافیت اور صحت عطا فرمائیگا،

اما العلاج فاسهال یقل منه ختمت آخر ابیاتی بنسخته،
لیکن اگر علاج کا سوال ہے تو سب سے پہلے اسہال کیا جاوے

ولیرسل العلق المصاص یسفن دم الفذال ویغنی من حجامته
پھر پس سر جونکیں لگوائی جائیں تاکہ فاسد خون پی جائیں اور پچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے

واللحم یھجرہ الا الخفیف ولا یدانی الیہ شرابا من مدامته
گوشت بہت کم استعمال کیا جائے اور مے نوشی سے قطعاً احتراز برتا جائے

الوجہ یطلیہ ماء الورد معتصرا فیہ الخلاف ملا فاوقت ھجعته
اور سوتے وقت عرق گلاب میں بید مشک ملا کر چہرہ پر مل دیا جائے

ولا یضیق منہ الرذ مختنقا ولا یصیحن ایضا عند سخطہ
اور اچکن کے بٹن کس کر نہ لگائے جائیں کہ گلا گھٹنے لگے اور غصہ میں آکر زور سے نہ بولا جائے

تصانیف شیخ شیخ کی تصانیف کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں مگر اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ سو سے کچھ زائد ہیں، بہت سی ایسی کتابیں تھیں جن کی اشاعت کی نوبت تک نہ آئی اور بد احتیاطی یا ناگہانی حادثہ کے باعث وہ شیخ کی حیات ہی میں تلف ہو گئیں لیکن جو سرمایہ شیخ کی دماغی کد و کاوش کا زمانہ کے دست تطاول اور بربادی سے محفوظ رہا ان میں بھی اکثر ایسی کتابیں ہیں جو اپنی دوبارہ عدم اشاعت کی وجہ سے یا تو تقریباً معدوم ہو چکی ہیں یا قلمی صورت میں کسی مغربی دار الکتب کے گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں، اور بہت کم نسخے ایسے ہیں جو بآسانی ہر جگہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔

قانون شیخ اس کے ۱۴ اجزا ہیں، فن طب میں ہے یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور شیخ نے اپنی زندگی کے اکثر تجربات کو اس میں نقل کیا ہے، محمد بن یوسف

جو شیخ کے ارشد تلامذہ سے تھے اُنہوں نے اس کی تلخیص کی اور اس کا نام موجز رکھا اور بجائے اصل مطول کتاب کے آج وہی نصاب میں داخل ہے۔

کتاب الشفاء شیخ کی شہرت کی باعث زیادہ تر یہی کتاب ہوئی اس میں چار فن شامل ہیں اور اٹھارہ جز میں ہے مگر اکثر نایید ہیں۔

انصاف بیس جلدوں میں ارسطو کی جمیع تصانیف کی شرح کی گئی تھی اور نیز شیخ نے مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ خیالات پر ان میں ایک تبصرہ بھی کیا تھا مگر افسوس کہ یہ نایاب اور بیش بہا ذخیرہ سلطان مسعود کے سپاہیوں نے شیخ کی سواری سے لوٹ کر بے دردی کے ساتھ پامال کر دیا،

الحاصل والمحصول یہ شیخ کی پہلی تصنیف ہے جس کو اُنہوں نے ابوبکر برقی کی فرمایش پر تحریر کیا تھا مگر اب گمنام ہے۔

لسان العرب شیخ نے دس جلدوں میں عربی کی ایک محققانہ لغت تیار کی تھی مگر ابھی مسودہ کو صاف نہ کرنے پائے تھے کہ وفات کر گئے، اور پھر اس کی طباعت نہ ہوسکی۔

نجاۃ ابن سینا اس میں منطق وفلسفہ دونوں علوم شامل ہیں اور مصر میں عام طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

اشارات فن منطق میں ہے اور بہت مشہور تصنیف ہے، درس نظامیہ میں اسکو خاص اہمیت دیجاتی ہے۔

کتاب دانش شیخ نے اسکو پند وموعظت کے طور پر علاء الدولۃ کیلئے فارسی زبان میں تحریر کیا تھا، علاوہ اس کے فن منطق میں کل آٹھ رسالے ہیں اور طبیعیات میں تقریباً پندرہ کتابیں شیخ نے تحریر کی تھیں، بہر کیف شیخ کی تصانیف کی فہرست بہت مطول ہے۔ لیکن یہ ہماری غفلت اور حرماں نصیبی ہے کہ ہم شیخ جیسے اسلامی مصنف کے علمی کمالات اور وسعت معلومات سے بہت کم واسطہ رکھتے ہیں،

غزل

از

(جناب خان صاحب سید رضا علی صاحب وحشت کلکتہ)

معافی کے نہیں قابل، کچھ ایسی کی خطا میں نے
کیا خونِ وفا جو وقت کی عرضِ وفا میں نے

تری بیگانہ خوئی پہ نہ ہوگی مجھ کو مایوسی،
نہیں دیکھی ہے کیا تیری نگاہ آشنا میں نے

خطا ثابت ہوئی خود اپنے ہی شوقِ اسیری کی
تری زلفوں کو ناحق کہدیا دامِ بلا میں نے

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونیکا موقع تھا
کیا ہے شکر کے پردے میں الفت کا گلہ میں نے

حریفِ غفلتِ ہستی نہیں تحریکِ بیداری
نہ اٹھنا تھا نہ اٹھا گو سنی بانگِ درا میں نے

یہ کیسی آہ نکلی یک بیک ڈوبی ہوئی غم میں
شکستِ دل کی شاہد ہی سنی ہے جو صدا میں نے

نہیں احساس ہے مجھ کو تری بے اعتنائی کا
ہوئی مدت کیا ہے شیوۂ تسلیم و رضا میں نے

نہ سرکی اک قدم بھی خاک میری کوئے جاناں سے
جمایا رنگ مٹ مٹ کر بہ رنگِ نقشِ پا میں نے

کبھی پر میں نے چھوڑی چارہ سازی دردِ ہجراں کی
سرِ شوریدہ کو قدموں پہ تیرے رکھدیا میں نے

تردد میں ہے، گھبرائی ہوئی سی ہے نظر اس کی
نگاہِ حسرت آگیں سے جو کی ہے التجا میں نے

نہ ہو مایوس کوئی ہے درِ رحمت کھلا ہر دم
اجابت آئی استقبال کو جب کی دعا میں نے

یہ کیا انجان بن کر پوچھتے ہو مدعا میرا
بس اب جانے بھی دو پایا تمہارا مدعا میں نے

کھلا آخر کہ ہے دردِ محبت ہی دوائے دل
عبث اس دردِ جاں پرور کی ڈھونڈی تھی دوا میں نے

زمانے کی روش کچھ ایسی ہے یاس آفریں وحشت
مٹایا رفتہ رفتہ دل سے نقشِ مدعا میں نے

انسان کا دماغ اور اُسکا استعمال

از

(جناب حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹر اٹ لا، ایڈیٹر شمع)

اگر آپ کا دماغ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ آپ اس مضمون کے حروف نہ پڑھ سکتے، نہ اس رسالہ کو اُٹھا سکتے، نہ سانس لینا ممکن ہوتا اور نہ قلب کو حرکت ہوتی، مختصر یہ کہ آپ زندہ نہ ہوتے۔ دماغ ایک (organ vital) ہے غالباً اب آپکے ذہن میں دماغ کی اہمیت آگئی ہوگی؟

دماغ علم حاصل کرنے کا بھی (organ) ہے، بچہ پیدا ہوا بظاہر اُس کی صحت ہر اعتبار سے ٹھیک ہے، لیکن دماغ اس قدر کم ہے کہ اُس کو صرف زندہ رکھہ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ سانس لیتا ہے، اُس کا قلب حرکت کرتا ہے، معدہ غذا کو قبول اور ہضم کرتا ہے اُس نے تیس برس کی عمر بھی پائی۔ مگر نتیجہ؟

وہ کچھ نہ سیکھہ سکا؟ اس کو انسان کی طرح برتاؤ کرنے کا ڈھنگ نہ آیا۔ کسی چیز سے واقف نہ ہو سکا کوئی لفظ نہ دہرا سکا، نہ ایک قدم چل سکا اور نہ کسی کو پہچان سکا، یوم ولادت سے تاریخ وفات تک اُسکی یکساں حالت رہی! وجہ یہ تھی کہ وہ فاتر العقل تھا!

قوائے انسان کو محض استعمال کرنے کے لئے دماغ کا بیسواں حصہ کافی ہے، اگر بقیہ اُنیس ۱۹ حصے مل گئے تو وہ مکمل انسان ہے، ورنہ فاتر العقل!

پیدائیشی فاتر العقل کو اُس کا مختصر دماغ زندہ رکھتا ہے، اور پورا دماغ، نہ صرف

انسان کو زندہ رکھتا ہے بلکہ علم و عمل کا اہل بنا دیتا ہے۔ اگر آپ سیکھنے والے اور دماغ کا فرق نہ معلوم کرلیں گے تو میں آپ کو دماغ کو صحیح استعمال کرنے کے متعلق مفید معلومات نہ بتا سکونگا۔

پاگل خانوں میں ایسے پاگلوں کی کمی نہیں جو بالکل دیوانے اور لاعلاج ہیں! کیونکہ انکا زندہ دماغ موجود ہے اور چونکہ سیکھنے والا دماغ خراب ہوگیا ہے اس لئے ان کی حرکتیں عام انسان سے مختلف ہیں۔

جسم اور رگوں کے درمیان ایک واسطہ ہے، دماغ، رگوں کی نظام کا ایک حصہ ہے اور رگیں جسم کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں، جس سے انسان عملی زندگی بسر کرتا ہے۔

اگر رگیں نہ ہوتیں تو قوت احساس، اور اعصابی حرکت، ناممکن ہوتی، مفلوج کی ٹانگ اس کے جسم کا حصہ ہے لیکن کسی کام کی نہیں بلکہ ایک بار ہے، کیونکہ اسکی رگیں مردہ ہیں اور قوت احساس اور قوتِ حرکت مفقود ہے۔

رگوں کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ٹیلیفون کی مثال کارآمد ہوگی دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کو ٹیلیفون کا صدر دفتر سمجھنا چاہئے۔ (Sense organs) وہ ٹیلیفون کا آلہ ہیں جن کو اور ہم اس کو (Receiver) وصول کن کہیں گے رگیں ٹیلیفون کی تار ہیں جو صدر دفتر تک آواز پہنچاتے ہیں۔ رگوں کا جال تمام جسم میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی کو رگوں کا نظام بھی کہتے ہیں۔

آپ کو اب اندازہ ہوا ہوگا کہ بالکل دماغ ایک گورکھ دھندا ہے، کائنات عالم میں اس سے زیادہ عجیب اور کوئی چیز نہیں، جب تک آپ اس کو نہ سمجھیں آپ اس کا صحیح استعمال نہ کرسکیں گے۔

آپ یہ مضمون پڑھ رہے ہیں، لیکن کس طرح؟ الفاظ نگاہ کے مقابل ہیں، آنکھوں میں جو کہ (Sense organs) ہیں کشش ہوتی ہے اور منعکس شعاعوں کی کرنیں ان میں داخل ہوتی ہیں، بینائی کی رگیں ان نتائج کشش (Impulses) یعنی الفاظ کو دماغ میں

لیجاتی ہیں اور دماغ حکم صادر کرتا ہے۔ اگر اس نے حکم دیا کہ پڑھے جاؤ تو آپ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور الفاظ پر نظر دوڑانے کا کام آپ کے چند اعصاب نے انجام دے دیا تاکہ پڑھنے کا سلسلہ بند نہ ہو، ممکن ہے دماغ نے یہ حکم کیا کہ رسالہ بند کر دو اور لیٹ کر آرام کرو، نتیجہ! آپ کے جسم کے سینکڑوں اعصاب ان پیغاموں کو عملی صورت میں لانے میں مصروف ہو گئے یہ اعصاب عمل کن ہیں (Sensory nerves) رگیں اثر پذیر ہو کر مرکزی مقام پر لیجاتی ہیں، اور کارکن اعصاب کا کام ہے کہ وہ مرکزی مقام کے احکام کو مظہر اثر اعصاب تک پہونچا دیں۔ اثر پذیر رگوں کی تعداد لاکھوں اور کروروں سے بھی زیادہ ہے! گویا آپ کا کل جسم اور اس کا ایک ایک عضو بلکہ ہر عضو کا حصہ اثر پذیر ہے، بعض اثرات کو کھال قبول کرتی ہے اور بعض کو ناک، کان اور آنکھیں قبول کرتی ہیں۔ مثلاً اس وقت جبکہ آپ بیٹھے ہوئے شمع کو ملاحظہ کر رہے ہیں، شور و غل، ہوا، روشنی، حرارت وغیرہ وغیرہ سے آپ کا جسم مُوثر ہو رہا ہے اور اس اثر پذیری کا ثبوت، آپ جسم کے مختلف اعضاء کے ذریعہ سے، یعنی ناک بھوں چڑھا کر مسکرا کر، یا الفاظ کے ذریعہ سے، دیتے ہیں۔ اور سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، دانستہ یا نادانستہ، آپ اپنی زندگی میں ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس قسم کے اثرات کا اظہار اپنے اعضا کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور جسم کے مرکزی احکام کے پابند رہتے ہیں، جس طرح جسم انسانی میں اثر پذیر رگوں کی تعداد بہت ہے اسی طرح کارکن اعصاب کی بھی کمی نہیں ہے۔

رگوں کا نظام اثر پذیر ہے، یہی نظام آپ کے جسم میں اثر پذیر رگوں اور مظہر اثر اعصاب میں تعلقات اور توازن قائم رکھتا ہے، بغیر اس تعلق اور توازن کے زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اس کی برکت سے مناظر سے لطف اندوزی اور ذایقوں سے لذت چشی حاصل ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ احساسات کا کس طرح اظہار کرتے ہیں؟ موذن کی اذان، خوبصورت چہرہ کی جھلک، بھوک وغیرہ کو آپ کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ اس کا جواب اس امر پر منحصر ہے کہ آپ نے ابتک اپنے دماغ کو کس طرح استعمال کیا ہے۔

رگوں کے نظام کا ایک مرکز نہیں ہے، وہ مجموعہ ہے مختلف مرکزوں کا، اُن کی ذمہ داریاں بھی مختلف ہیں۔ علم حاصل کرنے والا مرکز افضل ہے، اور دیگر مرکزوں کا حاکم ہے بشرطیکہ آپنے اُن کو اس کا تابع بنا دیا ہو، ان کی تابعداری کی وسعت سے آپ کی قوتِ احساس کا اندازہ ہوتا ہے، اور آپ میں وہ قابلیت پیدا ہوتی ہے جس سے آپ اپنی خواہشات کو پورا کرنے پر قادر ہوسکیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ محض منعکس افعال کا جو ادنیٰ، اور اعلیٰ مرکزوں سے پیدا ہوتے ہیں، فرق معلوم فرمالیں،

فرض کیجے آپ کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر ہے، میں نے آپ کے گھٹنے سے ذرا نیچے ہاتھ مارا آپکا پیر اُچھلا، اس کو محض منعکس فعل کہتے ہیں۔ ضرب کا اثر ریڑھ نے جو ایک ادنیٰ مرکز ہے محسوس کیا، وہاں سے کارکن اعصاب نے اس کو ایک پٹھے تک پہونچا دیا۔ پٹھا فوراً سمٹ گیا اور آپکی ٹانگ اچھل گئی۔ میرے ہاتھ سے چوٹ لگنا (ہیجان) پوری ٹانگ کے اعصابی اجزار کو حرکت (فعل منعکس) میں لانیکا باعث ہوا ریڑھ بعض منعکس افعال کا مرکز ہے،

ممکن ہے آپ نے میری حرکت کو گستاخی پر محمول کیا، اور غصہ آگیا، دل کی دھڑکن بڑھی تنفس میں ترقی ہوئی۔ اعضا میں خون کا دوران کم ہوا۔ کارکن اعصاب میں خون کی زیادتی ہوگئی۔ جگر نے نشاستہ حیوانی کو شکر میں بدل دیا جس سے قوت بڑھ گئی، اور آپ مجھے سزا دینے اور صلواتیں سُنانے پر آمادہ ہوگئے۔ توہین پر غصہ کا آنا دماغی فعل ہے۔

پیر کا اُچھالنا فطری حق ہے جو آپ کو کسی نے نہیں سکھایا، اسی طرح چھینک کا آنا سانس کا لینا، سردی سے کانپنا، رونا، خوف زدہ ہو جانا، غصہ کا آنا، وغیرہ وغیرہ آپ کو سیکھنے نہیں پڑے ہے۔ پیدایش کے وقت ان سب کے مرکز موجود تھے۔

خالی معدہ میں بھوک کی تحریک آپ کو پریشان کر دیتی ہے، آنکھ میں خاک کے ذرہ کی تحریک سے آنسوؤں کی گانٹھ پر اثر ہوا اور نتیجہ پلکوں پر نمودار ہوگیا، سردی کی تحریک کا اثر اعصاب

پر ہوا اور آپ کانپنے لگے۔ دروازے کو کسی نے جھڑجھڑادیا، آپ خوف زدہ ہوگئے، یہ سب افعال آپ کے رگوں کے مرکزی نظام کے دو ادنیٰ مرکزوں سے پیدا ہوئے، یعنی ریڑھ اور ریڑھ کا وہ حصّہ جو اب گردن تک پہنچکر باریک ہوکر دماغ میں پہونچگیا ہے، پیدایش کے وقت ان دونوں مرکزوں کا صحیح ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ ابتدائی افعال اور حیات کو قائم رکھنے کے لئے لازمی ہیں۔

جس بچّہ کی ریڑھ ناقص ہوگئی مرجائیگا، لیکن اگر دو اعلیٰ مرکز یعنی (Cerebellum) (چھوٹا دماغ) (Cerebrum) دماغ، یا بالفاظ دیگر سیکھنے والا دماغ موجود نہ ہو تو بھی بچّہ زندہ رہے گا۔ مگر وہ کچھ نہ سیکھ سکے گا۔ اس کی آنکھیں آگ کو دیکھتی ہیں، ناک خوشبو کو سونگھتی ہے لیکن وہ دماغ نہیں ہے جن میں ان احساسات کو محفوظ رکھہ سکے۔ اور نہ وہ دماغی مرکز موجود ہے جو یہ سکھا سکے کہ آگ کو دیکھنے اور خوشبو کو سونگھنے کے بعد اس کو سابقہ تجربے یاد آجائیں مگر اس میں افعال منعکس کے مرکز موجود ہوتے ہیں جو اس کے اعضا کو بتا دیتے ہیں کہ آگ کی تمازت سے اُن کو ہٹ جانا چاہئے۔

سیکھنے والا دماغ وہ عضو ہے جو اس وقت کام کرتا ہے جبکہ دونوں ادنیٰ مرکزوں کی صحیت تحریک میں کمی واقع ہوجاتی ہے، مثال ماسبق کو لیجئے، ٹخنہ پر ضرب پہونچنے سے آپ کو غصّہ آگیا۔ علم حاصل کرنے یعنی سیکھنے والے دماغ نے کچھ مدد نہ دی، غصّہ کا آجانا عمل منعکس تھا، وہ آپ کو نہ بتا سکتا تھا کہ آپ مجھے سزا دیں یا صلواتیں سُنائیں، صرف اعلیٰ ترین مرکز، اجزار جسم اور بیرون جسم سے احساسات حاصل کرتے ہیں اور ان طاقتوں کو جمع کرتے ہیں جو سوائے عمل منعکس کے، اور سب افعال کے لئے آمادہ کردیتی ہیں۔

وہ افعال کیا ہیں؟ اُن کی بنا ر تجربہ پر ہے، اور مبنی ہے اُس استعمال پر جو آپ دماغ سے لے چکے ہیں فعل منحصر ہے اس امر پر کہ آپ نے اپنے دماغ کو کیسی تربیت دی ہو اور کیا سکھایا ہے۔ پس دیکھنا چاہئے کہ اعلیٰ دماغ کس طرح تجربہ، علم، اور اطلاع حاصل

کرتا ہے؟

پیدائش کے وقت انسان برہنہ۔ بے شرم، بداخلاق، بدتہذیب، ناشائستہ، غرض سب کچھ ہوتا ہے، لیکن بڑا ہو کر انسانی خوبیاں یا حیوانی برائیاں سیکھ سکتا ہے۔ وقتِ پیدائش صرف دماغ کا اعلیٰ مرکز ہی وہ حصہ جسم تھا، جو صاف، غیر آزمودہ، اور بے تربیت تھا، جسم حرکت کے لئے بے چین تھا، اعضاء تمام دنیا میں کام کرنے کے آرزومند تھے۔ آنکھیں آسمان کے پار ہونے کے لئے بے تاب ہیں۔ اور مجسم حیرت اور اضطراب تھا۔ ننھا سا دماغ عادتوں سے مانوس تھا۔ مگر تحریک اور تجربہ سے سبق لینے کے لئے آمادہ تھا۔ گویا زرخیز مٹی کی کیاریاں موجود تھیں اور صرف تخم ریزی کی ضرورت تھی،

عادت فطری ملکہ سے مختلف ہے، ساہوکار کو روپیہ سے، ریاضی داں کو ہندسہ سے اور والدین کو بچوں سے، فطری ملکہ معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل ساہوکار کو روپیہ سے اسی قدر فطری ملکہ ہے جس قدر بندر کو ہے، اور یہی حال ریاضی داں کا ہے، ماں باپ کی محبت میں بھی اسی قدر فطری ملکہ موجود ہے جس قدر کہ شیر کو اپنے بچوں کے ساتھ محبت میں ہے۔ ورنہ ماں باپ کو اولاد سے اور اولاد کو والدین سے نفرت نہ ہو جایا کرتی، اور نہ بھوک کی شدت میں شیر اپنے بچوں کو کھا جایا کرتا۔

ملکہ فطری ایک مستقل کیفیت ہے، جس کو تغیر نہیں، انسان میں حفاظت خود اختیاری کا بھی ملکہ فطری نہیں ہے ورنہ وہ عزیزوں اور دوستوں کی خاطر اپنی جان دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جایا کرتا، ملکہ فطری کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ انسان میں اس سے بہتر عادتیں پیدا ہو سکتی ہیں، اور برخلاف ملکۂ فطری کے انسان اُن کو بدل سکتا ہے، ترقی دے سکتا ہے، اور چھوڑ سکتا ہے۔

عادتیں، بیش قیمت انسانی مقبوضات ہیں۔ ان کی بدولت انسان ہوشیار، سنجیدہ، عالم، مہذب، شجاع، اور شریف بن سکتا ہے۔ ملکہ فطری پیدائش کے وقت انسان کے ساتھ

نہیں آتا۔ بلکہ اس وقت ایسی کلیں موجود ہوتی ہیں جن کو اگر خاص طریقہ پر استعمال کیا جائے تو خوب کام کرتی ہیں۔ پیدا ہوکر بچہ کو بھوک لگی، اس کا احساس اعلیٰ مرکز کو ہوا، لیکن ناتجربہ کاری ناواقفیت، اور الفاظ کی غیر موجودگی نے مجبور کر دیا۔ اور وہ بے تاب ہوکر جسم کو اینٹھنے لگا اور بے ڈھنگا شور وغل مچانا شروع کر دیا۔ حالت وقت کے بموجب یہ کافی تھا۔

کیوں؟

اس لئے کہ بچہ کو پیدائشی حق تھا کہ دوسرے اس کا تحفظ کریں، والدین کی توجہ، خالہ۔ پھوپھی کی محنت، اور غالباً انا کی نگہداشت میسر تھی۔ کھانے اور پلنے کے ابتدائی منازل طے ہوجانے سے بچہ کو بھی سکون حاصل ہوا،

مگر وہ بچہ، بیکار نہیں رہا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر چلائے، اپنی آواز پر تعجب کیا۔ اور آنکھیں پھرا پھرا کر دنیا کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ عجیب عجیب چیزیں نظر آئیں۔ اور نئی نئی باتوں سے آگاہی ہوئی کمرہ دیکھا، کتا دیکھا، گرم اور سرد میں فرق محسوس کیا، میٹھی اور کھٹی چیز کا ذائقہ معلوم ہوا، سخت اور نرم میں تمیز ہوا۔ دور اور نزدیک کا معمہ حل کیا، غصہ اور خوشی کی کیفیت دیکھی، یعنی کچھ باتیں انگلیوں کی بہ سبب سے، اور کچھ زبان، کان، آنکھ، ناک اور جلد کے ذریعہ سے معلوم اور محسوس کیں،

بچہ کو ان چیزوں سے اس لئے واقفیت ہوئی کہ اس نے ان کو تلاش کیا، اور ان چیزوں نے اپنے آپ کو معلوم کرانے میں مزاحمت کی، انگلی میں سوئی چبھی، اور انگلی میں مٹی لگ گئی، سوئی اور مٹی نے بچہ کو دو مختلف پیغام پہونچائے، اسی طرح وہ پیغامات حاصل کرتا رہا، آگ کا شعلہ دیکھ کر نا واقفیت کی وجہ سے ہاتھ بڑھائے، وہ جل گئے، تکلیف کا اثر دماغ نے محسوس کیا، اس کے بعد پھر شعلہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، مگر اس مرتبہ دماغ میں ہاتھ روک دیئے، کیوں؟ پہلی مرتبہ دماغ میں یہ تجربہ نہ تھا، لیکن ہاتھ جلنے کے بعد تجربہ محفوظ ہوگیا، غرض اسی طرح ہزاروں تجربے حاصل ہوتے رہے اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی، تجربات میں ترقیاں ہوتی گئیں،

ریڑھ اور گو داجو ادنی مرکز ہیں پیدائش کے وقت اس قدر ہوشیار ہوتے ہیں کہ اُنکو جواب عمل کے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر آپ کے دماغ ایسے بے خبر اور ناواقف ہوتے ہیں کہ اگر اُن کے ساتھ احتیاط نہ برتی جائے تو وہ بُری باتیں سیکھ لیں گے، انکا کام تجربہ اور علم حاصل کرنا ہے، اور وہ انسان کو پسندیدہ اخلاق کا عادی، یا نہایت مکروہ اور قابل نفرت ہستی بنا سکتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ آپ میں مختلف عادات کا عجیب وغریب مجموعہ بنجانے کی پوری صلاحیت ابتدا سے موجود ہے، کوئی ذی روح آپ کی ہمسری نہیں کر سکتا، کیونکہ آپ کے دماغ کی قوت غیر محدود ہے،

پیدائش کے وقت انسان کے لئے دو راستے کھلے ہوتے ہیں۔ علم اور تجربے حاصل کرے یا تمام عمر احمق رہے۔ چھ برس کی عمر میں جملہ انسانی افعال کے اصول جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ اگر یہ چھ برس بری طرح استعمال ہوئے تو ان کی اصلاح میں بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہوگی۔

پیدا ہو کر آپ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اب سب کچھ کر سکتے ہیں، اس وقت کچھ نہ جانتے تھے آج بہت کچھ جانتے ہیں، یہ ترقی بجائے خود حیرت انگیز ہے لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز آپکی قوتیں ہیں،

بندروں کے ہاتھوں میں بھی صفائی ہوتی ہے، اور اُن کے قوا رشامہ، ذائقہ، باصرہ، آپ کی طرح ذکی الحس ہوتے ہیں ان کے جسم کے اندر بھی رگوں کے جال ہوتے ہیں، لیکن بندر آپ کی طرح دماغ کا استعمال نہیں کر سکتا،

اس کو اتنا دماغ ودیعت نہیں ہوا جتنا کہ آپ کو، اُس کا "مرکز تبادلہ" یعنی مقام جہاں اطلاعات وصول ہو کر جواب دئیے جاتے ہیں اور اُن کو نوٹ کیا جاتا ہے، اور یاد رکھا جاتا ہے، آپ کی طرح وسیع نہیں ہے۔

وہ جہاز کی تصویر کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آئندہ سال اس میں بیٹھ کر ولایت جاؤنگا،

اور نہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ مختلف جذبات کو قابو میں لا کر صرف گردن کے اشارے سے "ہاں"، یا "نہیں"، کہہ سکے،

عادتوں کے سیکھنے میں وقت صرف ہوتا ہے، لیکن ان کو قائم رکھنے میں وقت کی ضرورت نہیں ہوتی،

آپ نے باتیں کرنا سیکھا، لیکن اب اس کے فراموش ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، آپ نے چلنا پھرنا سیکھا اور اب اس کے بھولنے کا کھٹکا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کام آپ نے ایسی خوبی سے حاصل کئے ہیں کہ اب وہ آپ سے جدا نہیں ہو سکتے، اور چلنا اور باتیں کرنا آپ کی عادت بن چکے ہیں،

مگر کیا آپ ہر جگہ جا سکتے ہیں اور ہر معاملہ پر باتیں کر سکتے ہیں؟ مانا کہ آپ کافی دور تک جا سکتے ہیں، اور کافی دیر تک باتیں کر سکتے ہیں، لیکن کیا یہ آپکی عادت ہے کہ جو "کام کافی طور پر انجام پا جائے آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں! "دنیا میں عام حالت یہی ہے، لوگ کسی کام کو معمولی طور پر کر لینا، یا اس کو کافی طور پر جاننا قابل اطمینان سمجھتے ہیں، اور رفتہ رفتہ ایک زندگی یا پیشہ کے عادی بن جاتے ہیں۔ ترقی کے خیال سے دور رہنا عادت میں داخل ہو جاتا ہے، اور ان کے لئے یہی کافی ہے "میں صرف اتنی دور چل سکتا ہوں، میں صرف فلاں معاملات پر باتیں کر سکتا ہوں"

جو لوگ ایسی عادتوں کے غلام بن چکے ہیں، جن میں ترقی کرنے کا ولولہ فوت ہو چکا ہے، وہ اس مضمون سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے، نہ انکی معلومات میں اضافہ ہوگا اور نہ ان کا دماغ زیادہ استعمال ہو سکے گا، لیکن اگر آپ زندگی کا پورا لطف اٹھانا چاہتے ہیں، اور ولولہ موجود ہے، اور زندگی کو محض وقت معینہ تک کسی نہ کسی طرح گزارنے کا نام نہیں سمجھتے ہیں تو اس مضمون کو توجہ اور غور کے ساتھ پڑھیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی عمر کا بڑا حصہ برباد ہو چکا ہے، اور آپ تمام عمر دماغ کو جاہل اور بے کار بنانے میں مصروف رہے ہیں۔ یہ خیال نہایت مذموم ہے "اب کیا سیکھیں گے؟ بہت عمر گذر گئی، تھوڑی سی باقی ہے"

مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کر کے آپ اپنی حالت کو درست کر سکتے ہیں،

علم کو بڑھائیے

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ اسکول میں پھر داخل ہو کر تعلیم کا سلسلہ چھیڑ دیں، اسی طرح یہ خیال بھی عبث ہے کہ طالب علمی کے ساتھ علم سیکھنے کے مواقع بھی رخصت ہوئے۔ چھ برس کی عمر تک آپ کسی اسکول میں نہیں گئے، لیکن اس عرصہ میں جو کچھ آپ نے حاصل کیا وہ مدت اور اعلیٰ حصول علم کے لحاظ سے بے نظیر تھا، کسی مدرسہ میں اتنی قلیل مدت میں آپ ایسا بیش قیمت علم حاصل نہیں کر سکتے، یہ علم حاصل کر کے آپ اسکول میں تشریف لیگئے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اسکول سے باہر رہ کر علم سیکھنے سے مجبور ہیں۔ انسان کو ہمیشہ یہ سمجھنا چاہئے کہ جب تک وہ زندہ رہے گا تعلیم جاری رہے گی، اور اگر رُکے گی تو محض انحطاط قویٰ کے باعث رُکے گی۔

تحصیل علم آسان نہیں ہے، پوری توجہ کی ضرورت ہے اور بغیر پسینہ بہائے حاصل نہیں ہو سکتا ہے، اس کی تحصیل میں اس وقت تک سعی جاری رکھنی چاہئے جب تک کہ وہ آپ کی عادت بن جائے۔

اگر آپ ڈربہ بنا سکتے ہیں تو کسی نہ کسی وضع کا اصطبل بھی تعمیر کر سکتے ہیں، اگر آپ اردو بول سکتے ہیں تو عربی، فارسی، پشتو، انگریزی، فرانسیسی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

انسان کی زبان پر عموماً دو ہزار الفاظ چڑھے ہوتے ہیں انگریزی میں شیکسپیر نے بیس ہزار اور ملٹن نے دس ہزار الفاظ استعمال کئے تھے، لیکن آج کل انگلستان اور امریکہ میں ایک ذہین کاشتکار کو پچیس ہزار الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔

الفاظ اوزار ہیں، انسانی دماغ نے ان سے زیادہ حیرت انگیز اور قابل قدر اوزار اب تک ایجاد نہیں کئے۔

الفاظ کی کمی ایسی ہی مضر ہے جیسی کہ لوہے کا جوتا پہن کر چلنا دشوار ہے، آپ کے لئے،

لکھنے اور بولنے میں الفاظ کا صحیح استعمال نہ جاننا، ایسا ہے جیسا کہ معمار کو اینٹ، اور چونے کا استعمال نہ جاننا، مطلب کو ادا کرنے یا عمارت کو بنانے کے لئے صرف الفاظ، یا ملبہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ فن عمارت، اور استعمال الفاظ کے قواعد کے جاننے کے بھی ضرورت ہے۔

رہا یہ سوال کہ آپ کس طرف رجوع ہوں اور کون سا علم حاصل کریں، اس کا جواب آپکے میلانِ طبع، اور ضرورت پر منحصر ہے، دوسرے آدمی کوئی مشورہ نہیں دے سکتے،

لیکن آپ کو اپنی موجودہ حالت کا اندازہ لگانا چاہئے۔ وہ صحیح جواب دے سکے گا۔ جواب کی صحت منحصر ہے آپ کے دماغ کے سابقہ استعمال پر،

اپنی حالت کا صحیح اندازہ کیجئے

اپنی حالت کی جانچ کرو، اس کے اجزار کر کے دیکھو، ایک ایک بات کو علیٰحدہ علیٰحدہ کر کے سمجھو اور پھر یہ سوچو کہ آپ کی موجودہ حالت میں کونسی باتیں اس قسم کی ہیں جن کو دور کیا جائے اور کونسی ایسی باتیں ہیں جن کو داخل کیا جائے؟

حالت ایک وسیع لفظ ہے، اس سے مراد، آپ کی عادتیں، آپ کا گھر، آپ کا کام۔ آپ کی قوم، آپ کے کپڑوں کی الماری، آپ کے بنک کی کتاب، آپ کا خاندان، آپ کے احباب آپ کے کھیل تفریح کے ذرائع، آپ کی فرصت کے اشغال، غرض کہ وہ سب باتیں ہیں جن میں آپکا وقت اور آپ کی قوت صرف ہوتی ہے،

فرائض منصبی سے جو وقت بچتا ہے اس کی بھی قیمت ہے، اگر آپ نے قیمت مقرر نہیں کی ہے اور آپ اپنے فرصت کے وقت کا صحیح استعمال نہیں کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ فرائض منصبی کی ادائگی تک اپنی دلچسپیوں اور ترقیوں کو محدود سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں آدمی جس تنخواہ پر نوکر ہوئے اسی پر تا دمِ مرگ رہے، ان لوگوں نے کبھی اپنی فرصت کے اوقات کی طرف توجہ نہیں کی، فرصت کے اوقات میں بھی وقت اور قوت کا اصراف ہی اور

اکثر آپ کو غلط راستہ پر لیجاتے ہیں، کیا کبھی فرصت کے اوقات سے آپ کو کوئی ایسی چیز بھی حاصل ہوئی جس کو آپ آج، کل، ایک ہفتہ، ایک ماہ، ایک سال، یا دس سال کے بعد روپیہ میں تبدیل کر سکیں؟ اگر نہیں حاصل ہوئی تو سمجھئے کہ آپ کی دماغی قوت بے کار ہے، اور اس کی طرف توجہ فرمائیے۔ اپنے احاطہ تربیت کا جائزہ لیجئے۔ اور غور کیجئے کہ اس میں کونسی باتیں قابل اخذ ہیں اور کونسی باتیں قابل ترک ہیں، جو باتیں لائق ترک نہیں ہیں تو کیوں نہیں ہیں؟ اور اب آپ اُن کے متعلق کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ جس حالت میں ہیں وہ کیسی ہے، اور اس میں رہنے کی وجہ سے آپکو کیا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، کیا آپ اس نقصان کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اور وہ نقصان آپ کی حیثیت کے مطابق ہے؟ اگر نہیں ہے تو فوراً تضیع اوقات کا خاتمہ کیجئے دستور العمل بنائیے اور نئے دلولے شوق کیساتھ نئے سفر کی طرح اس کو اختیار کیجئے۔ اپنی حالت کے معائنہ اور ایک ایک چیز کو علیحدہ کرکے جانچنے سے آپ کو اپنی اندرونی حالت معلوم ہو جائے گی۔ یہیں سے تیسری نصیحت کی ابتدا ہوتی ہے۔

فہرست بنائیے اور اندرونی جانچ پڑتال کیجئے

اس موقع پر یاد رکھیے کہ آپ کا ماحول، اور آپ کی فرصت، دو ایسے جزو ہیں جنکو پیش نظر رکھ کر آپ اپنی پوری جانچ پڑتال کر سکتے ہیں، فرض کیجئے آپ کسی فرم میں منیب ہیں، کیا آپ تمام عمر منیب رہنا چاہتے ہیں، یا اپنے موجودہ علم میں اضافہ کرکے ایک دن اس فرم کے شریک یا مالک بننے کی خواہش ہے، ان درجوں پر فائض ہونے کے لئے کن باتوں کی ضرورت ہے! پھر یہ دیکھیے کہ آپ کی راہ میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں؟ دوسروں کے حالات سُن کر کہ وہ منیب کی حیثیت سے ترقی پا کر کس طرح کسی فرم کے شریک یا مالک بن گئے، آپ کو کچھ زیادہ فائدہ نہ پہونچے گا۔ ممکن ہے کہ ان حالات پر آپ کو جوش پیدا ہو، لیکن کامیابی اسی وقت ممکن ہے جبکہ آپ خود عملی حیثیت سے شریک بننے یا مالک ہو جانے کا بیڑا اُٹھالیں، یعنی حصول مقصد کے لئے اپنے دماغ، اپنے ہاتھ، اور اپنی آدار کا استعمال شروع فرمادیں۔

چاہئے کہ آپ اپنے نفس کو عمیق نظر سے دیکھیں، یہ آسان کام ہے، مشکل نہیں ہے، پہلے ہمسایہ کو لیجئے اس کی گفتگو کی کیا مخصوص عادتیں ہیں، کیا دماغی عادتیں ہیں۔ اور کیا جذبہ کی عادتیں ہیں؟ وہ اپنے کان، ناک، زبان اور انگلیوں کو باتیں کرتے وقت، محنت کے وقت یا جذبہ کی حالت میں کس طرح استعمال کرتا ہے؟ اس کا طرزِ عمل کیا ہوا کرتا ہے؟ غرض کہ ان باتوں کی تحقیقات کے بعد آپ اپنی بھی جانچ کر سکیں گے۔ اور تھوڑی سی مشق کے بعد معراج ترقی پر پہونچا دینے کے لئے کسی راہبر کی ضرورت نہ رہے گی۔ جو باتیں قابل اصلاح نظر آئیں انہیں اصلاح کرو، راستہ پر چل نکلو، اور دماغ کا استعمال شروع کر دو۔

دماغ میں بہت سے واقعات کے بھر جانے، یا اس کے تھک جانے کا اندیشہ نہ کیجئے بلکہ اس فکر میں رہیے کہ کہیں مفید اور کارآمد عادتیں، دماغ میں داخل ہونے سے نہ رہ جائیں۔ کیونکہ مفید عادتیں تجربات میں بہت معاون ہوتی ہیں۔

غصّہ کو ترک کر دیجئے

معمولی معمولی باتوں پر چڑھنا اور خفا ہونا اچھا نہیں، کبھی اپنے آپے سے باہر نہ ہو جیئے۔ ورنہ آپ نہ سیدھا چل سکیں گے، نہ دیکھ سکیں گے نہ بات کر سکیں گے؟

مسلسل اور استوار محنت کو کام میں لگائے رکھیے، جذبہ کی حالت میں آپ اپنی پوری مصروفیت کو استعمال نہیں کر سکتے، ذرا ذرا سی باتیں ہیجان پیدا کر دیتی ہیں، اور جب منتشر دماغ پر جذبہ حاوی ہو تو اعلیٰ عمل دماغ کی بجائے اسفل اشیاء، حیات آپ کو گرفتار کر لیتی ہیں۔

اگر آپ کبھی غصّہ کی حالت میں اخبار کو پھاڑ ڈالیں، یا برطرفی کے خوف سے ایسے سہم جائیں کہ حواس قائم نہ رہ سکیں، یا کسی سے متنفر ہو کر اس کی صورت سے بیزار ہو جائیں۔ یا کسی کی رائے کو اس حد تک پسند کریں کہ تنقید اور اصلاح کا خیال تک کے آپ متحمل نہ ہو سکیں یا غریب سمجھے جانے کے خوف سے آپ کفایت شعاری ترک کر دیں یا اس خیال سے آپ کی کم علمی کا اظہار

ہو جائے گا، آپ کسی شخص سے ایک لفظ کے معنی نہ پوچھیں اور لغت تک کو نہ دیکھیں تو آپ کو یقین کر لینا چاہئے کہ آپ کے جذبات نے آپ کی خدمت نہیں کی، بلکہ بُری عادتیں سیکھ لی ہیں،

یہ خوف یہ تنفر، اور یہ ناپسندیدگیاں وہ صفات ہیں جو آپ نے حاصل کی ہیں، عدم توجہی اور تحصیل کے باعث آپ کی عادت بن گئی ہیں۔ لیکن یہ نکتہ کبھی فراموش نہ ہونے دیجئے کہ جس طرح بُری عادتیں آپ میں داخل ہو گئیں، اسی طرح وہ دور بھی ہو سکتی ہیں، اور ان کی بجائے اچھی عادتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہر ممکن خوف کا آپ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہر لامعلوم کی تھاہ لے سکتے ہیں، غیر کارآمد اور بھیانک چیزوں سے متنفر ہونا سیکھ سکتے ہیں،

خواہش اور اس کے ساتھ محنت ضروری ہے، آپ کا دماغ مدد دے گا۔ آپ اس کو استعمال کریں اور یہ تجربہ فوراً شروع کر دیں،

بچپن میں آپ نے تجربہ کے ذریعہ سے علم حاصل کیا، اب آپ تجربہ سے کیوں جھجھکتے ہیں۔

کوشش سے نہ جھجھکئے

اگر آپ ٹھوکریں کھا کر نہ گرے ہوتے تو آج کیسے چل سکتے تھے؟ اگر تُتلا تُتلا کر باتیں نہ کرتے تو آج تقریروں کے فراٹے بھرنے کیسے ممکن ہوتے؟ اگر غلطیاں نہ کرتے تو مواقع سے فائدہ حاصل کرنا کس طرح سیکھتے؟

آپ کو چاہئے کہ اپنی معلومات اور اپنے مبلغ علم کا پلیٹ فارم بنائیں جس پر آزادی کے ساتھ کھڑے ہو سکیں، بیٹھ سکیں، اور دوسروں سے مل کر اجنبی ہونا محسوس نہ کر سکیں دماغی مزاولت سے زیادہ دماغ صرف ہوتا ہے،

چند مشہور اور عام اصولوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو انسان کو اپنی قوتوں کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے، پہلے ورثہ کو لیجئے، کیا اچھا اور بُرا دماغ ورثہ میں ملتے ہیں؟ آپ کو

ورثہ میں جسم ملا جس میں آنکھیں ہیں جن سے آپ دیکھتے ہیں، کان ہیں جن سے آپ سُنتے ہیں، ناک ہے جس سے آپ سونگھتے ہیں، زبان ہے جس سے آپ چکھتے ہیں، کھال ہے جس کے اندر رگوں کا جال ہے، اور جس سے آپ محسوس کرتے ہیں، پورا جسم ہے جو کبھی تکالیف میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے لیکن عام طور پر اچھی حالت میں رہتا ہے، معدہ ہے جو کھانے کو ہضم کرتا ہے، خون کا دوران ہے، جو غذا اور ایندھن کو جسم کے تمام حصّوں میں پہونچاتا ہے۔ غاغود ہیں جن میں سے بعض تو لازم حیات عمل کو منضبط کرتے ہیں، اور بعض طبیعی بڑھاؤ کو ضبط میں رکھتے ہیں، ایک مشین ہے جس کی مدد سے آپ باتیں کرتے ہیں، دوسری مشین آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتی ہے، رگیں جسم کے مختلف اجزا کو یکجا رکھتی ہیں، اپنے مقامات سے اُن کو سرکنے نہیں دیتی ہیں، اور ایسی ہمواری اور استواری پیدا کر دیتی ہیں کہ تمام جسم ہر قسم کی تحریک کے بعد جب عمل کے لئے آمادہ رہتا ہے،

ہڈیوں کی ظاہری ساخت، پٹھے، غاغود، مشینیں، اور رگیں آپس میں مختلف ہوتی ہیں دنیا میں کوئی دو انسانی صورتیں ایک سی نہیں ہوتی ہیں کسی کی بینائی تیز ہے کسی کی سماعت تیز ہے اور کسی کا جسم بڑا ہے۔ غرض کہ یہ جسمانی اختلاف لازم ہے، اور ہم کو اس اختلاف کی طرف زیادہ توجہ نہ کرنی چاہئے، یہ محض جسمانی ورثے ہیں جن کی حیثیت جسمانی خاصیتوں سے زیادہ نہیں، اور اگر دماغ سے ان کا کوئی تعلق ہے تو اس قدر کم ہے کہ ہم ان کو بہ آسانی نظر انداز کر سکتے ہیں

اسی طرح اپنی تربیت کے ورثہ کی فکر نہ کیجئے۔ ان خیالات سے کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجئے کہ فلاں بات کی آپ میں کمی کیوں ہے اور وہ کس طرح پوری ہوسکتی ہے۔ فلاں بات کا آپ کو علم کیوں نہیں ہے؟ اور وہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے، اگر آپ مجنوں نہیں ہیں، تو وہ کمی بھی پوری ہو جائے گی اور وہ علم بھی حاصل ہو جائے گا، لیکن شوق اور محنت ضروری شرائط ہیں، اور کامیابی کے واسطے کافی وقت اور قوت کے صرف کی ضرورت ہے، دماغ ہر کام کے لئے آمادہ ہے آپ اس کی نفع بخشی کو محدود نہ کیجئے

بلکہ وسعت دیجئے۔

کبھی کبھی آپ تھک جائیں گے! ایسی حالت میں آرام کرنا ضروری ہے، اڈیسن صرف اٹھارہ گھنٹہ روزانہ کام کرتا ہے۔کیوں؟ اس لئے کہ روشنی کی شعاعیں ۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے دوڑتی ہیں، اگر زیادہ تیزی کریں تو جل جائیں۔

آپ نے باغ میں جھک کر تھوڑی دیر پھول توڑے، کمر میں درد ہو گیا، اب نہانے کا شوق ہوا، اور اسی شوق میں آپ نے جا کر دریا میں غسل کیا، درد کا خیال جاتا رہا، نہ درد رہا اور نہ اس کی یاد اٹھی، کیا وجہ ہے؟ جذبہ طبیعت، اور فطرت کا تقاضہ ہے کہ کام بدلتا رہے اور آپ مستحق ہیں کہ نئی خواہشوں اور نئے ولولوں کو حاصل کرتے رہیں، بشرطیکہ آپ کسی ظالم دستور العمل کے پابند نہ ہوں،

دنیا میں ہزاروں اور لاکھوں آدمی ہیں جو کام کا تو کیا ذکر ہے، اپنی بیوی بچوں اور دوست عزیزوں سے بھی تھک جاتے ہیں، مگر یہ تکان بے ثبات ہے، جب کسی کام میں طبیعت نہ لگے تو اس کو چھوڑ دیجئے اور کوئی دوسرا کام اٹھا لیجئے، تاکہ طبیعت کا ولولہ، اور کام کرنے کا جوش نہ فوت ہونے پائیں، ہر وقت ایک ہی شغل کی پابندی عاجز کر دیتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کام کو بدلتے رہو تکان دور ہو کر طبیعت کام کے لئے پھر آمادہ ہو جائے گی،

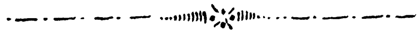
آپ فطرتاً سست نہیں ہیں، البتہ بخار، یا معدہ کی خرابی سے غیر فطری سستی پیدا ہو جائیگی۔ اور جب تک یہ شکایت دور نہ ہو گی آپ کا خون پیتی رہے گی۔ سست جسم، بیمار ہوتا ہے، یا شکست خوردہ! جو لڑکا ریاضی میں سست ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ریاضی سے صحیح طور پر مانوس نہیں کیا گیا۔

اگر آپ پژمردہ ہیں تو اس کو پژمردگی نہ سمجھئے۔طبیعت کے ولولہ کو قائم رکھئے، اگر آپ سلامت روی کی چال سے مستقل طور پر کسی کام میں لگے رہیں گے تو ضرور کامیاب ہوں گے، اور اگر آپ کو اپنے کام سے محبت ہے تو وہ ایک دن جزو حیات ہو جائے گی، عادت بن جائے گی، اور

اور آپ کو اس کی موجودگی اور اپنی ریاضت مطلق بار نہ گذرے گی۔

آپ کا دماغ غیر محدود ہے، اس کو جہالت کی چار دیواری سے محصور نہ کیجئے، اور نہ اس کو مسلاکر اپنی پرانی روش اور پرانی زندگی کا پابند ہوجائے۔ بلکہ اس کو نئی زندگی، نئی بصارت، اور نئے تجربہ کی روشنی میں ترقی دیجئے، یاد رکھئے کہ آپ دماغ سے جس قدر کام لیں گے وہ اسی قدر زیادہ کام کے لئے آمادہ ہوگا۔ فقط

(مختار)



"یادِ وطن کے دو آنسو"

از

(جناب سید معین الدین احمد صاحب قیس رضوی عظیم آبادی)

جب حسبِ خواہ دورِ سنین و شہور تھا
جنت نظیر پٹنہ بھی ارضِ سرور تھا

(۱) مٹی وہ، جو مقابلہ اکسیر کا کرے
(۲) پانی وہ، جو مماثلِ آبِ طہور تھا

سرمایۂ بہار تھا ہر باغ پُر فضا
ہر پھول رو کشِ رُخِ رنگین حور تھا

ہر ذرہ آفتاب تھا پٹنہ کی خاک کا
جو قطرہ آبِ گنگ کا تھا غرقِ نور تھا

ہر اہلِ فن تھا اپنی جگہ کامل العیار
یکتائے روزگار تھا جو ذی شعور تھا

آغا حسن سے کم نہ تھے جو خوش نویس تھے
قبضے میں اُنکے کشورِ بین السطور تھا

گہوارہ تھا یہ شہر بھی اُردو زبان کا
اہلِ زباں یہاں کا ہر اک با شعور تھا

دِلّی کی جو زباں تھی وہ پٹنہ کی تھی زباں
ہر چند فاصلہ میں دِلّی سے دور تھا

از بسکہ دِلّی ہی کے مسلماں تھے یہاں
دونوں کا ایک ہی لب و لہجہ ضرور تھا

دِلّی میں تھا زبان کا میخانہ مرکزی
نزدیک کوئی شاخ کوئی شعبہ دور تھا

اُس میکدہ میں کھچتی تھی جیسی مےِ سخن
پٹنہ اسی شراب کے نشہ سے چور تھا

تھی ایک ہی شراب امیر و غریب کی — جامِ سفال تھا کہیں جامِ بلور تھا
دلی میں میرؔ، پٹنہ میں راسخؔ سا باکمال — دونوں کو ایک وقت میں یکساں شعور تھا
تحقیقؔ اور بیدلؔ و جوششؔ سا کوئی بھی — بتلائیے! جہان میں نزدیک و دور تھا؟
معجز نما خطاب تھا اِن باکمال کا — اِن کو ہر ایک بحر پہ کامل عبور تھا
جو تھا غرض وہ علم کی دولت سے تھا غنی — جو شخص تھا وہ عیبِ جہالت سے دور تھا
درد و الم کے نام سے واقف نہ تھا کوئی — عیش و طرب کے نشہ میں ہر شخص چور تھا
”ہر روز، روزِ عید تھا، ہر شب، شبِ برات“ — ہر صبح و شام نغمۂ عیش و سرور تھا
مشتاق تھا نہ کون بھلا اس دیار کا — شہرہ ہمارے شہر کا بھی دور دور تھا
افسوس! آج ہو گیا سنسان وہ دیار — کل تک جہاں کہ رحمتِ حق کا ظہور تھا
اے وائے! آج کیا ہوئے وہ لوگ اے فلک! — جن کا کمال شہرۂ نزدیک و دور تھا
کیسی سمومِ گرم چلی اس بہار میں — وقفِ خزاں ہوا ہے جو باغ سرور تھا
لو دیکھئے ایک رہ گئے تھے شادؔ باکمال — جن پر وطن کو ناز تھا فخر و غرور تھا
پیرانہ سال ہو کے وہ دنیا سے چل بسے — کم ہو گیا ہے چشمِ وطن کا جو نور تھا

اے قیسؔ! اتنا عرض کروں گا بہ صد ادب
قدر اُن کی۔ اُن کے سامنے کرنا ضرور تھا

(افسانہ)

فریب حیات

از
(جناب مولانا محمد مختار صاحب کچھوچھوی)

انیسویں صدی کے اواخر تک مصر میں ایک نہایت مقتدر، عالی نسب، اور ذی عزت خاندان پایا جاتا تھا، لیکن یہ صدی ابھی ختم بھی نہونے پائی تھی کہ اُس کے ساتھ ہی اس ہر لعزیز اور وصیع خاندان کی بھی آخری گھڑیاں آگئیں، جس کے ساتھ زمانہ ایک مدت تک خندہ پیشانی سے ملتا رہا اور اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتا رہا، اور جس کی ہری بھری شاخوں پر پیہم آٹھ صدی تک بلبل اُمید نغمہ زن رہی،

یہ زبردست اجتماعی انقلاب ایک کافی بحث اور اس سے زیادہ اُن اسباب و عوارض پر ایک غائر نظر ڈالنے کا محتاج ہے جنہوں نے اس کی اس دیرینہ شادمانی اور مدت دراز کے راحت و آرام کو دفعتاً صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا، اور پھر اسی پر اکتفا نہ کر کے اُس کے افراد کو اُسی مسموم خنجر سے آراستہ کیا جو خصوصیت کے ساتھ لوگوں کو اس کی قربان گاہ پر ذبح کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور جس نے آخرالامر اس معزز خاندان پر دو کاری ضرب لگائی جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ گمنامی اور ذلت کے عمیق غار میں جا گرا!

(۱)

حنفی بک مصری ترکیہ کے اُن دو بڑے اور معزز خاندانوں کا ایک میانہ قد اور خوبصورت نوجوان تھا جن کو قدرت نے دولت و شرف سے مالا مال کر رکھا تھا، مصر میں ان کی دولت وہ دولت تھی جس کو تمام سرداران فوج اور افسران ملک ممالیک کے پورے عہد حکومت تک

بطور جاگیر کے وراثتاً پاتے چلے آتے تھے،

حقی بک نے ابتدائی کتابیں اپنے گھر ہی پر تمام کیں اوس کے بعد مدارس عمومیہ میں داخل ہوا ا[illegible] سے علم وادب میں اتنا بہرہ ور ہو کر نکلا جو اس کو پڑھے لکھے لوگوں کی صف میں جگہ دینے کے لئے کافی ہو سکتا تھا،

اس نے اپنے ننہال اور ددھیال کی جانب سے جیزہ کے دونوں صوبوں نیز نواحی قاہرہ میں جو اس کا پیدائشی مقام بھی ہے کافی جائداد ورثہ میں پائی تھی لیکن دوسرے رؤسا کی طرح اس نے بھی جوان ہوتے ہی اپنا گرانقدر سرمایہ انتہائی اولوالعزمی اور ناعاقبت اندیشی سے ضائع اور تلف کرنا شروع کر دیا، روپیہ اور پیسہ جو کچھ اس کے ہاتھ میں آتا وہ اسے انتہائی لاپرواہی کے ساتھ اپنی موہوم رنگ رلیوں اور حصول شرف کی اس حقیر راہ میں صرف کر ڈالتا،

اس کا ضعیف باپ ابھی زندہ تھا، لیکن کبرسنی نے اس کو اب اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ اپنے لڑکے کو اس اندھی شہوت کے شکار ہونے سے بچا سکتے تاہم وہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن بھی نہ تھا، اس نے اپنی بہت سی طویل راتیں انہیں افکار کے رہگذار میدانوں میں سرگرداں رہکر بسر کیں اور انہیں اندوہگیں تصورات کے ناپیدا کنار سمندر میں تھپیڑے کھاتے گذاریں مگر پھر بھی وہ کسی ایک مستقل رائے، پر نہ پہنچ سکا،

اسی اثنا میں اس کے ذہن کے اندر ان تمام وقائع کی یاد بھی تازہ ہوگئی جس میں اس نے بڑے بڑے دلیر اور بہادر سورماؤں کو تہ تیغ کیا تھا اور وہ مناظر اس کے پیش نظر ہوگئے جن میں ہزاروں جانیں ہمیشہ کے لئے تن سے جدا ہو رہی تھیں، اور لاکھوں گردنیں ساگ پات کی طرح کٹ رہی تھیں، وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کا نفس اس وقت بھی ان خونیں تلواروں کے لئے متمتع ہے جو کبھی عرب کے ریگستانوں میں اس کے ارد گرد چمکا کرتی تھی یا جو یونان کی فضاء بسیط میں اپنے جوہر دکھایا کرتی تھیں، اس نے بارہا یہ تمنا کی کہ کاش "میرا یہ خواب وخیال

بیداری اور حقیقت سے بدل جاتا اور کاش میں جہاد کے شریف ترین میدان میں قوم و ملک کے دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اس سے پہلے شہید ہو چکا ہوتا اور میں اپنے لڑکے کو قضا و قدر کے اس عمیق گڑھے میں گرا ہوا نہ پاتا دیکھتا جس سے گلو خلاصی کی کوئی امید نہیں مگر فقر و فاقہ سے [redacted] اور بے بس ہو جانے کے بعد))

حقیقت میں یہ دونوں خیال اُن نفوس کے لئے جنھوں نے زندگی کا پورا حصہ عزت و اکرام کے ساتھ گزارا ہو اور جو ہمیشہ سے تحکم و فرمانروائی کے خوگر رہے ہوں کچھ کم سوہان روح نہیں۔

اس بزرگ مرد کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ اس کی زندگی کی آخری گھڑیاں، تلخ کامی، نامرادی، اور غم و اندوہ میں بسر ہوں، حفی بک اُس وقت جبکہ اُس کے ضعیف باپ پر نزع کی حالت طاری تھی بزم نشاط اور دور شراب سے مسرور و بدمست ہو رہا تھا، اوسکو جب اپنے باپ کی یہ خبر پہونچی، تو بجبر اکراہ وہاں سے اوٹھا اور اس جہان سے ہمیشہ کے لئے کوچ کرنے والے بزرگ باپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اتنی دیر میں موت اُس پر اپنا کافی قبضہ جما کر اُس کو گفت و شنید تک سے محروم کر چکی تھی البتہ اُس کی آنکھوں میں شعاع کا اب بھی کچھ بچا کچا حصہ باقی رہ گیا تھا جس سے اُس نے اپنے لڑکے پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی جو اُس کے قلبی اندوہ اور دلی صدمات کا کافی سے زیادہ پتہ دے دیتی تھی، پھر آنکھیں بند کرلیں، اُن سے آنسوؤں کے دو قطرے گرے جو اس دنیا سے گذرنے والے باوقار بزرگ کے آخری مصائب کا تتمہ تھے،

(۲)

میرے بچے تو اس تجرد کی زندگی کب تک بسر کرے گا، تو اپنی ایک رفیقہ حیات کی فکر کیوں نہیں کرتا جو تیرے شادی و غم میں برابر کی شریک ہو، اور تیرے لئے راحت و آرام کی ہر اس چیز کو مہیا کرے جس کو تو خود نہیں کر سکتا،

اماں مجھ کو بیوی کی کیا حاجت؟ مجھ کو اس ابدی قید کی کیا ضرورت جس میں جان بوجھ کر اپنے نفس کو پھنساؤں؟ مجھ کو کسی خاص عورت سے تعلق پیدا کرنے اور صرف اسی سے لطف اندوز

ہونے کی کیا غرض؟ آپ جانتی ہیں کہ میرا نفس بچپن سے آزادی کا خوگر اور عیش و عشرت کا دلدادہ رہا ہے، پھر اگر شادی محض قضائے شہوات کے لئے ہوتی ہے تو میں ایک جگہ پابند ہو کر اس غرض کو انجام [redacted] بالا خانوں پر شب گزاری کو بہتر خیال کرتا ہوں، اور اگر اس لئے ہوتی ہے کہ وہ میرے لئے سامان نفیس فراہم کرے تو میں اس کے لئے آپ سے بہتر کسی کو نہیں سمجھتا۔

کیا میں ہمیشہ زندہ رہوں گی؟ اور کیا میں اب اس سن کو نہیں پہونچ چکی ہوں جس میں ہر گھنٹہ اور ہر گھڑی قسمت کے پیغامبر کا خطرہ درپیش رہتا ہے؟ اور پھر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تمام شادی شدہ لوگ احمق ہیں جنہوں نے اپنی آزادی سے کنارہ کش ہو کر باختیار خود اپنے کو زواج کی سخت قید میں پھنسا رکھا ہے؟

خدا کے لئے اماں اب میری زیادہ سمع خراشی سے باز آئیے، میں شادی کا سخت دشمن ہوں اور صرف اسی کا دشمن نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تمام والدین کا بھی سخت دشمن ہوں جنہوں نے شادیاں کر کے اپنے کو مقید بنا رکھا ہے،

خیر میرے بچے مجھے بھی کافی ہے کہ میں تجھے خیریت سے دیکھ لیا کروں، میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں تجھے ہنس مکھ پا لیا کروں، اس کے سوا اور میں دنیا میں کس چیز کی خواہشمند ہوں گی، ایک ماں اپنے اس اکلوتے بچہ سے جس نے اس کو دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کر رکھا ہو اور کیا چاہے گی؟

بیشک اماں بس آپ کا یہ اکلوتا لڑکا آپ سے اسی کا خواہشمند ہے، ورنہ مجھے اور شادی بیاہ کی الجھنوں سے کیا واسطہ؟!!

اس گفتگو کو ہوئے زمانہ دراز گذر چکا ہے حنفی بک مثل سابق اب بھی اسی عیش و عشرت اور قضائے شہوت کا دلدادہ ہے دوسری طرف اس کی بڈھی ماں اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اپنی تنہائی میں بیٹھی مصروف گریہ و بکا ہے،

....

ایک روز صبح کو اس کی ماں کی حالت خراب ہونی شروع ہو گئی شب و روز کے پیہم غم و اندوہ نے اس کے قلب کا خون خشک کر دیا تھا آج اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ اسکا جگر اندر ہی اندر شق ہو رہا ہے اور اُس کی روح سخت تکلیف میں نکل رہی ہے

حفیظ بک بھی اس وقت نشۂ شراب میں چور اپنی ماں کے سامنے کھڑا ہے تھوڑی دیر کے بعد اس کی حالت پہلی سی نہ رہ گئی وہ خمار کے باوجود اس وقت کافی ہوش میں ہے اور ایک وحشت خیز نظر کے ساتھ اپنے چاروں طرف دنیا کے اس محیط کو دیکھ رہا ہے، اس کے ذہن میں مختلف قسم کے خیالات آ رہے ہیں، کبھی کبھی اس کے سامنے یتیمی کا ہیبت ناک منظر آ جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر رونے لگتا ہے حقیقت میں شراب و کباب اور شہوت رانیوں کے اس انہماک نے اس کے قوائے عقلی کو صحیح ادراک سے بالکل معطل کر دیا ہے اور اب اس کے پاس احساسات کا صرف اتنا حصہ باقی رہ گیا ہے جو اس کی آنکھوں کی طرف آنسوؤں کو لیجائے اور وہ انہیں سیلاب کی طرح بہا دے؟

بے شک اُسے یتیمی کا خوفناک منظر ڈرا رہا تھا وہ اس وقت گم گشتہ عقل لوگوں کی طرح نہیں، رو رہا تھا بلکہ اس کا یہ نالہ ایک قطعی اور یقینی طور پر ہونے والی شے کے لئے تھا جس سے کوئی چارہ نہیں،

گو ماں کے مقدر میں ابھی مرنا نہیں لکھا تھا بلکہ اس کی موت کسی دوسرے وقت کی رہین منت تھی لیکن قدرت نے یہی چاہا کہ اس وقت اس کے درد جگر او ٹھے جس سے اُس کے اکلوتے اور جان سے زیادہ عزیز لڑکے کی یہ کیفیت ہو اور پھر ان تمام چیزوں کے مجموعہ سے ایک ایسا ظرف تیار ہو تو ایک بدبخت ضعیفہ کے لئے دو چند شقاوت اور بدبختی کا سبب بنے،

ماں کو ابھی اچھی طرح ہوش بھی نہ آنے پایا تھا کہ اس نے اپنے لڑکے کی طرف نظر اٹھائی اور اس کی یہ حالت دیکھ کر ہششدر اور مبہوت ہو کر رہ گئی، اور اپنے تمام معنوی قوی کیساتھ اس کی اس حالت پر غور کرنے میں مصروف ہو گئی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے لڑکے سے

مخاطب ہو کر اُس کی موجودہ حالت نیز اُس کے وفات پا جانے کے بعد اُس کا جو انجام ہونے والا ہے ان تمام امور پر نہایت طمانت دہی اور سکون قلب کے ساتھ گفتگو کرنی شروع کردی، لڑکے کا شعلۂ احساس اس وقت تیز تر ہو رہا تھا اُس نے بلاپس وپیش اپنی ماں کے روبرو سر نیاز خم کر دیا اور اُس کی اس بات کو منظور کرلیا کہ اُس کو ایک رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے جو اُس کے ہر حال میں شریک سہیم رہے!!

قدرت کو یہی منظور تھا کہ اُس کی یہ رفیقہ بھی ایک بہت بڑے دولت منداور عالی نسب خاندان کی ایک فرد ہو، چنانچہ (ہنیہ) جس نے بچپن سے لیکر اس وقت تک ہر طرح کے عیش وآرام اور نازونعم میں پرورش پائی تھی، اُس کی دلہن بن کر میکے سے سسرال آئی، مگر حیف کہ اُسنے یہاں ایک بستر مرگ پر پڑی ماں اور ایک سن رسیدہ شوہر کے سوا جس کی عمر کا اتنا حصہ شہوت پرستیوں کی اُس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ چکا تھا جس نے اس کے پردوں کے نیچے قدم قدم پر اخلاقی موت کا ایک عمیق غار بنا رکھا ہے، اور جو باوجود عنفوان شباب کے ساتھ ساتھ بچپن کا الھڑپن بھی شریک ہوتا ہے ناتوان بڈھوں سے زیادہ کریہہ المنظر ہو رہا تھا، اور کچھ نہ پایا، اُس کی امیدوں پر پانی پھر گیا، اور اُس کے اُن تمام جذبات واحساسات کا جس کو وہ مدت سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی اور جس کو لے کر وہ خوشی خوشی سسرال آئی تھی، خون ہو گیا، وہ اس بے وقت کے بڑھاپے کو جو شہوت رانیوں کا لازمی نتیجہ میں دیکھ کر اپنے ہوش وحواس سے کھو گئی، تاہم یاس کے یہ کثیر التنوع مناظر اُس کی لکھو کھا امیدوں پر ابھی پوری طرح قابو نہ پا سکے تھے کہ ایک دن اُسے یکایک اپنے اندرونی اعضاء میں ایک قسم کی خلش سی محسوس ہوئی اور اُس کے دل سے بے اختیار یہ آواز نکل پڑی،

(اے میرے قابل پرستش بچے! میرے ان تمام دلی ارمانوں کا بس اب ایک تجھی پر سہارا ہے، اور میں اس دنیا میں اب صرف تیرے ہی لئے جی سکتی ہوں،

---

(۳)

تمراز، کیا تم نے واقعی احسان کی کچھ گفتگو نہیں سنی ؟

نہیں میری سرکار، میں اُن کی کوئی گفتگو نہ سُن سکا، البتہ میں نے اُنہیں ایک ہیبت ناک خاموشی اور سکوت کے عالم میں غرقاب ضرور پایا،

بزرگ تمراز، میں تمہیں (ہر قسم کے پدری جذبات سے خالی رہکر) اس تجردانہ زندگی لبسر کرنے پر مبارک باد دیتی ہوں اور تمہاری اس خوش قسمتی پر رشک کرتی ہوں،

(ہنیہ) ابھی پورے طور پر اس جملہ کو ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسوؤں کی بارش ہونے لگی اور وہ بے قرار ہو کر رونے لگی،

اگست ۱۸۹۱ء کی ساتویں تاریخ کو فیوم کے خوشنما صوبہ میں جہاں کہ کھجوروں کے تنے آسمان سے سر ٹکرا رہے ہیں اور جہاں کی نرم زمین میں مختلف قسم کی نہریں نکلی ہوئی ہیں (ہنیہ) تمراز سے اپنے جگر گوشہ اور اکلوتے بچے احسان کے متعلق جس کو قدرت نے اپنی خاص عنایت سے اس کی غمخواری کے لئے عطا فرمایا تھا کچھ باتیں کر رہی ہے، احسان اس وقت اپنی عمر کی بیسویں کڑی کو پہنچ چکا ہے، اوس کا خوبصورت چہرا، بھرے ہوئے بازو، بڑی بڑی آنکھیں، آگے کو اُٹھی ہوئی مگر درمیانی ناک، اور سونے کی طرح چمکنے والے بھورے بھورے بال، بہت ہی خوشنما اور بھلے معلوم ہوتے ہیں، اُس کی کم گوئی، خاموشی، خوش خلقی اور وجاہت نیز باوجود اس صغر سنی کے اس کی کامل رجولیت، خودداری اور زبر دست طاقت اس کے لئے بہترین مستقبل کے ضامن تھے، (اگر قدرت کا فیصلہ اس کے خلاف نہ ہوتا) وہ اپنے والدین کا ہر وقت بہت کافی احترام ملحوظ رکھتا تھا، اُن کے تمام احکامات کو بسر و چشم قبول کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا، ہمیشہ اچھی سوسائٹی میں بود و باش اختیار کرتا تھا، شیریں کلامی اور صداقت داجتہاد اس کا شیوا تھا اُس کا باپ اپنے پورے تیس برس کے کردار کے

بعد اب اُن بوڑھوں کی عمر کو پہونچ چکا ہے جن کی کمر زمانہ نے ٹیڑھی اور جن کی حیات حوادث روزگار نے کم کردی ہو،

"ہنیہ" نے اپنے لڑکے کی حسن تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اُس کے نموئے بدن کے ساتھہ ساتھہ ہمیشہ اُس کی ذہنی ترقی کا خیال بھی رکھا، گو اُس کو ان تمام باتوں کے انجام دینے میں بہت سی تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ اُس کے شوہر کے سابق قرضخواہوں کی بدولت جائداد کا ایک کافی حصّہ ہاتھہ سے نکل چکا تھا، جس نے "ہنیہ" کو اس بات پر مجبور کردیا تھا کہ وہ ہر چیز میں اقتصاد اور کفایت شعاری کو ملحوظ رکھے،

احسان اپنی بیسویں سالگرہ تک پہونچنے سے پہلے ان تمام دروس اور تعلیمی ذمہ داریوں سے فارغ ہوچکا تھا اور اب اُن کے پیش نظر جو کچھ بھی تھا وہ محض اپنے مستقبل کا خیال تھا جہاں سے کہ انسان کی حقیقی عملی اور اجتہادی زندگی شروع ہوتی ہے!! اُس کا مطمح نظر اپنے مستقبل کے متعلق کچھ معمولی نہ تھا وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب اور سوسائٹی کی اہم ترین ذمہ داریوں پر فائز ہونے کا حوصلہ رکھتا تھا، احسان کے ان حوصلوں کو اُس کے والدین محض ایک خبط سے تعبیر کرتے تھے چنانچہ متعدد بار اُنھوں نے اس بارے میں اُس سے کچھ نصیحت آمیز گفتگوئیں بھی کیں جو بعض اوقات اعتدال سے متجاوز ہوکر مناقشہ کی حد تک پہونچ جاتی تھیں، لیکن آخرالامر اُنھوں نے اس کو اپنے انہیں خیالات پر مصر پاکر یہ امید کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی کہ اس ولولہ شباب کو زمانہ ایک روز خود ہی مٹا دے گا جو سب سے بڑا معلم اور ناصح ہے،

"ہنیہ" کو اپنے بچے سے لطف اندوز ہوئے ابھی تھوڑا زمانہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ یکایک اُس نے اُس کے دل میں تفکرات کو گھر کرتے ہوئے محسوس کرلیا، اور اس وقت اُسکو کامل یقین ہوگیا کہ احسان کی خاموشی بالکل بے معنی نہیں بلکہ بزبان حال اُس کے دلی اندوہ اور آنسوؤں سے پُرنم آنکھوں کی چغلی کھارہی ہے آخرکار جب اُنھوں نے اس کی حالت کافی دگرگوں ہوتے دیکھی تو طبیب سے مشورہ لے کر تبدیل آب وہوا کی غرض سے قیوم کی طرف روانہ ہوگئے،

جہاں پر کہ "ہنیہ" کا ایک عالیشان محل بھی ابھی موجود تھا۔جس کو اُس کے باپ نے خاص طور پر اپنے رہنے کے لئے بنوایا تھا اور جس کے چاروں طرف ہر قسم کے بیل بوٹوں سے پُر ایک خوشنما باغ بھی لگوادیا تھا، یہ قصر فیوم کے اُس حصہ پر واقع ہے جس کے نیچے اس صوبہ کی سب سے زیادہ مشہور نہر اپنے صاف پانی گھنے درختوں اور خوشنما مناظر کے ساتھ بہ رہی ہے۔

(۴)

رات اپنا پرا جما چکی ہے، فضائے بسیط میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے، زمین بالکل مردہ ہو چکی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ بھی اپنے اُن مدفونین کے ساتھ جا ملی ہے جو اس کی گود میں ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو رہے ہیں،

اس وقت اُس عالیشان محل سے جس میں ہمارا ہیرو مع اپنے والدین کے اقامت گزیں ہے، ایک دھندلی سی روشنی دکھائی دے رہی ہے غالباً وہ نیچے والے حصہ کے اُس کمرہ سے آرہی ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ احسان تنہا ٹھہرا ہوا ہے یہ روشنی اُن چلمنوں سے چھن چھن کر باہر آرہی ہے جو اُس کمرے کے دروازوں اور جنگلوں پر پڑی ہوئی ہیں، نزدیک جاکر ذرا غور سے دیکھنے پر ایک بائیس برس کا نوجوان اور بلا کا حسین لڑکا اپنی میز پر سر جھکائے کسی فکر میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے، جس کو زمانہ کی نظر سے بچانے کے لئے فرشتۂ رحمت اپنے سایہ میں لئے ہوئے ہیں!

اُف، رات کی ان تاریکیوں نے نہ معلوم کتنوں کے دل میں شمع امید روشن کی ہیں اور نہ جانے کتنوں کو ہمیشہ کے لئے مایوس و نامراد کر چھوڑا ہے؟ اس وقت اگر ہم احسان کے قلب کا جائزہ لیں تو ہمیں اُس میں امید و یاس کی کوئی جھلک نظر نہ آئے گی بلکہ اس کے بجائے اُس میں ایک قسم کی حیرت انگیز ایک طرح کا شک محسوس ہوگا جو کبھی تو اُس کو لاکھوں ارمانوں کا مرکز بنا دیتا ہے اور کبھی ہر طرف سے غمگین اور مایوس کر دیتا ہے، اس وقت بس یاس و ارمان ہی دو چیزیں ہیں جو شک کے زبردست جھونکوں کے ساتھ احسان کے قلب کو تھپیڑے دے رہی ہیں،

جب کبھی امید کے جھونکے اُن کے پاس سے ہوتے ہوئے گزرتے ہیں تو وہ ہر طرف سے کھل جاتا ہے اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ کافی سے زیادہ جوانمرد اور بہادر بن جاتا ہے!! اُس کے برخلاف یاس کی باد سموم اُس کے لئے زہر ہلاہل سے کچھ کم اثر نہیں رکھتی، وہ اس وقت ہر طرف سے کنارہ کش ہو جاتا ہے دنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک نظر آنے لگتی ہے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتا ہے؛ اس وقت اُس کی اُس حالت، اور اُس کے چہرہ کی مختلف آنے جانے والی رنگتوں پر غائر نظر ڈالنے والا اُس کو ایک مجسمہ خیال کرے گا، جس کو اُس کے ماہر نقاش نے اس طرح بنایا ہو کہ اُس کی دونوں آنکھوں سے زندگی کا ایک مخفی اور پوشیدہ راز ظاہر ہو رہا ہے اور جس کا اثر نفس پر اُن آنکھوں کے اسرار کے لحاظ سے جن کے لئے وہ بنائے گئے ہیں مختلف طرح کا پڑ رہا ہے،

اس وقت اس کمرہ میں کسی قسم کی کوئی حرکت احسان کی گھڑی کی آواز یا اس کے کلیجہ کی دھڑکن کے سوا محسوس نہیں ہوتی، اُس کے گلابی رخساروں پر سامنے میز پر رکھی ہوئی شمع کی (جو قدیم رواج کے مطابق اب تک بعض رؤسا کی زینت محفل ہوا کرتی ہے) ایک خفیف سی ضَو نور پاشی کر رہی ہے، وہ ابھی اس سکوت و سکون کی حالت میں پڑا دریائے فکر میں غوطہ لگا ہی رہا تھا کہ یکایک اُسے اپنے کمرہ کی طرف آتے ہوئے کسی شخص کے پیروں کی چاپ سنائی دی، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے وہ آہستہ سے اُٹھ کر کمرہ کے ایک دروازہ کے قریب گیا جہاں پر کہ اُسے اُس کا قدیم نمک خوار خادم ممتاز کھڑا ملا جس کے دونوں ہاتھوں میں آج کی ڈاک سے آئے ہوئے خطوط و اخبارات تھے،

کیا تم کو جس وقت کہ یہ ڈاک لینے جا رہے تھے راستہ میں کوئی اور شخص بھی ملا تھا،

نہیں میرے آقا، میں پہلے تو ان درختوں کے درمیان سے لومڑیوں کی طرح ہر قابل شک کی طرف سے کافی تنبہ اور ہوشیاری کے ساتھ تیزی سے نکل گیا اور پھر فضائے بسیط میں پہونچکر ہمہ اکامد مقابل ہو گیا،

تمراز تم نے بہت خوب کیا، اچھا لو، یہ دینار لو، اسے تم اپنے چھوٹے آقا کی طرف سے اپنی امانت، وفاداری، اور حسن خدمت کا صلہ سمجھنا،

حضور آپ کے گرانقدر احسانات سے میری گردن ہمیشہ جھکی رہی، میں اپنے آپ کو انعام کے لایق کبھی بھی نہیں پاتا، تاہم اپنے خدا سے امیدرکھتا ہوں کہ وہ آیندہ مجھے اس سے زیادہ سخت اور دو چند امور کے بخیر و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

آمین، اچھا اب تم جاؤ،

تمراز کے جانے کے بعد احسان اپنی خوشنما اور چمکدار مسہری کے پاس بیٹھ کر یہ کہتا ہوا نہایت بے چینی اور اضطراب کے ساتھ ہر ہر خط کو دیکھنے لگا۔

"آج دو ہفتے ہوگئے لیکن "ریحانہ" نے میرے پاس ایک حرف بھی نہ لکھا، آخر"
"اس کا سبب؟ کیا وہ بیمار ہے؟ یا کیا وہ اپنے عہد کو بھول گئی اور اپنے"
"دل سے میری محبت نکال دی؟ کیا یہ زندگی محبت کے بغیر بھی کچھ قیمت"
"رکھتی ہے؟ اسرار عالم میں وہ کون ایسا راز ہے جو اس راز سے زیادہ"
"قابل غور ہو، اور جو اس قلب سے زیادہ لایق توجہ ہو جو اس دنیا کی"
"زینت اور اس کی رونق، نوجوان، اور حسین دوشیزہ کے دام محبت کا"
"شکار ہو چکا ہے! جو انہیں کے قرب سے تسکین پاتا اور ان کے ہجر سے"
"قریب الموت ہو جاتا ہے؟ اور انسانی جذبات میں اس سے زیادہ شریف تر"
"وہ کون سا جذبہ ہے جس کے ساتھ زندگی، جمال و خوبروئی، بانکپن اور سحر کاری"
"کے کرشموں سے سیراب ہوتی، اور جس کے بغیر تشنہ و ملول رہتی ہے؟"
"آہ دل کسقدر بے چین ہے اس خوش رنگ پھول کے سونگھنے کو"
"جس کو قسمت نے میری زندگی کی راہ میں لا ڈالا ہے، اور اف میں کسقدر"
"متمنی ہوں اس دل کی دھڑکن سننے کا جو اپنی رفتار میں میرے خفقان"

"قلب سے مشابہ ہوں"

اُس نے میز پر پڑے ہوئے کچھ منتشر اوراق اٹھا لئے اور الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا، اتفاق سے اُن میں وہ ورق بھی نکل آیا جس میں چند سال ہوئے اس نے اپنے دِلی کوائف قلم بند کئے تھے،

"میں اپنی اس زندگی کے متعلق اس شاعر کا معتقد نہیں (جو اس حیات"
"کا تمام تر بار اپنے باپ کی گردن پر ڈالتا ہے) میرا عقیدہ ہے کہ"
"یہ قضائے الٰہی تھی جس کو ازل سے آج تک ایک بہت بڑے راز"
"کی طرح زمانہ کی گردن اُٹھائے ہوئے تھی اور جسے اب اس نے میرے"
"سر پر لا ڈالا ہے! میں گوشت کا وہ ذلیل ٹکڑا نہیں جس کو حوادث کے تیز"
"دانت چبا ڈالیں، اور زمانہ آسانی سے نگل لے، بلکہ میں وہ سخت پتھر ہوں"
"جو شب و روز میں پیہم ٹھوکریں کھاتا ہے اور اُف نہیں کرتا، مجھے یقین ہے"
"کہ میں اپنے ارادہ کا پختہ اور صبر کا دھنی ہوں، لیکن آخر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"
"اس قدر صبر سے کیا فائدہ کہ اُس کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ہر وقت چھلک"
"جانے کا خوف دامنگیر رہے، ہاں میں اب عقل سے کام لوں گا، بے شک"
"عاقل وہی شخص ہے جو ہر کام میں قدم رکھنے سے پہلے اس کے انجام سے"
"واقف ہو جائے، اور اس کے نفع یا نقصان کو سمجھ لے"
"میری عقل مجھ سے مطالبہ کرتی ہے کہ میں اپنی اس حیات کا ایک اور"
"شریک بھی بناؤں جو میرے رنج و راحت میں شریک، اور میرا"
"ہر حال میں مدد و معاون ہو، ہاں ہاں اب میں بے شک اس منزل کی"
"طرف قدم بڑھاؤں گا جس میں اگر میری قسمت نے مجھ سے خیانت کی"
"تو یہ اس کا آخری تیر ہو گا، جس سے وہ مجھے اپنا نشانہ بنائے گی، لیکن"

" اگر زمانہ نے موافقت کی اور احوال نے میری ہمت بندھائی، تو یہ میرے لئے "
" بنیاد ہوگی، اس عظمت اور وقار کی جس کی تعمیر کا میں ایک مدت سے آرزومند "
" ہوں، اس وقت اور ہاں صرف اس وقت میری زندگی کی پژمردہ شاخ "
" میں ہری بھری پتیاں نکلیں گی، میرا غنچۂ دل کھل جائے گا اور میں ہر طرف "
" سے زندہ دل کہلانے کا مستحق سمجھا جاؤں گا، میں اپنے لئے اس حور وش "
" کا متمنی ہوں، جو زندگی کی تمام آلایشوں سے صاف ہو، پاک باطن ہو "
" ہزاروں ارمانوں کا مرکز اور ہر چیز سے بے نیاز ہو، جس کی دونوں آنکھوں "
" سے فطرت کا ٹھنڈا اور ہلکا نور اسی طرح چھن رہا ہو جس طرح کہ خوش رنگ "
" پھولوں سے صبح کی شبنم چھنتی ہے! میں اس ذات کا آرزومند ہوں جسکو "
" گردش چرخ اور قضاؤ قدر نے موت و حیات کے مزے چکھائے "
" ہوں، جو اپنی عمر کی بیسویں منزل طے کر چکی ہو، اور پھر جسے قسمت نے میرے "
" زندگی کی راہ میں اُسی نورانی مشعل کی طرح لاڈالا ہو، جس کی شعاعیں میرے "
" نواحئِ نفس کو منور کر رہی ہوں، میں خیال کرتا ہوں کہ زمین کی مصیبتوں نے "
" اُسے ایسا مفلس بنا دیا ہوگا جس پر آسمانی رحمتوں کو بھی نازل ہوتے "
" شرم آتی ہوگی۔"
" ہاں یہی وہ مبارک ذات ہے جس کو میں محبوب رکھتا ہوں، اور "
" چاہتا ہوں کہ وہ میری شریک حیات ہو، اگرچہ میں نے اُسے اب تک "
" نہیں پایا ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور ملجائیگی۔"

پھر اس نے ورق کو میز پر ڈال دیا اور ایک درد سے بھرے ہوئے یاس انگیز لہجہ میں کچھ کہنے لگا،

" میری قسمت زمانہ ہوا کہ اُسے راہ پر لے آئی تھی اور میں اس کا دیوانہ "

" ہوچکا تھا، لیکن کیا مقدر اُسے پھر میرے ہاتھوں سے چھین ہی لے گا "
" آہ - اے سرکش تقدیر، اُف اے بدنصیبی، مجھے ابدی محنت کا طوق "
" پہنا دے، مجھ سے ہر چیز چھین لے لیکن ایک اس کی .... محبت ...... "
" جو مجھے تسلی دے اور وحشت و تنہائی میں میری انیس ہو "
اتنے میں اس کا وفادار خادم تمرانہ تیزی کے ساتھ قدم آگے بڑھائے اس کے کمرے کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا،

(۵)

" پیارے احسان، اگرچہ میں اتنے دن آپ کے پاس کوئی خط نہ بھیج سکی، اور "
" نہ ایک مدت سے آپ کی خیر و عافیت معلوم کر سکی لیکن یقین مانو کہ میرا دل "
" ہر وقت آپ ہی کی طرف لگا رہتا تھا اور میں ہر لمحہ آپ سے ملنے کی آرزومند "
" رہا کرتی تھی "
" کیا میں آپ کو بھول سکتی ہوں، اس کو فراموش کر سکتی ہوں جو میرے دل "
" کی تسلی، اور میری زندگی کا یاور ہے؟ کیا بشر اس کی استطاعت رکھتا ہے "
" کہ وہ اپنے ایک محبت کرنے والے کو بھول جائے، صرف اس لئے کہ وہ "
" اس سے محبت کرتا ہے؟ کیا روئے زمین پر کوئی ایسی پاکدامن اور شریف "
" لڑکی بھی پائی جاتی ہے جو کسی سے محبت کرکے پھر اسے بھول بھی گئی ہو؟ "
" میں مدت سے کوئی خط نہ لکھ سکی صرف اس لئے کہ قضاء قدر نے ابھی چند دن "
" ہوئے ہیں کہ مجھ سے میرے سب سے بڑے محسن کو اسی جگہ چھین کر پہنچا دیا، "
" جہاں ایک دن ہم سب کو جانا ہے، وہ انہیں اس منزل کی طرف لے گئیں "
" جسے ایک دن ہمیں بھی طے کرنا ہے، ہمیں بھی اپنی آخر، عمر کو پہونچ کر زیر "
" زمیں دفن ہونا ہے، اور اس کو اپنی آرام گاہ بنانا ہے "

"اگر آپ نہ ہوتے تو اب میری بقیہ زندگی تلخ ہو چکی تھی، میری اس تمامی"
"حیات میں جو کچھ بھی کہ میرے پاس ہے وہ آپ ہی کا ہے، اول تو یہ میرے"
"پاس رہا ہی کیا ہے، جو کچھ بھی ہے وہ میرا شرف، میری آبرو، اور میری"
"عفت اور پاکدامنی ہے، جسنے میرے باپ کی آخری گھڑیوں کے فقر کو"
"وسیلہ بنا کر اب تک مجھے غیروں کے ہاتھ سے بچائے رکھا، آج تک میں"
"اس کو اپنی گردن میں ڈالے بطور امانت کے حفاظت کر رہی تھی اور اب"
"اُسے آپ کے گلے کا ہار بناتی ہوں، آپ کا حسن اخلاق شرافت اور"
"بیدار مغزی، اس بات کے ضامن ہیں کہ آپ میری اس ادبی اور انسانی"
"میراث کی نگہداشت کریں گے، اس سے زیادہ ایک حرف بھی لکھنا اب"
"میری استطاعت سے باہر ہے، میرا قلم میرے اُن جذبات کا صحیح"
"نقشہ کھینچنے سے عاجز ہے جو اس وقت میرے قلب میں ایک زبردست"
"ہیجان پیدا کئے ہوئے ہیں، اور میں اُن کو الف کو قلم بند کرنے سے"
"معذور ہوں جو میرے دل و دماغ میں ماضی کے حزن اور مستقبل کی"
"امیدوں سے متعلق جوش مار رہے ہیں"

فقط تمہاری (ریحانہ)

ان حوادثات کو ختم ہوئے آج سات سال کا زمانہ گذر گیا ہے اس اثنا میں احسان اور ریحانہ کی محبت دن بدن روبہ ترقی ہوتی گئی ان کی محبت وہ پاک محبت تھی جو ذاتی اغراض اور بوالہوسیوں کے بدنما دھبّہ سے صاف ہوتی ہے، اور ان کا باہمی قلبی تعلق بالکل اُس جاذبیت سے مشابہ تھا جو نظام عالم کے اعتدال کی نگہبان ہوتی ہے یا اُن عناصر کی الفت کی طرح تھا جو ہر دوسرے عنصر کو اس طریقہ سے اپنے میں شامل کر لینا چاہتا ہے کہ اُس میں کچھ خلل اور نقصان نہ آنے پائے،

(۶)

نومبر ۱۸۹۶ء کی ستائیسویں تاریخ کو ریحانہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھی جھروکے سے اس باغ کیطرف دیکھ رہی تھی جو اس کے مکان سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے، اس نے نرگس کے ایک پھول پر جو وسط باغ میں فوارے کے قریب جھکا ہوا تھا نظر جما رکھی ہے اور اپنے تفکرات کے ناپید اکنار سمندر میں غرقاب ہو کر نرگس و صدی کے موہوم تخیل سے جو اس وقت اتفاقی طور پر اس کے ذہن میں آگیا ہے، مجنونانہ گفتگو کر رہی ہے،

" نرگس! نرگس!! او جوانمرد نرگس!!! جسے یونانیوں کے قول کے مطابق قدرت "
" نے پہلی شکل سے جدا کر کے ایک خوشنما پھول کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے "
" آخر تو نے صدیٰ سے محبت کیوں چھوڑ دی جس کے غم میں وہ دن بدن دبلی "
" ہوتی چلی جا رہی ہے؟ تو نے اس کے سوز دردنی کا جواب کیوں اسی قسم "
" کے شعلہ محبت سے نہیں دیا؟ آخر وہ کونسی ایسی مخفی شے ہے جو ایک فریق "
" کے دل میں عشق و محبت کی لو لگا جاتی ہے، اور دوسرے کو اسی قدر اس "
" سے متنفر بھی بنا جاتی ہے؟ کیا اس دنیاوی حیات کا جس میں ہم سب "
" آج اپنی اپنی زندگیوں کے دن گذار رہے ہیں، کوئی دوسرا رخ بھی ہے "
" جو ہم سے مخفی اور پوشیدہ ہے؟

" نرگس! کیا ہم اس کا یقین کر لیں کہ قدرت نے ہمیں صرف اتنی ہی چیزیں عطا "
" فرمائی ہیں جتنے کے تحمل کی ہمارا مبلغ علم اور ہماری طاقت ہم کو اجازت دیتی "
" ہے، لیکن اس کے برعکس تجھ پر اپنی نوازشوں کی بارش کر کے اور تیرے قلب "
" کو اپنے تمام اسرار کا خزینہ بنا کر تجھ کو پھول کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے، تاکہ وہ "
" مقدس اسرار تیرے بے پایاں جمال کی تہ میں ہمیشہ کے لئے پوشیدہ طور پر "
" محفوظ رہیں "

" نرگس! ہاں او شوخ اور بیباز نرگس!! تو اپنی پہلی زندگی میں ایک ایسا "
" خوبصورت نوجوان تھا، تو پانی کے دیوتاؤں میں سے دو دیوتا کی اولاد "
" تھا، تیرے تنے کوثر یا کی طرف لے کر ایک ایسی شاخ بلند ہوئی جس نے "
" تجھ کو صدیٰ کے ساتھ محبت رکھنے سے روک دیا اور اسباب سے منع "
" کر دیا کہ رنجور " صدیٰ " کو تو بھی اُسی نظر سے دیکھے جس نظر سے کہ وہ تجھے "
" دیکھتی ہے "
" لیکن اے خوبرو نوجوان کیا تو یہ مجھے بتا سکتا ہے کہ منازل مشرق کی بلند "
" مرتبگی اور جاہ و حشمت کی فراوانی دو عاشقوں کی محبت بھرے دل کے "
" درمیان حائل ہو سکتے ہیں "
" نرگس! تو نے " صدیٰ " سے صرف اس لئے مُنہ موڑ کر تو ایک مقدس دیوتا کا "
" لڑکا ہے بہت بڑی خطا کی ہے، اس لئے دیوتا آتما (زدس؟) نے تیری "
" اصلی صورت کو مسخ کر کے تجھے پھول کی شکل میں تبدیل کر دیا، ورنہ اسکو "
" کیا پڑی تھی کہ وہ تجھے اس حالت میں کر دیتا کہ تو شبانہ روز نہروں کے "
" کنارے اور حوضوں کے پاس پڑا پایا جائے جس طریقہ سے کہ تو اپنی پہلی "
" حیات میں ہر ٹھہرے ہوئے سمندر کے ساحل پر گھنٹوں صرف اس لئے "
" کھڑا رہا کرتا تھا کہ اس کے پانی کی صاف اور نکھری ہوئی سطح میں اپنے دلربا "
" حسن و جمال کا مشاہدہ کیا کرے "

لیکن تو اے غمگین لڑکی جس کا شور اب اس قدر فنا ہو چکا ہے کہ وہ سُنی یا کہی ہوئی بات کو اسی طرح دوبارہ الٹ کر کہدینے کے سوا دوسری سب چیز بھول گئی ہے! میں جسوقت کہوں کہ احسان .... " صدیٰ " نے " ریحانہ " کے اسی لفظ کو ابھی اچھی طرح دوہرایا بھی نہ تھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور احسان اندر داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا، گویا کہ " صدیٰ " نے

حسب عادت جواب دینے کے بجائے اپنی ساحرانہ قوت سے احسان ہی کو لا کر "ریحانہ" سے بغل گیر کرا دیا،

احسان دروازہ تک آنے کو تو آیا، لیکن وہ اس جگہ خاموش اور خوف زدہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا، وہ باوجودیکہ جوانمردی کی تمام صفات سے پورے طور پر متصف تھا، لیکن اُس وقت کی اُس کے چہرہ کی زردی نہایت ہیبت ناک اور ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی، "ریحانہ" خاموشی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور زبان سے ایک حرف نکالے بغیر وہ احسان کے شانوں پر اپنا گلاب سا رخسار رکھ کر نہایت دردناک آواز میں دل توڑ کر رونے لگی،

"میرا باپ ابھی ابھی اپنی جائداد نیلام ہونے کے ایک گھنٹہ بعد یکایک اس"
"جہان سے رخصت ہو گیا، وہ وہاں جا کر اپنے بزرگوں، میری ماں اور"
"تمہارے والدین سے بغلگیر ہو گئے، اب میری زندگی میں تمہارے سوا"
"اور کوئی نہیں رہا ہے، تم اب یہاں سے سفر کی تیاری کرو، اس لئے کہ"
"ایک ہی جگہ امارت و فقر کی دو زندگیاں بسر نہیں کیجا سکتیں"

یہ کلمے احسان کی زبان سے روتے ہوئے نکلے، پھر وہ "ریحانہ" کو چھوڑ کر جس راہ سے آیا تھا اسی راہ واپس گیا تاکہ وہ اپنے باپ کی مٹی میں شرکت کر سکے،

دوسرے دن احسان و ریحانہ، دولہا دلہن بنے شام کی طرف جانے والے جہاز میں بیٹھ کر اُس جگہ جا رہے تھے جہاں اُنہوں نے اقامت گزیں ہو کر اپنے دست و بازو کی کمائی سے زندگی گزار دینے کا تہیہ کر لیا ہے،

(۷)

سامنے نظر آنے والے گھنے جنگل کی موڑ پر ایک جھونپڑا دکھائی دے رہا ہے جس کے اردگرد کچھ مزروعہ کھیت اور کچھ باغات بھی ہیں، جھونپڑے کے دروازہ پر ایک بچہ مچلتا ہوا نظر آ رہا ہے، اس وقت وہ وجد میں آ کر اس طرح گا رہا ہے جیسے بہار کے زمانے میں بُلبل چہک رہی ہو، باقی

جنگل اور جھونپڑے کے چاروں طرف ایک ہیبت ناک سکوت اور سنّاٹا چھایا ہوا ہے، حقیقت میں وہ اطمینان قلب جو اس جھونپڑے کے رہنے والوں کو نصیب ہے شاید ہی کسی بڑے سے بڑے خوش نصیب کو میسّر ہوگا، اس مہیب سکون میں یکایک یہ کہتے ہوئے ایک دردناک آواز سنائی دی جس میں غضب کا ترنّم اور جمال پایا جاتا تھا،

گھر میں ایک لکڑی بھی جلانے کو نہیں اور رات بھی آدھی ہوا چاہتی ہے،

اچھا میری پیاری! مجھے رسّی اور کٹّار لادو،

احسان نے رسّی ہاتھ میں لی اور کٹّار کندھے پر ڈال کر اس ہیبت ناک تاریکی میں جنگل کا راستہ لیا۔

(المقتطف)

(ترجمہ)

نقشِ دیوار

عُرف

"کیا دم دیا ہے"

از

(جناب سید جمیل حسین صاحب ایم اے علیگ سی۔ ایس حیدرآباد دکن)

کل شام کو حبیب صاحب کے ہاں جو لطیفہ ہوا اس کا مجھے رہ رہ کر خیال آرہا ہے یہ کیفیت کچھ مجھ ہی اکیلے پر طاری نہیں بلکہ ہر ایک کا جو وہاں موجود تھا یہی حال ہے۔ جنوں بھوتوں کا تذکرہ تھا اور ہر شخص باری باری سے اس ضمن میں کوئی نہ کوئی واقعہ سنا چکا تھا، لیکن ایسا کوئی نہ ہوا تھا جو سب کو اچنبے میں ڈال دیتا۔ چنانچہ ناواقف اصحاب بھی وہاں موجود تھے جن میں سے ایک خاص طور پر نمایاں معلوم ہوتے تھے، ان کا قد چھوٹا تھا اور چہرے سے استعجاب ٹپکتا تھا، وہ ہر ایک کی داستان کو کان لگا کر نہایت غور سے سن رہے تھے لیکن خود خاموش تھے بالآخر جب سب کی باری ہو چکی تو حبیب صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کہئے، آپ کو کوئی عقل دنگ کر دینے والا قصہ یاد نہیں؟"

ذرا تامل کے بعد "ہاں، قصہ تو نہیں جیسے آپ لوگوں نے سنے سنائے بیان کئے ہیں میں تو اصل کا قائل ہوں۔ نقل میں اصل کی بات کہاں؟ اگر آپ فرمائیں تو میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کروں اور عجیب اتفاق ہے کہ وہ آج شام ہی کو پورا ہوا"

ہم سب نے مل کر اس کے سنانے کی درخواست کی۔ کہنے لگے "ایک یا دو سال کا ذکر ہے میں

چاندنی چوک کے ایک مکان میں مقیم تھا۔ جس کمرے میں میں سوتا تھا وہاں، معلوم ہوتا تھا، پہلے کسی شخص نے رنگ کرایا تھا لیکن نمی کی وجہ سے دیواروں پر جا بجا سیل کے دھبے پڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک بالکل ایسا تھا جیسے کسی آدمی کا چہرہ۔ ہو بہو وہی نقشہ تھا۔ روز صبح آنکھ تو سویرے ہی کھل جاتی تھی مگر میں یونہی پڑے پڑے اس کو دیکھا کرتا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں اس کو فی الواقع کسی شخص کی تصویر سمجھنے لگا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اور دھبوں کی وضع قطع میں تو تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا لیکن اس میں کوئی فرق نہ آتا۔

ایک دفعہ مجھ کو شدت کا نزلہ ہوا اور ساتھ ساتھ بخار اور کھانسی بھی، اب تو میرا کام سوائے اس کے کچھ نہ رہا کہ دن بھر یا تو کسی کتاب کا مطالعہ کیا کروں یا خیالی گھوڑے دوڑایا کروں۔ اس زمانے میں اس تصویر کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ چوبیس گھنٹے مجھے اسی کا تصور بندھا رہتا۔ میں اس کے ایک ایک خدوخال پر غور کرتا؟ کبھی ناک کو دیکھتا تو کبھی ماتھے کو، غرضیکہ ہر لحاظ سے وہ نقشہ میری آنکھوں میں بس گیا،

میں اچھا بھی ہو گیا لیکن وہ شکل ہر وقت میرے سامنے موجود رہتی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس شکل و شباہت کا آدمی ضرور کہیں نہ کہیں ملے گا۔ چنانچہ اس جستجو میں میں گلی کوچوں کی خاک چھانتا اور اکثر ایسے مقامات پر جاتا جہاں لوگوں کا اژدحام ہو، مثلاً تھیٹروں میں، سیاسی جلسوں میں، کھیل کے میدانوں میں، اسٹیشنوں پر۔ لیکن بے سود۔

وہ اس تلاش کا مجھ کو خبط ہو گیا تھا اور میں نے ہر چیز کو پس پشت ڈال دیا۔ درختوں کی آڑ میں، بجلی کے کھمبوں سے لگ کر، یا کسی دوکان پر چڑھ کر میں لوگوں کے ہجوم کو دیکھا کرتا۔ بعض تو مجھ کو دل چلا خیال کرنے لگے اور پولس والے شبہ کی نظروں سے دیکھتے ...."

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا جیسے کوئی تھک کر سوچنے لگتا ہے۔ اور پھر سلسلہ کلام شروع کیا۔

"آخر کار میں نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ موٹر میں سوار تھا اور فتح پوری سے مغرب کی سمت جا رہا تھا۔ تھوڑی دور تک تو میں اس کے پیچھے بھاگا لیکن فوراً ہی ایک خالی موٹر سامنے سے آتی نظر آئی۔ اس موٹر کے پیچھے ڈال دو، کہتا ہوا میں لپک کر اس میں چڑھ گیا تھوڑی دیر میں ہم صدر بازار کے اسٹیشن پر آ پہنچے، میں جھٹ سے پلیٹ فارم پر گیا۔ دیکھا کہ اس شخص کے ہمراہ دو عورتیں ہیں اور ایک بچی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد جا رہے تھے میں اسی فکر میں پھر رہا تھا کہ کسی طرح دو باتیں کرنے کا موقع مل جائے کہ اتنے میں کچھ اور لوگ بھی ان میں آ ملے اور سب گاڑی میں سوار ہو گئے۔

"میں نے بھی جلدی سے منماڑ تک کا ایک ٹکٹ خرید لیا اس امید پر کہ گاڑی تبدیل کرنے سے پہلے شاید گفتگو کا موقع مل جائے۔ مگر منماڑ پہنچنے پر وہ مجھ سے پہلے ہی اپنے دوستوں کے ہمراہ دوسری گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ان کا درجہ محفوظ تھا جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ضرور وہ دولتمند آدمی ہوگا۔

"مجھے پھر ناکامی ہوئی لیکن میں نے بھی حیدر آباد جانے کا تہیہ کر لیا، کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ اثنائے سفر میں کبھی نہ کبھی تو وہ عورتوں کو چھوڑ کر اکیلا پلیٹ فارم پر ٹہلنے کے لئے اترے گا میرے پاس اس وقت بمشکل اتنے روپے تھے کہ اورنگ آباد تک آنے جانے کے کرائے کو کافی ہوتے۔ بہر حال "دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا" کا مضمون تھا۔ گاڑی کی روانگی میں ابھی دیر تھی۔ یہ خیال کر کے کہ شاید وہ کسی ضرورت سے باہر نکلے درجے کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ اسی طور پر گذر گیا تھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور وہ شخص مع اپنی چھوٹی بچی کے باہر نکلا۔ میرے دل کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ بلیوں اچھل رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سینہ اب پھٹا اور اب پھٹا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور زنانے درجے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بس یہی موقع ہے اگر اس کو کھو دیا تو گئے۔

"چنانچہ ایک دفعہ ہی گھبرا کر میں نے کہا "معاف فرمائیے، کیا جناب اپنا ملاقاتی کارڈ مجھ کو عنایت فرما سکتے ہیں۔ میں ایک نہایت اہم وجہ کی بنا پر اس قدر جرات کر رہا ہوں"

"وہ بہت متعجب ہوا اور ہونا بھی چاہیئے تھا لیکن اس نے میری درخواست کو رد نہیں کیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ کیس میں سے اپنا کارڈ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور زنانہ درجہ میں چلا گیا۔ یقیناً اس نے مجھ کو دیوانہ خیال کیا ہوگا اور یہ سوچ کر کہ کون اس کے منہ لگے یہی مناسب جانا کہ لاؤ اس کو خوش کردو۔"

کارڈ کو ہاتھ میں مضبوط پکڑے میں پلیٹ فارم کے ایک سرے پر سب سے علیحدہ جا کر اس کو پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا "دیوار والا چاندنی والا۔ مالابار ہل۔ بمبئی" جس وقت میری نظر اس نام و پتہ پر پڑی میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا اور میں چکرا کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں اورنگ آباد کے ایک شفا خانہ میں تھا۔ کئی ہفتے تک میری حالت خراب رہی۔ ایک مہینہ ہوا جب میں وہاں سے واپس آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر کچھ دیر کے لئے رک گئے۔

ہم سب کبھی تو ان کے منہ کی طرف دیکھتے اور کبھی ایک دوسرے کی طرف اس انتظار میں کہ وہ کچھ اور کہیں۔ یہ داستان اس قدر دلچسپ تھی کہ اس کے آگے ہمارے سارے قصے ہیچ معلوم ہونے لگے،

ایک لمحہ کے بعد انھوں نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا "میں اپنے چاندنی چوک کے مکان میں واپس آگیا اور یہ دریافت کرنا شروع کیا کہ آخر یہ پارسی کون شخص ہے۔

میں نے بمبئی خط لکھے، وہاں کے اخبار نویسوں کو لکھا، دہلی میں پارسی انجمنوں میں میل جول بڑھایا، لیکن مجھ کو اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ایک لکھ پتی پارسی تھا اور اس کے والدین نے دہلی کی بود و باش اختیار کر لی تھی۔

"اس بات کو بہت دن گزر گئے یہاں تک کہ کل کا دن آگیا۔ رات کو میں غیر معمولی طور

پر تھک کر لیٹا تھا اس لئے دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ سورج کی کرنیں کمرے میں پڑ رہی تھیں۔ میں نے حسب معمول دیوار پر نظر ڈالی اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ تصویر بہت مدہم ہو گئی ہے، حالانکہ رات کو سوتے وقت جو میں نے دیکھا تھا تو نہایت صاف و روشن تھی۔

"میں عالم تحیر میں باہر گیا۔ تازہ اخبارات جن میں گزشتہ شام کی خبریں درج تھیں پکار پکار کر فروخت کئے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک بیچنے والے نے چلا کر کہا "پارسی سیٹھ کی موٹر کا حادثہ" تم نے بھی سنا ہوگا۔ میں نے فوراً اخبار خرید کر مفصل حال پڑھا۔ "مسٹر دیوار والا چاندنی والا ایمبلی کے مشہور پارسی سیٹھ مع اپنے دوستوں کے موٹر میں علی گڑھ جا رہے تھے کہ یکایک ان کا تصادم ایک گاڑی سے ہو گیا اور موٹر الٹ گئی۔ مسٹر دیوار والا کی حالت خطرناک ہے،

"میں حیرت زدہ اپنے کمرے میں واپس آیا اور پلنگ پر بیٹھ کر تصویر کو دیکھنے لگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ تصویر بالکل غائب ہو گئی۔

"تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ مسٹر دیوار والا شدت تکلف سے انتقال کر گئے غالباً اسی وقت جبکہ وہ تصویر میری نظروں سے اوجھل ہوئی تھی"

"حیرت ہے! کمال ہے!!" ہم سب نے کہا

"تو ہاں" وہ بولے، "میری داستان میں تین تعجب خیز اور حیرت انگیز باتیں ہیں، اول یہ کہ دہلی کے ایک مکان میں محض رنگ کے تغیر ہو جانے سے نہ صرف ایک شخص کی ہو بہو تصویر ہی بن جاتی بلکہ اس کی زندگی سے بھی اس طور پر تعلق ہو جانا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سائینس کو بھی ایک مدت درکار ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اس شخص اور مقام تصویر کے نام میں مناسبت کا پایا جانا"

ہم سب نے اس سے اتفاق کیا اور جنوں کا قصہ پھر از سر نو زوروں کے ساتھ

شروع ہوگیا۔ اسی اثنا میں اس تعجب خیز واقعہ کے راوی نے خدا حافظ کہہ کر جانے کی اجازت چاہی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر جانے والا ہی تھا کہ صدیقی صاحب نے پوچھا "آپ نے وہ تیسری بات نہیں بتائی؟"

دروازہ کھولتے ہوئے "ارے ہاں! لو وہ تو کہی نہیں بھول ہی گیا۔ وہ یہ ہے کہ میں نے یہ قصّہ ابھی آدھا گھنٹہ ہوا گھڑا تھا۔

"اچھا خدا حافظ"

(ترجمہ از انگریزی)

رُباعیات جناب ثابت لکھنوی وکیل کوٹہ

ہشیار بکار خویش۔ دیوانہ ہوں
جس کو نہ سُنے کوئی وہ افسانہ ہوں
کانٹوں سے خلش مجھے نہ پھولوں سے غرض
ہر باغچہ میں سبزۂ بیگانہ ہوں

جس رُخ کو جہاز اپنا لئے جاتا ہوں
آندھی کا بھی زور اسی طرف پاتا ہوں
بازار میں کوئی میرا گاہک جو نہیں
ہوں جنس گراں۔ دلکو یہ سمجھاتا ہوں

شاعر کی یہ پہچان ہے سیلانی ہو
کچھ طبع میں وحشت اور جولانی ہو
بیچارے کی بات بھی نہ پوچھے کوئی
تاریخ اگر اس سے نہ کہلانی ہو

اشعار از سلام جناب ثابت لکھنوی

بر غزل مشہور و مقبول آتش رح

یارب دکھائیگا در خیر الورا نہ کیا
ہمسے یونہی رہیگا مخالف زمانہ کیا

نیرنگ دیکھ ہو گیا رنگ زمانہ کیا
اپنی غرض کا نام ہے اب دوستانہ کیا

کہدی عرفت ربی وارشاد من عرف
پوچھے جو کوئی ہے سخن عارفانہ کیا

اے پردہ پوش میرے گناہونکو تو نہ دیکھ
رحمت کو دیکھ ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ڈوبے جو اسکی چاہ میں دنیا کو چھوڑ کر
ہاتھ آئیگا انہیں بھی در یگانہ کیا

خوگر کیا نوازشوں کا پہلے ہی کریم
ہمسے حساب لیتا ہے اب عادلانہ کیا

پہچاننے سے نفس کے عرفان حق ہوا
دیکھو تو اس خزانے میں نکلا خزانہ کیا

ثابت اُٹھو، کمر کو، کسو ہو گئی سحر
سر پر سفر ہے سوتے ہو تم غافلانہ کیا

مرثیہ مصنفہ جناب ثابت لکھنوی کے چند بند

سفر وسیلۂ ظفر کا برائے انساں ہے
قدم قدم پہ تماشائے شاہ یزداں ہے
بلند و پست جہاں۔ جا بجا نمایاں ہے
نظر میں کوہ کہیں ہے کہیں بیاباں ہے
جدھر کو دیکھو اثر صنع کردگار کا ہے
کہیں خزاں کا ہے موسم کہیں بہار کا ہے

ہوا جو عزم مصمم تو کون دل پھیرے
اگرچہ فکر صعوبت سفر کی ہے گھیرے
مگر یہ کہتی ہے ہمت میں ساتھ ہوں تیرے
"سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے"
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
سمجھ لے رحمت خالق کی تو پناہ میں ہے

بشر عجائب قدرت سفر میں دیکھتا ہے
خدا کے نور کی ضو بحر و بر میں دیکھتا ہے
کہاں چمن میں جو گل دشت و در میں دیکھتا ہے
ہزار صنعتیں برگ و ثمر میں دیکھتا ہے

ہر ایک پتّی میں گلکاریاں ہیں قدرت کی
ہر ایک رنگ میں نیرنگیاں ہیں حکمت کی

چھٹا جو مختلف اللون پھولوں سے گلزار — تو جا بجا ہوئے خلقت کو فائدے بھی ہزار
گلے کا ہار ہوا۔ کوئی طرّہ دستار — کوئی ہے طاق پہ مسجد کے کوئی زیب مزار
ملا ہے کوئی جوارش میں کوئی شربت میں
گلاب بن کے مہکتا ہے کوئی صحبت میں

اگر نہ عالم غربت کی یوں ہوا کھاتے — تو پھول باغ میں کھلا کے خاک ہو جاتے
غم خزاں سے ۔عنادل کے دل کو ترپاتے — نہ کام آتے کسی کے تو نام کب پاتے
نتیجہ صاف عیاں بے دلیل و حجت ہے
ذریعہ فیض رسانی کا بھی سیاحت ہے

نہ پائی خاک بھی قیمت جو گل چمن میں رہے — گہر وہ قطرے کے ہمسر تھے جو عدن میں رہے
عقیق و لعل بدخشاں میں یا یمن میں رہے — ملول خاک بسر۔ مبتلا محن میں رہے
جو اپنی کان میں ہیرا دبا تھا پتھر سے
وہ کوہ نور نکل کر بنا مقدر سے

نا اتفاقی۔ نام نہاد لیڈر

(از جناب سید امیر حیدر صاحب بخت اکبرآبادی)

کچھ ایسے ہند میں ہیں لیڈروں کے نام نہاد | بڑھا رہے ہیں جو قوموں میں آج شر و فساد
بجا ہے سمجھے جو پبلک انہیں حقیر و ذلیل | نہیں ہیں ملک میں وہ قابلِ مبارکباد
نہ اُن کو خوفِ خدا ہے نہ شرمِ دنیا کی | نہ فیض قول سے اونکی نہ فعل سے ہے مفاد
ہے لفظ لفظ اگر باعثِ غلط فہمی | تو بات بات میں اُنکی ہے بوئے بغض و عناد
وہی طریق ہدایت ہے قابلِ نفریں | وہ اپنے زعم میں سمجھے ہیں جس کو قابلِ داد
بجا ہے اُن کو بشر اہلِ شر اگر سمجھیں | بجا ہے اُن کو شیاطیں اگر کہیں اُستاد
تباہ خلقِ خدا ہو نہیں اونہیں پروا | زباں پہ ذکرِ خدا ہے نہ دل میں رام کی یاد
بتوں کو چھوڑ کے پوجا اب اُنکی ہوتی ہے | جہاں میں پیٹ کے کتوں کو مل رہی ہے مراد
کہاں ہیں ملک کا نقشہ بنا کے پیش کریں | ہنر دکھائیں یہاں آکے مانی و بہزاد
کیا تھا گاندھی نے جب بائیکاٹ کپڑے کا ق | تو بائیکاٹ کی تھی ایک سال تک میعاد
مگر نہیں ہے اب ان لیڈرونکی ضد کی حد | وہ چاہتے ہیں رہے قوم عمر بھر برباد
نہیں ذرا انہیں احساس ملک و ملت کا | الٰہی انکی بغل میں یہ دل ہے یا فولاد
انہیں کی تفرقہ سازی سے آج دنیا میں | نہیں ہے آدمی گویا نہ کوئی آدم زاد
نہ جوئے شیر سے مطلب غرض نہ شیریں سے | ہے اپنے سر کے لئے وقفِ تیشۂ فرہاد

کلام حضرت ہادی مچھلی شہری

(رباعیات)

در عہدِ شباب مے پرستی نکنم
باجام و سبو دراز دستی نکنم
ناصح چو نصیحت تو این است خموش
ممکن نبود کہ شرح ہستی نکنم

دیگر

ہر کس کہ بہ عشق زندگانی دارد
سرمایۂ عہد نوجوانی دارد
از رنج و خوشی دلش نگیرد ہرگز
ہر حال بطور جاودانی دارد

دیگر

شکوہ زچہ از جہان فانی داری
خاموش کہ عہد نوجوانی داری
تا خشک ترا کند نہ خورشید فنا
باید کہ چو آب جو روانی داری

دیگر

امید خوشی ز زندگانی مشکل،
در دست خیال کامرانی مشکل،
ما صورت عیش و مرگ باگرگ شبیہ
زین خصم دفاع پاسبانی مشکل

ہادی مچھلی شہری

افکارِ ہادی

کند بمیکده خود رهبری خمار مرا
کشد بجانبِ کوئے تو انتظار مرا

گھے بنا خوشی عیش هم بپردازم
اگر مجال دهد لذتِ فشار مرا

ز دیده پائے وفا کرده راهِ دل پویم
برو ببوئے تو گر جوشِ انتظار مرا

ز راه ہجر بدل در رسد تصورِ یار
خبر ز باده دهد زحمتِ خمار مرا

ز سوز آتشِ پنهانِ من قفس سوزد
خموش اگر بگذارد غمِ بهار مرا

برغمِ ضبط ز دل ناله که برخیزد
کند به پیش جفائے تو شرمسار مرا

ز شغلِ عشق اگر منع می کنی ناصح
جز ایں بگو که بود دیگرے چه کار مرا

اگر ز عشق تو گویم همیں نصیبِ من است
وگر براهِ تو پویم معاف دار مرا

شگفت نیست که از مقتضائے بخت بد است
ببوئے قعر اگر رو کند کنار مرا

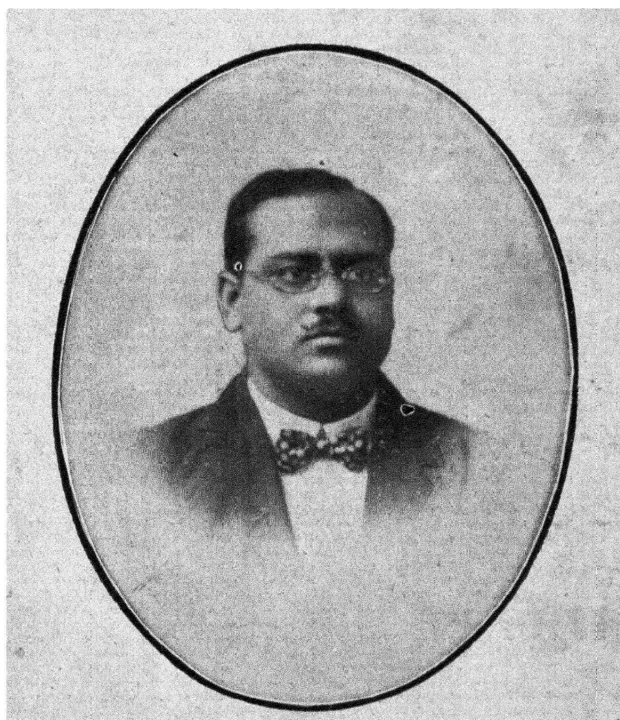
اگر ز سازِ دلم نغمه نمی خیزد
عجب مدار که کردی شکسته تار مرا

شبیه نیست بجز تو هیچ گل به چمن
شده ز روئے تو اندازهٔ بهار مرا

دلِ برشته که دارم ز ابتدائے وجود
زِ راهِ کوئے تو افتاد رهگذار مرا

خبر ز لطفِ تو ساقی اگر چه هست دلم
ز سوئے باده کشد زحمتِ خمار مرا

چه سود شکوه گذارم ز بیکسی هادی
نشانه است بدیں بخت ناگوار مرا



سید رئوف علی بیرسٹر مرحوم

آل انڈیا جہل مرکب کانفرنس

(بہ سلسلۂ ماسبق)

از
(جناب مرزا حامد حسین صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ٹی)

حضرات! ملک کی فضا میں آج کل سوراج حب وطن آزادی مساوات اخوت وغیرہ کے غل وشور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ بعض ابنائے وطن کے دماغوں میں یہ خیالات بری طرح سما گئے ہیں کہ بس آزادی ہی صرف وہ بلند ترین معراج ترقی ہے جو ہر قوم کو برائے تحصیل اپنا مطمح نظر بنانا چاہیئے۔ اور وطنیت ہی وہ شریف ترین جذبہ ہے جو انسان کو حصول آزادی کا خواہشمند بناتا ہے۔ سنئیے! آپ جانتے ہیں کہ بیہڑیا دہسان خلقت کو ابھارنے میں چند جوشیلے کلمے زبان زد کرانا نہایت مفید ہوتا ہے "آزادی" اور "قومیت" ایسے ہی کلمے ہیں اور ہمارے اور ہمارے ملک کے لئے ان میں اس سے زیادہ ذرا بھی معنی و وقعت نہیں۔ آج کل کے تقریر یے مدعیان لیڈری انہیں کلمات کو جا و بیجا استعمال کرکے بیچارے بے خبر ناواقف عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ انکی قلعی کہولتے وقت مجھے اپنی کامیابی کا کامل یقین ہے اس لئے کہ ان کی حقیقت پر غور کرنے کی اپیل میں صاحب الرائے طبقہ کے ہاتھوں جو غور وفکر کا عادی ہے، پس میں آپ سے بھرے دل سے التجا کرتا ہوں کہ آپ غور فرمائیے کہ ان مضرت رساں اور مہلک کلمات کے پس پشت کیسے کیسے خطرات مضمر و پنہاں ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ٹھنڈے دل سے ان کلمات یعنی "آزادی" اور "قومیت" کی تشریح کو جو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔ میں آپکو

یقین دلاتا ہوں کہ "عمل منطق" کا استعمال اس تشریح میں ہمیں آسانی کے ساتھ "قوم پرستوں" کے دہوکے کی ٹٹی توڑ ڈالنے اور "قومیت" کے بہوت کو مار بھگانے کے قابل بنا سکے گا اور قومیت کا ویران کھنڈر اور قوم پرستوں کی سست بنیاد کائنات چشم زدن میں ہماری آپکی کوشش سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔

مطالبہ یہ ہے کہ ہر انسان آزاد ہے اور اس لئے ہم بھی ہم غیر اقوام کی غلامی نہیں چاہتے، ہم اپنے اوپر آپ حکومت کر سکتے ہیں اور ہم ایک متفق و متحد مہذب و ترقی یافتہ آزاد قوم ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ قومیت کا ہندوستان میں وجود ہی نہیں ہے اور میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ ہم آج ایک قوم ہیں یا آیندہ کبھی ہو سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مختلف اقوام کا ایک گڑبڑ متضاد اور مخلوط مجمع ہیں جو ہندوستان کے وسیع براعظم میں خرید کر مجتمع کر دیئے گئے ہیں۔ اور جیسا کہ لارڈ برکن ہیڈ نے اپنی (معقول او دھ پنچ) "پر مغز" تقریر میں دارالعوام انگلستان میں بیان کیا ہے ہم سب یکجا اور باامن و عافیت صرف ایک وجہ سے ہیں یعنی اتحاد و استحکام قوت برطانیہ۔ وہ کون زنجیر ہے جو ہم سب کو کھینچ تان کر ایک ہی حلقہ میں رکھتی ہے؟ کھلا ہوا جواب ہے کہ وہ ہماری غلامی کی زنجیر ہے جو ہم سب کو ہمارے سب کے ایک آقا کے اشارۂ ابرو کی پابند رکھتی ہے۔ اسی کی بدولت ہم متحد ہیں۔ اسی پر ہم سب متفق ہیں اور اسی میں ہم سب یکساں یک زبان اور ہمخیال ہیں اور اسی غلامی کے برقرار رہنے پر ہم سب یک رائے ہیں۔ اور کیا مجال کہ اس بارے میں ہم کوئی اختلاف کر سکیں یا آپس میں کسی طرح کا جھگڑا فساد برپا کر سکیں۔ پس اگر ہم ایک قوم بھی ہیں تو ایک غلاموں کی قوم ہیں اور اس حیثیت سے ایک بڑی اور عظیم الشان قوم ہیں۔ اور ہم کو اس نگاہ سے دیکھا جائے کہ ہم ایک نہایت قوی ممتاز اور عظیم الشان قوم کے محکوم و مفتوح غلام ہیں تو ہمارا مرتبہ حشم وقعت وجاہ و ثروت دنیا میں اور ارفع و اعلی سمجھی جا سکتی ہے دیکھئے غور تو فرمایئے! ؎

کون کہتا ہے کہ اس دور میں آزاد ہیں ہم

جس طرح ہماری عبودیت کی قومی گیت ہے کہ خدا ہمارے آقا کو سلامت فتحیاب اور خوشحال رکھے۔ خدا ہمارے بادشاہ کو اچھا رکھے ۔ خدا ہمارے لاٹ صاحب کو بادشاہ اور کلکٹر صاحب کو لاٹ صاحب بنا دے ۔ خدا ہمارے تمام مالکوں کو اور لاٹ صاحب سے لے کر کلکٹر صاحب کے اردلی تک کو سلامت و برقرار رکھے ۔ اوسی طرح انگریزوں نے بھی نشۂ اقتدارِ فاتحانہ وقوت وسطوت حاکمانہ میں اپنا ایک قومی ترانہ بنا رکھا ہے کہ " اے برطانیہ حکومت کر - برطانیہ لہروں یعنی سمندروں پر حکومت کرتا ہے - برطانوی کبھی نہیں غلام ہوں گے " مگر کیا واقعی خود برطانوی غلام نہیں یا دنیا کی کوئی قوم غلامی سے بڑھی ہے ایک شاعر کہتا ہے ؎

مجھ کو جکڑا ہے خیالات کی زنجیروں میں
کہہ گیا تھا کبھی بھولے سے کہ آزاد ہوں میں

صرف فرق اتنا ہے کہ بعض آدمی کے غلام ہیں بعض خود اپنے خیالات کے اور بعض خارجی اشیا رعالم کے مثلاً امریکا روپیہ کا غلام ہے ۔ مسلمانان عالم بدبختی کے غلام ہیں - برطانوی اپنے قومی روایات کے غلام ہیں ہم سرکار عالیہ برطانیہ کے غلام ہیں۔

(مترجم) میں نے بہت سے جلسوں میں لوگوں کو اپنا گلا پھاڑتے سنا ہے کہ " آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے " مگر میں کہتا ہوں کہ " غلامی ہمارا پیدائشی حق ہے " اور ہم کو چوری چکاری سے یا ایمانداری سے جیسے بھی بن پڑے یہ حق حاصل کرنا اور اس کو قائم رکھنا ہے اور جو قوتیں بھی پیش و پس پردہ ہمارے مفاد میں کام کر رہی ہیں ہم کو اُن سب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ مہاتما اور موٹے " برادران " کے باوجود تمام دنیا کی غلام قوموں میں جو افسوس کہ اب بہت کم رہگئی ہیں ہندوستان اپنی نمایاں اور شاندار غلامانہ حیثیت استقلال کے ساتھ بناہ رہا ہے۔

حضرات ! ذرا غور تو فرمائیے خدانخواستہ اگر ہندوستان کو کبھی آزادی نصیب ہوئی تو اُس کے نتیجے میں کیسی قابل نفرت بلائیں اور کیسے قابل احتراز مصائب و آلام ہمارے سر پر نازل

ہوجائیں گے (اُف اُف! خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور جسم لرزتا ہے! اللھم حفظنا من کل شر وبلا۔ جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔
(مترجم) سوچئے تو کہ کیا ہوگا۔ ۵

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

جو کچھ ہم ہندوستانیوں نے غلامی کی قانع و معصوم پرامن وعافیت معاشرت وحیات کے قیام و ترویج میں عمر بھر محنت و کوشش کی ہے چشم زدن میں نیست نابود ہو جائے گی۔ مصر میں غیر ملکیوں کے مفاد کی حفاظت کون دست و بازو کریں گے۔ موصل کے تیل کے چشموں سے دُنیا کیسے مستفید ہو سکے گی۔ عراق وعجم میں تہذیب پھیلانے والوں کو کون فوجیں لے جائیں گی۔ وحشی تبتیوں، بھوٹانیوں، نیپالیوں، افغانیوں، عربوں اور سوڈانیوں کی گردن کس طرح ناپی جا سکے گی۔ فلسطین اور بیت المقدس جاہل اور غیر مستحق مسلمانوں سے چھین کر کیسے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ میں رکھا جا سکیں گے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر تہذیب کا جھنڈا گاڑنے والوں کے اسباب کے لئے تا بدامن ہمالیہ کون باربرداری کا کام دے گا۔ نینی تال شملہ منصوری اور دارجلنگ تک "صاحب" لوگوں کا سامان گرمی کے موسموں میں کیسے پہونچیگا "بابا لوگ" کو ہوا کھلانے گاڑی ڈھکیلتا ہوا کون جائے گا۔ کیا ہندوستانیوں کی آزادی کا لازمی نتیجہ تمام دنیا کی قوموں کی آزادی نہیں ہے۔ ہم کو کم از کم غلام در غلام اقوام کا تو خیال کرنا چاہئے۔ مصر۔ مراکو، فلسطین کی آزادی سے صرف مصری مراقشی اور یہودی ہی آزاد نہیں ہو جائیں گے بلکہ سوڈانی، ربعی اور عرب اقوام کا بھی کوئی پرسان حال نہ رہے گا کیا ہماری آزادی کے بعد کسی ہونہار انگریز نوجوان سول سروس انجنیری ڈاکٹری اور دیگر خدمت وبہبودی بنی نوع انسان کے علم وہنر سیکھنے میں جی لگیگا اور پھر سیکھنا اوس کے لئے کارآمد ہوگا؟ میں تو ۵

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت اہلِ وفا میرے بعد

غرض کہ آزادی کے خواب سے زیادہ خوفناک اور پریشان کن خواب اور اس خیال سے زیادہ مجنونانہ خیال ابنائے وطن کو کبھی نہیں سوجھا۔ اس خواب کی تعبیر دیتے ہوئے اور اس خیال کی تشریح کرتے ہوئے مجھے افسوس کے ساتھ اس افسوسناک واقعہ کی طرف آپ کی توجہ گیسٹنا پڑتی ہے کہ شروع میں ہمارا چمن وطن نہایت سرسبز شاداب اور بہار پر تھا اور ایک فریب خوردہ برطانوی ضعیفہ کی کھڑ بڑ سے اس چمن میں ہوم رول کا جو گھڑا (خرگوش) بھڑک بھاگا۔ ان بزرگ خاتون کو خیال تھا کہ وہ دولت علیہ برطانیہ عالم کے استحکام کی فکر کر رہی تھیں لیکن جیسے ہی کہ مہاتما جی نے سوراج کے اصلی مفہوم اور لوازم سمجھائے انھوں نے اپنی زبردست غلطی فوراً محسوس کر لی اور یہ بات بیشک انکے لئے قابل تعریف ہے کہ جیسے ہی اُن کو اپنی غلطی محسوس ہوئی انھوں نے نہایت جرات کے ساتھ قانون و صلح اور امن و امان و عافیت کی جرار فوجوں اور پرہیبت سامان ہلاکت کے استعمال اور صدہا نہتی بے گناہ جانوں کی گولیوں سے قربانی کو ملک کے غصہ بھرے جاہل گروہ کے اینٹ لاٹھی کے جواب میں بالکل جائز و مناسب بتلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ ہم کو اُن پر صرف اتنا اعتراض ہے کہ انھوں نے خود بھُس میں چنگاری ڈالی اور مطیع و فرماں بردار غلامانہ زندگی کے سکون کو ایک ولولہ خیز خواب دکھلا کر اُس کی تعبیر موت بتلائی اور اس تعبیر کا صحیح اترنا قضا و قدر پر ضروری ثابت کیا۔ حالات وطن کے مقتضائے فطرت کا اُن کو خود ہی از قبل اندازہ کرنا چاہئے تھا یعنی یہ کہ ہندوستان اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے قابل ملک کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر اس خیال کی طرف ملک کو متوجہ کرنے سے کیا فائدہ۔ برطانیہ عظمیٰ کی عالمگیر سلطنت کے استحکام و خدمت کی دُھن میں انھوں نے اس غریب فاقہ زدہ مفلوک الحال ملک میں ایسے خیالات پھیلانے کی کوشش کی جو

بذات خود خواہ کتنا ہی بے ضرر ہوں مگر محکوم قوم کیلئے ضرور ولولہ خیز تھے اور مظلوم محکوم کیلئے غصہ و خروش انگیز انکا لازمی نتیجہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر تباہی و کشت و خون تھا جو زمانے نے تجربہ و مشاہدہ کیا کہ ہو کر رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانیوں اور ہندوستانی کیرکٹر کو ایک برطانوی سول سروس گریڈ کلکٹر ضلع سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا وہ ہمارے رگ و ریشہ سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ ہم اپنے غلامی کے پیدائشی حق کو آزادی کی باؤلی ہانڈی کے عوض بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ غلامی ہمارا خمیر ہے اور اس سے ہماری ہڈیاں اور گوست پوست بنے ہیں غلامی ہمارا جدی ورثہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ ہماری ایک ایسی جائداد و ملکیت ہے جس پر ہم سب کے سب بجا طور پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ "صاحب" لوگوں کی غلامی ہی تو ہمارا سرمایۂ نازِ کارنامۂ حیات ہے ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ہماری نسلاً بعد نسلاً ڈیڑھ صدی کی مسلسل مستقل اور انتھک کوششوں کا نتیجہ سوائے اس ایک قابل ستائش پر سکون حیات اور اُس کے بقا و استحکام کی تدابیر کی کامیابی کے اور کیا ہے؟ سر مائکل اوڈائر وغیرہم کے ناز ہمارے سر آنکھوں پر لیکن اگر بالشویکی بھوت کے خواب نے انہیں ایسا ڈرایا ہے کہ وہ ہم ہنستے مجبور غلامان عبودیت سے اپنی سہمنا کی ظاہر کرتے ہیں تو ہم کو اُن کی تسکین خاطر کے لئے دبی زبان سے صرف اتنا کہنا ہے کہ ؎

ہم جور پرستوں پہ یہ گماں ترک وفا کا!
یہ وہم کہیں اُن کو گنہگار نہ کردے

موجودہ زمانے میں کبھی کبھی تو سوراج! سوراج! کا ایسا شور و غل ہونے لگتا ہے کہ ایک معاملہ فہم کو اس قوم! قوم! والے گروہ کی اچھل کود میں واقعی لطف اور ہنسی آسکتی ہے کوئی اُن سے پوچھے کہ ہم آزاد ہو کر کیا پا جائیں گے؟ آزادی کے لڈو میں کیا مزہ ہے

اور اس مزے کے لئے قوت حاسہ بھی تم کو نصیب ہے؟ آزادی کے پروانے کے لئے اتحاد
واتفاق اور امداد واستمداد باہمی کے شہد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس پر لگا کر چاٹا جائے
تمہارے ملک بھر میں کہیں بھی اس شہد کا چھتا ہے؟ آزادی کا نتیجہ؟ کیا سوچتے دیر لگتی
ہے؟ کیا پیشتر سے مثالیں موجود نہیں ہیں؟ سوائے اس کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے کہ
گذشتہ جنگ عظیم سے بڑے چڑھے پیمانے پر بلوے فسادات اور سول وار مدتوں تک
کے لئے ملک بھر میں مسلسل و مستقل ہو جائیں؟ دنیا بھر کی جوع الارض والی اقوام کی حریص نگاہیں
ہم پر پڑیں اور رال ٹپکے۔ غیر ایشائی زبردست طاقتیں درکنار خود ایشیائی کمزور قومیں بھی
ادہر ہی متوجہ ہوں جو اقوام اپنے مصالح کے لحاظ سے ادہر نہ جھکیں انہیں میں سے کسی کو
ہماری غلامانہ سرشت خوشامد کر کرکے یہاں لا بٹھالے۔ نا بھائی معاف کیجئے۔ اس ضیق ایںچا
گھسیٹی اور سنتر خاوندوں کی زوجگی سے ہمیں ایک کی بال بال غلامی کروڑ درجہ اچھی
ہے۔ ہم اپنے ملک کی ہر گلی دیوانے کتوں کی سیر گاہ نہیں بنانا چاہتے کہ ہر شہر قصبہ گاؤں
محلہ سڑک گلی کوچے میں ارتی اور اذان والے چہرے لئے بھونکتے پھریں۔ والدین اولاد
بھائی بہن کسیکا گلا دوسرے کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہے۔ آخر برسوں سے اسلحہ چھوٹے
نہیں ہیں ان کے استعمال کے لئے مشق چاہیئے کہ نہیں۔ کیا اتنے ہنگاموں پر بھی عوام
کی آنکھیں نہ کھلی ہونگی۔ اچانک کسی دیوار یا فرنیچر سے چوٹ لگے تو غصہ میں انسان
پلٹ کر اسی چیز کو مار بیٹھتا ہے۔ فسادات کے غم و غصہ میں عوام کو بتلا دیا گیا کہ اس کی
ذمہ دار سرکار ہے۔ خیر اس وقت تو یہ جادو چل گیا اور ہماری سرکار عالیہ کی طرف سے
لوگوں کے دل میں منافرت پیدا ہو گئی لیکن بعد میں ان فسادیوں کے حامیوں اور بلوائیوں
کے پیروکاروں کو دیکھ کر بھی کیا لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا کہ ان فسادات کو پسند کی
نظر سے دیکھنے والے سرکار کے علاوہ اور کون لوگ ہیں اور تمام نقصان جان و مال
اور عصمت دری کا مظلمہ در اصل کس پر ہے۔ میں تو ان وطن پرستوں قومی فدائیوں

سوراجیوں کی ذہنیت سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا ہوں۔ ہر وہ شخص جو پاگل خانے کی سیر سے محروم ہے سمجھ سکتا ہے کہ کسی وقت میں بھی ہندوستان سے برطانوی ذمہ داری کا رخصت ہونا خطرناک ہی نہیں ضروری ہولناک تباہ کن نتائج سے خالی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم سب کیوں سلف گورنمنٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں جبکہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ بن مانگے مل گئے۔ موجودہ اصلاحات بھی جب اُن کا جی چاہا اُنہوں نے خود ہی دیا نہ آپ کے انکار کی پرواہ کی کہ ہم نہ لیں گے زیادہ ہے نہ آپ کے اعتراف کی ضرورت سمجھی کہ جو کچھ ملا ہے بہت غنیمت اور اچھا ہے۔ اور پھر آپ لاکھ غل مچائیے جو کمیشن بیٹھنے والا ہے جو سال اس کے لئے معین ہے اس سے بیشتر کبھی نہ ہوگا۔ اور پھر آپ نے خود اب تک اپنا استحقاق کیا ثابت کیا؟ لوکل بورڈ میں آپ نالایق ثابت ہو چکے۔ کونسلوں میں آپ متحد نہ ہو سکے آیندہ کے متعلق بھی نہیں معلوم کہ آپ کی تفریق اور پارٹی بندیاں کتنی متنوع و مختلف ہونگی۔ قلمدان وزارت ہندوستانیوں کو دے دیا گیا اب بادشاہت بھی مانگتے ہیں آپ تاریخ کے کسی صفحے میں دکھلا دیجیے کہ بغیر مقابلہ فوج کسی نے کسی بادشاہ سے یونہی مفت بادشاہت مانگی ہی ہو۔ ملنا تو درکنار۔ باوجود وزارت پانے کے وزیر کے محرر اچھا کام کر رہے ہیں اور سارا وزارت کا کام کر رہے ہیں وزیر صاحب چونچ بنے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس عہدے پر جنم پٹہ لکھانے کی فکر میں ہیں۔ منہ کھولے اس کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اور نہ پانے والے ناک بھوں چڑھا رہے ہیں اور ہمیشہ کسی نہ کسی گروہ کا ہر وزیر و کونسلر پر غصہ و حملہ رہتا ہے۔ اس گڑبڑ میں بھی ہمارا روز کا مشاہدہ و تجربہ کھرے کھرے واقعات کی غیر مسکت منطق و دلیل سے اچھی طرح سمجھا رہا ہے کہ ہم پر بہت کچھ معقول طریقے سے حکومت کی جا رہی ہے اور دنیا کی دو محکوم اقوام سے بُری تو چار سے اچھی حالت میں ضرور ہیں۔ بادلے کتنے نے کاٹا ہو تو بنا بنایا انتظام توڑ کر از سر نو دوسرا انتظام شروع کریں جسکی ابتدا سر پھٹول سے ہو اور انتہا میں ہر طرح کے مصائب کا امکان ہو۔ جو ترقی خوشحالی امن و عافیت سے

نمایاں آثار ہر چہار طرف ملک میں آج موجود ہیں تاریخ قدیم وطن کے صدیوں کے حالات صحیح وتحقیق شدہ پڑھ ڈالیے ان حالات کے سویں ہزارویں حصہ کے وجود کا تسکین بخش ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ورنہ یوں تو عہد زرین سابقہ کے بے ثبوت کارنامے اور دلچسپ فسانے اور اُن کی ستایش انسانی فطرت وسرشت میں شامل ہے آج ہٹ دھرمی بھی انکار نہیں کرسکتی کہ ریل تار ڈاک پولیس سڑکیں واٹر پائپ اسپتال آبپاشی وغیرہ کے وسیع انتظامات اور مختلف محکمہ جات رفاہ عامہ جو تہذیب وشائستگی اور عیش وراحت کی دلیل ہیں سب کا وجود محض ہماری غلامی برطانیہ کی بدولت ہے ناشکرے پن کا کیا علاج جس میں راحت بھی تکلیف بتائی جاتی ہے۔

قومی کھڑ بھڑ کرنے والوں کا آج کل یہ فیشن ہے کہ " آزادی " اور " حب وطن " کے ترانے گانے میں اس طرح کی دُھن کا اظہار کریں گویا اُنھوں نے خوب سوچ لیا ہے کہ یہ مطمح نظر اصولاً اور مسلمہ طور پر صحیح وقابل تحصیل ہے۔ اور کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کے اچھے بُرے ہونے کے متعلق غور کریں اور اُس کے ابتدائی محاسن سے قطع نظر کر کے اُس کے موجودہ معائب یا آیندہ نتایج پر نظر ڈالیں۔ اس ایڈریس کے سلسلے میں میں نے آپ سے برابر یہ درخواست کی ہے کہ آپ اپنی معمولی توجہ اور سمجھ کو اس تحقیق وتفتیش میں صرف کریں کہ اس سیاسی بک بک یعنی قومیت حب وطن سوراج آزادی ہمارا پیدایشی حق ہے وغیرہ وغیرہ کی اصلی اہمیت وقدر کیا ہے۔ صرف انھی سیاسی دماغ والوں کو سارا سوچنے کا کام نہ کرنے دیجیے یہاں تک کہ آپ کے لئے آپکے حصہ کی غور وفکر بھی وہی کریں اور آپ کے دماغ کا کام بھی خود ہی انجام دے کر پکی پکائی ہانڈی آپ کے سامنے رکھدیں اور اس ہانڈی میں فاترالعقل اور دماغ کو ماؤف بنا دینے والی غذا ہو جس سے آپ بھی ہمیشہ کے لئے مسز اینی بسنٹ کی طرح سیاسی مسائل کے لئے ازکار رفتہ ہو جائیں اور ملک کے حق میں اچھائی بُرائی اور بُرائی اچھائی معلوم ہونے لگے

ہم خود اپنا راستہ اپنی عقل کی روشنی میں کیوں نہ ڈھونڈھ نکالیں اور اپنے ملک کی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ جس غلامی کے دور کرنے کی آج ہم کو صلاح دی جارہی ہے اس کے قائم و برقرار رکھنے اور دائماً پائدار و استوار بنانے میں برطانوی راج کی ابتدا سے اب تک ہم نے کیسی بڑی بڑی قربانیاں اور ایثار جان و مال کیا ہے۔ انفرادی حیثیت ہی سے نہیں من حیث القوم ہمنے اپنے مطمع النظر یعنی عبودیت کی موجودہ حالت تک پہونچنے کے لئے خود اپنی طبیعت و مرضی سے اور بلا جبر و اکراہ کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے۔

برطانوی غلبہ و اقتدار رفتہ رفتہ منزل بمنزل اور درجہ بدرجہ ہندوستان میں قائم و استوار ہوا ہے اور ہر مرتبہ ہماری مدد کی ضرورت پڑی ہے جسے ہمنے بلا پس و پیش پیش کیا ہے یہ ایک بدیہی امر واقعہ ہے جس کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت ہندوستانیوں کے کواپریشن اور عملی مدد سے قائم ہوئی ہے یہ کیا کچھ کم حاصل عمل ہے جب ہم بنیاد کی پستی سے برطانوی شان و عظمت کی سر بفلک بلندی کی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ خیرہ ہوجاتی ہے اور سر چکرانے لگتا ہے لیکن ہمیں یہ یاد نہیں رہتا کہ اس مرتفع شاندار عمارت کی بنیاد ہماری ہی اطاعت اور غلامانہ سرشت اور باہمی نزاعات پر ابدالآباد تک کے لئے مستحکم قائم کی گئی ہے فطرتاً منکسر المزاج ہونے کے باعث ہمنے بہت کم احساس کیا کہ برطانوی آقا کے آرام و قیام کے لئے ہمنے کتنا ادا کیا اور اب تک ادا کررہے ہیں مختصر یہ کہ من حیث القوم غلامی کا اپنے لئے قائم و برقرار رکھنا ہمارا فرض عینی اور کار منصبی ہے اور اس مطمع نظر کے لئے ہمارا دعوے ہے کہ ہم ہندوستان کی تمام و کمال وسیع آبادی کی نمایندگی کررہے ہیں۔ اس معاملہ میں تعلیم یافتہ صاحب الرائے طبقہ بھی ہمسے علیحدہ نہیں پچاسوں بلکہ سیکڑوں ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں اور ہر ایک پڑھے لکھے لیڈر یا گیدڑ ہندوستانی کے عمل سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ہم سب صرف اسی ایک کوشش میں دن رات کوشاں و سرگرداں ہیں اور ہمارا یہ دعوےٰ پچھے گزشتہ اور آئے دن ہوتے ہوئے واقعات اور

منطقی دلائل و براہین پر مبنی ہے۔ چلے ہوئے دماغ اور بگڑے ہوئے حواس کی تخیل کا نتیجہ نہیں۔ برائے بحث بالفرض محال تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ ہندوستان آزادی چاہتا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہندوستان سے برطانوی دور اُٹھ جائے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے دو اور صرف دو طریقۂ عمل ممکن ہیں۔ ایک تو باقاعدہ مسلح انقلاب جو موجودہ صورت حالات کے لحاظ سے یقیناً ناممکن العمل ہے۔ دوسرا طریقہ وہ جس کی صلاح مہاتما گاندھی نے ملک کو دی اور خود پیش رو بن کر اوس پر ملک سے اس حد تک عمل کرایا جس کی اسقدر جلد کسی کو امید نہ تھی اور موجودہ برطانوی قوت وسطوت کے دور میں جو کچھ اس طریقہ پر عمل ہوا اُس کو دیکھتے ہوئے اس کا اقرار واعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بغیر اشتداد ترک موالات ہی ایک صورت اور تدبیر تھی جس پر عمل کر کے ملک آزادی حاصل کرنے میں ضرور اور بہ آسانی کامیاب ہو سکتا تھا۔ اگر ملک کو درحقیقت یہ خواہش تھی کہ وہ برطانوی تسلط کا جُوا اپنی گردن پر سے اُتار کر پھینکدے لیکن کیا ہوا کس کو نہیں معلوم ہے کہ اگر ایک تعداد نے بُرے بھلے طور سے اس طریقۂ عمل پر عمل کیا تو ایک خاصی تعداد نے اوس پر عمل نہیں کیا اور رفتہ رفتہ اب اوس کو صاف صاف بالکل مسترد کر دیا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ برطانوی ہندوستانی راج سے علیحدگی پسند نہیں کرتا یعنی کھلے لفظوں میں یہ کہدینا ہندوستان ایک محکوم ملک رہنا پسند کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں۔ ہندوستان کی آبادی کے دو بہت بڑے اجزا اپنی انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ حالت بدستور قائم رہے بلکہ اور مستحکم اور ہمیشہ کے لئے مستقل ہو جائے۔ اوس سے زیادہ اندھا کوئی نہیں جو آنکھیں رکھکر دیکھنے سے انکار کرے۔ بعینہ یہی حالت حواس باختہ قوم! قوم! چلانے والوں کی ہے۔ جو اس واقعہ کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں کہ مسلمان اپنی ہر ممکن کوشش قوت اور طاقت اس مقصد کی تکمیل میں صرف کر رہے ہیں کہ ملک کی غلامانہ حیثیت و نوعیت قائم برقرار رہے مگر پھر بھی ہم دن کو دن

کہنے سے بیحد گھبراتے اور ہچکچاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں لالہ لاجپت رائے جی نے بمبئی ہندو کانفرنس کی صدارت کی تقریر کے سلسلے میں اپنے ہم مذہبوں کو دعوت دی تھی کہ ہندوستان کے تمام غیر مسلم جماعتوں سے سیاسی اتحاد کر کے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک ٹھوس اور مضبوط دستہ تیار کر کے کھڑے ہوں میرا دعویٰ ہے کہ کوئی سمجھدار اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایسا کر کے لالہ جی نے ہندوستان کی برطانوی حکومت کی بنیاد کو نئی کنکریٹ سے از سر نو پھر مضبوط کر دیا در آنحالیکہ لالہ جی قوم پرست اور سوراجی ہیں اور حب الوطنی کے لئے مشہور ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف اس اتحاد کو قائم کرنے کی اسکیم کے معنی لازمی طور پر یہ ہیں کہ مسلمان بھی کوشش کریں یا مجبور ہو کر برطانوی پناہ و رفاقت کے سایہ میں آجائیں کیونکہ ان کو ایسی حالت میں مجبوراً ایسے دوست پیدا کرنا اور بنانا ہیں جن کو ساتھ لیکر وہ لالہ جی کے متحدہ افواج کا مقابلہ کر سکیں اور انگریزوں سے بہتر دوست اس صورت معاملہ میں انہیں ملنا ناممکن ہے۔ اوران دو افواج کی تیاری میں برطانوی اقتدار استحکام کے ساتھ برقرار رکھنے کی مشین تیل پانی تاکر پورے زور شور کے ساتھ پھر چلنے لگتی ہے جب کبھی ہندو اپنا قانون دان حقوق طلب سر گورنمنٹ کے مقابلے میں بلند کرتا ہے مسلمان کی عملی مدد سے کچل دیا جاتا ہے اور جب کبھی کسی مسلم دماغ میں گورنمنٹ کے خلاف بلوہ فساد کی تحریک یا خیال آتا ہے تو اس کی لالہ جی والے ہندو پارسی عیسائی اتحادی کے ہتوڑے سے مرمت و اصلاح کر دی جاتی ہے اور جہاں تک ہمارے گروہ "وطن دشمن" کا تعلق ہے ہمارا الو سیدھا رہتا ہے اور ہم فائدے ہی فائدے میں رہتے ہیں کیونکہ یہی تو ہے جو ہم چاہتے ہیں اور اس کو قائم رکھنے کی تدبیریں سوچنے کے لئے تو آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اور گو کہ میں آخری شخص ہونگا جو ہندو یا مسلمانوں کو یہ صلاح دوں کہ وہ علانیہ ملک معظم کے دور امن و امان میں خلل ڈالیں لیکن اس سے بھی ہم آپ کو انکار نہ ہونا چاہئے کہ ہمارے گروہ کے ہر فرد کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ فرقہ وارانہ کشمکش کو قائم و برقرار رکھے

اور ہرگز ہرگز مختلف فرقوں کو متحد نہ ہونے دی اور جہانتک ہو سکے وطن کے مختلف فرقوں کے درمیان مسائل نزاع کو سلجھنے اور طے ہونے نہ دے بلکہ دونوں میں جو فصل و خلیج ہے ہماری کوشش سے زیادہ چوڑا ہی ہوتا جائے۔ وقت بے وقت ہم کو برابر آرتی واذان اور مسجدوں کے سامنے باجا بجانے اور نہ بجانے کے حقوق کی اہمیت پر زور دیتے رہنا چاہئے اور حد سے زائد زور دینا چاہئے کیونکہ سوراج مل جانے کے بعد نہ ارتی ہوگی نہ آذان۔ دراصل میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں رہ کر یہی حقوق اس قابل ہیں کہ ان کے لئے ہم اپنی جانیں دیدیں کیونکہ انہیں کے حاصل رہنے میں ہماری نجات ہے جس کا اور ہماری دائمی غلامی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور یہی ہمارا دعوی اور مسلک ہے ٥

ستم سے اس کے میں خوش ہوں کہ غالبا یوں ہی
مجھے وہ شامل ارباب امتیاز کرے

تبصرے

اصلاح سخن

نوشتہ

(جناب مولوی سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی مؤلف واقعات انیس)

کتاب اصلاح سخن ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے مولوی عبد العلی صاحب شوق سنڈیلا اسکے جامع ہیں مجھ سے پہلے تبصرہ نگاروں نے اس نسخہ کے موضوع پر کافی بحث کی ہے اور منشا تالیف پر اظہار رائے کیا ہے ادب کے مختلف اصناف پر اس کے تبصرہ کے تقسیم ہے۔ تقریب۔ دیباچہ التماس۔ اصلاح ضمیمہ وغیرہ مختلف مضامین کے ذریعہ سے تبصرہ نگاروں نے مقاصد کتاب پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ فی الحال ایک نسخہ اصلاح سخن کا بذریعہ ڈاک مجھے بھی ملا ہے اور غالباً اس ایثار سے حضرت مؤلف کا یہ منشا ہے کہ خامہ فرسائی سے ہیچمدان بھی اس کا معاوضہ ادا کرے یہ سوال ایک سے زیادہ مرتبہ پہلے بھی مجھ سے کہا گیا ہے لیکن میں نے خلاف مصلحت سمجھ کر توجہ نہیں کی اب جبکہ ابرام و تقاضہ اس صورت سے شروع ہے تو میں اپنی محفوظ رائے کو معرض اشاعت میں لانے کے لئے مجبور ہو گیا میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ اصلاح سخن پر تبصرہ کرنا گروہ شعرا کو پیغام مبارزت دینا ہے مگر خیر۔ حضرت شوق کی سولہ غزلیں معرض اصلاح میں ہیں اور ان غزلوں کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب شوق اچھے شاعر ہیں اور ان کا کلام جوہر شعریت سے خالی نہیں بعض مقام پر ان کے اشعار استادانِ نامور کے اصلاح سے بے نیاز ثابت ہوتے ہیں اور ردّ و قدح کے بعد اپنی اصلی ہی حالت میں اچھی معلوم ہوتے ہیں لیکن کوئی بشر باعتبار بشریت مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا اس اعتبار پر حضرت

شوق کے کلام میں بھی بشری فروگذاشت موجود ہے جس پر حضرات اساتذہ نے توجہ فرمائی ہے اور میں بھی علی محلہ اس کا ذکر کروں گا۔ اصلاح ح۔ نے خوان کرم پر ہندوستان کے ہر حصہ کے شعراء کو دعوت دیکھی ہے ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اصلاح غیر مفید اور خلاف اصول ہے میرے نزدیک اصلاح لینے والے کو سب سے پہلے ملکی خصوصیت کا لحاظ رکھنا چاہیئے تاکہ اختلاف محاورہ واصطلاحات کی کشمکش واقع نہ ہو اپنے شہر کے کسی شاعر کو اصلاح کلام کے لئے منتخب کرنا یہ پہلا فرض شاگرد کا ہے اس میں تعصب ملکی وشہری کو دخل نہیں بلکہ تقاضائے فطرت ومقتضائے ضرورت بھی ہے زبان کے اختلافی استکاک سے محفوظ رہنے کے لئے یہ اک آسان جادہ ہے جس کو جناب شوق نے ترک کردیا اور ربع مسکون کے مشاہیر ائمہ سخن کے آگے سر نیاز خم کردیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف زبانی ومکانی کا اثر صلائے عام کے ذریعہ سے ناگوار حد تک پہونچ گیا جس کو میں آگے چل کے بیان کروں گا۔ شوق صاحب نے دستر خوان دعوت پر نہایت خوش ذائقہ اور لطیف غذائیں چن دیں لیکن وہ شرکاء دعوت کو پسند نہ آئیں اور بسبب اختلاف مذاق قوت ذائقہ رد کردی گئیں، بنگالیوں کو چاول اور مچھلی پسند ہے صوبہ اودھ کے چپاتی خور پلاؤ کو ہٹا رہے ہیں۔ حضرات دہلی مرتج زیادہ مانگتے ہیں اور ارباب دکن ترشی کے خواہشمند ہیں بات بنے تو کیونکر بنے۔

اس جمہوریت پسند مذاق اصلاح کے بدولت جناب شوق کا شعر اساتذہ نامور کے سامنے اس طرح پیش ہوتا ہے جس طرح کوئی لاوارث مریض اپریشن کے ٹیبل پر لٹایا جاتا ہے اور ایک کم چالیس ماہران علم الابدان خوفناک آلات سے کر آستین چڑھاتے ہوئے بڑھتے ہیں اور عمل جراحی شروع ہوتا ہے۔ ماہران علم الابدان تو جرح وقدح سے پہلے بذریعہ کنسلٹش اتفاق رائے کر بھی لیتے ہیں لیکن جراحت پیشگان قلم کار کے مذہب میں اتفاق رائے حرام ہے اور شعر کا قلع قمع تشخیص شخصی پر منحصر ہے خوفناک نشتر قلم کے ہزاروں زخم کھانے کے بعد مریض شعر کی جان بچ جائے یہ اس کی خوش قسمتی ہے کچھ حیرت نہیں جو تمام اجزائے جسم

شعر قوت دستی پر قربانی چڑھا دیے گئے اور وہ ہیولا بھی باقی نہ رہا جو قوت تخیل کے عمل سے فضائے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

مراسلات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اول اول استادان نامور جناب شوق کی شاعری سے متاثر ہو کر محاسن شاعری کا اعتراف کرتے ہیں کوئی صاحب لکھتے ہیں کہ ماشاء اللہ آپ خوب کہتے ہیں آپ مستغنی عین الاصلاح ہیں کوئی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ کہیں آپ میرا امتحان تو نہیں لیتے بہر کیف ہر شاعر معترف کمال ہے لیکن آخر میں وہی لوگ مجروحیت کلام شوق کے لئے خنجر بکف نظر آتے ہیں اس میں ایک اہم راز ہے جب مصلحان کلام کو یہ پتا لگا کہ شاگرد ہر جائی ہر دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹا رہا ہے صرف ہمیں کو شرف اصلاح حاصل نہیں بلکہ اس میدان جنگ میں ایک کم چالیس افسران نامور کمان کر رہے ہیں تو ہر استاد آنکھیں بند کر کے اس جنگ مغلوبہ میں دھنس پڑا اور اس امید پر فن سپہ گری دکھاتا ہوا میمنہ سے میسرہ تک چلا گیا کہ شاید رستخیز میں کوئی کارنمایاں بہ طریق اتفاق واقع ہو جائے اور وہی قضیہ اتفاقی باعث نام و نمود ہو۔ نام آوران میدان شاعری کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ (جھوٹی جنگ) ہے اور اس کا دار و مدار فتح و شکست پر نہیں بلکہ تفنن طبع ہے۔ ہر استاد کے دل میں یہ بھی خیال پیدا ہو گیا تھا کہ میں ارتیس [۳۸] پہلوانان سخن کو زورد لا رہا ہوں کیونکہ جناب شوق کی خفیہ سازش کا راز کھل گیا تھا۔ نکات نقادی پر علم حاصل کرنے کے لئے جناب امیر احمد صاحب علوی حضرت صدیقی سید سلطان احمد صاحب جناب اثر لکھنوی کے تبصرہ قابل ملاحظہ ہیں ضروریات تنقید پر خامہ فرسائی کے لئے کچھ باقی نہیں یہ حضرات موضوع کتاب کے ہر پہلو پر پوری روشنی ڈال چکے انہیں باتوں کو الفاظ بدل بدل کر لکھنا جھوٹے نوالوں کو چبانا ہے میں اُن باتوں کو چھوڑتا ہوں اور چند جدید نکتوں کی طرف ناظرین کو متوجہ ہونے کی تکلیف دیتا ہوں۔ صیغہ مراسلات بہت دلچسپ ہے لکھنے والوں نے اس سبجکٹ پر خوب لکھا ہے لیکن یہ حصہ یعنی حصہ مراسلات حضرت شوق محفوظ رکھتے تو بہتر ہوتا اسی طرح تبصرہ نگار بھی اس منزل پر خاموشی سے گذر جائے تو

شایان اخلاق ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو شاعری محض تفنن طبیع کی غرض سے کرتے ہیں اور بہت زیادہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے لئے شاعری آلہ اکتساب معاش ہے شاعری سے فائدہ اٹھانے کے مختلف ذرائع ہیں تصنیف و تالیف املات جرائد، مضمون نگاری، افسانہ نگاری، ڈراما نویسی وغیرہ۔ ایسی حالت میں کوئی استاد اپنے شاگرد سے حق المحنت طلب کرے تو اس میں مضایقہ کیا ہے۔ مٹھائی طلب کرنا جو اک عام طریقہ اوستادی و شاگردی ہے میرے نزدیک اس میں بھی اوستاد کی توہین نہیں اور مراسلات اصلاح سخن میں تو محض ظرافت و شوخی شاعرانہ سے کام لیا ہے جیسے شوخی استادان اصلاح سخن نے کی ہے ویسی ہی شوخی تبصرہ نگاران اصلاح سخن نے بھی کی ہے سنڈیلہ کے لڈو، نذر کی مٹھائی طلب دیوان کے لئے کوئی رقم مانگنا مفید کتابوں کی اشاعت کے لئے طلب امداد یہ سب سوال معمولی بھی ہیں غیر معمولی بھی ہیں سوء ظن باعث نقصان اخلاق ہے۔

ہر شاعر اپنے دفتر کے چار دیواری میں خالی الذہن ہو کر جو کچھ لکھتا تھا وہ اس کا فرض تھا اصلاح سخن میں خطوط کے پبلک پراپرٹی ہو جانے سے ایسے پردے بھی اوٹھتے ہیں جو مراسلہ نگاروں کے اخلاق کو نقصان پہونچاتے ہیں مثلاً ایک اوستاد صاحب لکھتے ہیں کہ آپ لکھنؤ کے فرسودہ شاعری کے تقلید چھوڑ دیجئے یہ امر باعث دل آزاری اہل لکھنؤ ہی ایک زمانہ تھا کہ سخندان دہلی و لکھنؤ اہل زبان کہے جاتے تھے لیکن فی الحال زبان اردو مختلف آب و ہوا میں نشو و نما پا رہی ہے ہندوستان کے ہر صوبہ کو اہل زبان ہونے کا دعویٰ ہے پنجاب کو زبان اردو پر ناز ہے بہار بھی مدعی ہے، دکن بھی دعوے دار ہے زبان کیا ہے، محاسن زبان کیا ہیں فلسفہ زبان کیا ہے یہ اک نازک مسئلہ ہے اور نزاکت حقیقت کے ساتھ دل آزار بھی ہے چونکہ دل آزاری بدترین گناہ انسانی ہے اس لئے میں اس اجمال کی تفصیل بھی کرنا نہیں چاہتا۔

برادر مکرم نواب سائل اک مدت دراز سے شعراء لکھنؤ کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں اہل

لکھنؤ کو اکثر برادر معظم کے مہمانداری کا شرف حاصل ہوتا ہے اہل لکھنؤ کے ارادات کا نواب صاحب سے یہ حال ہے کہ صحبت مشاعرہ میں سب سے آخر ان کا نمبر آتا ہے اور سب سے زیادہ ان کی تعریف ہوتی تھی ان کے کلام کے مدح سرائی میں ہر فرد منہمک رہتا ہے نواب صاحب کا قول ہے کہ مجھے غزل کے داد جیسی لکھنؤ میں ملتی ہے دہلی میں نہیں ملتی اور ایسے نقاد سخن دہلی میں نہیں مگر جذبات حقیقی کو کوئی شخص دبا نہیں سکتا اور طرف داری وطن مقتضائے فطرت انسانی سے نواب صاحب کے قلم سے بھی ایک فقرہ دل شکن نکل گیا وہ اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں کہ آپ خوب کہتے ہیں اور آپ کے کلام میں تو ہماری طرف کا رنگ معلوم ہوتا ہے حیرت خیز بات ہے۔ اس فقرہ سے برادر مکرم کا یہ مقصود ہے کہ لکھنؤ والوں کا شعر کہنا نہیں آتا آپ کا کلام اس لئے اچھا ہے کہ اس میں دہلی کا مذاق سخن باعث امتیاز ہے۔

یہ وہ جذبات ہیں کہ جس کو انسان بھول نہیں سکتا۔ مراسلات میں بعض اور اوستادوں کے کنایہ بھی مکلف ہیں لیکن اس کا اثر اہل لکھنؤ اس لئے نہیں لیتے کہ ایسے خود پسند لوگ اہل لکھنؤ کی نظر میں بھی کوئی امتیازی شرف نہیں رکھتے پدرم سلطان بود ایک لاعلاج مرض ہے لکھنؤ کے شاعری کو افسردہ بتانا یا غزلوں کی مذاق صحیح کو اپنی ملکی خصوصیات سے منسوب کر لینا بجائے خود اک دل خوش کن خیال ہے انتالیس استادانِ سخن میں صرف حضرت ثاقب ہی ایسے شخص ہیں کہ خط آخر تک مولف کی خوبی کلام کے معترف رہے۔ تمام مجموعہ میں دو چار اصلاحیں حضرت ثاقب کے بھی ہیں لیکن در حقیقت وہ اصلاح اصلاح ہے۔

حقیقتاً اگر بعض شعرا مستند لکھنؤ اس مجموعہ میں نہ ہوتے تو اصلاح کا درجہ امتیازی زیر نقاب رہتا لیکن آرزو۔ محشر۔ صفی۔ عزیز کی اصلاحیں استادانہ علو مرتبت کا فرق دکھا رہے ہیں مجھے بسبب طوالت ان لوگوں کے اصلاحوں پر نقادی کا موقع نہیں ملے گا اس لئے میں اجمالاً یہاں ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور میں بے روئے رعایت کہتا ہوں کہ حق اصلاح انہیں لوگوں نے ادا کیا ہے تعجب خیز یہ امر ہے کہ بعض مستند مشاہیر شعرا جس کا کلام اپنے

مقام پر محاسن شعری سے مالامال ہے ان کی اصلاحیں مذاق صحیح اصلاح سے محروم نظر آتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح اور چیز ہے اور بجائے خود شاعری اور چیز ہے ادب مانع ہے ورنہ میں ناظرین کو توجہ دلاتا کہ آپ اون کے کلام مشہور یا مطبوع کا درجہ ملاحظہ فرمائیں اور پھر اصلاح کی پستی پر انصاف سے نظر ڈالیں لیکن اصلاحیں اس وقت بھی اصلاح سخن میں موجود ہیں میری توجہ دلانے سے آپ بجائے خود اس کا فیصلہ کریں گے حالانکہ اس چیز سے کسی اوستاد کی شاعری کی منقصت نہیں ہوتی اور نہ مجھے منقصت منظور ہے ایک بات میرے ذہن میں آئی میں نے لکھدی ممکن ہے کہ یہ میرا ذاتی واہمہ ہو۔

یہ مجموعہ چھپ جانے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوتا ہے کہ اک بزم تفنن درہم وبرہم ہوگئی وقتی ضرورتیں پوری ہوئیں اور فریقین کے اغراض کا خاتمہ ہوگیا نہ شاگرد کو اوستادوں کی سے کوئی عقیدت تھی۔ نہ اوستادوں کا ایثار تعلیم ہمدردانہ تھا دریا کو عبور کرنے کے لئے کشتی ضروری چیز ہے اور عبور کرنے کے بعد وہی کشتی بے ضرورت چیز ہے خدا جانے کون فائدہ میں رہا اور کس کو نقصان ہوا جناب شوق خود کہہ گئے ہیں ؎

اک تماشہ تھا کہ جس سے شوق شب بھر ہوگیا

یہ ہم ضرور کہیں گے کہ ایک مدت پسند دماغ کو اچھی سوجھی سات آٹھ برس کی محنت کی داد نہ دی جائے تو بے حد ناانصافی ہے محنت کا طولانی وقفہ اس قدر صبر آزما نکلا کہ اکثر آنکھیں بند ہو چکیں اور اکثر سب خاموش ہوگئے کاش بعض ہیر وخلوت کی تکلیف فنی کو جلوت کے منظر میں دیکھ لیتے اور ہر جرح خانے ان متنازعہ فیہ الفاظ یا استفسار کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اصلاح سخن میں واقع ہوگئی ہیں۔

(میدان محشر) بعض اساتذہ نے اس ترکیب پر باعتبار ظرفیت محشر دہوکا کھایا ہے اس معاملہ میں جناب عزیز کا عنوان فیصلہ قابل مدح ہے۔ فرماتے ہیں میری نظر سے کلام اساتذہ میں کہیں نہیں گزرا۔ یہ لاعلمی حضرت عزیز کے لئے باعث منقصت نہیں

یہ فقرہ احتیاط بشری کے سایہ میں سے کوئی شخص معلومات کلی کا دعوے دار نہیں ہو سکتا اور اگر ہو تو جھوٹا ہے میدان محشر کی غلطی کے طرف دار اور لوگ بھی اس مجموعہ میں موجود ہیں لیکن قابل افسوس ہیں وہ اُستاد جو اپنی معلومات شخصی پر مغرور ہو کر تمام دنیا کو غلط بتاتے ہیں یہ اجتہاد یہ دعوی طاقت بشری سے بالاتر ہے۔ میرے نزدیک بھی تصرفات اعجام کی تقلید کا پھندا اردو گو حضرات کی گردنیں پڑا رہے گا۔ میں بھی میدان محشر کی صحبت میں ہم آہنگ ہوں۔

(سم) اس لفظ کے متعلق اوستادوں کے حیرت انگیز اقوال مراسلات سے انتخاب کر کے درج ذیل کرتا ہوں۔

(احسن مارہروی) سم ہو جانا بھی لکھنو کا محاورہ معلوم ہوتا ہے۔

(اطہر) سم میں نے خاموش کے معنی میں نہیں سُنا

(باقی) اس شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

(مبارک) یہ شعر پسند نہیں

(شفق) سم کہا ہے۔

بہ مجبر المعقول لفظ محاورہ زبان اہل لکھنو ہی سم ہو گیا یعنی خاموش ہو گیا متحیر ہو گیا ہکا بکا ہو گیا پھر اوس کے بعد محل استعمال پر نازک فرق محسوس کیا جائے گا۔ اس میں استادوں کا کیا قصور ارے جناب جب وہ اک محاورہ سے ناواقف ہیں اور اُن کی زبان کا محاورہ نہیں تو وہ حضرات بھی لکھیں گے جو لکھا یہ تو جناب شوق کے اخلاق وسیع و شاگردی جمہوری کا خمیازہ ہے جناب شوق کو چاہئے کہ اب کی بار سو لہ غزلیں سوتھ افریقہ میں بغرض اصلاح روانہ کر دیں۔

(چمک دمک) اگر قابلیت دکھانا چاہوں تو میں بھی اس لفظ کی تعریف و توجیہ فلس کیپ کے آٹھ ورقوں پر لکھ سکتا ہوں مگر میری نزدیک تو دمک چمک کا تابع

محل ہے ہاں کندن کی دمک کے ساتھ یہ محاورہ مستثنیٰ ہے باقی ہر جگہ دمک کی جگہ چمک ہی فصیح ہے دونوں ساتھ مل کر قوت کلام کی اعانت کرتے ہیں یا چمک دمک دو مترادف لفظ ہیں۔ حضرت شوق کے ایک اوستاد معظم ہدایت فرماتے ہیں کہ جیسے جیسے مشق سخن بڑھے گی ویسے ویسے آپ خود اپنے کلام پر اصلاح فرمائیں گے۔ حضرت شوق کی حالت پر افسوس ہے کہ جیسے جیسے اور ویسے ویسے اُن کو کہنا پڑے گا۔

اب میرے فاضل دوست کا بنایا ہوا ناٹک ختم ہوا اور میں اس کے آخری باب یعنی اصلاحات پر ایک نظر ڈالتا ہوں اصلاحوں کے حسن و قبح پر وضاحت و صراحت سے انتقاد مشکل تر ہے اجمالاً بھی اگر کچھ لکھا جائے تو ریویو اصل کتاب سے دونا ضخیم ہو جائے گا میں مشتے نمونہ از خروارے بعض اُن اصلاحوں کا ذکر کرونگا جو کسی عالم میں امتیازی ہیں اور بس۔

ع اب کہاں ہے وہ جوانی کا طلسم لعزب ‏ ‏ اک تماشا تھا کہ جو اے شوق شب بھر ہو گیا

حضرت احسن مارہروی فرماتے ہیں کہ حضرت اوستاد نے اس لئے اس لفظ کو متروک کر دیا کہ سپتر کا التباس ہوتا ہے، شب بھر اور سپتر کا التباس غریب ان ہذا لشی عجیب

ع آہ ظالم ہو چکی اک منظر کی آنکھ بند ‏ ‏ اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا

جناب شفق دریافت فرماتے ہیں کہ ایک آنکھ بند ہوئی دوسری کیوں نہ ہوئی۔ میرے نزدیک سوال ذرا ٹھیڑھا ہے ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔

ع نہ پوچھو کوئی محبت کی واردات کا حال

کہ ایک دشمن جنس وفا نے لوٹ لیا

حضرت اظہر نے مصرعہ اول بدل دیا ہے ع

نہ پوچھو کوئی محبت کی سرگذشت ہے ‏ ‏ کہ ایک دشمن الخ

گذشت کی (ت) اور ہم کی (ہ) میں جہاد ہو رہا ہے خدا جانے یہ افتاد کس پر پڑے۔

ﮯ زبان سے اُف نہ کرنا شمع ساں جل جل کے مرجانا

حضرت محشر مصرعہ اول میں تصرف کرتے ہیں ﮯ مثالِ شمع جلنا اُف نہ کرنا اور مرجانا۔ اصلاح اسی کا نام ہے جس میں الفاظ کی ہیر پھیر سے خوبی پیدا کی جائے۔

ﮯ نہیں یہ ضبط آہ اے دلفگار آرزو اچھا

شفق۔ آہ کی ہائے ہوز اصلی گر گئی

مجھے بھی غریب آہ کے (ہ) پر رحم آتا ہے کہ حرف ندا کا الف منہ دیکھا کیا اور ذرا مدد نہ کی احسن

ﮯ یہی دو حرف آہ سرد کے شرح غم دل ہیں

طویل اک داستاں ہے جسکو تمنے مختصر جانا

شوق قدوائی۔ کہوں میں تم جو میری عمر بھر کے واسطے بیٹھو۔ فصاحت بلاغت روانی جس میں تمام محاسن کا اضافہ ہو گیا۔

میں تم جو میری سبحان اللہ احسن

ﮯ ستم ہے بڑھ کے گھٹنا ولولہ جوشِ محبت کا قیامت ہے نظر پر چڑھ کے پھر دل سے اُتر جانا

ریاض۔ ترے تیروں کا وہ آنا نگاہِ قہر بن کر اِدھر دل میں جگہ کرنا اُدھر دل سے اُتر جانا

اس شعر کی تعریف میں زبان قاصر ہے اور فرصت کم ہے ورنہ بہت کچھ لکھنے والا لکھ سکتا ہے احسن

ﮯ تری بیداریاں اے شوق تھیں تمہید غفلت کی

وہ پردہ رات کا تھا جس کو آغاز سحر جانا

اطہر۔ بیداریاں بصیغہ جمع بے ضرورت فرماتے ہیں اور مصرعہ بدلتے ہیں بالآخر شوق بیداری تری تمہید غفلت تھی بالآخر انجام کار کے معنی دے رہا ہے۔

صاحب استعداد اوستادوں سے یہ بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ باتوں باتوں میں

مشکل لغات کے معنی بتا دیتے ہیں بالآخر اک اہم لغت تھا جس کے معنی بتا دیئے - مصرعہ اوّل کے صدر سے حشو بھی نکل گیا - احسن

۵ کیا ڈالے کوئی آرزوِ تازہ کی بنیاد

باقی - فارسی ترکیبوں میں واؤ کا گرانا ممنوع ہے - ہاں سچ تو فرماتے ہیں واؤ کا گرنا قابل افسوس ہے - ماہران فن کے دیکھنے کی بات ہے واقفیت فن بھی کیا چیز ہے احسن

۵ ہے اُسکی شان اور سوا اسکے کیا کہوں گنجائش ایک دل میں غم روزگار کی

شفق - گنجائش کی شین معجمہ اصلی ہے اور حرف موقوف نہیں اس لئے گرانا درست نہیں ایک کا الف بھی گرایا نہیں جاسکتا وہ بھی اُردو ہونے کے سبب نہیں گر سکتا -

اگر اس عبارت کی منطق کسی کی سمجھ میں آگئی تو وہ داد دے سکتا ہے اور جو نہ سمجھا تو خیر مگر ہم تو یہ کہیں گے کہ یہ علم سینہ ہے جو کتابوں میں کہیں نہیں مل سکتا - احسن

۵ تابندہ ذرہ خاک کے ابتک ہیں چشم شوق

اللہ کوئی حد ہے مرے انتظار کی

نیاز - ذرّوں میں خاک قبر کے ہے نور چشم شوق

سبحان اللہ شاگرد کے تخلص کے رعایت سے نور چشم شوق ضعیف لزوم مالایلزم کا اضافہ ہے - احسن

۵ حسرت کے ساتھ خون شکایت بھی کر گئیں

پھر دل فریبیاں نگہ انتظار کی

ریاض - صبح شب وصال مری جان لیں گے جان

علم اشارات کا کمال دکھایا ہے یہ مصرعہ کئی صورت سے پڑھا جاسکتا ہے متانت و جلال قابل ملاحظہ ہے - ہائے کہنہ مشقی بھی کیا چیز ہے - احسن

۵ اب دیکھو نہ ہاتھ رکھ کے دل پر بیمار میں کچھ رہا نہیں ہے

باقیؔ ۔ وقتِ نزع بیمار کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں یا دل پر

بات تو بہت معقول فرمائی ہے لیکن ابھی معشوق فن نبّاضی میں مکمل نہ تھا اس لئے گھبرا گیا اور دل پر ہاتھ رکھدیا اور یہ سمجھا کہ نفس کی آمد و شد سے فائدہ حاصل کیا جائے احسنؔ

۵ اے شوق تم اپنے دلکو سمجھاؤ اس درد کی کچھ دوا نہیں ہے

ثاقبؔ ۔ اے شوق یہ دردِ عشق مشغلہ وہ ہے جسکی دوا نہیں ہے

اصلاح نے شعر کو چست کر دیا اصلاح کا معیار صحیح یہی ہے کہ مختصر ہو اور بہتر ہو حسین ہو احسنؔ

۵ اے قافلہ یاس گزر دل میں نہ ہو کر، پامال نہ کر گور غریبان تمنّا

بیباکؔ ۔ غریب بمعنی مفلس و نادار استعمال ہوتا ہے مثلاً گور غریباں پھر اس صورت میں اگر غریباں تمنّا کی طرف مضاف کیا جائے گا تو یہ معنی ہوں گے کہ جن کو تمنّا نہیں ہے اُن کی گور کو پامال نہ کر حالانکہ یاس عدم حصول نتیجہ کا نام ہے قلزمؔ

اس تمام بحث میں مفید نکتہ یہی ہے کہ غریب کے معنی مفلس و نادار کے ہیں اور اسی نکتہ سے شعر پر معنوی روشنی پڑی ہے فی الحقیقت ایسے اساتذہ کے فیض اصلاح سے شاگرد کے علاوہ پڑھنے والوں کی معلومات میں کافی اضافہ ہونے کی اُمید ہے احسنؔ

۵ وائے قسمت پہونچے ہیں کب ہم سے ناکامِ ازل

ختم جب محفل میں دورِ جام و ساغر ہو گیا

ریاضؔ ۔ مے وہی میکش وہی محفل وہی ساغر وہی

ختم میرے آنے پر کیوں دورِ ساغر ہو گیا

یہ موضوع تو حضرت ریاض کے حصّہ کا ہے واقعی خوب مصرعہ لگایا ہے احسنؔ

۵ دشمنِ جاں جب سے یہ چرخ ستمگر ہو گیا

کون سا باقی ستم ہے جو نہ ہم پر ہو گیا

آرزو - مہرباں جس دن سے اک ترک ستمگر ہو گیا
کون سا ایسا ستم تھا جو نہ ہم پر ہو گیا

حضرت آرزو کی اصلاح نے حق اصلاح ادا کر دیا احسن

ے کشتۂ ناز تغافل کا ہے اب کیا پوچھنا زندۂ جاوید تیری کھا کے ٹھوکر ہو گیا

عزیز - کشتۂ طرز خرام یار کا کیا پوچھنا زندۂ جاوید کھا کر ایک ٹھوکر ہو گیا

عزیز صاحب نے شعر کو حشو و زوائد سے صاف کر کے آئینہ کر دیا احسن

ے مسافرِ رہِ ہستی کو مقامِ عبرت ہے اجل کے بھیس میں بیم و رضا نے لوٹ لیا

حسرت موہانی ے نہ پوچھ منزلِ آخر میں دل پہ کیا گزری

کیا خوب مصرع ہے اور کیا لائق قدر اصلاح ہے احسن

ے وہ کچھ ہوا کہ گئی جان عشق میں آخر تغافل بت دیر آشنا نے لوٹ لیا

سائل ے یہی ہوا کہ گئی جان عشق میں آخر

وزن سے لغزیں مصرعہ آسمان پہ پہونچ گیا سبحان اللہ احسن

ے وہ دل کہ چین نہ لینے دیا کبھی جس نے غضب کہ ساتھ ہی دفن ایک ہی مزار میں ہے

عزیز - غضب تو یہ ہے مرے ساتھ پھر مزار میں ہے۔

ماہران فن ان باتوں کو دیکھ سکتے ہیں کہ اصلاح سے شعر کے کیا تیور ہو گئے احسن

ے کبھی جو تھی وہ کہاں اب متاع استغنا سرائے دہر کے حرص و ہوا نے لوٹ لیا

فیاض - نہ بچ سکی اسی حرص و ہوا نے لوٹ لیا

نہ بچ سکے بس اتنا ہی ٹکڑا اس مصرعہ میں استادانہ ہے اور ثبوت کہنہ مشقی کے لئے کافی ہے احسن

ے بیمار نے دنیا سے جانے میں بھی جلدی کی
جب آپ کے آنے میں تاخیر نظر آئی

اطہر - بیمار نے دنیا سے تعجیل کی جانے میں
اگر کہیں جناب احسن مارہروی اس مصرعہ کو دیکھ لیں تو فوراً فائدہ المناس جاری کر دیں
(کی حالتیں) (کھانے میں) جناب اطہر نے معلوم ہوتا ہے غور نہیں فرمایا احسن
ع اے جوش بہار غم اب خبر نہیں دیتی دم بھر جو پلک جھپکی زنجیر نظر آئی
ریاض - جو موج ہوا آئی زنجیر نظر آئی
مصرعہ ثانی کو خدائے سخن میرؔ کے مصرعہ سے کیا خوب علیحدہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں ع
پھر موج ہوا پیچان اے میر نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دیکھئے دونوں کے مصرعوں میں موج ہوا زنجیر ہی الفاظ ہیں مگر واہ اوستادی
اور مشاقی کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ریاض کے مصرعہ میں میر تقی کے مصرعہ کا شائبہ بھی نظر نہیں
آتا حقیقتہً کسی کی شہرت بیکار نہیں ہوتی جب تک خدا نے اُس کو کوئی بات نہ دی ہو۔

احسن
ع کہتی ہے یہ راز آنکھوں کی پریشانی بیمار کی حالت کچھ تغیر نظر آئی
نیاز - یہ شعر نکال ڈالئے حالت تغیر نہیں ہوتی بلکہ حالت میں تغیر ہوتا ہے
یہ اُستادانہ اور عالمانہ قول فیصل ہے ہمعصروں کو استفادہ چاہئے احسن
اب عطایائے اوستادان نامور میں ہیں بعض اشعار قابل توجہ ہیں۔
اطہر - ہر پھول میں تری ہی بو مجھ کو دکھائی دی
ہر شمع میں تیری ہی تصویر نظر آئی
بو دکھائی دی یہ محاورہ معلومات عام میں اضافہ جدید ہے
ع ایسی کیا خوشخبری لائی ہوا کے جھونکے دل مسرت سے اُچھلنے لگے دیوانوں کے
علیہ نائل - میں وہ دیوانہ ہوں مجنوں بھی مجھے کہتا ہے
قبلہ و کعبہ مگر آپ ہیں دیوانوں کے

اس شعر کی بھی یہی تعریف ہے کہ میر تقی صاحب کے شعر سے علیحدہ کیا ہے حالانکہ مضمون متحد ہے میر صاحب فرماتے ہیں ۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا ہے القاب سب مجھے

اب آپ ملاحظہ کریں توارد سے کتنا بچایا ہے یہ ہے استادانہ قوت — احسن

عطیہ اُلٰ ۔ جب سے دیکھی تری ہم نے کمان ابرو
ڈھیر سینہ میں لگے رہتے ہیں پیکانوں کے

جب سے دیکھی ہے تری ، اس فقرہ نے جان ڈال دی محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے اور پھر کمان ابرو سے استعارہ بہت فکر سے اس شعر کی خوبیاں واضح ہوتی جاتی ہیں مشاقوں کا کلام نظر غائر سے دیکھنا چاہیے ۔ احسن

ہ سچ ہے ہاں سچ ہے یقیناً یہ بجا اور درست — آپ گرویدہ ہوئے شوق کے افسانوں کے

جگر ۔ سچ ہے ہاں سچ ہے یقیناً یہ نہایت سچ ہے — آپ گرویدہ الخ

مصنف کے مصرعہ میں دو مقام پر (سچ) وارد ہوا ہے حضرت جگر نے ایک سچ کا اضافہ کیا تین سچ ہوئے اب یہ نیازمند بھی ایک مصرعہ عرض کرتا ہے اور سچ کا اضافہ کیا ہے اگر پسند افتد زہے عز و شرف ۔

سچ ہے ہاں سچ ہے یہ وہ سچ ہے کہ سچ مچ سچ ہے
آپ گرویدہ ہوئے شوق کے افسانوں کے

معلومات

از

(مولوی محمد حسین صاحب حسان ندوی)

ولایات متحدہ امریکہ کے محکموں میں عورتوں کی ۵۰۰ سے زائد اختراعات رجسٹرڈ کرائی گئی ہیں اس سے امریکن خواتین کی صنعت و حرفت اور علوم فنون میں مشغولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ان میں اکثر اور اہم اختراعات امور خانہ داری سے متعلق ہیں

تجارت صنعت اور دولتمندی کا مرکز آہستہ آہستہ یورپ سے امریکہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے ۹۵ فی صدی موٹریں جو تمام دنیا میں استعمال ہوتی ہیں ولایات متحدہ امریکہ سے نکلتی ہیں اس کے علاوہ یہاں سے حسب ذیل چیزوں کے برآمد کا تناسب حسب ذیل ہے۔

بغیر صاف کیا ہوا لوہا	تمام دنیا کے اعتبار سے	۵۵	فیصدی
صاف کیا ہوا ″	″	۵۵	″
فولاد	″	۶۶	″
پٹرول	″	۶۱	″
کوئلہ	″	۴۳	″
لکڑی	″	۵۲	″
پیتل	″	۵۰	″
دیا سلائی	″	۸۰	″
سیسہ	″	۶۴	″

صاف کیا ہوا	تمام دنیا کے اعتبار سے		فیصدی
توتیا	"	۶۴	"
صابون	"	۶۰	"
روئی	"	۵۵	"

اس مختصر سی فہرست سے امریکہ کی تجارتی و صنعتی مرکزیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ وہ ابھی اس میدان میں انتہائی ترقی پر نہیں پہونچا ہے کیونکہ خام پیداوار کی برآمد بھی ہنوز جاری ہے۔ جب مصنوعات کی ترقی ہو جائے گی تو صرف انہی کی تجارت کرے گا۔ اور اس وقت ظاہر ہے کہ منافع میں بھی برابر دن دونی ترقی ہوتی رہے گی۔

فرانسیسی اخبارات نے ایک عجیب واقعہ کا تذکرہ کیا ہے ایک نوجوان خاتون مارگریٹ بوققال دو سال مسلسل سوتی رہی اس طویل مدت گذرنے پر بیدار ہوئی تو بیس منٹ زندہ رہکر مر گئی اوس کی اس گراں خوابی کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں وہ اپنے مکان میں تھی کہ اس کی ایک رفیقہ کار سہیلی گھبرائی ہوئی گھر میں داخل ہوئی اور اس سے کہا مرغریت! مرغریت پولس تمہیں گرفتار کرنے آرہی ہے اوس کا قصہ محض تخویف و تمسخر تھا، مگر وہ سنتے ہی گر پڑی اور بے خبر سو گئی حتیٰ کہ دو سال تک مسلسل سوتی رہی، اسے بیدار کرنے کے لئے ڈاکٹروں کی تمام کوششیں بیکار گئیں، لیکن اس عرصہ میں غذا برابر پہونچائی جاتی رہی تقریباً پورے دو سال بعد اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، آنکھیں کھولیں بیٹھنے کا ارادہ کیا مگر ۲۰ منٹ گذرنے نہیں پائے تھے کہ ہمیشہ کے لئے سو گئی،

اس قسم کی نیند کے بعد انسان ہمیشہ مرنے کے بعد جاگتا ہے کہا جاتا ہے کہ طویل ترین مدت جس میں ایک شخص بیدار ہو کر زندہ ہوا۔ چنانچہ ایک روسی کسان ۷ ماہ بعد بیدار ہوا جاگتے ہی وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جائے مگر روک دیا گیا اور دو ہفتہ تک بستر پر پڑا

رہا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کی قوت عود کر آئی۔

اہل جرمنی نے اپنی کھیتیوں اور دوسری سبزیوں میں جلد سے جلد نمو پیدا کرنے کے لئے بالکل جدید طریقہ ایجاد کیا ہے۔ وہ زمین سے تقریباً ایک فٹ نیچے تار کا ایک سلسلہ بچھا دیتے ہیں ان تاروں کے کھمبے بھی ہوتے ہیں جو زمین سے اوپر اور وہ تاروں سے متصل ہوتے ہیں تاکہ فضا سے ان کے لئے برقی قوت جمع کریں، کہا جاتا ہے کہ اس طریقہ سے وہ ان کھیتوں میں دوسرے کھیتوں کے مقابلہ میں بہتر غلہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ٹیونس سے تقریباً ۱۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک فینیقی شہر کے آثار کا انکشاف کیا گیا ہے اس میں ایک ”بعل“ کا معبد ایک مسیحی اور ایک عطارد کا ردیانی معبد پایا گیا ہے۔ یہ بات تقریباً پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ شہر کی بنیاد مسیحی قرن اول اغطس قیصر کے زمانہ میں ڈالی گئی ہے۔ بعل کے شرقی معبد کا فرش سنگ رخام وغیرہ کے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس شہر کے باشندے ان بقیہ فینقیوں میں سے ہیں جن کے ممالک پر ہن بال کی شکست کے بعد رومیوں نے قبضہ کر لیا تھا، بعل کے معبد ان تمام مقامات پر کثرت سے ہیں جن پر فنیقیوں کا قبضہ تھا، بعلبک، صیدا، قرطنجہ، میں اب تک ان کے آثار پائے جاتے ہیں،

بعل ان شریر ترین معبودوں میں تھا جس کو انسان نے عبادت کے لئے اختراع کیا تھا وہ تانبے کا بنایا جاتا تھا پیٹ میں آگ جلائی جاتی تھی مونہہ چوڑا اور وسیع ہوتا تھا، اس کے لئے بچوں کی قربانی کی جاتی تھی جنہیں اس کے منہ میں ڈال کر پیٹ میں جلا دیا جاتا تھا، بعل کے کاہن اس کے لئے عورتوں کی قربانی بھی کرتے تھے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قربانی ان کے لئے مخصوص تھی، وہ اس کے لئے تقریباً ہر ماہ ایک حسین عورت پیش کی جاتی جسے وہ جب تک چاہتے محفوظ رکھتے اور پھر وہ اس معبود پر بھینٹ چڑھا دی جاتی، غالباً

توراہ میں جو "بعل بول" کا تذکرہ ہے اُس کے معنی "جھوٹے بعل" کے ہیں کیونکہ اسرائیلی اس معبود سے سخت متنفر تھے۔

اہل یورپ نے آسٹریلیا کو جس وقت آباد کرنا شروع کیا تو اُس وقت وہاں گائے بکری وغیرہ اس قسم کے جانوروں کا بالکل وجود نہ تھا لیکن کچھ دنوں بعد وہ ان تمام جانوروں کو یہاں لانے میں کامیاب ہوگئے،

آسٹریلیا میں بے انتہا وسیع سرسبز میدان ہیں جو ان جانوروں کے چارہ اور گھاس وغیرہ کے لئے بہت کافی ہیں لیکن اِنسے صرف بارش کے زمانے میں فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے بارش نہ ہونے یا منقطع ہو جانے سے یہ خشک اور خوفناک جنگلوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں، چنانچہ بکری پالنے والوں نے اس سال سخت خسارہ اُٹھایا بلکہ بعض تو اُن میں سے بالکل محتاج ہوگئے وجہ یہ ہوئی کہ گذشتہ بارش نہیں ہوئی اور بالکل خشکی رہی، نہریں بھی نہیں تھیں جن سے یہ جانور پانی پی سکتے، اور فطرۃً اونٹ اور گائے جب کہیں یہ محسوس کرلیتے ہیں کہ پانی ختم ہوگیا ہے تو جہاں کہیں پانی ہو اُس طرف جاسکتے ہیں، لیکن بکری اس معاملہ میں بہت بزدل واقع ہوئی ہے، وہ کچھ عرصہ کراہنے اور زبان نکل آنے کے بعد وہیں ختم ہوجاتی ہے۔

ناظرین واقف ہوں گے کہ اس وقت عالم میں مصنوعی ریشم کہ جسے "ریون" کہا جاتا ہے بہت سے کارخانہ ہوگئے ہیں اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کررہے ہیں،

اسی طرح اب اہل جرمنی نے مصنوعی اُون بھی بنالیا ہے جسے وہ لکڑی سے نکالتے ہیں، یہ اُون ہر قسم کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بہت تھوڑے زمانہ سے نباتات اور سبزی سے جوتوں کا چمڑا بنانے کے لئے تجربہ

کیا جا رہا ہے۔

کانو دئی (؟) شعاعیں ایک عرصہ سے مشہور ہیں اُن کے استعمال کا اسقدر رواج نہیں لیکن اب مسٹر کو لیج نے جو امریکہ کی برقی کمپنی میں علمی تحقیقات کے لئے متعین ہیں ایک خاص نلکی بنائی ہے جس میں شعاعیں ڈالنے کے لئے ایک راستہ ہے یہ شعاعیں ایک خرگوش کے کان پر ایک سیکنڈ کے دسویں حصہ کی قلیل ترین مدت تک ڈالی گئیں اور کان کے تمام بال اُڑ گئے اور جب کان کی جلد بجائے جلنے کے علیحٰدہ ہونے لگی تو مکرر شعاعیں ڈالی گئیں ذرا کے ذرا میں دو گنے بال اُگ آئے۔ لیکن اس مرتبہ پہلے کی طرح گندم نہیں بلکہ سفید تھے، یہ شعاعیں جراثیم اور مچھروں وغیرہ کو دم کے دم میں فنا کر دیتی ہیں۔

ابھی تجربات جاری ہیں جن کی وجہ سے عجیب غریب اثرات کا انکشاف ہی نہیں ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ریڈیم کی شعاعوں کی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رہجائیگی۔

ایک امریکن نے تصویر کشی کا ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو آپ کی تصویر کھینچیگا اور آٹھ منٹ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ یہ آلہ تصویر کشی کے صندوق کے متشابہ ہے آپ داخل ہو جائیے اور کرسی پر بیٹھ جائیے پھر سوراخ میں نقدی ڈالدیجئے اور بٹن دبا دیجئے ایک آواز نکلیگی اور پھر شدید روشنی پھیل جائیگی اور فوٹو کھینچنے کے شیشہ کا دروازہ کھل جائیگا اور آپ کی تصویر کھینچ لیگا۔ اب آپ باہر تشریف لے جائیے اور آٹھ منٹ تک انتظار کیجئے معینہ مدت کے اندر ایک طویل و عریض کاغذ نکلے گا جس میں آٹھ تصویریں ہوں گی۔

گذشتہ مہینہ نیویارک اور لندن کے درمیان لاسکی ٹیلیفون کا افتتاح کیا گیا ہے ایک منٹ تک گفتگو کرنے کا معاوضہ پانچ پونڈ ہیں۔

آخری مردم شماری کے لحاظ سے تمام دنیا میں یہودیوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

شمالی امریکہ	۳۳۷۹۶۶۸
جنوبی امریکہ	۱۱۸۶۵۷
یورپ	۴۷۷۸۹۱
ایشیا	۴۳۴۳۳۲
افریقہ	۳۸۰۶۶۸
آسٹریلیا	۱۹۴۱۵
	۱۴۸۱۰۰۰۰

سب سے زیادہ تعداد ولایات متحدہ میں ہے یعنی ۳۳۰۰۰۰۰ اس کے

علاوہ پولینڈ میں	۳۰۶۹۳۳۰
روم "	۱۰۰۰۰۰۰
اکرانیا "	۳۳۰۰۰۰۰
جرمنی "	۵۰۰۰۰۰

جزائر فلپین کی تعداد ۷ ہزار کے قریب ہے ان میں سے صرف ۴۴۶ ایسے ہیں جن کی مساحت ایک مربع میل سے زائد ہے۔ دار السلطنت منیلا کی مردم شماری ۲۸۳۶۱۳ ہے ان جزائر میں ۱۲اسو میل ریلوے لائن ہے، یہاں کی اشیائے برآمد میں، سن۔ شکر۔ نارجیل، تمباکو اور درآمد میں روئی۔ لوہے۔ فولاد کا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں قابل ذکر ہیں، ۹۰ فی صدی عیسائی ہیں تھوڑے سے مسلمان بھی ہیں بقیہ بت پرست ہیں۔

ملک معظم (برطانیہ) اور رؤسائے جمہوریہ فرانس و امریکہ کو حکومت سے حسب ذیل سالانہ وظیفہ ملتا ہے۔

رئیس جمہوریہ فرانس	۱۰۰۰۰	پونڈ یا	۱۲۰۰۰۰۰ فرانک
″ ″ امریکہ	۱۵۰۰۰	″ سفر خرچ	۵۰۰۰ پونڈ
ملک معظم (برطانیہ)	۱۱۰۰۰۰	″	

روم کی حال کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں ۳۱۲۰۰۰ کیتھولک پادری ہیں جن میں ۲۰۰۳۲۴ یورپ میں رہتے ہیں گویا ہر اٹھارہ سو آدمیوں کے لئے ایک پادری۔

۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اہل امریکہ کی تعداد ۱۰۵۱۷۰۰۰۰ تھی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آیندہ جون کی مردم شماری کی تعداد ۱۱۷ ملین ہوگی۔

حال میں امریکی خواتین نے عورتوں کی ایک انجمن قائم کی ہے جو علم جغرافیہ نیز مختلف قوموں کے حالات و طبائع پر بحث و تمحیص کرے گی۔ انجمن کی صدارت کے لئے مس ہا زیب شالم او مس کا انتخاب ہوا ہے جو اپنی قابل قدر تصانیف "امریکہ کی لاتینی اور اسپینی قومیں اور ان کی نوآبادیاں" کی وجہ سے ملک میں کافی مشہور ہو چکی ہیں اب تک ۳۹ عورتیں ممبر ہو چکی ہیں ممبری کے لئے شرط یہ ہے کہ کچھ مدت تک مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی ہو یا جغرافیہ پر کوئی مستقل کتاب تالیف کی ہو۔
